READING SECTION
Online Library For Pakistan
WWW.PAKSOCIETY.COM

خوبصورت کہانیوں کا مجموعہ

سسپنس ڈائجسٹ

ماہنامہ

فروری 2016



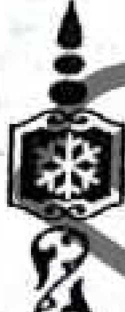
READING SECTION
Online Library For Pakistan
WWW.PAKSOCIETY.COM





جلد 46 • شمارہ 02 فروری 2016 • زرِ سالانہ 800 روپے • قیمت فی پرچا پاکستان 60 روپے •
خط کتابت کا پتا: پوسٹ بکس نمبر 215 کراچی 74200 • فون: 35895313 (021) فیکس 35802551 (021) E-mail:jdpgroup@hotmail.com







پبلشر و پروپرائٹر: ذیشان رسول • مقام اشاعت: گراؤنڈ فلور C-63 فیز II ایکس ٹینشن، ڈیفنس، مین کورنگی روڈ کراچی 75500
پرنٹر: جمیل حسن • مطبوعہ: ابن حسن پرنٹنگ پریس ہاکی اسٹیڈیم کراچی





انشائیہ

بے دولتی

جون ایلیا

ہمارا سب سے بڑا ہنر یہی تو ہے کہ ہمارا ہنر اپنے کام نہ آئے اور یہ کہ وہ دوسروں کے پس و پیش، چپ و راست اور پست و بلندی کی صورت گری کرنے، انہیں سنوارنے اور نکھارنے میں اپنا جواب نہ رکھتا ہو۔ تم تھے ہی نہیں، ہم تھے ہی نہیں، تم ہو ہی نہیں، ہم ہیں ہی نہیں۔ ہم اور تم تو بس ایک دکھائی دینے والا دھوکا ہیں، ایک دھوکا جو نہ جانے کیوں ہے؟ میں یہ سوچتے سوچتے ہلکان ہو گیا ہوں کہ وہ جو نہیں ہیں، وہ جو دھوکا ہیں، وہ دکھائی بھی کیوں دیتے ہیں۔

ہمیں شرم آنا چاہیے کہ ہم تم میں سے ہیں اور تمہیں اس پر پچھتانا چاہیے کہ تم ہم میں سے ہو۔ تم اور ہم ایک بیزار کر دینے والا تماشا ہیں جسے دیکھتے دیکھتے پپوٹے دکھنے لگے ہیں۔

میں اور معراج رسول سرزمین عرب کے اس علاقے کو ایک ساتھ دیکھ رہے ہیں جس کو ہماری سرزمین کے ہنرمندوں نے ریگستان کا معجزہ بنا دیا ہے، ہنر کا معجزہ۔ ہماری کارگزاری کا سارا سلیقہ دوسروں کے لیے اس کمال کے ساتھ ظہور میں آیا ہے۔ ہم نے اپنی بستیوں سے دور ان بستیوں میں آ کر جو عمارتیں بنائی ہیں، وہ سربلند رہنے کے لیے ہیں، دیکھتے ہی دیکھتے گر پڑنے کے لیے نہیں ہیں اور گزرگاہوں کا جو فرش بچھایا ہے وہ زمین کے سینے پر جڑے رہنے کے لیے ہے، موسم کی اگلی ہی رُتیں ادھڑنے کے لیے نہیں۔ نہیں سمجھا جا سکتا کہ شہر پردازی کی وہ کاوش اور دفترداری کی وہ دانش آخر کس کام کی جو اپنے شہروں اور اپنے دفتروں کے کام نہ آئے۔

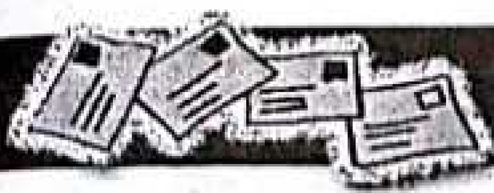
تمہارے شہروں کے باہنر، تمہارے ماہر، تمہارے محنت کش دوسری سرزمینوں کے ناموں کو للچائے ہوئے کانوں سے سنتے ہیں۔ ایسے کتنے ہیں جو یہاں سے سفر اختیار کرنا نہ چاہتے ہوں۔ کسی نے کہا تھا اور کراہتے ہوئے کہا تھا:

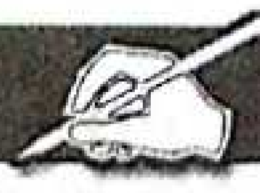
''میرے لوگ، میرے جفاکش دوسری قوموں کی مزدوری کریں گے۔ ان کی تھکان دوسروں کا آرام بنے گی۔ میرے اہلِ ہنر دوسروں کے غلام ٹھہریں گے۔ میرے اہلِ دانش کی مہارت دوسروں کے اشاروں کی خدمت گار قرار پائے گی۔ ان میں سے ہر گروہ اپنے اپنے کام کے حساب سے خوب خوب کمائے گا اور یہ ذلت اور ندامت کی کمائی ہوگی۔ وہ اپنے وجود سے دستبردار ہو جائیں گے اور پھر تو وہ جو چاہیں، پائیں اور جتنی اشرفیاں چاہیں، اپنی جیبوں میں بھر لائیں۔''

پر یہاں ایک اور بات بھی کہنی چاہیے اس لیے کہ وہ حق اور انصاف کی بات ہے اور وہ بات یہ ہے کہ ہم میں سے زیادہ لوگ آخر یہ کیوں نہ چاہیں کہ انہیں دو وقت کی روٹی ملنے کا سہارا تو ہو۔ اور اگر اس سے بھی زیادہ، بہت زیادہ کی امید ہو تو آخر وہ اپنے شہروں سے کیوں نہ کوچ کر جائیں۔ میں تو کبھی کبھی یہ کہتا ہوں کہ ایسا ہی ہونا چاہیے۔ مہارتوں اور ہنرمندیوں کو اپنی سرحدیں پار کرنے کی خواہش آخر کیوں نہیں رکھنی چاہیے؟ انہوں نے اپنی عمر کا بہترین زمانہ دن رات محنت کر کے گزارا ہے۔ ان میں سے اکثر کو ان کے شہروں سے کیا ملا ہے۔ ان میں سے لاکھوں لوگ ایسے ہیں جو ہر حالت میں یہیں رہنا چاہتے ہیں۔ ان میں سے لاکھوں ایسے ہیں جو آج کی امید نہ سہی تو کل کی امید پر زندگی بسر کرنے کی خواہش رکھتے ہیں مگر یہاں تو ابھی تک نہ آج کی امید ہے اور نہ کل کی۔ وہ یوں کہ جو ہمارے والی ٹھہرے ہیں، وہ بھی فضول ہیں اور جو ان والیوں کو ہٹا کر ان کی گدی پر بیٹھنا چاہتے ہیں، وہ بھی فضول ہیں۔

جن لوگوں نے اپنے آقاؤں سے لو لگائی ہے اور جنہوں نے ان آقاؤں کے حریفوں سے امیدیں رکھی ہیں، وہ سب گھاٹے میں رہے ہیں۔ حکمرانوں اور مدعیوں کا کہا باطل ہی ثابت ہوا ہے، باطل باطل سب باطل۔ اب اگر لوگ بپھر کر ان دونوں پر ٹوٹ پڑیں تو کیا یہ کوئی جرم ہوگا؟ میں کہتا ہوں کہ یہ حق ہوگا، انصاف ہوگا، عدل ہوگا۔ لوگ وعدوں سے تنگ آ گئے ہیں چاہے یہ وعدے یہ کریں یا وہ......

اس ملک کے حاکموں اور ان کے حریفوں نے اور ان کی حکمتوں نے یہاں کی جوہردار ذہانتوں کو دوسری قوموں کا گداگر بنا دیا ہے اور یہ ہنرمند بے قصور ہیں۔ یہ بے چارے ملکوں ملکوں جا کر گداگری کرتے ہیں اور اپنے اپنے کشکولوں کی بھیک اپنے ملک میں بھیج دیتے ہیں۔ وہ اس ملک کی اور کیا خدمت کر سکتے ہیں؟ مگر ان محنت کشوں کی بھیجی ہوئی یہ دولت اس ملک کی بے دولتی ہے۔ ہاں، اے مجبور باربرداری کی قوم! یہ تیری بے دولتی ہے۔





محترم قارئین!
السلام علیکم!

فروری 2016ء کا دلفریب شمارہ آپ کے زیرِ مطالعہ ہے۔ گزشتہ دنوں سیاسی سطح پر کافی گہما گہمی رہی۔ بلدیاتی الیکشن جس زوروشور سے ہوئے اب اتنی ہی گہری خاموشی چھائی ہوئی ہے اور عوام تاحال ان کے ثمرات سے محروم ہیں۔ تمام مسائل جوں کے توں ہیں دیکھیے آگے آگے ہوتا ہے کیا۔ ابھی ان مسائل پر قابو نہیں پایا گیا تھا کہ صحرائے تھر میں پانی اور غذا کی قلت سے اموات کا سلسلہ جاری ہوگیا۔ اسپتالوں میں بھی طبی امداد کی کمی نے مشکلات میں اضافہ کردیا ہے۔ تھر کی موجودہ صورتِ حال دیکھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ اس کی بہتری کے لیے جو بھی اقدامات کیے جاتے رہے وہ انتہائی غیر موثر بلکہ محض دکھاوا ثابت ہوئے۔ ورنہ اس کے نتائج ہرگز یہ نہ نکلتے۔ یہ علاقہ کئی بار خشک سالی کا شکار ہوچکا ہے مگر ان مشکلات کا کوئی مستقل حل آج تک کوئی تلاش نہ کرسکا۔ اب تو خدارا ٹھوس اقدامات کرکے انہیں بھی جینے کا حق دیا جائے۔ آج کل عالمی سطح پر دیکھا جائے تو سعودی، ایران تنازع کے پس منظر میں دنیا کو اس وقت خطرناک ترین بحران کا سامنا ہے جس کے سبب مشرقِ وسطیٰ میں سیاسی، معاشی اور معاشرتی طور پر صورت حال مخدوش ہوتی محسوس ہورہی ہے۔ ایسے میں مسلم ممالک کا ثالثی کردار اہمیت کا حامل ہے۔ ورنہ ان دونوں مسلم ممالک کے درمیان کشیدگی سے پورے خطے کے امن کو خطرہ لاحق ہوسکتا ہے۔ بہرحال اللہ سے دعا ہے کہ الٰہی نہ صرف پاکستان بلکہ دنیا بھر میں امن کو کوئی خطرہ نہ درپیش ہو اور اس دعا کے ساتھ ہی چلتے ہیں ہم بھی اس پیاری محفل کی جانب جہاں بے شمار دعائیں ہماری منتظر ہیں۔

✠ **آغا سلمان پاشا**، پاکیشیا سے محفل میں شریک ہوئے ہیں ''باورچی خانے سے ذرا فرصت ملی تو ایک دن عمران صاحب کی لائبریری میں کچھ دیر تاک جھانک کی تو سسپنس اور جاسوسی کے درجنوں شمارے نگاہوں کو خیرہ کرگئے۔ پھر ہماری باذوق رگِ مطالعہ پھڑکی اور ایک دو شمارے تسکینِ ذوق کی خاطر اٹھا لیے۔ دال ماش کو تڑکا لگاتے لگاتے چند صفحات پڑھ ڈالے اور تب سے سسپنس کا ایسا چسکا لگا کہ عمران صاحب جونہی سسپنس لاتے، ہم اٹھا کر غائب کردیتے۔ وہ کسی نہ کسی مشن پہ نکل جاتے اور ہم اٹھا کر پڑھنے بیٹھ جاتے۔ خطوط پڑھ پڑھ کر ہمیں بھی خط لکھنے کا شوق ہوا اور پہلی بار کاغذ قلم سنبھال ہی لیا۔ (دل کی گہرائیوں سے خوش آمدید) آج کل عمران صاحب طویل مشن پر پاکیشیا سے باہر گئے ہوئے ہیں۔ یہی ایام فرصت ہیں اور ہمیں آزادی سے ہر کام کرنے کی سہولت میسر ہے۔ سو دو دن قبل مارکیٹ سے گھریلو سودا سلف خریدنے کے ساتھ ساتھ سسپنس بھی خرید لیا اور باوجہ فراغت دو دن میں ہی پڑھ لیا۔ سرورق کی لڑکی پر تبصرہ نہیں کریں گے کیونکہ اگر ہمارا تبصرہ عمران صاحب کی نگاہ سے گزرا تو اس میں صنفِ نازک کی تعریف پڑھ کر ان کا ہم سے ناراض ہوجانے کا خدشہ ہے اور ہم ان کی ناراضگی مول لینا گوارا نہیں کرسکتے۔ اس بار صدارت وزارت اور مشیرت ہماری پیاری پیاری بہنوں کے حصے میں آئی۔ سعدیہ بخاری، مرحا گل اور طاہرہ گلزار نے بہت ہی اچھے خط لکھے اور اپنی محنت کا ثمر پالیا۔ پیاری بہنوں آپ تینوں کو میری طرف سے بہت بہت مبارک باد۔ ارے ارے، یہ اپنے بلیک زیرو عرف طاہر صاحب (مرزا طاہر الدین بیگ) بھی دلچسپ تبصرے کے ساتھ موجود ہیں۔ آپ کا تبصرہ بے حد پسند آیا۔ زرین آفریدی پہ اپنے کرنل آفریدی کا گمان گزرا مگر یہ تو صنفِ نازک کی نمائندہ نکلیں۔ خیر، ان کا لیٹر بھی ونڈرفل رہا۔ ارے باپ رے یہ ہمارے ایم عمران جونانی صاحب بھی موجود ہیں۔ زبردست لکھا، فل ایکشن سے بھرپور الفاظ۔ ویلڈن۔ کہانیوں میں ماروی میں اچانک حالات نے یکدم پلٹا کھایا اور مراد نے ماروی کو بھلادیا۔ محبوب اور ماروی کی شادی ہو ہی گئی۔ محبوب کو اپنی طویل ترین ریاضتوں کا ثمر مل ہی گیا اور غباروں کا بھی خوب انجام ہوا۔ اس قسط نے تو ماروی کو دلچسپ بنا دیا ہے۔ مراد اب نگار اخانم سے شادی کرکے ایک بڑی ریاست کا والی بن چکا ہے۔ ویلڈن محی الدین نواب صاحب۔ شیش محل کی موجودہ قسط بھرپور رہی۔ چاند بانو کی معصوم محبت پر بے حد پیار آیا۔ فاروق کو چاہیے اس کی محبت کی قدر کرے۔ جولیٹ تو اسے منہ لگانا گوارا نہیں کرتی ہے اور اپنے مطلب کے لیے اس کی تعزیت کرتی پھرتی ہے۔ راہ نجات آخری صفحات پہ ایک خوب صورت کہانی جس نے بہت سے سبق دیے۔ ناہید سلطانہ سسپنس میں کم مگر اچھا لکھتی ہیں۔ ہم تو چاہتے ہیں ان سے قسط وار کہانی لکھوائی جائے۔ (اگر آپ لوگوں کی خواہش بھرپور ہوئی تو ناہید سلطانہ اختر صاحبہ کو اس بارے میں بھی لازمی سوچنا چاہیے) عدل وانصاف، بھید، اصل شوبزنس اور اندھیرا زبردست کہانیاں تھیں۔ کبھی کبھار ایک آدھ اسٹوری عمران سیریز پر بھی ہوجائے تو کیا ہی بات ہو...... ہم امید کرتے ہیں ہماری پہلی شرکت آپ سب کو اچھی لگے گی اور آئندہ بھی

عمران صاحب سے چھپ کر ہم خط و کتابت کا رنگین سلسلہ جاری رکھیں گے۔'' (آنکھ مچولی کا یہ کھیل دلچسپ تو ہے پر...... اچھا ہے عمران صاحب کو بھی اپنے ساتھ شامل کرلیں...... کیسا آئیڈیا ہے؟)

سید ثاقب علی شاہ، اڈیالہ جیل، راولپنڈی سے تبصرہ کررہے ہیں ''اس دفعہ سسپنس 22 دسمبر کو موصول ہوا۔ دیکھ کر اتنی ہی خوشی ہوتی ہے جتنی کہ اپنے ''پیارے محبوب'' کو دیکھ کر ہوتی ہے۔ اس کی قدر کوئی ہم جیسے قدردانوں سے پوچھے، بھلا بے ذوق لوگوں کو اس کا احساس کیونکر ہوگا۔ (بہت نوازش آپ کی) اس دفعہ سرورق پر حسینہ کی قاتل مسکراہٹ اور اس کے سر پر جگمگ کرتے روشن ستارے اس بات کی پیشن گوئی تھی کہ انشاء اللہ 2016ء اچھا گزرے گا۔ جون ایلیا نے جو اس بار نوکرشاہی کا تذکرہ کیا، بلاشک وہ جاندار تھا لیکن بحیثیت مسلمان کہتا ہوں کہ جب تک ہم اللہ کے قانون کو نافذ نہیں کریں گے، یہ ''نوکرشاہی'' کی لعنت قائم رہے گی اس لیے ہمیں اللہ کے بتائے ہوئے طریقے پر چلنا ہوگا۔ اب آتے ہیں اپنی محفل کی طرف تو جناب اپنی محفل میں آتے ہی احساس ہوا کہ لیڈیز فرسٹ کے اصول کے تحت پہلے تینوں نمبروں پر معزز خواتین کا قبضہ ہوچکا اور مرد حضرات شرمندہ و پریشان نظر آئے، تو میرے بھائیوں کو پریشان ہونے کی ضرورت نہیں محنت کرنے کی ضرورت ہے (ذرا دل بڑا رکھیں خواتین کی طرح) بے شک، عزیزہ سعدیہ بخاری، مرحا گل اور طاہرہ گلزار صاحبہ نے سسپنس کو اور اپنی محفل کو اپنے بہت ہی دلکش و جاندار تبصروں سے نوازا، معزز خواتین کو اپنے اس بھائی کی طرف سے مبارکباد۔ سب سے پہلے شیش محل کی بات ہوجائے کہ جب بھی سسپنس ہاتھ آتا ہے، شیش محل کے خیال سے ہی دل کی دھڑکن تیز ہوجاتی ہے، بہت ہی سپرہٹ اور جاندار انداز میں کہانی رواں دواں ہے۔ ساتھ یہ تذکرہ بھی ضروری ہے کہ ماروی کا سوچتے ہی دل کی دھڑکن رکنے لگتی ہے اور یہ کہ جناب مرزا امجد بیگ صاحب کا دفتر کہاں ہے؟ جناب جتنے کامیاب وکیل ہیں، اتنی ہی جلدی کیس نمٹاتے ہیں۔ ویسے جہاں تک ہمارا تجربہ ہے، آج کل کے دور میں یہ قصہ کہانی ہی ہے کیونکہ ہم خود 10 سالہ قیدی ہیں اور آج کل انصاف تو صرف امیروں کی باندی بن کر رہ گیا ہے۔ (اللہ آپ کی مشکل آسان کرے اور جلد از جلد آزادی نصیب ہو) اصل شوبزنس اچھی تحریر تھی، کاشف زبیر صاحب کی۔ تنویر ریاض صاحب نے تھوڑا دکھی کیا۔ ناہید سلطانہ اختر کی تحریر متاثر کن تھی۔ محفل شعروسخن میں زوہیب احمد ملک، ملائکہ حریم، عبدالغفور خان ساگری، رضوان تنولی کریڑوی، زریں آفریدی اور محمد قدرت اللہ نیازی کے اشعار بہت پسند آئے۔''

محمد یوسف سانول، تحصیل نورپور تھل سے شرکت کررہے ہیں ''کائنات کے مالک و خالق سے التجا ہے کہ ادارے کو دگنی چوگنی ترقی عطا ہو۔ 3، 4 ماہ کی غیر حاضری کے بعد ایک بار پھر محفل یاراں میں حاضری، امید ہے ویلکم کہا جائے گا۔ (بالکل جناب خوش آمدید...... آپ کی اپنی محفل ہے) کچھ احباب نے یاد رکھا، کچھ بھول گئے۔ یہ دنیا ایسی ہی ہے۔ سالِ نو کے پہلے شمارے کا سرورق انتہائی دیدہ زیب اور دلکش اور ذاکر انکل کی محنت کا منہ بولتا ثبوت...... حسینہ ماہ جبینہ کا انداز مسکان سال نو سے امیدیں وابستہ کیے ہوئے تھا۔ فہرست دیکھی دل خوش ہوا۔ حق کے داعی کا ایک اور خطاب بادشاہ گر پڑھا، نوکرشاہی واقعی انگریز کا پروردہ تحفہ ہے اتفاق کرتے ہیں۔ سب سے پہلے اسما قادری کا شیش محل پڑھا۔ انتہائی پیاری اور ادا اس قسط تھی۔ فاروق سے جولیٹ کا ملنے جانا اور فاروق وغیرہ کا شملہ نکل جانا، جولیٹ کا دلدار آغا سے انتقام کا جنون زبردست رہا۔ ماروی کی ابتدا بہت اچھے انداز سے کی تھی مگر اب نہیں لگتا کہ یہ وہی ماروی ہے جس کے ہم دیوانے تھے۔ بہرحال نواب صاحب تو نواب ہیں بھلا ہم اختلاف کرنے والے کون ہوتے ہیں۔ اس کے بعد راہ نجات، ناہید سلطانہ اختر صاحبہ کو خصوصی طور پر مبارکباد۔ انتہائی اچھی کہانی اور ضمیر کو جھنجھوڑنے والی کہانی تھی۔ میرا ایک دوست جو کرسچین ہے، میں اس کو یہ شمارہ گفٹ کروں گا اور راہ نجات پڑھنے کی ریکوئسٹ کروں گا۔ واقعی دین احمد ایک مکمل دین ہے اور تمام ادیان کا مجموعہ ہے۔ باقی کہانیاں وقت کی کمی کی وجہ سے زیر مطالعہ ہیں اور امید ہے کہ تمام اچھی ہوں گی۔ محفل یاراں میں سعدیہ بخاری کرسی صدارت پر فائز تھیں۔ اچھا تبصرہ تھا مبارکباد۔ مرحا گل، طاہرہ گلزار، سید عبادت کاظمی، رمضان پاشا، قاسم رحمان، فلک شیر ملک، عمران جونانی، صفدر معاویہ اور قدرت اللہ نیازی کے تبصرے بھی شاندار تھے اور مزے کی بات ادارے کی طرف سے سب کو بریکٹوں میں جواب بھی ہے (ہر جواب طلب بات کا جواب حاضر ہوتا ہے) محفل شعروسخن میں قاری محمد رمضان حسرت الحسنی، ہادیہ، ماہا... سجاد حسین خوشاب اور رضوان تنولی کا انتخاب پسند آیا اور ایک خصوصی بات یہ کہ دسمبر 24 کو نبی احمد ﷺ کا یوم میلاد ہے اور مجھ ناچیز کا برتھ ڈے (ارے واہ...... ماشاء اللہ، مبارک ہو) اس حسین اتفاق پر رب کائنات کا بہت شکرگزار ہوں۔ میری طرف سے تمام مسلمانوں کو عید میلاد النبی ﷺ بہت مبارک۔ اور آخر میں میری امی کے لیے خصوصی دعا جو کہ بیمار ہیں۔'' (اللہ تعالیٰ آپ کی والدہ کو صحت کاملہ عطا فرمائے۔ آمین)

ادریس احمد خان، ناظم آباد، کراچی سے چلے آرہے ہیں ''جنوری کا سسپنس ہنستی مسکراتی بہار لیے جلوہ گر ہوا اور ہاتھوں ہاتھ لیا گیا۔ نئے سال کی سب ہی دوستوں کو بہت بہت مبارکباد۔ خدا کرے کہ نیا سال ساری محرومیوں کا ازالہ کرے۔ سرورق کے بعد جون ایلیا کے انشائیہ سے مستفید ہوئے۔ اداریہ بھی حالات کے مطابق تھا۔ خطوط کی محفل میں سرفہرست سعدیہ بخاری نظر آرہی تھیں، مبارکباد۔ دیگر دوست بھی نظر آرہے تھے اور خوب صورت آراسے نواز رہے تھے۔ الیاس سیتاپوری کی پارسائی کا خمار تاریخ کے خوابیدہ



دریچوں سے آگاہ کیا۔ بے شک ایسے بہت سے دنیادار عبادت گزار بھی ہوتے ہیں جو صرف دنیا کو دکھانے کے لیے عبادت کرتے ہیں اور دادِ عیش کی محفلیں بھی بجھاتے ہیں۔ گویا خدا کو اور دنیا دونوں کو دھوکا دیتے ہیں۔ اصل شوبزنس کاشف زبیر کی اچھی تحریر تھی انسان کی ضرورت بھی انسان سے کیا سے کیا کرا دیتی ہے جس کا عام حالت میں سوچ بھی نہیں سکتا۔ بین نے بھی ہر احساس کو پس پشت ڈال دیا۔ اس کے بعد اسما قادری کی شیش محل پڑھی جو خوب صورت پیرائے میں لکھی گئی بہترین کہانی ہے جو قاری کو آخری سطر تک اپنے سحر میں جکڑے رکھتی ہے۔ تنویر ریاض کی آخری بار بھی اثر انداز رہی۔ جین نے اپنے پہلے شوہر کو قتل کر دیا مگر اس کا احساس بھی ہو گیا۔ بھید بھی اچھی لگی۔ اشعار کی محفل میں بھی معیاری اشعار نے مزہ دیا۔ زبیر سلیمانی کی اندھیرا اچھی کہانی تھی۔ کترنیں نہ ہونے کے برابر تھیں۔ مصیبتیں بھی اچھی لگی۔ اولیاؤں کے حالات و واقعات میں شمس عرفان اولیاء اللہ کے واقعات پڑھتے ہوئے اپنے ایمان کو روشنی سے منور پایا ہے۔ جس سے ایمان ترو تازہ ہو جاتا ہے۔ لانچل میں اشل مونٹ کی احتیاط پسندی بالکل کام نہیں آئی اور شاطر ذہنوں والے مجرموں نے اپنا کام بھی اس سے کرالیا۔ آخری صفحات کی کہانی راہ نجات محترمہ ناہید سلطانہ اختر کی بہترین سے بہترین کہانی تھی۔ ان کی تحریروں میں بے جا لمبی تمہیدوں سے احتراز کیا جاتا ہے جو خواتین کا طرۂ امتیاز ہے۔ وہ بامعنی اور بامقصد انداز میں لکھتی ہیں جس سے دلچسپی کا عنصر بدرجہ اتم ہوتا ہے اور قاری کی نظر آخری سطر تک اوپر نہیں اٹھتی۔ ایسی تحریریں لکھنے پر ان کو بہت مبارکباد۔''

✠ **وارث علی**، سندیلیا نوالی سے محفل کی رونق بنے ہیں '' نئے سال کا نیا شمارہ دسمبر کی دھند لی، ٹھنڈی شام کو دسمبر کے آخری دنوں میں ملا اور دل خوش کر گیا۔ سرورق پر حسینہ کافی شوخ و چنچل سی تھی...... میری طرف سے آپ سب اسٹاف کو، اپنے ملک کے تمام قارئین کو اور پورے اہلِ وطن کو نیا سال مبارک ہو (آپ کو بھی مبارک ہو) کرسیِ صدارت سعدیہ بخاری کو مبارک ہو۔ طاہرہ گلزار آپی کا خط دیکھ کر بہت خوشی ہوئی۔ قاسم رحمان کا تبصرہ بھی زبردست تھا۔ کہانیوں میں سب سے پہلے آخری صفحات کی طرف دوڑ لگائی اور راہ نجات میں جا کر دم لیا۔ لائقِ تحسین ہیں ناہید سلطانہ جی! آپ کو سو سلام اتنی زبردست تحریر لکھنے پر۔ دلوں کے اندر ایمان کی روشنی بھر دینے والی تحریر تھی۔ داؤد نے اپنے دین کو چھوڑ کر جو کام کیا وہ کسی طور بھی سراہے جانے کے لائق نہ تھا۔ ہر طرف سے اس پر نفرین اور پھٹکار ہوئی۔ ماریہ کے انداز سے لگ رہا تھا کہ کبھی اسلام قبول نہیں کرے گی لیکن عائشہ کے حسن اخلاق اور عائشہ کے کردار کو دیکھ کر وہ خود ہی مائل اسلام ہوئی۔ سچ ہی تو ہے ہمارا دین کب زبردستی اور جبر کا حکم دیتا ہے۔ ماروی پڑھی۔ مراد کا طیارے کو ہائی جیک ہونے سے بچانا کافی زبردست لگا لیکن نگارا خانم کے محل میں جانا عجیب اتفاق لگا۔ کاشف انکل جی کا انتخاب اس دفعہ تو نہایت حیران کن تھا۔ مغربی معاشرے کی بے حسی پڑھ کر تو لگتا تھا کہ ابھی ابکائی آجائے گی۔ اللہ معاف کرے ان کا تو بس نہیں چلتا دولت کی خاطر انسان کو ہی چبا جائیں۔ عرفان شمس اللہ کے بندوں کی خوبیاں پڑھیں۔ اس دور میں کیوں ایسے لوگ نہیں ملتے؟ بہت پیاری تحریر تھی قادر بخش کی۔ شیش محل میری فیورٹ رائٹر کی اسٹوری اس دفعہ کافی سست رہی۔ ساری کہانی تو پچھلے حوالوں میں گزر جاتی ہے۔ جولیٹ بے چاری پر افسوس ہوا۔ فاروق سے ملاقات نہ کر پائی۔ چاند بانو دیکھو فلمی دنیا میں کیا کرتی ہیں؟ جانی کی بروقت آمد نے جولیٹ کو بچا لیا ورنہ وہ تو پھر سے...... کہانی بہت اچھی جا رہی ہے۔ شعر سارے زبردست تھے۔ پلیز خط شائع کر کے خوش ہونے کا موقع دے دیں۔'' (اب کہیے کتنے من خوشی کا احساس ہوا...... ہمارا کام تو سب کو خوش کرنا ہے)

✠ **محمد جاوید خان**، تحصیل علی پور سے محفل میں شریک ہیں '' اکیسویں صدی کی 16 برس کی عمر یا کا پہلا دل آویز شمارہ 17 کو ہماری تحویل میں آیا۔ ہمیں اپنے ہونے کا ثبوت دینے اور تجدید تعلق دل کے واسطے احساسات کندہ کرنے کا غیر متزلزل قصد کیا۔ بزم احساسات کا افتتاح اداریہ سے کیا۔ گڈ گورننس کی دعوے دار حکومت کی مثال اس گندے انڈے جیسی ہے جس کا بظاہرہ تو صاف اور شفاف مگر اندر سے گندا و بدبودار ہوتا ہے۔ صدارت صنفِ نازک کے حصے میں گویا حق دار کو اس کا حق مل گیا۔ مرحا گل اس بات پر تو ہم بھی محو حیرت ہیں کہ صنف معصوم کے 13 جبکہ صنف نازک کے صرف 4 خط آئے۔ نوآموز زرین آفریدی اگر خربوزہ خربوزے کو دیکھ کر رنگ پکڑتا ہے تو ہم سوچ رہے ہیں کہ پہلا خربوزہ کسے دیکھ کر رنگ پکڑتا ہوگا؟ حاجی محمد زاہد کا احساس نامہ مختصر ہی سہی مگر نورِ محبت میں لپٹا ہوا تھا۔ ماہا ایمان اب ہادیہ اپنے پیدا ہونے کا اعلان خود کرنے سے تو رہی۔ ایڈیٹر صاحب کا برسوں سے رکا ہوا قلم نان اسٹاپ چل پڑا اور دھڑا دھڑ شکریے کی دولت بانٹنا شروع ہو گئے مگر جناب محبت شکریے کی محتاج نہیں ہوتی۔ (اس کے باوجود آپ کے شکوے تواتر سے جاری تھے) ہم آپ کے ہاتھ پکڑ کر جوڑ کر کہتے ہیں پلیز قینچی کم چلایئے گا (کمال ہے ہاتھ بھی ہمارے جوڑے جائیں اور گزارش بھی ہم سے...... اس طرح دوسرے کہاں جائیں گے) دعائے دل ہے کہ اسی طرح حیات بھر سب کے ہونٹوں کے پھولوں پر مسکراہٹوں کی شبنم گرتی رہے۔ ایک بار سیکنڈ ہینڈ بک شاپ سے پہلی بار اتفاقاً سسپنس ڈائجسٹ لیا تو منفرد نام اور اسکیچ اور منفرد موضوع نے ایسا دل موہ لیا کہ جب بھی سسپنس لیا آغاز مطالعہ دیوتا سے ہی کیا۔ نواب صاحب سے ہمیں محبت ہی نہیں بلکہ عقیدت ہے۔ رقص میم کا مرکز و محور ماروی سے نظر بازی کے لیے آنکھوں کے پروانوں نے اڑان بھری جہاں مرینہ کی یاس انگیز موت نے دل کو سکا سا دیا۔ مراد نکاح پر نکاح کر رہا ہے تو ماروی نے بھی دائرۂ عدت سے باہر آتے ہی بانہوں کا سہارا ڈھونڈ لیا۔ ہزاروں جاگتی آنکھوں کے خوابوں کے شیش محل میں چاند بانو چاہت کی چاندنی فاروق پر بکھیر تو رہی ہے مگر اس وقت چاند بانو کے چاند جیسے دل میں جشن غم برپا ہوگا جب دل کی دھڑکن سے تراشے ہوئے نگینے پر کسی اور کا نام نکلے گا مگر شاید چاہتیں احساس سود و زیاں سے ماورا ہوتی ہیں۔ ترجمہ کاشف زبیر کا ہو اور ہم کسی اور انگلش ترجمے کی جانب راغب ہو جائیں، ایسا بہت کم بار ہوا ہوگا۔ اصل شوبزنس میں دو دوستوں بین اور شاٹ کے مابین مسلسل مقابلوں نے پہلے



ہی شک میں مبتلا کر دیا تھا۔ توپ کا گولہ لگے اس غربت کو جس نے دوست کو دوست کا گلا، اولاد اور بیوی کی خاطر کاٹنے پر مجبور کر دیا۔ رضیہ محبوب کی کہانی معصیتیں میں سرکار صاحب کی اپنی بیوی کے متعلق پرائیویٹ سوچ کے لیے پہلے سر ہلا کر اور اب قلم چلا کر تائید کر رہے ہیں۔ آغوش سسپنس میں ادب کے گل ایک سے بڑھ کر ایک مہکتے ہوئے پھول تو تھے ہی مگر جس دستِ زن سے تحریر شدہ کہانی نے ہمیں دل تک متاثر و معطر کیا، اس کا نام راہِ نجات ہے۔ ایک کامل پابند شرع مسلمان کئی افراد کی اصلاح کے لیے کافی ہوتا ہے۔ ہیرے جیسا دوست سلمان نومسلم عائشہ بااصول اور غیر متعصب جج اور ایس ایچ او نیک سیرت میڈم نگہت کے پاکیزہ اعمال نے ڈیوس اور ماریہ کو عظمت اسلام سے روشناس کر کے نور ایمان سے منور کیا۔ داؤد کی فکر تو درست تھی مگر طریقہ کار اسلامی ہدایات کے برعکس تھا۔ راہِ نجات نے پلکوں کے دھاگے میں آنسوؤں کے موتی پرو دیے۔ عمر عبداللہ کی قرض اور منظر امام، ناہید سلطانہ اختر کی اکثر تحاریر تعمیری اور اصلاح معاشرہ کے عناصر سے بھرپور ہوتی ہیں۔ سحر راہ نجات سے ابھی آزاد نہ ہوئے تھے کہ زبیر سلیمانی کی کڑوی کاوش اندھیرا نے گھسیٹ لیا۔ اندھیرا میں غیور زبیر کی غیرت اور بروقت فیصلے کو سراہا۔ زن ذات اگر چاہتی ہے کہ معاشرے میں اس کا پاکیزہ وقار کبھی بھی مجروح نہ ہو تو زندگی میں کبھی بھی غیر مرد کو نہ دوست کی شکل میں نہ محبوب کی شکل میں آنے دے۔ بھیڑیے ہر گام پر گھات لگائے ہوئے ملیں گے۔ عدل وانصاف میں قابل توصیف وکیل بیگ صاحب نے ٹھگ بازوں پر قانون اور دلائل کے چابک برسا کر دودھ کا ملک اور رواثر کا پانی کر دیا۔ بزم اشعار میں اشعار پڑھتے رہے، کبھی آہ تو کبھی واہ واہ کرتے رہے۔''

✠ **سید عبادت کاظمی**، ڈیرہ اسماعیل خان سے تبصرہ کر رہے ہیں ''سب سے پہلے تو ادارے اور تمام قارئین کو دل کی گہرائیوں سے نئے سال کی مبارک (آپ کو بھی مبارک ہو) اس دفعہ سسپنس 20 کو بہت لیٹ ملا۔ ٹائٹل گرل پر نظر ڈالی جو بہت خوب صورت اور دلکش انداز میں مسکرا رہی تھی۔ جون ایلیا کی خدمت میں حاضری دی جہاں شاہی رموز و آفاق سمجھائے جا رہے تھے۔ دسمبر کے آخری ایام ہیں اور بے وجہ اداسی ہے۔ بوجھل دل کے ساتھ محفل دوستاں میں داخل ہوئے۔ سعدیہ بخاری کافی عرصے کے بعد آئیں اور چھا گئیں۔ کرسی صدارت کی بہت بہت مبارک ہو۔ صنفِ نازک نے تو اس دفعہ میدان مار لیا یعنی پہلے، دوسرے اور تیسرے نمبر پر بھی صنفِ نازک...... مرحا گل کا تفصیلی تبصرہ اچھا لگا۔ زرین خان آفریدی بھئی آج کل ہم دھیان میں رہتے کہاں ہیں۔ قاسم تمہارا کہنا ٹھیک ہے لیکن کسی کے چلے جانے سے زندگی میں ایک خلا پیدا ہو جاتا ہے وہ کبھی پورا نہیں ہوتا۔ محمد صفدر معاویہ آپ ایئر فورس میں ہیں جان کر خوشی ہوئی۔ انشاء اللہ میں بھی جلد آرمی فورس جوائن کرنے والا ہوں۔ ہمیشہ کی طرح شیش محل سے اسٹارٹ کیا۔ جولیٹ اور فاروق کو رائٹر جدا کر رہی ہے جو مجھے اچھا نہیں لگ رہا۔ جدائی بہت رلاتی ہے۔ چاند بانو کے عشق میں مجھے اپنی جھلک محسوس ہوئی۔ چاند بانو کا وہ جملہ دل میں اتر گیا آپ کا کہنا میرے لیے حکم کا درجہ رکھتا ہے اف...... ثنا کی بے حسی پر غصہ آتا ہے۔ آغا دلدار جیسے لوگ معاشرے کا ناسور بن چکے ہیں۔ پارسائی کا خمار بہت اچھی کہانی تھی۔ ماروی نے ایک دم رنگ بدلا ہے۔ ماروی کو محبوب کے ساتھ ملا دیا۔ چلو محبوب کو منزل مل گئی۔ اس کے صبر کا اچھا صلہ ملا ہے...... راہ نجات ایک زبردست کہانی تھی لیکن داؤد جیسے شخص سے مجھے سخت نفرت ہے۔ پہلے غلطی کرو پھر نادم ہو جاؤ بس...... ماریہ راہ راست پر لوٹ آئی۔ مجموعی طور پر کہانی اچھا تاثر چھوڑ گئی۔ عدل وانصاف وہی روایتی کہانی کچھ نیا نہیں تھا۔ اندھیرا ایک زبردست کہانی تھی۔ زیبو جیسی کئی لڑکیاں ہمارے معاشرے میں ہیں لیکن زیبو کا عقلمندانہ فیصلہ اچھا لگا۔ زہرہ اپنی ہی اولاد کے سامنے شرمندہ ہوئی۔ شعر وسخن میں ایم عمران جونانی کا تبصرہ دل کو چھو گیا۔'' (پسندیدگی کا شکریہ)

✠ **ناصر علی**، پشاور سے محفل میں شریک ہوئے ہیں ''18 دسمبر کو آخری پیپر سے فارغ ہو کر نکلا تو بازار میں سسپنس موجود تھا۔ اس بار سرورق زبردست تھا۔ حسینہ نئے سال کی خوشی منا رہی تھی اور ساتھ میں خوب صورت الفاظ کے ساتھ نیا سال مبارک نظر آیا۔ سرورق کو چھوڑ کر سیدھا دوستوں کی محفل میں پہنچا۔ صدارت کی کرسی پر سعدیہ بخاری نظر آئیں۔ اس کے بعد مرحا گل موجود تھیں تبصرہ کافی جاندار لگا۔ اس کے بعد طاہرہ گلزار موجود تھیں۔ تبصرہ کافی مفصل اور جاندار لگا۔ سید عبادت کاظمی آپ سرورق کی حسینہ کو اتنے غور سے دیکھ لیتے ہو کہ اس کے دل کا حال معلوم کر لیتے ہو۔ سب سے پہلے شیش محل سے اسٹارٹ کیا۔ کہانی اچھی جا رہی ہے۔ فاروق نے دل پر پتھر رکھ کر چاند بانو کو فلم میں کام کرنے کی اجازت دے دی۔ دوسری طرف جولیٹ بھی انتقام کی آگ میں جل رہی ہے۔ اگلی قسط کا شدت سے انتظار ہے۔ اس کے بعد ماروی پڑھی۔ اتنی خاص نہیں ہے۔ آخری صفحات پر راہ نجات پڑھ کر مزہ آ گیا۔ زبردست اسٹوری ہے۔ مجھے اس کہانی میں سلمان کا کردار اچھا لگا۔ بیگ صاحب کی عدل وانصاف بھی اچھی رہی۔ بڑی خوب صورتی سے کیس کو حل کر دیا۔ محفل شعر وسخن میں مرحا گل، رمنا گل، رضوان تنولی، معراج محبوب عباسی کے شعر پسند آئے۔ کترنوں میں محمد جاوید احسان سحر کی کترنیں اچھی تھیں۔'' (لیجیے جناب آپ کا خط بھی شاملِ محفل ہوا...... اب تو خوش ہیں نا!)

✠ **محمد صفدر معاویہ**، خانیوال سے چلے آ رہے ہیں ''2016ء کا پہلا شمارہ 16 دسمبر کو کراچی میں مسرور بیس پر ملا۔ آہ...... ایک سال گزر گیا۔ ان ننھے منے پیارے پیارے بچوں کی شہادت کو...... یہ انسانیت سوز واقعہ جب اخباروں اور نیوز چینل پر دہرایا جاتا ہے تو دل پر خون کے آنسو گرتے ہیں۔ آخر کیا قصور تھا ان معصوم پھولوں کا؟ سلام ان والدین پر جو عزم اور حوصلے کی چٹان بنے ہوئے ہیں۔ سرورق کو مبارک باد اور ایک بہت ہی خوب صورت آنکھوں والی ماڈل سے سجایا گیا۔ بہت ہی پرفیکٹ سرورق ہے۔ تحریروں کے ناموں کو بھی بہت خوب



صورت طریقے سے پیش کیا گیا۔ بادشاہ گر میں جون ایلیا محترم نوکر شاہی کے متعلق بتاتے نظر آئے کہ حکومت کو ہمیشہ وزیر مشیر ہی چلاتے نظر آئے ہیں۔ آپ کا اداریہ پڑھا۔ آپ قوم کو نئے سال کی مبارک کے ساتھ سیاسی میدان میں منتخب ہونے والے ارکان کو ایمان داری سے کام کرنے یا صرف ترغانے کے متعلق بتاتے ہوئے آخر صحیح کہا کہ ایک فرد سے نہیں کڑی سے کڑی ملا کر ہی ان مسائل کے بھنور سے نکلا جاسکتا ہے۔ سعدیہ بخاری صاحبہ محفل میں اس سال کی سرفہرست صدارت کی امیدوار بنیں بہت عمدہ تبصرہ تھا، مبارک ہو اور شاید آپ کا تبصرہ پڑھتے ہوئے ایڈیٹر کی زنگ آلود قینچی ٹوٹ گئی ہوگی ہاہاہا۔ (ارے ارے قینچی تو سلامت ہے مگر سعدیہ نے کمال کردیا) اس دفعہ کمال ہوگیا۔ وزیراعظم اور جنرل سیکریٹری بھی خواتین اپنے بہت عمدہ تبصروں کے ساتھ بنیں۔ ادریس احمد خان کی بہت خوب صورت حاضری تو سید عبادت کاظمی کی عمدہ تبصرہ نگاری۔ زرین آفریدی کو سسپنس میں ویلکم کرتے ہیں۔ میرے شہر خانیوال کے باقی دوست کدھر رہ گئے ہیں، حاضری دو محفل میں۔ کہانیوں میں انٹر ہوئے تو سب سے پہلے شیش محل پڑھی۔ ایک لفنگے کا ہاتھ زخمی ہونے کے علاوہ لڑائی کی بچت رہی۔ ڈاکٹر نے ڈسچارج کردیا فاروق کو اور دادا اس کو لے کر شملہ جارہے ہیں۔ جولیٹ کی فاروق سے ملاقات نہ ہوئی پر اس نے کمال اداکاری سے جانی سے چاتو لیا۔ عمدہ رہی یہ قسط۔ پھر ماروی پڑھی یقین تو نہیں آیا کہ مرینہ مرگئی لو جی مراد کی قسمت کھل گئی۔ گدھا ریڑھی سے شروع ہوکر بادشاہ سلامت بن بیٹھا۔ الیاس سیتاپوری کی پارسائی کا خمار بھی عمدہ رہی لیکن برہان الدین کا کردار بہت برا رہا، وہیں اعتماد خان نے بہت بڑی قربانی دے کر اپنی وفاداری کا ثبوت دیا۔ اس دفعہ بس یہی تین کہانیاں پڑھی ہیں کیونکہ میں 22 دسمبر کو گھر جارہا ہوں تو اس لیے رکھ دیا کہ باقی ٹرین کے سفر میں پڑھیں گے، وقت اچھا گزرے گا۔'' (آئیڈیا برا نہیں...... سسپنس تو ہے ہی آپ کا ساتھی)

✠ **بشیر احمد بھٹی**، فوجی بستی بہاول پور سے تبصرہ کررہے ہیں ''2016ء نئے سال کی آپ کو مبارک باد۔ میں آپ کا مشکور ہوں۔ اکتوبر 2015ء کے جاسوسی ڈائجسٹ کے کم صفحات کا میں نے خط لکھا اور فوراً ہی آپ کی جانب سے مجھے مکمل صفحات والا جاسوسی مل گیا۔ جناب محی الدین نواب صاحب کی سلسلہ وار کہانی ماروی نئے نئے رنگ دکھلا رہی ہے۔ جناب محی الدین نواب صاحب زبردست رائٹر ہیں۔ کبھی کبھار ان کی کہانی میں سسپنس پر گرفت ڈھیلی پڑ جاتی ہے۔ ان کی باتیں، مکالمے پڑھ کے احساس ہوتا ہے۔ وہ واقعی معاشرے کے جراح ہیں۔ ایک بار پھر ان سے استدعا ہے۔ دیوتا جیسی کوئی ہنگامہ خیز کہانی کی ابتدا کر کے ماضی کی یادیں تازہ کردیں۔''

✠ **انجینئر سعید اقبال بھٹی**، گلبرگ لاہور سے تشریف لائے ہیں ''آپ کا جنوری 2016ء کا خوب صورت کہانیوں کا مجموعہ پڑھا۔ عید میلادالنبی ﷺ کی چھٹیوں کی وجہ سے جلد ہی اچھی اچھی کہانیاں پڑھ لیں۔ ٹائٹل کور کی خوب صورتی کا کیا کہنا۔ ستواں ناک، آنکھوں اور دانتوں کی چمک نے محترمہ کا حسن سہ بالا کردیا۔ جو کہانیاں دل کو لگیں۔ پارسائی کا خمار، اصل شوبزنس، عدل وانصاف، ماروی، شمس عرفان اور راہ نجات اور محفل شعروسخن کے ساتھ کترنیں۔ میری رائے کے مطابق سید عبادت کاظمی کا شعر نمبر 1 اور مرزا طاہرالدین بیگ کا شعر نمبر 2 پر آنا چاہیے تھا۔'' (آپ نے جتنے اشعار بھیجے ہیں ان میں غلطیاں ہیں۔ اس کے علاوہ آپ الگ صفحے پر اشعار واضح تحریر کریں۔ شکریہ)

✠ **اشفاق شاہین**، کراچی سے محفل میں شریک ہیں ''نئے سال کی نسبت سے سرورق بہت عمدہ تھا۔ انشائیے سے ہو کر اپنی محفل میں پہنچے جہاں سعدیہ بخاری سب سے پہلے براجمان تھیں۔ سعدیہ، مرحا، طاہرہ، زرین، عمران جونانی اور قدرت اللہ کے خطوط بہترین تھے۔ حاجی زاہد کی بات سے اتفاق کرتا ہوں کہ محی الدین نواب صاحب ماروی کے ساتھ بالکل بھی انصاف نہیں کررہے۔ شیش محل سسپنس کی پہچان بنتی جارہی ہے، اس بار کہانی سست رہی لیکن دلچسپی سے بھرپور تھی۔ ماروی میں بالآخر محبوب کی مراد پوری ہو ہی گئی اور مراد بھی کہاں سے کہاں پہنچ گیا۔ آخری صفحات کی کہانی راہ نجات ناہید سلطانہ اختر نے حساس موضوع چنا۔ ماریہ، ڈیوس کے کردار بڑے جاندار تھے، کاش تھوڑا سا داؤد اپنی بیٹی کو لاتوں کے بجائے باتوں سے بھی سمجھاتا تو اور اچھا لگتا۔ الیاس سیتاپوری کی تاریخی کہانی پارسائی کا خمار معلومات سے مزین بہترین تحریر تھی۔ اچھی لگی۔ کاشف زبیر نے اصل شوبزنس متاثر کن انداز میں لکھا۔ پسند آیا۔ آخری بار بھی سسپنس بھری بہترین تحریر تھی۔ ویری گڈ تنویر ریاض۔ عدل وانصاف مرزا امجد بیگ اس بار معمول سے ہٹ کر کیس لائے، بہرحال اچھا لگا۔ اندھیرا مختصر کہانیوں میں اس بار کی بہترین کہانی رہی۔ خصوصاً اس میں زیبو کا کردار۔ اشعار کا انتخاب بھی خوب تھا۔ خصوصاً ناہید اختر، ثنا اور وقار حسن کا انتخاب لاجواب تھا۔''

✠ **مرزا طاہرالدین بیگ**، میرپور خاص سے تبصرہ کررہے ہیں ''جنوری کا سسپنس اور بازیگر اور جون ایلیا صاحب نے جمہوریت کا جو نقشہ بنایا ہے، بہت خوب ہے۔ آپ کے خط میں سعدیہ بخاری سرفہرست اور مرحا گل دوسرے نمبر پر، تبصرے دونوں کے لاجواب رہے ویلڈن۔ آگے چلتے ہیں، پارسائی کا خمار الیاس صاحب کی اچھی معلوماتی تحریر۔ برہان کا انجام جیسی کرنی ویسی بھرنی۔ اب آئندہ الیاس صاحب کیا لے کر آتے ہیں انتظار کرو۔ سلیم انور صاحب کی کہانی بھید بہت خوب صورت کہانی۔ پڑھ کر محمود اور ایاز بہت یاد آئے۔ ایاز کے پاس بھی ایک صندوق تھا اور اس میں کیا تھا تاریخ میں درج ہے۔ زبیر صاحب کا اندھیرا اس کہانی کے کردار اب بھی آپ کو ضرور ملیں گے۔ ظفر کا کردار کسی گلی کے نکڑ اور کسی گلی کے اندر دلچسپ اور سبق آموز معاشرتی کہانی۔ ثمر عباس کی کہانی لا ٹیگل زبردست رہی۔ خوب صورت انداز سے انگریزی ادب سے ترجمہ کیا۔ باقی رقم کہاں ہے مسٹر اسٹل مونٹ...... اب مسٹر اسٹل مونٹ کے پاس جواب

دینے کے لیے بچا ہی کیا تھا۔ مرزا امجد بیگ صاحب ایک بار پھر بازی لے گئے اور عدل و انصاف کا بول بالا ہوا مجرم کتنا ہی شاطر کیوں نہ ہو... انصاف دلانے والے مخلص ہونا چاہئیں۔ اب سسپنس کے صفحات پر ناہید سلطانہ اختر کی راہ نجات۔ معاشرتی، سماجی اور بہترین کہانی۔ ایسی کہانیاں سسپنس کے قد میں اضافہ کرتی ہیں ماریہ اور ڈاڈا نہیں عبدالرافع انجام لاجواب، بہت ہی عرصے تک یاد رکھا جائے گا۔''

عبدالجبار رومی انصاری، چوہنگ سٹی، لاہور سے چلے آ رہے ہیں ''نیا سال شروع ہو چکا ہے۔ سب کو بہت بہت مبارک ہو۔ جنوری کا شمارہ نئے سال کی مبارک باد دیتے ہوئے ستاروں کے جھرمٹ میں خوب صورت خدوخال لیے دوشیزہ کی دل آویز مسکراہٹ کے ساتھ ملا۔ انشائیہ میں جون ایلیا کی بادشاہ گری بہترین تحریر تھی لیکن ہمارے ملک میں شاید عوام جمہوریت سے واقف نہیں ہیں اور نہ انہیں اپنی طاقت کا اندازہ ہے۔ بے چاری عوام صبر و تحمل کے ساتھ بلا چون و چرا کیے بادشاہ گروں کا بوجھ اٹھاتی ہے اور جمہوریت اس کا نام تو نہیں ہے نا۔ ادارے کی سنجیدہ باتیں ہر شہری کے لیے قابل غور ہیں اور سب کو چاہیے کہ اپنے طور پر اپنے رویوں کو ٹھیک کریں۔ اپنے نظام میں تبدیلی لائیں۔ سعدیہ بخاری، مرحا گل اور طاہرہ گلزار تینوں کو ایک ساتھ آنے پر ڈھیروں مبارک ہو۔ بہت اچھا لگا۔ سعدیہ بخاری کا ملکی حالات پر باخبر تبصرہ عمدہ لگا۔ مرحا گل کا بھی تفصیلی انداز تحریر بے حد اچھا تھا اور طاہرہ گلزار کی سسپنس سے محبت بھی لاجواب ہے اور بھی بھی خاموش قاری بھی اپنی خاموشی توڑتے ہیں تو کمال کا تبصرہ کرتے ہیں جیسے زرین آفریدی نے پہلا تبصرہ لکھا اور بہت اچھا لکھا۔ ویلکم زرین، لکھتی رہا کریں۔ شیش محل بھرپور تجسس لیے رواں دواں ہے۔ چاند بانو اور جولیٹ اپنی اپنی لگن میں لگی ہیں۔ دیکھیں جولیٹ دلدار آغا کے خلاف کیا ایکشن لیتی ہے اور فاروق دل پہ جبر کیے ربن دادا کے ساتھ شملہ روانہ ہو چکا ہے۔ ماروی میں نگار خانم نے پچھلی قسط میں مراد منگی کی جستجو کی تو اس دفعہ مراد طیارہ ہائی جیک ہونے پر اسی کے ملک پہنچ گیا۔ طیارے میں فائٹنگ تو زبردست رہی اور پھر نگار خانم کی امید بھی بر آئی آسانی سے مراد کی منکوحہ بن گئی۔ مرزا امجد بیگ کی ہر بار کی طرح کامیاب جرح نے کیس کو جیت ہی لیا اور عدل و انصاف کی اہمیت کو اجاگر کر دیا۔ بہترین اسٹوری تھی۔ رنگت کالی ہی سہی مگر وہ بہت سوں سے اچھی تھی۔ زیبو نے لوگوں کے کالے کرتوتوں سے سبق حاصل کر لیا تھا اور وہ گمراہ کن اندھیرا اپنی زندگی میں نہیں لانا چاہتی تھی۔ بزرگوں کا قول ہے دوست زیادہ سے زیادہ بناؤ اور دشمن کم سے کم بناؤ لیکن گجرات کے بادشاہ محمود نے غلطی کی اور برہان الدین کو دوست نما دشمن بنا کے چھوڑ دیا جس نے اپنے انتقام کے لیے محمود کی جان لے لی۔ لیکن اپنی پارسائی کے خمار کے زعم میں خود برہان الدین بھی ذلیل ہو کر موت سے دوچار ہوا۔ تاریخی کہانی زبردست رہی۔ ایک خدا کی محبت اور ایمان کی روشنی میرے دل میں گھر کر چکی ہے ڈیوس اور پھر اسلام کی روشنی میں ڈیوس بھی عبدالرافع بن کر ماریہ کے ساتھ ہو گیا۔ جو کام داؤد نہ کر سکا، وہ اس کی بیٹی نے کر دکھایا۔ بے شک جسے راہ ہدایت ملنی ہوتی ہے اللہ کی طرف سے اس کے لیے ویسے حالات پیدا ہو جاتے ہیں۔ راہ نجات ناہید سلطانہ اختر کی اس شمارے کی بہترین کہانی ہے۔ شمس عرفان اللہ کے ولی قادر بخش کے حالات و واقعات بہت دلچسپ رہے۔ محفل شعر و سخن میں قاری محمد رمضان، اللہ نواز افق اور زرین آفریدی کے شعر اچھے لگے اور کترنوں میں محمد ریاض، احسان سحر اور محمد جاوید کی کام کی باتیں اچھی لگیں۔''

رمضان پاشا، گلشن اقبال، کراچی سے خوب صورت تبصرے کے ساتھ حاضر ہیں ''سرورق نہ صرف دلکش تھا بلکہ نئے سال کے پہلے شمارے کے شایان شان بھی تھا البتہ فہرست میں کوئی جدت نہیں تھی۔ انشائیہ ہمیشہ کی طرح سچ بیانیوں پر مبنی تھا۔ خطوط کی محفل میں آپ کا اداریہ خوب تھا۔ یہ بھی سچ بیانیوں پر مبنی تھا۔ ایک جملے پر ہنسنے پر مجبور بھی ہوا (اچھا! وہ کیا تھا بھلا؟) محفل میں اول نمبر پر آنے والی محترمہ سعدیہ بخاری کو مبارک باد۔ موصوفہ کا تبصرہ بھی دل کو بھایا اور اب کہانیوں پر تبصرہ۔ اصل شو بز کس انتہائی انوکھی اور منفرد کہانی تھی، خوب لطف آیا۔ شیش محل ماہ بہ ماہ اس کہانی میں سسپنس اور تجسس بڑھتا جا رہا ہے، خدا شیش محل کو نظر بد سے بچائے۔ آخری بار میں میری دلچسپی کا سامان تھا اس لیے کہانی اچھی لگی۔ عدل و انصاف اس بار حسام بٹ کی کہانی کافی گنجلک تھی۔ پھر بھی مرزا امجد بیگ کیس جیت گئے، وہ ہارتے ہی نہیں۔ محاسبہ بالکل بور کہانی تھی۔ سسپنس میں نئے نئے قلم کار داخل ہو رہے ہیں، یہ ایک خوش آئند عمل ہے۔ خاص کر محترمہ رضیہ محبوب کی آمد بہت خوش گوار لگی۔ ساتھی ہی بہت سی مصیبتیں لے کر آگئیں کیا خوب۔ ماروی رفتار میں تیزی آگئی، لطف بڑھتا جا رہا ہے۔ لانجل کہانی اسم بامسمیٰ تھی اور بہت ہی مزیدار تھی۔ راہ نجات ایسی کہانی تھی کہ کافی عرصے یاد رہے گی۔ اشعار کی محفل میں ماہا ایمان، سجاد علی اور مہوش علی کے اشعار پسند آئے۔ کترنیں بھی خوب تھیں۔''

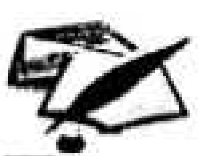
محمد قدرت اللہ نیازی، حکیم ٹاؤن خانیوال سے محفل کی زینت بنتے ہیں ''جنوری 2016ء کا شمارہ سرورق نئے سال کی مبارک سے مزین بروقت مل گیا۔ خوش باش حسینہ سال نو کی خوش امیدی کا استعارہ محسوس ہوئی۔ دعا ہے کہ نیا سال تمام عالم اسلام کے لیے خیر اور بھلائی کا ثابت ہو۔ اداریے میں مدیرہ صاحبہ ملک کے سیاسی حالات پر رائے زنی کرتی نظر آئیں پاکستان میں سیاست کو عیاری سے تشبیہ دی جاتی ہے اور کوئی عیار فائدہ اٹھا تو سکتا ہے فائدہ دے نہیں سکتا۔ کرسی صدارت پر شوخ و چنچل سعدیہ بخاری نامی خاتون براجمان تھیں۔ جن کی شوخیاں، شوخیاں کم اور بونگیاں زیادہ تھیں۔ بہرحال صدارت مبارک ہو۔ تبصرہ کافی عرق ریزی سے لکھا گیا اور یقیناً کافی محنت کی ہو گی آپ نے۔ وزارت پر بھی صنف نازک کا قبضہ رہا۔ مرحا گل نام نیا لیکن تبصرہ منجھے ہوئے تبصرہ نگاروں جیسا لگا۔ اپنی صنف کے غیاب پر محترمہ افسردہ نظر آئیں۔ بھئی گھر کے کام بھی تو کرنے ہوتے ہیں انہوں نے، اس لیے اچانک غائب ہو جاتی ہیں۔ واہ بھئی واہ،



تیسرے نمبر پر بھی صنف نازک ہی قابض نظر آئیں۔ طاہرہ گلزار کے تبصرے میں شکایات کا تناسب اس بار کم رہا مگر گرج چمک جاری رہی۔ طاہرہ باجی میں آپ سے قطعاً ناراض نہیں ہوں۔ محمد قاسم رحمان! آپ نے محاورہ تو سنا ہوگا۔ ''آنکھ اوجھل، پہاڑ اوجھل'' اس لیے بھول جانے کا گلہ نہ کیا کریں۔ اپنی موجودگی کا احساس دلاتے رہا کریں یعنی تبصرہ لکھتے رہا کریں۔ (بالکل درست فرمایا...... ہم بھی یہی کہتے ہیں) ایم عمران جونانی! آپ کے تبصرے کی جولانی سے لگ رہا ہے کہ آپ نوآموز ہرگز نہیں ہیں۔ آپ کے تبصرے نے دل خوش کر دیا۔ محمد صفدر معاویہ! ماروی کے بارے میں آپ کا کمنٹ بہت زبردست لگا، جیتے رہو۔ تحریروں میں سب سے پہلے بلاشبہ شیش محل ہی پڑھی۔ جولیٹ کا جذبۂ انتقام پسند آیا۔ ربن دادا کی فاروق سے محبت کا انداز بھی نرالا رہا، میری طرح شاید ربن دادا نے بھی تاڑ لیا ہے کہ ماجد علی اور ساتھ موجود لڑکی گھر سے بھاگے ہوئے ہیں اور کسی خالہ پھپھو کے پاس نہیں جا رہے بلکہ چھپنے کے لیے جا رہے ہیں۔ آخری صفحات پر ناہید سلطانہ اختر کی راہ نجات بھی زبردست تحریر ثابت ہوئی۔ داؤد کے ایک احمقانہ فیصلے نے اسے دنیا و آخرت کے لیے ایک مستقل عذاب کا سبب بنا دیا۔ یہ تو اس کی خوش قسمتی کہ اللہ پاک نے اسے ہدایت دے دی۔ عائشہ، ماریہ اور ڈیوس کے قبولِ اسلام نے بھی دل باغ باغ کر دیا۔ ابتدائی صفحات پر الیاس سیتاپوری کی تحریر پارسائی کا خمار پڑھتے ہوئے کسی مصنف کا جملہ ذہن میں گونجتا رہا کہ متکبر عابد سے منکسر المزاج گناہ گار بہتر ہوتا ہے۔ برہان الدین کے فلسفے نے بہت بیزار کیا تو وہیں اعتماد خان کے فعل نے بھی کوفت میں مبتلا کیے رکھا۔ کاشف زبیر کی اصل شو بزنس حقیقت سے بعید ترین محسوس ہوئی۔ ثمر عباس کی لاانجل میں سلوین کیلسو نے اسٹل مونٹ کو کامیابی سے قربانی کا بکرا بنایا۔ مرزا امجد بیگ کی روداد عدل و انصاف ایک اور کامیاب کیس کی تفصیل تھی۔ تاہم انویسٹرز کے لیے یہ تحریر یقینی طور پر مفید ثابت ہوگی۔ زبیر سلیمانی کی اندھیرا تلخ حقائق پر نشتر زنی کرتی تحریر ثابت ہوئی۔ زیبو جیسے کئی کردار ہمارے معاشرتی سیٹ اپ کی وجہ سے گھروں میں پنپ رہے ہیں۔ رضیہ محبوب کی مصنبتیں بنگلا دیشی ادب سے شاید پہلا انتخاب تھا جو سسپنس کی زینت بنا یہ سلسلہ جاری رہنا چاہیے۔ محفل میں ادریس علی اور نورین گوجرانوالہ کے انتخاب پسند آئے۔ محمد جاوید علی پور کی کترنیں پسند آئیں۔''

✠ مسز صدیقی، گلشن اقبال، کراچی سے تبصرہ کر رہی ہیں ''سب سے پہلے نئے سال کی دلی مبارک۔ یہ سال کیونکہ ربیع الاول کے مبارک مہینے اور جمعے کے بابرکت دن سے شروع ہوا ہے، انشاء اللہ سب کے لیے محبت، خوشیاں، صحت و تندرستی اور سب کے لیے انتہائی مبارک ثابت ہوگا۔ سب سے پہلے تو عذرا بہن اور آپ کو ذیشان بیٹے کی شادی کی ڈھیروں مبارکباد، خدا کرے نیا سال اور ہمسفر دونوں کے لیے ہر روز، روز عید ہو، ہر شب، شب برات آپ کا چمن مہکتا رہے، بڑھتا رہے ثمہ آمین۔ (آپ کی نیک تمناؤں کا شکریہ) اب آپ کا بے حد شکریہ میرے خط کو اتنی اچھی طرح میرے پسندیدہ پرچے ہی میں چھاپ کر میرے لیے یادگار بنا دیا بہت بہت شکریہ۔ اب جنوری کے پرچے میں لوگوں نے محبت سے پسند کیا۔ میں بے انتہا شکر گزار ہوں، سعدیہ بخاری صاحبہ کی، مرحا گل، طاہرہ گلزار، زرین آفریدی صاحبہ کی۔ بیٹے عبدالغفور خان، محمد صفدر اور قدرت اللہ آپ سب نے جس محبت اور خلوص کا اظہار کیا، مجھے بہت زیادہ خوشی ہوئی۔ میں سب کے لیے دعاگو ہوں کہ خدا آپ سب کو دن دونی رات چوگنی خوشیاں عطا کرے۔ آمین۔ میری ایک چھوٹی سی التجا ہے کہ عذرا بہن اور آپ سال میں چار بار کسی بھی بہترین کہانی پر کچھ انعام رکھیں کیونکہ تعریف سے وہ خوشی نہیں ہوتی جو ایک چھوٹے سے انعام سے ملتی ہے۔ حضرت رابعہ بصریؒ کے قول کے مطابق ایک نیکی کا خدا دس کا اجر دیتا ہے اور یہ حقیقت بھی ہے، وہاں یہ چیزیں ہی کام آئیں گی۔ امید ہے میری عاجزی سے کی گئی یہ فرمائش پوری کر کے لکھاریوں کو اچانک سرپرائز دے کر لاکھوں دعائیں کمائیں گے۔'' (آپ کی تجویز نوٹ کر لی گئی ہے مسز صدیقی...... خوش رہیں)

✠ ڈاکٹر نعیم اکبر سحر، مانسہرہ ہزارہ سے تبصرہ کر رہے ہیں ''ابتدا سرورق سے کہ ذاکر انکل نے واقعی 2016ء کو تبدیلی کا سال قرار دیا ہے۔ گویا صنفِ وجاہت اور صنفِ نزاکت کو لگام ڈال کر جھگڑا ہی ختم کر دیا۔ فہرست میں دونوں خواتین ایسے گھور رہی تھیں جیسے بے چارے شوہر کو آپس کی سوکنیں۔ سادہ سی فہرست پسند آئی۔ جون ایلیا نے بادشاہ گر تحریر کیا۔ گویا تاریخ کے اس گوشے کو بے نقاب کیا جو ہمیشہ سرسبز و شاداب رہا ہے، رہے گا یعنی نوکر شاہی۔ آخری دو لائنیں آب زر سے لکھنے کے قابل ہیں کہ اس گروہ کو حد میں رکھا جائے۔ جمہوری معاشرے کے آداب سکھائے جائیں۔ یہی قوم کے لیے نسخۂ نجات ہے۔ حکمرانوں کے لیے حکمت یہی ہوگی کہ اپنے کندھوں پر رکھے ہوئے سر میں اللہ نے جو عقل عطا کی ہے اس کا مثبت استعمال کریں۔ آپ کے اداریے نے دل کے حساس تاروں کو چھیڑ دیا خصوصاً پاکستان آج بھی سرخرو ہو سکتا ہے مگر پہلے ہمیں اپنے رویوں اور نظام میں تبدیلی لانا ہوگی۔ مگر نظام کسی فردِ واحد کا نہیں بلکہ کڑی سے کڑی ملاتے ہوئے ایک پوری زنجیر کی درستگی کا نام ہے۔ ویسے انکل جب تک میں اس لائن میں کڑی سے کڑی ملاتے ہوئے پڑھتا رہا، بات سمجھ میں آئی ہی نہیں۔ نجانے کیا بات تھی؟ (گویا آپ کو زیر زبر پیش سبق پڑھنے کی ضرورت ہے) اٹک والی خاتون سعدیہ بخاری نے اطلاع دی کہ انکل اور آنٹی نے اپنے بیٹے کی شادی کر دی ہے، بہت مبارک ہو۔ مٹھائی ہم خود ہی خرید کر کھا لیں گے۔ (بہت شکریہ) پارسائی کا خمار! الیاس سیتاپوری کا شاہکار اپنے منہ میاں مٹھو کی داستان تھی۔ جس زمانے کی داستان تھی۔ اگر ساتھ ہی سن عیسوی یا سن ہجری کے حوالے ہوتے تو وہ کبھن دور ہو جاتا جو تحریر کی خوب صورتی کو لگا ہے۔ محمود شاہ ثانی بادشاہ! کیا ہمارے تمام بادشاہ بلکہ تقریباً تمام بادشاہ ایسے ہی رنگیلا صفت تھے۔ اصل شو بزنس کاشف صاحب لائے۔ واقعی انسانیت سوز تماشا کرنے والی وحشی قوم کا وحشت ناک چہرہ دکھایا۔ اسما قادری کا شیش محل بہت زبردست ہے۔ نئے زمانے میں پرانے زمانے کو اس طرح پیش کرنا گویا وہ ہماری آنکھوں کے سامنے ہے اور



اجنبیت بھی محسوس نہیں ہوتی۔ یہی تحریر کا اصل حسن ہے۔ اسما جی کے قلم کی جولانیاں قائم ہیں اور دائم ہیں یہ دل سے دعا گو ہوں۔ آمین۔ بیگ صاحب کی عدل وانصاف ہمارے معاشرے میں سرایت کر جانے والی کرپشن کی داستان تھی جسے پڑھ کر انسانیت کا سر شرم سے جھک جاتا ہے اور ہم بے وقوف عوام لالچ کے اس سنہرے جال میں ہمیشہ ہی پھنس جاتے ہیں۔ اللہ ہمیں عقل سلیم عطا فرما دے۔ آمین۔ زبیر سلیمانی صاحب کی اندھیرا میں اندھیرا تھا۔ ماں کا کردار اندھیرا۔ باپ کا کردار اندھیرا۔ بیٹی کو بھی اپنے کردار کے لیے اندھیرا پسند۔ شکر اللہ کا کہ زیبو کو بروقت سمجھ آئی اور اس کی آنکھیں کھل گئیں۔ محی الدین نواب صاحب کی ماروی میں اتفاقات کی بھرمار ہے۔ آخر میں راہ نجات جو کہ ناہید سلطانہ اختر صاحبہ جیسی کہنہ مشق لکھاری کی تحریر تھی۔ ان لوگوں کی داستان جو اپنے مرکز سے ہٹ جاتے ہیں اور اس وقت تک فطرت کے دھارے میں نہیں آسکتے جب تک اپنے مرکز سے ربط نہیں پیدا کر لیتے۔ تمام پڑھنے والوں سے گزارش ہے کہ ایک مرتبہ پھر راہ نجات کا مطالعہ کریں مگر سر کی آنکھوں سے نہیں دل اور روح کی آنکھوں سے۔ راہ نجات کا لطف دوبالا ہو جائے گا اور دوبارہ پڑھنے سے آپ کو راہ نجات ایک نئے ذائقے سے روشناس کرائے گی۔ کافی سال بعد قلم کا غذ تھاما تھا کہ رسم نبھالی جائے کہ موقع بھی ہے اور دستور بھی ہے کہ نئے سال کی آمد۔ میری جانب سے تمام پڑھنے والوں کو اور جاسوسی پبلی کیشن کے تمام اسٹاف کو نیا سال مبارک ہو۔'' (آپ کو بھی ڈھیر ساری خوشیاں نصیب ہوں)

✠ اطہر حسین، کراچی سے تبصرہ کر رہے ہیں۔'' سال نو کا سسپنس جگمگاتا ہوا ایک اسٹال پر دیکھا تو فوراً جھپٹ لیا۔ بہت ہی خوب صورت ٹائٹل تھا۔ حسینہ کی آنکھوں میں ڈھیروں خوشیوں کی چمک نمایاں تھی۔ ٹائٹل کے بعد محفل خطوط میں پہنچے تو صنف نازک کو نمبر 1 پر براجمان پایا۔ تبصرہ اچھا تھا اور واقعی نمبر 1 کا حق دار تھا۔ تمام دوستوں کے تبصرے اچھے ہوتے ہیں۔ اس کے بعد جون ایلیا کے بادشاہ گر سے مستفیض ہوئے۔ ہر لفظ ہر سطر میں اک سبق چھپا ہوا تھا۔ اگر ہمارے حکمران بھی دل کی گہرائی سے پڑھیں تو مشکل نہیں کہ تمام مسائل حل ہوتے دیر نہ لگے۔ اس کے بعد فہرست پر نگاہ دوڑائی اور شیش محل سے اسٹارٹ لیا۔ شیش محل بہت سلو اسٹوری ہے۔ مطلب کہانی تو اچھی ہے مگر بہت سست رفتاری سے آگے بڑھ رہی ہے۔ اسما جی سے گزارش ہے کہ ٹیمپو تیز کریں۔ ادھر ماروی کچھ خاص مزہ نہیں دے پا رہی۔ حالانکہ کہانی کا اسٹارٹ بہت اچھا ہوا تھا۔ اس ماہ کی سب سے اچھی کہانی اصل شو بزنس لگی۔ جس میں کھیل کھیل میں رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ بہت اچھا لکھا کاشف زبیر نے۔ ناہید سلطانہ اختر کی راہ نجات اچھی کہانی تھی۔ تنویر ریاض کی آخری بار بھی زبردست کہانی تھی۔ جیمن نے اپنی زندگی کا آخری نیک کام قتل کی صورت کیا مگر اسے بعد میں پتا چلا کہ اس کی زندگی ابھی باقی ہے اور اس نے قتل کر کے غلط کام کر دیا ہے۔ اسے احساس ندامت ہوا اور اس نے خود کو پولیس کے حوالے کر دیا۔ الیاس سیتاپوری کی پارسائی کا خمار تاریخی پہلوؤں کو آگاہ کرتی بہترین کہانی تھی۔ مرزا امجد بیگ کی عدل وانصاف گزارے لائق تھی۔ سلیم انور کی بھید بہت عمدہ تھی۔ دیکھا جائے تو اس دفعہ بڑی کہانیوں سے زیادہ چھوٹی کہانیوں نے مزہ دیا۔ مجموعی طور پر شمارہ بہتر تھا۔ شمس عرفان میں ایمان افروز واقعات پڑھ کر اچھا لگا۔''

✠ حنا عروج، کورنگی، کراچی سے تشریف لائی ہیں'' جنوری کا شمارہ اپنے دیدہ زیب رنگوں کے ساتھ ہمارے ہاتھوں میں ہے۔ سرورق کی حسینہ اگر چہ اب کم کم ہی متاثر کرتی ہے مگر اس بار آنکھوں کے ساتھ ساتھ دل کو بھا گئی...... جون ایلیا کی تو خیر کیا ہی بات ہے۔ لفظ لفظ موتی دل کی آنکھوں سے پڑھنے کے لائق ہے۔ اگر حکمرانوں کے ساتھ ساتھ عوام کے دل میں بھی گھر کر لے تو ہمارے معاشرتی نظام اور رویوں میں نمایاں فرق آ جائے۔ تاریخی صفحات نے ہمیشہ سسپنس کی ایک الگ شناخت بنائی ہے۔ اس بار بھی پارسائی کا خمار پڑھ کر ماضی کے اوراق سے آگاہی ہوئی۔ کاشف زبیر کی اصل شو بزنس نے تو اس بار رونگٹے کھڑے کر دیے۔ کیا کوئی اتنا خونی کھیل بھی کھیل سکتا ہے۔ شیش محل نے تو اسما قادری کے گراف میں اضافہ کر دیا ہے۔ قاری کو ایسی ہی تحریروں کا انتظار رہتا ہے جس کے بارے میں مزید جاننے کا تجسس برقرار ہے۔ بہت اچھا لکھا اسما جی آپ نے...... تنویر ریاض کی آخری بار نے بھی لطف دوبالا کر دیا۔ مرزا امجد بیگ کا احوال عدل وانصاف میں حسام بٹ نے بھی اچھا لکھا۔ صحیح بات ہے اگر انصاف عدالتوں میں بھی نہ ملا تو کہاں ملے گا۔ مگر آج کل کے وکلا کہاں ان باتوں کا خیال کرتے ہیں۔ بھید سلیم انور نے مختصر سی مگر اچھی کہانی لکھی۔ محفل شعر وسخن میں ہر شعر دل میں اترتا محسوس ہوتا ہے۔ ماشاء اللہ بہت اعلیٰ انتخاب ہوتا ہے۔ اندھیرا میں زبیر سلیمانی نے معاشرے کی ایک خوف ناک جھلک دکھلانے کی کوشش کی۔ اچھی کہانی تھی۔ ماروی میں اب نواب صاحب کبھی کبھی بور کرنے لگتے ہیں۔ مانا کہ انسان ہمت کے بل پر بڑے بڑے کام کر جاتا ہے مگر اس سے بڑھ کر سوچنا مشکل ہو جاتا ہے۔ لیکن ایسا بھی نہیں ہے کہ دلچسپی برقرار نہ رہے۔ بس کبھی کبھی اوور ہو جاتا ہے۔ رضیہ محبوب نے بنگلا دیشی ادب سے انتخاب کیا۔ اچھا لکھا۔ شمس عرفان میں ضیا تسنیم بلگرامی نے ہمیشہ کی طرح بہت عمدہ لکھا۔ لائنجل ثمر عباس کی اچھی کاوش رہی۔ راہ نجات کی تو کیا ہی بات کی جائے۔ جتنی تعریف کروں کم ہو گی۔ برسوں یاد رہ جانے والی تحریر ہے۔ ناہید سلطانہ اختر جی ویلڈن...... عبرت بھی اور ہدایت بھی...... بہت خوب صورت انداز میں تحریر کیا۔''

اب ان قارئین کے نام جن کے نامے محفل میں شامل نہ ہو سکے۔

راشد حبیب تابش، چھب، ضلع اٹک۔ کمال انور، کراچی۔ اظہر علی، راولپنڈی۔ جنید احمد ملک، کراچی، حبیب اللہ، اسلام آباد۔ مہوش ناز، لاہور۔ محمد اقبال، کراچی۔ محسن رضا، حیدرآباد۔ آسیہ محبوب، لاڑکانہ۔ انجم اشفاق، ملتان۔ نازیہ حسن، اسلام آباد۔ تحریم فاطمہ، کراچی۔ شاکر لطیف، لاہور

ترکان شاہ کروٹیں بدل بدل کر تھک چکی تھی۔ کسی کے انتظار میں آنکھیں جل رہی تھیں۔ پھر آنے والے لمحے نے دروازے پر دستک دی۔ گویا اس نے اپنے وقار کو دستک دی اور سائے کے سامنے تن کر کھڑی ہوگئی۔ سایہ بولنے لگا۔ جو اطلاع سامنے آئی، وہ کسی زلزلے سے کم نہیں تھی۔ جو اندیشے کئی دن سے اس کے ذہن میں سر اٹھا رہے تھے، اب اس کے سامنے حقیقت بن کر کھڑے تھے۔

''تو نے اچھی طرح سنا ہے یا انعام کے لالچ میں اپنے دل کو زبان بنا رہی ہے۔''

''میں غدار ضرور ہوں کہ اپنے مالک سے غداری کر رہی ہوں لیکن جھوٹی نہیں ہوں۔ مجھے بادشاہ سلامت نے کسی کام سے اندر بلایا تھا۔ شہزادی حضور بھی وہیں تشریف فرما تھیں۔ یہ الفاظ اسی وقت میرے کانوں سے ٹکرائے تھے۔''

''تو نے اور کیا کیا سنا، مجھے تفصیل سے بتا۔''

''میں نے زیادہ کچھ نہیں سنا۔ صرف اتنا سنا۔ بادشاہ حضور فرما رہے تھے، میں گوالیار کی مہم پر جانے سے پہلے

ماضی کا آئینہ۔ بااختیار اور بے اختیار انسانوں کے عبرت اثر واقعات

سلطانہ

ڈاکٹر ساجد امجد

یہ خیال بہت قدیم اور مضبوط ہے کہ دنیا پر حکمرانی کرنا صرف اور صرف مرد کا حق ہے لیکن... یہ تو مقدر کی بات ہے کہ بادشاہت خود اپنے لیے کسے منتخب کرتی ہے... اور اس کا احساس اور یقین اس وقت ہوا جب التمش کی بیٹی سلطانہ کو قدرت نے اس اعزاز کے لیے منتخب کیا۔ جب کہ ولی عہدی کے لیے بیٹے موجود تھے... بس یہی وہ گھڑی ہوتی ہے جب قدرت کی ادا پر انسان حیران رہ جاتا ہے... بات تخت و تاج کی ہو اور وارث موجود ہو مگر یہ شان و شوکت وراثت کے لیے اپنی سمت تبدیل کرلے تو کیسے جنگ و جدل اور محلاتی سازشوں کا بازار گرم نہ ہو... سلطانہ کو بھی بے شمار آزمائشوں کا سامنا تھا۔ پابندِ سلاسل ہو کر بھی اس صنفِ نازک نے تمام نازک اداؤں، خوابوں اور خواہشوں کو بالائے طاق رکھ دیا... اسے یاد رہا تو فقط عوام کی فلاح و بہبود کا عمل اور باپ کی نصیحتوں اور وصیتوں کا بھرم... پھر کیسے نہ مقدر اس کا ساتھ دیتا... تاریخ گواہ ہے کہ دیکھنے والے دیکھتے رہ گئے اور بادشاہت کا تاج سلطانہ کے سر پر سج گیا۔

تمہاری جانشینی کا اعلان کرنے والا ہوں۔ اس کے بعد مجھے باہر نکلنا پڑا تھا۔ میں وہاں اور زیادہ نہیں ٹھہر سکتی تھی۔"

"تو نے جو کچھ سنا میرے لیے وہی بہت ہے۔"

ترکان شاہ کا وقار اس کے قدموں میں پڑا تھا۔ وہ بے حس و حرکت کھڑی تھی۔ کنیزِ خاص اس امید پر قدم جمائے کھڑی تھی کہ اتنی بڑی خبر کے بعد بیش قیمت انعام اس کی مٹھی میں ہونا چاہیے۔

ترکان شاہ کا سکوت ٹوٹا تو اسے اپنا وعدہ یاد آیا۔ اس نے فیروزے کا ہار اپنی گردن سے اتار کر کنیز کی طرف اچھال دیا۔

"اگر یہ خبر جھوٹی نکلی تو میں اس ہار سمیت تیری گردن اتارلوں گی۔ اس لیے نہیں کہ اس خبر سے مجھے خوشی ہوئی ہے بلکہ اس لیے کہ میں جھوٹ بولنے والوں کو زندہ نہیں چھوڑتی۔"

کنیز سر سے پاؤں تک کانپ گئی۔ "بادشاہوں کے فیصلے بدلتے دیر نہیں لگتی لیکن مجھے یقین ہے کہ میں نے جو سنا وہی بتایا۔"

"میں ملکۂ ہند ہوں، ملکۂ عالیہ نہیں۔ اس لیے میرے فیصلے اٹل ہوتے ہیں۔ تو اب جا اور اپنی موت یا شاندار زندگی کا انتظار کر۔"

اس کے جاتے ہی ترکان شاہ نے خود کو بستر پر گرا لیا۔ اس کے ذہن میں تیز آندھیاں چل رہی تھیں۔ اس کے دماغ میں بادشاہ کے کہے ہوئے الفاظ گونج رہے تھے۔ سلطان التمش نے کبھی کہا تھا۔ "تمہارے بیٹے کے سوا کوئی دوسرا شہزادہ ولی عہد سلطنت نہیں بن سکتا۔" پھر اسے کنیز خاص کی زبان سے ادا ہونے والے الفاظ یاد آئے۔ "بادشاہوں کے فیصلے بدلتے دیر نہیں لگتی۔" وہ تڑپ کر اپنے بستر سے اٹھ گئی۔ "میں کم از کم یہ فیصلہ نہیں بدلنے دوں گی۔ میرا بیٹا شہزادہ رکن الدین ہی التمش کا جانشین ہے۔ وہی ولی عہد ہے۔ وہی بادشاہِ ہندوستان ہے۔ اس کے بادشاہ بننے کے بعد میں ملکۂ ہند سے ملکۂ عالیہ بن سکوں گی۔ میرے بیٹے کے ہوتے ہوئے سوتیلی بیٹی رضیہ کیسے حکمران بن سکتی ہے۔ ولی عہد تو بڑا بیٹا ہی ہوتا ہے۔ دیکھتی ہوں میرے بیٹے کا حق کون مارتا ہے۔" وہ اپنے آپ سے ہم کلام تھی۔ "یہ فیصلہ صبح تک کے لیے نہیں ٹالا جا سکتا۔ التمش میرا شوہر ہے۔ میں اس کی خلوت گاہ میں کسی بھی وقت جا سکتی ہوں۔ اسی وقت جاؤں گی اور اسے اس کا وعدہ یاد دلاؤں گی۔"

وہ خواب گاہ سے باہر آئی۔ دور کھڑے پہرے داروں نے گردنیں خم کر کے اس کی تعظیم کی۔ وہ چل نہیں رہی تھی، پاؤں پٹخ رہی تھی۔ وہ اسی عالم میں خلوتِ سلطانی کے سامنے پہنچ گئی۔

سلطان التمش اس وقت بھی اپنی بیٹی رضیہ سلطانہ سے محوِ کلام تھا۔ اسے کارِ سلطنت کے رموز، سیاست کے داؤ پیچ اور محل میں برپا سازشوں سے آگاہ کر رہا تھا۔

"میں وہ بدنصیب باپ ہوں کہ میرے دس لڑکوں میں کوئی بھی اس قابل نہیں کہ میری سلطنت میں دراڑیں ڈالے بغیر حکومت کر سکے۔ شہزادہ رکن الدین کی حرکتوں سے تم بے خبر نہیں ہو۔ بڑا بیٹا تو وہی ہے۔ ولی عہد اسی کو ہونا چاہیے تھا لیکن اسے شراب ہی سے فرصت نہیں۔"

"وہ آپ کا بیٹا ہے۔ اچھا تو یہی تھا......"

"مجھے معلوم ہے تم کیا کہنا چاہتی ہو۔ میں نے بھی بہت سوچا لیکن رکن الدین کی شراب نوشی نے مجھے اس کے خلاف سوچنے پر مجبور کر دیا ہے۔"

"مگر میں لڑکا نہیں ہوں بابا جان۔"

"تم جسمانی اعتبار سے لڑکی ہو لیکن عزم اور بہادری میں لڑکوں سے کم نہیں۔ کیا تمہیں یاد نہیں کہ ایک مرتبہ شکار کے دوران مجھ پر شیر نے حملہ کر دیا تھا۔ سب کھڑے منہ دیکھ رہے تھے اور تم نے تلوار کے ایک ہی وار میں شیر کا کام تمام کر دیا تھا۔ میں نے تمہاری تربیت لڑکوں کی طرح کی ہے۔ تم جنگی تربیت مکمل کر چکی ہو۔ تمہارے لیے میرا انتخاب غلط نہیں۔"

"یہ تو آپ کا انتخاب ہے لیکن آپ کے امراء کبھی اس فیصلے کو دل سے تسلیم نہیں کریں گے۔ کبھی ایسا نہیں ہوا کہ کسی عورت نے حکمرانی کی ہو۔"

"کس کی ہمت ہے، جو میرے فیصلے کے خلاف آواز اٹھائے۔"

"جب ہمتیں جواب دے جاتی ہیں تو سازشیں شروع ہو جاتی ہیں۔"

"تمہارا امتحان یہی ہوگا کہ تم ان سازشوں کو ناکام بناؤ۔"

"میں پھر بھی یہی کہوں گی کہ یہ حق میرے بھائیوں میں سے کسی کا تھا۔"

"یہ تمہاری سعادت مندی ہے لیکن میری خواہش یہی ہے کہ گوالیار مہم کے دوران جب تک میں دہلی سے باہر رہوں، میری جانشینی کا تاج تمہارے سر پر رہے۔"

رضیہ سلطانہ ابھی کوئی جواب دینے نہ پائی تھی کہ ترکان شاہ اجازت کی طلب گار ہوئی اور دوسرے ہی لمحے پاؤں پٹختی ہوئی کمرے میں داخل ہو گئی۔ اس کے تیور صاف بتا رہے تھے کہ وہ کسی اچھے ارادے سے نہیں آئی ہے۔ رضیہ سلطانہ سوتیلی ماں کے احترام میں اٹھ کر کھڑی ہو گئی۔

ترکان شاہ کی تیوری پر پڑے ہوئے بل اشارہ کر رہے تھے کہ اس کا یہاں بیٹھنا مناسب نہیں۔ اس نے باپ سے اجازت لی اور کمرے سے نکل گئی۔

''اب آپ کو آداب شاہی کا لحاظ بھی نہیں رہا۔'' سلطان التمش نے اس طرح دخل اندازی پر اسے ٹوکا۔

''آداب کا پاس دونوں طرف سے کیا جاتا ہے۔'' ترکان شاہ نے ایک اور گستاخی کی۔ ''جو کچھ میں نے سنا ہے، اس کے بعد مجھے یہاں آنا ہی تھا۔''

''آپ نے کیا سن لیا؟''

''آپ میرے بیٹے کو نظر انداز کر کے عنانِ سلطنت اپنی بیٹی کے ہاتھوں میں دے رہے ہیں۔''

یہ سنتے ہی التمش کچھ سوچنے پر مجبور ہوگیا۔ ابھی اس نے رضیہ کی جانشینی کا اعلان نہیں کیا تھا۔ پھر یہ بات ترکان شاہ تک کیسے پہنچ گئی؟

''میں نے ابھی باضابطہ اعلان نہیں کیا پھر یہ اطلاع آپ تک کیسے پہنچی؟''

''حق تلفیوں کی داستانیں دیواروں میں مقید نہیں رہتیں۔''

''کیا میں یہ سمجھ لوں کہ آپ کے پھیلائے ہوئے سازشوں کے جال میری خلوت گاہ تک آگئے ہیں۔''

''میں اپنے بیٹے کا حق مانگنے کے لیے کچھ بھی کر سکتی ہوں۔'' ترکان شاہ عاقبت نااندیشی میں گستاخی کی حدوں کو چھونے لگی۔

''ترکان شاہ، پاس ادب۔ میں تمہارا شوہر ہی نہیں اس مملکتِ خداداد کا حکمران بھی ہوں۔ رہا جانشینی کا مسئلہ تو یہ ہمیشہ کے لیے نہیں۔ میں صرف گوالیار کی مہم تک اپنی بیٹی کو اپنا جانشین مقرر کر رہا ہوں۔''

''یہی تو میں پوچھنے آئی ہوں کہ جب بیٹا ہے تو بیٹی کیوں؟ کیا صرف اس لیے کہ رکن الدین یا غیاث الدین میرے بیٹے ہیں؟''

''اب تم مجھے رموزِ مملکت سمجھاؤ گی؟ کس میں کیا صلاحیت ہے میں جانتا ہوں۔ میں بیٹے اور بیٹی میں فرق نہیں سمجھتا۔''

''آپ نے مجھ سے وعدہ کیا تھا کہ رکن الدین ولی عہد سلطنت ہوگا۔ کیا اب بادشاہ بھی اپنے فیصلے تبدیل کرنے لگے؟''

''فیصلے بادشاہ نہیں حالات کرتے ہیں۔ اب میں بھی بہتر سمجھتا ہوں کہ میری غیر حاضری میں رضیہ سلطانہ انتظامات سنبھالے۔''

ترکان شاہ نے کچھ اور کہنے کے لیے لب کھولے تھے کہ التمش نے اسے کچھ کہنے کے لائق نہ رہنے دیا۔

''میں نے تجھے لونڈی سے ملکۂ ہند بنا دیا۔ اگر تو اپنی حقیقت کی طرف لوٹنا ہی چاہتی ہے تو میں دیر نہیں لگاؤں گا۔ اس لیے بہتر ہے میرے کاموں میں دخل نہ دے۔ اور ہاں، اگر میری غیر حاضری میں تو نے کوئی ایسا ویسا قدم اٹھایا تو کوئی میرے غضب کو روک نہیں سکے گا۔ مجھے ایک ایک پل کی خبر ملتی رہے گی۔ اپنے جاسوسوں کو معطل کر دے، اپنے سازشی ذہن کو کچل دے۔''

ترکان شاہ کیسی ہی دلیر سہی، اس وقت وہ بادشاہِ ہند سلطان التمش کے سامنے کھڑی تھی اور بادشاہ کا غضب بھڑک اٹھا تھا۔ وہ ایک لفظ بھی نہ بول سکی۔ اسی میں عافیت جانی کہ اس کے سامنے سے ہٹ جائے مگر ایک مرتبہ وہ پھر شاہی آداب بھول گئی۔ کسی اجازت کے بغیر اٹھی اور کمرے سے نکل گئی۔

اس کے جاتے ہی التمش کا ذہن محل کی غلام گردشوں میں گردش کرنے لگا۔ وہ کون ہو سکتا ہے جس کی سماعت تک میرے الفاظ پہنچے ہوں اور اسی وقت ترکان شاہ تک پہنچا دیے گئے ہوں۔ وہ کون تھا جو کچھ دیر پہلے خلوت گاہ میں آیا تھا۔ میری کنیز کے سوا کوئی بھی تو نہیں۔ وہ معاملے کی تہ تک پہنچ چکا تھا۔ اس نے فوراً کنیز کو طلب کیا۔ کنیز دیکھ چکی تھی کہ ترکان شاہ کمرے میں داخل ہوئی اور پھر باہر نکلی۔ اس کے دل میں اندیشوں نے سر اٹھایا۔ کہیں اس کی چوری پکڑی تو نہیں گئی؟ اسے اپنے قدموں پر کھڑا رہنا دشوار ہوگیا۔ وہ کانپتے قدموں سے کمرے میں داخل ہوئی۔ اس نے سوچ لیا تھا کہ اگر اس سے پوچھا گیا تو وہ صاف انکار کر دے گی۔ التمش نے اس سے کچھ نہیں کہا۔ صرف اس کی شعلہ بار آنکھیں تھیں جو اس کا جائزہ لے رہی تھیں۔ وہ زیادہ دیر ان آنکھوں کی گرمی برداشت نہ کر سکی اور بے ہوش ہو کر گر گئی۔ کچھ پوچھنے کی ضرورت نہیں تھی۔ چوری پکڑی گئی، گویا چور نے اقرارِ جرم کر لیا تھا۔

محل کی دوسری کنیزیں جمع ہوگئیں۔ بادشاہ کے حکم سے کنیز خاص کی تلاشی لی گئی۔ فیروزے کا ہار اس کے گریبان سے برآمد ہوا۔

'یہ وہی رشوت ہے جو ترکان شاہ کی طرف سے اسے دی گئی ہوگی۔' التمش نے سوچا لیکن یہ راز کسی پر ظاہر نہیں ہونے دیا۔ وہ نہیں چاہتا تھا کہ کنیزوں کے سامنے ترکان شاہ بھی مجرم ٹھہرے۔ ''یہ جب ہوش میں آئے تو اس سے کہنا صبح ہونے سے پہلے محل چھوڑ کر کہیں چلی جائے۔ اسے اپنا مال ومتاع اپنے ساتھ لے جانے کی اجازت ہوگی۔ میں نہیں

چاہتا کہ کوئی میرے دروازے سے مفلس بن کر جائے۔''
فیروزے کا ہار التمش نے اپنے پاس رکھ لیا تھا۔

☆☆☆

ترکان شاہ ترکی لونڈی تھی جو التمش کی نظروں میں آ گئی۔ بادشاہ نے اسے زمین سے آسمان پر پہنچا دیا۔ اسے ترکان شاہ کا لقب ملا۔ ملکۂ ہندوستان کہلائی جانے لگی۔ التمش کی چہیتی تھی اس لیے دوسری بیگمات پر حکم چلانے لگی اور سب پر چھا گئی۔ بلا کی حریص اور عیار تھی۔ وہ اس عروج پر اکتفانہ کرسکی۔ اس کا بیٹا رکن الدین فیروز شاہ، بادشاہ کے بیٹوں میں سب سے بڑا تھا لہٰذا ولی عہد سلطنت اسی کو ہونا تھا۔ اس اعزاز نے ترکان شاہ کو مغرور کر دیا تھا۔ وہ خود کو ملکۂ عالیہ کہلانے کے لیے بہت تیز دوڑ رہی تھی۔ اس کا بس نہیں چلتا تھا کہ شوہر کو زہر دے کر بیٹے کو تخت پر بٹھا دے لیکن خود رکن الدین کا حال یہ تھا کہ بچپن ہی سے خود کو خراب کر بیٹھا تھا۔ جوان ہوتے ہی شراب کا رسیا ہو گیا، کنیزوں کی عزتیں اس کے ہاتھوں پامال ہونے لگیں۔ التمش دین دار اور متقی تھا۔ وہ ان حرکتوں کو برداشت نہیں کرسکتا تھا۔ اس نے اسے اپنی نظروں سے دور کرنے کے لیے بدایوں کا حاکم بنا کر بھیج دیا۔ جوں جوں التمش کی عمر بڑھتی جا رہی تھی وہ سوچنے لگا تھا کہ اس کے بعد امورِ سلطنت کون سنبھالے گا۔ وہ اپنے بیٹوں پر نظر ڈالتا تو پریشان ہو جاتا تھا۔ اس کے سارے بیٹے نالائق، عیش و عشرت کے دلدادہ اور احساسِ فرض سے ناآشنا تھے۔ ایک رضیہ سلطانہ تھی جس سے بڑی امیدیں تھیں۔ اس کی ذات میں وہ تمام خوبیاں تھیں جو ایک عاقل و عادل بادشاہ کے لیے ضروری ہوتی ہیں۔ دانش مندوں کو اس کے سوا کہ وہ ایک عورت ہے، کوئی اور عیب اس میں نظر نہ آتا تھا۔ باقاعدگی سے قرآنِ مجید کی تلاوت کرتی تھی۔ نماز روزے پر سختی سے کاربند تھی اور کم و بیش تمام مروجہ علوم و فنون میں دست گاہ حاصل تھی۔ اسی لیے جب وہ گوالیار کی مہم پر جانے کی تیاری کر رہا تھا تو اس نے رضیہ سلطانہ کو اپنا جانشین مقرر کر دیا۔

☆☆☆

ترکان شاہ اب ایک اور چال چلنے والی تھی۔ اس نے اپنے کمرے میں پہنچتے ہی وزیرِ اعظم نظام الملک کو طلب کرلیا۔ یہ رات اتنی طویل ہو گئی تھی کہ صبح کی پہلی کرن کسی کونے میں چھپ گئی تھی۔ چالوں پر چالیں چلی جا رہی تھیں اور رات تھی کہ ختم ہونے کا نام نہیں لے رہی تھی۔

کسی طرح یہ ظاہر نہیں ہو پایا تھا کہ نظام الملک اور ترکان شاہ پہلے سے ملے ہوئے تھے لیکن اس ناوقت اسے طلب کرنے سے تو یہی ظاہر ہوتا تھا کہ وہ بھی ترکان شاہ کے دماغ ہی کا ایک حصہ تھا۔

رات گئے کی اس طلبی پر نظام الملک سخت پریشانی کے عالم میں ترکان شاہ کی خدمت میں حاضر ہوا تھا اور ترکان شاہ کو اپنے سے بھی زیادہ پریشان دیکھ کر چونک گیا تھا۔

''ملکۂ ہند! اس پریشانی اور ناوقت طلبی کا سبب پوچھ سکتا ہوں؟ یہ سبب بھی اس لیے کہ بندہ خود پریشان ہے۔''

''اگر پریشانی نہ ہوتی تو ہم تمہیں طلب ہی نہ کرتے۔ مجھے یہ بتاؤ کہ تمہیں عورت کی غلامی قبول ہے؟ اس کے سامنے گردن خم کیے کھڑے رہنا گوارا ہے؟''

''میں آپ کی بات کا مفہوم نہیں سمجھا۔''

''میں تمہیں یہ اطلاع دے رہی ہوں کہ شہزادی رضیہ سلطانہ مستقبل کی حکمران ہند بننے والی ہے۔''

''یہ کیسے ممکن ہے۔ وہ ایک ناپختہ عورت ہے۔ عورت کی حکمرانی کسے گوارا ہوگی۔ وہ بھی اس حالت میں کہ شہزادہ رکن الدین اور اس کے بعد غیاث الدین موجود ہیں۔ معزالدین بھی موجود ہے۔''

''بات کو رکن الدین اور غیاث الدین تک محدود رکھو کیونکہ وہ میرے بیٹے ہیں۔ حقِ حکمرانی رکن الدین کا ہے نہ کہ رضیہ سلطانہ کا۔''

''مجھے یہ سمجھائیے کہ یہ بات چلی کہاں سے؟ آپ کو یہ اطلاع فراہم کہاں سے ہوئی کہ رضیہ سلطانہ کو ہند کی سلطنت دی جا رہی ہے جبکہ بادشاہ سلامت ابھی حیات ہیں؟''

''وہ گوالیار کی مہم پر روانہ ہو رہے ہیں اور اپنی غیر حاضری میں رضیہ سلطانہ کی جانشینی کا اعلان کرنے والے ہیں۔''

''جانشینی تو عارضی عمل ہے۔''

''اس عارضی عمل کو مستقل ہوتے دیر نہیں لگے گی۔ اگر تم لوگوں نے اس عمل کو بہ خوشی قبول کرلیا تو بادشاہ اس کی ولی عہدی کا اعلان کرنے میں دیر نہیں لگائے گا۔ رضیہ سلطانہ تمام ترک امراء سے ناخوش ہے لہٰذا اس کے تخت نشیں ہوتے ہی تم سب کی بھی خیر نہیں۔''

اس اطلاع پر نظام الملک کچھ سوچنے پر مجبور ہو گیا۔ یہ خبر کوئی اور نہیں ترکان شاہ پہنچا رہی تھی لیکن پھر یہ کانٹا نظام الملک کے دل میں کھٹک رہا تھا کہ ترکان شاہ پر بادشاہ کے ارادے ظاہر کیسے ہوئے؟ کہیں ایسا تو نہیں کہ یہ چالاک عورت بڑی خوب صورتی سے ہمیں بادشاہ کے مقابل لا کر اپنے مقاصد پورے کرنا چاہتی ہو؟

''ملکۂ محترمہ! آپ کو یہ کیسے معلوم ہوا کہ رضیہ سلطانہ کو جانشینی سونپی جارہی ہے؟ یہ بھی تو ہوسکتا ہے یہ اطلاع آپ تک غلط پہنچائی گئی ہو۔''

''سلطان سے میری خود بات ہوئی ہے۔ وہ بیٹی کی محبت میں اتنا سرشار ہے کہ رکن الدین کو موت کے گھاٹ اتار دے تو بعید نہیں۔''

''کیا یہ مناسب نہ ہوگا کہ ہم اس وقت تک انتظار کریں جب تک بادشاہ خود یہ اعلان نہ کردے۔''

''اس کے لیے تمہیں زیادہ انتظار نہیں کرنا پڑے گا۔ سلطان کو گوالیار کی طرف کوچ کرنے کی جلدی ہے۔ وہ پہلی فرصت میں دربار منعقد کرے گا۔''

''ہم سے جہاں تک ممکن ہوا، اس فیصلے کی مخالفت کریں گے۔''

''بس میں نے یہی بتانے کے لیے تمہیں طلب کیا تھا۔ اب تم جاؤ...... محل کے دروازوں پر صبح کی سپیدی دستک دینے والی ہے۔'' نظام الملک کو امید نہ ہو لیکن ترکان شاہ کو یقین تھا کہ صبح ہوتے ہی سلطان دربار منعقد کرے گا جس میں رضیہ سلطانہ کی جانشینی کا اعلان ہوگا۔'' وہ مجھے یہ موقع ہرگز نہیں دے گا کہ میں اس کے خلاف رائے عامہ کو ہموار کروں یا کوئی اور قدم اٹھاؤں۔'' اس کا اندازہ درست تھا۔

سلطان نے تمام امرائے سلطنت کو جمع ہونے کا حکم دیا۔ نظام الملک کے سوا اس وقت تک کوئی نہیں جانتا تھا کہ دربار کیوں منعقد ہورہا ہے۔ زیادہ سے زیادہ سب یہ سمجھ رہے تھے کہ سلطان نے گوالیار کی مہم کے بارے میں مشورے کے لیے طلب کیا ہوگا لیکن جب اس نے رضیہ سلطانہ کی جانشینی کا اعلان کیا تو سب ایک دوسرے کا منہ تکنے لگے۔ ایسا کبھی نہیں ہوا تھا کہ کوئی عورت تختِ شاہی پر قدم رکھے جبکہ سلطان کے بیٹے موجود تھے۔

نظام الملک کی آنکھوں کے سامنے اس گفتگو کا نقشہ گھوم گیا جو اس کے اور ترکان شاہ کے درمیان ہوئی تھی۔ اسے یہ بھی یاد آیا کہ اس نے اس فیصلے کی مخالفت کا وعدہ کیا تھا۔ اس نے دست بستہ عرض کیا۔

''ہم غلاموں کی کیا مجال کہ احکام شاہی کے خلاف سوچیں لیکن ہمیں یہ بھی زیب دیتا ہے کہ جو کچھ سلطنت کی بہتری کے لیے ضروری ہو، اس سے بندہ پرور کو آگاہ کریں۔''

''کیا تو یہ سمجھتا ہے کہ تیری دانش ہمارے فیصلے کو تبدیل کرسکتی ہے؟''

''میری کیا مجال...... میں تو صرف یہ عرض کررہا تھا کہ آپ کی جانشینی نہایت ذمے داری کا عہدہ ہے۔ شہزادی عالیہ اس ذمے داری کو شاید نبھانہ سکیں۔''

''یہ ایک عارضی تقرری ہے۔ پھر بھی تو بتا تو کس نام کا انتخاب کرتا ہے؟''

''میری حقیر رائے میں شہزادہ رکن الدین اس عہدے کے لیے موزوں ہوسکتے تھے۔''

''کیا تجھے نہیں معلوم کہ وہ بدایوں کا حاکم ہے؟ اس کی تقرری وہیں موزوں ہے۔''

''بدایوں پر تو کوئی اور عامل مقرر ہوسکتا ہے۔''

''کیا تو ہمیں سکھائے گا کہ کون کس کام کے لیے موزوں ہے؟''

''خدا مجھے سلطان کے غضب سے بچائے۔ میں تو صرف اس لیے عرض کررہا تھا کہ حضور کے اس فیصلے سے شہزادوں میں بددلی نہ پھیل جائے۔''

''میرے امراء اسی لیے ہیں کہ میری بیٹی کے خلاف اٹھنے والی ہر بغاوت کو کچل ڈالیں۔ رضیہ سلطانہ کی جانشینی صرف اسی کا امتحان نہیں، تم سب کا امتحان بھی ہے۔ میں اگر مہم سے زندہ بچ کر آگیا تو صرف شہزادی کی کارکردگی کا جائزہ نہیں لوں گا، تم سب کی کارکردگی کا بھی جائزہ لوں گا۔''

التمش اپنی بات ختم کرچکا تھا۔ کمرے میں گہرا سکوت طاری تھا لیکن چہروں سے ظاہر ہوتا تھا کہ ان میں سے ہر ایک کچھ کہنا چاہتا ہے مگر طاقتِ گویائی نہیں ہے۔ التمش کی آواز پھر گونجی۔ ''ہم حکم شاہی جاری کرتے ہیں کہ آج سے جمال الدین یاقوت حبشی شہزادی کا نگراں ہوگا۔ شہزادی کا ہر قدم اس کی محافظت میں اٹھے گا۔ ہم اسے امیر آخور (داروغہ اصطبل) مقرر کرتے ہیں۔''

مکھیوں کی بھنبھناہٹ جیسی آوازیں بلند ہوئیں۔

''ایک غلام اور داروغہ احمد اصطبل۔ یہ تو ہم سب کی توہین ہے۔'' چہ میگوئیاں ہورہی تھیں لیکن آوازیں اتنی پست تھیں کہ التمش انہیں سننے سے محروم تھا۔

''غالباً آپ لوگ یہ سوچ رہے ہیں کہ یہ عہدہ ایک غلام کے شایانِ شان نہیں۔''

''ہم سب ہی غلام ہیں۔ ہمیں تو یہ دکھ ہے کہ شہزادی کی محافظت کے لیے ہم میں سے کسی کو منتخب کیوں نہیں کیا گیا؟ کیا ہماری وفاداری پر حضور کو شک ہے؟''

''وفاداری امتحان کے بعد ثابت ہوتی ہے۔'' التمش نے کہا اور اٹھ کر کھڑا ہوگیا۔ تمام امراء نے بھی اپنی نشستیں چھوڑ دیں۔ دربار برخاست ہوگیا۔

دربار سے اٹھتے ہی اس نے شہزادی رضیہ سلطانہ کو طلب کرلیا۔

''میں نے تمام امراء کے سامنے یہ اعلان کردیا ہے کہ تم میرے گوالیار سے واپس آنے تک...... میری جانشین ہوگی لیکن میں یہ دیکھ کر آیا ہوں کہ معدودے چند امراء کے کوئی میرے اس فیصلے سے خوش نہیں ہے۔ اس لیے تمہیں نہایت احتیاط سے کام لینا ہوگا۔ خواجہ مہدی غزنوی، سیف الدین ایبک، اعزالدین کبیر خاں وغیرہ پر اعتبار نہ کرنا۔ نظام الملک سے ہوشیار رہنا۔ جمال الدین یاقوت تمہارا محافظ ہوگا۔ اس پر اعتبار کرنا۔ اپنی ماں ترکان شاہ پر گہری نظر رکھنا۔ اسے اپنے قریب بھی نہ آنے دینا کہ ہر سازش اسی کے اشارۂ ابرو سے پرورش پاتی ہے۔''

''بابا جانی! آپ میری خاطر اتنے لوگوں کی ناراضی کیوں مول لے رہے ہیں؟''

''اس لیے کہ جو سلطنت اللہ تعالیٰ نے مجھے دی ہے، اس کی حفاظت تم ہی کرسکتی ہو۔ میں نہیں چاہتا کہ چند دنوں کے لیے ہی سہی، اپنی رعایا کو ناکارہ ہاتھوں میں دوں۔ اگر اقتدار رکن الدین کو مل گیا تو وہ اس سلطنت کو ساغر شراب میں ڈبوتے دیر نہیں لگائے گا۔ اس کے پردے میں ترکان شاہ حکومت کرے گی اور تمام نظام تہ و بالا کردے گی۔ میں ابھی زندہ ہوں۔ دارالخلافہ سے دور ہوں گا لیکن تیرے مخالف تجھے گزند پہنچانے سے پہلے ہزار مرتبہ سوچیں گے۔ بس تو انہیں کسی رعایت کا حق دار نہ سمجھنا۔ میں کل نمازِ فجر کے بعد عازمِ سفر ہو جاؤں گا۔ میری باتوں کو یاد رکھنا۔''

جب شہزادی رخصت ہوگئی تو التمش نے فیروزے کا وہ ہار ایک چھوٹی سی صندوقچی سے نکالا جو اس کی کنیز کے پاس سے برآمد ہوا تھا۔ اس ہار کو وہ کچھ دیر دیکھتا رہا پھر مٹھی میں دبالیا اور ترکان شاہ کو طلب کیا۔

''اس ہار کو پہچانتی ہو؟''

ہار کو دیکھتے ہی ترکان شاہ کا چہرہ اتر گیا لیکن عورت ہوشیار تھی فوراً بات بنائی۔

''ارے یہ تو میرا ہار ہے۔ آپ کے پاس کہاں سے آیا؟ میں تو اسے کئی دن سے ڈھونڈ رہی تھی۔''

''وہ کنیز تمہیں یاد ہے جسے معتوب کرکے میں نے محل سے نکال دیا؟ یہ ہار اسی کے پاس سے برآمد ہوا تھا۔''

''اس کا مطلب ہے، وہ چور بھی تھی۔''

''وہ چور نہیں تھی، تم جھوٹ بول رہی ہو۔ یہ ہار تم نے مخبری کرنے کے انعام کے طور پر اسے دیا تھا۔ جس وقت میں اور شہزادی ہم کلام تھے اور میں اسے جانشینی کی نوید سنا رہا تھا، وہ کمرے میں آئی تھی۔ اڑتے ہوئے کچھ الفاظ اس کے کانوں میں پڑے تھے۔ وہی الفاظ اس نے تمہارے کانوں میں انڈیل دیے۔ تمہاری بے صبری اسی وقت تمہیں میرے کمرے میں لے آئی۔ اب شک کی گنجائش ہی نہیں تھی کہ ابھی ہونے والی گفتگو کس نے تمہیں پہنچائی ہوگی۔ تلاشی لینے پر یہ ہار اس کے پاس سے ملا۔ یہ اس نے چرایا نہیں تھا، تم نے اسے انعام میں دیا تھا جسے چھپانے کی اسے فرصت بھی نہ مل سکی تھی۔''

ترکان شاہ کے پاس اب کوئی جواب نہیں تھا، صرف التمش بول رہا تھا۔

''میں اب بھی تجھے نصیحت کر رہا ہوں کہ سازشوں سے باز آجا۔ میں جا ضرور رہا ہوں لیکن میرے مخبر اور جاسوس ہر طرف پھیلے ہوئے ہیں۔ اگر رضیہ سلطانہ کو کوئی گزند پہنچی تو قصوروار تو ہوگی۔ اس کی حفاظت اب تیری ذمے داری ہے۔''

ترکان شاہ چوربنی کھڑی تھی۔ اس نے التمش کو اتنے غصے میں کبھی نہیں دیکھا تھا۔ اس نے اسی میں عافیت جانی کہ رضیہ کی حفاظت کا عہد کرے اور التمش کے غصے کو ٹھنڈا کرے۔

''مجھے آپ شہزادی رضیہ کا دشمن سمجھتے ہیں تو اس خیال کو دل سے نکال دیں۔ میں عہد کرتی ہوں کہ اس کا ہر طرح سے خیال رکھوں گی بشرطیکہ وہ بھی مجھے اپنی ماں سمجھے...... ورنہ اپنے بیٹے کے پاس بدایوں چلی جاؤں گی۔''

اس کے چہرے پر ناگواری کے تاثرات بھی نمایاں تھے مگر مصلحت یہی تھی کہ اس وقت ان الفاظ کو ہونٹوں سے ادا نہ کرے۔ وہ اپنی خلوت گاہ میں آئی تو بستر پر کانٹے بچھے ہوئے تھے۔ کچھ دیر بستر پر کروٹیں بدلتی رہی پھر اٹھ کر ٹہلنے لگی۔ ''کاش اس وقت رکن الدین میرے پاس ہوتا۔'' ابھی وہ کچھ اور کہنا چاہتی تھی کہ مسجد سے فجر کی اذان بلند ہوئی۔ اس کا دل زور سے دھڑکا۔ اسے معلوم تھا کہ نمازِ فجر ادا کرتے ہی التمش سوار ہو جائے گا۔ پہلے مہرولی جائے گا جہاں چھاؤنی ہے۔ حضرت بختیار کاکیؒ کے قدموں پر حاضری دے گا پھر لشکر لے کر گوالیار کی طرف روانہ ہو جائے گا۔ رضیہ ہماری حکمران ہوگی مگر دیکھتی ہوں کیسے چین سے رہتی ہے۔

اس کے اسی عزم کا بھرم اس وقت ٹوٹ گیا جب رضیہ سلطانہ نے التمش کے رخصت ہوتے ہی دربار منعقد کیا۔ اس وقت ہر آنکھ حیرت زدہ رہ گئی جب وہ چہرے پر

نقاب ڈال کر تختِ شاہی پر متمکن ہوئی۔ (بعد میں اس نے پردہ بالکل ترک کر دیا تھا اور مردانہ لباس پہننے لگی تھی)

ترکان شاہ بھی دربار میں موجود تھی۔ دوسری بیگمات کے ساتھ وہ ایک باریک پردے کے پیچھے تھی لیکن اسے بھی شہزادی کے احترام میں اس طرح کھڑا ہونا پڑا جس طرح سلطان کے سامنے ہونا پڑتا تھا۔

ترکان شاہ مارے خفت کے زمین میں گڑی جا رہی تھی۔ اسے لگ رہا تھا جیسے وہ زیادہ دیر کھڑی نہیں رہ سکے گی۔ اس نے شہزادی کے بیٹھنے کا انتظار بھی نہیں کیا۔ اس سے پہلے ہی اپنی نشست سنبھال لی۔ شہزادی نے محسوس ضرور کیا لیکن اس وقت کچھ کہنا مناسب نہ سمجھا۔

وہ وقت قابلِ دید تھا جب امراء وارا کینِ دربار ایک نوعمر شہزادی کے احترام میں کھڑے تھے۔

ترکان شاہ دربار سے لوٹی تو اس کا حال یہ تھا کہ پاؤں رکھتی کہیں تھی، پڑتا کہیں تھا۔

کمرے میں آکر وہ جلے پاؤں کی بلی کی طرح ٹہلنے لگی۔ اسے رضیہ سلطانہ کے تیور یاد آرہے تھے۔ وہ خود کو جانشین نہیں حکمران سمجھ رہی تھی۔ عارضی فیصلے کو اپنا مستقل فیصلہ سمجھ رہی تھی۔ پھر ایک خیال آتے ہی وہ سر سے پاؤں تک کانپ گئی۔ ''کہیں ایسا تو نہیں کہ وہ التمش کی غیر حاضری کا فائدہ اٹھا کر تخت وتاج پر قبضہ کرلے۔ بہت سے امراء اور خود نائب سپہ سالار بہرام غوری اس کے ساتھ ہیں بلکہ بہرام غوری تو سنا ہے اس کے عشق میں مبتلا ہے۔ جاگیرداروں اور حاکموں کو بھی خریدا جاسکتا ہے۔ کچھ امراء میرے بھی تو وفادار ہیں۔ اس سے پہلے کہ رضیہ کوئی قدم اٹھائے میں رکن الدین کو تخت پر کیوں نہ بٹھادوں۔ التمش پر واپسی کے راستے ہی بند ہوجائیں گے۔''

اس نے سازشوں کے جال بچھانے شروع کر دیے اور اگلے چند دنوں میں شہزادہ رکن الدین بدایوں سے دہلی پہنچ گیا۔ اس کے آتے ہی ترکان شاہ نے نظام الملک، سیف الدین کوچی اور اپنے دوسرے وفادار امیروں کو طلب کرلیا۔ ان سب نے شہزادہ رکن الدین کے ہاتھ پر بیعت کی اور کسی طرح شہزادی رضیہ کو راستے سے ہٹانے کے لیے تجاویز پر غور ہونے لگا۔ نظام الملک تو کچھ زیادہ ہی جلدی میں تھا۔ اس نے رضیہ سلطانہ کے قتل کی تجویز پیش کی جسے دوسرے لوگوں نے ٹھکرا دیا۔ ایک تجویز یہ بھی دی گئی کہ یاقوت حبشی کو راستے سے ہٹا دیا جائے۔ رضیہ سلطانہ کے وفادار امیروں کے قتل پر بھی غور ہوا۔ بالآخر سب کا اس پر اتفاق ہوا کہ رضیہ کے جتنے وفادار ہیں، انہیں ایک ایک کر کے قتل کر دیا جائے اور قتل کا طریقہ ایسا اختیار کیا جائے کہ کوئی پراسرار بیماری ظاہر ہو مثلاً آہستہ آہستہ اثر کرنے والا زہر۔

اجلاس ختم ہوا۔ کمرے کے باہر کھڑے ایک سائے کو حرکت ہوئی اور وہ اندھیرا چیرتا ہوا آگے بڑھ گیا۔

اسی سائے نے رضیہ کو اطلاع پہنچادی کہ بند کمرے میں خفیہ اجلاس ہوا ہے۔ کیا باتیں ہوئیں، یہ جاننے کی ضرورت نہیں تھی۔ سانپ کے منہ میں زہر ہے یا نہیں، یہ دیکھنے کی ضرورت نہیں تھی...... اسے تو صرف کچلنا ضروری تھا۔

دوسرے دن کی صبح طلوع ہوئی تو رضیہ سلطانہ نے شہزادہ رکن الدین کو طلب کرلیا۔

''تم یہاں کس مقصد کے لیے آئے ہو؟''

''آپ ہی نے ملاقات کا اشتیاق ظاہر کیا ہے۔''

''تم دہلی کس کے حکم پر آئے ہو؟''

''میں ولی عہد ہوں۔ مجھے کسی کے حکم کی ضرورت نہیں۔''

''تم محض حاکم بدایوں ہو۔ بارگاہِ سلطانی میں اسی وقت حاضر ہو سکتے ہو جب تمہیں بلایا جائے یا تمہاری درخواستِ ملاقات کو شرفِ قبولیت حاصل ہو۔''

''تم مستقبل کے سلطان سے ہم کلام ہو۔''

''تم آج کی دوپہر ہونے سے پہلے پہلے بدایوں کی طرف روانہ ہو جاؤ ورنہ میں تمہارے یہاں آنے کو بغاوت سمجھوں گی......اور یاد رکھو پھر تم میرے بھائی نہیں رہو گے، محض باغی ہو گے۔ باغیوں کی سزا تم جانتے ہی ہو گے۔''

شہزادی کے لہجے میں ایسا یقین اور رعب تھا کہ رکن الدین کو کچھ کہنے کی جرأت نہ ہو سکی۔ وہ کچھ کہہ تو نہ سکا لیکن حکم شاہی کو خاموشی سے پیروں تلے روندا اور کمرے سے نکل گیا کہ رسمِ شاہی کے مطابق رخصتی کا سلام پیش کرنا بھی بھول گیا۔

☆☆☆

ترکان شاہ تمام حالات سے بے خبر نظام الملک سے محوِ گفتگو تھی جسے اس نے آئندہ کی منصوبہ سازی کے لیے ابھی ابھی طلب کیا تھا۔

''ابھی تو رضیہ سلطانہ کو تربیت کی منزلوں سے گزارا جارہا ہے۔ سلطان کے واپس آتے ہی عارضی جانشینی مستقل جانشینی میں تبدیل ہوجائے گی۔'' نظام الملک کہہ رہا تھا۔

''میں اپنے بیٹے کا حق کسی کو نہیں مارنے دوں گی۔''

''یہی تو میں کہہ رہا ہوں۔ ایک لائق بیٹے کے ہوتے ہوئے سلطان کیوں بضد ہیں کہ بیٹی کو تاج وتخت سونپ دیں۔''

اس سے جو انتشار پھیلے گا، اس کا تصور بھی نہیں کیا جاسکتا۔ ہم میں سے کوئی بھی عورت کی غلامی قبول نہیں کرے گا۔''

''باتیں ہی کرتے رہو گے یا ان پر عمل بھی ہوگا۔ سلطان ابھی دہلی میں موجود نہیں۔ ہمارے پاس بہت وقت ہے۔''

''میں آپ سے یہی عرض کرنے آیا تھا۔ شہزادی بڑی ہوشیاری سے اپنے وفاداروں کو اپنے گرد جمع کر رہی ہے۔ بہت جلد وہ وقت آئے گا کہ ہم سب معزول کر دیے جائیں گے۔ آپ شہزادہ رکن الدین سے کہیں وہ جلد کوئی فیصلہ کرے۔''

''فیصلہ تو مجھے کرنا ہے۔'' ترکان شاہ نے کہا۔

''فیصلہ یہ کیا جائے کہ شہزادی کے جتنے وفادار ہیں، انہیں ایک ایک کر کے راستے سے ہٹا دیا جائے اور یہ میں آپ کی مرضی اور اجازت کے بغیر نہیں کر سکتا۔''

''تو تم یہ کہنا چاہتے ہو کہ کئی قتل ایک ساتھ کر دیے جائیں گے یا ایک ایک کر کے سب کو قتل کر دیا جائے گا اور کسی کو کانوں کان خبر نہیں ہوگی؟''

''قتل صرف تلوار ہی تو نہیں کرتی۔ مہلک زہر بھی تو یہ کام کر سکتا ہے۔''

''سوال تو موت کا ہے۔ کیا کسی کی موت چھپائی جاسکتی ہے؟''

''موت کا سبب تک کسی کو معلوم نہ ہو سکے گا۔''

''کھلبلی تو یہ مچے گی کہ آخر وقفے وقفے سے یہ موتیں کیوں ہو رہی ہیں؟''

''جب تک تشویش کی لہر آگے بڑھے گی، اس وقت تک کئی اہم لوگ راستے سے ہٹ چکے ہوں گے اور شہزادہ رکن الدین ہندوستان کے حکمراں ہوں گے۔'' اس نے یہ بات ترکان شاہ کی خوشنودی کے لیے کہی حالانکہ اب وہ خود حکمرانی کے خواب دیکھنے لگا تھا۔ اگر حکمرانی رکن الدین کو مل جاتی تو یہ بھی دراصل اسی کی حکومت ہوتی کیونکہ رکن الدین اس کا اہل ہی نہیں تھا۔ وہ جب تک رہتا، نظام الملک کے مرہونِ منت رہتا۔

''اگر تم میرے بیٹے کا مفاد اسی میں دیکھتے ہو تو دیر کس بات کی ہے۔'' ترکان شاہ نے کہا۔

''یہ کام میرے اکیلے کے کرنے کا نہیں۔ تمام امراء عہد کریں کہ وہ میرا ساتھ دیں گے اور اس راز کو اپنے سینے میں دفن رکھیں گے۔''

''جاگیردار ہماری راہ میں حائل ہوں گے۔''

''جو کھیل ہم کھیل رہے ہیں، اس میں خرید و فروخت ہوتی ہے۔ یہ کام بھی مجھ پر چھوڑ دیا جائے۔''

ابھی بات یہیں تک پہنچی تھی اور رکن الدین کا انتظار ہو رہا تھا تاکہ اس کی بھی رائے لے لی جائے کہ شہزادہ کمرے میں داخل ہوا۔ وہ بے اختیار ہنس رہا تھا۔ اس کی یہ ہنسی ترکان شاہ کو ناگوار گزری تھی۔

''شہزادہ کو یہ زیب نہیں دیتا کہ اس طرح مسخروں کی ہنسی ہنستے پھریں۔''

''ملکہ حضور! بات ہی ایسی ہے کہ ہنسے بغیر رہا نہیں جاتا۔''

''ایسی کیا بات ہوگئی شہزادہ معظم؟'' اس مرتبہ نظام الملک نے دخل اندازی کی۔

''التمش کی جانشین شہزادی رضیہ سلطانہ نے مجھے حکم دیا ہے کہ میں بدایوں واپس چلا جاؤں۔ وہ مجھے شہر بدر کرنے کے گھمنڈ میں مبتلا ہے۔ کوئی اس سے جا کر کہہ دے کہ میں کسی کے حکم کا پابند نہیں۔ جب میں چاہوں گا، چلا جاؤں گا۔''

نظام الملک دل ہی دل میں خوش ہو رہا تھا کہ اسے کچھ کرنے کی ضرورت نہیں پڑی، خاندان التمش خود ہی آپس میں لڑ مرنے کو تیار ہے۔ اس نے رکن الدین کو مزید بھڑکانے کے لیے رضیہ سلطانہ کے مقابلے میں اسے کمزور ثابت کرنے کے لیے نصیحت کی۔

''شہزادی عالیہ اس وقت سلطان کی جانشین ہیں۔ ان کا حکم سلطان کا حکم ہے۔ ایسا نہ ہو آپ کی شکایت سلطان تک پہنچ جائے۔''

''یہ حق میرا تھا جس پر وہ براجمان ہے۔ میں اس کے کسی حکم کا پابند نہیں۔ میں اس سے بھی کہہ آیا ہوں کہ اگر وہ چاہے تو میری شکایت سلطان معظم تک پہنچا دے۔''

ابھی اس کا غصہ ٹھنڈا بھی نہیں ہوا تھا کہ نائب سپہ سالار سیف الدین ایبک نے کمرے میں قدم رکھا۔

''شہزادہ اعظم، تشریف لے چلیے۔ سواری تیار ہے۔ آپ کو حکم سلطانی کے مطابق بدایوں جانا ہے۔''

''میں ولی عہد رکن الدین ہوں۔ آپ مجھے زبردستی نہیں لے جاسکتے۔''

''میں زبردستی کر بھی نہیں رہا ہوں۔ میں تو صرف درخواست لے کر آیا ہوں۔''

اب ترکان شاہ کے بولنے کی باری تھی۔

''آپ اس وقت جاسکتے ہیں۔ ہم شہزادی رضیہ سے بات کریں گے۔''

''میرے پاس اتنا وقت نہیں۔ حکم قطعی ہے۔

شہزادے کو چلنا ہی ہوگا۔''
''یہ کیوں بھولتے ہو کہ میں ولی عہد ہوں۔''
''ہمیں حکم سلطانی کی تعمیل کرنا ہوگی ورنہ میرے سپاہی حکم کی تعمیل کرائیں گے۔''
ترکان شاہ نے بہت شور مچایا لیکن اب جانے کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا۔ شہزادے کے رخصت ہوتے ہی ترکان شاہ جنونیوں کی طرح چیخنے لگی۔ ''اس محل میں میری کیا حیثیت ہے۔ میرے بیٹے کو زبردستی شہر بدر کر دیا گیا اور میں دیکھتی رہ گئی۔ جسے سلطانِ ہند ہونا تھا، وہ یوں بدایوں بھیج دیا گیا۔''
دیکھتے ہی دیکھتے پانسا پلٹ گیا تھا۔ نظام الملک، رکن الدین کو مہرہ بنانا چاہتا تھا اور وہ مہرہ اپنی جگہ سے ہٹ گیا تھا بلکہ وہ اس جگہ دیکھا گیا تھا جہاں سازشیں تیار ہوتی ہیں۔ اب ضروری ہوگیا تھا کہ بے شک وہ اپنے منصوبے پر عمل پیرا رہے لیکن اپنی صفائی پیش کر دے۔ وہ رضیہ سلطانہ سے ملنے پہنچ گیا۔
''شہزادی معظمہ کو اطلاع دو کہ وزیراعظم ہند تشریف لائے ہیں۔''
قدرے توقف کے بعد اسے طلب کر لیا گیا۔ رضیہ سلطانہ کا دل اس کی طرف سے صاف نہیں تھا لیکن اس عیار کی لچھے دار باتوں نے بہت جلد رضیہ کی غلط فہمی دور کر دی۔
''میں آپ کو ایک اہم اطلاع دینے آیا ہوں۔''
''اب ہمارا وزیراعظم جاسوس کے فرائض انجام دینے لگا ہے؟''
''آپ کا وفادار آپ کے لیے کچھ بھی کر سکتا ہے۔''
''ہمیں خوشامد پسند نہیں۔ جو کچھ کہنا ہے صاف صاف کہیے۔''
''شہزادہ رکن الدین مجھے بدایوں طلب کر رہے ہیں۔''
''تو چلے جائیے۔''
''ترکان شاہ فرماتی ہیں کہ ہر وقت ان کی خدمت میں حاضر رہوں۔ اس وقت بھی میں انہی کے کہنے پر ان کی خدمت میں حاضر ہوا تھا جس وقت شہزادہ رکن الدین کی شہر بدری کے احکام پہنچے تھے۔''
نظام الملک نے نہایت خوب صورتی سے اپنی صفائی پیش کر دی تاکہ آئندہ وہ اپنے منصوبے پر عمل کرے تو الزام اس پر نہیں ترکان شاہ پر آئے۔
''بھائی رکن الدین آپ کو بدایوں کیوں بلانا چاہتے ہیں؟''
''وہ چاہتے ہیں کہ میں ان کی کامیابیوں کے لیے راستہ ہموار کروں۔''
''آپ کیا چاہتے ہیں؟''
''میں تو یہ چاہتا ہوں کہ یہاں رہ کر آپ کی مدد کروں۔ شاید میں غلط کہہ گیا۔ آپ خود اتنی دانش مند ہیں کہ آپ کو کسی مدد کی ضرورت نہیں۔ پھر بھی ایک ہمدرد بھی چاہیے گا۔''
''بھائی رکن الدین کس راستے کی ہمواری کی بات کر رہے ہیں؟'' شہزادی کے لہجے میں اب نفرت نہیں نظام الملک کے لیے اپنایت تھی۔
''وہ سمجھتے ہیں، انہیں وراثت سے محروم کر دیا گیا ہے۔''
''وہ غلط سمجھتے ہیں۔ یہ ایک عارضی انتظام ہے جو سلطانِ معظم نے میرے سپرد کر دیا ہے۔''
''میں نے بھی یہی سمجھانے کی کوشش کی تھی۔''
''آپ کسی کی باتوں میں نہ آیئے گا۔''
''میں تو کسی کی باتوں میں نہیں آؤں گا لیکن امرائے سلطنت بھی ڈانواں ڈول ہو رہے ہیں۔ اس لیے کہ آپ ایک خاتون ہیں۔''
''ہمیں اس وقت آپ سے غرض ہے۔ دوسروں کو ہم خود سنبھال لیں گے۔ ہم بہت جلد دربار منعقد کریں گے جس میں یہ مسئلہ بھی زیرِ بحث آئے گا۔ اب آپ جا سکتے ہیں۔''
نظام الملک نے رخصتی کا سلام عرض کیا اور کمرے سے نکل گیا۔ یہاں سے نکلتے ہی وہ ترکان شاہ کی خدمت میں پہنچ گیا۔ ترکان شاہ اپنے کمرے میں بے چینی سے ٹہل رہی تھی۔ اس کی کنیز اس کے ساتھ ساتھ گردش میں تھی۔
''نظام الملک کیا ہم یہ سمجھیں کہ تمہیں اب ہماری ضرورت نہیں رہی۔''
نظام الملک نے ترکان شاہ کے لہجے کی تلخی کو محسوس کرتے ہوئے کنیز کی طرف اشارہ کیا۔ ترکان شاہ کو بھی یاد آیا کہ کنیز ابھی تک کمرے میں موجود ہے۔ اس نے ہاتھ کے اشارے سے کنیز کو باہر جانے کو کہا۔
جب کنیز باہر چلی گئی تو نظام الملک گویا ہوا۔
''ملکۂ عالیہ! دیواروں کے بھی کان ہوتے ہیں ...... یہ تو پھر زندہ کنیز ہے۔''
''ہمیں ہماری غلطی یاد مت دلاؤ۔ ہمیں تو یہ بتاؤ کہ ہمارا بیٹا کب سلطانِ ہند بن رہا ہے؟''
''ایسے کاموں میں وقت کی بڑی اہمیت ہوتی ہے۔ میں تمام چالیں دیکھ بھال کر چل رہا ہوں۔''

"نظام الملک! اگر میرے بیٹے کو اقتدار مل گیا تو میں تمہیں ہیرے جواہرات میں تول دوں گی۔"

"مجھے تو اس میں دلچسپی ہے کہ حق دار کو اس کا حق مل جائے۔"

"ہمیں معلوم ہوا ہے، آپ اس وقت شہزادی کے پاس سے ہو کر آرہے ہیں۔" ترکان شاہ نے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالتے ہوئے کہا جیسے اس کی چوری پکڑلی ہو۔

"یہ بڑا ضروری تھا۔ اسے اپنی وفاداری کا یقین دلا کر ہی میں اپنے منصوبے پر عمل کرسکتا ہوں۔"

"اب وقت نہیں ہے نظام الملک...... اپنے منصوبے پر عمل شروع کردو۔"

"اب کسی کی موت ہو تو سمجھ لیجیے گا کہ میں نے اپنے منصوبے پر عمل شروع کردیا ہے۔"

☆☆☆

شہزادی رضیہ سلطانہ نہایت دانش مندی سے تمام معاملات سرانجام دے رہی تھی۔ پھر ایک دن اس نے ایک حیرت ناک قدم اٹھایا۔ شاہی طبیب کو زبردستی رخصت پر بھیج دیا اور اس سے کہہ دیا کہ وہ فوراً دہلی سے نکل کر کسی دور دراز مقام پر جاکر اس طرح چھپ جائے کہ اس کی ہوا بھی کسی کو نہ ملے۔

نظام الملک کے ہوش اڑ گئے۔ اس کا تو منصوبہ ہی خاک میں مل گیا۔ وہ حیران تھا کہ اس منصوبے کی بھنک شہزادی کے کانوں میں کیسے پڑ گئی؟ اس نے شاہی طبیب کو لالچ دے کر چند خاص لوگوں کو زہر دینے کا منصوبہ تیار کیا تھا تاکہ شہزادی کمزور ہوجائے اور رکن الدین آگے بڑھ کر اقتدار پر قبضہ کرلے۔ یہ اتنا خوفناک منصوبہ تھا کہ التمش جب گوالیار سے واپس آتا تو اس پر دہلی کے دروازے بند ہوچکے ہوتے۔ رضیہ سلطانہ کو یا تو اس منصوبے کی سن گن مل گئی تھی یا اس کی ذہانت نے بھانپ لیا تھا کہ کیا ہوسکتا ہے۔ وہ نظام الملک کی طرف سے مطمئن ہوگئی تھی لیکن ترکان شاہ کی طرف سے اسے ہر وقت خطرہ رہتا تھا۔ وہ اس نتیجے پر پہنچی تھی کہ محل میں کچھ بااثر لوگ ایسے ضرور ہیں جو ترکان شاہ کا ساتھ دے رہے ہیں اور تمام سازشیں انہی کے گرد گھیرا ڈالے بیٹھی ہیں۔

اس نے باپ کے تخت کو بچانے کے لیے "ترکان چہل گانی" (التمش کے چالیس غلام جو بڑے بڑے عہدوں پر فائز تھے) سے رابطہ کیا اور انہیں اپنے دربار میں بلا بھیجا۔ انہی میں ملک اختیار الدین التونیہ بھی تھا جو "بھٹنڈا" کا حاکم تھا اور عام طور سے ملک التونیہ کے نام سے پکارا جاتا تھا۔ رضیہ سلطانہ پردے کے پیچھے تھی لیکن وہ اس کی دل نشین آواز، نپے تلے فقرے سن رہا تھا۔ اس کے حسن دل آویز کی جھلک پردے سے چھن چھن کر باہر آرہی تھی۔ ملک التونیہ پوری طرح دیکھ تو نہیں سکتا تھا کہ ایسی دل نشین آواز کی مالک کس حسن و جمال کی مالک ہے لیکن اندازہ کرسکتا تھا کہ ایک چاند ہے جو بدلی کے پیچھے چھپا بیٹھا ہے۔ اس وقت تو وہ رضیہ سلطانہ کی عقل وفہم پر اش اش کر رہا تھا۔ اس پر یہ راز بھی کھلتا جارہا تھا کہ سلطان التمش نے بیٹوں کی موجودگی میں اپنی بیٹی کو اپنا جانشین کیوں بنایا ہے۔

رضیہ سلطانہ ان تمام افراد کو ان کی ذمے داریوں کا احساس دلا رہی تھی لیکن ان کی تفصیلات بتاتے ہوئے وہ ایسے ایسے نکات بیان کررہی تھی کہ بے اختیار داد دینے کو جی چاہتا تھا...... اور لوگوں کا حال وہ خود جانتے ہوں گے لیکن ملک التونیہ کے ہوش اڑے ہوئے تھے۔ وہ دہلی سے بھٹنڈا کی طرف روانہ ہوا تو شہزادی کا خیال اس کے ساتھ ساتھ چل رہا تھا۔ اسی عالم میں وہ بھٹنڈا پہنچ گیا۔ وہ اپنی بے چینی کو کوئی نام نہیں دے سکا تھا۔ وہ خود سے یہ دعویٰ کرتے ہوئے بھی ڈر رہا تھا کہ اسے رضیہ سلطانہ سے عشق ہوگیا ہے۔ وہ اپنی حیثیت سے بخوبی واقف تھا۔ بھٹنڈا کا حاکم ضرور تھا۔ نوجوان بھی تھا، سجیلا اور بہادر بھی لیکن التمش کا غلام تھا۔ التمش نے اسے خرید کر اس کی تربیت کی تھی۔ اسے حاکم بنایا تھا۔ وہ یہ تصور بھی نہیں کرسکتا تھا کہ آقا زادی سے عشق کرے۔ وہ اپنے آپ کو ملامت کرتا رہا۔ خود کو شہزادی کے خیال سے دور رکھنے کے لیے سیر وشکار میں مشغول رہنے لگا لیکن کسی طرح چین نہ آتا تھا۔ آخر یہی ترکیب سمجھ میں آئی کہ ایک مرتبہ پھر در محبوب پر حاضر ہوجائے۔ شاید کچھ سکون ملے۔ اس نے کچھ قیمتی تحائف ساتھ لیے اور دہلی پہنچ گیا۔ رضیہ سلطانہ کے حضور طلبی ہوئی۔ صورت پھر وہی تھی۔ رضیہ سلطانہ باریک پردے کے پیچھے تھی۔ ملک التونیہ اس کی آواز سن سکتا تھا۔ چہرے پر نقاب تھی لیکن پیشانی کے چاند کو دیکھ سکتا تھا۔

وہ اپنی وفاداریوں کا یقین دلاتا رہا، اپنے علاقے کے مسائل بیان کرتا رہا، شہزادی کی نصیحتیں بٹورتا رہا۔ اپنے عزائم سے اسے آگاہ کرتا رہا۔ جس طرح وہ شہزادی کے حسن کی جھلک دیکھ رہا تھا، شہزادی بھی پردے کے پیچھے سے اسے دیکھ رہی تھی۔ اس کے سامنے نہایت سجیلا جوان بیٹھا تھا جس کے بشرے سے بہادری اور دلیری کے آثار ظاہر ہو رہے تھے۔ جس کی باتوں میں اخلاص تھا۔ لہجے کی نرمی دل

میں اتر رہی تھی لیکن شہزادی یہ محسوس کیے بغیر نہ رہ سکی کہ اسے کوئی دکھ ہے جسے وہ چھپانے کی کوشش کر رہا ہے۔

ملاقات ختم ہوئی اور اسے شہزادی کے حضور سے اٹھنا پڑا۔ وہ اب جس آگ میں جل رہا تھا اسے عشق کا نام دیے بغیر نہ رہ سکا تھا لیکن اپنے اور شہزادی کے فرق کو بھی نظرانداز نہ کر سکتا تھا۔ کبھی کبھی اسے یہ خیال ضرور آتا تھا کہ اس کا آقا سلطان شمس الدین التمش بھی تو کبھی غلام تھا اور اس نے بھی تو سلطان قطب الدین ایبک کی دامادی کا شرف حاصل کیا تھا۔

☆☆☆

نظام الملک کے ترکش میں اب کوئی تیر باقی نہیں رہ گیا تھا۔ رضیہ سلطانہ اپنی فہم و فراست سے اس کے ہر منصوبے کو خاک میں ملاتی چلی آ رہی تھی۔ نظام الملک کو صرف اتنی کامیابی حاصل ہوئی تھی کہ سازشوں کی اس داستان میں اس کا نام کہیں نہیں تھا۔

نظام الملک نے اپنے ذہن کو بہت ٹٹولا اور پھر اس نے وہ چال چلی جو اس کی حیثیت سے قطعی مطابقت نہیں رکھتی تھی۔ اس نے رضیہ سلطانہ کے کردار کو مسخ کرنے کا ارادہ کیا۔ اس کے لیے اس نے یاقوت حبشی کا انتخاب کیا۔ اسے رضیہ سلطانہ کی خلوت گاہ تک براہِ راست رسائی حاصل تھی۔ وہ کسی کی اجازت کے بغیر وہاں جا سکتا تھا۔ بہت سی آنکھیں گواہ تھیں کہ رضیہ اس سے بے پردہ گفتگو کرتی ہے۔ اگر رضیہ کو اس کے ساتھ ملوث کیا جاتا تو سب کو یقین آ جاتا۔ اس نے اپنی ایک کنیز کو بھاری رقم کا لالچ دے کر اس بات پر راضی کر لیا کہ وہ رضیہ اور یاقوت حبشی کے فرضی عشق کا قصہ دوسری کنیزوں تک پہنچائے گی۔

ایک کنیز کو بتانے کی دیر تھی۔ ایک نے دوسری کو بتایا، دوسری نے تیسری کو۔ پورے محل کی کنیزیں اس راز سے واقف ہو گئیں۔ ایک دوسرے کو دیکھتی تھیں اور بے اختیار ہنستی تھیں۔ معنی خیز نگاہیں یاقوت حبشی کا پیچھا کر رہی تھیں۔ کنیزوں میں رضیہ سلطانہ کا رعب و مرتبہ کم ہونے لگا تھا۔ وہ اپنے مقام و مرتبے سے نیچے اتر کر ایک معمولی غلام کے عشق میں مبتلا تھی۔ کنیزوں کے لیے یہ واقعہ کچھ کم نہیں تھا۔ رضیہ سلطانہ کی خوب جگ ہنسائی ہو رہی تھی لیکن چپکے چپکے۔

نظام الملک اسے اپنی بڑی کامیابی سمجھ رہا تھا۔ جتنی بدنامی رضیہ کی ہو چکی تھی، وہ اب چاہتا تھا کہ اس کے بھائیوں کو بھی اس کی خبر کر دے۔ کچھ یقین کریں گے کچھ نہیں اور اس طرح خاندان التمش آپس میں الجھ پڑے گا۔ وہ بھی چاہتا تھا کہ کسی ایک گروہ کا ساتھ دے کر اقتدار پر قبضہ کر لے۔ خصوصاً رکن الدین اس کا پسندیدہ مہرہ تھا۔ اس طرح وہ ترکان شاہ کی ہمدردیاں بھی حاصل کر سکتا تھا۔

یہ ایک خطرناک چال تھی لیکن اس کی تقدیر اچھی نہیں تھی۔ دہلی کے در و بام تک سورج کے طلوع ہونے کی خبر اچھی طرح پہنچی نہیں تھی کہ سلطان کے فاتح لشکر کی واپسی کی خبر پہنچ گئی۔ سلطان کسی اطلاع کے بغیر حدودِ دہلی میں داخل ہو چکا تھا اور اس وقت "مہرولی" کے مقام پر تھا جہاں اس کے پیر و مرشد کی خانقاہ تھی۔ اسے اپنے مرشد کی قدم بوسی کے بعد دہلی میں داخل ہونا تھا۔

شہزادی رضیہ سلطانہ ابھی زنانہ لباس میں تھی اور نمازِ فجر سے فارغ ہوئی تھی کہ یہ اطلاع اس تک پہنچ گئی۔ اس نے مردانہ لباس زیب تن کیا، نقاب سے آدھا چہرہ ڈھانپا، سر پر ٹوپی رکھی۔ یاقوت حبشی نماز کے انداز میں دونوں ہاتھ باندھے کھڑا تھا۔ اس کی آنکھیں زمین کا منہ چوم رہی تھیں۔ رضیہ سلطانہ جیسے ہی باہر نکلی اور اپنے گھوڑے کے قریب گئی، یاقوت حبشی آگے بڑھا اور اپنی آقازادی کو سہارا دے کر گھوڑے پر سوار کرایا اور قریب کھڑے دوسرے گھوڑے پر خود سوار ہو گیا۔ امراء اور اکابرین کو وہ اپنے پیچھے چھوڑ گئی تھی۔

پورا شہر نقاروں اور شہنائیوں سے گونج رہا تھا۔ خلقتِ شہر اپنے سلطان کے استقبال کے لیے گھروں سے باہر نکل آئی تھی۔ شہزادی، سلطان کے ہم رکاب دہلی میں داخل ہوئی تو فضا نعروں سے گونج اٹھی۔ چھتوں سے پھولوں کی پتیاں نچھاور کی جا رہی تھیں۔

رات ہوئی تو پورا شہر چراغاں سے بقعۂ نور بن گیا۔ شہزادی کی طرف سے اعلان ہوا۔ "فتح گوالیار کی خوشی میں سات روز تک جشن منایا جائے گا۔ قلعے کے دروازے کھول دیے گئے ہیں جہاں غریبوں میں لنگر تقسیم ہوگا۔ ضرورت مندوں کی ضرورتیں پوری کی جائیں گی۔ بھوکوں کو کھانا، ننگوں کو کپڑا دیا جائے گا۔"

یہ جشن اسی شان و شوکت سے منایا گیا۔ سلطان التمش نہایت پارسا اور متقی بادشاہ تھا۔ اس کے دربار میں جشن منانے کا مطلب یہ نہیں تھا کہ شراب کے دور چلتے رہیں، رقص و شباب کی محفلیں آراستہ ہوں۔ رضیہ سلطانہ بھی ایسی ہی پاکباز اور عبادت گزار تھی، یہ جشن ہوا ضرور لیکن بعض امراء یہ کہتے نظر آئے کہ اگر رکن الدین کے ہاتھ میں زمامِ اقتدار ہوتی تو جشنِ فتح کا عالم ہی دوسرا ہوتا۔ رکن الدین کو اقتدار میں لانے کی کوششیں اسی لیے کی جا رہی تھیں۔

سات روزہ جشن ختم ہوا تو التمش نے نظام الملک کو طلب کیا۔ اس سے گفتگو کرنے کے بعد شہزادی رضیہ کو تنہائی میں طلب کیا اور اس سے امورِ سلطنت میں پیش آنے والے تجربات کی بابت پوچھا۔ رضیہ نے یہاں پیش آنے والی سازشوں کے رنگوں سے اسے آشنا کیا اور سال بھر کے تھکا دینے والے شب و روز کی تفصیلات بتائیں۔ التمش کا چہرہ بتا رہا تھا کہ یہ تمام باتیں اس کی توقعات کے برعکس ہیں لیکن وہ یہ بھی جانتا تھا کہ جو شخص بھی تختِ شاہی پر قدم رکھتا ہے، اسے ان تجربات سے گزرنا ہوتا ہے۔ کسی کی اہلیت اور نااہلی تو اس وقت ثابت ہوتی ہے جب وہ ان مراحل سے... بہ خیر و خوبی گزرتا ہے۔

''میں یہی دیکھنا چاہتا تھا کہ میری غیر موجودگی میں تم ان مراحل سے کیسے گزرتی ہو۔ مجھے خوشی ہے کہ تم نے مجھے سرخرو کیا۔ اب مجھے یہ فکر نہیں کہ میرے بیٹے نااہل ہیں۔ مجھے خوشی ہے کہ میں نے اپنے آقا قطب الدین ایبک کی سلطنت کو جس طرح سنبھالا بلکہ اسے وسعت دی، میری بیٹی اسے سنبھالنے کے لیے موجود ہے۔ کہنے والے مجھ سے بھی کہہ رہے تھے کہ ایک بائیس سالہ لڑکی پورے ہندوستان پر حکمرانی کس طرح کرے گی؟ جگہ جگہ بغاوتیں پھوٹ پڑیں گی لیکن میں دیکھ رہا ہوں کہ کہیں سے کوئی آواز بلند نہیں ہوئی۔''

''باہر کے جھگڑوں سے نمٹا جاسکتا ہے لیکن جو سازشیں گھر میں ہو رہی ہیں، وہ تکلیف دہ ہیں۔''

''مجھے یقین ہے کہ تم اس پر بھی قابو پالوگی۔''

''آپ کو خدا اسلامت رکھے۔ میں ہر وقت آپ کے ساتھ ہوں۔''

☆☆☆

ملک التونیہ رضیہ سلطانہ کے عشق میں اندر ہی اندر گھل رہا تھا اور غالباً کوئی فیصلہ کر چکا تھا اسی لیے تو التمش کے واپس آتے ہی اس نے بھی دہلی جانے کا ارادہ کیا۔ اسے امید تھی کہ التمش اس کی درخواست ضرور قبول کرے گا کیونکہ وہ اس کا پسندیدہ غلام رہا تھا۔ جب وہ بھٹنڈا کا حاکم بنا تھا، اس کے بعد بھی التمش اس پر خاص توجہ رکھتا تھا۔ وہ جب بھی التمش کے سامنے جاتا تھا، التمش کی آنکھیں اسے دیکھ کر روشن ہوجاتی تھیں۔ یوں بھی اسے معلوم تھا کہ التمش اپنے غلاموں سے بہت محبت کرتا ہے۔ ان سب باتوں کے باوجود یہ پہلی مرتبہ تھا کہ التمش کے سامنے جاتے ہوئے اس کا دل دھڑک رہا تھا۔ بات ہی ایسی تھی کہ کہنے کی ہمت نہیں ہو رہی تھی۔ ایک باپ سے اس کی بیٹی مانگنا کتنا مشکل تھا...... اور باپ بھی التمش۔

التمش ابھی نمازِ عصر سے فارغ ہو کر اوراد و وظائف میں مشغول تھا کہ ایک کنیز نے آکر ملک التونیہ کی آمد کی اطلاع پہنچائی۔ سلطان نے اسے مخصوص کمرے میں طلب کرلیا جہاں وہ اپنے وزیروں سے ملاقاتیں کیا کرتا تھا۔

ملک التونیہ نے قدرے جھک کر سلام پیش کیا اور پھر سیدھا کھڑا ہوگیا۔ التمش نے اس کے دونوں ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے لیے اور اسے اپنے نزدیک بٹھا لیا۔ ملک التونیہ نے فتح گوالیار پر مبارک باد دی۔ سلطان نے بھٹنڈا کے حالات اور اردگرد کے علاقوں کے بارے میں پوچھا۔ ملک التونیہ نے نہایت شائستگی اور سعادت مندی سے سلطان کے سوالوں کے جوابات دیے۔ اس کے بعد وہ سراپا سوال بن کر کھڑا ہوگیا۔

''خدا کے بعد آپ ہی میرا سہارا ہیں۔ میری جان آپ پر فدا ہو۔ میری تلوار آپ کے لیے ہے۔ اگر آپ ہمیشہ کے لیے مجھے اپنی فرزندی میں قبول فرمالیں اور شہزادی کا ہاتھ میرے ہاتھ میں دے دیں تو غلام اسے اپنی خوش بختی سمجھے گا۔''

''میرے فرزند! میں نے تیری درخواست کو بہ غور سنا۔ میں تجھے اس لائق بھی سمجھتا ہوں کہ تو یہ درخواست کرے لیکن یہ درخواست قبل از وقت ہے۔ رضیہ سلطانہ ابھی شادی کے لیے رضامند نہیں۔ میں تیری خاطر پھر بھی اس کی رضا لینے کی کوشش کروں گا۔''

اس کے بعد التونیہ کے منہ میں الفاظ نہیں تھے کہ کچھ کہتا۔ وہ واپس چلا گیا۔ یہ قصرِ شاہی تھا۔ شاہی محلوں کی خاصیت ہی یہ ہوتی ہے کہ یہاں کوئی بات چھپی نہیں رہ سکتی۔ اس کھیل میں کنیزیں خوب کردار ادا کرتی تھیں۔ باتوں کو ادھر ادھر لے جاکر انعام وصول کیا کرتی تھیں۔ اس وقت بھی یہی ہوا۔ ملک التونیہ کو واپس گئے کچھ ہی دیر گزری تھی کہ رضیہ کی کنیز نے اس تک خبر پہنچا دی کہ وہاں کیا باتیں ہوئی ہیں۔

رضیہ سلطانہ کو بے اختیار ہنسی آگئی جیسے اس نے کوئی عجیب بات سن لی ہو۔ جیسے وہ کوئی مرد ہو اور اس کے لیے کسی مرد کا رشتہ آیا ہو۔ اس کے باپ نے کئی مرتبہ اسے احساس دلایا تھا کہ وہ لڑکی نہیں لڑکا ہے۔ اس نے تو پچھلے ایک سال ایسی زندگی گزاری تھی کہ ہر مرد اس کے سامنے گردن خم کیے رہتا تھا۔ بڑے بڑے منصب دار اسے سلطان معظم کہہ کر پکارتے تھے۔ وہ اسی نشے میں سرشار تھی کہ التونیہ درمیان

میں آگیا۔ وہ کیسا ہی مرد سہی لیکن کیا وہ مجھے فتح کرلے گا؟ وہ مجھ سے شادی کرنے نہیں، میری آزادی اور وقار پر ڈاکا ڈالنے آیا ہے۔ اسے شاید یہ بات پسند نہیں آئی کہ ہر مرد مجھے سجدہ کرے۔ وہ چاہتا ہے میں اسے سجدہ کروں۔ کیا جمال الدین یاقوت مرد نہیں۔ وہ میرے ہر قدم پر ایک سجدہ ثبت کرتا ہے۔ اس نے تو کبھی کوئی حق نہیں جتایا۔ اس کی آنکھوں میں، میں نے کئی سوال دیکھے ہیں لیکن وہ مجھے آزاد دیکھنا چاہتا ہے۔ نہیں، ہرگز نہیں۔ مجھے اپنے باپ کی سلطنت کو بچانا ہے۔ میں اس کارِ خیر میں ہرگز کسی کو شریک نہیں کرسکتی۔ اے رضیہ! کیا تو سلطان کے سامنے انکار کرسکے گی؟ اگر انہوں نے مجبور کیا تو، تو کیا جواز پیش کرے گی؟ میں کہہ دوں گی کہ میرے سامنے جو مقصدِ عظیم ہے اس کی تکمیل میں آزاد رہنا چاہتی ہوں۔

☆☆☆

گوالیار کی فتح کے بعد التمش کو مالوہ اور اجین کی طرف متوجہ ہونا تھا کیونکہ گوالیار کا راجا دیوپل مالوہ کی طرف بھاگ گیا تھا اور کافر قرامطیوں نے جو التمش کے لیے بلکہ تمام مسلمانوں کے لیے دردِ سر بنے ہوئے تھے، اجین کے مہاکال مندر میں پناہ لے رکھی تھی۔ یہ خبریں برابر پہنچ رہی تھیں کہ یہ قرامطی اور راجا دیوپل اپنی طاقت جمع کرکے دہلی پر حملہ آور ہونے کی تیاری کررہے ہیں۔ التمش ان کے طاقتور ہونے سے پہلے ان کی طاقت توڑ دینا چاہتا تھا تاکہ اسلامی سلطنت کا دفاع کرسکے۔ اسی لیے اس نے رضیہ سلطانہ کی شادی میں زیادہ دلچسپی کا اظہار نہیں کیا تھا۔ اسے ایک مرتبہ پھر شہزادی کو اپنی جانشین کے طور پر چھوڑ کر جانا تھا۔

سلطان نے اجین کے راجا کے نام خط روانہ کیا کہ راجا دیوپل ہمارا دشمن ہے، اسے ہمارے حوالے کردو۔ راجا اجین نے اس خط کا نہایت گستاخانہ جواب دیا۔

''یہ کوئی اور ریاست نہیں، اجین ہے اجین۔ اس طرف کا رخ کرنے کی کوشش بھی نہ کرنا۔ اس شہر کی حفاظت ہم نہیں ہمارے دیوتا کرتے ہیں۔ تم اگر اپنی قبر بنانا چاہتے ہو تو یہاں آجاؤ۔ راجا دیوپل کو ہم ہرگز تمہارے حوالے نہیں کریں گے۔ اگر زبردستی چھڑا کرلے جاسکتے ہو تو شوق پورا کرلو۔ ہم تمہارا انتظار کررہے ہیں۔''

التمش کی آتشِ غضب بھڑکانے کے لیے یہ جواب کافی تھا۔ وہ لشکرِ جرار کے ساتھ دہلی سے نکلا۔ اس کا پہلا ہدف ''مالوہ'' تھا جہاں بغاوت کی آگ بڑی شدت سے بھڑک رہی تھی۔ یہ ایک مضبوط ہندو ریاست تھی۔ اسے اپنی طاقت پر ناز بھی تھا۔ مالوہ کے حاکم نے اپنی اس طاقت پر نازاں ہوکر اپنے لشکر کو التمش کے سامنے ڈال دیا لیکن جلد ہی اسے اندازہ ہوگیا کہ وہ کس کوہِ گراں سے ٹکرا گیا ہے۔ وہ میدانِ جنگ سے فرار ہوگیا۔ مالوہ، التمش کی عملداری میں آگیا۔ اس نے قلعے پر اپنا حاکم متعین کیا اور خود ایک مقام بھیلسہ یا بھیلسان کی طرف بڑھا۔ اسے زیر کرنے کے بعد اسے اجین کی طرف جانا تھا۔

بھیلسہ میں موجود تھوڑے سے لشکر نے سلطان کی کوئی مزاحمت نہیں کی۔ دراصل اجین اور مہاکال مندر کے اندر جو دشمن کی قوت تھی، انہوں نے بھیلسہ والوں کو یہ پیغام پہنچا دیا تھا کہ وہ بھیلسہ کو خالی کردیں۔ اس طرح سلطان کو کوئی مزاحمت نہ کرنا پڑی اور بھیلسہ پر اس کا قبضہ ہوگیا۔

یہ مخالف قوتیں یہ چاہتی تھیں کہ اجین سے باہر سلطان کا ڈٹ کر مقابلہ کیا جائے۔ بلکہ راجا تو یہ کہہ رہا تھا کہ دیوتا خود التمش کو کھینچ کر میری طرف لارہے ہیں تاکہ وہ میرا مقابلہ کرے اور نیست و نابود ہوکر رہ جائے۔ التمش نے پھر اسے ایک خط تحریر کیا۔

''اگر راجا دیوپل کو میرے حوالے کردو تو میں دہلی کی طرف لوٹ جاؤں گا اور تم جنگ سے بچ جاؤ گے۔''

راجا اجین نے اس خط کا جواب بھی نہایت گستاخانہ دیا لہٰذا جنگ لازم ہوگئی۔ التمش کا مقابلہ کرنے کے لیے تین قوتیں یکجا ہوگئی تھیں۔ پہلی قوت خود اجین کی تھی جس کا لشکر منہ کھولے کھڑا تھا۔ دوسری قوت بھیلسہ والوں کی تھی۔ بھیلسہ والوں کا بھی بہت بڑا لشکر تھا جو بھیلسہ خالی کرکے اجین کی طرف چلا گیا تھا اور تیسری قوت مہاکال مندر والوں کی تھی جو مندر کم اور قلعہ زیادہ تھا۔ کافر قرامطیوں کی بہت بڑی تعداد وہاں جمع تھی جو مسلح تھے اور ہندوستان بھر میں چھاپا مار کارروائیاں کرتے پھرتے تھے۔ اور ایک اور طاقت تھی اور وہ تھی ان کا عقیدہ۔ اجین متبرک مقام سمجھا جاتا تھا۔ اس لیے کہ راجا بکرماجیت یہیں کا حکمران تھا اور یہی اس کا پایۂ تخت تھا لہٰذا یہاں کے عام شہری بھی اس شہر کو بچانے کے لیے سردھڑ کی بازی لگانے کو تیار تھے۔

دہلی اور اجین کے لشکر آمنے سامنے ہوئے۔ اجین کے لشکریوں کی تعداد اتنی زیادہ تھی کہ لگتا تھا ان کے بوجھ سے زمین بیٹھ جائے گی۔ یہی وہ عددی برتری تھی جس سے اجین والوں کو یقین ہوگیا تھا کہ ان کی فتح لازمی ہے۔

جنگ شروع ہوئی۔ ابتدا میں لگتا تھا کہ یہ جنگ ہاتھی اور بکری کی ٹکر ہے لیکن دیکھتے ہی دیکھتے صورتِ حال تبدیل

ہونے لگی۔ میدان جنگ لاشوں سے پٹ گیا۔ ان میں اکثریت ہندوؤں کی تھی۔ ساری طاقت دھری رہ گئی اور راجا بکرماجیت اپنے متبرک شہر کو چھوڑ کر فرار ہوگیا۔ اجین کے قلعے پر سلطان کا پرچم لہرا دیا گیا۔

بکرماجیت کے وہ سپاہی جو قتل ہونے سے بچ گئے تھے، بھاگ کر مہاکال کے مندر میں روپوش ہوگئے۔ یہ مندر اپنی مضبوطی میں کسی قلعے سے کم نہیں تھا بلکہ اس زمانے میں ہندوستان کا کوئی قلعہ بھی اس سے زیادہ مضبوط نہ ہوگا۔ کہا جاتا تھا کہ اس کی تعمیر میں تین سو سال لگے تھے۔

سلطان نے کچھ سپاہیوں کو اجین میں چھوڑا اور مہاکال مندر کے سامنے جا کھڑا ہوا۔ مندر کی دیواریں اور دروازے اتنے مضبوط تھے کہ اندر جانے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ کئی دن تک ان دیواروں پر پتھر برسائے جاتے رہے۔ تب کہیں جا کر کئی ہفتوں کی محنت کے بعد دیواروں میں شگاف پڑے اور سلطان کے لشکری کمندیں ڈال کر مندر کے صحن میں اتر گئے۔ یہ ایسا حیرت انگیز منظر تھا جسے چشم فلک نے کبھی نہ دیکھا ہوگا۔ مندر کے پروہتوں نے بھی نہ سوچا ہوگا کہ کبھی ایسا وقت بھی آئے گا۔

التمش کے سپاہیوں نے اندر پہنچتے پہنچتے ہی مندر میں روپوش سپاہیوں کو قتل کرنا شروع کر دیا۔ ان قرامطیوں کا بھی صفایا کر دیا جو محمود غزنوی سے لے کر اس وقت تک مسلمانوں کو نقصان پہنچاتے چلے آرہے تھے اور کسی مسلمان بادشاہ کو چین سے نہیں رہنے دیا تھا۔

التمش کا مشن پورا ہو چکا تھا۔ مالوہ اور اجین اس کی سلطنت کا حصہ بن چکے تھے۔ وہ کامران د کامیاب دہلی لوٹ آیا۔

جشن فتح کی گہما گہمیوں سے فارغ ہونے کے بعد اس نے امراء کا اجلاس طلب کیا۔ اس اجلاس میں خلافِ معمول اس کے بیٹے بھی شامل ہوئے۔ رکن الدین بھی بدایوں سے دہلی آیا۔

کسی کو نہیں معلوم تھا کہ وہ اس اجلاس میں کیا کہنے والا ہے۔ لوگ اپنے قیاس سے یہ اندازہ کر رہے تھے کہ وہ اجین اور مالوہ کی فتح کے بعد پہلا اجلاس بلا رہا ہے اس لیے وہاں پیش آنے والے معاملات اور وہاں کے انتظامی امور کے بارے میں باتیں کرے گا۔ ان کا یہ اندازہ غلط بھی نہیں تھا کیونکہ اس نے بات وہیں سے شروع کی تھی۔ اس جہاد میں حصہ لینے والوں کو خراج تحسین پیش کیا تھا۔ شہداء کے حق میں فاتحہ خوانی کی تھی۔

فاتحہ خوانی کے بعد التمش نے سب کو مخاطب کر کے ایسا اعلان کر دیا کہ سکوت، شور میں تبدیل ہوگیا۔ امراء کی صفوں میں ہلچل مچ گئی۔

''ہر مسلمان کو اپنی موت یاد رکھنی چاہیے اور میں تو اتنا تھک چکا ہوں کہ اپنی موت صاف نظر آرہی ہے۔ میں اپنی وصیت آپ لوگوں کے سامنے رکھ رہا ہوں تاکہ جھگڑا کھڑا نہ ہو۔ میں آپ سب پر واضح کر رہا ہوں کہ شہزادی رضیہ سلطانہ میری جانشین بھی ہے اور ولی عہد سلطنت بھی۔ میرے مرنے کے بعد میرے امراء پر لازم ہے کہ وہ میری وصیت کا احترام کریں۔''

یہ ایسا اعلان تھا جس کی تاریخ میں کوئی مثال نہیں ملتی تھی۔ کسی بادشاہ نے اپنی بیٹی کو ولی عہد مقرر نہیں کیا تھا۔ حق تو بیٹے ہی کا سمجھا جاتا تھا۔ امراء کی صفوں میں بے چینی پھیل گئی کہ ہمیں یہی وصیت کے احترام کے لیے کہا جارہا ہے سب کی نظریں رکن الدین کی طرف اٹھیں کہ اسے اپنے حق میں بولنا چاہیے پھر دوسرے لوگ بھی بولیں گے۔ رکن الدین پر تو جیسے سکتہ طاری ہوگیا تھا۔ وہ پھٹی پھٹی آنکھوں سے بادشاہ کی طرف دیکھ رہا تھا۔ پھر جیسے اسے ہوش آگیا۔ وہ اپنی نشست سے اٹھ کر کھڑا ہوگیا۔

''سلطان معظم! جو کچھ آپ کی زبانِ مبارک سے ادا ہوا، کیا یہ حق تلفی نہیں؟ بڑا بیٹا میں ہوں۔ ولی عہدی کا حق میرا ہے۔ یہ سراسر ناانصافی ہے کہ بیٹے کے ہوتے ہوئے آپ بیٹی کے لیے وصیت کر رہے ہیں۔ اس فیصلے کو میں تو کیا آپ کے امراء بھی تسلیم نہیں کریں گے۔'' اس نے امراء کی صفوں کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

''تم ناخلف ہو جو سرِ دربار باپ کے فیصلے کو ٹھکرا رہے ہو ورنہ میرے امراء میں سے کسی کو یہ جرأت نہ ہوسکے گی۔'' سلطان نے کہا اور پھر نظام الملک سے مخاطب ہوا۔ ''نظام الملک! تم بتاؤ میرے فیصلے میں کیا خرابی ہے؟ کیا شہزادی رضیہ اس عہدے کی اہلیت نہیں رکھتی؟''

التمش جانتا تھا کہ ویسے تو کسی کو کچھ کہنے کی ہمت نہ ہوگی۔ اگر ان کے دلوں میں کوئی بات ہے تو کھل کر سامنے آجائے تاکہ وہ اس کا جواب دے سکے۔ نظام الملک جھجکتے ہوئے کھڑا ہوا۔

''میری یہ مجال کہاں کہ آپ کے فیصلے کے برخلاف سوچوں لیکن ایک بات کھٹکتی ہے۔''

''بلاخوف کہو...... اجازت ہے۔''

''سلطانِ معظم! لائق بیٹوں کی موجودگی میں بیٹی کا

انتخاب اس خادم کی سمجھ میں نہیں آیا۔''

''یہ فیصلہ ابھی تمہاری سمجھ میں آجائے گا۔'' سلطان نے کہا اور پھر دوسرے امراء کی طرف متوجہ ہوا۔ ''کسی اور کو کچھ کہنا ہے تو میں وہ بھی سننے کو تیار ہوں۔''

دوسرے امراء نے اعتراض اٹھائے ضرور لیکن وہ بھی اس کے سوا کچھ نہیں تھے جو نظام الملک کہہ چکا تھا۔ التمش نے تمام لوگوں کی باتیں غور سے سنیں اور پھر ان سے مخاطب ہوا۔

''تمہارے اعتراضات بالکل درست ہیں لیکن کچھ دیر کے لیے میری محرومی پر بھی غور کرو۔ میں وہ بدنصیب باپ ہوں جس کے بیٹوں میں سے کوئی بیٹا بھی اس لائق نہیں جو اس بارِ گراں کو اٹھا سکے۔ سب کے سب عیش و عشرت میں مبتلا ہیں۔ اگر زمامِ اقتدار ان نااہلوں کے ہاتھوں میں چلی گئی تو اس عظیم الشان سلطنت کے ٹکڑے ہوتے دیر نہیں لگے گی۔ یہ شاہی محل شرابیوں اور جواریوں کا گڑھ بن کر رہ جائے گا۔ کیا تمہیں یہ قبول ہوگا؟ رضیہ پاکباز بھی ہے مدبر بھی اور شمشیر زن بھی۔ اس کی جنگی تربیت میں بہرام غوری نے کوئی کسر اٹھا نہیں رکھی ہے۔ تم مجھے بتاؤ عورت ہونے کے سوا تم نے اس میں کوئی اور عیب دیکھا؟ اگر نہیں دیکھا تو عورت مرد سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ ہمیں تو وہ حکمراں چاہیے جو ہندوستان میں اسلام کے نام کو زندہ رکھ سکے۔ اب تم مجھے بتاؤ اور کیسا حکمراں تمہیں درکار ہے؟''

دربار میں سانپ سونگھ گیا تھا۔ اس کے سوا کوئی اور نئی بات نہیں ہوئی تھی۔ ترکان شاہ کے چہرے کی سیاہی مزید بڑھ گئی تھی۔ اسے یہ فیصلہ ظاہر ہے پسند نہیں تھا لیکن کہ اس وقت بولنے کا کوئی فائدہ نہیں۔

''میں سمجھتا ہوں میں نے تمہارے اعتراضات دور کر دیے ہیں۔ تمہاری خاموشی بتا رہی ہے کہ تم قائل ہو چکے ہو۔''

سب نے یک زبان کہا۔ ''ہمیں حکمِ سلطانی سے مکمل تعاون ہے۔''

سلطان نے شہزادی کی ولی عہدی پر تمام امراء سے حلف لیا۔ نظام الملک بھی حلف اٹھانے والوں میں شامل تھا۔

☆☆☆

اجین کی آب و ہوا نے سلطان کی صحت پر نہایت برے اثرات مرتب کیے تھے۔ اسے مسلسل آرام کی ضرورت تھی لیکن سلطنت کے انتظامی امور ایسے تھے کہ جان نہیں چھوڑ رہے تھے۔ طویل جنگی مہمات نے اسے تھکا دیا تھا اور اب وہ داخلی امور کو نمٹانے میں مصروف تھا۔ یہ دکھ الگ تھا کہ کوئی بیٹا اس لائق نہیں جو ہاتھ بٹا سکے۔ اس نے رضیہ سلطانہ کو ولی عہد مقرر ضرور کر دیا تھا لیکن یہ حسرت دل کو بے کل ضرور رکھتی تھی کہ کاش اسے یہ قدم اٹھانا نہ پڑتا۔ رضیہ کچھ بھی سہی ایک عورت ہے۔ وہ راستے کے کانٹے ہٹاتے ہوئے کتنی تھک جائے گی۔ وہ دن رات ان کوششوں میں مشغول تھا کہ رضیہ کے لیے جتنی سہولتیں پیدا کرسکتا ہے کر دے۔ ایسے اسباب فراہم کر دے کہ جب رضیہ تخت نشین ہو تو اسے مشکلات کا سامنا نہ ہو۔ وہ طبیبوں کے مشوروں کو ٹالتا رہا اور آرام کی طرف سے غافل ہو گیا۔

اس کی صحت ہرگز اس قابل نہیں رہ گئی تھی کہ وہ سفر کی صعوبتیں برداشت کرتا لیکن چند انتظامی امور کے سلسلے میں اسے ملتان کا سفر اختیار کرنا پڑا۔ وہاں پہنچتے ہی اسے بیماری نے گھیر لیا۔ طبیب ساتھ تھے۔ ہر دوا آزمائی لیکن مرض میں اضافہ ہوتا چلا گیا۔ اتنا نحیف ہو گیا تھا کہ گھوڑے پر بیٹھ بھی نہیں سکتا تھا۔ اسے عماری میں بٹھا کر دہلی لایا گیا۔ یہاں پہنچ کر بھی کوئی افاقہ نہیں ہوا۔ روز بہ روز موت کے قریب ہوتا چلا گیا۔ یہاں تک کہ اسے اپنی موت کا یقین ہو گیا۔ مرنے سے ایک دن قبل اس نے اپنے امراء کو طلب کیا اور انہیں ان کا عہد یاد دلایا۔

''تم سب اس کے گواہ ہو کہ میں نے آج تک کسی کا حق نہیں مارا۔ تم میں سے کسی کو نوکر نہیں مجاہد اسلام سمجھا۔ اپنے دست و بازو سمجھا۔ تم سے وفا کی امید رکھی۔ اب مجھ پر وہ وقت آنے والا ہے جو ہر انسان پر آتا ہے۔ اس وقت مجھے تمہاری پہلے سے بھی زیادہ ضرورت ہے۔ تم نے مجھ سے عہد کیا تھا کہ تمہیں شہزادی رضیہ کی ولی عہدی قبول ہے۔ مجھ سے ایک مرتبہ پھر عہد کرو کہ میری موت کے بعد تم اس کی حکمرانی قبول کرو گے اور اسے تخت نشین ہونے میں اس کی مدد کرو گے ورنہ سب کچھ ختم ہو جائے گا۔ مجھے ترکان شاہ کی طرف سے سخت خطرہ ہے۔''

اراکینِ سلطنت نے بیک آواز کہا۔ ''اللہ تعالیٰ آپ کو صحت عطا فرمائے۔ ہر اندیشہ دل سے نکال دیں۔ ہم آپ کو شرمندہ نہیں کریں گے۔ ہمیں شہزادی رضیہ کی سربراہی دل و جان سے قبول ہے۔ ہم ہمیشہ انہیں آپ کی جگہ سمجھیں گے۔ ان کا حکم آپ کا حکم ہوگا۔ ان کی راہ میں جو بھی مزاحم ہوا، ہم اس کا فیصلہ تلوار سے کریں گے۔ ہماری تلواریں آپ کے لیے ہیں۔''

التمش نے اللہ کا شکر ادا کیا پھر اپنے امراء سے معذرت کا طلب گار ہوا۔

''کسی کو میری جانب سے دکھ پہنچا ہو تو وہ مجھے معاف کردے۔''

وہاں سے اٹھتے ہی نظام الملک اپنے منصوبے کی تکمیل کے لیے سرگرم ہوگیا۔ اس کی جہاں دیدہ نظروں نے بھانپ لیا تھا کہ بادشاہ بس اب چند گھڑی کا مہمان ہے۔ اس نے بادشاہ کی وصیت پر عمل کرنے کا عہد زبان سے کیا تھا، دل کچھ اور کہہ رہا تھا۔ اس نے اپنے ہم خیال امراء سے ایک خفیہ ملاقات کی۔ اس میں یہ طے ہوا کہ بادشاہ کے مرتے ہی اس کی وصیت کو ہوا میں اڑا دیا جائے اور حق بہ حق دار رسید کے مطابق شہزادہ رکن الدین کو تخت پر بٹھا دیا جائے۔ اسے ان امراء کو تیار کرنے میں زیادہ محنت نہیں کرنی پڑی کیونکہ ایک تو رضیہ سلطانہ کے عورت ہونے کی وجہ سے سب اس کے خلاف تھے۔ دوسرے رکن الدین کی عیش پرستی سے سب واقف تھے۔ سب جانتے تھے کہ وہ محض ایک کٹھ پتلی بادشاہ ہوگا۔ ہمیں اپنی من مانیاں کرنے کا خوب موقع ملے گا۔ علاؤ الدین شیر خانی، رضیہ سلطانہ سے شادی کرنے کا خواہش مند تھا۔ اسے یہ امید ہو چلی تھی کہ رضیہ کی بے بسی سے فائدہ اٹھا کر وہ اس سے شادی کرلے گا۔ اگر وہ حکمراں بن گئی تو پھر یہ مشکل ہو جائے گا۔ اس نے برسرِ اجلاس کہا۔

''سلطان التمش نے تو قلعے کو مسجد بنا دیا ہے۔ نہ رقص کی محفلیں جمتی ہیں، نہ شراب کے دور چلتے ہیں۔ ہمیں تو شراب بھی چھپ کر پینی پڑتی ہے۔ یہی حال رضیہ کے دورِ حکومت میں بھی ہوگا۔ رکن الدین کے دور میں کم از کم ہمیں کھل کر سانس لینے کا تو موقع ملے گا۔''

''پھر آپ لوگ کیا کہتے ہیں؟''

''ہم سب تمہارے ساتھ ہیں لیکن پہلے سلطان کو مرنے تو دو۔''

''اس کے لیے زیادہ انتظار نہیں کرنا پڑے گا۔ میں ابھی شاہی طبیب کی طرف سے ہوتا ہوا آرہا ہوں۔ وہ سخت مایوس ہے۔ سلطان بس چند گھڑی کے مہمان ہیں اور اگر بچ بھی گئے تو ہم خود مار دیں گے۔ نام یہی ہوگا کہ بیماری نے مار دیا۔'' نظام الملک نے کہا اور ایک ساتھ کئی قہقہے بلند ہوئے پھر یہ قہقہے ادھورے رہ گئے۔ نالہ و شیون کی آوازیں آئیں اور پھر ایک کنیز آگئی۔

''سلطان التمش اس دارِ فانی سے کوچ کر گئے۔''

نظام الملک فوراً آگیا اور انتظامات سنبھال لیے۔ سب سے پہلا کام اس نے یہ کیا کہ التمش کا جنازہ اٹھتے ہی رضیہ سلطانہ کو نظر بند کر کے پہرا بٹھا دیا۔ وہ چیختی چلاتی رہ گئی۔ اس کی فریاد سننے والا کوئی نہیں تھا۔ اس کے ہمدرد ارکین تعداد میں تھوڑے تھے۔ وہ وقت آنے کے انتظار میں خاموش ہوگئے۔ نظام الملک وزیراعظم تھا اور پھر طاقتور لوگ اس کے ساتھ تھے، کسی کی ایک نہ چلی۔

تمام لوگ بادشاہ کے صدمے میں تھے۔ تعزیت کے لیے آنے والوں کا تانتا بندھا ہوا تھا۔ کسی کو ہوش بھی نہ رہا کہ رضیہ کے ساتھ کیا ہوگیا۔ ملازمین یہی سمجھ رہے تھے کہ شہزادی کو باپ کی وفات کا ایسا صدمہ پہنچا ہے کہ کمرے میں بند ہو کر رہ گئی ہے۔ کسی کو کچھ معلوم بھی تھا تو منہ سے لفظ نکالتے ہوئے ڈرتا تھا۔

سلطان التمش کی وفات کو چار دن گزرے تھے کہ امراء میں سے کسی کو اپنے وعدے یاد نہ رہے۔ بادشاہ کی وصیت مفادات کی نذر ہوگئی۔ امرائے سلطنت نے رضیہ سلطانہ کے بجائے سلطان کے بیٹے رکن الدین فیروز شاہ کو تخت پر بٹھا دیا۔ وزیروں اور امیروں نے نذریں پیش کیں اور شاعروں نے مبارک بادی کے قصیدے لکھے اور انعام سے سرفراز ہوئے۔

بہرام غوری اور سیف الدین ایک نہایت بااثر امیر تھے اور رکن الدین کے اقتدار کے حق میں نہیں تھے لیکن سازشوں کی آندھی ایسی چلی تھی کہ دونوں بے بس ہو کر رہ گئے تھے۔ سمجھ میں نہیں آتا تھا کہ ان طاقتوں سے کیسے ٹکرائیں۔ ان دونوں نے ایک جگہ ملاقات کی تاکہ یہ طے کرسکیں کہ ان حالات سے کیسے نمٹا جائے۔ بہرام غوری تو اتنے غصے میں تھا کہ ملاقات کے لیے آیا تو تلوار نیام سے باہر تھی۔

''سلطان کے ساتھ امراء نے ایسی غداری کی ہے کہ تلوار کے سوا ان کا کوئی علاج نہیں۔'' بہرام غوری کہہ رہا تھا۔

''بہرام! یہ وقت دل سے نہیں، دماغ سے سوچنے کا ہے۔'' سیف الدین نے کہا۔

''میں اپنی جان پر کھیل کر رکن الدین کا سر قلم کردوں گا۔''

''اس سے کیا ہوگا؟ شطرنج کے باقی مہرے اسی طرح رہیں گے۔''

''تو کیا تم نے مجھے یہ کہنے کو بلایا ہے کہ اس فیصلے پر سرِ تسلیم خم کردیں۔''

''ہاں، تقریباً یہی کہنے کو بلایا ہے۔''

''پھر میرے اور آپ کے راستے جدا ہیں۔ میں یہ فیصلہ نہیں مانتا۔''

''بہرام غوری! میری بات سنو۔ تم بھی چاہتے ہو

تا کہ شہزادی عالیہ محفوظ رہیں؟''

''میں تو صرف یہ چاہتا ہوں کہ وہ سلطان کی وصیت کے مطابق تختِ شاہی پر جلوہ افروز ہوں۔''

''وہ محفوظ رہیں گی تو اقتدار تک پہنچیں گی۔''

''چلو یہی سہی......اور کہو کیا کہنا چاہتے ہو؟''

''اس وقت جذباتی ہونے کی ضرورت نہیں۔ وقت کا تقاضا یہ ہے کہ ہم اپنی مخالفت ظاہر نہ کریں، شہزادہ رکن الدین کی حمایت کرتے رہیں۔ ہماری مخالفت ظاہر ہوگئی تو ہمیں شہزادی سے دور کر دیا جائے گا۔ ہمیں کچھ معلوم نہ ہو سکے گا کہ وہ کس حال میں ہیں۔ ہم ان کی کوئی مدد نہ کر سکیں گے۔ مصلحت یہی ہے کہ ترکان شاہ اور نیا بادشاہ ہم پر اعتماد کرے۔ اگر وہ سازش کر رہے ہیں تو ہم بھی یہ چھوٹی سی سازش کریں۔ حالات جیسے جیسے آگے بڑھتے ہیں، آئندہ کا لائحہ ہم اس وقت طے کریں گے۔ ہم دل سے نہیں، زبان سے رکن الدین کی وفاداری کا دم بھرتے رہیں گے۔''

یہ باتیں بہرام غوری کے دل میں اتر گئی تھیں۔ وہ سیف الدین سے متفق نظر آ رہا تھا۔

''مجھے یقین ہے کہ سوگ کے دن گزر جانے کے بعد ترکان شاہ ضرور ہمیں بلائیں گی اور ہم سے وفاداری کا عہد لیں گی۔ ہمیں انہیں ہر حال میں مطمئن کرنا ہے۔ ہم ان کا اعتماد حاصل کر کے ہی شہزادی عالیہ کی حفاظت کر سکتے ہیں۔''

ترکان شاہ نے سوگ اترنے کا انتظار بھی نہیں کیا اور ایک ہنگامی اجلاس طلب کر لیا۔ اس اجلاس میں بہرام غوری اور سیف الدین کو خاص طور پر بلوایا گیا کیونکہ ان کی طرف سے ترکان شاہ کے دل میں کچھ شک تھا جسے وہ دور کرنا چاہتی تھی۔ رکن الدین اور وزیراعظم نظام الملک بھی موجود تھے۔

ترکان شاہ نے بات کا آغاز بہرام غوری اور سیف الدین ایبک ہی سے کیا تھا۔

''رضیہ سلطانہ کی ولی عہدی پر آپ دونوں نے بھی حلف اٹھایا تھا۔ کیا آپ دونوں اب بھی اس پر قائم ہیں؟''

یہ ایسا ترچھا سوال تھا کہ دونوں کچھ دیر کے لیے ششدر کر رہ گئے لیکن پھر سیف الدین نے جواب دیا۔

''ہم نے شہزادی عالیہ کی ولی عہدی کا عہد ضرور کیا تھا لیکن یہ عہد نہیں تھا کہ ہم شہزادہ رکن الدین کی مخالفت کریں گے۔ اب جبکہ وزیراعظم کی دور اندیشی نے شہزادہ عالی کے اندر چھپے ہوئے جوہر تلاش کر لیے ہیں تو ہم بھی ان کے ساتھ ہیں۔ ہم مخالفت کا سوچ بھی نہیں سکتے اور یوں بھی ہم دونوں سپاہی ہیں ہمیں ان باتوں سے کوئی سروکار نہیں۔ ہم ہر اس شخص کی عزت کریں گے جو سلطانِ معظم کی نشانی ہے۔''

''نشانی تو رضیہ سلطانہ بھی ہے۔'' عیار ترکان شاہ نے ان کی نیت کو بھانپتے ہوئے کہا۔

''ہم ان کی بھی عزت کرتے ہیں لیکن حکم تو اس کا مانیں گے جو تختِ شاہی پر جلوہ گر ہے۔''

''اگر رضیہ سلطانہ اور رکن الدین کے درمیان انتخاب کا مرحلہ پیش آیا تو تم کس کے ساتھ کھڑے ہو گے؟''

''ملکۂ عالیہ! ہم آپ کی آنکھوں کا اشارہ دیکھیں گے۔ ہمارے لشکر آپ کی جنبشِ ابرو پر سفر کریں گے۔''

ترکان شاہ اسی دن کے انتظار میں تھی کہ وہ ملکۂ عالیہ کہلائے۔ سیف الدین ایبک نے اس کی ابتدا کر دی تھی۔ یہ وہ شخص تھا جس کے زیرِ اثر سپاہیوں کی بڑی تعداد تھی۔ وہ اگر بغاوت پر اتر آتا تو کچھ بھی ہو سکتا تھا۔ ایسا شخص اس کے سامنے سر جھکائے کھڑا تھا۔ بہرام غوری شہزادی کا اتالیق رہ چکا تھا۔ اگر شہزادی سے کوئی کام نرمی سے نکلنا ہوا تو یہ شخص بہت کام آ سکتا ہے۔ ترکان شاہ یہ سوچ سوچ کر جھوم رہی تھی۔

''شاباش! مجھے تم دونوں سے یہی امید تھی کہ تم ہماری وفاداری کا اقرار کرو گے اور ہمارے بیٹے کے ہاتھ مضبوط کرنے میں ہمارے ساتھ تعاون کرو گے۔ اگر اسی طرح وفاداری سے پیش آتے رہے تو ہم تمہیں مالا مال کر دیں گے۔''

رکن الدین اس وقت بھی نشے میں بدمست بیٹھا تھا۔ اس کے نزدیک یہ بحث فضول تھی جو کی جا رہی تھی۔ وہ چاہتا تھا یہ دونوں جلد از جلد جائیں تا کہ اسے بھی اٹھنے کا موقع ملے۔ اس نے ترکان شاہ کا بھی خیال نہیں کیا جو ان سے بحث کر رہی تھی اور ہاتھ کے اشارے سے دونوں کو باہر جانے کے لیے کہا۔ بہرام غوری اور سیف الدین نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔ یہ ان کی سخت بے عزتی تھی۔ اس طرح تو کنیزوں اور غلاموں کو باہر جانے کے لیے کہا جاتا تھا۔ غوری کے ماتھے پر بل پڑ گئے تھے لیکن سیف الدین ایبک نے گردن جھکا کر اجازت چاہی اور غوری کو لے کر باہر آ گیا۔

''تم نے دیکھا سلطان کی آنکھیں بند ہوتے ہی ہماری کیا عزت رہ گئی ہے۔'' بہرام غوری نے کہا۔

''دوست! ابھی تو بہت کچھ دیکھنا پڑے گا۔ ہمیں ضبط سے کام لینا ہے۔ اسی طرح ہمارا مقصد پورا ہوگا۔'' ان دونوں کے باہر نکلتے ہی رکن الدین بھی اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔

''ہم نے ایک نئی کنیز ملازم رکھی ہے۔ ہمیں اس کے پاس جانا ہے۔'' رکن الدین نے کہا اور اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔

وہ بادشاہ تھا اسے کون روک سکتا تھا۔ دو کنیزیں اندر آئیں اور اسے سہارا دیے کر باہر کھڑی پالکی تک لے گئیں۔

نظام الملک دل ہی دل میں ہنس رہا تھا۔ ایسے ایسا ہی بادشاہ درکار تھا۔ جو باتیں بادشاہ سے کرنے کی تھیں، ترکان شاہ اس سے کر رہی تھی۔

رکن الدین کے جاتے ہی نظام الملک نے ترکان شاہ کے کان میں وہ بات ڈال دی جو اس کے منصوبے کا حصہ تھی۔

''آپ ان دونوں فوجیوں پر انعام واکرام کی بارش کرتی رہیں تاکہ یہ آپ کے وفادار رہیں ورنہ اگر فوجی بغاوت ہوگئی تو سنبھالنا مشکل ہوجائے گا۔''

''اس کا مطلب تو یہ ہوا کہ ہم ان کے دستِ نگر ہو کر رہ جائیں گے۔''

''اس عرصے میں ہم نیا لشکر تیار کرلیں گے یا میں عام فوجیوں کو خرید کر ان دونوں کے خلاف کردوں گا۔'' ترکان شاہ اس کے ذہن کی داد دیے بغیر نہ رہ سکی۔

نظام الملک نے اس منصوبے پر عمل پیرا ہونے کے لیے ترکان شاہ کو لوٹنا شروع کردیا۔ ترکان شاہ نے وزیرِ خزانہ کو حکم دے دیا کہ نظام الملک جس وقت جتنی رقم چاہیں، انہیں دے دی جائے۔

ترکان شاہ بہت جلدی میں تھی۔ اس کے بیٹے کو حکومت مل گئی تھی لیکن رضیہ سلطانہ ابھی زندہ تھی۔ ترکان شاہ کو اس کی طرف سے برابر کھٹکا لگا ہوا تھا۔ وہ برابر اس کوشش میں لگی ہوئی تھی کہ رضیہ سلطانہ کو قتل کردیا جائے۔ رضیہ کا قتل کسی معمولی منصوبہ بندی کے طفیل نہیں ہوسکتا تھا۔

''میں اب زیادہ صبر نہیں کرسکتی۔ رضیہ جب تک زندہ ہے میرے بیٹے کے سر پر تلوار لٹکتی رہے گی۔ رضیہ کو راستے سے ہٹادو تاکہ میں سکون کی نیند سوسکوں۔''

نظام الملک خود بھی یہی چاہتا تھا لیکن اس کے چاہنے سے کیا ہوتا تھا۔ وہ یہ جانتا تھا کہ رضیہ کا قتل ایسا بھیانک طوفان کھڑا کردے گا جس کا مقابلہ رکن الدین جیسا کمزور بادشاہ نہیں کرسکے گا۔ اس افراتفری سے غوری یا ایبک میں سے کوئی ایک فائدہ اٹھالے گا۔ اس کے اور ترکان شاہ کے ہاتھ کچھ بھی نہیں لگے گا۔ اس نے ترکان شاہ کو سمجھانے کی کوشش کی۔

''رضیہ کا قتل کوئی معمولی قتل نہیں ہوگا۔ وہ سلطان کی نشانی ہے۔ اگر اس کے قتل پر فوج نے بغاوت کردی تو اس کی لپیٹ میں آپ آئیں گی۔ رکن الدین کو بھی تخت سے اتارا جاسکتا ہے۔''

''مجھے یہ سوچ کر نیند نہیں آتی کہ رضیہ محل میں موجود ہے۔ اس کے حامی کسی وقت بھی زور پکڑ سکتے ہیں۔''

''میں نے اس کا انتظام کرلیا ہے۔ میں آہستہ آہستہ سلطانی فوج کو اس کے خلاف کرتا جارہا ہوں۔ ایک وقت آئے گا کہ اس کے ساتھ کوئی نہیں رہے گا۔ وہ اپنی موت آپ مرجائے گی۔ بے سہارا کشتی زیادہ دیر سطحِ آب پر نہیں رہتی۔''

ترکان شاہ چپ تو ہوگئی لیکن مطمئن نہیں تھی۔ اب اس نے رضیہ کو اکیلا کرنے کے لیے اپنے اقدامات خود کرنے شروع کردیے۔ سب سے پہلے جمال الدین... یاقوت حبشی کو ''امیر آخور'' کے عہدے سے معزول کردیا۔

''تم ایک غلام ہو غلام بن کر رہو۔ رضیہ کے دروازے پر پڑے رہو۔''

''میرے لیے یہی بہت ہے کہ میں شہزادی کی غلامی میں ہوں۔''

''ابھی ڈھیل دے رہی ہوں ورنہ میں یہ بھی کرسکتی ہوں کہ یہ غلامی بھی چھین لوں۔''

''خدا کے لیے ایسا نہ کیجیے گا۔''

''میں اس لیے تجھے اس کی خدمت پر مامور کررہی ہوں کہ وہ یہ جان لے کہ ہم اپنے نافرمانوں کے ساتھ یہ سلوک کرتے ہیں۔''

رضیہ کا حال یہ تھا کہ پابندِ سلاسل تھی۔ جتنے وفادار تھے بظاہر دشمنوں میں جا کھڑے ہوئے تھے۔ ماں سب سے بڑی دشمن بنی ہوئی تھی، بھائی جیسی ہستی خون کی پیاسی ہو رہی تھی۔ باہر کیا ہورہا ہے، کچھ پتا نہیں چل رہا تھا۔ ایک غلام حبشی تھا جو باہر کی کچھ خبریں لے آتا تھا۔ سب سے بڑی خبر یہی تھی کہ رکن الدین فیروز عیش وعشرت میں اتنا مبتلا ہوگیا ہے کہ امورِ مملکت کے تمام کام اس نے اپنی ماں ترکان شاہ کے سپرد کردیے ہیں۔ ترکان شاہ ایک ایک چال سنبھل سنبھل کر چل رہی تھی۔

☆☆☆

جب رضیہ سلطانہ کی بساطِ سیاست الٹ گئی اور وہ کمزور سے کمزور ہوتی چلی گئی تو علاؤ الدین شیر خانی نے جو ایک نامور امیر تھا، اپنے ارمانوں کو پورا ہوتے ہوئے دیکھا۔

اب حکومتِ ہند میں یہی ہورہا تھا کہ جس کو اپنی جو بات منوانی ہوتی تھی، ترکان شاہ کے دربار میں حاضر ہوتا تھا۔ رکن الدین برائے نام بادشاہ تھا۔ حکومت تو دوسرے لوگ کررہے تھے۔ علاؤ الدین شیر خانی نے بھی ترکان شاہ

کے نقشِ قدم پر سجدہ کیا۔

''ملکہ عالیہ! اب ضروری ہوگیا ہے کہ شہزادی رضیہ کو پابہ زنجیر کردیا جائے۔''

''اس سے کیا ہوگا؟ میں تو چاہتی ہوں اس کی آواز ہی بند ہوجائے۔''

''وہ اگر بولے بھی تو وہ جو ہم کہیں۔'' شیر خانی نے ملکہ کی بات کو آگے بڑھایا۔

''ہمیں نظام الملک کی جانب سے شک ہونے لگا ہے۔ وہ رضیہ کو مسلسل رعایتیں دے رہا ہے۔''

''تالی بھی بجے اور ہاتھ بھی نہ دکھیں۔ اس بارے میں آپ کیا کہتی ہیں؟''

''میں تمہاری بات کا مفہوم نہیں سمجھی۔''

''رضیہ سلطانہ کا ہاتھ میرے ہاتھ میں دے دیں۔ میری حمایت بھی ہمیشہ کے لیے آپ کی ہوجائے گی اور میں رضیہ کو بھی آپ کی نظروں سے دور کردوں گا۔''

''تمہاری بتائی ہوئی ترکیب ایسی نہیں جسے آسانی سے رد کیا جاسکے لیکن مجھے امید نہیں کہ وہ اتنی آسانی سے مان جائے گی۔''

''اب وہ اتنی ٹوٹ چکی ہے کہ اسے ماننا ہی پڑے گا۔ بس ذرا نرمی سے کام لیجیے گا۔ نہیں مانی تو مجھے انگلیاں ٹیڑھی کرنا بھی آتی ہیں۔''

☆☆☆

رکن الدین عنانِ حکومت سنبھالتے ہی عیش وعشرت میں اس طرح ڈوبا کہ سلطنت کے انتظامی امور سے بالکل ہی غافل ہوگیا۔ رات بھر رقاصاؤں کے جسم مرمریں سے لطف اندوز ہوتا اور دن بھر خوابِ غفلت کے مزے لوٹتا۔ وہ قطب الدین ایبک اور التمش کے جمع کیے ہوئے خزانے کو اس بے دردی سے خرچ کررہا تھا کہ صاف معلوم ہوتا تھا کہ یہ سلطنت زیادہ دن چلنے والی نہیں۔ جو امراء سلطان التمش کے وفادار تھے اور اب تک خاموش تھے، ترکان شاہ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور اس کی توجہ اس طرف مبذول کی۔ وہ بھی سب کچھ اپنی آنکھوں سے دیکھ رہی تھی لیکن عقل کی ایسی اندھی تھی کہ رکن الدین کی بوالہوسی کو لڑکپن کی حرکتیں سمجھ رہی تھی۔ اس نے ان امراء کو یہ کہہ کر مطمئن کردیا کہ وہ ابھی بچہ ہے۔ جلد ہی ناؤنوش کی ان محفلوں سے دل بھر جائے گا۔ ان امراء کو اب شدت سے افسوس ہورہا تھا کہ سلطان التمش کے اندازے کتنے درست تھے۔ اگر اس کی وصیت پر عمل ہوجاتا تو یہ دن دیکھنا نہ پڑتا۔ ان کے دلوں میں رکن الدین کی طرف سے نفرت اور رضیہ کے لیے ہمدردی۔ کے جذبات بڑھتے جارہے تھے لیکن وہ بے بس تھے البتہ یہ ظاہر ہونے لگا تھا کہ بہت جلد یہ استحکام انتشار میں بدل جائے گا۔ مجبور ہوکر ان امراء نے اردگرد کے جاگیرداروں اور سرداروں سے رابطے شروع کردیے تھے۔

نظام الملک، علاؤ الدین شیر خانی، سیف الدین کوچی اور دوسرے خودغرض امراء اسی دن کے انتظار میں تھے۔ انہوں نے رکن الدین کے لیے ایسے اسباب مہیا کردیے کہ مے ناب میں غرق ہوکر کسی کام کا ہی نہ رہ جائے اور وہ اس صورت حال سے فائدہ اٹھا کر تخت پر قابض ہوجائیں یا بادشاہ کے پردے میں خود حکومت کرنے لگیں۔

ترکان شاہ ان سب سے آگے نکلی۔ اس نے بیٹے کو بے خود دیکھ کر سارے اختیارات اپنے ہاتھ میں لے لیے۔ رکن الدین تو کسی کنیز کی زلفوں کی زنجیر پہن کر خلوت گاہ میں بند رہتا، ترکان شاہ احکامات جاری کرتی رہتی۔ وہ رکن الدین کی طرح تخت پر بیٹھنے اور دربار منعقد کرنے لگی۔

ترکان شاہ حسد پیشہ عورت تھی۔ اصلاً ترک کنیز تھی۔ التمش نے اس پر فریفتہ ہوکر حرم میں ڈال لیا تھا۔ آہستہ آہستہ التمش کی زندگی ہی میں وہ اتنی بااختیار ہوگئی تھی کہ دوسری بیگمات اس سے رشک کرنے لگی تھیں۔ وہ کنیز رہ چکی تھی اس لیے دوسری بیگمات اسے احترام کی نگاہ سے نہیں دیکھتی تھیں جبکہ وہ اس طبیعت کی مالک تھی کہ چاہتی تھی سب اس کی عزت کریں۔ اس کے دل میں احساس محرومی بڑھتا جارہا تھا۔ آخری دنوں میں التمش نے بھی اس سے آنکھیں پھیر لی تھیں۔ وہ اس دھن میں رہتی تھی کہ اس کا بیٹا بادشاہ بن جائے۔ پھر وہ سب سے گن گن کر بدلے لے گی لہٰذا جب اسے اختیارات مل گئے تو وہ اپنے اصل روپ میں نمودار ہوگئی۔ اس نے التمش کی کئی بیویوں کو قتل کرادیا۔ کچھ ایسی تھیں جو اس کی دسترس سے بچ کر قلعے سے نکل بھاگیں اور محنت مزدوری کرکے اپنے دن گزارنے لگیں۔ یہ معزز عورتیں جب شہر میں پہنچیں اور شہریوں نے انہیں محنت مزدوری کرتے دیکھا تو ان کے دلوں میں رکن الدین کی طرف سے نفرت آمیز جذبات پیدا ہونے لگے۔ گھروں میں نئے بادشاہ کے خلاف بغاوت کی باتیں ہونے لگیں لیکن یہ اتنا آسان نہیں تھا البتہ وہ بیج بوئے جانے لگے جو رکن الدین اور اس کی ماں کے خلاف بارآور ہونے والے تھے۔

بیگمات پر مظالم توڑنے کے بعد بھی ترکان شاہ کا دل نہیں بھرا۔ اس مرتبہ اس کا نشانہ التمش کا سب سے چھوٹا بیٹا

قطب الدین تھا۔ ترکان شاہ کے حکم پر اس کی آنکھوں میں سلائیاں پھیر کر اسے اندھا کر دیا گیا۔ رضیہ سلطانہ کو اس کی خبر ملی لیکن وہ اپنی کنیز کی گود میں سر رکھ کر رونے کے سوا کچھ نہیں کر سکتی تھی۔ وہ دروازے سے سر ٹکراتی رہی لیکن کسی نے اسے باہر جانے کی اجازت نہیں دی۔ وہ ظالم ترکان شاہ سے یہ بھی نہ پوچھ سکی کہ اس کے معصوم بھائی کو کس جرم میں سزا دی گئی۔

قطب الدین کا علاج کر کے زندان میں ڈال دیا گیا۔ وہ اندھا ہو گیا تھا مگر زندہ تو تھا۔ ترکان شاہ کو اس کی اندھی زندگی بھی نہیں دیکھی گئی۔ اس نے ایک اور بھیانک قدم اٹھایا اور اسے قتل کرا دیا۔ اس کی لاش زندان سے باہر آئی تو قلعے میں کہرام مچ گیا۔ ہر آنکھ اشک بار تھی لیکن شمشیروں کے پہرے نے ان کے آنسو جہاں تھے، وہیں روک دیے۔ اس موت کو طبعی موت کہا جا رہا تھا لیکن سب جانتے تھے کہ کیا ہوا ہے۔

سپاہیوں کے پہرے اس وقت سب کو روک سکتے تھے لیکن رضیہ سلطانہ کے بپھرے ہوئے جذبات پر بند نہیں باندھ سکتے تھے۔ اس نے بھائی کی رخصت بینائی کو قبول کر لیا تھا لیکن اس کی موت پر صبر نہ کر سکی۔ سپاہیوں کا پہرا توڑ کر ترکان شاہ کے پاس پہنچ گئی۔

''مادر گرامی!'' اس نے اتنی زور سے مخاطب کیا کہ چیخنے کا گمان ہوتا تھا۔

''آواز نیچی رکھو۔'' ترکان شاہ نے نہایت نرمی سے کہا۔ ''میں تمہاری مادر گرامی کہاں سے ہو گئی۔ مجھے ملکۂ عالیہ کہہ کر مخاطب کرو۔''

''اگر آپ کو عزت راس نہیں تو ملکۂ عالیہ کہے دیتی ہوں۔ میں تو صرف یہ پوچھنے آئی ہوں کہ اس معصوم کا کیا قصور تھا؟''

''تم کس کی بات کر رہی ہو؟''

''میرا بھائی قطب الدین۔ تمہارے شوہر سلطان التمش کی آخری نشانی۔''

''مجھے کسی نے بتایا تو تھا کہ وہ مر گیا۔''

''وہ مرا نہیں آپ نے اسے قتل کرایا ہے۔''

''تم مر بھی جاؤ تو ثابت نہیں کر سکتیں۔''

''مجھے ثابت کرنا بھی نہیں ہے۔ اسے خدا ثابت کرے گا۔ میں تو صرف یہ بتانے آئی ہوں کہ آپ کے دن پورے ہو گئے ہیں۔ اس معصوم کے خون کا حساب آپ کو دینا پڑے گا۔ ایک بہن اپنے بھائی کا مقدمہ خدا کی عدالت میں لے کر جائے گی۔''

وہ تو جیسے اب بد دعاؤں پر اتر آئی تھی۔ ترکان شاہ کو اتنی برداشت کہاں تھی۔ اس نے فوراً اپنی کنیزوں کو طلب کیا۔

''اس گستاخ کو یہاں سے گھسیٹتی ہوئی لے جاؤ۔''

کنیزیں ترکان شاہ کا منہ تک رہی تھیں۔ وہ کوئی عام لڑکی نہیں تھی، شہزادی تھی۔ شہزادی رضیہ سلطانہ، جانشینِ التمش۔ رضیہ خود بھی یہ کیسے چاہتی کہ معمولی کنیزیں اسے گھسیٹتی ہوئی لے کر جائیں۔ اس نے ہاتھ کے اشارے سے انہیں دور رہنے کو کہا اور ترکان شاہ کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال دیں۔

''میرے باپ کی ادنیٰ کنیز! جو گناہ تجھ سے سرزد ہو گیا ہے اس کی سزا تجھے مل کر رہے گی۔''

اس سے پہلے کہ ترکان شاہ جواب میں کچھ اور کہتی، وہ کمرے سے نکل گئی۔

ترکان شاہ نے اس کے پہرے پر متعین سپاہیوں کو طلب کیا اور ان سے سخت باز پرس کی اور انہیں ہدایت کی آئندہ رضیہ سلطانہ اپنے محبس خانے سے باہر نہ آسکے۔

☆☆☆

قلعہ رن تھنبور پر ہندوؤں نے دوبارہ قبضہ کر لیا تھا۔ التمش کی زندگی تک یہ قلعہ اس کے قبضے میں تھا لیکن اب چند مہینوں بعد ہی ہاتھ سے نکل گیا تھا۔ سالار سیف الدین ایبک نے رکن الدین فیروز کی توجہ اس طرف دلائی تھی لیکن رکن الدین نے اس عظیم حادثے کو اس طرح سنا تھا جیسے زمین کا بنجر ٹکڑا تھا کہ ہاتھ سے نکل گیا بلکہ شراب کے نشے میں قہقہہ لگاتے ہوئے یہ بھی کہا تھا کہ چلو اچھا ہوا قلعے کی حفاظت پر جو خرچ کرنا پڑ رہا تھا، وہ خرچ بچ گیا۔ اس طرف سے مایوس ہونے کے بعد وہ ترکان شاہ سے بھی ملا تھا۔ اس کا جواب بھی رکن الدین سے مختلف نہیں تھا بلکہ اس نے تو سالار کو سرزنش کی تھی۔

''آخر تم اس بے کار علاقے کے لیے اتنے فکر مند کیوں ہو؟ کس علاقے کے ساتھ کیا کرنا ہے، یہ سوچنا ہمارا کام ہے، تمہارا نہیں۔ تم صرف وہ کرو گے جو ہم کہیں گے۔''

سیف الدین ایبک کو التمش کا دورِ حکومت یاد آ گیا۔ جب ہر علاقے پر نظر رکھی جاتی تھی۔ تمام فوجی معاملات میں بادشاہ اس سے مشورے کرتا تھا۔ جنگوں میں خود ساتھ نکلتا تھا جس سے لشکر کا حوصلہ بڑھتا تھا۔

سیف الدین اس موقع پر یہ چاہتا تھا کہ حکمرانوں سے اجازت لے کر وہ قلعہ رن تھنبور پر دوبارہ قبضے کے لیے

نکلے لیکن حکمرانوں کو پروا ہی نہیں تھی۔ رکن الدین شراب میں غرق تھا۔ ترکان شاہ اس کی اہمیت کو سمجھ ہی نہیں سکتی تھی۔ نظام الملک یہ کہہ کر ٹال جاتا تھا کہ میں، وزیر اعظم ہوں...... بادشاہ نہیں، خود کیسے کوئی فیصلہ کرسکتا ہوں۔

ابھی یہ معاملات چل ہی رہے تھے کہ قطب الدین کے قتل کا واقعہ پیش آگیا۔ جوش غضب سے اس کی بھویں تن گئیں۔ اس کو رضیہ سلطانہ کی زندگی کی طرف سے بھی فکر لاحق ہوگئی۔ اگر اس نے اس وقت بھی احتجاج نہیں کیا تو پانی سر سے اونچا ہوجائے گا۔ اس نے پہلے بہرام غوری سے ملاقات کی اور پھر ترکان شاہ کی خدمت میں پہنچ گیا۔

''ملکۂ عالیہ! قطب الدین کے قتل سے اہلِ قلعہ میں بہت بے چینی پائی جاتی ہے۔''

''تم بھی اسے قتل کہتے ہو۔''

''میرے کہنے نہ کہنے سے کچھ نہیں ہوتا۔ خلقِ خدا یہی کہتی ہے۔''

''پھر تو بتا میں کیا کرسکتی ہوں؟''

''ان ہاتھوں کو قلم کروا دیجیے جن ہاتھوں نے شہزادے کا گلا گھونٹا۔''

''وہ ہاتھ اگر تجھے ملیں تو میرے پاس لے آ۔''

''وہ تو میں تلاش کر ہی لوں گا۔ اس وقت تو میں یہ کہنے آیا تھا کہ شہزادی عالیہ کی حفاظت اب میری ذمے داری ہے۔ ان کی جان کو بھی خطرہ ہے۔''

''ہم نے تجھے ایسا کوئی حکم نہیں دیا۔ تیری ذمے داری سرحدوں کی حفاظت ہے۔''

''میں اس معاملے میں کسی حکم کا پابند نہیں۔ آج سے میرے مسلح سپاہی شہزادی کی حفاظت کریں گے۔''

''مت بھولو تم ترکان شاہ ملکۂ عالیہ حکمران ہند سے مخاطب ہو۔''

''میں تو صرف آپ کو آپ کی ذمے داری یاد دلا رہا ہوں۔''

''میں اس طرزِ تخاطب کو تمہاری بغاوت سمجھوں؟''

''مجھے جو کہنا تھا، میں نے کہہ دیا۔''

''میں تجھے معزول بھی کرسکتی ہوں۔''

''معزول نوکروں کو کیا جاتا ہے۔ میں شہزادی رضیہ سلطانہ کا محافظ ہوں۔'' سیف الدین ایبک نے کہا اور کمرے سے نکل گیا۔

''اس کا مطلب ہے بغاوت!'' ترکان شاہ پوری آواز سے چلائی حالانکہ اس وقت کمرے میں کوئی نہیں تھا۔ اس نے زور دار تالی بجائی اور بجاتی چلی گئی۔ کئی کنیزیں ایک ساتھ دوڑتی ہوئی کمرے میں داخل ہوئیں۔ ترکان شاہ پر دیوانگی طاری تھی کنیزیں اس کے سامنے تھیں اور وہ انہیں طلب کرنے کے لیے تالیاں بجا رہی تھی۔ پھر اسے محسوس ہوا کوئی کمرے میں ہے۔ اس کی کنیزیں اس کے اردگرد تھیں۔

''ملکۂ عالیہ! ہم حاضر ہیں۔''

''وہ تو میں دیکھ رہی ہوں۔''

''پھر یہ تالیاں؟''

''ابھی میں نے ایک خواب دیکھا ہے۔ میں نے دیکھا کہ سیف الدین ایبک میرے کمرے میں آیا ہے اور مجھ سے کہہ رہا ہے کہ میں قطب الدین کے قتل کا حساب لوں گا۔ قطب الدین کو کیا میں نے قتل کیا ہے، پھر وہ میرے خواب میں کیوں آیا تھا؟''

''ملکۂ عالیہ، وہ خواب نہیں تھا۔ وہ ہماری موجودگی میں آپ کی خدمت میں حاضر ہوئے تھے اور ہمارے سامنے یہاں سے تشریف لے گئے ہیں۔''

''تم سب اس سے مل گئے ہو۔ مجھے ڈرانے کے لیے کہہ رہے ہو، یہ خواب نہیں ہے۔'' وہ ہذیانی انداز میں چیخ رہی تھی۔ پھر جیسے اسے ہوش آگیا۔ ''تم میں سے کوئی جائے اور فوراً نظام الملک کو میرے پاس بھیجے۔ میں اس سے بھی تو پوچھوں یہ خواب تھا یا حقیقت۔''

وہ سب کی سب اس طرح باہر نکل گئیں جیسے ان میں سے کوئی بھی وہاں رکی رہی تو ترکان شاہ عالم دیوانگی میں اس پر جھپٹ پڑے گی۔ کچھ دیر نہیں گزری تھی کہ نظام الملک کی پالکی اس کے محل کے سامنے آکر رک گئی۔

''یہ آپ نے کیسا حکم دے دیا؟''

''کیسا حکم، میں نے تو کوئی حکم جاری نہیں کیا۔''

''میں نے لشکر کے مسلح سپاہیوں کو ''کوشک فیروزی'' کی طرف جاتے دیکھا ہے۔ آپ نے رضیہ سلطانہ سے متعلق تو کوئی حکم جاری نہیں کر دیا؟''

''اس کا مطلب ہے جو میں نے دیکھا...... جو میں نے سنا، وہ خواب نہیں تھا۔'' وہ منہ ہی منہ میں بڑبڑا رہی تھی۔ پھر اس نے نظام الملک کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال دیں۔ ''نظام الملک! سیف الدین ایبک نے ہماری حکم عدولی کی ہے۔ وہ بغاوت پر تل گیا ہے۔ اس نے اپنے مسلح سپاہی رضیہ سلطانہ کی حفاظت کے لیے بھیجے ہیں۔ اسے ہم پر بھروسا نہیں رہا۔ یہی بغاوت کی ابتدا ہوتی ہے۔''

''یہ معاملہ اتنا سادہ نہیں ملکۂ عالیہ کہ اسے میں اکیلا نمٹا سکوں۔ اس کے لیے رکن الدین سے مشورہ کرنا ہوگا۔''

''اس میں مشورے کی کیا بات ہے۔ اس کی گرفتاری کے احکام فوراً جاری کرو۔''

''سیف الدین سالارِ افواج ہے۔ اس کی گرفتاری آسان نہیں ہوگی۔ ابھی تک تو وہ باغی ہوا ہے، گرفتاری کے بعد اس کا لشکر بھی بغاوت کر بیٹھے گا۔''

''اسے اس کے عہدے سے معزول تو کیا جا سکتا ہے۔''

''اس کے لیے رکن الدین کی طرف سے تحریری حکم کی ضرورت ہوگی۔''

''یہ تم ہم پر چھوڑ دو۔ ہم رکن الدین سے یہ فرمان لے لیں گے۔''

رکن الدین کی کم ہمتی نے یہ اجازت نہیں دی کہ سیف الدین کی معزولی کے احکام جاری کرتا۔ اسے ڈر تھا کہ سیف الدین پلٹ کر اسی کو قتل نہ کردے۔ وہ اس معاملے کو ٹالتا رہا۔ بس یہی اس کی غلطی تھی۔ جو معاملہ دب سکتا تھا، وہ اچھلنے لگا۔ امرائے سلطنت تو یہ دیکھ رہے تھے کہ سیف الدین نے قلعے کے تمام پرانے محافظین کو زبردستی ہٹا کر اپنے سپاہی متعین کردیے ہیں۔ انہیں یہ بھی معلوم ہوگیا کہ اس تبدیلی میں بادشاہ کی مرضی شامل نہیں۔ سیف الدین جو کررہا ہے، اس کا مطلب ہے اس کی گرفت مضبوط ہے۔ ان امرائے سلطنت کو اپنی جانوں کی فکر ہوئی۔ انہوں نے چوری چھپے سیف الدین سے ملاقاتیں شروع کردیں۔ ترکان شاہ کے مظالم کی داستانیں زیرِ بحث آئیں۔ سرِفہرست شہزادہ قطب الدین کا قتل تھا۔ ان امرائے سلطنت کو یہ بھی باور کرایا گیا کہ رضیہ سلطانہ کی جان کو خطرہ ہے۔

ان امراء نے خط کتابت کے ذریعے دوسرے علاقوں کے حکمرانوں کو مظالم کی ان داستانوں سے آگاہ کیا۔ جن مظالم پر پردہ پڑا ہوا تھا، وہ عیاں ہوکر عوام تک بھی پہنچے۔ نتیجہ یہ ہوا کہ ملک میں ہر طرف بے اطمینانی اور ناآسودگی کی لہر دوڑ گئی۔

پہلا پتھرا اپنے ہی گھر سے چلا۔ ملکہ ترکان کے چھوٹے بیٹے نے جو حاکم اودھ تھا، اپنے بڑے بھائی رکن الدین کی اطاعت سے انکار کردیا۔ اس نے لکھنوتی کے محاصل کی رقم جو دہلی کے خزانے میں جمع کرنے کے لیے بھیجی گئی تھی، راستے ہی سے واپس منگوالی اور محاصل کی جگہ یہ خط بھیج دیا۔

''خزانے کی رقم رقاصاؤں اور بھانڈوں پر خرچ کی جارہی ہے۔ چند ماہ میں میرے باپ کی عظیم سلطنت ٹکڑوں میں تقسیم ہونے کے قریب پہنچ گئی ہے۔ آپ یا تو اپنی روش بدلیں یا پھر مجھے آزاد سمجھیں۔ میں اس گھناؤنے کھیل میں شریک ہونے کا متحمل نہیں ہوسکتا۔''

جب اس خط کا خاطر خواہ جواب نہ ملا تو اس نے دوسرے خط میں صاف اعلان کردیا۔

''اگر یہ بغاوت ہے تو میں بغاوت کرتا ہوں۔ مجھے دہلی کے احکام کا پابند نہ سمجھا جائے۔''

ترکان شاہ اس کھیل کو بگڑنے سے بچا سکتی تھی۔ غیاث الدین کو سمجھا بجھا کر راہِ راست پر لا سکتی تھی لیکن اس نے اس سنجیدہ معاملے کو محض دھمکی سمجھا۔ وہ اس آگ کا تماشا دیکھتی رہی۔ یہ نہ سمجھی کہ جب آگ لگتی ہے تو پھیلتی بھی ہے۔ اگر اسے بروقت بجھایا نہ جائے تو سب کچھ بھسم ہوجاتا ہے۔

اس آگ کے ساتھ بھی یہی ہوا۔ یہ اودھ تک محدود نہ رہی۔ جب دوسرے علاقوں کے حاکموں نے دیکھا کہ غیاث الدین نے علمِ بغاوت بلند کردیا ہے تو ان کی بھی ہمت ہوئی۔ بدایوں، لاہور، ملتان اور ہانسی کے حکمرانوں نے آپس میں مشورہ کرکے رکن الدین کی اطاعت سے انکار کردیا اور علمِ سرکشی بلند کی۔

ہر طرف انتشار پھیلنے لگا۔ محاصل کی رقم آنا بند ہوگئی۔ طوائفیں اور سازندے ساتھ چھوڑ کر بھاگنے لگے تو رکن الدین کا نشہ اترا۔ ترکان شاہ کے بھی ہوش ٹھکانے آئے۔ دونوں ماں بیٹوں نے مشورہ کیا کہ باغی حکمرانوں پر چڑھائی کی جائے۔ رکن الدین نے کچھ دیر کے لیے ساغر ہاتھ سے رکھ دیا۔

نظام الملک نے بھی یہ سوچ کر تائید کی کہ اگر ان حاکموں پر غلبہ پالیا گیا تو ٹھیک ورنہ وہ کسی طرح رکن الدین کو موت کے منہ میں دھکیل کر خود اقتدار پر قبضہ کرلے گا۔ اگر ترکان شاہ راستے میں آئی بھی تو اس سے نمٹنا مشکل نہ ہوگا۔

رکن الدین نے کمرِ ہمت باندھی اور جنگ کی تیاری کرنے لگا۔ پہلا دھچکا اسے اس وقت لگا جب سیف الدین ایبک اور بہرام غوری نے ساتھ جانے سے انکار کردیا۔ ان دونوں کی بہادری ضرب المثل تھی۔ معرکہ گوالیار میں ان کے کارنامے زبان زدِ خاص و عام تھے۔ رکن الدین اتنی جلدی میں تھا کہ منانے کی کوشش بھی نہیں کی یا پھر نظام الملک اپنے منصوبے کے پیشِ نظر یہ چاہتا ہی نہ تھا کہ وہ دونوں سلطان کے ساتھ جائیں۔

یہ منظر بھی دیدنی تھا۔ تاریخ جیسے اپنے آپ کو دہرا رہی ہو۔ رکن الدین نے سرکاری طور پر اعلان کیا۔ ''جب تک سرکشوں کا سر کچل کر میں واپس نہیں آجاتا مادرِ گرامی

ملکۂ عالیہ ترکان شاہ میری جانشین ہوں گی۔'' خوشامدیوں کی آفرین وتحسین سے دربار گونج اٹھا۔
حکومت تو پہلے بھی ترکان شاہ ہی چلا رہی تھی لیکن رسمی اعلان ضروری تھا۔ اس اعلان کے ساتھ ہی ترکان شاہ کی آنکھوں میں وہ منظر گھوم گیا جب سلطان التمش گوالیار روانہ ہو رہا تھا اور اس نے رضیہ سلطانہ کی جانشینی کا اعلان کیا تھا۔ اس کی گردن غرور سے تن گئی۔ آج التمش کی جانشین زنداں میں پڑی ہے اور میرے بیٹے نے مجھے اپنا جانشین مقرر کیا ہے۔
حسب سابق نظام الملک کا چہرہ سیاہ پڑ گیا۔ اسے امید تھی کہ شہزادہ اسے اپنا جانشین مقرر کر کے جنگ کے لیے نکلے گا۔ رضیہ کی جانشینی کے وقت بھی اس نے یہی سوچا تھا اور آج بھی وہ یہی سوچ رہا تھا۔ اس نے بمشکل رکن الدین کو سمجھانے کی کوشش کی۔
''سلطانِ معظم! آج آپ پھر تاریخ کے اسی موڑ پر کھڑے ہیں جہاں سابق سلطان التمش کھڑے تھے۔ انہوں نے بھی عورت ہونے کے باوجود شہزادی رضیہ کو اپنا جانشین مقرر کیا تھا۔ یہ اعلان امراء کی بے چینی کا سبب بنا تھا۔ ملکۂ عالیہ بھی ایک خاتون ہیں۔ یہ اعلان امراء کو مایوس کرے گا۔ آپ کی واپسی تک یہ بارِگراں میں اٹھانے کو تیار ہوں تاکہ بدنظمی نہ ہو۔ بے شک میں ملکۂ عالیہ کے مشوروں کے مطابق ہی حکومت چلاؤں۔''
''رضیہ سلطانہ کی بات اور تھی۔ وہ کم سن لڑکی تھی۔ اماں حضور جہاں دیدہ اور پختہ کار ہیں۔ تمام امراء ان کا احترام کرتے ہیں۔ آپ کا یہاں نہیں میرے ساتھ رہنا ضروری ہے۔ آپ کے مشورے مجھے راستہ دکھائیں گے۔ ہم نے جو فیصلہ کیا ہے، وہی رہے گا۔''
نظام الملک اس کے بعد ایک لفظ نہ کہہ سکا لیکن اس فیصلے کو اس نے دل سے تسلیم نہیں کیا تھا۔ رکن الدین ایک بھاری لشکر کے ہمراہ دہلی سے نکلا۔ اس لشکر کی ایک خاص بات یہ تھی کہ رقاصاؤں کا ایک گروہ بھی ہمراہ تھا تاکہ جہاں پڑاؤ ہو، یہ رقاصائیں سلطان رکن الدین کا دل بہلانے کے لیے حاضر رہیں۔ اس کے ساتھ جانے والے بیشتر امراء بھی اسی رنگ میں رنگے ہوئے تھے لہٰذا کسی کو کوئی اعتراض نہ ہوا۔
رکن الدین روانہ ہوا اور سفر کی منزلیں طے کرتا ہوا کیلوکھری تک پہنچا تھا کہ نظام الملک موقع دیکھ کر لشکر سے فرار ہو گیا۔ لشکر کی حالت اور رقاصاؤں کے پرے دیکھ کر اسے شکست اور موت صاف نظر آ رہی تھی۔ اسے جانشین نہیں بنایا گیا تھا، یہ کدورت بھی اس کے دل میں تھی۔ اس نے تو سوچا تھا جانشینی کے بعد اقتدار پر قبضہ کر لے گا لیکن یہ موقع اسے نہ مل سکا تھا۔ اس کا شیطانی ذہن اب دوسرے منصوبے بنا رہا تھا۔
نظام الملک برق رفتار گھوڑے پر سوار تھا۔ کئی دن کی مسافت کے بعد ''کول'' پہنچا اور بدایوں کے حاکم سے پناہ کا طالب ہوا۔ رکن الدین نے اس کے فرار کو بھی کوئی اہمیت نہ دی۔ رقص وسرود میں مشغول رہا۔ اس کی آنکھیں تو اس وقت کھلیں جب اسے یہ معلوم ہوا کہ نظام الملک بدایوں کے حاکم کو ساتھ لے کر لاہور کی طرف روانہ ہوا ہے۔ اس کے عزائم یہ ہیں کہ لاہور کے حاکم کو اپنے ساتھ ملا کر دہلی پر حملہ آور ہو جائے اور رکن الدین کی غیر حاضری کا فائدہ اٹھائے۔
جلد ہی یہ خبریں اس تک پہنچ بھی گئیں کہ نظام الملک نے لاہور کے حاکم عزالدین کو شیشے میں اتار لیا ہے۔ دیگر باغی بھی اس کے ساتھ مل گئے ہیں اور وہ دہلی پر حملہ آور ہونے کے لیے صف بندی کر رہا ہے۔
رکن الدین کا رخ اب پنجاب کی طرف تھا۔ اس کی فوج منصور پور تک پہنچی تھی کہ اس کی صفوں میں انتشار پیدا ہو گیا۔ التمش کے عہد کے مشہور امراء تاج الدین، ملک محمد، بہاء الدین حسن، کریم الدین، ضیا الملک، خواجہ رشید اور امیر فخرالدین وغیرہ رکن الدین سے برگشتہ ہو گئے۔
''ہم نے بھی کیسی غلطی کی۔ رکن الدین کی تاج پوشی کے وقت تلواریں نیام سے باہر نہیں کیں اور اب اس کے لیے اپنا خون بہانے چلے ہیں۔''
''ہم نے تو یہ سوچ کر رکن الدین کی حمایت کر دی تھی کہ خون خرابا نہ ہو۔ ہمیں یہ گمان بھی نہیں تھا کہ وہ عیش وعشرت میں مبتلا ہو کر التمش کی سلطنت کو نقصان پہنچائے گا۔ ہمیں یہ گمان بھی نہیں تھا کہ ترکان شاہ اس پر حاوی ہو جائے گی۔ ہم نے نادانستگی میں رکن الدین کی نہیں، ترکان شاہ کی حمایت کی۔ ایک عورت ہی کی حمایت کرنی تھی تو رضیہ سلطانہ اس سے بدرجہ بہتر تھی۔''
''اب کیا ہو سکتا ہے۔ تیر تو کمان سے نکل چکا۔ ترکان شاہ حکومت کر رہی ہے۔ شہزادی رضیہ زنداں میں ہیں اور ہم یہاں۔''
''اب بھی کچھ نہیں گیا۔ ہم واپس دہلی لوٹ چلیں۔ سیف الدین ایبک اور بہرام غوری دہلی میں ہیں۔ ہم ان کی مدد سے شہزادی رضیہ کو تخت پر بٹھا سکتے ہیں۔ ترکان شاہ زیادہ دیر ہمارا مقابلہ نہیں کر سکے گی۔''
ان تمام امراء نے باہم مشورہ کیا اور خفیہ طور پر لشکر

سلطانی سے الگ ہو کر دہلی پہنچ گئے۔ انہیں چھاؤنی پہنچ کر سیف الدین اور بہرام غوری سے ملاقات کرنی تھی۔

سیف الدین کو ان امراء کی آمد کی اطلاع ہوئی تو اس پر حیرتوں کے پہاڑ ٹوٹ گئے۔ یہ لوگ تو رکن الدین کے ہمراہ گئے تھے۔ واپس کیسے آگئے۔ وہ ابھی کوئی سوال کرنے نہیں پایا تھا کہ تاج الدین آگے آیا۔

''ہم سب اپنے گناہوں کا کفارہ ادا کرنے رکن الدین کا ساتھ چھوڑ کر یہاں آئے ہیں اور آپ کی مدد کے طالب ہیں۔''

''کیسا گناہ...... کیسا کفارہ؟''

''ہم نے سلطان التمش کی وصیت کو ٹھکرا کر بڑا گناہ کیا ہے۔ اس کا کفارہ یہ ہے کہ ہم حق بہ حق دار رسید کے مصداق شہزادی عالیہ کو تختِ شاہی پر بٹھائیں اور یہ آپ کی مدد کے بغیر نہیں ہوسکتا۔''

سیف الدین نے فرطِ مسرت سے نعرۂ تحسین بلند کیا۔

''شاباش ہے آپ لوگوں کو۔ میں کب سے اس دن کا انتظار کر رہا تھا۔ آپ لوگوں نے مجھے سلطان التمش کی روح کے سامنے سرخرو کیا۔ اپنے ولی نعمت کے احسانات کا بدلہ چکانے کے قابل بنایا۔ میں آزاد ہوں اور میرے آقا کی بیٹی قید میں ہے، یہ احساس ہی میرے لیے سوہانِ روح بنا ہوا تھا۔ میرے ہاتھ بندھے ہوئے تھے۔ آپ لوگوں نے مجھے آزاد کر دیا۔''

''سیف الدین! یہ باتوں کا وقت نہیں، جو کچھ کرنا ہے جلدی کرو۔''

''میرے سپاہی اس کارِ خیر میں حصہ لینے کے لیے تیار ہیں۔''

کچھ دیر نہیں گزری تھی کہ محلاتِ شاہی میں ہلچل مچ گئی۔ ایک نسوانی چیخ تھی جو قلعے کی دیواروں سے ٹکرا رہی تھی۔

''بے ادبو...... گستاخو! میں ہندوستان کی ملکہ ہوں۔ بادشاہِ وقت کی ماں اور اس کی جانشین ہوں۔ نمک حرامو! تمہاری یہ مجال۔''

یہ چیخیں ترکان شاہ کی تھیں۔ امراء کے فیصلے کے مطابق اس کے سر سے تاجِ سلطانی اتار لیا گیا تھا اور گرفتار کر کے جانبِ زنداں لے جایا جا رہا تھا۔

سیف الدین کے وفادار سپاہی ادھر ادھر پھیل گئے تھے کہ کوئی مزاحمت نہ ہونے پائے۔ ظالموں کا یہی انجام ہوتا ہے۔ اس کی چیخیں بے اثر تھیں۔ اس کے لیے کوئی مزاحم ہونے کو تیار نہیں تھا بلکہ قلعے کی جو عورتیں اس کے مظالم کا شکار بنی تھیں، ان کی آنکھوں میں خوشی کے آنسو تھے۔

سیف الدین بذاتِ خود رضیہ کے محل میں گیا اور اسے یہ خوش خبری سنائی۔ اس تک یہ خبر کوئی اور پہنچاتا تو شاید اسے یقین بھی نہ آتا لیکن سیف الدین پر وہ شک نہیں کر سکتی تھی۔

''شہزادی عالیہ! دیر کرنے کی گنجائش نہیں ہے۔ جلدی سے تیار ہو جائیے۔ آپ کے ہمدرد امراء چاہتے ہیں کہ تاج پوشی کی رسم جتنی جلد ادا ہو جائے اچھا ہے۔ رکن الدین تک یہ خبر ضرور پہنچے گی۔ اس سے پہلے کہ وہ کوئی چال چلے، کوئی شخصیت ایسی ضرور ہو جس کی سرکار سے احکام جاری ہوں اور ہم غلام اس کی تکمیل کریں۔ اگر ہر شخص اپنی عقل کے مطابق کام کرے گا تو یقیناً بدنظمی پھیلے گی۔''

''مجھے اب بھی افسوس ہے۔ کاش! میرے بھائی میں اتنی اہلیت ہوتی کہ وہ تماشا نہ بن رہا ہوتا۔''

''شہزادی عالیہ! جلدی کیجیے۔ آپ ہجومِ دشمناں میں گھری ہوئی ہیں۔ تختِ شاہی پر قدم رنجہ فرمائیے اور دشمنوں کی بیخ کنی کے لیے احکام صادر فرمائیے۔ شہری بھی مضطرب ہیں۔ انہیں بھی یقین آجائے کہ ان کا کوئی سرپرست ہے۔''

''میری آپ سے ایک درخواست ہے۔ یہ رسم نہایت سادگی سے ادا کی جائے۔''

''اس کا خیال رکھا جائے گا۔''

ایک سادہ سی تقریب میں رضیہ سلطانہ کے سر پر تاج رکھ دیا گیا۔ اس تقریب میں تمام امراء نے اپنی کوتاہیوں کا ذکر کیا اور آئندہ کے لیے عہدِ وفا کیا۔ رکن الدین کی معزولی کا فرمان تحریر کیا گیا جس پر تمام امراء اور خود رضیہ سلطانہ کے دستخط ثبت تھے۔ رکن الدین کو تخت نشیں ہوئے صرف چھ ماہ اور آٹھ دن ہوئے تھے کہ اسے معزول کر دیا گیا۔

دوسرے دن ہر طرف ڈھنڈورا پیٹ دیا گیا کہ رکن الدین فیروز کو معزول کیا جا چکا ہے۔ جو اس سے ہمدردی ظاہر کرے گا، اسے باغی تصور کیا جائے گا۔

رضیہ سلطانہ نے برق رفتار قاصدوں کو مختلف علاقوں کی طرف دوڑا دیا کہ وہ اس خبر کو ان علاقوں کے حاکموں تک پہنچا دیں۔ انہی میں سے ایک قاصد انعام کے لالچ میں پنجاب کی طرف مڑ گیا تاکہ وہ رکن الدین تک یہ خبر پہنچا دے۔ یہ قاصد ترکان شاہ کا دور کا رشتے دار بھی تھا۔ وہ اس امید میں یہ خبر لے کر رکن الدین تک پہنچا تھا کہ رکن الدین جلد سے جلد واپس آکر رضیہ سلطانہ کا تختہ الٹ دے گا۔ ترکان شاہ بھی رہا ہو جائے گی۔

رکن الدین ابھی ''منصوریہ'' ہی میں تھا اور باغی

امراء کو کچلنے کی منصوبہ بندی کر رہا تھا کہ قاصد نے اس کی معزولی اور رضیہ سلطانہ کی تخت نشینی کی خبر پہنچادی۔ کثرت شراب نوشی نے اس کے اعصاب کو بری طرح متاثر کیا تھا۔ فیصلے کی طاقت بالکل ہی جاتی رہی تھی۔ اس وقت بھی یہی ہوا کہ خبر سنتے ہی ہاتھ پاؤں پھول گئے۔ آگے باغی ہیں، پیچھے رضیہ سلطانہ ہے۔... درمیان میں وہ ہے۔ آگے بڑھے یا پیچھے ہٹے؟ نظام الملک کب کا ساتھ چھوڑ گیا تھا۔ سنجیدہ اور فہمیدہ امراء رضیہ سلطانہ کے ساتھ جا ملے تھے، چند خوشامدی مصاحب ساتھ رہ گئے تھے جن کی اپنی کوئی رائے نہیں تھی۔ وہ ہر اس بات کو مان لیتے تھے جو شہزادے کے منہ سے نکلتی تھی یا جس میں ان کا مفاد ہوتا تھا چنانچہ جب اس نے ان مصاحبوں کو اس خبر سے آگاہ کیا اور یہ ارادہ ظاہر کیا کہ وہ دہلی جا کر اپنی حکومت دوبارہ حاصل کرنا چاہتا ہے تو ان مصاحبوں نے تائید کی۔

''باغیوں کا کیا ہے، ان سے تو کسی بھی وقت نمٹ لیا جائے گا۔ آپ کا خیال درست ہے، دارالحکومت بچایئے۔''

اسے چاہیے تھا کہ پہلے اپنے اتحادی پیدا کرتا، اپنے ہمدرد تلاش کرتا، اس کے بعد دہلی کی طرف جاتا لیکن وہ تن تنہا دہلی کی طرف چل دیا جہاں اس کے خلاف نفرت کے جذبات ابھی تازہ تھے۔ نامور امراء اور سالار افواج اس سے بدظن تھے۔ اس کے باوجود یہ شراب کا نشہ ہی تھا جو اسے اڑائے لے جا رہا تھا۔ ایک ایسا لشکر اس کے ہمراہ تھا جو بے دلی سے اس کے ساتھ تھا بلکہ گردش میں تھا۔ لڑنے کے لیے نکلا تھا لیکن اس کا سربراہ اسے جگہ جگہ لیے پھر رہا تھا۔ اس کے انداز سے ظاہر ہو رہا تھا کہ اس نے آج تک کوئی جنگ نہیں لڑی۔ اس کا انداز تو بالکل ایسا تھا جیسے دہلی پہنچتے ہی شہر کے لوگ اس کے استقبال کے لیے باہر نکل آئیں گے۔ راستے میں پڑنے والے جاگیردار اس کی مدد کے لیے لشکر ساتھ کر دیں گے۔ چلنے سے پہلے نہ کوئی صف بندی کی تھی، نہ یہ طے کیا تھا کہ کس مقام پر جنگ لڑی جائے گی۔ نہ خیال تھا کہ دوسری جانب آزمودہ کار سیف الدین ایبک ہے جو دہلی کی حفاظت کر رہا ہوگا۔ ایک بے سمت سفر تھا جو جاری تھا۔

رضیہ سلطانہ نے سیف الدین ایبک کو طلب کیا اور طبلِ جنگ بجانے کی اجازت دے دی۔

''آپ دہلی سے باہر نکل کر رکن الدین کا مقابلہ کریں۔'' رضیہ سلطانہ یہ حکم جاری کرنے کے بعد کچھ دیر کے لیے خاموش ہو گئی لیکن اس کے بشرے سے ظاہر ہو رہا تھا کہ ابھی اس نے بات ابھی ختم نہیں کی ہے اس لیے ایبک نے وہاں سے ہٹنا مناسب نہ سمجھا۔ آخر کچھ دیر بعد رضیہ نے سر اٹھایا۔ ''میری آپ سے التجا ہے۔ اس جنگ میں میرے بھائی (رکن الدین) کو کوئی گزند نہ پہنچے۔ وہ جیسا بھی ہے، میرا بھائی ہے۔ میرے باپ کی نشانی ہے۔ اسے گرفتار کر کے میرے پاس لایئے گا۔ میں اسے سمجھاؤں گی۔ شاید مصالحت کی کوئی صورت نکل آئے۔''

''ایسا ہی ہوگا سلطانِ اعظم۔''

''بس اب تم جاؤ۔ جنگ کی تیاری کرو۔ ہم خدا کی بارگاہ میں تمہارے لیے دعا کریں گے۔''

سیف الدین ایبک کمرے سے نکل گیا کچھ دیر بعد رضیہ سلطانہ نے نقاروں کی آوازیں سنیں۔ وہ مصلے پر کھڑی ہوئی اور اپنے بھائی کی سلامتی کی دعا مانگنے لگی۔

سیف الدین ایبک نہایت تیاری کے ساتھ دہلی کی حدود سے نکلا۔ اسے یقین تھا کہ یہ جنگ نہایت خون ریز ہوگی۔ رکن الدین اپنا اقتدار حاصل کرنے کے لیے جان کی بازی لگا دے گا۔ وہ راستے میں کئی جگہ رک کر اپنے لشکر سے خطاب کرتا رہا تا کہ ان کا حوصلہ بڑھا رہے۔ اسی عالم میں وہ ''کیلوکھری'' تک پہنچ گیا۔ رکن الدین بھی اس مقام سے کچھ فاصلے تک پہنچ گیا تھا۔

ایبک نے صفیں درست کیں اور حملے کا حکم دے دیا۔ وہ قلب میں تھا لیکن دائیں بائیں اپنا گھوڑا دوڑاتا پھر رہا تھا اور جنگ کا جائزہ لے رہا تھا۔ اس کی آنکھوں نے جلد ہی دیکھ لیا کہ رکن الدین کے سپاہی بے دلی سے لڑ رہے ہیں۔ اس نے اپنے سپاہیوں کو پہلے ہی تلقین کر دی تھی کہ رکن الدین پر یلغار نہ کی جائے اس لیے رکن الدین کی طرف کوئی نہیں جا رہا تھا۔ وہ قلب میں کھڑا اپنی فوج کو لڑا رہا تھا۔ وہ کئی مرتبہ ایبک کے سپاہیوں کی زد پر آیا۔ اگر وہ مارا جاتا تو جنگ کا فیصلہ بہت جلد ہو جاتا لیکن ایبک کے سپاہی جان بوجھ کر جنگ کو طول دیتے رہے۔ ان کا دباؤ ''میسرہ'' اور ''میمنہ'' پر تھا اور بالآخر یہ صفیں درہم برہم ہو گئیں۔ سلطان کے جانثار بھاگ کھڑے ہوئے۔

رکن الدین نے اپنے لشکر کو پسپا ہوتے ہوئے دیکھا تو فرار ہونے میں عافیت سمجھی لیکن ایبک کے سپاہی مسلسل اس پر نظر رکھے ہوئے تھے۔ اسے میدانِ جنگ سے نکلنے دیا لیکن کچھ دور تعاقب کے بعد گرفتار کر لیا۔ ایبک نے وعدہ پورا کیا۔ رکن الدین کے جسم پر ایک خراش تک نہیں آئی تھی۔ رکن الدین فیروز شاہ کو گرفتار کر کے رضیہ کے سامنے

پیش کر دیا گیا۔
''رکن الدین! اگر تم غالب آجاتے اور میں تمہارے سامنے پیش کی جاتی تو میرے ساتھ کیا سلوک کرتے؟''
''میں جلادوں کو بھی زحمت نہ دیتا۔ اپنی تلوار تیرے خون سے سرخ کر لیتا۔''
''مگر میں ایسا نہیں کروں گی۔ تم جیسے بھی ہو، میرے باپ کی نشانی ہو۔''
''تم مجھے زندہ چھوڑ کر کوئی احسان نہیں کرو گی۔ میں اب بھی تاجدارِ ہند ہوں۔''
''کاش، تم اس کے اہل ہوتے۔''
رضیہ سلطانہ نے اس گفتگو میں بہت کوشش کی کہ وہ اقتدار سے دست برداری کا پروانہ لکھ کر زندہ رہنے کا وعدہ لے لے۔ اس نے یہ تک کہہ دیا کہ وہ کسی دور دراز کے علاقے کا حاکم بن کر چلا جائے اور سلطنت کا وفادار رہے لیکن رکن الدین نے مصلحت کا کوئی راستہ اختیار نہیں کیا اور رضیہ سلطانہ کو برابر برا بھلا کہتا رہا۔ مجبور ہو کر اسے حکم دینا پڑا کہ اس گستاخ کو دہلی سے دور کسی ویران قلعے میں قید کر دیا جائے۔
رضیہ سلطانہ کو تمام فتنوں سے نجات مل چکی تھی۔ ترکان شاہ اپنے انجام کو پہنچ چکی تھی۔ رکن الدین قید کر دیا گیا تھا۔ جتنے مخالف امراء تھے، دربدر مارے مارے پھر رہے تھے۔ اب اپنا دبدبہ قائم کرنے کے لیے رضیہ نے اپنی تاج پوشی کا جشن منایا۔ تمام ملک کے حاکموں اور جاگیرداروں کو دعوت شرکت دی گئی۔ امرائے سلطنت نے نذریں پیش کیں۔ شعراء نے قصیدے پڑھے۔
یہ پہلا موقع تھا جب سلطانہ پردہ ترک کر کے مردانہ لباس میں تخت پر جلوہ گر ہوئی۔ اہل دربار میں بہت سوں نے اسے پہلی مرتبہ بے پردہ دیکھا تھا۔ مردانہ لباس کے باوجود اس کا نسوانی حسن ایسا دلکش تھا کہ دیکھنے والے آنکھیں جھپکنا بھول گئے۔ اس دربار میں حاکم بھٹنڈا ملک التونیہ بھی موجود تھا جو اسے دیکھے بغیر اس کے عشق میں مبتلا تھا۔ التمش کی زندگی میں شادی کا پیغام بھی دے چکا تھا لیکن رضیہ نے انکار کر دیا تھا۔ اس وقت سے لے کر اب تک اسی عشق کی خلش وہ اپنے دل میں محسوس کرتا رہا تھا۔ آج اسے بے پردہ دیکھا تو اس کے حسن پر نثار ہو گیا۔ وقت کی آندھی نے جو چراغ بجھا دیے تھے، وہ بھی روشن ہو گئے۔ جو زخم مندمل ہو گئے تھے پھر سے ہرے ہو گئے۔ بے تابی بے قراری میں بدل گئی۔ دربار میں کیا ہو رہا ہے، سلطانِ اعظم رضیہ سلطانہ کس سے مخاطب ہے، اسے کچھ سنائی نہیں دے رہا تھا۔ اس کی آنکھیں رضیہ سلطانہ کے چہرے کا طواف کر رہی تھیں۔
دربار ختم ہوا تو وہ خود کو وہیں چھوڑ کر اٹھ گیا۔ اس کی قسمت اچھی تھی کہ اسے کچھ دن اور دہلی میں نصیب ہو گئے۔ وہ اپنی محبوب کا مہمان ہے، یہ خیال ہی اس کے لیے تقویت کا باعث تھا۔
رضیہ سلطان نے حکم جاری کیا تھا کہ وہ بیرونی حاکموں سے فرداً فرداً اکیلے میں ملاقات کرے گی۔ بہت سی باتیں ایسی ہوتی ہیں جو سرِ دربار نہیں کی جاسکتیں۔ ملک التونیہ اس اعلان سے حواس باختہ ہو گیا تھا۔ محبوب سے ملاقات اور وہ بھی اکیلے میں۔ وہ اس کے سامنے بول بھی سکے گا؟ وہ اس سے کیا کہے گا؟ پھر اس نے اس کی وفاداریاں خریدنے کے لیے بہت سی باتیں دل میں سوچ لیں۔ تھوڑی دیر کے لیے وہ اس خوش فہمی میں بھی مبتلا ہوا تھا کہ ہوسکتا ہے رضیہ سلطانہ نے اس سے اکیلے میں ملنے کے لیے یہ منصوبہ بندی کی ہو کہ تمام حاکموں کو اکیلے میں ملنے کا موقع دیا ہو۔ ہوسکتا ہے اس کے دل میں جو آگ جل رہی ہے، رضیہ بھی اسی آگ میں جل رہی ہو۔ یہی سب سوچتے ہوئے وہ خلوت سلطانی میں داخل ہو گیا۔ وہ اس وقت بھی مردانہ لباس میں تھی۔ وہ بے پردہ اس کے سامنے بیٹھی تھی۔ کوئی کنیز اس کے پاس موجود نہیں تھی۔ رضیہ سلطانہ نے اپنی نشست سے اٹھ کر اپنے معزز مہمان کا خیر مقدم کیا۔ ملک التونیہ یہ سمجھنے سے قاصر تھا کہ وہ ہر مہمان کا اسی طرح استقبال کر رہی تھی یا یہ سلوک صرف اس کے ساتھ تھا۔
ملک التونیہ نے اس کی ہمدردی حاصل کرنے کے لیے ایک بناوٹی کہانی بیان کر دی۔
''علاؤالدین شیر خانی میرے پاس پناہ لینے آیا تھا۔ میں نے انکار کر دیا۔''
''وہ بوڑھا بوالہوس اب کہاں ہے؟''
''یہ میرے علم میں نہیں۔''
''آپ نے اسے پناہ کیوں نہیں دی؟''
''وہ آپ کا دشمن ہے۔ آپ کا دشمن میرا دوست کیسے ہوسکتا ہے۔''
''پھر آپ نے اسے زندہ کیسے جانے دیا؟''
''میں نے کوشش کی تھی لیکن وہ ہوشیار نکلا۔ میرے تیور دیکھ کر فرار ہو گیا لیکن میں آپ سے وعدہ کرتا ہوں، اسے تلاش کروں گا اور زندہ یا مردہ آپ کے سامنے پیش کر دوں گا۔''

''ہمیں اپنے ملازموں سے یہی توقع ہے۔''
ملک التونیہ کے ارمانوں پر اوس پڑ گئی۔ وہ تو یہ سمجھ کر آیا تھا کہ رضیہ سلطانہ ابھی میرے شادی کے پیغام کو بھولی نہیں ہوگی۔ وہ میرے جذبے کی قدر کرے گی۔ میری مردانہ وجاہت پر فدا ہو جائے گی لیکن وہ تو مجھے محض ملازم سمجھتی ہے۔ مجھ سے ان جذبات کی توقع رکھتی ہے جو بحیثیت حاکم میرے فرائض میں شامل ہیں۔

اس نے رضیہ سلطانہ کے رویے سے اپنی سخت توہین محسوس کی۔ اس کے بعد جتنی باتیں ہوئیں، وہ بے دلی سے ان کے جواب دیتا رہا اور پھر اجازت ملنے پر اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔

اس کے جاتے ہی رضیہ سلطانہ کا ماضی اس کے سامنے آ گیا۔ یہی وہ شخص ہے جس کے بارے میں مجھے معلوم ہوا تھا کہ وہ مجھ سے شادی کرنا چاہتا ہے۔ اس خیال کے ساتھ ہی جمال الدین یاقوت حبشی اس کے تصور میں آ گیا۔ تیر کی طرح سیدھا کھڑا ہوا۔ دونوں ہاتھ نماز کی نیت کی طرح بندھے ہوئے۔ آنکھیں زمین کا منہ چومتی ہوئی۔ وفا کا پیکر، غلام یا امیر آخور۔ رضیہ حیران تھی کہ ملک التونیہ سے ملاقات کے فوراً بعد یاقوت حبشی کا خیال کیوں آ گیا؟ دونوں کا کیا موازنہ؟ فرماں روائے ہند ہوتے ہوئے میرے ذہن میں ایک غلام کا تصور نہیں ابھرنا چاہیے تھا۔ جلد ہی وہ اس حقیقت تک پہنچ گئی کہ غیر شعوری طور پر جمال الدین یاقوت اس کے بہت قریب آ گیا ہے۔ اب وہ جو مرد دیکھے گی، اس کا موازنہ یاقوت حبشی سے ضرور کرے گی۔ یاقوت حبشی وہ واحد مرد ہے جو حق مردانگی نہیں جتاتا، اس کے سامنے آنکھیں جھکائے رہتا ہے۔ اس پر حکومت کرنا نہیں چاہتا، اس کا محکوم ہے۔ اس نے گھبرا کر ادھر ادھر دیکھا اور پھر خود کلامی کے انداز میں بولی یاقوت حبشی میرے شایان شان نہیں۔ دوسرے ہی لمحے اس نے اس خیال کو مسترد کر دیا اور یاقوت کو بارگاہِ ناز میں طلب کیا۔

''تم میرے لیے کسی کی جان لے سکتے ہو؟''
''سلطانِ اعظم! انسان کو سب سے زیادہ اپنی جان پیاری ہوتی ہے۔ آپ کے لیے میں اپنی جان بھی لے سکتا ہوں۔''
''لیکن کیوں...... میرے حکم میں ایسی کیا طاقت ہے؟''
''اس کو میں کوئی نام نہیں دے سکتا۔''
''اگر میں حکم دوں کہ اسے کوئی نام دو؟''
''یہ پہلی اور آخری نافرمانی ہوگی جو میں کروں گا۔ اسے میں کوئی نام نہیں دے سکتا۔''
''بس اب جاؤ۔''

التتمش کے زمانے سے اب تک وہ مردانہ زندگی گزار رہی تھی۔ غیر محسوس طریقے سے اس کی نسوانیت اس سے رخصت ہو گئی تھی۔ حکم دینے کی عادت ایسی پڑی تھی کہ حکم سننے اور اس پر عمل کرنے کی طاقت ہی نہ رہی تھی اسی لیے جو مرد اس کے معیار پر پورا اتر رہا تھا، وہ جمال الدین یاقوت تھا جو مرد تھا...... لیکن حاکم نہیں۔

جمال الدین یاقوت اس کی بارگاہ میں ہر وقت آ جا سکتا تھا۔ اس کے دروازے پر ہر وقت موجود رہتا۔ وہ جب چاہتی اسے بلا لیتی اور گھنٹوں اس سے باتیں کرتی۔ اس کی کنیزیں اس منظر کو دیکھتی تھیں۔ لطف اندوز بھی ہوتی تھیں اور افسوس بھی کرتی تھیں کہ رضیہ ایک غلام کو دل دے بیٹھی ہے۔

کچھ دن نہیں گزرے کہ امراء میں بھی اس کے چرچے ہونے لگے۔ جن کو وہ مسترد کر چکی تھی، وہ اس میں اور بھی رنگ آمیزی کر رہے تھے۔

☆☆☆

ملکہ ترکان شاہ زنداں میں تھی۔ رضیہ کو اس کے مظالم بھی یاد تھے لیکن اس کے باوجود اس نے حکم دیا تھا کہ ملکہ پابند ضرور ہے لیکن اسے کسی قسم کی تکلیف نہ ہونے پائے۔ اس کی تمام ضروریات کا اس کے شایانِ شان خیال رکھا جائے۔ اتنی رعایتوں کے باوجود اسے اقتدار سے محرومی کا شدید احساس تھا۔ گم صم بیٹھی رہتی تھی۔ کبھی کبھی دورہ سا پڑ جاتا تھا۔ اس عالم میں چیخنے چلانے لگتی تھی۔ اس کی زبان پر رضیہ کے لیے گالیاں جاری ہو جاتی تھیں۔ اس کی آواز زنداں کی سنگی دیواروں سے باہر نہیں نکلتی تھی۔ غالباً یہی احساس تھا کہ اس کا ذہنی توازن بالکل ہی بگڑ گیا۔ اسی پاگل پن میں ایک دن اس نے اپنا سر دیواروں سے ٹکرانا شروع کر دیا۔ جب تک پہرے دار اس تک پہنچتے، وہ شدید زخمی ہو چکی تھی۔ طبیبوں نے اسے بچانے کی بہت کوشش کی لیکن وہ جانبر نہ ہو سکی۔

کچھ دنوں بعد رکن الدین فیروز بھی اسی عالمِ اسیری میں وفات پا گیا۔

☆☆☆

رضیہ سلطانہ کو نہایت ناگفتہ بہ حالات میں اقتدار ملا تھا۔ رکن الدین فیروز کی صرف چھ ماہ کی ناقص کارکردگی کا نتیجہ یہ نکلا تھا کہ ملک میں سخت ابتری پھیل گئی تھی۔ سلطنت کا تمام نظام درہم برہم ہو چکا تھا۔ بڑے بڑے جاگیردار اور ناظم الامور خودسری پر آمادہ تھے۔ بہت سے امیر باہمی سمجھوتا

کر کے دلی کی طرف بڑھ آئے تھے اور اسے گھیرے ہوئے تھے مگر رضیہ کی سیاسی چالوں نے ملک کو تباہی سے بچالیا۔

تخت پر بیٹھتے ہی اس نے چند ایسے احکام بھی جاری کیے جن کا تعلق شریعت اور سماجی بھلائی سے تھا۔ شراب بیچنے اور شراب پینے پر پابندی لگادی گئی۔ رقص و سرود کی محفلیں ممنوع قرار دے دی گئیں۔ بیوہ عورتوں کے وظائف مقرر کیے گئے۔ حکومت کو کمزور دیکھ کر قزاقوں اور لٹیروں نے مسافروں کا جینا حرام کر دیا تھا۔ رضیہ نے ایسے قوانین بنائے کہ قزاقوں اور لٹیروں کا صفایا ہوگیا۔ غرض عہد التمش کے وہ تمام قاعدے، ضابطے اور اصول جو رکن الدین کے عہد میں نقش و نگار طاقِ نسیاں ہو گئے تھے، رضیہ نے انہیں دوبارہ نافذ کیا۔ اس نے حکومت کے فرائض کو انجام دینے کے سلسلے میں التمش کی پوری پیروی کی اور انصاف و جود و سخا کو اپنا شعار بنالیا۔ ان اقدامات سے اس نے عوام کے دل جیت لیے۔

ان اقدامات پر عمل پیرا ہونے کے لیے اس نے حکومت کے بڑے بڑے عہدے قابلِ اعتماد امیروں کے سپرد کیے۔ سابق وزیر اعظم نظام الملک کے نائب مہدی غزنوی کو وزارت کے منصب پر سرفراز کیا۔ یہ نیا وزیر بھی نظام الملک کے خطاب سے بہرہ ور ہوا۔ لشکر کی نیابت سیف الدین ایبک کے حوالے کی گئی اور اسے قتلغ خاں کے خطاب سے نوازا۔ اسی طرح دوسرے مقامات کی حکومتیں بھی ملک کے نامی گرامی اور قابلِ اعتماد امراء کے حوالے کی گئیں اور وہ سب دارالسلطنت دہلی سے اپنی اپنی تقرری کا فرمان لے کر اپنے اپنے علاقوں کو روانہ ہوئے۔

☆☆☆

نظام الملک فرار ہو کر لاہور چلا گیا تھا اور ابھی تک وہیں پناہ گزینی کے دن گزار رہا تھا۔ اپنی چرب زبانی سے لاہور کے حاکم عزالدین کے دل میں ایسا گھر کر لیا تھا کہ وہ اسے ہر وقت اپنے مشوروں میں شامل رکھتا تھا۔ نظام الملک کی ہوس اقتدار ابھی ختم نہیں ہوئی تھی۔ وہ اسے برابر رضیہ سلطانہ کے خلاف بھڑکاتا رہتا تھا۔ طعنے دیتا تھا کہ ترک امراء کی غیرت کو کیا ہو گیا ہے۔ ایک عورت کی غلامی کا طوق اپنے گلے میں ڈالا ہوا ہے۔ اس کے سامنے سر جھکائے کھڑے رہتے ہیں۔ نظام الملک کے اس کہنے کا مقصد عزالدین کو غیرت دلانا تھا کیونکہ وہ بھی ترک تھا۔ وہ التمش کے غلاموں میں سے ایک تھا لیکن تھا تو ترک۔

نظام الملک کو یہاں آرام سے دن گزارتے دیکھ کر علاؤالدین شیر خانی اور سیف الدین کوچی بھی لاہور پہنچ گئے۔ ان کے آنے سے نظام الملک کی طاقت بہت بڑھ گئی۔ اب وہ حاکم لاہور کو مجبور کرنے لگا کہ وہ مرکز کے خلاف بغاوت کر دے۔ عزالدین اب بھی جھجک رہا تھا۔ عیار نظام الملک نے اس موقع پر ایسی چال چلی کہ عزالدین چاروں خانے چت ہو گیا۔ نظام الملک جانتا تھا کہ ملک التونیہ سے عزالدین کی دشمنی ہے۔ اس نے یہی ہتھیار استعمال کیا۔

''ملک التونیہ، رضیہ سلطانہ سے شادی کا خواہش مند ہے۔ یہ شادی التمش کی زندگی ہی میں ہو جاتی لیکن التمش کی زندگی نے وفا نہ کی۔ پھر حالات دگرگوں ہوتے چلے گئے۔ اب سکون ہوا اور میری معلومات کے مطابق رضیہ اب ... شادی کے بارے میں سوچ رہی ہے۔ سوچو اگر ایسا ہو گیا تو تمہارا مستقبل کیا ہوگا۔ تم اس سکون کو بے سکونی میں بدل دو تاکہ شادی کچھ دن کے لیے ٹل جائے۔ ملک التونیہ جس اقتدار کے خواب دیکھ رہا ہے، تم آگے بڑھ کر اس سے اس کا یہ خواب چھین سکتے ہو۔''

''جب بڑے بڑے ترک امراء مجبور ہیں تو میں کیا کر سکتا ہوں۔''

''آپ مجبور نہیں ہیں۔ علاؤالدین شیر خانی اور سیف الدین کوچی کے لشکر آپ کے ساتھ ہیں۔ ہم بغاوت کر کے دہلی تک پہنچ گئے تو وہ ترک امراء بھی ہمارا ساتھ دیں گے جو ''عورت'' کی غلامی سے تنگ ہیں۔''

ملک عزالدین اتنے سہارے ملنے کے بعد مرکز سے بغاوت کرنے پر آمادہ ہو گیا۔ علاؤالدین شیر خانی اور سیف الدین کوچی بھی اس شرط پر ساتھ دینے کے لیے آمادہ ہو گئے کہ جو نئے علاقے فتح ہوں گے، وہ ان دونوں میں تقسیم کر دیے جائیں گے۔ نظام الملک کے دل میں یہ آرزو کروٹیں لے رہی تھی کہ اگر عزالدین دہلی کے تخت پر قابض ہو گیا تو اسے اپنا وزیر بنا لے گا۔ خود عزالدین کو یہ امید تھی کہ ایک ''عورت'' اس کا مقابلہ کتنی دیر کرے گی اور بالآخر وہ فتح یاب ہوگا۔

ملک عزالدین نے لاہور سے نکلنے سے قبل رضیہ کو خط لکھا تاکہ جنگ کا جواز پیدا ہو جائے۔ اس خط میں اس نے صاف صاف لکھ دیا کہ اسے ایک عورت کی غلامی ہرگز قبول نہیں۔ آپ تخت سے دست برداری کا اعلان کریں ورنہ مجھے باغی سمجھیں۔ میں نہ محاصل ادا کروں گا اور نہ مرکز سے کوئی تعلق رکھوں گا۔

اس کا خیال تھا کہ رضیہ اس خط کے جواب میں بہت سی

رعایتیں بخش دے گی۔ وہ جنگ سے بھی بچ جائے گا اور اپنے لیے بہت سی مراعات بھی حاصل کرلے گا لیکن ہوا اس کے برعکس۔ رضیہ سلطانہ اس خط کے جواب میں ایک لشکر جرار لے کر لاہور کی جانب چل دی۔ عزالدین سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ ایک نرم و نازک دوشیزہ لشکر کی راہنمائی کرتی ہوئی عازمِ جنگ ہوگی۔ وہ بڑی حیرت کے ساتھ اپنی فوج کے ساتھ لاہور کی حدود سے نکلا۔ دونوں فوجیں آمنے سامنے ہوئیں تو اس کی حیرت میں مزید اضافہ ہوا۔ وہ دیکھ رہا تھا کہ شہزادی رضیہ مردانہ لباس میں گھوڑے پر سوار لشکر کے قلب میں موجود ہے۔ جنگ عورتوں کا کھیل نہیں ہوتی۔ وہ اگر لشکر کے ساتھ آ بھی گئی تھی تو کسی خیمے میں بیٹھ کر جنگ کا تماشا دیکھ رہی ہوتی لیکن وہ تو خطرے سے بے پروا میدانِ جنگ میں موجود ہے۔ وہ اس کے حسنِ انتظام سے اتنا متاثر ہوا کہ اپنا گھوڑا اپنی صفوں سے آگے بڑھالیا۔ دائیں بائیں گردن گھما کر دیکھا۔ علاؤ الدین شیر خانی، سیف الدین کوچی، نظام الملک اپنے اپنے لشکروں کے ساتھ کھڑے تھے اور انتظار میں تھے کہ جنگ کا آغاز ہو اور وہ آگے بڑھیں۔ ان کی نظریں عزالدین پر لگی ہوئی تھیں۔ ان کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ وہ اپنا گھوڑا لے کر صفوں سے باہر کیوں آگیا ہے۔ پھر انہوں نے دیکھا عزالدین نے گھوڑے کو ایڑ لگائی اور دشمن کے لشکر کی طرف سرپٹ دوڑا۔ ان تینوں نے آواز لگائی۔

''عزالدین کیا کرتے ہو؟'' ان کی آوازوں نے سکوت کو توڑا ضرور لیکن عزالدین نے پلٹ کر بھی نہیں دیکھا۔

اسے آتا دیکھ کر رضیہ سلطانہ کی اگلی صفوں میں اضطراب پیدا ہوا وہ چاہتے تھے کہ عزالدین کو تلواروں پر رکھ لیں کہ عزالدین نے اپنی تلوار پھینک دی۔ سپاہیوں نے اسے چاروں طرف سے گھیر لیا۔

''میں لڑائی کے ارادے سے نہیں آیا ہوں۔ مجھے سلطانِ اعظم رضیہ سلطانہ کے پاس لے چلو۔''

رضیہ سلطانہ قریب ہی موجود تھی۔ اس نے سپاہیوں کو حکم دیا۔ ''وہ عزالدین کو اعزاز کے ساتھ میرے خیمے تک پہنچائیں۔ وہ اگر کوئی بات کرنے آئے ہیں تو میں ان سے بات کروں گی۔''

عزالدین کو رضیہ سلطانہ کے خیمے میں پہنچا دیا گیا جہاں وہ بھی پہنچ گئی تھی۔ اس نے خیمے سے نکل کر عزالدین کا استقبال کیا اور اپنے ساتھ لے کر خیمے کے اندر گئی۔

''سلطانِ اعظم! میں کسی کے ورغلانے میں آگیا تھا۔ مجھ سے کہا گیا تھا کہ ایک لڑکی خواہ میرے آقا التمش کی بیٹی کیوں نہ ہو، ملک کو نہیں چلاسکتی۔ ملک میں انتشار پھیل جائے گا کیونکہ مجھ سے کہا گیا تھا کہ ترک امراء آپ کے خلاف ہوگئے ہیں۔ میں اپنے آقا کی چھوڑی ہوئی عظیم سلطنت کو بچانے کے لیے آپ کی تنزلی کا خواہش مند ہوگیا تھا۔ مجھے فریب دیا گیا تھا جس کا میں شکار ہوگیا لیکن میری آنکھیں تو یہ دیکھ رہی ہیں کہ آپ ''مردِ میدان'' ہیں۔ آپ کی جرأت دیکھ کر مجھے یقین ہوگیا کہ آپ میرے آقا کی سلطنت کی حفاظت کرسکتی ہیں۔ امید ہے آپ میرا قصور معاف کردیں گی۔''

''تجھے ورغلانے والے کون ہیں؟''

''علاؤ الدین شیر خانی، سیف الدین کوچی اور آپ کا سابق وزیر نظام الملک۔''

''کیا تو نہیں جانتا کہ یہ ہمارے نہیں، تیرے آقا کی سلطنت کے دشمن ہیں؟''

''میری آنکھیں اب کھلی ہیں۔''

''تو اگر ان تینوں کو اپنی پناہ سے نکال کر ہمارے حوالے کردے تو ہماری مہربانیاں تیرے ساتھ ہیں۔''

''میں وعدہ کرتا ہوں کہ انہیں گرفتار کرکے آپ کے حضور پیش کردوں گا۔''

''ہم تیری وفاداری کے صلے میں لاہور کے ساتھ ساتھ ملتان کی حکومت بھی تجھے بخشتے ہیں۔''

نظام الملک نے بھانپ لیا تھا کہ عزالدین کس ارادے سے رضیہ کے لشکر میں گیا ہے۔ اس نے علاؤ الدین شیر خانی اور سیف الدین کوچی کو بھی خبردار کردیا کہ اب ہمارا لاہور میں رکنا خطرے سے خالی نہیں۔

عزالدین اس خیال سے واپس لوٹا کہ نظام الملک وغیرہ کو دھوکے سے گرفتار کرکے شہزادی کے حضور پیش کردے گا لیکن وہ اپنے لشکر میں پہنچا تو تینوں فرار ہوکر اس کی دسترس سے دور جاچکے تھے۔ اب اس کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا کہ ان کا تعاقب کیا جائے۔ ملک عزالدین اجازت کی غرض سے ایک مرتبہ پھر رضیہ سلطانہ کی خدمت میں حاضر ہوا اور ان کے فرار سے آگاہ کیا۔

''وہ تمہاری پناہ سے دور چلے گئے ہیں۔ اب وہ میرے قیدی ہیں۔ میں ان کے ساتھ جو بھی سلوک کروں، تم نے اپنی ذمے داری پوری کردی۔''

رضیہ سلطانہ نے اپنے چند بااعتماد لوگوں کو ان تینوں کے تعاقب میں روانہ کردیا۔ ان تعاقب کرنے والوں میں یاقوت حبشی بھی تھا۔ رضیہ کو اس سے زیادہ کس پر اعتبار ہوسکتا تھا۔

ان لوگوں کو روانہ کرنے کے بعد رضیہ نے واپسی کا راستہ اختیار کیا۔ عزالدین لاہور کی طرف لوٹ گیا۔ جنگ کے بغیر فتح نصیب ہوگئی تھی۔ امیر لشکر اس فتح کو رضیہ سلطانہ کی اقبال مندی سے تعبیر کررہا تھا۔ لشکر کی خوشی کا ٹھکانا نہیں تھا۔ مسرت کے شادیانے بجاتا ہوا یہ لشکر دہلی کی طرف چلا۔ دہلی سے چند کوس کے فاصلے پر سیف الدین ایبک اچانک بیمار پڑ گیا۔ طبیب ساتھ تھے۔ انہوں نے معائنہ کیا اور تجویز کیا کہ سالار کو ''لو'' لگ گئی ہے۔ ضروری دوائیں دے کر اسے سنبھالے رکھا اور یہ قافلہ دہلی پہنچ گیا۔ دہلی پہنچتے ہی اس کا علاج شروع ہوگیا لیکن سیف الدین ایبک جانبر نہ ہوسکا۔

رضیہ کو اس کی وفات کا سخت صدمہ ہوا۔ یہ وہ شخص تھا جس نے رضیہ سلطانہ کو ترکان شاہ کے مظالم سے بچانے میں اہم کردار ادا کیا تھا اور اسے اقتدار کی منزل تک پہنچانے کا باعث بنا تھا۔ رضیہ نے اس کی خدمات کے اعتراف کے طور پر تین روزہ سوگ کا اعلان کیا۔ قلعے میں قرآن خوانی ہوتی رہی اور شہریوں کو حکم ہوا کہ گھروں پر سیاہ جھنڈے لہرائیں۔ سیف الدین کے سوگ میں پورا شہر سیاہ ہوگیا۔

جب وہ اس صدمے سے باہر آئی تو نیابت لشکر قطب الدین کے سپرد کی۔ حالات سازگار ہوتے ہی رضیہ سلطانہ نے سب سے پہلے راجپوتانہ کے حالات کا جائزہ لیا۔ یہاں کے سردار سلطان التمش کی وفات کے بعد پھر باغی ہوگئے تھے اور انہوں نے رن تھنبور کا محاصرہ کرلیا تھا جہاں کچھ مسلمان سردار مقیم تھے اور ان ہی.... مسلمان سرداروں نے رکن الدین کی توجہ بھی اس طرف دلائی تھی لیکن اس نے کوئی قدم نہیں اٹھایا تھا۔ رضیہ کو جب ان حالات کا علم ہوا تو اس نے نئے سالار ملک قطب الدین حسن غوری کو ان کی سرکوبی کے لیے بھیجا۔ قطب الدین نے جلد ہی حالات پر قابو پالیا۔ قلعے پر قبضہ کیا اور قلعے کو ویران کردیا اور خود پایۂ تخت چلا آیا۔

رضیہ سلطانہ کی انصاف پسندی اور دانش مندی پر بغاوت کو جڑ سے اکھاڑ پھینکا۔ جو لوگ اسے عورت سمجھ کر من مانیاں کرنے لگے تھے ان کے دلوں پر اس کا رعب طاری ہوگیا۔ تمام ملک امن وامان کی زندگی بسر کررہا تھا۔ ہر قسم کی بغاوتوں اور شورشوں کا خاتمہ ہوچکا تھا اور عوام خوشحالی کی جانب گامزن تھے۔ پنجاب سے بنگال تک اس کی دانش مندی اور رعیت نوازی کے چرچے تھے۔ جدھر نظر اٹھتی تھی، عشرت ومسرت کی جیتی جاگتی تصویریں نظر آتی تھیں۔ امیر غریب سب خوش تھے۔ لوگ علم وفضل کی روشنی سے منور ہورہے تھے۔ تجارت ترقی پر تھی۔ کارواں لٹیروں کے خطرے سے بے نیاز ایک جگہ سے دوسری جگہ جاتے تھے۔

رضیہ سلطانہ کی کامیابیوں کی اس دن تکمیل ہوگئی جب دشمنوں کے تعاقب میں بھیجا ہوا اس کا لشکر کامرانی کے پھریرے اڑاتا ہوا واپس آگیا۔

''امیر آخور جمال الدین یاقوت شرف باریابی کے منتظر ہیں۔'' نقیب نے صدا لگائی۔

کنیز یہ منظر دیکھ کر چونکے بغیر نہ رہ سکی کہ رضیہ سلطانہ جو ابھی ابھی آرام کی غرض سے بستر پر دراز ہوئی تھی، ننگے پاؤں دروازے کی طرف بھاگی۔ اس نے جمال الدین یاقوت کے اندر آنے کا انتظار بھی نہیں کیا تھا۔

یاقوت ایک بھاری خوان اپنے ہاتھوں میں لیے کھڑا تھا۔

''یاقوت! تم آگئے؟ خیریت سے ہو، کوئی گزند تو نہیں پہنچی؟'' رضیہ سلطانہ بے صبری سے اس کے حالات پوچھ رہی تھی۔ پھر اس کی نظر اس خوان پر پڑی جو یاقوت اٹھائے ہوئے تھا۔ ''یہ کیا ہے...... کوئی تحفہ ہے جو تم مجھے نذر کرنے کے لیے لائے ہو؟''

''سلطان اعظم یہی سمجھ لیجیے۔ اس سے بہتر تحفہ کوئی اور ہو ہی نہیں سکتا تھا۔''

''ہم بھی تو دیکھیں اس میں کیا ہے۔'' یہ کہتے ہوئے رضیہ نے کپڑا ہٹادیا۔ وہ نہایت مضبوط دل کی مالک تھی لیکن تھی تو ایک عورت۔ کپڑا ہٹتے ہی وہ منہ پھیرنے پر مجبور ہوگئی۔ اس خوان میں دو کٹے ہوئے سر رکھے تھے۔

''سلطان اعظم! آپ کے دونوں دشمن علاؤ الدین شیر خانی اور سیف الدین کوچی کیفر کردار کو پہنچ گئے۔ یہ ان کے کٹے ہوئے سر ہیں۔''

''اور نظام الملک؟''

''وہ ہمارے ہاتھوں سے بچ نکلا۔ وہ ''بردار'' کے پُرپیچ پہاڑی راستوں میں کہیں گم ہوگیا لیکن سلطان اعظم، وہ ایسے راستوں میں داخل ہوگیا ہے کہ زندہ واپس نہیں آسکے گا۔ وہ پہاڑی راستے بھول بھلیوں کی طرح ہیں۔ وہاں انسان داخل تو ہوتا ہے لیکن واپسی کا راستہ بھول جاتا ہے۔ بھوک پیاس سے ایڑیاں رگڑ کر مرجائے گا۔ میں اس کا سر نہیں لاسکا لیکن وہ زندہ بھی نہیں بچے گا۔''

نظام الملک کو اس کے بعد کسی نے زندہ نہیں دیکھا۔

☆☆☆

رضیہ بہت خوش تھی۔ ایک نہیں تین سازشیوں سے

اسے نجات ملی تھی جو کسی بھی وقت اس کے لیے خطرہ بن سکتے تھے۔ جمال الدین یاقوت کی طرف سے اس کے دل میں مزید جگہ بن گئی تھی۔ اس کامیابی کی خوشی میں اس نے دوسرے روز دربارِ خاص آراستہ کیا۔

رضیہ سلطانہ کے کئی معتمد سردار اس مہم میں یاقوت حبشی کے ہمراہ گئے تھے لیکن جب اس تے اس مہم کا ذکر کیا تو کامیابی کا سہرا یاقوت حبشی کے سر باندھا۔ دیگر لوگوں کا ذکر تک نہیں آیا۔

یہاں تک بھی غنیمت تھا کہ سب کے سب خون کا سا گھونٹ پی کر رہ گئے۔ اس کے بعد اگلی ہی سانس میں رضیہ سلطانہ نے ایک ایسا اعلان کر دیا کہ اپنی اپنی نشستوں پر بیٹھے ہوئے نامور امراء پتھر کا مجسمہ بن کر بیٹھے کے بیٹھے رہ گئے۔

رضیہ سلطانہ نے ایک اعلان کے ذریعے یاقوت حبشی کو ''امیر الامراء'' بنا دیا۔

ترک سرداروں کی اس سے بڑی بے عزتی کیا ہو سکتی تھی کہ ایک حبشی کو ان کا امیر بنا دیا جائے۔ اسے ''امیر آخور'' بنانے کا فیصلہ تو اس لیے قابلِ قبول ہو گیا تھا کہ فیصلہ کرنے والا التمش تھا۔ اب ان سرداروں کے سامنے التمش نہیں، اس کی بیٹی تھی جسے عورت ہونے کے باوجود بعض مجبوریوں کی وجہ سے انہوں نے تخت التمش پر بٹھا دیا تھا۔ اب ایک حبشی کو ان کا امیر بنایا جا رہا تھا۔ یہ رضیہ کا رعب و دبدبہ تھا کہ اس کے سامنے ہونٹ خاموش رہے لیکن دربار ختم ہوتے ہی نفرتوں کو زبان مل گئی۔

التمش کا بیٹا شہزادہ معزالدین بہرام شاہ سب سے زیادہ چراغ پا تھا کیونکہ اگر نفرتوں کی آندھی رضیہ کے اقتدار کو اڑا کر لے جاتی تو سب سے زیادہ طاقتور امیدوار وہی تھا۔

یہ ممکن تھا کہ ترک سردار کچھ دن شور مچا کر خاموش ہو جاتے لیکن معزالدین نے انہیں مشتعل کرنے کے لیے اس فیصلے کی زبردست مخالفت شروع کر دی۔ اس نے امراء کا اجلاس طلب کیا اور انہیں باور کرایا کہ وہ سب ایک حبشی غلام کے غلام بنا دیے گئے ہیں۔ وہ اپنی گفتگو میں بار بار رضیہ سلطانہ کا نام لیتا تھا مثلاً سلطان اعظم نے جان بوجھ کر آپ لوگوں کی تذلیل کی ہے یا کہتا، سلطان اعظم کا ہاتھ اگر اس حبشی کے سر پر نہ ہوتا تو میں اپنے ہاتھ سے اس کا سر قلم کر دیتا۔ بار بار رضیہ سلطانہ کا نام لینے سے اس کا مقصد یہ تھا کہ ان سرداروں کے دلوں میں رضیہ سلطانہ کی نفرت کا دھواں بھر جائے۔ یہ سب اس کے خلاف ہو جائیں اور جس طرح رکن الدین فیروز کو معزول کر کے انہوں نے اس کی

جگہ رضیہ سلطانہ کو تخت پر بٹھا دیا تھا، اسی طرح رضیہ کا تاجِ شاہی چھین کر اس کے سر پر سجادیں۔ اس کا مقصد بہت جلد پورا ہوجاتا۔

اس وقت حکومت میں وہی امراء شامل تھے جنہوں نے بڑی تگ ودو کے بعد رضیہ کو تخت پر بٹھایا تھا۔ وہ اب کوئی ایسا کھیل نہیں کھیلنا چاہتے تھے جس سے انتشار پیدا ہو۔ انہیں یہ بھی معلوم تھا کہ رضیہ میں فرماں روائی کی پوری صلاحیت موجود ہے۔ وہی ہے جو سلطنت کو استحکام سے آشنا کرسکتی ہے۔ انہیں اگر اختلاف تھا تو یاقوت حبشی سے تھا اور وہ بھی اس کی کارکردگی سے نہیں اس کے کم نسلی ہونے سے تھا۔ بالآخر انہوں نے کئی اجلاسوں کے بعد معزالدین سے صاف کہہ دیا۔

''ہم سلطنت کی خاطر یاقوت حبشی کو برداشت کر رہے ہیں۔ اگر ہم نے کوئی قدم اٹھایا تو سلطنت میں وہ انتشار پیدا ہوجائے گا جسے اب سنبھالنا مشکل ہوجائے گا۔''

وہ امراء یہ پھر بھی نہ کہہ سکے کہ معزالدین تم میں یہ صلاحیت نہیں کہ سلطنت سنبھال سکو۔

معزالدین امراء کے اس جواب سے سخت مایوس ہوا۔ اس کے بعد وہ ایک ایک امیر سے تنہائی میں ملا۔ تاج الدین کا مرتبہ ان امراء میں سب سے بلند تھا۔ وہ معزالدین کی باتوں میں آکر نیم رضامند ہوگیا تھا لیکن مسئلہ دوسرے امراء کا تھا جو ترک ہونے کی وجہ سے یاقوت حبشی کے خلاف تو تھے لیکن اس کے خلاف کوئی سخت قدم اٹھاتے ہوئے ڈرتے تھے۔ تاج الدین نے ترک امراء کا ایک خفیہ اجلاس بلایا تاکہ کسی نتیجے پر پہنچ سکے۔ اس اجلاس میں معزالدین کی ذات بھی زیر بحث آئی۔ اس پر کسی کو اتفاق نہیں تھا کہ وہ رضیہ کا نعم البدل ثابت ہوگا۔

سوال یہ تھا کہ یاقوت حبشی سے نجات کس طرح ملے؟ اس کے خلاف آواز اٹھانے کا مطلب یہ تھا کہ رضیہ سے ٹکر لی جائے۔ امیر ضیاالملک نے تجویز پیش کی کہ ہم سب مل کر اپنی ذمے داریاں انجام دینے سے معذرت کرلیں۔ اس تجویز کی سب ہی نے مخالفت کی۔

''یہ قدم خودکشی کے برابر ہوگا۔ سلطان اعظم ہم سب کو معتوب قرار دے کر الگ کردیں گی۔ ہماری جگہ دوسرے لوگ امیر بنادیے جائیں گے۔ وہ حبشی زادہ اپنی جگہ برقرار رہے گا۔'' تاج الدین نے تجویز کی مخالفت کرتے ہوئے کہا۔

''برادرم تاج الدین! یہ تو خطرہ دیکھ کر ریت میں منہ چھپانے کے برابر ہوا۔''

''ہرگز نہیں۔ ہم اپنی آنکھیں کھلی رکھیں گے۔ ہوسکتا ہے خطرہ ٹل جائے۔ سلطان اعظم کو خود احساس ہوجائے کہ انہوں نے غلطی کی ہے۔''

''اگر انہیں احساس نہ ہوا تو؟''

''تو پھر ہم کوئی انقلابی قدم اٹھانے پر مجبور ہوجائیں گے۔ ضرورت اس امر کی ہے کہ ہم میں ہم آہنگی برقرار رہے۔''

تاج الدین کی سب نے حمایت کی اور یہ طے ہوا کہ جذبات میں کوئی قدم نہ اٹھایا جائے۔ کچھ دن دیکھ لیا جائے۔ اگر ہوا کا رخ مخالف رہا تو پھر کوئی تدبیر سوچی جائے گی۔

☆☆☆

شہزادہ معزالدین کی کنیز خاص، امیر خواجہ رشید کے ساتھ خلوت میں بیٹھی تھی اور سرگوشیوں میں باتیں ہورہی تھیں۔

''کیا واقعی شہزادہ تم سے محبت کرتا ہے؟''

''میں ایک لمحے کے لیے اس کے سامنے سے ہٹ جاؤں تو وہ بے چین ہوجاتا ہے۔''

''کیا تم سے اس نے یہ بھی کہا کہ وہ تم سے شادی کرلے گا؟''

''میں ایک کنیز ہوں۔ اس کی قربت ہی میرے لیے بہت ہے۔''

''کیا تم یہ نہیں چاہو گی کہ وہ تم سے شادی کرلے اور تم ملکۂ ہند کہلاؤ۔''

''یہ خواب تو میری آنکھوں میں ہر وقت رہتا ہے۔''

''یہ خواب اسی وقت مکمل ہوسکتا ہے جب شہزادے کے سر پر تاجِ شاہی رکھ دیا جائے اور وہ تمہارا احسان مند ہو۔''

''میرا احسان مند؟''

''اسے اقتدار کی منزل تک پہنچانے میں تمہارا ہاتھ ہو۔''

''میں بھلا اس کے لیے کیا کرسکتی ہوں؟ اقتدار کا راستہ تو آپ جیسے امیروں کے سہارے طے ہوتا ہے۔''

''میں راہنمائی کروں گا لیکن شہزادے کی انگلی پکڑ کر تو تمہیں چلنا ہے۔''

''میں کچھ سمجھی نہیں۔''

''دیکھو، میری بات غور سے سنو۔ جب تک رضیہ سلطانہ ہے شہزادے کو اقتدار نہیں مل سکتا۔ تمہیں رضیہ اور یاقوت حبشی کے تعلق کو شہزادے کے سامنے اتنی رنگ آمیزی کے ساتھ بیان کرنا ہے کہ معزالدین کی غیرت جوش میں آجائے۔ تم یہ سب اس طرح بیان کروگی کہ شہزادے کو

سچ مچ یقین.... آجائے اور یہ باتیں دوسرے امراء کی کنیزوں سے بھی کرو گی۔ جب رضیہ کا کردار مشکوک ہوجائے گا تو وہ امراء بھی رضیہ کے خلاف ہوجائیں گے۔ اس کے بعد کیا ہوگا وہ میں سنبھال لوں گا۔ میں شہزادے کے لیے اقتدار کی راہ ہموار کروں گا اور اس کے بعد تم ملکۂ ہند کہلاؤ گی۔''

یہ کوئی معمولی پیشکش نہیں تھی لیکن سوال یہ تھا کہ وہ رضیہ سلطانہ کی خلوت گاہ میں داخل کیسے ہو۔ رضیہ کی قربت ملنے کے بعد ہی وہ اس کے سچے یا جھوٹے رازوں سے پردہ اٹھا سکتی تھی۔ اس کی باتوں پر دوسروں کو اسی وقت یقین آسکتا تھا۔ اس کنیز نے اس مشکل کا اظہار کیا بھی تھا۔

''سلطان اعظم کی کنیز خاص لالہ رخ کے ہوتے ہوئے میری رسائی وہاں تک کیسے ہوگی۔ اگر وہاں پہنچے بغیر میں کوئی بات منہ سے نکالوں گی تو پھر اپنا انجام مجھے معلوم ہے۔ میں اپنے خواب اپنی آنکھوں میں لے کر مرنا نہیں چاہتی۔''

''یہ سب سوچنا میرا کام ہے۔ بس تم اتنا کرنا کہ جب تمہیں شہزادہ معزالدین سے جدا کر کے سلطان اعظم کی خدمت میں پیش کیا جائے تو انکار مت کرنا۔''

''شہزادے سے جدائی مجھے منظور نہیں۔''

''یہ جدائی عارضی ہوگی اور پھر اس کے بعد شہزادے کے لیے اقتدار کا راستہ صاف ہوجائے گا۔'' خواجہ رشید نے اس کنیز کو شیشے میں اتار لیا اور وہ چلی گئی۔

اس سازش کا آغاز کرنے والوں میں خواجہ رشید اکیلا نہیں تھا۔ اس کے پیچھے ''ترکان چہل گانی'' تھے جو التمش کے چالیس ترکی غلام تھے۔ انہی کی مدد سے رضیہ سلطانہ اقتدار میں آئی تھی اور اب وہی اس کے خلاف ہو رہے تھے۔ رضیہ سلطانہ طاقت کے نشے میں انہیں کوئی اہمیت نہیں دے رہی تھی۔

ان لوگوں نے التمش کے عہد ہی میں ایک جتھا بنا لیا تھا اور ایک دوسرے کی اعانت سے سلطنت کے بڑے بڑے عہدوں پر قبضہ کر لیا تھا لیکن سلطان التمش کی ذاتی قابلیت اور وجاہت نے انہیں زور نہیں پکڑنے دیا تھا۔ التمش کے بعد رکن الدین کے عہد میں ان کا اثر اس قدر بڑھ گیا کہ سلطنت کا ہر کام ان کے اشارے پر ہونے لگا۔ یہی لوگ رضیہ سلطانہ کو اقتدار میں لائے تھے۔ اس کی دانش مندی سے خوش بھی تھے لیکن یاقوت حبشی کے بڑھتے ہوئے اقتدار اور رضیہ سے اس کے تقرب نے سارا کھیل بگاڑ دیا۔ انہوں نے اسے قومی غیرت کا مسئلہ بنا لیا۔ ان کے نزدیک یہ قومی اہانت تھی کہ ایک سیاہ فام حبشی کو ''امیر الامراء'' کا شرف حاصل ہوجائے۔ انہیں عہدے کی مناسبت سے یاقوت حبشی کے سامنے کھڑا ہونا پڑتا تھا۔ اس کے علاوہ انہیں یہ شبہ بھی تھا کہ رضیہ سلطانہ اس حبشی سے عشق کرنے لگی ہے۔ اس مسئلے پر قابو پانے کے لیے انہوں نے مختلف امیروں کو مشتعل کیا اور رضیہ کے خلاف اکسانے لگے۔ بھٹنڈا کے حاکم ملک التونیہ سے بھی ان کے رابطے تھے کیونکہ وہ بھی التمش کا ایک غلام اور رضیہ سلطانہ کا امیدوار تھا جسے رضیہ مسترد کر چکی تھی۔ اسے بھڑکانا بہت آسان تھا۔

شہزادہ معزالدین کی کنیز خاص شہناز کو رضیہ کی جاسوسہ مقرر کرنا اسی سازش کی ایک کڑی تھی۔ اب صرف مسئلہ یہ تھا کہ اسے رضیہ تک پہنچایا کیسے جائے۔

اس مسئلے کا حل خود بخود نکل آیا۔ یہ بھی ہوسکتا ہے کہ اس کے پیچھے بھی کوئی سازش ہو۔ رضیہ کی کنیز خاص لالہ رخ کسی پراسرار بیماری کا شکار ہو کر بستر سے لگ گئی۔ یاقوت حبشی تک پیغام پہنچانا اور اسے بارگاہِ سلطانی تک رسائی دینا لالہ رخ کے فرائض میں شامل تھا۔ رضیہ کے بہت سے رازوں کی امین تھی اور اب بستر پر بے سدھ پڑی تھی۔ رضیہ کے تو جیسے ہاتھ پاؤں کٹ گئے۔

لالہ رخ کے ہٹتے ہی خواجہ رشید اور امیر تاج الدین نے شہزادہ معزالدین سے ملاقات کی اور اسے اقتدار کے خواب دکھا کر اس بات پر رضامند کر لیا کہ وہ اپنی کنیز شہناز کو بارگاہ سلطانی میں بھیج دے تاکہ رضیہ کے خلاف ٹھوس معلومات فراہم ہوسکیں۔

رضیہ سلطانہ ہر کنیز پر اعتبار نہیں کرسکتی تھی لیکن شہناز اس کے بھائی کی کنیز رہ چکی تھی۔ گفتگو کی مشاق، ذہن کی براق تھی۔ نکتہ سنج تھی۔ لطیفہ ساز تھی۔ ادبی ذوق کمال کو پہنچا ہوا تھا۔ صورت شکل بھی ایسی تھی کہ بادشاہوں کے برابر بیٹھ کر بجتی تھی۔ وہ سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ اس کا بھائی کسی سازش کا حصہ ہوسکتا ہے یا شہناز کسی خاص مقصد سے بھیجی گئی ہے۔ اس نے شہناز کو اپنے دروازے پر جگہ دے دی۔

رازوں نے منہ کھولنے شروع کردیے۔ شہناز، شہزادہ معزالدین سے دور نہیں رہ سکتی تھی۔ وہ گاہے بگاہے اس سے ملتی رہتی تھی اور رضیہ سے اسے متنفر کرنے کے لیے رضیہ اور یاقوت حبشی کے تعلقات بڑھا چڑھا کر بیان کرتی رہتی تھی۔ ایک روز اس نے نہایت کھل کر بات کہہ دی۔

''شہزادہ مکرم! میں یہ بات وثوق سے کہہ سکتی ہوں کہ بس کچھ دن جاتے ہیں یاقوت حبشی شاہی تاج میں

ہیرے کی طرح چمکنے لگے گا۔"

"تو کہنا کیا چاہتی ہے صاف صاف بتا؟"

"اس کے بعد آپ کی غیرت نے جوش مارا اور آپ نے میری گردن تراش دی تو میں کیا کرلوں گی؟"

"ہم تجھے زبان دیتے ہیں تو محفوظ رہے گی۔"

"یاقوت حبشی امیر الامراء بھی ہے اور سلطان اعظم کا مقرب خاص بھی۔ حال یہ ہے کہ سلطان اعظم کو اس کے بغیر چین نہیں پڑتا۔ گھنٹوں اس سے باتیں کرتی رہتی ہیں۔ ہم میں سے کسی کنیز کو بھی تنہائی میں مخل ہونے کی اجازت نہیں ہوتی۔ جب سلطانِ اعظم گھوڑے پر سوار ہوتی ہیں تو وہ غلام زادہ ان کی بغلوں میں ہاتھ ڈال کر گھوڑے پر سوار کراتا ہے۔"

"کیا تو نے خود دیکھا ہے؟"

"یہ منظر میں کئی بار دیکھ چکی ہوں۔ اگر آپ کو یقین نہیں تو میں آپ کو بھی مشاہدہ کرادوں گی۔"

"تو سچ ہی کہتی ہوگی۔ سوال یہ ہے کہ سلطانِ اعظم کو کیسے روکا جائے؟ یہ تو شاہی خاندان کے لیے بڑی رسوائی کی بات ہے۔"

"چھوٹا منہ بڑی بات۔ میں کچھ عرض کروں؟"

"میری سماعتیں تجھے سننے کو تیار ہیں۔"

"جمال الدین یاقوت کو کسی طرح قتل کرادیا جائے۔"

"کیا صرف یاقوت قصوروار ہے؟"

"اس نے سلطان اعظم کا دل جیت لیا ہے۔ جب وہ نہیں رہے گا تو سلطان اعظم خودبخود راہِ راست پر آجائیں گی۔"

"یاقوت کا قتل قیامت برپا کردے گا۔"

"سوچ لیجیے، وہ اگر زندہ رہا تو کوئی نہ کوئی گل ضرور کھلے گا۔ سلطان اعظم اب اس کے بغیر رہ نہیں سکیں گی۔"

"کیا تو سمجھتی ہے کہ بات اتنی آگے بڑھ گئی ہے؟"

"باتیں تو اور بھی ہیں لیکن اس سے آگے کچھ اور کہتے ہوئے میرا منہ جلتا ہے۔ وہ آخر آپ کی بہن ہیں۔ ان کی رسوائی آپ کی رسوائی ہے۔"

شہناز نے بڑی ہوشیاری سے شہزادے کی غیرت پر تازیانے برسادیے تھے۔ شہزادہ رضیہ سلطانہ کا سوتیلا بھائی تھا لیکن تھا تو بھائی۔ اس سے زیادہ سننے کی اس میں بھی تاب نہیں رہی تھی۔ وہ شہناز کو چھوڑ کر اٹھ گیا۔

جس بات کی آدمی ٹوہ میں لگا رہتا ہے وہ نظر آکر رہتی ہے۔ ایک دن یہ منظر شہزادے نے اپنی آنکھوں سے دیکھ لیا۔ یاقوت چل تو غلاموں کی طرح رہا تھا، اس کے ہاتھ بندھے ہوئے تھے، نظریں جھکی ہوئی تھیں لیکن جب رضیہ گھوڑے پر بیٹھنے لگی تو غلام کے ہاتھ کھل گئے۔ اس نے رضیہ سلطانہ کی بغلوں میں ہاتھ دیے اور کسی پھول کی طرح اٹھا کر گھوڑے پر رکھ دیا۔ دوسرے گھوڑے پر خود سوار ہوا اور دونوں روانہ ہوگئے۔

جب بادشاہ سیر و تفریح کے لیے نکلتے ہیں یا شکار کو جاتے ہیں تو اس کے امراء اس کے ساتھ ہوتے ہیں۔ سپاہی پیشہ ملازم ہوتے ہیں لیکن رضیہ کے ساتھ امیر الامراء تن تنہا تھا۔ شہزادے کو ان سب باتوں پر یقین آگیا جو اس کی کنیز نے اس سے کہی تھیں۔ اس کی آنکھوں میں خون اتر آیا۔ رضیہ اس کی سوتیلی بہن تھی۔ ترکان شاہ کے ساتھ اس نے جو سلوک کیا تھا، وہ بھی اسے یاد تھا۔ اسے رضیہ سے کوئی ہمدردی نہیں تھی لیکن اس کا طرزِ عمل قومی غیرت کا سوال بن گیا تھا۔ یہ مسئلہ بھی تھا کہ خاندان کی عزت کو امراء کے سامنے کیسے اچھالا جائے۔ اس نے معاملے کو دوسرا رنگ دے کر ترک امراء سے ملاقات کی اور معاملے کو یاقوت حبشی اور ترک امراء تک محدود رکھا۔

"آپ کب تک خاموش بیٹھے رہیں گے؟ اب پانی سر سے اونچا ہوچکا ہے۔"

"ہم نے کہہ دیا تھا کہ ہم سلطنت کے مفاد کی خاطر خاموش ہیں۔"

"اب اسی مفاد کا تقاضا ہے کہ یاقوت کے اقتدار میں کمی کی جائے۔"

"یہ ہمارے اختیار میں تو نہیں۔ فیصلے تو خود سلطان اعظم فرماتی ہیں۔"

"آپ کچھ نہ کریں لیکن میں یہ کرسکتا ہوں کہ یاقوت کو قتل کرادوں اور ترکوں کی عزت بچالوں۔"

"اس عزت کا پاس ہمیں بھی ہے لیکن یہ انتہائی قدم اٹھانے کے حق میں نہیں۔"

"تو پھر سلطان اعظم کے پاس جائیے اور انہیں سمجھائیے کہ جمال الدین کو اپنی سلطنت کے کسی آخری حصے میں بھیج کر دہلی کو اس کے وجود سے پاک کردیجیے۔"

"تختِ دہلی پر اس وقت رکن الدین نہیں، رضیہ سلطانہ رونق افروز ہیں جن کو سمجھانا آسان نہیں اور ابھی وہ وقت نہیں آیا کہ ہم ان کے خلاف کوئی کھیل کھیلیں۔"

شہزادے کے لیے مشکل یہ تھی کہ وہ اس سے آگے امراء کو کچھ نہیں بتاسکتا تھا اور امراء فی الحال طیش میں آنے کو تیار نہیں تھے۔ وہ ان امراء کی طرف سے مایوس ہوکر بہن کی خدمت میں حاضر ہوگیا لیکن اس وقت بھی اس کی زبان پر

اصل بات نہیں تھی۔

''کیا آپ کو معلوم ہے ترک سرداروں میں آپ کے لیے کیا باتیں ہو رہی ہیں؟''

''کچھ اور نہیں، یہی باتیں ہو رہی ہوں گی کہ میں نے ایک عورت ہونے کے باوجود سلطنت کو سنبھال لیا۔''

''نہیں، باتیں یہ ہو رہی ہیں کہ ایک کم نسب کو آپ نے ترکوں پر حاوی کر دیا۔ وہ جب یاقوت حبشی کے استقبال کے لیے کھڑے ہوتے ہیں تو ان کے دل زخمی ہو جاتے ہیں۔''

''یہ باتیں آج کی نہیں ہیں، سلطانِ معظم کے دور سے کی جا رہی ہیں۔ یاقوت کو اس کی وفاداری کا صلہ اس وقت بھی ملا تھا۔ اسے امیر آخور اور میر محافظ بنایا گیا تھا۔ میں نے بھی اس کی خدمت کا صلہ اسے دیا ہے۔''

''آپ کمال کرتی ہیں۔ اس کی خدمات اپنی جگہ...... آپ تو اس کی خاطر معزز اراکین کی ناراضگیاں مول لے رہی ہیں۔''

''میں اپنے فیصلے واپس لینے کی عادی نہیں جبکہ میں نے کوئی غلط فیصلہ بھی نہ کیا ہو۔''

''سرداران قوم آپ سے ناخوش ہیں۔''

''مجھے کسی کی خوشی ناخوشی کی پروا نہیں۔ میں جمال الدین یاقوت کو اس کے منصب سے ہٹا کر اسے شرمندہ کرنا نہیں چاہتی۔''

''آپ ایک شخص کی خاطر اتنے لوگوں کا مقابلہ کیسے کریں گی۔''

''تم میری فکر مت کرو۔ میرے خلاف کوئی آواز اٹھانے کی جرأت نہیں کر سکتا۔ تم بھی نہیں۔ میں نے تمہاری اتنی باتیں محض اس لیے سن لیں کہ تم میرے بھائی ہو۔ اگر کوئی مجھے اقتدار سے ہٹا سکتا ہے تو ہٹا دے۔ میرے دل میں جمال الدین یاقوت کی جو جگہ ہے وہ اسی طرح رہے گی۔ میں اس ایک شخص پر سیکڑوں مفاد پرستوں کو قربان کرتی ہوں۔''

وہ کوشش کے باوجود رضیہ سلطانہ سے یہ نہیں کہہ سکا کہ وہ جمال الدین یاقوت سے عشق کرتی ہے لیکن اس کی غلط فہمی نے یقین کا درجہ ضرور حاصل کر لیا۔ یہ بات اس کی سمجھ میں آ گئی کہ ایک معمولی حبشی زادہ امیرالامراء کے رتبے تک کیسے پہنچ گیا۔

معزالدین کے چلے جانے کے بعد رضیہ سلطانہ نے گزرے ہوئے لمحوں کا جائزہ لینا شروع کیا۔ معزالدین کی گفتگو میں کئی اشارے ایسے تھے جن سے رضیہ سلطانہ کا کردار مشکوک ہوتا تھا۔ وہ بڑی دیر تک غور کرتی رہی۔ پھر اس کی انا اور ضد نے اس کا حصار کر لیا۔ اس کی کنیز اس کے قریب آ کر کھڑی ہو گئی۔

''امیرالامراء جمال الدین یاقوت کو فوراً حاضر کیا جائے۔''

''حکم کی تعمیل ہو گی۔''

کچھ دیر نہیں گزری تھی کہ یاقوت حبشی بارگاہ ناز میں حاضر تھا۔ رضیہ سلطانہ اس کے استقبال کے لیے کرسیِ زرنگار سے اٹھ کر کھڑی ہو گئی۔ کوئی بھی شخص یہ سوچے بغیر نہیں رہ سکتا تھا کہ وہ فرماں روائے ہند ہونے کے باوجود امیرالامراء کے استقبال کے لیے کیوں کھڑی ہو جاتی ہے۔

''جمال الدین! ہمارا گھوڑا کھڑے کھڑے اونگھنے لگا ہے۔ ہم چاہتے ہیں آج کہیں سیر کے لیے جائیں۔''

''جو حکم سلطانِ اعظم۔''

''مہرولی تک جا کر واپس آئیں گے۔''

''چشم ما روشن دلِ ماشاد۔''

''داروغۂ اصطبل سے کہہ کر گھوڑے باہر نکلواؤ۔''

وہ باہر نکلی۔ گھوڑا تیار کھڑا تھا۔ یاقوت نے اس کی بغلوں کو گرفت میں لیا اور وہ سوار ہو گئی۔ یاقوت کچھ دیر اپنے گھوڑے پر اس کے پیچھے پیچھے چلتا رہا اور شہر سے نکلتے ہی اس کے برابر آ گیا۔

''جمال الدین! تمہیں یاد ہے، ایک زمانہ وہ تھا جب امرائے سلطنت کو میرے عورت ہونے پر اعتراض تھا اور انہوں نے رکن الدین کو تخت پر بٹھا دیا تھا۔ ایک وقت یہ آیا ہے کہ انہیں یہ اعتراض ہے کہ میں نے ایک غیر ترک کو امیرالامراء کے منصب پر کیوں فائز کر دیا۔''

''آپ میری خاطر اپنے امیروں کی مخالفت کیوں مول لیتی ہیں؟ میرے لیے اس سے بڑا اعزاز اور کوئی نہیں کہ میں غلامی کے منصب پر فائز ہوں۔ آپ یہ منصب ان میں سے کسی کو عطا فرما دیں جو اس کا خواہش مند ہو۔''

''اگر آج میں ان کا یہ مطالبہ مان لوں تو کل وہ کوئی اور مطالبہ لے کر آ جائیں گے۔ جو حکمران اپنے فیصلے خود نہیں کر سکتے، وہ کٹھ پتلی بن کر رہ جاتے ہیں۔ دوسروں کے ہاتھوں میں کھیلتے ہیں۔ میں اپنے فیصلے خود کر سکتی ہوں۔ بس تم یہ وعدہ کرو کہ میری حفاظت پر ہمیشہ مامور رہو گے۔''

''میں نے خود کو امیرالامراء کبھی سمجھا ہی نہیں۔ میں تو ہمیشہ آپ کا محافظ رہا ہوں۔ کبھی ایسا وقت آیا تو میری چیخیں بھی آپ کی حفاظت کریں گی۔''

''میں ان خود غرض امیروں کو یہی بتانا چاہتی ہوں کہ

منصب وفاداری کو مدِنظر رکھ کر تقسیم ہوتے ہیں۔''
''میں تو پھر یہی عرض کروں گا کہ اپنے لیے مشکلات کھڑی نہ کیجیے۔ اگر انہیں میرا یہ منصب قبول نہیں تو یہ منصب مجھ سے چھین لیں۔ میں تو یوں بھی آپ کا ہوں۔''
وہ نادانستگی میں ایک ایسی بات کر گیا جو بہت دن سے وہ اپنے دل میں رکھے ہوئے تھا۔ ''میں تو یوں بھی آپ کا ہوں۔'' رضیہ سلطانہ نے اس وقت اس کی آنکھوں میں جھانک کر نہیں دیکھا ورنہ وہ سارے رنگ اسے نظر آجاتے جو اس وقت یاقوت کے دل سے آنکھوں تک سفر کررہے تھے۔
مہرولی ابھی دور تھا۔ وہ کہہ کر یہی آئی تھی کہ مہرولی تک جائیں گے لیکن اس سے پہلے ہی اس نے گھوڑے کی باگیں موڑلیں۔ یاقوت نے اس کی پیروی کی۔
قلعے تک پہنچتے پہنچتے اس کا ذہن صاف ہو چکا تھا۔ معزالدین سے ہونے والی گفتگو ہوا میں تحلیل ہو چکی تھی۔ وہ فیصلہ کر چکی تھی کہ اٹھنے والی ہر آندھی کا مقابلہ کرے گی۔
محل میں پہنچتے ہی اس نے سالار قطب الدین کو طلب کیا۔
''امیر الامراء جمال الدین یاقوت کی زندگی کو خطرہ ہے۔ اس کے محل کے سامنے مسلح پہرا بٹھا دو۔''
''یہ اندیشہ آپ کو کیسے پیدا ہوا؟''
''یہ آپ کو وقت آنے پر خود معلوم ہو جائے گا۔ فی الوقت تو آپ ان کی حفاظت کا بندوبست فرمائیں۔'' یہ فرمان جاری کرنے کے بعد اس نے کنیز شہناز کو اپنے پاس بلایا۔
''تو میرے بھائی شہزادہ معزالدین کے پاس کب سے ملازم ہے؟''
''انہیں آقائے نعمت بنائے تو کئی سال ہو گئے۔''
''تو ان کی ذاتی زندگی میں کس حد تک دخیل ہے؟''
''میں کچھ بھی نہیں۔''
''ہمارا مطلب ہے کیا تو ان سے عشق کی دعوے دار ہے؟''
''بھلا آسمان اور زمین بھی ایک ہوئے ہیں۔''
''یہ تو یہاں ایک سے زیادہ مرتبہ ہوا ہے۔ جس شہزادے کی تو کنیز خاص رہی ہے، اس کی ماں ترکان شاہ بھی کنیز ہی تھی۔ کیا تو نے بھی کوئی ایسا خواب دیکھا ہے؟''
''سلطان اعظم! خواب تو سب ہی دیکھتے ہیں۔''
''تیرا جرم یہ ہے کہ تو نے صرف خواب نہیں دیکھا، اس کی تکمیل کے لیے کوشاں بھی ہے۔''
''میں اپنی حیثیت جانتی ہوں۔''
''اس کے باوجود تو نے امیر خواجہ رشید سے اکیلے میں ملاقات کی؟''
''انہوں نے خود مجھے بلایا تھا۔ میں ایک کنیز ہوں، انکار نہیں کر سکتی تھی۔''
''وہاں کیا باتیں ہوئیں؟''
''انہوں نے مجھ سے کہا تھا کہ میں آپ کی کنیز خاص بن کر آپ کے پاس چلی جاؤں۔''
''کس لیے؟''
''آپ کی کنیز لالہ رخ بیمار جو پڑ گئی تھی۔''
''بیمار تو وہ بعد میں پڑی۔ تو نے ملاقات اس سے پہلے کی تھی۔''
اس سوال پر شہناز کا رنگ اڑ گیا۔ جب سلطان اعظم کو یہ معلوم ہے تو اور بھی سب کچھ معلوم ہوگا۔ اس نے گردن جھکالی۔
''تیرا یوں سر جھکا لینا ظاہر کرتا ہے کہ تو نے جھوٹ بولا۔ اب تو سچ بتا کہ خواجہ رشید نے تجھ سے اور کیا کہا تھا؟''
''سلطان اعظم! مجھ سے غلطی ہوگئی۔ میں معافی کی خواستگار ہوں۔ میں ابھی مرنا نہیں چاہتی۔ خدا کے واسطے مجھ پر رحم فرمائیں۔''
''غلطی تو نے نہیں، اس امیر نے کی ہے۔ سزا اسے ملے گی۔ تیرا جتنا قصور ہے تجھے اتنی ہی سزا ملے گی۔ ہم تجھ سے وعدہ کرتے ہیں تو زندہ رہے گی۔''
شہناز نے وہ سب کچھ بتا دیا جو خواجہ رشید نے اس سے کہا تھا۔ ظاہر ہے اس بیان میں جمال الدین یاقوت کا ذکر بار بار آرہا تھا۔
''تو نے کسی اور امیر سے بھی ملاقات کی تھی؟''
''سلطان معظم التمش کی قسم! میں کسی اور امیر سے نہیں ملی۔''
''خواجہ رشید کے پاس کوئی اور بھی تھا؟''
''نہیں، وہ اکیلے تھے۔''
''تو نے مخبری کرتے ہوئے معزالدین کو کیا بتایا؟''
''کچھ بھی نہیں۔ بس یہ کہ یاقوت پر آپ کی مہربانیاں حد سے بڑھ گئی ہیں۔''
''تجھے اندازہ ہے کہ میں تیرے ساتھ کیا کر سکتی ہوں؟''
''رحم، سلطان اعظم رحم۔''
''اگر تو چاہتی ہے کہ زندہ رہ سکے تو اپنی زبان بند کرلے۔ معزالدین کو کچھ نہ بتانا کہ میں نے تجھ سے کیا پوچھا۔ لالہ رخ صحت یاب ہو چکی ہے اس لیے اب تیری ضرورت نہیں رہی۔ تجھے معزالدین کے پاس واپس جانا ہوگا۔ مجھے بہت جلد یہ بھی معلوم ہو جائے گا کہ لالہ رخ کو زہر کس نے دیا تھا۔ مجھے یقین ہے اس کو زہر دینے میں تیرا

ہاتھ نہیں ہوگا مگر پھر بھی۔‘‘

شہناز واپس جا چکی تھی۔ رضیہ سلطانہ گزرے ہوئے واقعات پر غور کر رہی تھی اور سوچ رہی تھی اب اسے کیا کرنا ہے۔ اس پر سازش واضح ہوگئی تھی۔ گواہی کے لیے اس نے شہناز کو زندہ بھی چھوڑ دیا تھا۔ سوچنا صرف یہ تھا کہ ایک بااثر امیر پر ہاتھ کیسے ڈالا جائے اور اس کے بعد کے نتائج سے کیسے نمٹا جائے گا۔ ایک مرتبہ پھر اسے یاقوت حبشی کا خیال آیا لیکن پھر اسے خیال آیا کہ یہ مشکل کام اسے نہ سونپا جائے۔ یہ کام سالار قطب الدین کرسکتا ہے۔ اس سے یہ بھی معلوم ہو جائے گا کہ وہ میرا کتنا وفادار ہے۔ اس نے قطب الدین کو بلا بھیجا۔ رات گہری ہوگئی تھی اس کی طلبی اس وقت ہوئی تو وہ فکر مند ہوگیا جیسا بیٹھا تھا اسی طرح اٹھ کر چلا آیا۔ قطب الدین کو اس نے اس کمرے میں بٹھایا جہاں وہ امراء اور وزراء سے ملاقاتیں کیا کرتی تھی۔ بعد میں خود بھی وہاں پہنچ گئی۔

’’میں نے آپ کو اس لیے بلایا ہے کہ وہ سازشیں پھر سر اٹھانے لگی ہیں جن کا ہم نے رکن الدین فیروز کے عہد میں سامنا کیا تھا۔ کچھ عناصر ایسے ہیں جو مجھے تخت سے اتار کر معزالدین کو تخت پر بٹھانا چاہتے ہیں۔‘‘

’’ایسا کیوں ہو رہا ہے؟ انہیں آپ سے کیا شکایت پیدا ہوگئی؟ ہر طرف امن و امان ہے۔ علاقوں کے حکمراں آپ کے تابع ہیں۔ محاصل پابندی سے ادا کر رہے ہیں۔‘‘

’’شاید ان امراء کو وہ سب کچھ کرنے کو نہیں مل رہا ہے جو کچھ رکن الدین کے دربار میں ہوا کرتا تھا۔ شاید انہیں پچھتاوا ہو رہا ہو کہ انہوں نے اس دربار اور اس کی روایات کو کیوں اجاڑ دیا۔‘‘

’’آپ یہ سب باتیں کیسے کہہ سکتی ہیں، آپ کو کیا شواہد ملے ہیں؟‘‘

’’خواجہ رشید نے ایک کنیز کو لالچ دے کر مخبری کے لیے بھیجا تھا۔‘‘

’’سلطان اعظم معاف کیجیے گا کہ یہ کنیزیں تو ادھر کی ادھر کرتی ہی رہتی ہیں اور پھر مخبری کے لیے آپ کے پاس ہے ہی کیا جو آپ کو نقصان پہنچے؟‘‘

’’یہ کنیز کوئی عام کنیز نہیں تھی۔ معزالدین کی خاص کنیز تھی۔ اس نے جو باتیں بتائیں، وہ بڑی چونکا دینے والی ہیں۔ خواجہ رشید نے اسے ہدایت کی تھی کہ وہ امیر الامراء جمال الدین اور میرے تعلق کو معزالدین اور قلعے کی دوسری کنیزوں کے سامنے غلط رنگ میں پیش کرے۔ وہ جب میری کنیز بن کر رہے گی تو غلط بھی کہے گی تو لوگوں کو یقین آجائے گا۔ وہ بدبخت میرے کردار کو مسخ کرنا چاہتا تھا تاکہ مجھے تخت سے اتارنے کا جواز پیدا ہو سکے۔‘‘

’’اوہ!‘‘ قطب الدین نے ایک گہری سانس لی۔ ’’اگر یہ سازش ہے تو یقیناً اس میں دوسرے لوگ بھی شامل ہوں گے۔‘‘

’’میرے خیال میں ابھی اس سازش نے زور نہیں باندھا ہے۔ خواجہ رشید یہ چاہتا ہوگا کہ شہناز کے ذریعے میرے خلاف غلط خبریں پھیلائی جائیں اور پھر دوسرے امراء کو اپنا ہم خیال بنا کر میرے لیے مشکلات پیدا کرے۔‘‘

’’یہ بھی تو ہوسکتا ہے کہ شہزادہ معزالدین اس کے ساتھ شامل ہوں۔‘‘

’’اس کا امکان بہت کم ہے۔ خواجہ رشید صرف یہ چاہتا ہوگا کہ جب خود معزالدین کی کنیز یہ باتیں کرے گی تو معزالدین کو یقین آجائے گا اور اگر کسی وقت یہ امراء میرے خلاف ہوئے تو معزالدین ان کے ساتھ آسانی سے مل جائے گا یا کم از کم میرا دفاع نہیں کرے گا۔‘‘

’’بات تو کچھ کچھ میری سمجھ میں آگئی ہے لیکن یہ بتایئے کہ آپ مجھ سے کیا چاہتی ہیں؟‘‘

’’میں یہ چاہتی ہوں کہ اس فتنے کو یہیں روکنے کے لیے ضروری ہے کہ خواجہ رشید کو گرفتار کرلیا جائے۔ کنیز شہناز اس کے خلاف گواہی دے گی۔‘‘

قطب الدین کچھ دیر کے لیے خاموش ہوگیا جیسے کچھ کہنے کے لیے الفاظ جمع کر رہا ہو۔

’’اگر میری وفاداری پر حرف نہ آئے تو میں کچھ عرض کروں؟‘‘

’’ہم تمہیں اسی طرح اپنا وفادار سمجھتے ہیں جس طرح سیف الدین ایبک ہمارے لیے بااعتماد تھے۔‘‘

’’آپ کسی معمولی آدمی کی گرفتاری کا حکم نہیں دے رہی ہیں۔ خواجہ رشید ایک بااثر امیر ہیں۔ ان کی گرفتاری ایک بحران پیدا کردے گی۔ فی الحال اس سے بچنا چاہیے۔ ہمارے پاس ثبوت بھی ناکافی ہیں۔ خواجہ رشید پر گہری نظر رکھیے اور کچھ دن کے لیے خاموش ہوجایئے۔‘‘

’’کیا میں اس دن کا انتظار کروں جب یہ سازش جڑ پکڑ جائے اور پھر اسے کاٹنا مشکل ہوجائے۔‘‘

’’میں اس سے پہلے ہی اس سازش کا قلع قمع کردوں گا۔ آپ پر کوئی آنچ نہیں آنے دوں گا۔‘‘ قطب الدین نے وعدہ کیا اور رضیہ سلطانہ کچھ دیر کے لیے مطمئن ہوگئی۔

رضیہ سلطانہ کے لیے مشکل یہ ہوگئی تھی کہ اس کے

وفادار امراء ہی اس کے خلاف باتیں کر رہے تھے۔ وہ مشورہ کرتی تو کس سے کرتی۔ ایک قطب الدین ہی تھا جس کے سامنے اس نے دل کھول کر رکھ دیا تھا۔

قطب الدین سے ملاقات کے بعد اور اسے اپنا وفادار دیکھ کر رضیہ سلطانہ کی خود اعتمادی اور بڑھ گئی۔ اسے کچھ دن کے لیے محتاط ہو جانا چاہیے تھا لیکن اس نے اپنی روش نہیں بدلی۔ جمال الدین یاقوت سے اس کی بے تکلفی اسی طرح قائم رہی۔ شہناز کو جتنی آگ لگانی تھی وہ لگا چکی تھی۔ اس کی بتائی ہوئی باتوں کو سن کر ان امراء کو یہ شوق ہوا تھا کہ وہ ان مناظر کا اپنی آنکھوں سے مشاہدہ کریں۔ وہ یہ دیکھے بغیر نہ رہ سکے کہ وہ جب بھی سیر و تفریح کے لیے نکلتی ہے یاقوت حبشی اس کی بغلوں میں ہاتھ ڈال کر اسے گھوڑے کی پشت پر سوار کراتا ہے۔ وہ اس کے ساتھ سیر کو نکلتا ہے۔ کوئی تیسرا ساتھ نہیں ہوتا۔ خلوت میں کیا باتیں ہوتی ہیں، کوئی نہیں جانتا تھا۔ شہناز کی سنائی ہوئی داستان پر سب کو یقین آنے لگا تھا۔ کئی مرتبہ ایسا ہوا کہ کسی امیر نے بارگاہِ شاہی میں اجازت طلب کی اور اس سے کہہ دیا گیا کہ امیر الامراء سلطانِ اعظم سے معروفِ گفتگو ہیں اور پھر اس امیر کو گھنٹوں بیٹھ کر انتظار کرنا پڑتا۔ ایک روز تو حد ہی ہوگئی کہ رضیہ سلطانہ نے قطب الدین سے ملنے سے انکار کر دیا محض اس لیے کہ جمال الدین یاقوت خلوتِ سلطانی میں معروفِ گفتگو تھا۔

قطب الدین کو یہ انکار ہرگز ناگوار نہ ہوتا لیکن جو داستانیں وہ سن رہا تھا، ان کی موجودگی میں یہ انکار اسے سخت ناگوار گزرا۔ اسے بھی ان داستانوں کی صداقت پر یقین آگیا۔ وہ خود بھی ترک تھا۔ نسلی تعصب نے بھی سر اٹھایا۔ سیاہ فام حبشی اتنا اہم ہوگیا کہ مجھے باریابی کی اجازت ہی نہیں دی گئی۔

شکوک و شبہات بڑھتے چلے گئے۔ اس نے امراء کی نگرانی کے بجائے رضیہ سلطانہ کی نگرانی شروع کر دی۔ وہ دیکھ رہا تھا کہ سلطانِ اعظم (رضیہ) سے امیر الامراء کی ملاقاتیں دن میں کئی کئی مرتبہ ہوتی ہیں۔ اس نے امراء سے ملنا چھوڑ دیا ہے۔ جو احکامات جاری کرتی ہے ان میں غالباً یاقوت حبشی کے مشورے شامل ہوتے ہیں۔ اب وہ دربار بھی باقاعدگی سے منعقد نہیں کرتی۔

امراء کی بے چینی بڑھتی جا رہی تھی لیکن رضیہ کی حکومت اتنی مضبوط ہو گئی تھی کہ وہ اس کے خلاف قدم اٹھاتے ہوئے ڈر رہے تھے اور کسی ایسے موقع کی تلاش میں تھے کہ رضیہ کے اقتدار کا سورج بھی ڈوب جائے اور ان پر کوئی الزام بھی نہ آئے۔ ایک دن انہیں معلوم ہوا کہ قطب الدین بھی رضیہ سلطانہ کے رویے سے نالاں ہے۔ ان امراء نے ایک اجلاس منعقد کیا جس میں قطب الدین کو بھی بلایا۔

قطب الدین رضیہ سلطانہ کا وفادار تھا لیکن یاقوت حبشی کے معاملے میں اس کے دل میں بھی بال آگیا تھا۔ وہ جب اس اجلاس میں شریک ہوا اور امراء نے نہایت رنگ آمیزی کے ساتھ اسے یہ داستان سنائی تو اس کی آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئیں۔ بہت سے معاملات کا وہ خود مشاہدہ کر چکا تھا۔ بہت سی باتیں اس کے کانوں میں پڑ گئیں۔ کئی گھنٹوں کی بحث و تمحیص کے بعد وہ یہ کہتا ہوا اٹھا۔ ''آپ لوگ جو بھی فیصلہ کریں، میں آپ کے ساتھ ہوں۔''

گفتگو کے دوران قطب الدین نے یہ بھی بتا دیا تھا کہ رضیہ سلطانہ، امیر خواجہ رشید کو گرفتار کرانا چاہتی تھی۔ یہ ایسی اطلاع تھی جس سے تمام امراء طیش میں آگئے۔ اب وہ اتنی آگے بڑھ گئی ہے کہ اس حبشی زادے کے لیے معزز امیر کو گرفتار کرنے کے درپے ہے۔ اس وقت تو بات ٹل گئی ہے لیکن وہ گرفتار کرا بھی سکتی ہے۔ صرف خواجہ رشید نہیں، ہم سب سخت خطرے میں ہیں۔ اس خیال کے آتے ہی متفقہ طور پر فیصلہ کر لیا کہ اب جو کچھ بھی کرنا ہے، جلد کر لینا چاہیے۔

ایک اجلاس اور منعقد ہوا جس میں قطب الدین کو شریک نہیں کیا گیا۔ اسے صرف فیصلے سے آگاہ کرنا تھا اس لیے اجلاس اس کی شرکت کے بغیر ہی شروع ہوگیا۔ معز الدین کو بھی دور ہی رکھا گیا۔

امیر تاج الدین اور خواجہ رشید پیش پیش تھے۔ امیر تاج الدین اس راز سے واقف تھا کہ ملک التونیہ، رضیہ سلطانہ سے شادی کا خواہش مند تھا اور اب بھی وہ اس کی طرف سے مایوس نہیں ہوا ہے لہٰذا اس نے ملک التونیہ کی اسی خواہش کو اپنے فیصلے کا مرکز بنایا اور امراء سے یوں مخاطب ہوا۔

''ملک التونیہ، رضیہ سلطانہ سے عشق کرتا ہے۔ رضیہ نے اس کا رشتہ مسترد کر دیا ہے لیکن وہ مایوس نہیں ہوا ہے۔ کئی مرتبہ مجھ سے کہہ چکا ہے کہ میں اس کے لیے بات کروں۔ میں نے بات کی بھی تھی لیکن رضیہ نے انکار کر دیا۔ اب اگر اسے یاقوت حبشی کے بڑھتے ہوئے اقتدار سے واقف کیا جائے اور رضیہ سے اس کے تعلق کو کچھ صحیح کچھ غلط رنگ میں پیش کیا جائے تو اس کا جذبۂ رقابت اسے اتنا حوصلہ دے دے گا کہ وہ رضیہ سے ٹکرا جائے۔ ویسے بھی وہ اتنا شجاع ہے کہ بغاوت کرنے میں دیر نہیں لگائے گا بلکہ ہم

اس سے کہیں گے کہ وہ بغاوت کردے۔''

''اس کی بغاوت کو شاہی لشکر ذرا سی دیر میں کچل دے گا۔ اس سے ہمیں کیا فائدہ ہوگا۔''

''آپ نے پچھلے اجلاس میں دیکھ لیا کہ قطب الدین بھی رضیہ کے خلاف ہوگیا ہے۔ وہ نہیں چاہے گا تو التونیہ کو شکست کون دے گا۔''

''یہ آپ کی بھول ہے تاج الدین......'' خواجہ رشید نے کہا۔ ''رضیہ سلطانہ خود تلوار کی دھنی ہے۔ اس جنگ میں وہ بھی یقیناً ساتھ جائے گی۔ لشکر کا ایک بڑا حصہ اس سے عقیدت رکھتا ہے۔ کیا سپاہی اس کی خاطر لڑیں گے نہیں؟''

''آپ سمجھے نہیں۔ ایک بغاوت ہمارے لشکر میں بھی ہوگی جس کا نشانہ جمال الدین یاقوت اور رضیہ سلطانہ بنیں گے۔ یہ کس طرح ہوگا، میں اور قطب الدین مل کر ہی کوئی فیصلہ کرسکیں گے۔''

اس کے بعد تاج الدین نے قطب الدین سے ملاقات کی اور تمام معاملات طے پا گئے۔

☆☆☆

قطب الدین، سلطانِ اعظم رضیہ سلطانہ سے ملاقات کے لیے پہنچا تو یاقوت حبشی وہاں پہلے سے موجود تھا۔ شکر ہے قطب الدین کو انتظار نہیں کرنا پڑا کیونکہ یاقوت حبشی اٹھنے ہی والا تھا۔

''کہو قطب الدین...... کیسے آنا ہوا؟''

''سلطانِ اعظم! آپ کے لیے ایک اچھی خبر ہے۔ آپ کا دشمن نظام الملک، ہماری اطلاع کے مطابق بھٹنڈا میں موجود ہے۔''

''بھٹنڈا میں؟'' رضیہ سلطانہ کا منہ کھلا کا کھلا رہ گیا۔

''ہاں، ملک التونیہ نے اسے پناہ دے رکھی ہے۔ میں آپ سے اجازت لینے آیا ہوں کہ فوج کا ایک دستہ لے کر جاؤں اور التونیہ سے درخواست کروں کہ وہ نظام الملک کو ہمارے حوالے کردے۔

''التونیہ اتنی آسانی سے آپ کی بات نہیں مانے گا۔ ہمارا مشورہ تو یہ ہے کہ شاہی لشکر لے کر جائیے اور بھٹنڈا کا محاصرہ کرلیجیے۔ وہ اگر مانتا ہے تو ٹھیک ورنہ اس سے جنگ کیجیے۔''

''اگر گھی سیدھی انگلیوں سے نکل سکتا ہے تو انگلیاں ٹیڑھی کرنے کی کیا ضرورت ہے۔ میں اس سے جاکر بات کرتا ہوں۔ اگر وہ نہیں مانا تو جنگ کا راستہ کھلا ہے۔''

''یہ کام تو خط کے ذریعے بھی ہوسکتا ہے۔ ہم اسے خط لکھتے ہیں کہ وہ نظام الملک کو ہمارے حوالے کردے۔ اگر

اس نے انکار کیا تو پھر آپ پوری تیاری سے جایئے گا۔''

''یہ غلطی کیجیے گا بھی مت۔ وہ آپ کا خط پڑھ کر نظام الملک کو وہاں سے کہیں اور بھیج دے گا۔ یہ کیوں کہے گا کہ میں اسے آپ کے حوالے نہیں کرتا۔ میں وہاں خود پہنچ گیا تو وہ انکار نہیں کرسکے گا۔''

''آپ کے ساتھ بہت تھوڑے سے سپاہی ہوں گے۔ اگر اس نے آپ کو نقصان پہنچایا؟''

''آپ میری فکر نہ کریں۔ میں اپنی حفاظت کرنا جانتا ہوں اور اتنا بے مروت وہ بھی نہیں کہ میں جنگ کے ارادے سے نہ جاؤں اور وہ مجھے گرفتار کرلے۔''

رضیہ نے اسے اجازت دے دی۔ وہ بھٹنڈا کی طرف روانہ ہوگیا۔ نظام الملک کا تو محض بہانہ تھا۔ اسے التونیہ سے مل کر اپنے منصوبے کی وضاحت درکار تھی۔ یہ باتیں خط کے ذریعے طے نہیں کی جاسکتی تھیں۔

وہ واپس آیا تو اس نے رضیہ سے کہہ دیا کہ ہماری اطلاع غلط ہی تھی۔ نظام الملک وہاں موجود نہیں۔ شاید التونیہ اس سلسلے میں آپ کو خط بھی لکھے۔

رضیہ سلطانہ مطمئن ہوگئی بلکہ قطب الدین کی شکرگزار بھی ہوئی کہ وہ اتنی صعوبت اٹھا کر بھٹنڈا تک گیا، محض ملک وقوم کے مفاد میں۔

☆☆☆

ملک التونیہ نے رضیہ سلطانہ کے نام خط لکھا۔ یہ کوئی انوکھی بات نہیں تھی۔ حاکموں کے خطوط آتے ہی رہتے تھے۔ قطب الدین نے کہہ بھی دیا تھا کہ شاید التونیہ آپ کو خط لکھے۔ رضیہ سلطانہ نے یہ سوچ کر لفافہ چاک کیا تھا کہ التونیہ نے نظام الملک کی موجودگی کے بارے میں وضاحت کی ہوگی لیکن خط پڑھتے ہی شدت غضب نے اس کے وجود پر کپکپی طاری کردی۔ خط کے مضمون میں یاقوت حبشی کے وجود کو نشانہ بنایا گیا تھا اور یہ دھمکی بھی دی گئی تھی کہ اگر دو دن کے اندر اندر اسے معزول کرکے ہندوستان سے باہر نہ نکال دیا گیا تو میں آپ کے اس مجرمانہ فعل سے بدظن ہوکر پرچم بغاوت بلند کردوں گا۔ ترکوں کی عزت و آبرو بچانے کے لیے میں کچھ بھی کرسکتا ہوں۔

یہ ایسا گھٹیا اور گستاخی آمیز مضمون تھا جس کی وہ ملک التونیہ سے توقع نہیں کرسکتی تھی۔ خط کی زبان بتا رہی تھی کہ التونیہ کو سمجھانے کا کوئی فائدہ نہیں ہوگا۔ گستاخوں کو تلوار سے جواب دیا جاتا ہے۔

وہ بہت دنوں سے اپنے امرا... کو بھولی ہوئی تھی بلکہ ان کی طرف سے بدگمان ہوکر انہیں کسی مشورے میں شریک نہیں کررہی تھی لیکن یہ معاملہ ایسا تھا کہ اس نے انہیں طلب کیا اور خط دکھا کر ان کی رائے طلب کی۔

''گستاخ التونیہ کا یہ خط پڑھ کر آپ لوگ مجھے کیا رائے دیں گے؟''

''اس خط کا ایک ہی جواب ہوسکتا ہے۔ التونیہ کے ساتھ وہی سلوک کیا جائے جو ایک باغی کے ساتھ کیا جاسکتا ہے۔ یاقوت حبشی کی تقرری پر اختلاف ہمیں بھی ہے لیکن اس کا یہ مطلب تو نہیں کہ مملکت کو نقصان پہنچایا جائے۔ مجھے تو یہ لگتا ہے کہ ملک التونیہ عرصے سے بغاوت پر آمادہ اور خودمختاری کا خواہاں تھا۔ یاقوت حبشی کی تقرری کو تو محض جواز بنایا گیا ہے۔ اگر آپ یاقوت کو ہندوستان سے باہر نکال بھی دیں تو بھی ملک التونیہ بغاوت کے لیے کوئی اور بہانہ ڈھونڈ لے گا۔'' تاج الدین نے نہایت تفصیل سے اپنا موقف بیان کیا۔

تاج الدین بول چکا تو خواجہ رشید اپنی جگہ سے کھڑا ہوا۔

''بادشاہوں کے فیصلے اس لیے نہیں ہوتے کہ حاکموں کے کہنے سے بدل دیے جائیں۔ کل آپ کوئی اور فیصلہ کریں گی اور کسی دوسرے حاکم کو پسند نہیں آئے گا۔ اس طرح تو سلطنت تماشا بن جائے گی۔''

ضیا الملک بھی بولنے میں پیچھے نہیں رہا۔

''سلطان اعظم! آپ اس خط کا جواب ضرور دیں لیکن بھٹنڈا کی حدود میں پہنچ کر تاکہ اسے یہی معلوم ہو کہ آپ کمزور نہیں ہیں۔ آپ کا لشکر، آپ کے امراء آپ کے ساتھ ہیں۔''

سالار قطب الدین نے بھی امراء کی رائے سے اتفاق کیا اور التونیہ کو خاک میں ملانے کے عزم کا اظہار کیا۔

''آپ مجھے اجازت دیجیے کہ میں جلد از جلد لشکر تیار کروں۔ اس جنگ میں آپ بھی ہمارے ہمراہ ہوں گی تاکہ اگر وہ گستاخ ہماری تلواروں کی تاب نہ لاکر معافی کا خواستگار ہو تو ہم اسے آپ کے قدموں میں لاکر ڈال سکیں۔''

''میں آپ کو اجازت دیتی ہوں۔ جنگ کی تیاری کی جائے۔''

☆☆☆

روز سعید نے سورج کو رضیہ کی قدم بوسی کے لیے بھیجا۔ امرائے دولت نے اپنی سلطان کو جھرمٹ میں لے لیا۔ اب وہ چونکہ جنگ کے ارادے سے نکلی تھی اس لیے ہاتھی پر سوار تھی۔ یاقوت حبشی ننگی تلوار ہاتھ میں لیے اسی کے

ہاتھی پر سوار تھا۔ خلقت شہر یہ منظر دیکھنے کے لیے صبح ہی صبح راستوں پر آکر کھڑی ہوگئی تھی۔ اس چھوٹے سے قافلے کو ''مہرولی'' تک جانا تھا۔ یہاں چھاؤنی تھی۔ قطب الدین کو وہاں سے اپنے لشکر کو ہمراہ لے کر رضیہ کے ہمراہ ہو جانا تھا۔

خلقت شہر نے اس قافلے کو دیکھ کر ''اللہ، محمد ﷺ کے سپرد'' کے نعرے بلند کیے۔ وہ اس کا نام لے لے کر اسے دعاؤں میں رخصت کر رہے تھے۔

مہرولی پہنچ کر لشکر نے سلامی پیش کی۔ رضیہ کے ہاتھی کو آگے رکھا گیا۔ اس سے بھی آگے ہراول دستہ تھا جو راستے کو صاف کرتا جارہا تھا۔ رضیہ کے ہاتھی کے جلو میں دائیں بائیں امرائے سلطنت کے ہاتھی تھے۔ کچھ فاصلہ دے کر لشکر چلا آرہا تھا۔ گھوڑوں کی کثرت ایسی تھی کہ غبارِ راہ آسمان تک پہنچ رہا تھا۔ تھوڑی تھوڑی دیر بعد نعرۂ تکبیر کی گونج سنائی دیتی تھی جو لہو کو گرما رہی تھی۔

یہ لشکر جرار دہلی کی حدود سے نکلا۔ دن بھر جنگلوں، گھاٹیوں سے گزرتا رہا۔ لشکر کی ایسی کثرت تھی کہ سفر تیز رفتاری سے جاری نہیں رہ سکتا تھا۔

شام ہوئی پھر رات آگئی۔ اندھیرا ہوتے ہی لشکر نے پڑاؤ کیا۔ شاہی خیمہ نصب کر دیا گیا۔ یہ خیمہ ایک رات کے لیے لگایا گیا تھا لیکن اس میں آرام کی ہر چیز مہیا تھی۔ اس کے خیمے سے کچھ فاصلے پر امیر الامراء کا خیمہ تھا اور پھر عہدے اور منصب کے مطابق دور تک خیمے لگے ہوئے تھے۔

رضیہ سلطانہ نے جیسے ہی خیمے میں قدم رکھا محافظ سپاہیوں نے خیمے کو چاروں طرف سے گھیر لیا۔

''سلطانِ اعظم بے فکر ہو کر آرام فرمائیے۔ آپ کے جاں نثار دروازے پر موجود ہیں۔''

جمال الدین یاقوت دو محافظ اپنے ساتھ رکھتا تھا۔ اس وقت بھی وہ دونوں اس کے خیمے پر پہرا دے رہے تھے۔ رات کے اندھیرے نے ویرانے کے اندھیرے سے مل جل کر عجیب آسیبی ماحول پیدا کر دیا تھا۔ صرف قطب الدین کا خیمہ ایسا تھا جس کے دروازے پر مشعل بردار موجود تھے۔ ان مشعلوں کی روشنی میں ہاتھ کو ہاتھ سجھائی دینے لگا تھا۔ باقی خیموں میں شمع دان تھے جن کی روشنی باہر نہیں آرہی تھی۔

جب سپاہیوں کو یقین آگیا کہ جو خیموں میں ہیں، وہ سونے کے لیے لیٹ چکے ہوں گے، شمع دان گل کر دیے گئے ہوں گے تو قطب الدین کے اشارے پر سپاہیوں کے ایک گروہ نے جو پہلے سے تیار کھڑا تھا جمال الدین یاقوت کے

اپنڈیکس اور اسلام

Appendix ایک ایکسٹرا آنت ہے۔ جو بند ہوتی ہے اس میں کبھی کبھی کھانا جمع ہو کر سخت ہو جاتا ہے تب اس کو کاٹ کر نکالا نہ جائے تو یہ پھٹ سکتی ہے جس سے موت واقع ہو سکتی ہے۔ یہ پیٹ میں دائیں جانب ہوتی ہے۔ کھانا کھاتے ہوئے سیدھی ٹانگ کھڑی کر کے اور الٹی ٹانگ کو لٹا کر کھانا کھانا سنت نبوی ﷺ ہے۔ اس طرح اپنڈیکس دب جاتی ہے اور کوئی ذرہ اس میں نہیں جاتا اور نہ ہی کبھی اپنڈیکس کا مسئلہ ہوتا ہے۔ سبحان اللہ سائنس نے ثابت کیا کہ دینِ اسلام برحق ہے۔

مرسلہ۔ محمد جاوید، تحصیل علی پور

خیمے پر دھاوا بول دیا۔ ان کے سامنے پہرے پر کھڑے دو محافظوں کی کیا بساط تھی۔ دونوں اسی وقت خون میں نہا گئے۔ جمال الدین یاقوت نے آنکھیں بند کر لی تھیں لیکن سویا نہیں تھا۔ اس نے خیمے سے باہر کچھ آوازیں سنیں تو اٹھ کر بیٹھ گیا۔ وہ ابھی صورتِ حال کو سمجھنے کی کوشش کر ہی رہا تھا کہ اس کے شکار پر آئے ہوئے سپاہی خیمے میں داخل ہو گئے۔ یاقوت اب بھی کچھ نہیں سمجھا تھا لیکن اپنا دفاع ضروری تھا۔ اس نے قریب رکھی تلوار کے قبضے پر ہاتھ ڈالا لیکن دیر ہو چکی تھی۔ کئی تلواریں ایک ساتھ چلیں اور وہ کئی ٹکڑوں میں بٹ گیا۔

رضیہ سلطانہ اپنے خیمے میں تھی اور شاید آنکھ بھی لگ گئی تھی۔ اس کے ساتھ بھی یہی ہوا۔ باہر کچھ شور سا ہوا جو اس کی نیند کے خمار کو توڑتا ہوا اندر آگیا تھا۔ وہ یہی سمجھی کہ دشمن نے شب خون مارا ہے۔ وہ خیمے کے دروازے پر آئی کہ محافظوں سے دریافت کرے۔ دروازے پر کھڑے محافظوں کی بے ادب تلواروں نے اس کا راستہ روک لیا۔

''آپ باہر نہیں جاسکتیں۔''

''بے ادب سپاہیو! جانتے نہیں میں سلطانِ اعظم ہوں۔ تمہاری تقدیروں کی مالک۔''

''ہمیں معلوم ہے لیکن سالار قطب الدین کا یہی حکم ہے۔''

''انہیں ہمارے پاس بھیجو۔ جو کچھ تم سے کہا گیا ہے ہم ان کی زبان سے سننا چاہتے ہیں۔''

''ہمیں نہیں معلوم وہ کہاں ہیں۔''

''امیر الامراء کو بھیجو یا کسی اور امیر کو۔''

''آپ کسی سے نہیں مل سکتیں۔''
رضیہ نے کچھ نہیں کہا اور دوبارہ خیمے کے اندر جانے لگی۔ ان محافظوں نے اندر جانے سے پہلے ہی اسے روک دیا۔ اس کے عورت ہونے کا خیال بھی نہیں کیا۔ دونوں طرف سے اس کے بازو پکڑ لیے۔ کچھ سپاہی اندر گئے اور رضیہ کی تلوار اور ایک چھوٹا خنجر اپنے قبضے میں لے کر اس کے بازو چھوڑ دیے۔

''یہ تم لوگ کیا کررہے ہو؟''
''آپ ایک قیدی ہیں اور قیدیوں کو غیر مسلح کیا جاتا ہے۔''
''میں غیر مسلح ہو چکی، اب تم میرے خیمے سے نکل جاؤ۔ مجھے تنہا چھوڑ دو اور ہو سکے تو قطب الدین کو میرے پاس بھیج دو۔'' ان سپاہیوں نے کوئی جواب نہیں دیا لیکن اس کے خیمے سے باہر نکل گئے۔ اس کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ یہ سب کیا ہوا ہے۔ ہم تو کسی کی بغاوت کچلنے نکلے تھے۔ دشمن کی فوج سامنے آئی نہ مقابلہ ہوا۔ پھر یہ کیا ہو رہا ہے؟ وہ ٹہل رہی تھی اور سوچ رہی تھی اور پھر جیسے سب کچھ اس کی سمجھ میں آگیا۔ یہ ترک امیروں کی میرے خلاف بغاوت ہے۔ بھٹنڈا پہنچنے سے پہلے ہی انہوں نے مجھے قید کرلیا ہے اور میرا محافظ، میرا وفادار، میرا جاں نثار یاقوت کہاں ہے؟ اسے بھی یقیناً میری طرح کسی جگہ قید کردیا گیا ہوگا۔ تو کیا قطب الدین کو بھی ان امیروں نے خرید لیا؟ یہ سپاہی تو اسی کے تھے پھر میرے خلاف کیوں تھے؟

اسے قید کرلیا گیا تھا لیکن قیدی بنانے کا مقصد کیا ہے، یہ اس کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا۔ ہنگامہ اٹھنے کے بعد پھر خاموشی طاری ہوگئی تھی۔ وہ ایک مرتبہ پھر دروازے تک گئی لیکن ایک مرتبہ پھر لوٹا دی گئی۔

''اگر آپ اب دروازے تک آئیں تو ہم آپ کے پیروں میں زنجیریں ڈالنے پر مجبور ہو جائیں گے۔''
''مجھے صرف یہ بتاؤ امیر الامراء کہاں ہیں؟''
''ہمیں کچھ بتانے کی اجازت نہیں ہے۔''
اس کے بعد وہ مختلف سوالات کرتی رہی لیکن ہر سپاہی پتھر کا بن گیا تھا۔ اس کے سوالات دیواروں سے ٹکرا رہے تھے البتہ اسے یہ معلوم ہو گیا تھا کہ سپاہیوں نے اس کے خیمے کو چاروں طرف سے گھیرا ہوا ہے۔

وہ یہ دیکھنے کو جاگتی رہی کہ جن امراء نے اس کے خلاف بغاوت کی ہے، اب وہ آئندہ کیا کرتے ہیں۔ دہلی واپس جاتے ہیں یا بھٹنڈا کے التونیہ سے ان کی کوئی ساز باز ہوئی ہے۔ اسے دہلی لے جا کر قید کیا جاتا ہے یا موت اس کی تقدیر ہے۔ سورج طلوع ہوتے ہی چند سپاہی خیمے میں آئے۔

''آپ چلنے کے لیے تیار ہو جائیں۔''
''ہم کہاں جائیں گے؟''
''یہ نہیں بتایا جائے گا۔''
''میرا ہاتھی خیمے تک پہنچا دو۔ میں تیار ہوں۔''
''اب آپ ہاتھی پر نہیں، گھوڑے پر سفر کریں گی۔ گھوڑا خیمے کے دروازے پر موجود ہے۔''

وہ خیمے سے باہر نکلی۔ گھوڑا تیار کھڑا تھا۔ اسے بے اختیار یاقوت حبشی یاد آگیا جو اسے گھوڑے پر سوار ہونے میں مدد دیا کرتا تھا۔ اس نے بے بسی سے ادھر ادھر دیکھا اور سوار ہوگئی۔ قسمت میں ہوا تو یاقوت سے ملاقات ضرور ہوگی۔ وہ جہاں بھی ہو خیریت سے ہو۔ اس نے دل ہی دل میں کہا۔ اس موقع پر اس نے ایک اور شخصیت کو ڈھونڈنے کی کوشش کی تھی۔ وہ تھا قطب الدین جو نظر نہیں آرہا تھا۔

اس کے سوار ہوتے ہی لاتعداد سپاہیوں نے اس کے گھوڑے کو چاروں طرف سے گھیر لیا تھا۔ بھاگنے کے امکانات تقریباً معدوم ہو گئے۔

یہ مناظر اس نے رات کے اندھیرے میں دیکھے تھے۔ صبح کی روشنی اس پر حقیقتِ حال پوری طرح ظاہر کررہی تھی۔ دور تک مسلح شہ سوار نظر تو آرہے تھے لیکن ان میں کوئی بھی پرایا نہیں تھا۔ یہ اس کا لشکرِ شاہی تھا لیکن ان کی آنکھوں میں اپنی فرماں روا کے لیے کوئی احترام نہیں تھا۔ وہ بھاگ نہیں سکتی تھی لیکن چیخ تو سکتی تھی۔ ایک مرتبہ پھر اس نے قریب چلنے والے سواروں سے ڈانٹ کر پوچھا۔ ''قطب الدین کہاں ہے؟ اسے میرے پاس بھیجو۔'' ساتھ چلنے والے پتھر بن کر اس کے ساتھ چلتے رہے۔ کسی نے کوئی جواب نہیں دیا۔

وہ جواب بھی کیا دیتے۔ سازش مکمل ہو چکی تھی۔ قطب الدین اپنا لشکر لے کر دہلی کی طرف لوٹ گیا تھا۔ چند سو شہ سوار اپنے کسی نائب کی راہنمائی میں چھوڑ گیا تھا کہ رضیہ سلطانہ کو اس کی منزل تک چھوڑ آئیں۔ سازش کرنے والوں نے یہی طے کیا تھا۔

رضیہ سلطانہ کی آواز صحرا میں شور مچا کر رہ گئی تھی۔ اب وہ چپ تھی۔ اس نے خود کو حالات کے رحم و کرم پر چھوڑ دیا تھا لیکن اس کی آنکھیں ادھر ادھر بھٹک رہی تھیں۔ وہ جمال الدین یاقوت کو تلاش کررہی تھی۔ اسے کیا معلوم تھا کہ اس کا وفادار اس کی وفاداری کی بھینٹ چڑھ چکا ہے۔

ویرانے کا دامن سمٹتا جارہا تھا۔ کئی گھنٹوں کی اذیت

تک مسافت کے بعد اسے اندازہ ہونے لگا کہ وہ بھٹنڈا کے قریب پہنچ چکی ہے۔ سازش کے کئی دھندلے عکس اس کی آنکھوں کے سامنے لہرانے لگے۔ ملک التونیہ کا لشکر ابھی تک سامنے نہیں آیا تھا۔" اس کا مطلب ہے کوئی مقابلہ نہیں ہوگا۔ کسی سازش کے تحت مجھے ملک التونیہ کے حوالے کیا جارہا ہے۔ وہی التونیہ جسے میری بارگاہ دل سے کئی مرتبہ نکالا جاچکا ہے۔ اب مجھے اس کے انتقام سے کوئی نہیں بچا سکے گا۔ کاش! اس وقت جمال الدین یاقوت میرے ساتھ ہوتا۔" اسے اس سے زیادہ سوچنے کا موقع ہی نہیں ملا۔ چند سوسواروں کا ایک دستہ نمودار ہوا۔ یہ التونیہ کے سپاہی تھے۔ وہ تو اب تک یہی دیکھتی چلی آئی تھی کہ جب دو مخالف لشکر آمنے سامنے ہوتے ہیں تو جنگ ہوتی ہے لیکن یہاں "تبادلہ" ہورہا تھا۔ اسے مخالف لشکر کی سمت دھکیل دیا گیا جس نے اسے فوراً حصار میں لے لیا۔ دہلی کا لشکر واپس جانے کے لیے مڑ گیا۔ بھٹنڈا کا لشکر رضیہ کو لے کر بھٹنڈا کے قلعے کی طرف لوٹ گیا جہاں اسے نظر بند کیا جانا تھا۔

پوری تصویر واضح ہوگئی۔ وہ اب بھی کچھ نہ سمجھتی تو بے وقوف ہوتی۔ وہ سمجھ گئی کہ اس کے خلاف سازش کی گئی ہے۔ ترک امراء نے التونیہ سے سودے بازی کی ہے۔ میں یہاں نظر بند رہوں گی اور دہلی کے تخت پر کسی کو بٹھادیا جائے گا......شاید معزالدین۔

حقیقت بھی یہی تھی۔ ترک سرداروں نے التونیہ کے ساتھ مل کر یہ سازش تیار کی تھی۔ قطب الدین خود التونیہ سے ملنے آیا تھا اور طے کرکے گیا تھا کہ وہ بغاوت کا اعلان کردے اور ہم رضیہ سلطانہ کو لے کر میدان جنگ میں آئیں گے لیکن کوئی مقابلہ نہیں ہوگا۔ یاقوت حبشی کو قتل کردیا جائے گا اور رضیہ تمہاری قید میں رہے گی۔ اس طرح یہ تاثر دیا جائے گا کہ جنگ میں شکست ہوئی اور رضیہ سلطانہ قید کرلی گئی۔

سازش بظاہر مکمل تھی۔ اس میں کوئی کمی نہیں رہ گئی تھی لیکن ترک امیر یہ بھول گئے تھے کہ ملک التونیہ، رضیہ سلطانہ کا عاشق ہے۔ یہ کمی بعد میں پوری ہونے والی تھی۔

جب لشکر شاہی دہلی پہنچ گیا تو سازش کا آخری حصہ بھی مکمل کرلیا گیا۔ ترک امیروں نے اتفاق رائے سے التمش کے تیسرے بیٹے معزالدین بہرام شاہ کو تخت نشین کردیا اور تمام بڑے بڑے عہدے آپس میں تقسیم کرلیے۔ التمش کی وصیت ایک مرتبہ پھر پامال ہوگئی۔

تخت نشینی کا جشن منایا گیا تو شراب کے دور خوب چلے۔ ترک امیروں کو یہی ماحول درکار تھا۔ رضیہ جیسی سخت گیر حکمراں کے ہوتے ہوئے یہ ماحول میسر نہیں آسکتا تھا۔ اسی لیے اسے بغاوت کے جعلی دام میں پھنسا کر التونیہ کے زندان تک پہنچادیا گیا۔

☆☆☆

رضیہ سلطانہ کو کسی معزز مہمان کی طرح بھٹنڈا کے قلعے میں اتارا گیا۔ سپاہیوں نے گردنیں خم کیں اور ہتھیار نیچے کرلیے۔ درجنوں کنیزیں اس کی خدمت کے لیے حاضر ہوگئیں۔ تھوڑی دیر کے لیے اسے یہ محسوس ہوا جیسے وہ اپنے محل میں ہے لیکن وہ ایک قیدی تھی جسے سونے کے پنجرے میں قید کردیا گیا تھا۔

ابھی ملک التونیہ اس سے ملنے نہیں آیا تھا۔ اسے ڈر تھا کہ وہ ملنے آیا تو منظرنامہ تبدیل بھی ہوسکتا ہے۔ ملک التونیہ اس سے شادی کا خواہش مند تھا اور وہ کم از کم تین مرتبہ اس کی پیشکش کو ٹھکرا چکی تھی۔ وہ اپنی اس بے عزتی کا بدلہ ضرور لے گا۔ کچھ نہیں تو طنزیہ باتوں سے اس کا کلیجا چھلنی کردے گا یا زبردستی اس سے شادی کرلے گا۔ اب میں فرماں روا نہیں، بے بس قیدی ہوں۔

اسے اپنے اس اعزاز کا خیال آیا جو چند روز پہلے تک اسے حاصل تھا۔ وہ فرماں روائے ہند تھی۔ بڑی بڑی خطرناک گردنیں اس کے سامنے خم رہتی تھیں۔ اب اگر التونیہ اس سے ملنے آیا بھی تو پوری شان وشوکت کے ساتھ آئے گا۔

ایک روز ایک کنیز نے اسے اطلاع دی کہ حاکم بھٹنڈا ملک اختیار الدین التونیہ اس سے ملاقات کے لیے آرہا ہے۔

"میرے باپ کے غلام التونیہ کو میری خدمت میں پیش کرو۔ میں ملنے کے لیے تیار ہوں۔" اس نے اتنی زور سے کہا تھا کہ شاید التونیہ نے سن بھی لیا ہو کیونکہ دوسرے ہی لمحے وہ اندر چلا آیا تھا۔ اسے حیرت تو اس وقت ہوئی تھی جب التونیہ نے اسے اسی انداز میں سلام پیش کیا جس طرح دربار شاہی میں کیا کرتا تھا۔

"التونیہ! تم میرا مذاق اڑا رہے ہو یا ابھی تک مجھے فرماں روائے ہند تسلیم کرتے ہو؟"

"سلطانِ اعظم! آپ اب بھی میرے لیے سلطان اعظم ہیں اور میں آپ کے والد کی نسبت سے آپ کا غلام۔"

"پھر یہ سب کیا ہے؟ میں کیوں قید کرلی گئی ہوں؟ قید ہونا ہی تھا تو تمہاری قید میں کیوں ہوں؟"

"اس لیے کہ میں آپ سے محبت کرتا ہوں۔ آپ کی زندگی مجھے عزیز تھی۔"

''میری زندگی کا تم سے کیا تعلق؟''
''آپ میری زندگی ہیں۔''
''تمہیں یہ سب کہنے کی جرأت اس لیے ہو رہی ہے کہ اس وقت میں بے بس ہوں۔''
''یہ کس نے کہہ دیا کہ آپ بے بس ہیں۔ آپ اب بھی مجھے ٹھکرا سکتی ہیں۔''
''یہ تم اسی لیے کہہ رہے ہو کہ حالات کی ہوا میرے خلاف چل رہی ہے۔ تم نے حالات ایسے پیدا کر دیے ہیں کہ میں کہیں اور گئی بھی تو قید خانہ میرا مقدر ہوگا۔''
''آپ کو کسی تکلیف دہ قید خانے سے بچانے کے لیے ہی تو یہاں لایا ہوں۔''
''تمہارے منہ سے سچ نکل ہی گیا۔ تم نے اگل دیا کہ تم ہی سازباز کر کے مجھے یہاں لائے ہو۔''
''سلطان اعظم! میں ہی آپ کو یہاں لایا ہوں لیکن آپ کے ترک امیروں سے بچانے کے لیے۔ آپ کی زندگی مجھے عزیز تھی۔''
''اپنا الزام دوسروں پر کیوں دھرتے ہو۔ بغاوت تم نے کی تھی۔''
''میں آپ کے خلاف بغاوت کا تصور بھی نہیں کر سکتا تھا۔ یہ سب آپ کے امیروں کا پھیلایا ہوا جال تھا۔''
''جس میں تم پھنس گئے۔''
''مجھے پھنسنا پڑا۔ آپ کی خاطر۔ آپ کی زندگی کی خاطر۔ وہ آپ کو اور یاقوت حبشی کو قتل کرنا چاہتے تھے......'' وہ ابھی یہیں تک کہہ پایا تھا کہ رضیہ نے اس کی بات کاٹ دی۔
''یاقوت اس وقت کہاں ہے؟''
''اسے قتل کر دیا گیا ہے۔''
یہ اطلاع ایسی تھی کہ رضیہ چیختی ہوئی اپنی جگہ سے کھڑی ہوگئی۔ ''تم نے اسے قتل کرا دیا۔ تم اس کے قتل میں شریک ہو۔ خودغرض انسان، مجھ سے محبت کا دعویٰ بھی کرتے ہو اور میری عزیز ترین ہستی کو قتل بھی ہونے دیتے ہو۔ نفرت ہے مجھے تم سے۔ چلے جاؤ یہاں سے، مرنے دو مجھے بھی۔''
وہ کہتی رہی جو اس کے دل میں آ رہا تھا۔ التونیہ کسی سعادت مند بچے کی طرح چپ چاپ سن رہا تھا۔ جب وہ بول چکی تو التونیہ نے نہایت نرم لہجے میں اسے سمجھانے کی کوشش کی۔
''آپ کے ترک امیروں نے خطوں کے ذریعے مجھے اطلاع کر دی تھی کہ وہ آپ کو اور یاقوت کو قتل کرنے کے درپے ہیں۔''

''اپنی صفائی پیش کرنے کی ناکام کوشش مت کرو۔ تم اس سازش کی مجھے اطلاع کر سکتے تھے۔''
''میں نے آپ کو خط لکھ دیا تھا کہ یاقوت کو معزول کر کے ہندوستان سے باہر نکال دیں۔ اس سے زیادہ میں کچھ نہیں لکھ سکتا تھا۔ مجھے معلوم تھا میرے خطوط کی نگرانی کی جائے گی۔ اگر آپ میرے لکھے پر عمل کر لیتیں تو سازش خودبخود دم توڑ دیتی۔ مجبور ہو کر میں نے سازشیوں کے سامنے یہ تجویز رکھ دی کہ وہ امیرالامراء کو قتل کر دیں اور سلطان اعظم کو میرے حوالے کر دیں۔ مجھے یاقوت حبشی سے کوئی دلچسپی نہیں تھی بلکہ میں اس سے نفرت کرتا تھا لیکن میں آپ کو کھونا نہیں چاہتا تھا۔ میری تجویز مان لی گئی اور آج آپ یہاں ہیں اور محفوظ ہیں۔''
''کیا یہ خودغرضی نہیں؟ کیا تم نے اپنے مفاد کے لیے اسے قتل نہیں کرایا؟ کیا میں تمہیں معاف کر دوں گی؟''
''میں مجبور تھا سلطان اعظم؟ اپنے دل کے ہاتھوں مجبور تھا۔ یاقوت میرا رقیب بن گیا تھا۔ کم از کم میں یہی سمجھتا تھا۔''
''میں یاقوت کے قاتل کے سامنے بیٹھی ہوں، یہ خیال ہی میرے لیے سوہان روح ہے۔ میں تم سے یہ بھی نہیں کہہ سکتی کہ تم یہاں سے اٹھ کر چلے جاؤ کیونکہ یہ میرا دربار نہیں، تمہارا قلعہ ہے جسے میں فتح نہیں کر سکتی۔''
''اس کے باوجود آپ فاتح ہیں۔ میرے دل کی فاتح۔''
''اتنے مظالم کے باوجود اب تم مجھ سے کیا چاہتے ہو، کیا لینے آئے ہو یہاں؟''
''یہ اجازت کہ کبھی کبھی آپ کی تنہائی میں مخل ہوتا رہوں۔ اگر آپ اجازت نہیں دیں گی تو بھی مجھے ناگوار نہیں ہوگا۔ میرے لیے یہی خوشی بہت ہوگی کہ آپ محفوظ ہیں۔''
ملک التونیہ یہ کہتے ہوئے کمرے سے نکل گیا۔ رضیہ سلطانہ نے دیکھ لیا تھا کہ اس کی آنکھیں نم تھیں۔
اس کے چلے جانے کے بعد وہ بہت دیر تک التونیہ کے بارے میں سوچتی رہی۔ وہ جاننا چاہتی تھی کہ اس کی باتوں میں کتنی صداقت ہے۔ وہ جتنا جتنا سوچتی جا رہی تھی، اسے التونیہ سچا نظر آتا تھا اور مخلص بھی۔ اگر وہ مخلص نہ ہوتا تو واقعی وہ یہ تجویز کیوں رکھتا کہ رضیہ کو اس کے حوالے کر دیا جائے۔ بوالہوس ہوتا تو زبردستی مجھے اپنی داشتہ بنا لیتا۔ یہ نہ کہتا کہ میں آزاد ہوں جہاں چاہوں چلی جاؤں لیکن جمال الدین یاقوت؟
اس نام پر التونیہ خودغرض نظر آنے لگتا تھا۔
دو تین دن کا وقفہ دے کر ملک التونیہ اس سے

ملاقات کے لیے پھر آیا لیکن رضیہ سلطانہ نے ملاقات سے انکار کر دیا۔ اس کے تعجب کی انتہا نہ رہی جب اس نے دیکھا کہ وہ خاموشی سے چلا گیا۔ اس نے یہ حق بھی نہیں جتایا کہ یہ اس کا علاقہ ہے، اس کا قلعہ ہے۔ یہ اس کی شان کے منافی ہے کہ اس کی قیدی اس سے ملاقات سے انکار کر دے۔

رضیہ کے لیے اس کا یہ روپ بھی بالکل نیا تھا۔ اس نے ٹھنڈے دل سے سوچا تو التونیہ اسے قابلِ رحم نظر آنے لگا جو اس کے حکم پر چل رہا تھا۔ اس کے لیے اپنا بھی یہ روپ نیا نظر آرہا تھا۔ وہ اور التونیہ کے بارے میں اس طرح سوچ رہی تھی۔

وہ سمجھ رہی تھی کہ اس انکار کی پاداش میں اس پر سختیاں بڑھ جائیں گی لیکن اس کے برعکس مہربانیاں اور بڑھ گئیں۔ التونیہ کی طرف سے تحائف بھی آنے لگے جو اسے قبول کرنے پڑتے تھے۔ اسے یہ اجازت بھی مل گئی کہ وہ چاہے تو دو محافظوں کے ساتھ سیر و تفریح کے لیے باہر بھی جاسکتی ہے۔ وہ تنہائی سے گھبرانے لگی تھی لہٰذا اس نے یہ پیشکش قبول کر لی۔

☆☆☆

کئی مہینے گزر گئے تھے۔ التونیہ نے اس دوران اس سے کئی ملاقاتیں کی تھیں۔ ان ملاقاتوں میں التونیہ کی طرف سے کسی ناشائستگی کا ارتکاب نہیں ہوا تھا۔ اس کے دل میں آہستہ آہستہ التونیہ کے لیے جگہ پیدا ہوتی جا رہی تھی۔

التونیہ ہی کی زبانی اسے یہ معلوم ہو چکا تھا کہ جن امیروں نے اس کے خلاف سازش کی تھی، انہی امیروں نے اس کے بھائی معزالدین کو اس کی جگہ تخت پر بٹھا دیا ہے۔

ان اطلاعات کے بعد رضیہ نے اپنی قید کے بارے میں سوچنا چھوڑ دیا۔ اب اس کی سوچوں کا محور یہ تھا کہ کسی طرح ''ترک امیروں'' سے بدلہ لیا جائے اور دہلی کا تخت دوبارہ حاصل کرنے کی کوشش کی جائے۔ وہ سوچ ضرور رہی تھی لیکن ہر طرف اندھیرا ہی اندھیرا تھا۔ اس کے پاس وہ وسائل نہیں تھے جنہیں کام میں لا کر دشمنوں کا مقابلہ کر سکے۔ پھر اس اندھیرے میں روشنی کی ایک کرن نمودار ہوئی۔ یہ تھا ملک التونیہ۔ اگر کسی طرح ملک التونیہ اس کا ساتھ دینے پر آمادہ ہو جائے تو وہ دہلی پر چڑھائی کر دے۔ التونیہ اس خطرے میں ہاتھ کیوں ڈالے گا؟ اگر میں اس سے شادی کے لیے تیار ہو جاؤں تو شاید وہ میری خاطر یہ بوجھ اٹھا لے۔ ایک سے دو بہت ہوتے ہیں۔ اگر ہمیں کامیابی ہوئی تو دہلی کے تخت پر میں اسے بٹھا دوں گی۔ مجھے تو ''ترک امیروں'' کو نیچا دکھانا ہے۔

وہ فیصلہ کر چکی تھی۔ اب اسے التونیہ کا انتظار تھا لیکن وہ کسی کام میں ایسا الجھا تھا کہ آنے کا نام ہی نہیں لے رہا تھا۔ آخر اس کا پیمانہ صبر لبریز ہو گیا۔ اس نے ایک کنیز کے ذریعے اسے بلا بھیجا۔

''کیا تم اب بھی مجھ سے شادی کے خواہاں ہو جبکہ میں فرماں روائے ہند نہیں رہی...... محض ایک قیدی ہوں؟''

''میں اس لیے آپ سے شادی کرنا نہیں چاہتا تھا کہ آپ فرماں روا ہیں۔''

''جو بات میں نے پوچھی ہے اس کا جواب دیجیے۔ آپ مجھ سے شادی کرنا چاہتے ہیں؟''

''یہ آپ کی رضا سے مشروط ہے۔ آپ پہلے مجھے مسترد کر چکی ہیں اس لیے کچھ کہتے ہوئے ڈرتا ہوں۔''

''میں نے آپ کو اس لیے مسترد کر دیا تھا کہ میرے سامنے کچھ بڑے مقاصد تھے جن کی تکمیل ضروری تھی۔ اب کچھ ایسے مقاصد ہیں جن کے لیے شادی ضروری ہے۔ میں آپ کی پناہ میں ہوں۔ دہلی کا بادشاہ کسی وقت بھی تقاضا کر سکتا ہے کہ اس کی قیدی اس کے حوالے کی جائے۔ آپ کے لیے انکار کرنا مشکل ہو جائے گا لیکن اگر آپ مجھ سے شادی کر لیں تو پھر وہ یہ تقاضا نہیں کر سکتا۔''

''مجھے کچھ کہنے کی ضرورت نہیں۔ آپ جانتی ہیں میرا جواب ''ہاں'' میں ہوگا۔''

''میں یہ چاہوں گی کہ شادی کے بعد میرا شوہر فرماں روائے ہند کا شوہر کہلائے۔''

''جو شے آپ کی دسترس میں نہیں، اس کے خواب کیوں دیکھتی ہیں، میرے لیے تو آپ اب بھی فرماں روا ہیں۔''

''مجھے تخت و تاج سے دلچسپی نہیں۔ میں تو ان نمک حرام امیروں سے انتقام لینا چاہتی ہوں جنہوں نے غداری کی اور آپ میرا ساتھ دیں گے۔ اگر یہ شرط منظور ہے تو میں آپ کی شریک سفر بننے کو تیار ہوں۔''

یہ ایسی بڑی شرط تھی کہ التونیہ کچھ دیر کے لیے سوچ میں پڑ گیا۔ اگر وہ اس کی پوری جاگیر بھی مانگتی تو وہ دینے میں دیر نہیں لگاتا لیکن وہ ایک ایسی شرط رکھ رہی تھی جو اس کے اختیار میں نہیں تھی لیکن پھر اس کا عشق اس پر حاوی آگیا۔ شرط کوئی بھی ہو، رضیہ سے زیادہ تو نہیں۔

''میں اس شرط پر پورا اترنے کو تیار ہوں لیکن میری بھی ایک شرط ہے۔ اگر ہم ناکام بھی رہے تو آپ میرا ساتھ نہیں چھوڑیں گی۔''

''موت کے علاوہ کوئی چیز ہمارے راستے میں مزاحم نہیں ہوسکتی۔ میں آپ کو اپنا شوہر تسلیم کرتی ہوں۔''

☆☆☆

رضیہ نے التونیہ سے شادی کر کے اپنے آپ کو محفوظ کرلیا تھا۔ اب معزالدین اسے پناہ گزیں کہہ کر طلب نہیں کرسکتا تھا۔ اب وہ باعزت حاکم کی باعزت بیوی تھی۔ اب اسے اپنے باپ کی سلطنت کو بوالہوس امیروں سے آزاد کرانا تھا۔ یہی وہ عزم تھا جسے شرط بنا کر اس نے التونیہ سے نکاح کیا تھا۔

دونوں نے مل کر لشکر جمع کرنا شروع کردیا۔ گکھروں، جاٹوں اور دوسرے لڑاکا قبیلوں کے ہزاروں جوان ان کے پاس پہنچنا شروع ہوگئے۔ انہوں نے علاقے کے زمینداروں کو طلب کیا اور انہیں بڑی بڑی جاگیروں کا لالچ دے کر ان کے جوانوں کے جسموں پر ہتھیار سجا دیے۔ چند بڑے سردار بھی رضیہ سلطانہ کے ساتھ ہوگئے۔

رضیہ خود ''مرد میدان'' اور نہایت مشاق تلوار باز تھی۔ اسے بڑے سلیقے سے جنگی تربیت دی گئی تھی۔ التونیہ کی شجاعت و مردانگی کی دھوم دور دور تھی۔ دونوں نے مل کر نئے لشکر کی تربیت میں کوئی دقیقہ اٹھا نہیں رکھا۔ افرادی قوت اتنی زیادہ ہوگئی تھی کہ اب لشکر سلطانی کا مقابلہ بہ آسانی کیا جاسکتا تھا۔

ان فوجی تیاریوں کی اطلاع معزالدین تک بھی پہنچ چکی تھی۔ پھر اسے یہ اطلاع ملی کہ ملک التونیہ اپنی فوج لے کر بھٹنڈا سے نکل چکا ہے اور دہلی پر حملہ آور ہونے کے لیے مسلسل آگے بڑھ رہا ہے۔ معزالدین کے امیروں نے اسے مشورہ دیا کہ وہ التونیہ کے دہلی پہنچنے کا انتظار نہ کرے بلکہ جلد از جلد لشکر سلطانی کو بھٹنڈا کی طرف روانہ کرے تاکہ یہ لشکر التونیہ کو راستے ہی میں دبوچ لے۔ اس نے اپنے سالار عزالدین بلبن کو حکم دیا۔

راستے ہی میں دونوں فوجوں کا آمنا سامنا ہوگیا۔ یہ جنگ تجربہ اور ناتجربہ کاری کی جنگ ثابت ہوئی۔ رضیہ کی فوج کے بیشتر سپاہی ناتجربہ کار تھے۔ جہاں دیدہ سپہ سالار نے آزمودہ داؤ آزمائے اور دباؤ ڈالا تو رضیہ کی صفیں ٹوٹ گئیں۔ چند گھنٹوں میں اس کے سپاہی تنکوں کی طرح بکھر گئے۔

رضیہ اور التونیہ نے راہ فرار اختیار کی اور بہ مشکل اپنی جانیں بچا کر بھٹنڈا کے قلعے تک پہنچنے میں کامیاب ہوگئے۔ عزالدین بلبن نے ضروری نہیں سمجھا کہ وہ قلعے کا محاصرہ کرے۔ وہ دونوں کو شکست دے کر دہلی کی طرف لوٹ گیا۔

التونیہ تجربہ کار سپاہی تھا۔ اس جنگ کے تیور دیکھ کر سمجھ گیا تھا کہ وہ آئندہ بھی اس تربیت یافتہ فوج کا مقابلہ نہیں کرسکے گا۔ اس کے نزدیک بہتری اسی میں تھی کہ وہ معزالدین کی طرف دوستی کا ہاتھ بڑھائے۔ اپنی اور رضیہ سلطانہ کی جاں بخشی کے وعدے پر کچھ شرائط مان لے اور معاملات طے کرلے۔ معزالدین اس وقت ہرگز اس کا متحمل نہیں ہوسکتا تھا کہ علاقے میں شورشیں اور بغاوتیں سر اٹھائیں لہٰذا اس سے مصالحت کرنا آسان تھا۔ اس نے رضیہ سلطانہ کو بھی سمجھانے کی کوشش کی لیکن اس کی انا اور ضد نے اسے چین سے بیٹھنے نہیں دیا۔ وہ ہر قیمت پر دوبارہ اقتدار حاصل کرنا چاہتی تھی۔ اس نے یہاں تک کہہ دیا کہ اگر التونیہ اس کا ساتھ نہیں بھی دیتا تو وہ اپنے لشکر کے ساتھ اکیلی شاہی لشکر سے ٹکرا جائے گی۔ التونیہ اسے کھونا نہیں چاہتا تھا۔ وہ اس کی باتوں میں آگیا۔

رضیہ نے اپنے منتشر لشکر کو دوبارہ ترتیب دیا اور التونیہ کو ساتھ لے کر چلی۔ معزالدین نے اس مرتبہ بھی عزالدین بلبن کو اس کے مقابلے کے لیے بھیجا۔ کیتھل کے گردو پیش کے علاقے میں دونوں فوجوں کے درمیان خون ریز معرکہ آرائی ہوئی۔

صبح سے شروع ہونے والی جنگ میں دوپہر تک تو رضیہ کا لشکر ثابت قدمی سے لڑتا رہا اور پھر اندھیرا ہونے تک ساری صفیں بکھر کر رہ گئیں۔

رضیہ، التونیہ دونوں میدان جنگ سے بھاگ نکلے لیکن کسی محفوظ مقام پر پہنچنے سے قبل ہی چند زمینداروں نے انہیں گرفتار کرلیا۔ یہاں پہنچ کر تاریخ خاموش ہوجاتی ہے۔ ان دونوں کو یا تو انہی زمینداروں نے قتل کردیا یا پھر ان کو گرفتار کر کے معزالدین کے سامنے پیش کیا گیا اور اسی کے حکم سے دونوں کو قتل کیا گیا۔

بعض نے لکھا ہے التونیہ کو زمینداروں نے قتل کیا اور رضیہ سلطانہ کو معزالدین کے حکم سے قتل کیا گیا۔ اس کے زوال پر زیادہ غور کرنے کی ضرورت نہیں۔ یاقوت حبشی کا بڑھا ہوا اقتدار اور اس سے خاص تعلق غلط فہمیوں کا سبب بنا اور طاقتور امراء نے اسے تخت سے مقتل تک پہنچا دیا۔

ماخذات

طبقات ناصری، طبقات اکبری،
تاریخ فرشتہ، سفر نامہ ابن بطوطہ

اس کی آنکھ کھلی تو وہ بستر پر دراز تھا۔ اوپر سفید چھت تھی جس پر لگا ہوا گولڈن ڈسک والا پنکھا بہت دھیمی رفتار سے چل رہا تھا۔ دیواروں پر اعلیٰ درجے کا ایپل گرین پلاسٹک ایملشن پینٹ تھا۔ دائیں طرف کھڑکی کے آگے لگے پردے سرسرا رہے تھے جیسے باہر ہوا چل رہی ہو۔ بیڈ کے مخالف سمت کمرے کا واحد دروازہ تھا۔ وہ نرم بستر پر دراز سوچ رہا تھا کہ وہ کہاں ہے؟ اس کے ماتھے پر کچھ لگا ہوا تھا۔ اس نے ہاتھ اٹھا کر چھوا تو اس کے ماتھے پر پٹی چپکی

صیّاد

کاشف زبیر

وہ جو خوش رنگینیوں میں مگن کھلے پھولوں سے چھیڑ چھاڑ کرتے اپنی زندگی میں گم تھے کہ اچانک ایک روز انہی پھولوں کو پیروں تلے روندنے کا تکلیف دہ حادثہ سرزد ہو گیا اور... غلطی تو ہر حال میں غلطی ہوتی ہے جس کا اندراج قدرت کے رجسٹر میں آپ ہی ہو جاتا ہے۔ بے شک ڈالی سے جدا ہونے والے پھول وقت کی گرد میں کہیں گم ہو جاتے ہیں لیکن شاخ کی ویرانی آپ ہی ان کے بچھڑ جانے کا پتا دیتی ہے۔ جیسے کہ یہاں... وہ بکھری ہوئی نشانیاں جانے کتنی کہانیاں سنا رہی تھیں۔

مایا جال میں الجھنے والے چند زر پرست انسانوں کی فطرت کا اندازہ

ہوئی تھی جیسی زخموں پر لگاتے ہیں۔ مگر اسے کوئی تکلیف محسوس نہیں ہو رہی تھی۔ پٹی کو چھو کر اس نے اٹھنے کی کوشش کی تو اس کے ایک پاؤں نے حرکت کرنے سے انکار کر دیا۔ اس کے جسم پر موٹی چادر تھی۔ اس نے چادر ہٹائی تو فوراً ہی پاؤں کے حرکت نہ کرنے کی وجہ بھی نظر آ گئی اس کا بایاں پاؤں ٹخنے سے لے کر گھٹنے سے ذرا اوپر تک پلاستر میں جکڑا ہوا تھا اور اس وجہ سے گھٹنے سے مڑنے سے قاصر تھا۔ اس نے وحشت زدہ ہو کر سوچا۔

'یہ میرے ساتھ کیا ہوا ہے؟'

اور تب اسے احساس ہوا کہ وہ اپنی اس حالت کے بارے میں کچھ بھی نہیں جانتا۔ اسے اپنا نام اور اس جگہ سے اپنا تعلق یاد نہیں آ رہا تھا۔ یہ اسپتال نہیں تھا۔ کمرے کی ساخت اور فرنش کرنے کا انداز بیڈروم کا سا تھا مگر وہاں صرف ایک درمیانے سائز کا بیڈ، اس کی سائڈ دراز اور فرش پر نیلے رنگ کا قالین تھا۔ کھڑکی پر آسمانی رنگ کے ہلکے سے پردے تھے اور باہر ایک درخت کا اوپری حصہ نظر آ رہا تھا۔ شاید یہ کمرا مکان کی اوپری منزل پر تھا۔ بیڈ کے ساتھ ایک ڈرپ اسٹینڈ رکھا ہوا تھا مگر فی الحال اس پر کوئی ڈرپ نہیں تھی۔ اس کے جسم پر صاف ستھری ٹی شرٹ اور ڈھیلا برمودا شارٹ تھا جو گھٹنوں تک آ رہا تھا۔ اس کا جسم بھی صاف ستھرا تھا۔ اس نے اپنے ہاتھ دیکھے جو صاف ستھرے تھے اور ناخن تراشے ہوئے تھے۔ وہاں کوئی آئینہ نہیں تھا جو وہ خود کو دیکھتا لیکن اس کے جسم اور ہاتھ پیروں سے لگ رہا تھا کہ وہ جوان آدمی ہے۔ وہ اٹھ بیٹھا۔ اب بھی اسے اپنے جسم اور پاؤں میں کوئی تکلیف محسوس نہیں ہو رہی تھی۔ تکلیف کے بجائے پورے جسم میں ایک سکون آمیز کیفیت تھی جو شاید کسی مسکن دوا کا اثر تھا۔

دوا کے خیال پر اس نے اپنے بازوؤں کا جائزہ لیا اور اسے دائیں بازو پر نس میں انجکشن لگنے کے نشانات نظر آئے۔ یعنی اسے انجکشن کے ذریعے دوا اور شاید خوراک بھی دی گئی تھی کیونکہ وہ خود کو بالکل صحت مند محسوس کر رہا تھا اور پیٹ بھی بھرا ہوا لگ رہا تھا۔ ان سب اطمینان بخش باتوں کے باوجود اس کے لیے یہ بات کم مضطرب کرنے والی نہیں تھی کہ اسے اپنے بارے میں کچھ یاد نہیں تھا۔ وہ ذہن پر زور دینے لگا تو معاً جھما کا سا ہوا اور اسے ایک بچی کی جھلکیاں نظر آئیں جو اچھلتی کودتی ہوئی ایک روش پر اس کی طرف آ رہی تھی۔ لیکن اس سے پہلے کہ بچی اس تک آتی جھلک ختم ہو گئی تھی۔ دروازہ کھلنے کی آواز پر وہ چونکا۔ ایک نوجوان اور خوب صورت عورت اندر آئی۔ وہ کسی قدر طویل قامت اور چھریرے بدن کی مالک تھی۔ اس نے موسم کی مناسبت سے لینن کا پرنٹ والا سوٹ پہنا ہوا تھا جو اس کے متناسب بدن پر سج رہا تھا۔ اس نے اپنے براؤن سلکی بال عقب میں جوڑے کی صورت میں باندھ رکھے تھے۔ رنگت بہت صاف اور دمکتی ہوئی تھی۔ نقوش اچھے لیکن ان میں کسی قدر سختی بھی تھی۔ اسے بیدار دیکھ کر وہ تیزی سے اس کے پاس آئی اور اس کے چہرے کو چھوتے ہوئے کہا۔

''شکر ہے تمہیں ہوش آ گیا۔''

وہ عورت کو گھور رہا تھا اور سوچ رہا تھا کہ وہ کون ہے؟ اس کے بارے میں کیا جانتی ہے اور کیا وہ واقف ہے کہ اسے کچھ یاد نہیں ہے؟ عورت جھجک کر پیچھے ہوئی تو اسے احساس ہوا کہ وہ اسے سخت نظروں سے گھور رہا ہے۔ ''کیا ہوا..... تم مجھے ایسے کیوں دیکھ رہے ہو؟''

''تم کون ہو؟''

عورت نے گہری سانس لی۔ ''تو ڈاکٹر کا خدشہ درست ثابت ہوا۔''

''کیسا خدشہ؟''

''اس نے کہا تھا کہ شاید چوٹ کے بعد طویل بے ہوشی کی وجہ سے جب تم بیدار ہو تو تمہیں اپنا ماضی یاد نہ ہو۔''

''کیسی چوٹ اور یہ کیسے لگی؟''

''تم بھول گئے ہو۔ تم کار چلا رہے تھے اور اسے حادثہ پیش آیا تھا۔''

عورت کی بات سن کر اس کے ذہن میں پھر جھما کا سا ہوا اور اس نے دیکھا وہ کار ڈرائیو کر رہا ہے۔ اس کے برابر میں عورت بیٹھی ہے۔ پھر اس نے مڑ کر دیکھا تو اسے پچھلی سیٹ پر وہی بچی سوتی نظر آئی۔ اس کے ہاتھ میں ایک گڑیا تھی جو اس نے سینے سے لگا رکھی تھی۔ جھلک جیسے اچانک نظر آئی تھی، اسی طرح اچانک ختم بھی ہو گئی۔ وہ بدستور عورت کو گھور رہا تھا مگر اب وہ خوف زدہ نہیں تھی۔ اس نے پہلے کھڑکی سے پردے ہٹائے تو باہر سے تیز روشنی اندر آئی۔ پھر وہ اس کے پاس آئی اور اس کے شانے پر ہاتھ رکھا۔ عورت کے قریب آنے پر اسے اس کے بدن سے اٹھتی مسحور کن خوشبو بہت واضح محسوس ہوئی۔ وہ نرمی سے بولی۔ ''حادثہ شدید تھا مگر شکر ہے کہ تمہیں زیادہ نقصان نہیں ہوا۔ پنڈلی کی ہڈی میں سمپل فریکچر ہوا ہے جو دو مہینے میں ٹھیک ہو جائے گا۔ ابھی ڈاکٹر نے تمہیں بیڈ ریسٹ کا کہا ہے لیکن دو ہفتے بعد تم اسٹک کی مدد سے چل سکو گے۔ ایک مہینے

بعد پلاستر اتار دیا جائے گا۔''
''میں کہاں ہوں؟''
''تم اپنے گھر میں ہو۔'' عورت نے کہا۔
''تم کون ہو؟''
''میں شاہین ہوں۔'' اس نے رسانیت سے جواب دیا جیسے اسے پہلے ہی اس سوال کی توقع ہو۔ ''تمہاری بیوی۔''
اسے شاک لگا۔ ''میں شادی شدہ ہوں؟''
''اس میں تعجب کی کیا بات ہے؟ آدمی شادی شدہ نہیں ہوتے کیا؟'' وہ اس کے پاس بیٹھ گئی۔ ''ہم تو پانچ سال سے ایک دوسرے کے ساتھ ہیں۔''
اسے یقین آگیا کیونکہ کوئی عورت اتنی بے تکلفی سے صرف اپنے شوہر کے پاس ہی بیٹھ سکتی ہے چاہے وہ کتنی ہی ماڈرن اور آزاد خیال کیوں نہ ہو۔ وہ بیویوں والا مخصوص انداز اپنے اندر پیدا کر ہی نہیں سکتی۔ شاہین کا انداز بیوی والا ہی تھا۔ اس نے ہاتھ بڑھا کر اس کا ہاتھ پکڑا تو وہ خود اس کے پاس کھنچی چلی آئی۔ ایک منٹ سے بھی پہلے اس کا رہا سہا شک بھی جاتا رہا۔ شاہین کی آنکھوں میں خمار اتر آیا تھا اور رنگت گلابی ہوگئی تھی۔ خود اس کی سانسیں بھی تیز ہونے لگی تھیں مگر جب اس نے مزید پیش قدمی کی کوشش کی تو شاہین نے اسے روک دیا۔ وہ مرتعش لہجے میں بولی۔ ''بس، ابھی تمہاری حالت اس قابل نہیں ہے۔ ڈاکٹر نے دو ہفتے بہت احتیاط کا کہا ہے، اس کے بعد تم پاؤں پر زور ڈال سکتے ہو۔''
اس نے گہری سانس لے کر اپنے جذبات کے ابال پر قابو پانا شروع کیا۔ اچانک اسے خیال آیا اور اس نے شاہین سے پوچھا۔ ''یہ حادثہ کب اور کہاں پیش آیا؟''
''دو دن پہلے جب ہم دارالحکومت سے واپس گھر آرہے تھے تو راستے میں پیش آیا۔''
''میں دو دن سے بے ہوش تھا؟''
''نہیں چوبیس گھنٹے تم خود بے ہوش رہے تھے اور ڈاکٹر نے تکلیف سے بچانے کے لیے تمہیں مزید چوبیس گھنٹے بے ہوش رکھنے کا مشورہ دیا تھا۔''
''ڈاکٹر نے مجھے یہیں دیکھا تھا؟''
''نہیں، میں تمہیں اسپتال لے گئی تھی۔ کل شام کو گھر لائی ہوں۔''
''ڈاکٹر نے مجھے آنے دیا؟''
''ہاں، تمہیں کوئی خطرناک چوٹ نہیں آئی تھی۔ اس نے کہا کہ اسپتال میں بھی تمہیں لیٹے رہنا ہے تو بہتر ہوگا کہ تمہیں گھر لے جاؤں۔''
''اسپتال کیسے لے گئی تھیں؟''
''ایک گاڑی میں، خوش قسمتی سے کار کو زیادہ نقصان نہیں ہوا۔ میں نے مکینک کو دے دی تھی، وہ آج پہنچا جائے گا۔''
وہ سوچ رہا تھا کہ اس نے سب پوچھ لیا ہے سوائے اپنی شخصیت کے۔ ''میں کون ہوں...... میرا مطلب ہے میرا نام کیا ہے؟''
شاہین نے سائڈ دراز سے ایک پرس اٹھا کر اس کے سامنے رکھ دیا۔ ''اس میں تمہاری تمام چیزیں ہیں۔ جب تک یہ دیکھو، میں تمہارے لیے کھانے کو کچھ لاتی ہوں۔ دو دن سے تمہارا گزارہ ڈرپ اور طاقت کی دواؤں پر ہو رہا تھا۔''
شاہین کمرے سے چلی گئی۔ وہ اسے جاتا دیکھ رہا تھا اور سوچ رہا تھا کہ وہ نہ جانے کون ہے مگر بیوی کے لحاظ سے خوش قسمت ہے۔ اتنی حسین بیوی قسمت سے ہی ملتی ہے۔ اس کے جانے کے بعد وہ پرس کی طرف متوجہ ہوا اور اسے کھول کر دیکھا۔ اندر سے ایک آئی ڈی کارڈ نکلا جس پر ایک اجنبی تصویر تھی۔ نیچے نام سجاد حسن لکھا ہوا تھا۔ آئی ڈی کارڈ دو سال پہلے بنا تھا اور تقریباً دس سال بعد ایکسپائر ہوتا۔ اس کی تاریخِ پیدائش کے لحاظ سے وہ پینتیس برس کا تھا۔ آئی ڈی کارڈ کے ساتھ ڈرائیونگ لائسنس تھا۔ شیلف میں دو عدد ڈیبٹ کارڈ تھے جو دو مختلف بینکوں کے تھے۔ اس کے علاوہ تقریباً چھ سات ہزار روپے چھوٹے بڑے نوٹوں کی صورت میں تھے۔ اس نے خود سے کہا۔ ''تو میرا نام سجاد حسن ہے؟''
سجاد نے اپنی صورت نہیں دیکھی تھی لیکن شاہین نے کہا تھا کہ پرس اور اس میں چیزیں اس کی ہیں۔ اس نے پرس واپس سائڈ دراز میں ڈال دیا اور خود بستر پر دراز ہو گیا۔ اب اس کا اضطراب کسی حد تک کم ہو گیا تھا۔ البتہ کچھ نئے سوالات اس کے ذہن میں اٹھے تھے اور وہ ان کے جوابات کے لیے شاہین کی واپسی کا منتظر تھا۔ وہ تقریباً بیس منٹ بعد آئی۔ اس نے ایک ٹرے اٹھا رکھی تھی جس پر بڑے سائز کا بھاپ اڑاتا باؤل تھا۔ اس نے ٹرے بستر کے کنارے پر رکھی اور تہ کیا ہوا نیپکن اٹھا کر اس کے گلے سے باندھا۔ ''سجاد! اٹھ جاؤ، لیٹ کر پینا مشکل ہوگا۔''
وہ اٹھ بیٹھا۔ باؤل میں سبزیوں اور گوشت کے ریشوں پر مشتمل سوپ تھا۔ اس سے اشتہا انگیز مہک اٹھ رہی تھی۔ شاہین نے ٹرے آگے کی مگر اس نے کہا۔ ''میں خود لوں گا۔''
شاہین نے ٹرے اس کے پاس کر دی اور وہ مخصوص

چمچ سے سوپ پینے لگا۔ چند چمچ لینے کے بعد اسے لگا کہ واقعی کئی دن بعد اس کے پیٹ میں کچھ گیا تھا کیونکہ اندر سے آنتوں نے جیسے انگڑائی لی تھی۔ نصف باؤل خالی کرنے کے بعد اس نے شاہین سے سوال کیا۔ ''میں کس کمرے میں ہوں؟ یہ ہمارا کمرا تو نہیں لگ رہا ہے؟''

''یہ ہمارے بیڈروم کے برابر والا کمرا ہے۔''

''اپنے کمرے میں کیوں نہیں رکھا؟''

''تمہارے پاؤں کے خیال سے، سونے کے دوران میں غلطی سے اسے کوئی نقصان نہ ہو۔''

''ہمارا گھر کہاں ہے؟''

''دارالحکومت سے کوئی دس کلومیٹرز دور ہے۔ یہ تمہاری آبائی کوٹھی ہے۔ تم یہیں پیدا ہوئے اور پلے بڑھے ہو۔ میں تم سے شادی کے بعد یہاں آئی تھی۔''

''کیا یہ جگہ ویرانے میں ہے؟'' سجاد نے باہر گھنے درخت کے اوپری حصے کی طرف دیکھا۔ ''میں نے اب تک کوئی آواز نہیں سنی، سوائے پرندوں کی آواز کے۔''

''نہیں لیکن آس پاس ساری بڑی کوٹھیاں ہیں اور ان کے درمیان بھی فاصلہ ہے اس لیے یہاں آوازیں نہیں آتیں۔ کسی زمانے میں یہ تفریحی مقام تھا مگر اب سڑک کے بائی وے بننے اور دارالحکومت کی آبادی نزدیک آنے سے بہت سے لوگوں نے یہاں باقاعدہ رہائش اختیار کر لی ہے۔ پہلے یہاں صرف بجلی اور فون تھا، اب گیس بھی آگئی ہے۔ موبائل سگنل بھی آگئے ہیں۔''

سجاد نے سوپ ختم کر دیا تھا۔ شاہین نے نیپکن سے اس کے ہونٹ صاف کیے اور مزید کا پوچھا مگر اس نے انکار کر دیا۔ ''چائے مل سکتی ہے؟''

''کیوں نہیں تم چائے شوق سے پیتے ہو اس لیے تم نے چائے کا ہی کہا۔'' وہ خوش ہو کر بولی۔ ''میں ابھی بنا کر لاتی ہوں۔ تمہیں میرے ہاتھ کی چائے بہت پسند ہے۔''

وہ ٹرے لے کر جانے لگی تو سجاد نے عقب سے کہا۔ ''اگر کوئی چھوٹا آئینہ ہے تو وہ بھی لے آنا۔''

شاہین ایک لمحے کو رکی پھر سر ہلاتی ہوئی چلی گئی۔ سجاد سوچ رہا تھا کہ اب بھی کئی سوالات تھے مگر ظاہر ہے وہ ایک دم سے سارے سوالات نہیں کر سکتا تھا۔ اسے رہ رہ کر جھلکیوں میں نظر آنے والی بچی کا خیال آرہا تھا۔ وہ شادی شدہ تھے تو ان کی بچی بھی ہو سکتی تھی لیکن شاہین نے کسی بچی کا ذکر نہیں کیا تھا۔ اگر ان کی بچی حادثے میں زخمی ہوئی ہوتی تو وہ لازمی اس کا ذکر کرتی۔ جب شاہین نے کار حادثے کا ذکر کیا تو اس کے ذہن میں آیا کہ جھلک والی بچی بھی حادثے کے وقت کار میں موجود تھی۔ وہ سوچ رہا تھا کہ بچی ٹھیک بھی ہے یا نہیں۔ دس منٹ بعد شاہین چائے کی ٹرے اور ایک ہینڈی مرر لے کر آئی۔ اس نے ٹرے بستر پر رکھی اور آئینہ سجاد کی طرف بڑھا دیا۔ اس نے آئینہ لے کر خود کو دیکھا۔ آئی ڈی کارڈ اور ڈرائیونگ لائسنس پر اسی کی تصویر تھی۔ وہ کھڑے نقوش اور کسی قدر لمبے چہرے والا آدمی تھا۔ اسے خوب صورت نہیں کہا جا سکتا تھا لیکن وہ جاذب نظر ضرور تھا مگر فی الحال اس کا چہرہ ستا ہوا تھا۔ شاہین غور سے اسے دیکھ رہی تھی۔

''کیا تمہیں کچھ بھی یاد نہیں ہے؟''

اس سوال پر سجاد نے ذہن پر زور دیا تو اسے پھر جھلکیاں سی نظر آئیں۔ اس کے چہرے پر تیز دھوپ پڑ رہی تھی اور نزدیک ہی کوئی بھونرا بھن بھن کر رہا تھا۔ اسے نباتات اور پھولوں کی ملی جلی خوشبو آرہی تھی۔ اس نے دھندلائی نظروں سے دیکھا۔ وہ کار کی سیٹ پر لٹکا ہوا تھا اور کار کے بونٹ سے بھاپ کے بادل اٹھ رہے تھے۔ اس نے کار کی عقبی نشست پر دیکھا تو وہ اسے خالی نظر آئی۔ اس کے برابر والی سیٹ جہاں شاہین کو موجود ہونا چاہیے تھا، وہ بھی خالی تھی۔ اسے لگا کہ اس کے ماتھے سے کوئی چیز بہہ رہی ہے اور اس نے ہاتھ لگا کر دیکھا تو وہ خون تھا۔ اس کے ساتھ ہی جھلک ختم ہو گئی اور اس کی الجھن مزید بڑھ گئی۔ اس نے اچانک ہی پوچھا۔ ''ہماری بچی کیسی ہے؟''

شاہین حیران نظر آئی۔ ''بچی...... ؟ ہماری کوئی بچی نہیں ہے۔ تمہیں یہ خیال کیوں آیا؟''

''پتا نہیں مجھے لگا جیسے ہماری کوئی بچی بھی ہے۔'' وہ اپنا ماتھا سہلاتے ہوئے بولا۔ اگر ان کی کوئی بچی نہیں تھی تو اسے جھلکیوں میں بچی کیوں دکھائی دے رہی تھی؟

شاہین نے اس کے ہاتھ پر ہاتھ رکھا۔ ''پلیز! تم سوچو مت، سب ٹھیک ہو جائے گا۔ اپنے ذہن پر زیادہ زور مت ڈالو۔''

اس نے گہری سانس لی۔ ''میں سوچنا نہیں چاہتا، سوچیں خود بہ خود ذہن میں آتی ہیں۔''

''چائے لو اور مجھ سے بات کرو۔'' شاہین نے نفیس قسم کا مگ اس کی طرف بڑھا دیا۔ ''اس سے سوچیں تمہیں پریشان نہیں کریں گی۔''

''کیا بات کروں جبکہ میں اپنے ماضی کے بارے میں کچھ نہیں جانتا۔'' اس نے مگ لے لیا۔ ''ہم یہاں اکیلے

رہتے ہیں لیکن ہمارے رشتے دار تو ہوں گے؟''
''دور پرے کے ہیں جن سے اب ہم کوئی تعلق نہیں رکھتے۔'' شاہین نے کہا۔'' حلقۂ احباب بھی محدود ہے۔''
''میں کام کیا کرتا ہوں؟ میرا مطلب ہے میرا ذریعۂ معاش کیا ہے؟''
اس سے پہلے کہ شاہین کچھ کہتی، نیچے سے کال بیل کی آواز آئی اور اس نے اٹھ کر کھڑکی سے باہر دیکھا۔ پھر اس کی طرف آئی اور اپنا مگ ٹرے میں رکھتے ہوئے بولی۔''مکینک کار لے آیا ہے۔ میں ذرا اس سے نمٹ کر آتی ہوں۔''
اس کے جاتے ہی سجاد نے اپنا مگ بھی ٹرے میں رکھا اور ٹرے کھسکا کر بستر کے دائیں طرف اتر آیا۔ اس نے زمین پر پاؤں رکھا تو اس کا خیال تھا کہ اسے مشکل پیش آئے گی لیکن خلافِ توقع اس کا پاؤں آسانی سے فرش پر ٹک گیا اور درد کی کوئی لہر نہیں اٹھی۔ احتیاطاً اس نے اس پر زور دینے کے بجائے اپنے دائیں پاؤں کے سہارے اچھل کر کھڑکی کی طرف بڑھنا شروع کیا۔ وہ کھڑکی تک پہنچا اور اس نے نیچے جھانکا۔ پورچ سے نیچے ڈھلان کی صورت میں راستہ گیٹ تک جا رہا تھا اور اس کے دائیں بائیں خوب صورت باغ تھا جس میں پھولوں کے تختے تھے اور مختلف اقسام کے درخت لگے ہوئے تھے۔ دائیں بائیں موجود باغ اور چار دیواری سے لگ رہا تھا کہ کوٹھی زیادہ بڑی نہیں ہے شاید ڈیڑھ یا دو کنال پر تھی۔ یہاں سے پہاڑی علاقے کے مخصوص بلند قامت درخت دکھائی دے رہے تھے۔ شاہین گیٹ کی طرف جا رہی تھی۔ اس نے گیٹ کھولا اور کسی سے بات کرنے لگی۔ یہاں سے سجاد کو صرف ایک نیلی سی جھلک دکھائی دے رہی تھی۔ وہ اندر نہیں آیا تھا۔
پھر شاہین نے دروازہ بند کر دیا اور واپس آنے لگی۔ گاڑی نہیں آئی تھی۔ تو کیا آنے والا مکینک نہیں تھا؟ اس نے سوچا اور تیزی سے بستر کی طرف واپس آیا۔ بڑی مشکل سے اس نے اپنا پاؤں اوپر رکھا اور بستر کی سمت جانے والے چادر ٹھیک کرنے لگا۔ اس کوشش میں ٹرے یوں سرکی کہ چائے چھلک گئی۔ اس نے جلدی سے ٹرے اپنی جگہ کی اور اپنا مگ اٹھا کر بڑے بڑے گھونٹ لینے لگا۔ تاکہ شاہین سمجھے کہ وہ چائے پی رہا تھا۔ جب وہ کمرے میں آئی تو سجاد نے مگ تقریباً خالی کر دیا تھا۔ وہ اس کی طرف آتے ہوئے کہنے لگی۔''مکینک آیا تھا بتانے کہ کار آج نہیں ملے گی، کل تک آئے گی۔''
''اتنی سی بات بتانے وہ خود چلا آیا؟'' سجاد نے حیرت سے کہا۔
''ہاں، وہ یہاں سے زیادہ دور نہیں ہے۔ ذرا نیچے مین ہائی وے پر اس کی ورکشاپ ہے۔'' کہتے ہوئے شاہین کی نظر ٹرے میں گری چائے پر گئی۔''اوہ...... یہ کیسے گر گئی، شاید جاتے ہوئے میں مگ بے احتیاطی سے رکھ گئی تھی۔''
سجاد نے سکون کا سانس لیا کہ اسے کوئی وضاحت نہیں کرنی پڑی۔ اس نے کہا۔''یہاں کوٹھی میں اور کوئی نہیں ہے؟''
''نہیں، ہم ہمیشہ سے اکیلے رہے ہیں۔''
''میرا مطلب ہے کوئی ملازم نہیں ہے؟''
''کچھ عرصے پہلے شیر گل اور اس کی بیوی یہاں ملازم تھے پھر وہ ملازمت چھوڑ کر چلے گئے، تب سے ہمیں ڈھنگ کے ملازم نہیں ملے۔ شیر گل چوکیدار تھا اور اس کی بیوی راجی اندر کے کام کرتی تھی۔''
''کھانا؟''
''کھانا تو ہمیشہ سے میں ہی بناتی ہوں۔'' اس نے جواب دیا۔''سچی بات ہے کہ میں عادی ہو گئی ہوں۔ ملازموں کے بغیر کوئی مشکل نہیں ہوتی۔ یہاں کوئی کام بڑھانے والا نہیں ہے اور اس علاقے میں دھول مٹی ہوتی نہیں ہے۔ ہفتے میں ایک بار ویکیوم کلینر سے آرام سے پوری کوٹھی کی صفائی کر لیتی ہوں۔ روز چھوٹے چھوٹے کام نمٹا لیتی ہوں اس سے وقت بھی اچھا گزر جاتا ہے۔'' سجاد لیٹ گیا۔ وہ کسی قدر تھکن محسوس کر رہا تھا۔ ذرا سی حرکت نے اس کی توانائی نچوڑ لی تھی اور اب اسے پتا چلا کہ وہ سچ مچ کمزور اور بیمار ہے۔ اس کی آنکھیں بند ہو رہی تھیں۔ شاہین نے اسے غور سے دیکھا اور بولی۔''میرا خیال ہے تمہیں اب آرام کرنا چاہیے۔''
اس نے سر ہلایا۔ شاہین نے پردے برابر کر دیے اور ٹرے اٹھا کر کمرے سے نکل گئی۔ اس کے جانے کے بعد سجاد کس وقت سویا، اسے پتا نہیں چلا۔
☆☆☆
بچی دوڑتی ہوئی روش پر اس کی طرف آ رہی تھی۔ اس نے گڑیا تھام رکھی تھی اور اس کے کسی قدر بڑے اور کھلے ہوئے بال ہوا میں لہرا رہے تھے۔ فراک میں وہ بہت پیاری لگ رہی تھی۔ اس کی عمر پانچ چھ سال سے زیادہ نہیں تھی۔ پھر منظر بدلا وہ کار ڈرائیو کر رہا تھا۔ اس کے برابر میں شاہین بیٹھی ہوئی تھی اور عقب میں بچی سیٹ سے ٹیک لگائے سو رہی

تھی۔ وہ وقفے وقفے سے پلٹ کر اسے دیکھ رہا تھا۔ ایک بار اس نے اسے کسمساتے دیکھا۔ پھر بچی نے آنکھ کھولی اور اچانک سامنے دیکھتے ہوئے چلائی۔ ''ڈیڈی۔''

اسی لمحے اسے احساس ہوا کہ سامنے کوئی گاڑی آرہی تھی اور اس نے بے ساختہ اسٹیئرنگ کاٹا تھا۔ کار سڑک سے اتر کر کچے میں آ گئی' اس نے بریک لگائے مگر سامنے سے ایک درخت جیسے ان کی طرف جھپٹا۔ اس نے بچانے کی کوشش کی مگر تصادم ناگزیر تھا۔ ایک دھماکا ہوا اور ہر طرف تاریکی پھیل گئی۔ پھر تیز روشنی منہ پر پڑی تو اس نے کسمسا کر آنکھیں کھولیں۔ کار خالی تھی اور بونٹ سے بھاپ کے بادل اٹھ رہے تھے پھر اس نے دور سے کسی کو آتے دیکھا۔

☆☆☆

اس کی آنکھ کھلی تو باہر تاریکی تھی اور کمرے میں ایک لائٹ روشن تھی جس کی روشنی بہت تیز نہیں تھی۔ اس بار اس کے جسم پر ہلکا کمبل تھا۔ موسم زیادہ سرد نہیں تھا مگر رات کے وقت خاصی سردی ہو جاتی تھی پھر کل کی نسبت زیادہ سرد ہوا تھی تبھی شاہین نے اسے یہ ہلکا کمبل اوڑھا دیا تھا۔ اسے لگا کہ خواب میں تصادم کے جھٹکے نے اسے بیدار کیا تھا مگر جاگنے کے بعد اسے اپنے مثانے میں دباؤ محسوس ہو رہا تھا۔ وہ سوچ رہا تھا کہ اب کیا کرے اور کہاں جائے؟ اسے تو واش روم کا بھی علم نہیں تھا۔ وہ اٹھا تو اسے سرہانے ایک گھنٹی اور اس کے تلے ایک کاغذ دکھائی دیا۔ اس نے گھنٹی اٹھائی تو وہ ہلکی سی بجی اس نے کاغذ دیکھا۔ اس پر ایک سطر میں لکھا تھا۔ ''کوئی بھی ضرورت ہو تو گھنٹی بجا دینا میں آ جاؤں گی۔''

اس نے کاغذ اور اس پر گھنٹی احتیاط سے رکھ دی۔ اس نے کمبل ہٹا کر پاؤں بیڈ سے نیچے قالین پر رکھا اور کھڑا ہو گیا۔ وہ سوچ رہا تھا کہ اگر سہارے کے لیے کوئی چھڑی ہوتی تو اس کے لیے آسانی ہو جاتی۔ بہر حال اسے ایک تجربہ ہو چکا تھا۔ وہ اسی طرح ایک پاؤں پر اچھلتا ہوا دروازے تک آیا اور ہینڈل گھمایا۔ اس نے دروازے سے باہر جھانکا تو اسے بائیں طرف ایک اور کمرے کا دروازہ دکھائی دیا۔ اس سے آگے شاید واش روم تھا۔ دائیں طرف ایک لاؤنج تھا۔ اس سے آگے شیشے کی دیوار کے سائز کے سلائیڈر تھے۔ اس کے بعد ٹیرس تھا جو یقیناً پورچ کے اوپر تھا۔ لاؤنج کے آغاز میں سیڑھیاں نیچے جا رہی تھیں۔ وہ باہر نکل کر ریلنگ تک آیا اور اس نے نیچے جھانکا۔ سیڑھیاں دائرے میں گھومتی ہوئی نیچے جا رہی تھیں۔ اوپری فلور زیادہ بڑا نہیں تھا۔ یہاں بس یہی کچھ تھا۔ یہاں قالین نہیں تھا اور پلاسٹر والا پاؤں نیچے لگتا تو آواز پیدا ہوتی اور وہ آواز نہیں چاہتا تھا۔

وہ ریلنگ تھام کر اس دروازے تک آیا جو اس کے خیال میں واش روم کا تھا اور اس کا خیال درست ثابت ہوا۔ یہ جدید وضع کا مکمل سہولتوں سے آراستہ واش روم تھا۔ یہاں شاور کے ساتھ ایک بڑا سا باتھ ٹب بھی تھا۔ فارغ ہو کر اس نے واش بیسن کے بڑے سے آئینے میں خود کو دیکھا۔ ماتھے کی پٹی شاید اس کی نیند کے دوران بدلی گئی تھی کیونکہ وہ بالکل تازہ لگ رہی تھی۔ اس نے نل کھولا تو اس سے گرم پانی آ رہا تھا۔ اس نے ماتھے کی پٹی بچاتے ہوئے منہ دھویا تو اسے تازگی محسوس ہوئی۔ اس نے منہ دھو کر آئینے میں دیکھا اور خود سے کہا۔ ''تم کون ہو؟''

ہوش میں آنے کے بعد جو حالات سامنے آئے تھے، وہ اگرچہ بہ ظاہر معمول کے مطابق تھے لیکن اسے لگ رہا تھا کہ پس پردہ کوئی گڑبڑ ہے۔ آخر اسے جھلکیوں میں ایک بچی کیوں دکھائی دے رہی تھی' شاہین کا کہنا تھا کہ ان کی کوئی بچی نہیں تھی اور یہاں سے معاملہ مشکوک ہو رہا تھا۔ وہ بچی سے انکار کیوں کر رہی تھی اگر جھلکیوں میں نظر آنے والی بچی حقیقی نہیں تھی تو اس کا مطلب تھا کہ حادثے نے اسے دماغی لحاظ سے بھی متاثر کیا ہے۔ مگر اس کے اندر سے کوئی کہہ رہا تھا کہ ایسا نہیں ہے...... اگر اس کا دماغ متاثر ہوا ہوتا تو وہ اس طرح نہیں سوچ رہا ہوتا۔ اسے خیال آیا کہ وہ نیچے جا کر دیکھے۔ اس نے اب تک اس کوٹھی کا جتنا حصہ بھی دیکھا تھا، اس کی یادداشت میں کوئی ہلچل نہیں مچی تھی۔ یہاں اسے کچھ بھی مانوس نہیں لگ رہا تھا۔ اسے شاہین جھلکیوں میں ضرور دکھائی دیتی تھی لیکن جب وہ اسے حقیقت میں دیکھتا تو وہ اسے اجنبی لگتی تھی۔ وہ جتنا سوچ رہا تھا، اتنا ہی الجھ رہا تھا۔ سردی کا احساس ہوا تو وہ واش روم سے باہر آیا اور سامنے کھڑی شاہین کو دیکھ کر چونکا۔ وہ نائٹی میں تھی اور سردی سے بچنے کے لیے اس نے شال لی ہوئی تھی۔

''مجھے کیوں نہیں جگایا؟''

''میں نے سوچا، تم تھکی ہوئی سو رہی ہو گی۔'' سجاد نے بہانہ کیا ورنہ اسے قطعی خیال نہیں آیا تھا۔ وہ آگے بڑھا تو شاہین اس کے پلاسٹر والے پاؤں کی طرف آ گئی اور اس کا بازو اپنے شانے پر رکھ کر اسے سہارا دینے لگی۔ اس کی گداز قربت سنسنی بن کر سجاد کے جسم میں دوڑنے لگی۔ وہ اسے بستر تک لائی اور لٹا کر اسے کمبل اوڑھا دیا۔ یہ کام اس نے بہت آسانی سے کیا تھا جیسے اس کی مشق ہو۔ کمبل درست

کر کے وہ جانے لگی تو سجاد نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا۔ اس نے مڑ کر دیکھا اور مسکرا دی پھر جھک کر بولی۔

''میں نے کہا نا کہ ابھی تمہاری حالت اس قابل نہیں ہے۔''

''اچھا کچھ دیر کے لیے میرے پاس تو آسکتی ہو؟''

''آ تو سکتی ہوں۔'' اس نے بوجھل لہجے میں کہا۔ ''مگر ہم دونوں ہی پیاسے رہ جائیں گے۔ بہتر ہوگا صبر کر کے سو جائیں۔ بس کچھ دن کی بات ہے۔''

سجاد نے ٹھنڈی سانس لے کر سر ہلایا۔ ''ٹھیک ہے، ویسے وقت کیا ہوا ہے۔ یہاں کوئی گھڑی نہیں ہے اور ہاں میرے پاس موبائل بھی ہوگا؟''

''گھڑی اس کمرے میں نہیں ہے اور تمہارا موبائل حادثے میں ضائع ہو گیا تھا جیسے ہی گاڑی آئے گی، میں شہر جا کر تمہارے لیے دوسرا موبائل لے آؤں گی۔''

''میں نے وقت پوچھا ہے؟''

''صبح کے چار بج رہے ہیں۔''

''زیادہ وقت نہیں رہا ہے، یہیں لیٹ جاؤ۔'' اس بار سجاد نے دوسرے انداز میں کہا تو وہ مان گئی اور اس کے کمبل میں آگئی۔ اس نے شال اتار دی تھی اور سجاد نے دیکھا کہ نائٹی بہت باریک سے کپڑے کی تھی جس سے جسم جھلک رہا تھا۔ وہ ایک بار پھر اپنی قسمت پر اس حوالے سے رشک کیے بغیر نہ رہ سکا۔ مگر اب اس کا موڈ بدل گیا تھا اس لیے شاہین کی قربت بھی اس پر زیادہ اثر انداز نہیں ہوئی تھی۔ شاہین نے پوچھا۔

''کیا سوچ رہے ہو؟''

''میں سوچ رہا ہوں کہ حادثہ کیسے پیش آیا؟''

''تمہاری توجہ ایک لمحے کے لیے سڑک سے ہٹی تھی اور سامنے سے ایک گاڑی آئی۔ اسے بچانے کے لیے تم نے اسٹیئرنگ گھمایا تو کار سڑک سے اتر گئی اور بے قابو ہو کر ایک درخت سے ٹکرا گئی۔ خوش قسمتی سے اس وقت رفتار زیادہ نہیں تھی۔ لیکن تم نے سیٹ بیلٹ نہیں باندھی ہوئی تھی اور تمہارا سر اسٹیئرنگ سے ٹکرا گیا۔''

''سر کی چوٹ سمجھ میں آتی ہے لیکن پاؤں میں فریکچر کیسے ہوا؟''

''یہ تو ڈاکٹر کی سمجھ میں بھی نہیں آیا مگر جب اسپتال میں تمہارا معائنہ ہوا تو پنڈلی میں فریکچر نکلا۔ اس کے علاوہ تمہیں کوئی اور چوٹ نہیں آئی۔''

سجاد نے اسے دیکھا۔ ''تم محفوظ رہیں؟''

''ہاں، میں نے سیٹ بیلٹ باندھی ہوئی تھی۔''

سجاد بچی کے بارے میں پوچھتے پوچھتے رہ گیا اور اسے یاد آیا کہ شاہین کسی بچی کے وجود سے انکار کر چکی ہے۔ اس کے بجائے اس نے پوچھا۔ ''گاڑی کا کیا نقصان ہوا؟''

''اس کا ریڈی ایٹر اور سامنے کی لائٹس ٹوٹی تھیں لیکن بونٹ بچ گیا ورنہ ڈینٹ پینٹ کی وجہ سے لمبا کام ہو جاتا۔ چند خراشیں آئی ہیں جو اسپرے کلر سے غائب ہو جائیں گی۔''

''تم مجھے اسپتال تک کیسے لے گئی تھیں؟''

''جس گاڑی سے بچتے ہوئے حادثہ ہوا تھا، اس کے شریف ڈرائیور نے تمہیں اسپتال تک پہنچایا۔ ورنہ میں بہت مشکل میں پڑ جاتی۔ جب تمہاری طرف سے اطمینان ہوا تو میں نے مکینک کو کال کر کے گاڑی لے جانے کو کہا۔''

''مجھے یہاں کیسے لائیں؟''

''ظاہر ہے ایمبولینس میں، دو عدد اٹینڈنٹ کے ساتھ لائی ورنہ میرے لیے تو تمہیں گھر لانا بھی مشکل ہو جاتا۔ وہی تمہیں یہاں تک پہنچا کر گئے۔''

''کیا مجھے ڈاکٹر کو نہیں دکھانا ہوگا؟''

''نہیں، اس نے کہا ہے کہ اگر کوئی تکلیف نہ ہو تو تمہیں ایک مہینے بعد اس کے پاس لے کر آؤں۔ یہاں نزدیک ہی ایمبولینس سروس ہے۔ میں ایک کال کروں گی تو ایمبولینس آجائے گی مگر اب اس کی ضرورت بھی نہیں پڑے گی۔ ڈاکٹر نے دوائیں دی ہیں جو مزید دو دن کھانی ہیں اس کے بعد دوا کی ضرورت بھی نہیں رہے گی۔''

''تم نے مجھے دوا نہیں دی؟''

''پین کلر انجکشن کی صورت میں ہے اور باقی دوائیں تمہیں ڈرپ میں دی تھیں۔ ان کا اثر اب تک ہوگا۔ صبح سے ٹیبلٹس کی صورت میں دوا دینی ہے۔''

سجاد سوچ رہا تھا کہ یہ کون سا ڈاکٹر تھا جس نے پہلے ہی پیش گوئی کر دی تھی کہ اس کی یادداشت کھو سکتی ہے اور پھر اسے ہوش میں آنے سے پہلے گھر لانے کی اجازت بھی دے دی۔ اس نے کہا۔ ''تم انجکشن لگا سکتی ہو؟''

''ہاں، میں تربیت یافتہ نرس ہوں۔'' شاہین نے کہا۔ ''تم بھول چکے ہو ورنہ تم سے شادی سے پہلے میں ایک نجی اسپتال میں کام کرتی تھی۔''

''جب مکینک آیا تو میں نے تم سے ایک سوال کیا تھا؟''

''کام کے بارے میں؟'' شاہین بولی۔ ''تمہیں کام کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ تم جدی پشتی دولت مند ہو۔ شہر میں تمہاری کئی عمارتیں ہیں اور ان کے کرائے سے ہمارا

گزارہ بہت آرام سے ہوتا ہے۔''

''یعنی ہم دولت مند ہیں؟''

''ہاں، تمہاری سالانہ آمدنی کروڑوں میں ہے۔''

''مجھے یہ جگہ اجنبی سی لگ رہی ہے۔ آخر ہم یہاں کیوں رہتے ہیں جبکہ شہر میں رہ سکتے ہیں؟''

شاہین نے حیرت سے اس کی طرف دیکھا۔ ''تم نے خود یہاں رہنے کا فیصلہ کیا تھا اور اب تم کہہ رہے ہو کہ ہمیں شہر میں رہنا چاہیے۔''

''پتا نہیں کیا چکر ہے۔'' سجاد نے اپنے بالوں میں ہاتھ پھیرا۔ ''مجھے کچھ یاد نہیں آرہا ہے۔''

شاہین اٹھی، اس نے سجاد کے سینے پر ہاتھ رکھا۔ ''فکر مت کرو، تمہیں سب یاد آجائے گا۔ ڈاکٹر نے کہا ہے کہ رفتہ رفتہ تم ٹھیک ہو جاؤ گے۔''

سجاد چونکا۔ ''ڈاکٹر......؟ اس سے کب بات ہوئی؟''

''تمہارے سونے کے بعد میں نے اسے کال کر کے بتایا تھا۔ اس کا کہنا ہے کہ علامات اچھی ہیں اور شاید پاؤں ٹھیک ہونے سے پہلے تمہاری یادداشت بحال ہو جائے۔''

سجاد نے سر ہلایا۔ ''میں نے نیچے پاؤں رکھا تو کوئی تکلیف محسوس نہیں ہوئی۔''

''ابھی تم دواؤں کے زیر اثر ہو مگر اب ایسی غلطی مت کرنا۔ میں نے گھنٹی کس لیے رکھی تھی۔''

''میں نے تمہیں ڈسٹرب کرنا مناسب نہیں سمجھا۔''

''لیکن اب ایسی غلطی مت کرنا۔'' شاہین کہتے ہوئے اٹھ گئی۔ ''تم بھوک محسوس کر رہے ہو؟''

سجاد واقعی بھوک محسوس کر رہا تھا۔ اس نے سوپ لیا تھا جو زود ہضم بھی ہوتا ہے اس لیے اسے لگ رہا تھا جیسے اس نے دو وقت سے کچھ نہ کھایا ہو۔ شاہین نے شال اوڑھی اور باہر جاتے ہوئے بولی۔ ''تم ایک گھنٹا آرام کر لو۔ میں کھانا بنا کر تمہیں واش روم لے جاؤں گی۔''

''فی الحال ضرورت نہیں ہے۔''

''میں منہ ہاتھ دھونے کے لیے کہہ رہی ہوں، تم نے کئی دن سے برش نہیں کیا ہے۔''

شاہین کے جانے کے بعد اس نے آئینہ اٹھا کر دیکھا۔ اس کی آنکھوں کے نیچے حلقے سے تھے۔ اس کے دانت میلے ہو رہے تھے اور ہونٹوں سے لگ رہا تھا کہ وہ شاید سگریٹ نوشی کا عادی تھا مگر اسے ابھی تک طلب نہیں ہوئی۔ شاید دوسری چیزوں کی طرح وہ تمباکو کی طلب بھی بھول گیا تھا۔ آئینہ گھماتے ہوئے اسے دائیں کنپٹی پر ہلکا سا نیلا نشان نظر آیا۔ شاید یہاں بھی چوٹ لگی تھی مگر اسے درد کا احساس نہیں تھا۔ ایک گھنٹے بعد شاہین آئی اور اسے سہارا دے کر واش روم تک لے گئی۔ اس نے برش کیا اور شاہین اسے پھر سہارا دے کر لاؤنج میں لائی۔ وہاں ایک چھوٹی سی میز تھی۔ اسے کرسی پر بٹھاتے ہوئے شاہین نے اس کی پلاستر والی ٹانگ دوسری کرسی پر رکھی اور بولی۔ ''میں ناشتا یہیں لے آتی ہوں۔''

باہر صبح نمودار ہو چکی تھی لیکن اس وقت دھند تھی اور شاید آسمان پر بادل بھی تھے۔ شیشوں کے سلائیڈرز کے آگے پردے تھے مگر اس وقت سمٹے ہوئے تھے۔ ٹیرس زیادہ بڑا نہیں تھا۔ وہاں گملوں میں کچھ پودے تھے اور دو عدد لیدر کاؤچ رکھے ہوئے۔ کچھ دیر بعد شاہین ناشتے کی ٹرے لے آئی۔ اس میں ابلے ہوئے اور تلے ہوئے انڈے تھے۔ سینکے ہوئے توس تھے اور بنی کیک کے ٹکڑے تھے۔ انہوں نے ساتھ ہی ناشتا کیا۔ شاہین نے ناشتے کے دوران میں اسے بتایا کہ وہ روشنی ہونے پر نیچے جائے گی اور کار کا معائنہ کر کے آئے گی۔ ہوسکتا ہے کہ کار ٹھیک ہو گئی ہو تو وہ وہیں سے شہر جائے گی اور کچھ ضروری سامان لائے گی۔ سجاد نے سر ہلایا۔ ''لیکن جلدی آجانا۔ اگر کوئی آگیا یا کوئی مسئلہ ہوا تو میں کیسے ہینڈل کروں گا۔''

''تم فکر مت کرو۔'' شاہین نے برتن سمیٹ کر ٹرے میں رکھتے ہوئے کہا۔ ''میں دو ڈھائی گھنٹے سے زیادہ نہیں لگاؤں گی۔ ویسے بھی واپس آکر مجھے لنچ تیار کرنا ہوگا۔''

وہ کافی بنا کر لائی تھی۔ کافی کے بعد اس نے سجاد کو کھانے کے لیے چند گولیاں دیں۔ یہ کھلی ہوئی تھیں اور پتا نہیں چل رہا تھا کہ کون سی گولی کس لیے ہے۔ اس نے پوچھا تو شاہین نے سرسری سے انداز میں جواب دیا۔ ''یہ پین کلرز اور اینٹی بایوٹک ہیں۔''

سجاد کچھ دیر گولیوں کو دیکھتا رہا پھر اس نے انہیں پانی کی مدد سے حلق سے اتار لیا۔ شاہین نے اس سے گلاس لیا۔ ''چلو، میں تمہیں بستر پر لٹا دوں۔''

''میں سوچ رہا ہوں کہ باہر ٹیرس پر رہوں۔ وہاں کاؤچ ہیں۔''

شاہین نے نفی میں سر ہلایا۔ ''موسم اچھا نہیں ہے اور بارش کی پیش گوئی ہے۔ اس لیے بہتر ہوگا کہ تم اندر لیٹ جاؤ اور اگر تم بستر پر لیٹنا نہیں چاہ رہے ہو تو یہاں صوفے پر لیٹ جاؤ۔''

اس نے سر ہلایا۔ ''ہاں، یہ ٹھیک ہے۔''

شاہین نے اسے صوفے پر بٹھایا۔ وہ اس کا تکیہ اور

کمبل بھی لے آئی تھی۔ ''اگر نیند آئے تو سو جانا۔''
بچ بچ اسے کچھ دیر بعد نیند آنے لگی۔ وہ صوفے پر لیٹا اور پھر اسے خبر نہیں ہوئی کہ وہ کب سو گیا۔ اس کی آنکھ کھلی تو باہر دن چڑھ کر ڈھلنا شروع ہو گیا تھا۔ اس نے کمبل نہیں اوڑھا تھا لیکن اس وقت اس کے اوپر کمبل تھا۔ یقیناً شاہین واپس آگئی تھی مگر وہاں سناٹا تھا۔ وہ اٹھ بیٹھا۔ اس کا سر بھاری ہو رہا تھا اور اب جسم میں سکون والی کیفیت نہیں تھی۔ ایک بے چینی سی تھی جیسے جسم ٹوٹ رہا ہو جیسے آدمی کچی نیند سے بیدار ہونے کے بعد محسوس کرتا ہے حالانکہ وہ تقریباً چھ یا ساڑھے چھ گھنٹے سویا تھا۔ وہ اٹھا اور صوفے کا سہارا لے کر شیشے کے سلائیڈر تک آیا اور اسے سرکایا۔ تقریباً ایک انچ موٹے شیشے کا سلائیڈر بہت وزنی تھا مگر یہ المونیم کے جس سلائیڈز پر فکس تھا، وہ بہت اعلیٰ درجے کے تھے۔ پٹ آرام سے اور بے آواز کھسک گیا۔ باہر سے تیز ٹھنڈی ہوا کا جھونکا آیا۔ سورج نکل آیا تھا مگر ہوا کی تندی اور خنکی میں فرق نہیں آیا تھا۔ باہر درختوں سے گرنے والے پتے اڑ رہے تھے اور خزاں کی آمد کی اطلاع دے رہے تھے۔ اس نے کاؤچ کا سہارا لیا اور ٹیرس کی ریلنگ تک آیا۔ اس نے نیچے جھانکا تو اسے میرون رنگ کی بڑی کار دکھائی دی۔ کار دیکھتے ہوئے اس کے ذہن میں جھماکا سا ہوا۔
وہ کار کی سیٹ سے ٹیک لگائے نیم بے ہوش تھا اور اس کے منہ پر تیز روشنی پڑ رہی تھی۔ کار کے بونٹ سے بھاپ کے بادل اٹھ رہے تھے اور کار خالی تھی۔ اس کے سوا کوئی نہیں تھا۔ اس کے ماتھے سے خون بہہ رہا تھا اور اس نے بہ مشکل سر اٹھایا تو اسے سامنے سے کوئی آتا دکھائی دیا۔ جب وہ نزدیک آیا تو شاہین ثابت ہوئی۔ اس کے ہاتھ میں کچھ تھا مگر سجاد دیکھ نہیں سکا۔ اسی لمحے کسی نے اس کے شانے پر ہاتھ رکھا اور وہ چونک کر حقیقت کی دنیا میں آگیا۔ یہ شاہین تھی جس نے اسے تھام رکھا تھا اور پھر اسے کاؤچ تک لائی اور احتیاط سے بٹھا دیا۔ شاہین کا رنگ سفید ہو رہا تھا۔ اس نے کہا۔ ''میرے خدا! تم خودکشی کرنے والے تھے۔ جب میں نے تمہیں پکڑا تو تم گرنے والے تھے۔''
''پتا نہیں، میں نے نیچے جھانکا تو مجھے لگا جیسے میرا ذہن تاریک ہو گیا ہو۔''
''تم یہاں کیوں آئے تھے اور اگر آنا تھا تو مجھ سے کہتے۔''
''میں سو گیا تھا۔'' سجاد نے کہا۔ ''حالانکہ میں سونا نہیں چاہتا تھا۔ کیا گولیوں میں نیند کی دوا بھی تھی؟''

شاہین چونکی پھر اس نے انکار کیا۔ ''نہیں...... یہ ساری اینٹی بایوٹک، پین کلر اور منرل و وٹامن والی گولیاں ہیں۔''
''تب مجھے اتنی نیند کیوں آ رہی ہے؟''
''شاید اس لیے کہ تم کمزور ہو۔''
سجاد نے سر ہلایا۔ ''مجھے واش روم جانا ہے۔''
شاہین اسے واش روم تک لائی۔ جب تک وہ فارغ ہوا شاہین باہر انتظار کرتی رہی پھر اسے کمرے میں لے آئی۔ سجاد نے پوچھا۔ ''مجھے نیچے کیوں نہیں رکھا؟''
''نیچے صرف ایک گیسٹ روم ہے اور وہاں میں نہیں سو سکتی تھی اس لیے تمہیں اوپر لے آئی۔ یہاں ہمارا بیڈ روم بھی ہے، تم آواز بھی دو تو میں سن لوں گی۔''
''مجھے بھوک لگ رہی ہے۔''
''میں نے لنچ بنا لیا ہے۔ میں نے کھا لیا تھا، تمہارے لیے لاتی ہوں۔''
شاہین نے بھنا ہوا مٹن بنایا تھا جس کے ساتھ روغنی نان تھے، یہ تیار مل جاتے ہیں بس گرم کرنا پڑتا ہے۔ کھانا لذیذ تھا اور اس نے رغبت سے کھایا۔ کھانے کے بعد شاہین اس کے اور اپنے لیے چائے بنا کر لے آئی۔ سجاد نے پوچھا۔ ''گاڑی مل گئی؟''
''ہاں، میں نیچے گئی تو گاڑی کا کچھ کام باقی تھا۔ میں نے مکینک سے کہا کہ وہ تیار کرے تب تک میں نے یہاں موجود چھوٹی سی مارکیٹ سے خریداری کی اور گاڑی لے کر واپس آگئی۔''
''شہر جانے کا پروگرام؟''
''وہ فی الحال ملتوی کر دیا، مجھے تمہارا خیال تھا۔ میں سوچ رہی ہوں کہ اب ہو آؤں۔''
''کیا لینا ہے؟''
''چھوٹی موٹی چیزیں ہیں۔ کھانے کا سامان ختم ہو رہا ہے، وہ لاؤں گی۔ یہاں بھی یہ چیزیں مل جاتی ہیں مگر فریش نہیں ہوتیں۔''
چائے پی کر شاہین روانگی کے لیے تیار ہو گئی۔ سجاد نے اپنے کمرے کا دروازہ بند کرنے سے منع کر دیا تھا۔ شاہین جانے سے پہلے اپنے کمرے میں گئی اور وہاں سے نکل کر سیڑھیوں پر جانے لگی تو سجاد نے محسوس کیا کہ اس نے اپنے جسم کی اوٹ میں کچھ چھپا رکھا تھا۔ جیسے ہی وہ سیڑھی سے اتری، سجاد اٹھ کر ہر ممکن تیزی سے کھڑکی تک پہنچا اور اس نے پردہ ہٹا کر نیچے جھانکا۔ کچھ دیر بعد شاہین نمودار ہوئی اور اس نے کوئی چیز کار کے اندر ڈالی۔ سجاد ایک جھلک

دیکھ سکا تھا۔ اسے لگا کہ وہ گڑیا جیسی کوئی چیز تھی مگر وہ یقین سے نہیں کہہ سکتا تھا کہ اس نے جو دیکھا تھا، وہ کوئی گڑیا ہی تھی۔ وہ کپڑا بھی ہوسکتا تھا یا کوئی اور چیز۔ شاہین ڈرائیونگ سیٹ پر بیٹھی اور جیسے ہی کار دروازے کے پاس پہنچی وہ خود بہ خود کھلنے لگا۔ گویا یہ ریموٹ کی مدد سے کھلنے والا آٹومیٹک دروازہ تھا۔

سوال یہ تھا کہ جب آٹومیٹک دروازہ موجود تھا تو کسی کو چوکیدار رکھنے کی کیا ضرورت تھی؟ کار کے نکلتے ہی گیٹ خودکار انداز میں بند ہوگیا۔ گیٹ سلاخوں والا تھا لیکن یہ سلاخیں ایسی نہیں تھیں کہ کوئی ان پر چڑھ کر اندر آسکتا۔ اسی طرح جہاں جہاں چاردیواری نظر آرہی تھی، اس کی دس فٹ کی بلندی کے بعد تین فٹ تک اسٹیل کی خاردار باڑھ لگی تھی۔ کسی چور کے لیے کوٹھی میں گھسنا آسان نہیں تھا۔ شاید یہاں الارم بھی تھے جو کسی مداخلت کار کے گھستے ہی بج اٹھتے۔ سجاد چند لمحے کھڑکی کے ساتھ لگا کھڑا رہا۔ پھر وہ دیوار کا سہارا لیتا ہوا کمرے سے باہر آیا اور چند لمحے ہچکچانے کے بعد وہ نیچے اترنے لگا۔ خلافِ توقع اس کے لیے یہ کام مشکل ثابت نہیں ہوا۔ وہ ریلنگ کا سہارا لیتا ہوئے آسانی سے نیچے آگیا۔ سیڑھی ایک وسیع لاؤنج میں اتر رہی تھی جس میں ایک بڑی ڈائننگ ٹیبل بھی تھی۔

اس کے ساتھ ہی کچن تھا۔ وہ کچن میں آیا مگر وہاں کچھ نہیں تھا، سوائے سنک میں پڑے چند گندے برتنوں کے۔ باقی تمام چیزیں بڑے سائز کے الماری نما فریج اور کپ بورڈز میں تھیں۔ اس نے نشست گاہ اور گیسٹ روم میں بھی جھانکا مگر اسے کوئی ایسی چیز نظر نہیں آئی جو خلافِ معمول ہوتی۔ یہاں ایک چھوٹی سی اسٹڈی بھی تھی مگر اس کی حالت سے لگ رہا تھا کہ اسے شاذ ہی استعمال کیا جاتا ہوگا۔ یہاں صفائی تو تھی مگر چیزیں مہینوں سے نہیں چھیڑی گئی تھیں۔ اس نے وہاں رکھی میز کی درازوں کو دیکھنا چاہا مگر وہ لاک نکلیں اور ان کی چابیاں نہ جانے کہاں تھیں۔ اسے خیال آیا کہ وہ نیچے آگیا ہے اور اسے اصل میں اپنا اور شاہین کا بیڈ روم دیکھنا چاہیے تھا۔ یہ خیال آتے ہی وہ واپس پلٹا۔ سیڑھی کی طرف جاتے ہوئے اس کی نظر سیڑھی تلے ایک دروازے پر گئی۔ شاید یہ چھوٹا سا اسٹور روم تھا جو عام طور سے سیڑھیوں کے نیچے موجود خلا میں بنالیا جاتا ہے۔ مگر اس وقت اس نے اس پر توجہ نہیں دی تھی۔

اسی لمحے اسے چکر سا آیا اور ذہن پر دھند طاری ہونے لگی۔ اس نے سر جھٹکا مگر اسے لگا کہ غنودگی کی لہر ہر گزرتے لمحے کے ساتھ طاقتور ہوتی جارہی ہے۔ وہ کچھ دیر پہلے تو سوکر اٹھا تھا پھر ایسی غنودگی کیوں؟ اچانک اسے خیال آیا کہ شاہین نے اسے چائے میں کچھ دیا ہے۔ اسے یاد آیا کہ جب وہ پہلی بار دو دن تک سونے کے بعد بیدار ہوا تب بھی چائے پینے کے کچھ دیر بعد ہی اسے نیند آگئی تھی پھر شاہین نے اسے نیند کی دوا دی اور وہ سوگیا۔ اب ایسے پھر نیند آرہی تھی۔ شاہین اسے سلائے رکھنا چاہتی تھی مگر کیوں؟ اب اس کی تکلیف ایسی بھی نہیں تھی بلکہ سرے سے تکلیف ہی نہیں تھی کہ اسے بچانے کے لیے سلایا جاتا۔ نہیں...... اس کے پسِ پشت کوئی اور چکر تھا۔ اب اسے فکر تھی کہ وہ غنودگی حاوی ہونے سے پہلے اوپر پہنچ جائے۔ وہ شاہین کو بے خبر رکھنا چاہتا تھا کہ وہ نیچے تک آیا تھا۔

اس حالت میں اوپر جانا مشکل ثابت ہوا کیونکہ اس کی ٹانگ ڈنڈے کی طرح سیدھی تھی اور اگر وہ اسے کسی طرح اٹھا کر سیڑھی پر رکھ بھی لیتا تو اوپر چڑھتے ہوئے سارا زور اس پر آجاتا۔ دوسرے اس کا توازن بگڑتا تو وہ پیچھے گر سکتا تھا۔ اس لیے اس نے آسان طریقہ اختیار کیا اور بیٹھ کر یوں اوپر چڑھنے لگا کہ دایاں پاؤں استعمال کررہا تھا اور پلاستر والا پاؤں خود ہی سیڑھی پر سرکتا ہوا آرہا تھا۔ ایک ہاتھ سے ریلنگ اور دوسرے سے سیڑھی پر زور دیتا ہوا وہ کسی قدر مشکل سے اوپر پہنچ گیا۔ جب اس نے کھڑے ہونے کی کوشش تو اس کے چکر شدید ہوگئے۔ اس مشقت نے اس کا سانس پھلا دیا تھا مگر وہ سانس درست کرنے کے لیے رک نہیں سکتا تھا اس لیے اسی طرح بیٹھ کر سرکتا ہوا کمرے میں آیا اور بہ مشکل بستر پر چڑھ کر جو لیٹا تو پھر اسے ہوش نہیں رہا۔

جب وہ جاگا تو رات ہوچکی تھی اور وہ بیڈ پر سیدھا لیٹا ہوا تھا اور اس کے اوپر کمبل تھا۔ جاگنے کے بعد اسے شاہین پر شدت سے غصہ آنے لگا کہ وہ اس کے ساتھ کس قسم کا کھیل کھیل رہی تھی اگر اس کی یادداشت گم ہوئی تھی تو اس کا مطلب یہ نہیں تھا کہ اسے یوں مسلسل سلائے رکھا جائے۔ وہ اٹھ بیٹھا اور اس نے اپنا بایاں پلاسترزدہ پاؤں الگ سے ہلا کر دیکھا۔ وہ اسے اوپر نیچے کررہا تھا مگر اس سے زیادہ حرکت نہیں دے سکتا تھا کیونکہ اس کا گھٹنا اور ٹخنا پلاستر میں جکڑا ہوا تھا اور وہ اسے معمولی سی جنبش بھی نہیں دے سکتا تھا۔ مگر پورے وزن سے ٹانگ اوپر نیچے کرنے سے اسے نہ تو کوئی مشکل پیش آئی اور نہ ہی تکلیف ہوئی تھی۔ اگر اسے مسکن دوا دی گئی تھی تو اس کا اثر یقیناً اب تک ختم ہوگیا تھا۔

اس کے باوجود وہ ہڈی ٹوٹنے کی تکلیف محسوس نہیں کر رہا تھا۔ حادثے کو ساڑھے چار دن ہو گئے تھے اور ہڈی اتنی جلدی نہیں جڑتی ہے۔ اس نے اپنے ماتھے سے چپکی ہوئی پٹی اتاری اور آئینے میں زخم دیکھا تو وہ تقریباً بھر گیا تھا اور کھرنڈ پختہ ہو رہا تھا۔ دروازہ بند تھا، وہ کھلا اور شاہین نے اندر جھانکا۔

”تم جاگ گئے ہو؟“

”ہاں۔“ اس نے سرد لہجے میں کہا۔ ”حالانکہ تم پوری کوشش کر رہی ہو کہ میں سوتا رہوں۔“

شاہین اندر آئی اور گہری سانس لی۔ ”تو تم جان گئے ہو۔“

”میں بچہ نہیں ہوں۔ تم مجھے خواب آور دوا دیتی رہی ہو؟“

”ہاں میں تمہیں دوا کے ساتھ چائے میں بھی نیند کی دوا دیتی رہی ہوں۔“

”لیکن کیوں؟“

”تمہاری صحت کے لیے ضروری ہے۔ تمہاری ذہنی کیفیت ایسی ہے کہ اگر تم جاگتے رہو گے تو الجھو گے اور اگر کوئی غلط حرکت کی تو تمہارا زخم خراب ہو سکتا ہے۔“

”میں نہ تو بچہ ہوں اور نہ ہی نا سمجھ جو اپنا نقصان کروں۔“

”ہاں مگر تمہاری یادداشت تو غائب ہے۔ کسی آدمی کے لیے اس سے زیادہ الجھن کی بات کیا ہو سکتی ہے کہ اسے اپنے بارے میں کچھ یاد نہ ہو۔“

شاہین کی اس دلیل کا کوئی جواب نہیں تھا۔ وہ جھنجلاہٹ محسوس کرنے لگا۔ ”مگر مجھے اس طرح سلائے رکھنا؟“

شاہین اس کے برابر بیٹھ گئی اور اس کے ہاتھ پر ہاتھ رکھا۔ ”پلیز! مجھ پر اعتماد کرو۔ میں تمہاری بیوی ہوں تمہاری ہمدرد ہوں۔ کیا میری خدمت میں کوئی کمی ہے، میرے کسی عمل سے تمہیں لگا کہ میں تمہیں نقصان پہنچانا چاہ رہی ہوں؟ ہاں نیند کی دوا دی ہے کہ تم جتنا آرام کرو گے، ہڈی اتنی جلدی جڑ جائے گی۔“

سجاد نے اپنے پلاسٹر زدہ پاؤں کی طرف دیکھا۔ ”میری ہڈی ٹوٹی ہوئی ہے اور مسکن دوا کا اثر بھی یقیناً ختم ہو چکا ہے لیکن میں ذرا بھی تکلیف محسوس نہیں کر رہا ہوں۔“

”اس کی وجہ ہے ہڈی ٹھیک سے جڑی ہے اور اگر ہڈی ٹھیک سے جڑی ہو تو تین دن میں درد ختم ہو جاتا ہے۔ تمہیں کل صبح تک پانچ دن ہو جائیں گے اس لیے اب درد نہیں ہو رہا ہے۔ مسکن دوا کا اثر ختم ہو گیا ہے لیکن تمہیں پین کلر تو دے رہی ہوں۔ صبح دی تھی اب پھر دوں گی۔ بس آج کی دوا اور ہے، کل سے اس کی ضرورت بھی نہیں رہے گی۔ دو دن تم اینٹی بایوٹک لو گے اور مزید دس دن تک منرل اور وٹامن لو گے۔“

سجاد کا غصہ اور جھنجلاہٹ شاہین کی قربت اور اس کے حلاوت آمیز لہجے نے ختم کر دی تھی۔ رہی سہی کسر شاہین نے اس کے شانے پر سر رکھ کر پوری کر دی اور بے ساختہ اس کے ہاتھ شاہین کے وجود کے گرد لپٹ گئے۔ اس نے آہستہ سے کہا۔ ”آئی ایم سوری، واقعی اس کیفیت نے مجھے جذباتی اور مضطرب کر دیا ہے۔“

”تم جتنا آرام کرو گے اور ذہن پر زور دینے سے گریز کرو گے، اتنی جلدی ٹھیک ہو جاؤ گے۔“

”یہ ڈاکٹر نے کہا ہے؟“

”ہاں اور اگر وہ نہ بھی کہتا تو میں نرس ہوں اور ایسے کئی کیسز دیکھ چکی ہوں۔ مجھے معلوم ہے کہ اس کیفیت میں آدمی کیا محسوس کرتا ہے اور اسے کس طرح ٹریٹ کرنا چاہیے۔“

سجاد نے سوچتے ہوئے کہا۔ ”او کے اب میں جذباتی نہیں ہوں گا مگر تم مجھے نیند کی دوا نہیں دو گی۔“

”منظور ہے لیکن تم بھی بلا ضرورت چلنے اور پاؤں پر زور دینے سے گریز کرو گے۔“

”ٹھیک ہے۔“

شاہین نے خوش ہو کر اس کا رخسار چوما اور بولی۔ ”میں تمہارے لیے کھانا لاتی ہوں۔“

کھانے میں اس بار چکن کارن سوپ تھا جس میں چکن کے ریشے اور پانی میں توڑ کر ابالے ہوئے انڈے کی مقدار زیادہ تھی۔ اس کے بعد شاہین نے اسے نارنگی کاٹ کر دی۔ ”یہ تم شوق سے کھاتے ہو۔“

”تم سامان لے آئیں؟“

”ہاں تمہارے لیے موبائل بھی لائی ہوں لیکن سم نہیں لا سکی اس کے لیے تمہارا فرنچائز جانا ضروری ہے۔ جب میں پلاسٹر کٹوانے لے جاؤں گی، تب تم اپنی سم بھی نکلوا لینا۔“

رات کے بارہ بج رہے تھے۔ سجاد زیادہ ہی آرام کر چکا تھا اور اب اس کا سونے کا موڈ نہیں تھا۔ شاہین اسے لاؤنج میں لے آئی اور ٹی وی آن کر دیا۔ یہ بڑے سائز کا ایل ای ڈی ٹی وی تھا۔ یہاں کیبل سسٹم نہیں تھا مگر کوٹھی میں سیٹلائٹ ٹی وی سسٹم تھا جو ڈھائی سو سے زیادہ چینل دکھاتا تھا۔ شاہین نے کمبل اور تکیہ بھی وہیں صوفے کے پاس رکھ دیا اور گھنٹی بھی لے آئی۔ ”میں تھک گئی ہوں اور سونے جا رہی ہوں لیکن تمہیں کوئی ضرورت ہو تو بیل بجا دینا۔“

”تم بہت زیادہ ذمے داریاں پوری کر رہی ہو۔“

''ہاں، مجبوری ہے اور حالات بھی ایسے ہیں۔ تم ٹھیک ہو جاؤ گے تو سب معمول پر آجائے گا۔ پھر میں خوب آرام کروں گی۔''

سجاد نے اس کے جانے کے بعد ٹی وی آن کر لیا اور چینل گھما کر دیکھنے لگا۔ ایک چینل سے انگریزی مووی آرہی تھی، وہ اسے دیکھنے لگا۔ وہ انگریزی جس طرح سمجھ رہا تھا، اس سے اسے لگا کہ وہ تعلیم یافتہ ہے۔ اس نے شاہین سے اس بارے میں نہیں پوچھا تھا یا پھر اوپری طبقے کا فرد ہونے کی وجہ سے اس کی انگریزی اچھی تھی۔ چار بجے تک وہ... ٹی وی میں لگا رہا پھر اسے جمائیاں آنے لگیں تو وہ لیٹ گیا۔ نیند تو نہیں آئی مگر وہ اونگھتا رہا اور صبح کی روشنی ہونے کے بعد اس کی آنکھ لگی۔ جب وہ جاگا تو باہر روشنی پھیل چکی تھی اور شاہین سامنے چھوٹے صوفے پر بیٹھی ہوئی ایک فیشن میگزین دیکھ رہی تھی۔ سجاد نے انگڑائی لی اور وال کلاک کی طرف دیکھا جس میں دس بج کر بائیس منٹ ہو رہے تھے۔ وہ چار گھنٹے سویا تھا۔ شاہین نے ناشتے کا پوچھا تو اس نے کہا۔

''بہت زور کی بھوک لگی ہے۔''

''پہلے واش روم سے فارغ ہو جاؤ۔''

اسے واش روم سے لانے کے بعد شاہین نیچے چلی گئی۔ اگرچہ شاہین نے اسے تقریباً قائل کر لیا تھا کہ وہ اس کے خیال سے اسے نیند کی دوا دے رہی تھی اس کے باوجود اس کی پوری طرح تسلی نہیں ہوئی تھی۔ اس کے جاتے ہی وہ اپنے اور شاہین کے بیڈروم کی طرف بڑھا۔ اس نے کوشش کی کہ فرش پر پلاستر کے ٹکرانے سے آواز پیدا نہ ہو مگر جب اس نے لٹو گھمایا تو وہ لاک نکلا۔ یک دم ہی اس کے اندر دب جانے والے شکوک پھر سے سر اٹھا کر کھڑے ہو گئے۔ شاہین نے بیڈروم کیوں لاک کیا تھا؟ جبکہ وہ ان کا مشترکہ بیڈروم تھا اگر وہ الگ رہتی تھی تب بھی اسے لاک کرنے کا کوئی جواز نہیں بنتا تھا۔ وہ واپس آیا اور اپنی جگہ بیٹھ گیا۔ شاہین اس سے کچھ چھپا رہی تھی مگر وہ اس سے کیا چھپا رہی تھی، وہ اب تک سمجھ نہیں پایا تھا۔ وہ سچ مچ سجاد تھا لیکن شاہین کیا واقعی شاہین اور اس کی بیوی تھی؟

وہ بچی کے بارے میں سوچنے لگا۔ پہلے وہ اسے ذہن کی پراگندگی سمجھ رہا تھا جو جھلکیوں کی صورت میں سامنے آرہی تھی مگر اب اس کا خیال پھر بدل گیا تھا۔ کیا شاہین اس سے بچی کے بارے میں چھپا رہی تھی؟ اس کا خیال اس چیز کی طرف بھی گیا جو شاہین اپنے ساتھ گاڑی میں لے گئی تھی۔ اس نے سوچا کہ اب وہ باہر گئی تو وہ بیڈروم کی تلاشی لینے کی کوشش کرے گا چاہے اس کے لیے اسے اس کا لاک کیوں نہ توڑنا پڑے۔ مگر وہ کمزور لاک نہیں تھا، اسے خالی ہاتھوں سے توڑنا ممکن نہیں تھا۔ پھر اسے دوسری ترکیب سوجھی۔ وہ شاہین سے کہتا کہ اسے بیڈروم میں لے چلے۔ وہاں جانا اس کا حق تھا، وہ انکار نہیں کر سکتی تھی۔ وہ نیچے سے ناشتا لائی تب تک سجاد خود کو نارمل کر چکا تھا۔ شاہین نے ٹرے میز پر رکھی۔ اس میں وہی انڈوں، توس اور ہنی کیک پر مشتمل ناشتا تھا۔ چائے یا کافی وہ ناشتے کے بعد لاتی۔ سجاد نے سرسری سے انداز میں کہا۔ ''میں اپنا بیڈروم دیکھنا چاہتا ہوں۔''

شاہین نے چونک کر اسے دیکھا اور بولی۔ ''کیوں نہیں۔''

اس نے ناشتا کیا تو اس دوران میں شاہین بیڈروم کی طرف گئی اور اس نے اتنی خاموشی سے دروازے کا لاک کھولا کہ سجاد کو ذرا بھی آواز نہیں آئی مگر وہ جانتا تھا کہ اس نے لاک کھولا ہے۔ وہ کچھ دیر اندر رہی پھر باہر آئی تو سجاد نے ناشتا کر لیا تھا۔ وہ ٹرے لے کر نیچے چلی گئی۔ آج اس نے سجاد کے لیے جو چائے بنائی تھی اس میں کچھ ملایا نہیں تھا۔ چائے نوشی کے بعد وہ اسے سہارا دے کر بیڈروم میں لائی۔ یہ اعلیٰ درجے کے فرنیچر سے سجا ہوا تھا اور ہر چیز بہت خوب صورت اور چنی ہوئی تھی۔ ڈبل بیڈ کنگ سائز تھا۔ شاہین نے اسے بیڈ پر بٹھا دیا۔ سجاد نے کہا۔ ''خاصا بڑا ہے، ہم دونوں آرام سے سو سکتے ہیں۔''

شاہین ہچکچائی پھر اس نے کہا۔ ''اگر تم یہاں سونا چاہتے ہو تو مجھے کوئی اعتراض نہیں ہے۔ میں سوتے میں کروٹیں بہت لیتی ہوں بس اس سے ڈر لگتا ہے کہ تمہارے پاؤں پر نہ چڑھ جاؤں۔''

سجاد نے چند لمحے سوچا اور پھر کہا۔ ''نہیں، میرے خیال میں وہی کمرا ٹھیک ہے۔ دس دن کی بات ہے پھر میں یہیں آجاؤں گا۔''

''آج میں واپس آکر تمہارا جسم صاف کروں گی۔'' شاہین نے کہا۔ ''تم روز نہانے والے آدمی ہو اور آج تمہیں نہائے ہوئے پانچ دن سے زیادہ ہو گئے ہیں۔''

''تم کہاں جاؤ گی؟''

''تمہاری منزل اور وٹامن والی دوا لینا بھول گئی تھی۔''

''میرے خیال میں اتنی ضروری نہیں ہے۔''

''ضروری ہے۔ پھر تمہارے لیے اسنک بھی لینی ہے۔'' شاہین نے کہا۔ اس نے سجاد کو دوائیں دیں۔ اس نے دیکھا کہ دوائیں وہیں رکھی تھیں۔ شاہین تیار ہونے لگی۔ اس نے الماری سے لباس نکالا اور باہر جانے لگی تو سجاد نے

آہستہ سے کہا۔

"نہیں چینج کرلو، باہر جانے کی کیا ضرورت ہے۔ اگر تم میری وجہ سے جارہی ہو تو میں رخ دوسری طرف کرلیتا ہوں۔"

شاہین نے سر ہلایا تو سجاد نے رخ پھیر لیا۔ لباس بدل کر شاہین نے کہا۔ "آؤ، میں تمہیں بیڈ تک پہنچادوں۔"

اگرچہ سجاد خود جاسکتا تھا مگر اس نے ایسا کرنا مناسب نہیں سمجھا اور شاہین اسے سہارا دے کر اس کے کمرے میں لائی۔ آج سردی زیادہ تھی اس لیے اس نے کھڑکی کے پٹ بند رکھے البتہ پردے ہٹا دیے تھے۔ آج اس نے سادہ شلوار سوٹ پر لانگ کوٹ لیا تھا۔ یہاں یقیناً خاصی سردی تھی مگر نیچے شہر میں موسم ابھی نارمل تھا۔ وہ ہاتھ ہلاتی ہوئی رخصت ہوئی تو سجاد کار کے اسٹارٹ ہونے کا انتظار کرتا رہا اور جیسے ہی آواز آئی' وہ بستر سے اٹھ کر کھڑکی تک آیا۔ اس نے دیکھا کار گیٹ سے نکل رہی تھی اور اس کے نکلنے کے بعد گیٹ بند ہوگیا تھا۔ گھر میں کوئی نہیں تھا اس لیے وہ بے فکری سے پلاستر والا پاؤں فرش پر ٹیکتا ہوا باہر آیا۔ اس نے بیڈروم کا دروازہ چیک کیا۔ اس بار وہ کھلا ہوا تھا۔ اس نے سب سے پہلے درازوں کی تلاشی لی۔ اس کے خیال میں اندر ایسی کوئی چیز ہوئی جو شاہین پر روشنی ڈالے مگر وہاں ایسی کوئی چیز نہیں تھی۔

اسے تعجب ہوا کہ وہاں اس کی اور شاہین کی کوئی تصویر بھی نہیں تھی۔ حالانکہ شادی شدہ جوڑے کی کوئی نہ کوئی تصویر فریم میں ہونی چاہیے تھی۔ بیڈ کی سائڈ دراز اور ڈریسنگ ٹیبل کی درازوں کو کھنگالنے کے بعد وہ الماری تک آیا مگر اس کے دروازے لاک تھے۔ شاہین نے چالاکی سے کام لیا تھا، اس نے بیڈروم کا دروازہ کھلا چھوڑ دیا لیکن الماری کے دروازے لاک کر دیے تھے۔ یہ کوئی غیر معمولی بات بھی نہیں تھی۔ لوگ اپنی الماریوں کو عموماً لاک ہی رکھتے ہیں۔ شاہین اس سے کچھ چھپا رہی تھی تو وہ کیسے معلوم کرسکتا تھا۔ اس نے اوپر نیچے پورا گھر ہی دیکھ لیا تھا۔ مگر اسے بچی کے حوالے سے کوئی چیز نظر نہیں آئی تھی۔ تو کیا شاہین ٹھیک کہہ رہی تھی، ان کی کوئی بچی نہیں تھی؟ تب اسے جھلکیوں میں وہ بچی رہ رہ کر کیوں دکھائی دے رہی تھی اگرچہ حادثے کے بعد والی جھلک میں بچی نہیں تھی مگر اسے شاہین دکھائی دی تھی اور اسے یقین تھا کہ حادثے کے وقت بچی کار میں موجود تھی۔

معاً اسے سیڑھیوں کے نیچے اسٹور روم کا خیال آیا۔ شاید وہاں ایسا کچھ ہو جو صورت حال پر روشنی ڈال سکے۔ وہ سیڑھیوں سے نیچے آیا مگر وہاں موجود دروازے کو کھولنے سے پہلے وہ کوٹھی کے داخلی دروازے تک آیا۔ وہاں ایک شوکیس کے اوپر کی ہولڈر لگا ہوا تھا اور اس میں چابیوں کا بڑا سا گچھا تھا۔ یہ یقیناً پورے گھر کی چابیاں تھیں۔ ان میں داخلی دروازے کی چابی بھی تھی۔ شاہین باہر گئی تھی تو یقیناً اس کے پاس اضافی چابی ہو گی۔ وہ سیڑھیوں کے نیچے دروازے تک آیا اور اس کی توقع کے عین مطابق وہ لاک نکلا۔ جب اس نے گچھے میں موجود چابیاں اس پر آزمائیں تو ان میں سے کوئی چابی اس میں نہیں لگی۔ گچھے میں تمام چابیوں کے دو دو سیٹ تھے، صرف دو چابیاں واحد تھیں۔ ان میں سے ایک داخلی دروازے کی تھی، دوسری اس کے خیال میں بیڈروم کی تھی۔

تصدیق کے لیے وہ گچھا لے کر اوپر آیا اور بیڈروم کے لاک پر دوسری چابی لگا کر چیک کی تو وہ اسی کی نکلی۔ اس گچھے میں پورے گھر کے ہر دروازے کی چابی تھی۔ نہیں تھی تو سیڑھیوں کے نیچے والے دروازے کی نہیں تھی اور اس سے یہ معاملہ نہایت پراسرار ہوگیا تھا۔ گچھا واپس کی ہولڈر پر رکھنے کے لیے اسے نیچے جانا پڑا اور جب وہ واپس آیا تو اس کا سانس پھولا ہوا تھا۔ وہ باہر ٹیرس پر نکل آیا اور نباتات کی خوشبو لیے صاف شفاف ہوا میں گہرے سانس لینے لگا۔ یہ جگہ پہاڑوں میں تھی مگر شاید سطح سمندر سے بہت اونچی نہیں تھی کیونکہ ہوا ہلکی نہیں تھی اور اس میں سانس لینا آسان لگ رہا تھا۔ وہ کاؤچ پر لیٹ کر ستانے اور دھوپ سے محظوظ ہونے لگا مگر ساتھ ہی اس کی سوچوں میں اضطراب کی لہر بھی جاری تھی۔ اگر شاہین اس سے کچھ چھپا رہی تھی یا اس کے ساتھ کسی قسم کا کھیل کھیل رہی تھی تو وہ کیا کرتا؟

اسے اپنے بارے میں کچھ یاد نہیں تھا اور وہ ذہن پر زور دینے لگا۔ وہ کار کی جھلک کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ اچانک ہی جھماکا سا ہوا اور اسے وہی منظر دکھائی دیا کہ وہ ڈرائیو کر رہا ہے۔ شاہین اس کے برابر میں بیٹھی ہے اور عقب میں بچی سو رہی تھی۔ پھر وہ بیدار ہوئی اور سامنے کی طرف دیکھتے ہوئے چلائی۔ "ڈیڈی۔" اسی لمحے اسے بھی سامنے حرکت کا احساس ہوا اور اس نے پوری قوت سے اسٹیئرنگ کاٹا۔ کار سڑک سے اتر گئی اور کچے میں اچھلتی کودتی بے قابو ہو کر درخت کی طرف بڑھی۔ سجاد نے براہِ راست تصادم سے بچنے کے لیے آخری لمحے میں اسٹیئرنگ کاٹا۔ اس کے باوجود کار درخت سے ٹکرا گئی تھی۔ ایک دھماکا ہوا اور کسی نے اسے جھنجوڑا۔ سجاد نے چونک کر دیکھا وہ شاہین تھی۔ وہ فکرمند تھی۔ "تم ٹھیک ہو نا؟ میرے خدا تم خواب میں کس طرح چلا رہے تھے۔"

سجاد کو پتا نہیں چلا کہ وہ کب آئی تھی۔ وہ سو گیا تھا اور

آہستہ سے کہا۔

''یہیں چینج کر لو، باہر جانے کی کیا ضرورت ہے۔ اگر تم میری وجہ سے جا رہی ہو تو میں رخ دوسری طرف کر لیتا ہوں۔''

شاہین نے سر ہلایا تو سجاد نے رخ پھیر لیا۔ لباس بدل کر شاہین نے کہا۔ ''آؤ، میں تمہیں بیڈ تک پہنچا دوں۔''

اگرچہ سجاد خود جا سکتا تھا مگر اس نے ایسا کرنا مناسب نہیں سمجھا اور شاہین اسے سہارا دے کر اس کے کمرے میں لائی۔ آج سردی زیادہ تھی اس لیے اس نے کھڑکی کے پٹ بند رکھے البتہ پردے ہٹا دیے تھے۔ آج اس نے سادہ شلوار سوٹ پر لانگ کوٹ لیا تھا۔ یہاں یقیناً خاصی سردی تھی مگر نیچے شہر میں موسم ابھی نارمل تھا۔ وہ ہاتھ ہلاتی ہوئی رخصت ہوئی تو سجاد کار کے اسٹارٹ ہونے کا انتظار کرتا رہا اور جیسے ہی آواز آئی وہ بستر سے اٹھ کر کھڑکی تک آیا۔ اس نے دیکھا کار گیٹ سے نکل رہی تھی اور اس کے نکلنے کے بعد گیٹ بند ہو گیا تھا۔ گھر میں کوئی نہیں تھا اس لیے وہ بے فکری سے پلاستر والا پاؤں فرش پر ٹیکتا ہوا باہر آیا۔ اس نے بیڈ روم کا دروازہ چیک کیا۔ اس بار وہ کھلا ہوا تھا۔ اس نے سب سے پہلے درازوں کی تلاشی لی۔ اس کے خیال میں اندر ایسی کوئی چیز ہوگی جو شاہین پر روشنی ڈالے مگر وہاں ایسی کوئی چیز نہیں تھی۔

اسے تعجب ہوا کہ وہاں اس کی اور شاہین کی کوئی تصویر بھی نہیں تھی۔ حالانکہ شادی شدہ جوڑے کی کوئی نہ کوئی تصویر فریم میں ہونی چاہیے تھی۔ بیڈ کی سائڈ دراز اور ڈریسنگ ٹیبل کی درازوں کو کھنگالنے کے بعد وہ الماری تک آیا مگر اس کے دروازے لاک تھے۔ شاہین نے چالاکی سے کام لیا تھا، اس نے بیڈ روم کا دروازہ کھلا چھوڑ دیا لیکن الماری کے دروازے لاک کر دیے تھے۔ یہ کوئی غیر معمولی بات بھی نہیں تھی۔ لوگ اپنی الماریوں کو عموماً لاک ہی رکھتے ہیں۔ شاہین اس سے کچھ چھپا رہی تھی تو وہ کیسے معلوم کر سکتا تھا۔ اس نے اوپر نیچے پورا گھر ہی دیکھ لیا تھا۔ مگر اسے بچی کے حوالے سے کوئی چیز نظر نہیں آئی تھی۔ تو کیا شاہین ٹھیک کہہ رہی تھی، ان کی کوئی بچی نہیں تھی؟ تب اسے جھلکیوں میں وہ بچی رہ رہ کر کیوں دکھائی دے رہی تھی اگرچہ حادثے کے بعد والی جھلک میں بچی نہیں تھی مگر اسے شاہین دکھائی دی تھی اور اسے یقین تھا کہ حادثے کے وقت بچی کار میں موجود تھی۔

معاً اسے سیڑھیوں کے نیچے اسٹور روم کا خیال آیا۔ شاید وہاں ایسا کچھ ہو جو صورتِ حال پر روشنی ڈال سکے۔ وہ سیڑھیوں سے نیچے آیا مگر وہاں موجود دروازے کو کھولنے سے پہلے وہ کوٹھی کے داخلی دروازے تک آیا۔ وہاں ایک شوکیس کے اوپر کی ہولڈر لگا ہوا تھا اور اس میں چابیوں کا بڑا سا گچھا تھا۔ یہ یقیناً پورے گھر کی چابیاں تھیں۔ ان میں داخلی دروازے کی چابی بھی تھی۔ شاہین باہر گئی تھی تو یقیناً اس کے پاس اضافی چابی ہو گی۔ وہ سیڑھیوں کے نیچے دروازے تک آیا اور اس کی توقع کے عین مطابق وہ لاک نکلا۔ جب اس نے گچھے میں موجود چابیاں اس پر آزمائیں تو ان میں سے کوئی چابی اس میں نہیں لگی۔ گچھے میں تمام چابیوں کے دو دو سیٹ تھے، صرف دو چابیاں واحد تھیں۔ ان میں سے ایک داخلی دروازے کی تھی، دوسری اس کے خیال میں بیڈ روم کی تھی۔

تصدیق کے لیے وہ گچھا لے کر اوپر آیا اور بیڈ روم کے لاک پر دوسری چابی لگا کر چیک کی تو وہ اسی کی نکلی۔ اس گچھے میں پورے گھر کے ہر دروازے کی چابی تھی۔ نہیں تھی تو سیڑھیوں کے نیچے والے دروازے کی نہیں تھی اور اس سے یہ معاملہ نہایت پراسرار ہو گیا تھا۔ گچھا واپس کی ہولڈر پر رکھنے کے لیے اسے نیچے جانا پڑا اور جب وہ واپس آیا تو اس کا سانس پھولا ہوا تھا۔ وہ باہر ٹیرس پر نکل آیا اور نباتات کی خوشبو لیے صاف شفاف ہوا میں گہرے سانس لینے لگا۔ یہ جگہ پہاڑوں میں تھی مگر شاید سطحِ سمندر سے بہت اونچی نہیں تھی کیونکہ ہوا ہلکی نہیں تھی اور اس میں سانس لینا آسان لگ رہا تھا۔ وہ کاؤچ پر لیٹ کر ستانے اور دھوپ سے محظوظ ہونے لگا مگر ساتھ ہی اس کی سوچوں میں اضطراب کی لہر بھی جاری تھی۔ اگر شاہین اس سے کچھ چھپا رہی تھی یا اس کے ساتھ کسی قسم کا کھیل کھیل رہی تھی تو وہ کیا کرتا؟

اسے اپنے بارے میں کچھ یاد نہیں تھا اور وہ ذہن پر زور دینے لگا۔ وہ کار کی جھلک کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ اچانک ہی جھماکا سا ہوا اور اسے وہی منظر دکھائی دیا کہ وہ ڈرائیو کر رہا ہے۔ شاہین اس کے برابر میں بیٹھی ہے اور عقب میں بچی سو رہی تھی۔ پھر وہ بیدار ہوئی اور سامنے کی طرف دیکھتے ہوئے چلائی۔ ''ڈیڈی۔'' اسی لمحے اسے بھی سامنے حرکت کا احساس ہوا اور اس نے پوری قوت سے اسٹیئرنگ کاٹا۔ کار سڑک سے اتر گئی اور کچے میں اچھلتی کودتی بے قابو ہو کر درخت کی طرف بڑھی۔ سجاد نے براہِ راست تصادم سے بچنے کے لیے آخری لمحے میں اسٹیئرنگ کاٹا۔ اس کے باوجود کار درخت سے ٹکرا گئی تھی۔ ایک دھماکا ہوا اور کسی نے اسے جھنجھوڑا۔ سجاد نے چونک کر دیکھا وہ شاہین تھی۔ وہ فکر مند تھی۔ ''تم ٹھیک ہو نا؟ میرے خدا تم خواب میں کس طرح چلا رہے تھے۔''

سجاد کو پتا نہیں چلا کہ وہ کب آئی تھی۔ وہ سو گیا تھا اور

خواب دیکھ رہا تھا۔ اس کا دل بہت تیزی سے دھڑک رہا تھا اور موسم کی خنکی کے باوجود اسے پسینا آیا ہوا تھا۔ وہ اٹھتے ہوئے بولا۔ ''ہاں میں خواب دیکھ رہا تھا۔ تم کب آئیں؟''

''ابھی آئی ہوں۔ کار سے اتری تو تمہاری ڈری ڈری آوازیں آرہی تھیں۔ میں دوڑتی ہوئی اوپر تک آئی ہوں۔ تم کمرے سے یہاں کیسے آئے؟''

سجاد نے گہرے سانس لیتے ہوئے کہا۔ ''اندر میرا دم گھٹ رہا تھا۔ میں دیواروں اور چیزوں کا سہارا لیتا ہوا باہر آگیا۔ یہاں لیٹا تو شاید نیند آگئی۔''

شاہین اس کے لیے پانی لے آئی۔ پانی پی کر اسے سکون ملا۔ سورج مغرب کی طرف جھک گیا تھا۔ ''تم نے دیر لگادی۔''

''ہاں، کام میں ذرا دیر ہوگئی۔ کار بھی مسئلہ کر رہی تھی اسے دکھاتی ہوئی آئی ہوں۔'' شاہین نے تھکے انداز میں کہا۔ ''میں نے وہیں سے پیزا لے کر لنچ کرلیا تھا۔ تمہارے لیے بھی لائی ہوں۔''

سجاد نے وہیں ٹیرس پر پیزا کھایا۔ یہ میڈیم لارج تھا جو اس کے لیے کافی ثابت ہوا۔ ساتھ میں کولڈ ڈرنک کا ٹن تھا۔ شاہین نے کہا۔ ''اندر چلو، یہاں سردی بڑھ رہی ہے۔''

وہ اندر لاؤنج میں آئے۔ سجاد نے ریموٹ اٹھا کر ٹی وی آن کیا۔ اس میں زیادہ تر غیر ملکی چینلز تھے اور چند ایک مقامی چینلز تھے ان میں کوئی بھی نیوز کا نہیں تھا۔ اس نے شاہین سے اس بارے میں پوچھا تو اس نے حیرت سے کہا۔ ''تمہیں نیوز چینل سے کب سے دلچسپی ہوگئی ہے؟''

''بس مجھے ابھی خیال آیا تھا۔''

''تم نیوز چینلز سے چڑتے ہو اور اسی لیے تم نے یہ پیکیج لیا تھا جس میں ایک بھی ملکی نیوز چینل نہیں ہے۔ ہاں انٹرنیشنل چینلز کئی ہیں۔'' شاہین نے کہا۔ ''میں نے کہا تھا کہ نیوز چینل ہونے چاہئیں۔ ہم شہر سے دور رہتے ہیں اور ہمیں حالات کی خبر ہونی چاہیے۔''

شاہین کا پرس اس کے پاس نہیں تھا۔ وہ شاید عجلت میں اوپر آئی تو پرس نیچے چھوڑ آئی تھی۔ اس نے سجاد سے چائے کا پوچھا۔ اس نے سر ہلایا۔ ''لیکن پہلے واش روم جاؤں گا۔''

''تب کیوں نہ تمہیں پہلے ٹب میں لٹا کر واش کردوں۔''

''یہ ٹانگ؟'' اس نے پلاستر کی طرف اشارہ کیا۔

''ٹب میں ہی تو یہ پانی سے محفوظ رہے گی۔''

واقعی ٹب میں وہ کپڑے اتار کر لیٹا اور اس نے اپنا پلاستر والا پاؤں اس کے کنارے رکھا تو یہ پانی کی پہنچ سے باہر تھا۔ شاہین نے پانی کھول دیا۔ وہ گرم اور ٹھنڈا مکس کرکے اس سے پوچھ رہی تھی۔ سجاد نے صرف نیکر پہن رکھی تھی۔ جب ٹب مناسب حد تک بھر گیا، اس نے اس میں لیکوئیڈ صابن و کلون ڈالا اور جھاگ بنانے لگی۔ پلاستر والا حصہ بچا کر وہ اسفنج سے اس کا جسم صاف کرنے لگی۔ وہ ٹب کے ساتھ ہی بیٹھی تھی۔ سجاد اس کے نرم و نازک ہاتھوں سے لطف اندوز ہو رہا تھا۔ اس نے پوچھا۔ ''ہماری اولاد کیوں نہیں ہے؟''

''کیونکہ ہم دونوں ہی اس کی ضرورت محسوس نہیں کرتے۔ یادداشت کھونے کے بعد تم میں بہت تبدیلی آئی ہے۔'' شاہین کا لہجہ تشویش ناک ہوگیا۔ ''تم ان چیزوں کے بارے میں بات کر رہے ہو جن سے تمہیں پہلے کبھی دلچسپی نہیں رہی تھی۔''

''اس تبدیلی سے تمہیں کوئی پریشانی ہو رہی ہے؟''

''نہیں، تم پہلے سے الٹ بات کر رہے ہو اس لیے فکر تو ہوگی۔''

اس کے سر کا زخم اس قابل تھا کہ وہ سر دھو سکتا تھا۔ شاہین نے اس کے بال دو بار شیمپو کیے۔ نہا دھو کر اور دوسرے کپڑے پہن کر اس نے خود کو تازہ دم محسوس کیا۔ شاہین اس کے لیے ایک ڈھیلا اور گرم ٹراؤزر لائی تھی جو پلاستر والے پاؤں پر بھی آرام سے آگیا تھا۔ اس کے ساتھ پوری آستین کی ہائی نیک ٹی شرٹ تھی۔ موسم کے لحاظ سے یہ مناسب لباس تھا۔ اس کے دوسرے پاؤں کے لیے شاہین نے سلیپر نکال دیا تھا۔ سجاد نے چائے کا منع کر دیا تھا۔ اس نے کہا کہ وہ ڈنر کے بعد لے گا۔ کوٹھی میں اسے کسی کمرے میں آتش دان نظر نہیں آئے تھے۔ شاید یہ سینٹرلی ہیٹڈ تھی کیونکہ دیواروں پر ہوائی خانوں کی جالی لگی تھی۔ ابھی موسم اتنا سرد نہیں ہوا تھا کہ گرمائش کرنے کی ضرورت پیش آتی۔ شاہین نے بتایا کہ وہ ڈنر کے لیے اس کی پسند کا افغانی پلاؤ بنانے جا رہی ہے وہ شہر سے اس کا سامان بھی لائی تھی۔

سجاد کو یاد نہیں تھا کہ اسے کھانے میں کیا کیا پسند تھا لیکن شاہین نے اب تک جو بھی بنایا تھا، وہ بہت مزے کا تھا۔ وہ لاؤنج میں بیٹھا ٹی وی دیکھ رہا تھا۔ شاہین نیچے کچن کی طرف چلی گئی۔ اس کے جانے کے کچھ دیر بعد وہ اٹھا اور بیڈ روم میں آیا۔ اسے شاہین کے بیگ کی تلاش تھی۔ بیگ ڈریسنگ ٹیبل پر رکھا ہوا تھا۔ اس نے بیگ کھول کر دیکھا اور اسے دو چابیاں الگ سے نظر آئیں۔ یہ یقیناً سیڑھیوں کے نیچے واقع اسٹور کی چابیاں تھیں۔ پہلے اس نے سوچا کہ انہیں نکال لے مگر پھر اس کی نظر دراز پر رکھی دواؤں پر گئی اور اس نے ارادہ ملتوی کر دیا۔

شاہین نے نو بجے تک ڈنر تیار کرلیا تھا۔ وہ پلاؤ کی ڈش اوپر لے آئی اور انہوں نے لاؤنج میں ڈنر کیا۔ ڈنر کے بعد سجاد نے

کہا۔ ”آج کافی کا موڈ ہو رہا ہے۔“

”کچھ دیر میں بناتی ہوں۔“ شاہین نے برتن اٹھاتے ہوئے کہا۔

”جلدی نہیں ہے اور تم بھی پیو گی، میں اکیلا نہیں پیوں گا۔“ سجاد نے صوفے پر نیم دراز ہوتے ہوئے کہا۔ پلاؤ مزے کا تھا اور وہ شکم سیر ہونے کے بعد ہلکی سی غنودگی محسوس کر رہا تھا۔ شاہین دس بجے کے قریب کافی لے آئی۔ وہ شکر اور کریم کے ساتھ تیار کافی لائی تھی۔ اسے علم تھا کہ وہ کیسی کافی پسند کرتا ہے۔ سجاد نے ایک گھونٹ لیا اور بولا۔ ”شکر کچھ کم ہے۔“

”میں لاتی ہوں۔“ شاہین بولی اور نیچے چلی گئی۔ اس کے جاتے ہی سجاد نے ٹراؤزر کی جیب سے چند چھوٹی گولیاں نکالیں اور شاہین کے کپ میں ڈال دیں۔ وہ ایک منٹ بعد شوگر پاٹ لے آئی۔ سجاد نے تھوڑی سی چینی ڈال کر ہلائی اور سر ہلاتے ہوئے کافی پینے لگا۔ شاہین تھکی ہوئی لگ رہی تھی۔ وہ صبح سے اٹھی ہوئی تھی اور اس نے آج آرام بھی نہیں کیا تھا۔ کافی ختم کرتے ہی اس نے جماہی لی اور بولی۔ ”اب میں سوؤں گی۔ تمہیں کوئی کام ہے؟“

”نہیں۔“ سجاد نے کہا۔ ”میں بھی کچھ دیر میں سو جاؤں گا۔ تم فکر مت کرو، اب میں آسانی سے چل پھر سکتا ہوں۔“

”اوہ، یاد آیا، میں تمہارے لیے اسٹک لائی تھی۔ وہ کار میں پڑی ہے۔ میں ابھی لاتی ہوں۔“

وہ مگ اٹھا کر نیچے چلی گئی۔ سجاد سوچ رہا تھا کہ کہیں اوور ڈوز نہ ہو جائے اور وہ اپنی غنودگی محسوس نہ کرلے مگر اسے اطمینان تھا۔ جیسے وہ خود کو سونے سے باز نہیں رکھ سکا تھا اسی طرح شاہین بھی نہیں جاگ سکے گی۔ وہ کچھ دیر بعد نیچے سے آئی اور ایک اچھی اور ہلکی ہینڈ اسٹک اس کے حوالے کی۔ ”استعمال کر کے دیکھو، ویسے میرے حساب سے تو ٹھیک ہے۔“

سجاد نے اسٹک کی مدد سے چل پھر کر دیکھا تو اسے ٹھیک لگی۔ ”ٹھیک ہے۔“

”ویسے بھی کچھ دن کی بات ہے۔“ شاہین نے بیڈ روم کی طرف جاتے ہوئے کہا۔ سجاد کو اچانک خیال آیا اور وہ اس کے پیچھے آیا۔ شاہین نے معنی خیز انداز میں پوچھا۔ ”کیا بات ہے......کیا آج یہیں سونے کا ارادہ ہے؟“

”نہیں لیکن میں سوچ رہا ہوں کہ کچھ وقت تمہارے پاس رہوں۔“

”رہو لیکن میں زیادہ دیر کمپنی نہیں دے سکوں گی۔ آج نہ جانے کیوں زیادہ تھکن محسوس ہو رہی ہے۔“
”میں تمہیں تنگ نہیں کروں گا۔“ سجاد نے اسے تسلی دی۔ شاہین نے لباس بدلا۔ نائٹی اور اس پر گاؤن پہن کر وہ بستر پر آگئی اور پھر دیکھتے ہی دیکھتے اس کی آنکھیں بند ہو گئیں۔ سجاد برابر میں لیٹا ہوا تھا۔ اگرچہ شاہین کی سانسیں خرخرانے لگی تھیں مگر اس نے احتیاطاً دس منٹ اور انتظار کیا پھر آہستہ سے اٹھا اور دبے قدموں ڈریسنگ تک آیا۔ اس نے پرس اٹھا کر اس میں سے دو چابیاں نکالیں جو ایک چھوٹے سے رنگ میں تھیں۔ وہ چابیاں مٹھی میں دبا کر کمرے سے باہر آیا۔ آہستہ سے دروازہ بند کیا اور سیڑھیوں سے نیچے اترنے لگا۔ اسٹک کے سرے پر ربر پیڈ تھا اس لیے اس کی آواز نہیں آرہی تھی۔ وہ پلاسٹر والا پاؤں آہستہ سے رکھ رہا تھا۔ اسی طرح وہ نیچے پہنچا اور چند لمحے سستانے کے بعد اس نے سیڑھیوں کے نیچے موجود دروازے پر چابیاں آزمائیں۔

دروازہ کھل گیا اور وہ حیران ہوا کیونکہ دروازہ اسٹور کا نہیں بلکہ بیسمنٹ کا تھا۔ سیڑھیاں نیچے جارہی تھیں۔ اس نے تاریک دیوار پر ہاتھ مارا اور بٹن دباتے ہی سیڑھیاں روشن ہو گئیں۔ وہ اندر آیا۔ بیسمنٹ کوئی آٹھ فٹ نیچے تھا۔ سیڑھی کے آخر میں سوئچ بورڈ تھا۔ اس نے بٹن آزمائے اور ایک بٹن دبانے پر وہاں بھی روشنی ہو گئی۔ یہ جگہ زیادہ بڑی نہیں تھی لیکن وہاں بہت زیادہ کاٹھ کباڑ اور سامان تھا۔ سجاد ٹانگ گھسیٹتا ہوا آگے بڑھا۔ یہاں دیواروں کے ساتھ ریک بنے ہوئے تھے۔ پھر وہ ایک جگہ گھوما تو سامنے اسے چھوٹا سا بستر دکھائی دیا۔ جیسا کسی سات سے دس سال تک کے بچے کا ہوتا ہے۔ وہ دنگ رہ گیا۔ اس کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ یہاں اسے ایسی کوئی چیز دیکھنے کو ملے گی۔ بستر کے ساتھ سنگی دیوار سے ایک مضبوط ترین کلپ کی مدد سے چھوٹی سی مگر اسٹیل کی مضبوط چین تھی جس کے ساتھ کلائی یا ٹخنے کے ساتھ بند ہو جانے والی ہتھکڑی تھی۔

’میرے خدا!‘ اس نے سوچا۔ ’یہ سب کیا ہے؟‘
بستر کے آس پاس کچھ نہیں تھا اور وہاں ہلکی سی بو پھیلی ہوئی تھی۔ بستر پر ایک تکیہ اور میلی سی چادر تھی۔ سجاد نے اس پر ہاتھ پھیرا تو اسے بال نظر آئے۔ یہ ہلکے براؤن رنگ کے سات آٹھ انچ لمبے بال تھے۔ اسے یاد آیا، جھلکیوں میں نظر آنے والی بچی کے بال بھی اسی رنگ کے تھے۔ چین، ہتھکڑی اور یہ بستر بتا رہا تھا کہ یہاں بچی کو قید کر کے رکھا گیا تھا۔ اس نے آس پاس دیکھا تو اسے ایک بند الماری دکھائی دی۔ یہ لاک تھی اور اس کی چابیاں شاید اوپر شاہین کے پرس میں تھیں مگر اس نے آسان طریقہ اختیار کیا، وہاں اوزاروں کا ایک ریک تھا۔ اس نے اس سے ایک سلاخ اٹھائی جو آگے سے چپٹی تھی۔ اس کا چپٹا سرا لاک والے حصے میں پھنسا کر اس نے زور لگایا تو وہ چرچراہٹ کی آواز سے کھلتا چلا گیا۔ الماری کھلتے ہی وہ لڑکھڑا کر پیچھے ہوا۔

اندر بچوں کے کپڑے اور ان کے کھلونے تھے۔ اس نے سلیقے سے رکھے کپڑوں کو کھینچ کر باہر گرایا۔ یہ لڑکے اور لڑکیوں دونوں کے کپڑے تھے۔ ان کے سائز بھی مختلف تھے۔ کھلونوں میں گڑیائیں، ٹیڈی بیئر اور کار جیسے کھلونے تھے۔ دو عدد اسکول بیگ تھے۔ سجاد نے انہیں کھول کر دیکھا۔ یہ دوسری اور پہلی کلاس کے بچوں کے بستے تھے۔ ان کی کاپیاں اور کتابیں، ان کے پنسل باکس سب اس میں موجود تھے۔ ڈرائنگ بک میں انہوں نے تصویریں بنائی ہوئی تھیں۔ ایک تصویر میں ایک مرد عورت اور تین بچوں کا خاکہ تھا اور نیچے لکھا تھا۔ ”مائی فیملی۔“
سجاد کے اندر کچھ کٹنے لگا۔ وہ سوچ رہا تھا کہ یہ سب کیا ہے۔ کیا اس جگہ بچوں کو قید رکھا جاتا تھا مگر کیوں؟ شاہین نے اس سے جھوٹ بولا تھا۔ اس نے اسے اس بارے میں بتایا نہیں تھا۔ اس کا مطلب ہے اس کے دل میں چور تھا اور وہ اس کی یادداشت کھونے کا فائدہ اٹھا رہی تھی۔ اس کے اندر اشتعال کی لہریں اٹھنے لگیں اور اس کا دل چاہا کہ وہ اوپر جا کر اس حسین عورت کا گلا دبا دے جو اس وقت اسے زہریلی ناگن لگ رہی تھی۔ لیکن اوپر جانے کے بجائے وہ تہ خانے کا جائزہ لینے لگا۔ ایک طرف ایک چھوٹے ریک پر کچھ سامان رکھا ہوا تھا اور جب اس نے یہ سامان دیکھا تو پھر دم بخود رہ گیا۔ یہ پلاسٹر کرنے کا سامان تھا۔ روئی، پٹی کا بنڈل اور پلاسٹر آف پیرس کا ڈبا تھا۔ اس نے اپنے پلاسٹر والے پاؤں کی طرف دیکھا اور سوچا کہ کیا یہ شاہین نے کیا ہے؟
یہ خیال آتے ہی اس نے اوزاروں والے ریک سے ایک اسٹیل کی دستی آری اٹھائی اور پلاسٹر کاٹنے لگا۔ اسے اس کام کا تجربہ نہیں تھا اس لیے شروع میں ذرا مشکل پیش آئی لیکن جب ایک جگہ سے پلاسٹر کٹ گیا تو اس کے بعد اسے توڑ توڑ کر اتارنا مشکل کام نہیں رہا۔ جہاں مشکل آتی، وہاں وہ آری سے کام لیتا۔ ذرا سی دیر میں اندر سے صاف ستھری ٹانگ نکل آئی۔ اس نے پنڈلی دبا کر دیکھا مگر اسے نہ تو درد ہوا اور نہ ہی کہیں زخم کا نشان نظر آیا۔ تجربے کے طور پر اس نے پاؤں پر زور ڈال کر دیکھا اور وہ آرام سے اس پاؤں پر کھڑا ہو گیا۔ گویا ہڈی ٹوٹنے والی

بات جھوٹ تھی۔ شاہین مکمل طور پر جھوٹی اور سازشی عورت ثابت ہوئی تھی۔ سجاد اوپر آیا۔ کمرے میں آکر اس نے گہری نیند میں ڈوبی شاہین کو دیکھا اور پھر اس کے پرس سے چابیاں نکال کر اس نے الماری کھولی۔

ایک خانے میں سوائے کپڑوں کے اور کچھ نہیں تھا۔ یہ شاہین کے کپڑے تھے۔ بڑا خانہ اس کے کپڑوں پر مشتمل تھا جن میں سے بیشتر ہینگ تھے۔ وہ نیچے ٹٹول کر دیکھ رہا تھا کہ اس حصے میں ایک لاکر نکل آیا۔ اس کی چابی گچھے میں تھی۔ اس نے اسے کھولا اور تیسری بار حیران رہ گیا۔ اندر سلیقے سے پانچ ہزار اور ہزار کے نوٹوں پر مشتمل گڈیاں رکھی تھیں۔ یہ بہت بڑی رقم تھی، شاید کروڑوں میں تھی۔ رقم کے ساتھ ایک خاکی لفافہ بھی تھا۔ اس کے نیچے ایک البم رکھا ہوا تھا۔ اس نے پہلے البم دیکھا۔ اس میں اس کی اور شاہین کی تصاویر تھیں۔ شروع کی تصاویر شادی کی تھیں۔ ان میں وہ دولہا دلہن بنے ہوئے تھے۔ کم سے کم اس بارے میں شاہین نے جھوٹ نہیں بولا تھا۔ پھر سجاد نے لفافہ کھولا تو اس میں سے ہزار کے نوٹوں کی دس گڈیاں نکلیں۔ یہ دس لاکھ روپے تھے اور ایسا لگ رہا تھا کہ حال ہی میں یہاں رکھے گئے تھے۔ مگر سجاد نے رقم کو زیادہ اہمیت نہیں دی۔ اسے رہ رہ کر تہ خانے میں موجود الماری میں بچوں کے کپڑوں کا خیال آرہا تھا اور وہ سوچ رہا تھا کہ بچے کہاں تھے؟

اشتعال کی لہر نے اسے سر سے پاؤں تک جکڑ لیا اور اس نے سرہانے رکھے جگ کو اٹھا کر شاہین پر الٹ دیا۔ پانی ٹھنڈا تھا اور شاہین نے چیخ ماری تھی۔ وہ اٹھی تھی مگر اس کی آنکھیں نہیں کھل رہی تھیں۔ پانی نے اس کا اوپری جسم شرابور کر دیا تھا۔ سجاد نے اسے تھپڑ مارا اور غرایا۔ ''ہوش میں آؤ...... میں کہہ رہا ہوں ہوش میں آؤ۔''

مگر شاہین دوا کے اثر میں تھی۔ سجاد نے اسے بازو سے پکڑ کر اٹھایا اور کھینچتا ہوا اپنے ساتھ لے جانے لگا۔ شاہین منمناتے ہوئے پوچھ رہی تھی کہ وہ کیا کر رہا ہے اور کیوں کر رہا ہے۔ سیڑھیوں پر وہ بری طرح لڑکھڑائی اور دو تین بار گرتے گرتے بچی۔ اگر سجاد نے اس کا بازو نہ پکڑ رکھا ہوتا تو وہ گر ہی جاتی۔ تہ خانے کے دروازے پر سجاد نے اسے دھکا دیا تو اس کا بازو سجاد کے ہاتھ سے نکل گیا اور وہ پہلے سیڑھیوں پر گری اور پھر لڑھکتی ہوئی نیچے فرش پر جا گری تھی۔ اس کی چیخیں بلند تھیں اور جب سجاد نیچے آیا تو وہ اپنی ناک سے فوارے کی طرح بہتے خون کو روکنے کی کوشش کر رہی تھی۔ اسے اور چوٹیں بھی آئی تھیں مگر یہ چوٹیں اسے حواس میں لے آئی تھیں۔ اس نے سر اٹھا کر سجاد کو دیکھا۔ اس کے تاثرات نے شاہین کو لرزا دیا۔ سجاد نے آگے آتے ہوئے کہا۔ ''یہ سب کیا ہے؟ یہاں بچوں کو قید رکھا جاتا تھا، جیسے تم نے مجھے پلاستر کا قیدی بنایا تھا۔''

کہتے ہوئے سجاد نے سلاخ گھما کر اس کے پاؤں پر ماری تو وہ اذیت ناک انداز میں چیخی۔ سجاد نے سلاخ زور سے نہیں ماری تھی مگر سلاخ فولادی اور وزنی تھی۔ ''پتا چلا ہڈی پر چوٹ لگے تو کیسی تکلیف ہوتی ہے۔'' سجاد کا لہجہ زہریلا ہو گیا۔ ''مگر تم فکر مت کرو، یہاں پلاستر کا سامان موجود ہے۔ اگر تمہاری ہڈی ٹوٹی بھی تو میں اسے سیٹ کر کے پلاستر کر دوں گا۔''

''سجاد! تمہیں کیا ہو گیا ہے۔'' شاہین روتے ہوئے بولی۔ وہ پیچھے سرک رہی تھی۔

''میری آنکھیں کھل گئی ہیں۔ دھوکے باز عورت، بتاؤ میری بچی کہاں ہے؟'' سجاد کہتا ہوا اس کی طرف بڑھا تو وہ پیچھے سرکنے لگی۔

''خدا کے لیے ہوش کرو ہماری کوئی بچی نہیں ہے۔''

شاہین ایک ریک کے پاس پہنچ گئی تھی اور اس کے نچلے حصے میں کچھ ٹٹول رہی تھی۔ ''بکواس بند کرو ذلیل عورت...... مجھے بچی کا بتاؤ، ہماری نہ سہی وہ کسی کی بچی تو ہے۔ تم نے اس کے ساتھ کیا کیا ہے۔ بتاؤ ورنہ میں مار مار کر تمہاری ساری ہڈیاں توڑ دوں گا۔''

اس نے سلاخ بلند کی تھی کہ شاہین کا ہاتھ آگے آیا اور اس میں دبے پستول نے شعلہ اگلا۔ گولی سجاد کے سینے میں اتر گئی۔ وہ لڑکھڑا کر پیچھے گیا۔ اس نے سینے میں خون اگلتے سوراخ کو دیکھا۔ شاہین کانپ رہی تھی اور اب ہسٹریائی انداز میں روتے ہوئے اس سے معافی مانگ رہی تھی۔ سجاد کو لگا کہ اس کے پیروں سے جان نکل گئی ہے۔ وہ گھٹنوں کے بل بیٹھا اور پھر فرش پر ڈھیر ہو گیا۔ شاہین نے پستول پھینک دیا تھا اور روتے ہوئے گھسٹ کر اس کے پاس آرہی تھی۔ وہ مسلسل اس سے معافی مانگ رہی تھی اور کہہ رہی تھی کہ اس سے بے ساختہ گولی چلی ہے۔ سجاد نے سر اٹھا کر اسے دیکھا۔ شاہین نے پاس آکر پاؤں کی تکلیف کے باوجود اس کا سر اٹھا کر اپنی گود میں رکھ لیا۔ وہ جس طرح رو رہی تھی، اس نے سجاد کے خیال کو بدل دیا تھا۔ اس نے سرگوشی میں پوچھا۔ ''شاہین یہ سب کیا ہے؟''

''ہماری بدقسمتی۔'' اس نے کہا اور اس کا زخم دیکھا۔

شاہین کے چہرے پر پھیلتی مایوسی نے اسے بتایا کہ زخم کاری تھا اور وہ شاید جانبر نہیں ہوسکتا تھا۔ شاہین نے کہا۔ ''میں تمہیں اسپتال لے جاتی ہوں، تم بچ جاؤ گے۔''

''یہ ممکن نہیں ہے۔ کیا تم مجھے اوپر لے جاسکتی ہو؟ موبائل بھی اوپر ہے اور شاید میرے پاس اتنا وقت بھی نہیں ہے۔''

شاہین پھر رونے لگی۔ ''میں کیا کروں؟...... یہ میں نے کیا کردیا؟''

''مجھے بتاؤ یہ سب کیا ہے ...... تم نے مجھ سے جھوٹ کیوں بولا...... اور وہ بچی کہاں ہے جو ہمارے ساتھ کار میں تھی؟''

''وہ......وہ مرگئی۔'' شاہین نے کہا تو اسے جھٹکا لگا۔

''مرگئی کیسے؟''

''حادثے میں۔ تم بے ہوش تھے۔ میں سیٹ بیلٹ کی وجہ سے محفوظ رہی تھی مگر بچی مرگئی تھی۔ اس سے پہلے کہ لوگ وہاں آتے میں نے اسے کار سے نکالا اور نزدیک ہی ایک گڑھے میں ڈال کر اوپر سے مٹی ڈال دی۔''

سجاد کے ذہن میں جھماکا سا ہوا اور اس نے دیکھا کہ شاہین اس کی طرف آرہی تھی۔ اس کے ہاتھ میں گڑیا تھی۔ وہی گڑیا جو بچی کے ہاتھ میں تھی۔ وہ گڑیا لے آئی تھی۔ سجاد نے کمزور لہجے میں پوچھا۔ ''مگر کیوں...... تم نے ایسا کیوں کیا؟''

''کیونکہ ہم اسے اغوا کر کے لائے تھے تاکہ اس کے گھر والوں سے تاوان لے سکیں۔''

سجاد نے بے ساختہ سر گھما کر بستر اور اس کے ساتھ موجود زنجیر کو دیکھا۔ اب اس کی سمجھ میں آگیا تھا کہ یہاں یہ سب کیوں تھا۔ ''ہم بچے اغوا کر کے...... لاتے ہیں؟''

''ہاں اور پھر ان کے گھر والوں سے تاوان وصول کرتے ہیں۔''

''اور پھر انہیں مار دیتے ہیں۔''

''نہیں...... نہیں۔'' شاہین نے بے قرار ہو کر کہا۔ ''ہم نے آج تک کسی بچے کو نہیں مارا۔ یہ پہلی بار تھا کہ ایسا ہوا اور وہ بھی بچی کی وجہ سے۔ اسے وقت سے پہلے ہوش آگیا تھا اور وہ چلائی تو تمہاری توجہ سڑک سے ہٹ گئی اور یوں حادثہ پیش آیا تھا۔ اگر ہم بچی کی لاش کے ساتھ پکڑے جاتے تو تم سوچ سکتے ہو کہ ہمارے ساتھ کیا ہوتا۔''

''مگر تم نے میرے ساتھ ایسا کیوں کیا؟''

''تمہاری یادداشت گم ہوگئی تھی۔ جب میں واپس آئی تو تم نے مجھ سے پوچھا کہ میں کون ہوں مگر ساتھ ہی تم نے بچی کے بارے میں پوچھا۔ تم اسے اپنی بچی سمجھ رہے تھے۔ پھر تم بے ہوش ہوگئے اور میں تمہیں یہاں لے آئی۔ مجھے خطرہ تھا کہ تم ہوش میں آکر ہنگامہ کرو گے اور یہاں سے جانے کی کوشش کرو گے اس لیے میں نے تمہاری ٹانگ پر پلاستر کردیا کہ تم کہیں نہ جاسکو اور جب تک تمہاری یادداشت بحال نہیں ہوجاتی، تم یہیں رہو۔ میں شروع میں تمہیں انجکشن دے کر سلاتی رہی لیکن یہ بھی ایک حد سے زیادہ ممکن نہیں تھا۔ اس لیے تمہیں ہوش میں لانا پڑا۔ میں نے تم سے کچھ جھوٹ بولا مگر اس کے علاوہ باقی سب سچ بتایا۔''

سجاد کے ذہن میں پھر جھماکا ہوا۔ بچی اچھلتی کودتی اپنی گڑیا کے ساتھ روش پر دوڑتی ہوئی ان کی طرف آرہی تھی۔ کار میں وہ اور شاہین تھے۔ پھر شاہین کلوروفارم سے بھیگا ہوا رومال لے کر کار سے اتری۔ چند منٹ بعد وہ بے ہوش بچی کے ساتھ جارہے تھے اور اسے عقبی سیٹ پر یوں لٹا دیا تھا جیسے وہ سورہی ہو۔ اس کی گڑیا بھی اس کی گود میں رکھ دی تھی۔ جھلک ختم ہوئی تو سجاد نے پوچھا۔ ''تم گڑیا لے کر کہاں گئی تھیں؟''

''بچی کے گھر والوں کو بہ طور ثبوت دینے کہ ان کی بچی ہمارے پاس ہے۔ آج میں تاوان کی رقم لے آئی۔ یہ ہماری آخری واردات تھی کیونکہ ہم نے سوچا تھا کہ جب پانچ کروڑ روپے پورے ہوجائیں گے تو ہم جرم کی راہ چھوڑ دیں گے۔ آج پانچ کروڑ روپے پورے ہوگئے ہیں مگر...... مگر۔''

''ہم مجرم ہیں اور وہ بھی بچے اغوا کرنے والے۔''

''ہم غریب تھے۔ میں نرس تھی اور تم ایک فرم میں معمولی جاب کرتے تھے۔ پھر ہم نے دولت کمانے کے لیے یہ کام شروع کیا۔ ایک کامیابی ملی تو ہم نے مستقل یہ کام شروع کردیا۔ پیسے آئے تو یہ کوٹھی خریدی کیونکہ یہاں بچوں کو رکھنا آسان تھا۔ ہم انہیں یہاں تہ خانے میں قید رکھتے تھے اور جب ان کے ماں باپ تاوان دے دیتے تو انہیں واپس چھوڑ آتے تھے۔ مگر ہم نے کسی بچے کو مارا نہیں ہے۔'' شاہین پھر رونے لگی۔ ''شاید ہمیں ہمارے جرموں کی سزا مل رہی ہے۔ سجاد! میں تمہارے بغیر زندہ نہیں رہ سکتی۔''

سجاد کی آنکھوں کے آگے رفتہ رفتہ تاریکی چھارہی تھی اور پھر یہ تاریکی مکمل ہوگئی۔ تہ خانے میں شاہین کی دھاڑیں مار کر رونے کی آواز گونجتی رہ گئی۔

****

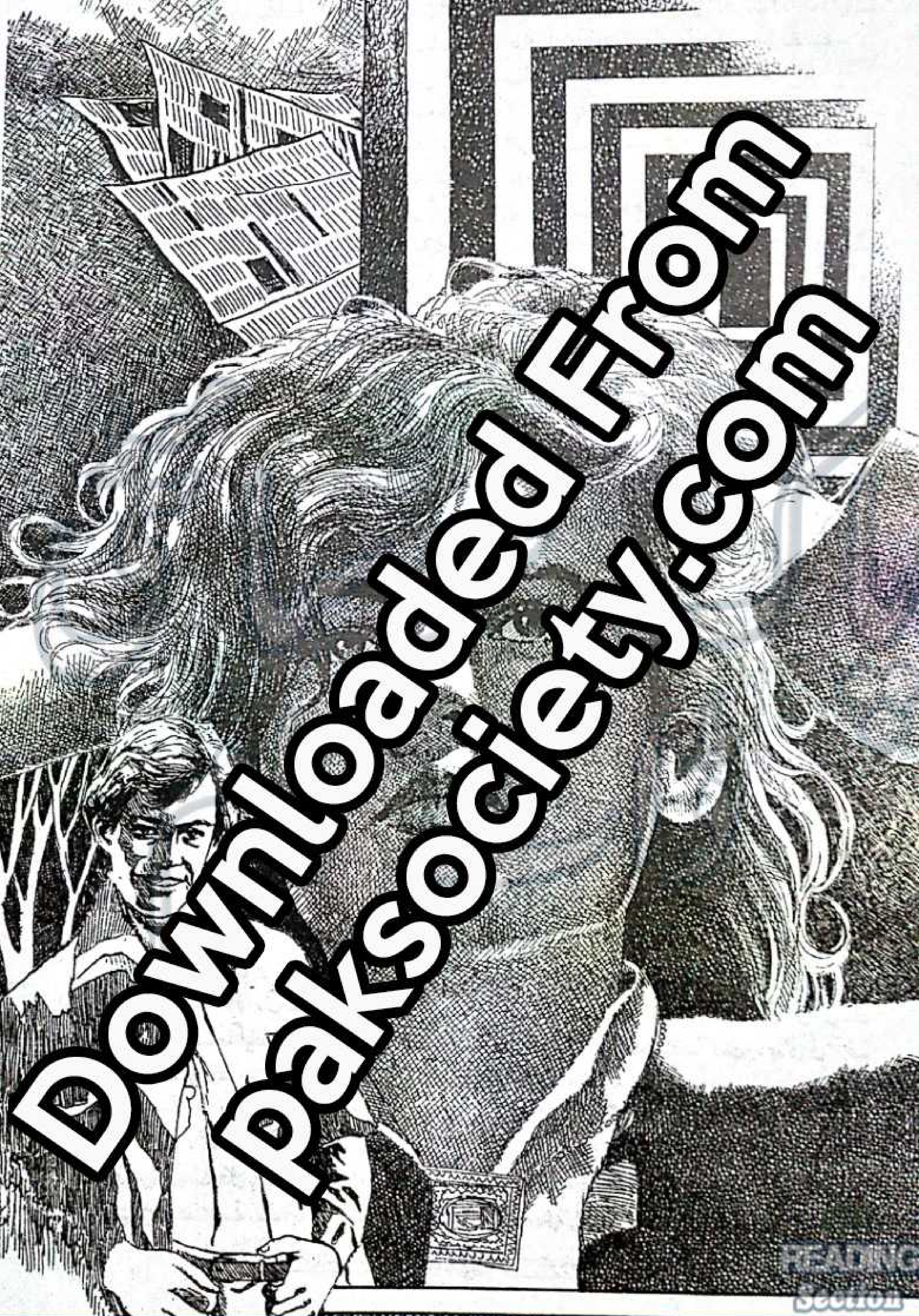
شیش محل

اسماء قادری

قسط:6

جہاں پر انسان کی بے بسی کی انتہا ہو... وہیں سے ربِ جلیل کی رحمتوں کی ابتدا ہوتی ہے۔ یہ بات کبھی اس نے بچپن میں سنی تھی مگر حادثات و واقعات اور طبقاتی کشمکش میں گھری مختصر سی فانی زندگی کے پیچ وخم میں الجھ کر اسے کچھ یاد نہ رہا... اسے نہیں معلوم تھا کہ یکسانیت سے بے زار اور تنوع کے متلاشی لوگ معزز اور بلند مقام کے حصول کی خاطر خود کو کتنی پستی میں گرا لیتے ہیں۔ وہ ذہین وفطین نوجوان بھی آنکھوں میں خوش امیدی کے خواب لیے راہ میں پلکیں بچھائے اس کا منتظر رہتا تھا لیکن ناکام آرزوئوں اور ناآسودہ تمنائوں کے انجام نے اس کے مندمل زخموں کو لہو لہو کردیا... راکھ میں دبی چنگاری نے اس کے تمام ارادوں کو خاکستر کرڈالا۔ دل کی بے ترتیب دھڑکنوں کے ساز کے درمیان جو خوش امیدی کبھی اس کی زندگی کا حصہ تھی اب نہ تو وہ خوش دکھائی دیتا تھا اور نہ ہی کسی کی آنکھ میں اس کے لیے کوئی امید باقی تھی۔ جانے یہ زندگی کا کونسا موڑ تھا... وہ تو شیش محل کے ہر منظر میں محبوب کی مسکراتی آنکھوں کے جلتے دیپ میں اپنے عکس کو دیکھنے کا عادی تھا... کھلتے گلابوں اور محبتوں کی برستی پھوار میں خود کو بھیگا محسوس کرتا تھا کہ اچانک اس شیش محل میں ہر جانب لپکتے شعلوں کی جھلک دکھائی دی تو احساس ہوا کہ وہ لوگوں کے ہجوم میں کس قدر تنہا ہے... جسے وہ اپنا ہمسفر اور رفیق سمجھتا رہا اس سے بڑا رقیب کوئی نہ نکلا۔

اسرار و تحیر کے پردوں میں ملفوف سطر سطر رنگ بدلتی واردات قلبی کی عکاس دلچسپ داستان



ریل گاڑی اپنی مخصوص رفتار سے دوڑی جارہی تھی۔ بمبئی سے چندی گڑھ تک سولہ سو بائیس کلومیٹر کا فاصلہ انہیں اسی ریل گاڑی سے طے کرنا تھا پھر وہاں سے شملہ محض ایک سو بیس کلومیٹر دور رہ جاتا۔ چندی گڑھ سے شملہ جانے کے لیے انہیں بھاٹیہ سیٹھ کا ڈرائیور ریلوے اسٹیشن پر ہی لینے آجاتا۔ سارا پروگرام طے شدہ تھا۔ اگر عام حالات میں وہ یہ سفر کررہے ہوتے تو فاروق کو بہت اچھا لگتا۔ سات پہاڑیوں کی چوٹیوں پر آباد شملہ کی خوب صورتی کے بارے میں اس نے بھی سن رکھا تھا اور اندازہ تھا کہ جس شہر کو انگریزوں نے اپنا گرمیوں کا دارالخلافہ بنا رکھا تھا، وہ یقیناً بہت خوب ہوگا لیکن یہاں تو دل جولیٹ کے لیے بے قرار تھا اور اسے دیکھنے کے لیے تڑپا جاتا تھا۔ اسے خود حیرانی تھی کہ جولیٹ کے لیے ایسی تڑپ اس سے قبل اس نے کبھی اپنے دل میں محسوس نہیں کی تھی۔ اس کی دید کی چاہ تو ہمیشہ اس کے دل میں رہتی تھی لیکن اتنی شدت سے اس کا حال جاننے کی ہڑک پہلے کبھی نہیں اٹھی تھی۔ وہ سوچ رہا تھا شاید یہ اس کے برے خوابوں کا ردِعمل ہے۔ پچھلے دنوں اسے جولیٹ پریشان بھی لگی تھی اور اب اس نے ربن کی زبانی اس کی ماں کی موت کی خبر بھی سن لی تھی تو بس اتنی ساری چیزوں نے جمع ہوکر اسے جولیٹ کے لیے پریشان کردیا تھا۔ جولیٹ کے لیے اس کے دل میں چاہت بھی تو ایسی شدت کی تھی لیکن محبت کی تمام تر شدت کے باوجود وہ ربن کی بات نہیں ٹال سکتا تھا۔ ربن سے اس کے محبت، احترام اور احسان سمیت بے شمار رشتے تھے۔ وہ اس کا دوست بھی تھا، بھائی بھی اور سرپرست بھی۔ ربن سے اس کے ہر رشتے میں اتنی گہرائی تھی کہ وہ اس کی خاطر اپنا آپ مٹا سکتا تھا چنانچہ اب بھی اپنے دل کی پکار کے خلاف اس کے حکم پر اس کے ساتھ شملہ جارہا تھا۔ شملہ جو کہ بمبئی سے پورے سترہ سو بیالیس کلومیٹر دور تھا اور اس کے لیے یہ فاصلہ شملہ سے بمبئی کا فاصلہ نہیں اپنے اور جولیٹ کے درمیان کا فاصلہ بن گیا تھا۔

''تیری خالہ کو بیماری کیا ہے شگفتلا؟'' برتھ پر لیٹے اپنے خیالات سے نبرد آزما فاروق نے ڈبے کی خاموشی میں ربن کی آواز سنی تو چونک سا گیا۔ بھلا یہ کون تھی جسے ربن نے شگفتلا کہہ کر مخاطب کیا تھا۔

''جج...... جی...... وہ...... وہ انہیں دل کا مرض ہے۔'' جواب ماجد علی کے ساتھ بیٹھی برقع پوش لڑکی نے دیا۔ اس سفر کے دوران اس نے پہلی بار اس لڑکی کی آواز سنی تھی۔ آواز خوب صورت ہونے کے ساتھ ساتھ لڑکی کے نوعمر ہونے کا بھی اعلان کررہی تھی۔

''یہ آپ شگفتلا کہہ کر کسے مخاطب کررہے ہیں؟ میری بیوی کا نام شکیلہ ہے۔'' لڑکی کی آواز کے فوراً بعد اس نے ماجد علی کی تیز آواز سنی۔ لہجہ و آواز تیز ہوجانے کے باوجود اس میں موجود گھبراہٹ کو محسوس کیا جاسکتا تھا۔

''اپنے کو مت چلا رے۔ اپن وہ ہے جو چاہے تو کھڑے کھڑے آدھے بمبئی کو بند کروادے۔ اپنے بوتھے پر جو یہ دو بڑے بڑے دیدے لگے ہیں نا، یہ اندھے نہیں ہیں۔ اپن سب کچھ دیکھ اور سمجھ سکتا ہے۔ تو شگفتلا کو شکیلہ بنا کر کسی اور کو دھوکا دے سکتا ہے پر اپن کو دھوکا دینا تجھ جیسے کل کے لونڈے کے بس کی بات نہیں ہے۔'' ربن نے فوراً ہی اسے لتاڑ کر رکھ دیا۔

''آپ کو کوئی غلط فہمی ہوئی ہے جناب۔ یہ سچ مچ میری بیوی شکیلہ ہے۔'' ماجد علی نے اب بھی اپنے بیان پر قائم رہنے کی کوشش کی۔

''اب اور جھوٹ بولا تو ایک الٹے ہاتھ کا ایسا دوں گا کہ سارے کے سارے دانت باہر آجائیں گے۔'' ربن کے لہجے میں تپش تھی۔ فاروق اپنی جگہ پر اٹھ بیٹھا۔ اب اسے کچھ کچھ سمجھ آنے لگی تھی کہ ربن نے کھانے کے بعد قہوہ پیتے ہوئے ماجد علی سے ٹیڑھی ترچھی گفتگو کیوں کی تھی۔ یقیناً ماجد علی شروع ہی سے اس کی نظر میں مشکوک رہا ہوگا اور اس نے اس معاملے میں کچھ ایسی گڑبڑ محسوس کی ہوگی کہ اپنی دخل اندازی ضروری سمجھی، ورنہ اسے کیا غرض پڑی تھی کہ لڑکی کے شکیلہ یا شگفتلا ہونے پر بحث کرے۔

''آپ تو زبردستی میرے گلے پڑ رہے ہیں۔'' ربن کے لہجے کی سختی کے باوجود ماجد علی نے شیر بننے کی کوشش کی۔ ربن اس کی بات سن کر یکدم اپنی جگہ سے کھڑا ہوگیا۔ فاروق نے بھی نیچے اترنے میں دیر نہیں لگائی۔

''پلیز سر آپ ان لوگوں سے بحث مت کریں۔ یہ مجھے خطرناک لوگ لگتے ہیں۔'' شکیلہ یا شگفتلا جو بھی تھی، ماجد علی کا بازو تھام کر اسے سمجھانے لگی۔

''کتنے بھی خطرناک ہوں پر تیرے حق میں اس سے زیادہ برے ثابت نہیں ہوسکتے۔'' ربن، ماجد علی کی طرف اشارہ کرکے پھنکارا۔

''آپ ہمیں معاف کیجیے بڑے صاحب۔ آپ کو میرے شکیلہ یا شگفتلا ہونے سے کیا لینا دینا ہے۔'' اس بار وہ ربن سے مخاطب ہوئی۔ اپنی طرف سے وہ بہت بااعتماد بن کر بولنے کی کوشش کررہی تھی لیکن اس کی گھبراہٹ پھر بھی عیاں تھی۔

''کہہ تو، تو ٹھیک رہی ہے بیبی پر اپنے کو تیری جوانی پر رحم آرہا ہے۔ کیوں اپنے ہاتھوں اپنی زندگی برباد کرنے نکل کھڑی ہوئی ہے۔'' ربن کا لہجہ یکدم ہی دھیما پڑ گیا اور وہ نہایت پُردرد لہجے میں لڑکی سے بولا۔ اس کے اس لہجے پر لڑکی بھی گم صم سی ہوگئی پھر دھیمی آواز میں بولی۔

''کیا کرتی، اس کے سوا کوئی راہ ہی نہیں تھی۔ میرے بڑے بھی مجھے ان کا نہیں ہونے دیتے۔''

''مناسب سمجھ تو اپنے کو پورا معاملہ بول۔ اپن تیرے لیے جو کرسکے، کریں گے۔'' ربن کے لہجے میں نرمی اور حلاوت اتر آئی۔ وہ ایسا ہی رنگ بدلتا آدمی تھا اور کوئی نہیں سمجھ سکتا تھا کہ اس کے رنگوں میں سے کون سا رنگ سب سے گہرا ہے۔ اب بھی وہاں صورتِ حال یکسر بدل چکی تھی۔ اجنبیت کا مظاہرہ کرتی لڑکی اور تیور دکھاتا ماجد علی ان کے ساتھ دوستوں کی طرح بیٹھے تھے۔ لڑکی نے برقعے کا اوپری حصہ ہٹا دیا تھا اور اب وہ اس کا چہرہ دیکھ سکتے تھے۔ وہ تیکھے نقوش اور سانولی رنگت والی ایسی حسینہ تھی جو مردوں کی توجہ اپنی طرف کھینچے بغیر نہیں رہ سکتی تھی۔

''پہلے تو میں آپ کو یہ کنفرم کردوں کہ میرا نام سچ مچ شگفتہ ہے۔ شکیلہ مجھے سر نے بتایا تھا لیکن جب آپ کی ساتھی نے مجھ سے میرا نام پوچھا تو فوری طور پر میری زبان سے اپنا اصل نام پھسل گیا۔ بعد میں، میں نے انہیں اپنا نام شکیلہ بتایا لیکن شاید انہیں شک ہوگیا تھا جب ہی انہوں نے آپ کو بتادیا۔'' وہ ماجد علی کو ''سر'' کہہ کر مخاطب کررہی ہے یہ فاروق نے دوسری بار نوٹ کیا تھا۔ بہرحال ابھی وہ اس نکتے پر زیادہ غور کرنے کے بجائے اس کی کہانی سننے میں دلچسپی رکھتا تھا۔

''اپن کا اپنا بھی حساب کتاب ہوتا ہے۔ اپن نے پہلی نظر میں ہی بھانپ لیا تھا کہ معاملہ گڑبڑ ہے۔ یہ پنچھو جو تجھے برقع پہنا کر ساتھ لایا ہے، تیرے کو برقع پہننے کا سلیقہ نہیں سکھا سکا۔ تو عادی نہیں ہے اس لیے تیرے سے مسلمان لڑکیوں کی طرح برقع سنبھالا بھی نہیں جارہا تھا اور تو اس میں بڑی بے چین لگ رہی تھی۔ سسٹر کیتھی سے تیرے بارے میں پوچھ گچھ کرکے تو اپن نے صرف اپنا شک پکا کیا تھا۔'' ربن نے شگفتہ کو جواب دیا تو فاروق اس کی قوتِ مشاہدہ کو داد دیے بغیر نہیں رہ سکا۔ جو کچھ ربن نے ذرا دیر میں بھانپ لیا، اسے وہ ذرا سا بھی محسوس نہیں کرسکا تھا۔ شاید ایک وجہ اس کی ذہنی پراگندگی بھی تھی۔ وہ اتنا الجھا ہوا تھا کہ ایسی باتوں پر غور کرنے کا اہل ہی نہیں رہا تھا لیکن الجھنیں اور پریشانیاں ربن کے ساتھ کیا کم رہتی تھیں۔ اب بھی وہ اس کے ساتھ سفر کررہا تھا تو جانے پیچھے کتنے مسئلے چھوڑ کر آیا تھا لیکن وہ تھا ہی غیر معمولی آدمی جو شاید سوتے میں بھی اپنی آنکھیں کھلی رکھتا تھا۔

''آپ بالکل ٹھیک کہہ رہے ہیں۔ میں نے آج پہلی بار ہی سر کی ایڈوائس پر برقع پہنا ہے۔'' شگفتہ نے محجوب سے لہجے میں اعتراف کیا۔

''اب یہ بھی بتادے کہ اپنے سر کے ساتھ کیوں اور کدھری جارہی ہے؟'' ربن کے لہجے کی بے نیازی ایک بار پھر لوٹ آئی۔

''میں آپ کو پوری بات بتاتا ہوں۔'' یکدم ہی ماجد علی نے درمیان میں دخل دیا۔ اس کی اس دخل اندازی پر ربن کی تیوری پر ہلکا سا بل تو ضرور پڑا لیکن اس نے ماجد علی کو ٹوکا نہیں اور بولنے دیا۔ ''شگفتہ فرسٹ ایئر کی اسٹوڈنٹ ہے۔ میں نے ابھی پچھلے سال ہی گریجویشن کے بعد ہائی اسکول میں پڑھانا شروع کیا ہے۔ تنخواہ زیادہ نہیں ہے اس لیے خواہش رکھنے والوں کو اضافی آمدنی کے لیے ان کے گھر جاکر ٹیوشن دیتا ہوں۔ شگفتہ کی ٹیوشن بھی مجھے میرے ایک کولیگ نے دلائی تھی۔ یہ ایک مالدار اور ماڈرن گھرانے سے تعلق رکھتی ہے اس لیے میں اس کے گھر اسے پڑھانے جاتا تو کوئی ہماری نگرانی کرنے والا نہیں ہوتا تھا۔ شروع کے دنوں میں، میں سنجیدگی سے اسے ٹیوشن دیتا رہا لیکن پھر رفتہ رفتہ ہم ایک دوسرے کی طرف راغب ہوتے چلے گئے۔ تعلیم سے ہٹ کر ہونے والی گفتگو کب بے تکلفی اور پسندیدگی میں ڈھلی، ہمیں خود بھی اندازہ نہیں ہوا۔ جب ہوش آیا تو احساس ہوا کہ ہم دونوں ایک دوسرے سے اتنی شدید محبت کرنے لگے ہیں کہ اب ایک دوسرے کے بغیر زندگی گزارنا ممکن نہیں رہا لیکن آپ سمجھ سکتے ہیں کہ ہمیں ساتھ زندگی گزارنے کی اجازت ملنی مشکل بلکہ ناممکن تھی۔ ہمارے درمیان مذہب اور اسٹیٹس کی اونچی اونچی دیواریں کھڑی ہوئی تھیں اور دونوں طرف کے بزرگوں سے یہ امید نہیں تھی کہ وہ ہمارا ملاپ ہونے دیں گے۔ شگفتہ کے گھر والوں کی طرف سے زیادہ شدید ردِعمل کا ڈر تھا۔ میرے گھر والے بھی ایک ہندو لڑکی کو بہو بنانے پر راضی نہ ہوتے لیکن ان کے اعتراض کا حل اس صورت نکالا جاسکتا تھا کہ ان کی تسلی کے لیے شگفتہ مسلمان ہوجاتی لیکن ظاہر ہے اس حل کا کوئی فائدہ نہیں تھا۔ میرے والدین سے زیادہ اصل مسئلہ شگفتہ کے والدین کا تھا۔ میں مسلمان کے بجائے ہندو بھی ہوتا تو وہ اپنے معیار سے اتنا نیچے اتر کر بیٹی بیاہنے پر راضی

نہیں ہوتے۔ ہم نے اس مسئلے پر بہت غور کیا اور آخر یہی حل سمجھ آیا کہ سب کو چھوڑ کر اپنی الگ دنیا بسالیں۔ اسی مقصد کے لیے ہم بمبئی چھوڑ کر چندی گڑھ جا رہے تھے۔ وہاں جا کر ہم کورٹ میرج کر لیں گے۔''

ماجد علی نے اپنی پوری داستان کہہ سنائی پھر ذرا مسکین سے لہجے میں بولا۔ ''آپ ہی بتائیے کہ یہ معاشرہ جو مذہب، دولت، رنگ اور نسل کے خانوں میں بٹا ہوا ہے، ہم جیسے محبت کرنے والے اسے چھوڑ کر فرار نہ ہوں تو کہاں جائیں؟'' ربن نے اس کے اس سوال کا کوئی جواب نہیں دیا اور شکنتلا کی طرف رخ کر کے اس سے مخاطب ہوا۔

''عمر کیا ہے ری تیری؟''

''ساڑھے سولہ سال۔'' اس نے جھجکتے ہوئے جواب دیا۔

''یہ ساڑھے سولہ سال کی ہے اور تو اس سے کورٹ میرج کرنے چلا ہے۔ کون سی عدالت تجھے اٹھرہ (اٹھارہ) برس سے کم عمر لڑکی سے کورٹ میرج کرنے دے گی؟'' شکنتلا کا جواب سن کر ربن نے ماجد علی کو گھورتے ہوئے پوچھا۔ اس کے تیکھے لہجے میں پوچھے گئے اس سوال پر ماجد علی بوکھلا گیا پھر بولا۔

''ہم...... ہم مسجد میں جا کر نکاح پڑھوا لیتے۔''

''شکنتلا کو شکیلہ بنا کر......؟'' ربن نے طنز کا ایک اور وار کیا۔

''اس کے سوا چارہ بھی کیا ہے۔'' ماجد علی اس تفتیش پر جزبز ہوا۔

''چل ٹھیک ہے۔ جب یہ راضی ہے تو کوئی دوسرا کیا بول سکتا ہے پر تو یہ بتا کہ آگے زندگی گزارنے کے لیے تیرے پاس کیا بندوبست ہے؟ تو پیسے والا تو ہے نہیں کہ پلّے سے بہت بڑی رقم باندھ لایا ہو۔ نئے شہر میں جا کر بسنے اور زندگی شروع کرنے کے لیے کچھ روپیا پیسا بھی تو لگے گا۔ تو نکاح کر کے اسے کدھر رکھے گا اور کیا کھلائے گا؟'' ربن تو ماجد علی سے یوں سوال جواب کر رہا تھا جیسے شکنتلا کا سرپرست ہو اور لڑکی بیاہتے ہوئے اس کے مستقبل کی فکر میں مبتلا ہو۔

''کچھ نہ کچھ بندوبست ہو ہی جائے گا۔'' ماجد علی نے جزبز ہوتے ہوئے جواب دیا۔

''بندوبست ہو جائے گا' مطلب تو نے پہلے سے کوئی بندوبست نہیں کیا اور ایسے ہی اسے اٹھا کر بمبئی سے چندی گڑھ کے لیے چل پڑا ہے۔'' اس کا جواب سن کر ربن بڑبڑایا۔ اس بار ماجد علی خاموش رہا۔

''ٹھیک ہے خود ہی کچھ کرنا پڑے گا۔'' ربن خود کلامی کے سے انداز میں بڑبڑایا پھر سر اٹھا کر بلند آواز میں ان سب سے مخاطب ہوا۔

''سب سو جاؤ رے۔ بہت رات ہو گئی ہے۔'' اس کے حکم پر سب سونے کی تیاری کرنے لگے۔ فاروق بھی دوبارہ برتھ پر چڑھ گیا۔ کیتھرائن نے دوسری برتھ سنبھال لی جبکہ ربن اور گولو نے نیچے کی نشستیں سنبھال لیں۔ ماجد علی اور شکنتلا بھی سونے کے لیے لیٹ گئے۔ سب سے پہلے گولو کے خراٹے سنائی دیے۔ سر منہ لپیٹے پڑا ربن بھی سویا ہوا محسوس ہونے لگا۔ کیتھرائن نے بھی جلد زیر مطالعہ کتاب بند کر کے بتی بجھا دی، یوں آہستہ آہستہ سب ہی سوتے چلے گئے لیکن فاروق کی آنکھوں سے نیند غائب تھی کچھ تو اس لیے کہ وہ دواؤں کے زیر اثر دن کے اوقات میں بھی... اچھی خاصی نیند لے لیتا تھا، دوسرے اسے اپنا اندرونی اضطراب بھی راتوں کو چین سے سونے نہیں دیتا تھا۔ رات جو اپنے ساتھ زیادہ تنہائی لاتی تھی اس کے گرد خیالات کا زیادہ ہی ہجوم لگا دیتی تھی۔ ان خیالات میں ڈوبے اسے احساس ہی نہیں ہوا کہ کتنا وقت آگے سرک گیا ہے۔ وہ ایک طرف کروٹ لیے بے حس و حرکت لیٹا رہا کہ بار بار کروٹ بدلنے یا حرکت کرنے سے دوسروں کی نیند میں خلل پڑ سکتا تھا۔ خصوصاً وہ ربن اور گولو کی طرف سے بہت محتاط رہتا تھا۔ اسے معلوم تھا کہ وہ دونوں اس سے اتنی محبت کرتے ہیں کہ سوتے میں بھی اس کی طرف سے مکمل غافل نہیں رہ سکتے۔ ان کے خیال سے ہی وہ خود کو گہری نیند میں ڈوبا ہوا ظاہر کر رہا تھا کہ یکایک اس کی سماعتوں نے خاموشی میں کچھ سرسراہٹیں سنیں۔ وہ کچھ اور بھی دم سادھ گیا۔ جانے اس کے علاوہ وہاں موجود پانچ نفوس میں سے کون جاگا تھا۔ شاید کسی کو پیاس لگی تھی یا باتھ روم جانے کی ضرورت محسوس ہوئی تھی۔ وہ اپنی جگہ لیٹے لیٹے قیاس آرائیاں کر رہا تھا کہ بہت مدھم سی سرگوشیاں سنائی دینے لگیں۔ وہ چونک سا گیا۔ یہ کون تھا جو رات کے اس پہر سرگوشیوں میں بات کر رہا تھا؟ سرگوشیاں اتنی مدھم تھیں کہ وہ کچھ بھی سن نہیں پا رہا تھا البتہ فطری تجسس نے قیاس آرائی پر ضرور مجبور کر دیا تھا اور وہ دل ہی دل میں سب کے بارے میں اندازے لگا رہا تھا۔

کیتھرائن اس کے عین سامنے والی برتھ پر سو رہی تھی۔ اگر وہ برتھ سے اترتی تو وہ فوراً ہی یہ بات محسوس کر لیتا۔ ربن اور گولو آمنے سامنے کی نشستوں پر سو رہے تھے لیکن ان کے یوں سرگوشی میں گفتگو کا امکان بہت کم تھا۔ ربن کو گولو سے کوئی کام ہوتا تو واضح آواز میں اس سے بات

کرتا۔ فرض کیا کہ سوئے ہوؤں کی نیند خراب ہونے کا ڈر دامن گیر ہورہا ہوگا تب بھی آواز دھیمی ہوتی لیکن سرگوشی پھر بھی نہ کی جاتی کہ گولو اس قسم کے طرزِ گفتگو کو سمجھنے کی اہلیت بھی نہیں رکھتا تھا۔ اس کے ان تینوں ساتھیوں کے علاوہ وہاں ماجد علی اور شکنتلا ہی بچے تھے اور غالب امکان یہی تھا کہ وہ ہی رات کے اس پہر سرگوشیوں میں بات کر رہے تھے۔ شادی کے لیے گھر سے بھاگے ہوئے اس جوڑے کے دل میں جانے کون کون سے اندیشے اور خطرات ہوں گے۔ وہ اپنے مستقبل کی طرف سے بھی فکر مند ہوں گے اور شاید اپنے سائے سے بھی بھڑک رہے ہوں گے۔ ایسے میں اگر وہ رات کے اس پہر ایک دوسرے سے کوئی خفیہ گفتگو کر رہے تھے تو یہ کوئی انوکھی بات نہیں تھی۔ ان کی گفتگو میں دخل اندازی کو غیر ضروری اور غیر اخلاقی جانتے ہوئے اس نے اپنے سونے کی اداکاری جاری رکھی۔ اسی وقت اس نے محسوس کیا کہ ریل کی رفتار کم ہورہی ہے۔ شاید کوئی اسٹیشن آرہا تھا۔ رفتار کم ہوتے ہوئے آخر کار ریل گاڑی رک گئی۔ یقیناً اسٹیشن ہی آیا تھا لیکن کوئی بڑا اسٹیشن نہیں ہوگا کیونکہ باہر سے زیادہ آوازیں سنائی نہیں دے رہی تھیں۔ بڑے اسٹیشنوں پر تو رات کے وقت بھی خاصی گہما گہمی رہتی ہے۔ وہ اپنی جگہ پڑا قیاس آرائیاں کر رہا تھا کہ ربن کی گونجیلی آواز سن کر چونک گیا۔

''کدھر بھاگ رہا ہے رے؟'' وہ کسی سے کہہ رہا تھا۔ فاروق نے کروٹ بدل کر اصل صورتِ حال سمجھنے کی کوشش کی۔ شکنتلا اور ماجد علی دروازے کے قریب کھڑے تھے اور ربن نے ماجد علی کی کلائی تھام رکھی تھی۔ فاروق نے دیکھا کہ شکنتلا کے ہاتھ میں اس کا پرس موجود تھا جبکہ ماجد علی نے کندھے سے بیگ ٹانگ رکھا تھا یعنی وہ یہاں گاڑی سے اترنے کا ارادہ رکھتے تھے جبکہ ماجد علی کے مطابق ان کی منزل چنڈی گڑھ تھی۔

''ہماری مرضی ہم جہاں چاہے اتریں۔ آپ ہمیں روکنے والے کون ہوتے ہیں؟'' ماجد علی نے ربن کی دخل اندازی پر طیش کا اظہار کیا۔

''اپن خدائی فوجدار ہے اور تیرے کو اپنی مرضی کے بغیر نہیں جانے دے گا۔'' ربن نے ایک جھٹکے سے اسے اندر کی طرف کھینچ لیا۔ اس کی گرفت میں کچھ ایسی سختی رہی ہوگی کہ ماجد علی کی چیخ نکل گئی۔ شکنتلا نے بھی اس کا ساتھ دینے کے لیے ایک سریلی سی چیخ ماری۔ صورتِ حال کو دیکھ کر فاروق تیزی سے برتھ سے اترا اور ڈبے کا دروازہ بند کر دیا۔

''دیکھا...... دیکھا۔ میں نے تم سے کہا تھا نا کہ یہ بدمعاش ہیں اور ہمیں لوٹنے کی کوشش کریں گے۔'' ماجد علی شکنتلا سے مخاطب تھا۔

''ٹھیک پہچانا تو نے۔ اپن بدمعاش ہے۔ اکھا بمبئی اپن کو دادا کہہ کر پکارتا ہے پر اپن تیری طرح دھوکے باز نہیں ہے جو لونڈیا کو پٹا کر اسے لوٹنے چلا ہے۔'' ربن نے زہر خند لہجے میں اس کی بات کا جواب دیا اور اسے سیٹ پر پٹخ دیا۔ اس ہنگامے میں گولو اور کیتھرائن کی آنکھ بھی کھل چکی تھی اور دونوں کچھ نا سمجھی کے عالم میں یہ سب دیکھ رہے تھے۔ کیتھرائن کی آنکھوں میں حیرت تھی البتہ گولو حیران نہیں تھا۔ اس کے لیے ایسے مناظر نئے نہیں تھے۔

''بکواس مت کرو۔ میں کیوں شکنتلا کو لوٹوں گا۔ تمہاری ہی نیت خراب ہوگئی ہے۔'' ربن کی بات سن کر ماجد علی کے چہرے کا رنگ پل بھر کو بدلا لیکن پھر وہ سنبھل کر ربن پر الزام تراشی کرنے لگا۔

''اپنے کو کسی سے کچھ لینا ہو تو چاقو کی نوک نرخرے پر رکھ کر ایک جھٹکے میں نکلوا لیتے ہیں، تیری طرح لمبی چوڑی پلاننگ نہیں کرتے۔'' ربن نے اپنا پنجہ اس کے گلے پر جما کر انگلیوں کا دباؤ ڈالا۔ خوف و دہشت سے ماجد علی کی آنکھیں باہر نکل آئیں۔

''پلیز پلیز...... انہیں چھوڑ دیں۔ ہم نے ایک دوسرے کے مشورے سے ہی یہاں اترنے کا فیصلہ کیا تھا۔ ہمیں ڈر تھا کہ ہمدردی کی آڑ میں آپ لوگ ہمیں نقصان نہ پہنچا دیں۔'' ماجد علی کی حالت دیکھ کر شکنتلا نے جلدی سے عاجزانہ لہجے میں التجا کی۔ اسی وقت رکی ہوئی ریل گاڑی نے دوبارہ رینگنا شروع کر دیا۔ وہ واقعی کوئی چھوٹا اسٹیشن تھا جہاں گاڑی چند منٹ ہی رکی تھی۔

''یہ ڈر تجھے نہیں اسے تھا۔ نقصان ہوتا تو اس کا۔'' ربن نے ماجد علی کے گلے پر اپنی انگلیوں کا دباؤ کم کر دیا تھا لیکن لہجے میں اس کے لیے سختی برہی تھی۔

''آپ کیا کہہ رہے ہیں میری کچھ سمجھ میں نہیں آرہا۔'' وہ الجھی ہوئی سی ایک نشست پر ڈھے گئی۔

''بٹوے میں کتنا زیور اور نقدی بھر کر لائی ہے تو اس کے کہنے پر؟'' ربن نے تیوری چڑھا کر اس سے دریافت کیا۔ اس نے جواب دینے کے بجائے جلدی سے اپنے بڑے سے پرس کو سینے کے ساتھ بھینچ لیا۔

''اپنے کو تیرے مال سے کچھ لینا دینا نہیں ہے، پر اپن جانتا ہے کہ تو جو کچھ ساتھ لائی ہے اس کے کہنے پر لائی

ہوگی۔اس نے تیرے سے کہا ہوگا کپڑے لتے ساتھ لینے کی ضرورت نہیں ہے، جتنا نقد اور زیور گہنے لاسکتی ہے لے آ تاکہ بیاہ کے بعد آگے زندگی بسر کرنے میں آسانی رہے۔تجھ محبت کی ماری نے آنکھیں بند کرکے اس کی بات مان لی ہوگی۔'' ربن کی قیاس آرائیوں پر شکنتلا کے چہرے کا رنگ بدل گیا اور صاف محسوس ہونے لگا کہ بات وہی تھی جس کا اندازہ ربن نے لگایا تھا۔

''یہ آدمی تمہیں مجھ سے بدظن کرنے کی کوشش کر رہا ہے شکنتلا۔اس کی باتوں پر کان مت دھرو۔'' ماجد علی نے بے قرار ہوکر اسے نصیحت کی مگر اس بار بولنا اسے مہنگا پڑا۔ ربن نے بغیر کسی وارننگ کے اچانک ہی اس کے منہ پر ایک الٹے ہاتھ کا تھپڑ اتنی زور سے رسید کیا کہ اس کے ہونٹوں کا گوشہ پھٹ گیا اور خون کی پتلی سی لکیر بہتی نظر آنے لگی۔اس ایک تھپڑ کے بعد ربن کا ہاتھ اٹھتا ہی چلا گیا اور اس نے چند منٹوں کے اندر ماجد علی کو دھنک کر رکھ دیا۔شکنتلا نے اسے بچانے کے لیے اپنی جگہ سے اٹھنے کی کوشش کی لیکن فاروق اس اثنا میں اپنا چاقو نکال کر کھول چکا تھا۔ چاقو کو لہراتے ہوئے اس نے شکنتلا کو اپنی جگہ پر بیٹھے رہنے کا اشارہ کیا۔ اوپر برتھ سے یہ سارا منظر دیکھتی کیتھرائن کے چہرے پر خوف اتر آیا۔

''یہ سب کیا ہو رہا ہے؟'' اس نے فاروق سے انگریزی میں دریافت کیا۔

''آرام سے بیٹھو سسٹر۔تھوڑی دیر میں سب واضح ہوجائے گا۔'' اس نے بھی انگریزی میں ہی قدرے سخت لہجے میں جواب دیا۔ ادھر ربن متواتر ماجد علی کو تختۂ مشق بنائے ہوئے تھا۔

''بول کیا منصوبہ تھا تیرا؟ کیا کرنے والا تھا تو اس لونڈیا کے ساتھ؟'' ماجد علی کو مارتے ہوئے وہ مسلسل اس سے پوچھ رہا تھا۔اول اول ماجد علی کچھ بھی بتانے پر آمادہ نہیں ہوا لیکن جیسے جیسے ربن اس کی مرمت کرتا گیا، اس کی مزاحمت کم ہوتی چلی گئی اور آخرکار وہ مقام آگیا جب وہ سب کچھ سچ سچ بتانے پر آمادہ ہوچکا تھا۔اس نے تسلیم کیا کہ وہ شکنتلا سے محبت نہیں کرتا ہے اور محض ناٹک رچا کر اسے اس کے گھر سے نکال لایا ہے۔اسے گھر سے بھگا کر لے جانے کے پیچھے ایک سبب تو روپیا ہی تھا۔چندی گڑھ پہنچ کر وہ رہائش اور شادی کے انتظام کے بہانے اس سے وہ ساری نقدی اور زیور لے لیتا جو وہ اپنے ساتھ لائی تھی اور پھر کوشش کرکے خود شکنتلا کے بھی دام کھرے کرلیتا۔اپنے اس

کر یہہ منصوبے کے لیے اس نے شکنتلا کے باپ کو موردِالزام ٹھہرایا۔اس کے مطابق ملازمت کے دوسرے ماہ میں اس کی چھوٹی بہن شدید بیمار ہوگئی تھی۔بیماری کی نوعیت کچھ ایسی تھی کہ گھر میں موجود سارا روپیا پیسا اس پر لگا دینے کے باوجود اس کی حالت سنبھلنے میں نہیں آرہی تھی۔ ایسے میں ماجد علی نے شکنتلا کے باپ سیٹھ انوپم اگروال سے درخواست کی کہ وہ اسے بہن کے علاج کے لیے رقم ادھار دے دے اور بعد میں اس کی ٹیوشن فیس میں سے وہ رقم کاٹتا رہے۔حالات بہتر ہوتے تو وہ فیس کے علاوہ اپنی تنخواہ میں سے بھی قرض اتارنے کی کوشش کرتا لیکن سیٹھ نے اس کی درخواست کو ٹھکرادیا اور ساتھ ہی یہ تنبیہ بھی کرڈالی کہ آئندہ اگر وہ ایسے کسی مطالبے کے ساتھ اس کے سامنے آیا تو وہ اس سے شکنتلا کو ٹیوشن پڑھوانا ہی ختم کردے گا۔

اصل میں سیٹھ اول درجے کا کنجوس بنیا تھا جس کا دمڑی بھی کسی کو دیتے ہوئے دم نکلتا تھا۔سیٹھ کے اس جواب پر ماجد علی نے بے حد سبکی محسوس کی۔اس پر شومئی قسمت اس کی بیمار بہن بھی دنیا سے گزر گئی۔غصے اور نفرت میں ڈوبے ماجد علی نے سیٹھ کو سبق سکھانے کے لیے منصوبہ تیار کیا اور غیر محسوس طور پر شکنتلا کو اپنی طرف راغب کرنا شروع کردیا۔جب وہ پوری طرح اس کی محبت میں ڈوب گئی تو اپنے اور اس کے درمیان موجود تفریقات کا احساس دلا کر اس بات پر آمادہ کرلیا کہ وہ اس کے ساتھ گھر چھوڑ کر چل پڑے۔شکنتلا کی عمر اور تجربہ ہی کتنا تھا کہ وہ محسوس کرپاتی کہ اس کے ساتھ کس قسم کا دھوکا کیا جارہا ہے، سو وہ ماجد علی کے کہنے پر گھر سے نکل کھڑی ہوئی اور اب یہ اتفاق ہی تھا کہ ریل گاڑی میں ان کا واسطہ ربن اینڈ کمپنی سے پڑ گیا اور ربن نے معاملے کی گڑبڑ کو تاڑ لیا۔شکنتلا جو پہلے ربن کے ہاتھوں ماجد علی کی دھنائی ہونے پر تڑپ رہی تھی، اب خود سے ہونے والے دھوکے کے انکشاف پر نڈھال ہوگئی اور بری طرح رونے لگی۔اوپر برتھ پر موجود کیتھرائن، فاروق کے اشارے پر نیچے اتری اور اسے دلاسا دینے لگی۔

''میں نے تو اس آدمی کو اپنے من مندر میں دیوتا کی سی جگہ دی تھی۔یہ میرے ساتھ اتنا بڑا وشواس گھات کرے گا، میں سوچ بھی نہیں سکتی تھی۔'' وہ کیتھرائن کے شانے سے لگ کر روتی ہوئی بول رہی تھی۔اس کی حالت اس مسافر کی سی تھی جسے طویل سفر درپیش ہو اور آغاز میں ہی زادِراہ لٹ گیا ہو۔لٹے ہوئے مسافر کے پاس اپنے سفر کو جاری رکھنے کے لیے کوئی راہ نہیں ہوتی، بالکل اسی طرح وہ بھی بے بس

وہ مجبور ہوگئی تھی۔

"اپن اچھا آدمی نہیں ہے پر تو اتنا گھٹیا ہے کہ تیرے سامنے بڑے سے بڑا غنڈا بھی اچھا ہی ہوگا۔ دیکھ اس معصوم کو جو تیری محبت کے دھوکے میں اپنے پچھلوں کو چھوڑ آئی ہے۔ اس کے بلکنے سے تیرا من نہیں کانپتا؟" ربن نے شدید غصے میں بولتے ہوئے ماجد علی کو مزید دو چار تھپڑ رسید کر دیے۔

"مجھے معاف کر دیجیے۔ غصے اور نفرت کی آگ نے مجھے بہکا دیا تھا اور میں انسان سے حیوان بن گیا تھا۔ اب مجھے اپنے فعل پر شرمندگی ہو رہی ہے۔" ماجد علی دھاڑیں مار مار کر رونے لگا اور ربن کے قدموں میں سر رکھ دیا۔

"اپنے سے کیا معافی مانگتا ہے۔ معافی مانگنی ہے تو اس سے مانگ جس کی تونے زندگی خراب کر دی ہے۔"

ربن نے لات مار کر اسے خود سے دور کیا۔ وہ بلبلاتا ہوا شکنتلا کے قدموں میں جا بیٹھا۔ "مجھے معاف کر دو شکنتلا! میں نے تمہارے ساتھ بہت زیادتی کی۔" اس نے شکنتلا کے پیر پکڑنے چاہے لیکن اس نے ایک جھٹکے سے اپنے پیر اس سے دور کر لیے۔

"تم مجھے ایک موقع اور دو۔ اب میں تمہارے ساتھ کوئی دھوکا نہیں کروں گا اور تم سے کیے سارے وعدے نبھاؤں گا۔" مگرمچھ کے آنسو بہاتا وہ ایک بار پھر اسے رام کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔

"اب میں مر کر بھی تم پر وشواس نہیں کر سکتی۔ اب تم سونے کے بھی بن کر آجاؤ تو میں تمہیں سویکار کرنے والی نہیں ہوں۔ مجھے دکھ ہے کہ میں نے تمہارے ساتھ جیون بتانے کا سپنا دیکھا اور اپنے ماتا پتا کا وشواس توڑ کر تمہارے ساتھ چل پڑی۔" وہ جو اسے بہت محبت اور احترام سے "سر" کہہ کر مخاطب کرتی تھی، نفرت اور قہر میں ڈوبی آواز میں اس سے مخاطب تھی۔

"جو ہوا اسے بھول جاؤ۔ میں تم سے تمہارا ہر سپنا سچ کرنے کا وعدہ کرتا ہوں۔" وہ خاصا ڈھیٹ بندہ تھا جو شکنتلا کے لہجے کا برا منائے بغیر اس کی منت سماجت کر رہا تھا۔ یہ منت سماجت اس کی مجبوری بھی رہی ہوگی کیونکہ وہ سوچ رہا ہوگا کہ جن لوگوں نے اس پرائے پھڈے میں ٹانگ اڑائی ہے، وہ شکنتلا کی طرف سے معافی نہ ملنے کی صورت میں نہ جانے اس کے ساتھ کیا سلوک کریں۔

"اب تمہارے ساتھ جینے کی اچھا کرنے سے بہتر ہے کہ میں اس چلتی ٹرین سے کود کر اپنی جان دے دوں۔" وہ طیش میں آکر یکدم اپنی جگہ سے کھڑی ہوگئی۔ ساتھ بیٹھی کیتھرائن نے گھبرا کر اس کا بازو تھاما کہ کہیں وہ سچ مچ اپنے الفاظ پر عمل نہ کر گزرے۔

"تیرے کو چھلانگ لگانے کی کیا ضرورت ہے...... تو اپنے کو بول، ربن اس کو چلتی ٹرین سے اٹھا کر باہر پھینک دیتا ہے۔" ربن کے الفاظ پر ماجد علی کے چہرے کا رنگ زرد پڑ گیا اور وہ بری طرح لرزنے لگا۔

"پلیز شکنتلا! مجھے معاف کر دو۔ پلیز مان جاؤ۔ تم میرے ساتھ نہیں رہنا چاہتیں تو مت رہو لیکن ان لوگوں سے تو مجھے نجات دلا دو۔" اس کا لہجہ اور الفاظ گواہی دے رہے تھے کہ اسے اپنی غلطی کا اتنا احساس نہیں ہے جتنا وہ ربن سے خوف زدہ ہو گیا ہے۔ ربن نے اسے مارا بھی تو بڑی بے تکلفی سے تھا۔ ایسی مار کسی غنڈے کو بھی پڑتی تو بلبلا جاتا، ماجد علی جیسے "شریف بدمعاش" کی تو حالت خراب ہونی ہی تھی۔

"اسے چھوڑ دیجیے چاچا جی! میں نے اپنا اور اس کا معاملہ اوپر والے پر چھوڑ دیا ہے۔ اب بھگوان ہی اسے اس کے کیے کی سزا دے گا کیونکہ اس نے جتنا برا میرے ساتھ کیا ہے، میں اسے اس کی اتنی سخت سزا نہیں دے سکتی ہوں۔" شکنتلا نے ماجد علی کی طرف نظر اٹھا کر بھی نہیں دیکھا اور ربن سے مخاطب ہوئی۔

"ٹھیک ہے بیٹی جیسا تو چاہے۔" ربن بھی فوراً نرم پڑ گیا۔ ادھر معافی کا اعلان سن کر ماجد علی کے زرد چہرے پر رونق آگئی تھی۔ وہ باری باری ربن اور شکنتلا کا شکریہ ادا کرنے لگا لیکن دونوں ہی نے کسی قسم کا ردِعمل ظاہر نہیں کیا۔

اوروں کے ساتھ خاموش تماشائی بنے فاروق نے یہ منظر دیکھا تو دل میں سوچنے لگا کہ آدمی کے بھی کتنے روپ ہوتے ہیں اور وہ کیسے روپ بدل بدل کر سامنے آتا رہتا ہے۔ بمبئی سے شروع ہونے والے سفر کے آغاز سے اب تک ماجد علی کتنے رنگوں میں ان کے سامنے آیا تھا۔ شروع میں وہ ایک اکھڑا ہوا اور بے مروت سا نوجوان محسوس ہوتا تھا پھر کھانے میں ان کے ساتھ شامل ہونے کے بعد اس نے اپنا رنگ بدل لیا تھا اور مہذب وخوش اطوار محسوس ہونے لگا تھا لیکن یہ رنگ بھی کچا ثابت ہوا اور انہوں نے اسے ایک دھوکے باز اور لالچی فرد کی صورت اپنے سامنے پایا اور اب وہ اسے ایک خوشامدی وخود غرض آدمی کے روپ میں دیکھ رہا تھا جو کسی نہ کسی طرح اپنی جان بچا کر بھاگ جانا چاہتا تھا اور اسے اس بات سے غرض نہیں تھی کہ پیچھے شکنتلا کا کیا ہوگا۔ گھر سے نکل کر وہ تو بالکل بے آسرا ہوگئی تھی۔ ایک لڑکی دھ...

بہت کم عمر ہوتے ہوئے بھلا کیسے تنہا آدمیوں کے جنگل میں اپنا تحفظ کر سکتی تھی۔ کوئی مخلص آدمی ہوتا تو اسے ربن اینڈ کمپنی کے حوالے کرتے ہوئے بھی سو بار سوچتا کہ جو لوگ ابھی شگفتہ سے ہمدردی جتا رہے ہیں، بعد میں جانے کیسے ثابت ہوں اور کہیں اسے کوئی نقصان ہی نہ پہنچا دیں۔ وہ تو بس اس بات پر مطمئن نظر آرہا تھا کہ خود اس کی گلوخلاصی کی صورت نکل آئی تھی۔

''اگلا اسٹیشن آنے والا ہے تو وہاں گاڑی سے اتر جانا۔'' خاموشی کے چند پل بیتنے کے بعد ربن نے ماجد علی کو حکم دیا۔

''شکریہ۔ میں اتر جاؤں گا۔'' وہ فوراً رضامند ہو گیا اور اپنے بیگ کی طرف ہاتھ بڑھایا۔

''اسے چھوڑ دے۔ یہ تجھے نہیں ملے گا۔'' ربن نے فوراً ہی اسے ٹوک دیا۔

''للل...... لیکن اس میں میرے کپڑے اور کچھ رقم ہے۔ اس کے بغیر میں کیا کروں گا؟'' وہ ہٹپٹایا۔

''مرد بچہ ہے کچھ نہ کچھ کر ہی سکتا ہے، پر اس کا سوچ جسے تو محبت کا جھانسا دے کر اپنے ساتھ لایا تھا اور یوں بیچ راہ میں چھوڑ کر جا رہا ہے۔ یہ ابھاگن اب کیا کرے گی۔'' ربن کا لہجہ قہر آلود ہوا تو ماجد علی دم دبا کر بیٹھ گیا اور بیگ کی طرف سے اپنی نظریں پھیر لیں۔ ربن کی لگائی مار نے اس کا حلیہ اچھا خاصا خراب کر ڈالا تھا۔ جسم پر موجود کپڑے کئی جگہ سے پھٹ گئے تھے۔ چہرے اور جسم پر کئی نیل پڑے تھے۔ ماتھے پر بڑا سا گومڑ نکل آیا تھا اور باچھوں سے ہلکا ہلکا خون بہہ رہا تھا۔ وہ سمجھ سکتا تھا کہ جس آدمی نے اس کا یہ حال کیا ہے وہ حکم سے سرتابی کی کوشش کرنے پر دوبارہ اسے تختۂ مشق بنانے میں تکلف نہیں کرے گا اس لیے شرافت سے بیگ سے دست برداری قبول کر لی تھی۔

اسٹیشن آیا تو اس نے ربن پر ایک التجا آمیز نظر ڈالی اور وہاں کوئی نرمی نہ پا کر دوسری نظر شگفتہ پر ڈالنے کے بعد شکست خوردہ سا دروازے سے باہر نکل گیا۔ فاروق نے یہ بات خاص طور پر نوٹ کی تھی کہ ماجد علی کی شگفتہ کی طرف اٹھی نظروں کا مرکز شگفتہ سے زیادہ اس کے پہلو میں رکھا اس کا پرس تھا۔ یقینی طور پر اس پرس میں وہ نقدی اور زیور تھا جسے شگفتہ نئی زندگی کے آغاز کے لیے ماجد علی کے بہکانے پر اپنے باپ کے گھر سے لے آئی تھی اور ماجد علی کا اصل مقصد اسی کا حصول تھا۔ وہ اتنا خود غرض آدمی تھا کہ اپنے ذاتی مفادات کے حصول کے لیے اس نے ملک کی سیاسی صورت حال کی بھی پروا نہیں کی تھی حالانکہ ایک تعلیم یافتہ فرد ہونے کی حیثیت سے وہ سمجھ سکتا تھا کہ موجودہ حالات کتنے نازک ہیں۔

آزادی کی تحریک نے برسوں سے ساتھ رہتے ہندوؤں اور مسلمانوں کے درمیان عداوت کو کھل کر سامنے آنے کا موقع دے دیا تھا اور ذرا ذرا سی بات فسادات کی آگ بھڑکانے کا سبب بن جاتی تھی۔ شگفتہ کے ایک مسلمان کے ساتھ گھر سے بھاگ جانے کی خبر پھیلتی تو شر پسند عناصر اس موقعے کو کسی صورت ضائع نہ جانے دیتے اور انتہا پسند ہندو مسلمانوں پر ٹوٹ پڑتے کہ ان کی قوم کے فرد نے ہماری غیرت پر حملہ کیا ہے۔ اس بدبخت نے تو اپنے پیشے کے تقدس کا بھی خیال نہیں کیا تھا اور استاد و شاگرد کے مقدس پیشے کی بھی دھجیاں اڑا کر رکھ دی تھیں۔ وہ ٹرین سے نیچے اتر گیا تو خود پر ضبط کیے بیٹھی شگفتہ بری طرح سسکنے لگی۔ شاید آس کا کوئی دھاگا تھا جو اب بھی بندھا رہ گیا تھا۔ ماجد علی اسے چھوڑ کر چلا گیا تو وہ دھاگا بھی ٹوٹ گیا اور اس کے ٹوٹنے کی تکلیف سے وہ نڈھال ہو کر رونے لگی۔

''کیوں روتی ہے ری۔ اپنے کو چاچا بولی ہے تو سمجھ کہ چاچا کے ساتھ ہے۔ اپن تجھ پر کوئی آنچ نہیں آنے دے گا۔'' ربن اس کے پاس جا بیٹھا اور اس کے سر پر ہاتھ رکھ کر اسے سمجھانے لگا۔ ساتھ بیٹھی کیتھرائن بھی دلاسا دیتی رہی۔ گولو ایک گلاس میں پانی نکال لایا جسے کیتھرائن نے اصرار کر کے اسے پلایا۔ اپنے اپنے طور پر وہ سب ہی اسے احساس دلا رہے تھے کہ وہ مخلص لوگوں کے درمیان ہے اور ان کے ساتھ اسے کوئی نقصان پہنچنے کا اندیشہ نہیں ہے۔ واحد فاروق تھا جو ذرا بھی لب کشائی نہیں کر سکا تھا اور ایک نشست پر خاموشی سے لگا یہ سارا تماشا دیکھ رہا تھا۔ اسے لڑکی کے ساتھ پیش آئے حادثے پر دلی افسوس تھا لیکن خود کو کچھ بھی کہنے سے معذور پا رہا تھا۔

''تیرے گھر والوں کو پتا چل گیا ہوگا کہ تو کیوں اور کس کے ساتھ گھر چھوڑ کر نکلی ہے...... پیچھے کوئی چٹھی وغیرہ چھوڑی تھی کیا تو نے؟'' سب کی ہمدردی اور دلاسوں کے بعد وہ چپ ہوئی تو ربن نے اس سے دریافت کیا۔ جواب میں شگفتہ نے نفی میں سر ہلایا اور بتانے لگی۔

''میں ایک قریبی سہیلی کے ساتھ کمبائنڈ اسٹڈی کا بہانہ کر کے رات اس کے گھر رکنے کا کہہ کر نکلی تھی۔ ڈرائیور مجھے میری سہیلی کے گھر تک خود چھوڑ کر گیا تھا لیکن میں اس کے گھر کے اندر جانے کے بجائے پاس ہی انتظار میں کھڑے ماجد علی کے ساتھ اسٹیشن آ گئی تھی۔ گھر والوں کو

میرے غائب ہونے کی خبر اس وقت ہوگی جب میں دوپہر تک گھر نہیں پہنچوں گی۔'' اس نے بتایا۔

''اور تو یہ جو نقدی اور زیور گھر سے لے کر نکلی ہے اس کا کسی کو پتا نہیں چلے گا؟'' ربن نے اس کے پرس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے پوچھا۔

''یہ سب میں نے ممی کے لاکر سے نکالا ہے۔ اگر انہیں لاکر کھولنے کی ضرورت نہیں پڑی تو اس کی خبر بھی نہیں ہوسکے گی۔'' اس نے کچھ شرمندہ سے لہجے میں جواب دیا۔ یہ نقدی اور زیور جسے وہ ماجد علی کے ساتھ ایک نئی زندگی کے آغاز کے لیے اپنے ساتھ لے کر چلی تھی، خوابوں کی تعبیر کے بجائے محض مالِ مسروقہ بن کر رہ گیا تھا۔

''ٹھیک ہے، چندی گڑھ پہنچ جائیں پھر تیرے لیے کچھ کرتے ہیں۔ جو کچھ تو نے بتایا ہے اس سے تو لگتا ہے کہ تیری بچت کی کوئی نہ کوئی صورت نکل آئے گی۔ ٹیلی فون ہوگا نا تیرے گھر پر۔ اس کا نمبر یاد ہے؟'' سب جان لینے کے بعد ربن نے پُرسوچ لہجے میں کہتے ہوئے آخر میں اس سے پوچھا۔

''جی ہاں نمبر یاد ہے لیکن آپ کیا کرنے والے ہیں؟'' وہ کچھ گھبرائی۔

''چین سے بیٹھ۔ جو بھی کریں گے ڈھنگ سے کریں گے۔ تیرے کو پکڑائی میں نہیں آنے دیں گے۔'' ربن نے ذرا رعب سے اسے جواب دیا پھر باقی کا سفر ان سب نے ایسے ہی آنکھوں میں کاٹ دیا کہ نیند سب کی آنکھوں ہی سے اڑ چکی تھی۔ بے خوابی کی وجہ سے صبح کسی کو ناشتے کی خواہش بھی محسوس نہیں ہو رہی تھی۔ ڈائننگ کار سے بس تازہ چائے منگوالی گئی۔ چائے کے ساتھ گولو نے میوے کی پوریاں اور میٹھی ٹکیاں نکال لیں۔ سب نے ان ہی سے کسی حد تک شکم سیری کرلی۔

ریل چندی گڑھ کے ریلوے اسٹیشن پر رکی تو وہ اپنا سامان سمیت چکے تھے۔ اسٹیشن پر بھابیہ سیٹھ کا ڈرائیور حسبِ پروگرام انہیں لینے کے لیے پہنچا ہوا تھا۔ ربن نے اسے بتایا کہ پروگرام میں تھوڑی سی تبدیلی آگئی ہے۔ اب وہ فوری طور پر شملہ روانگی کے بجائے کچھ وقت چندی گڑھ میں گزارنے کا ارادہ رکھتے ہیں۔ ڈرائیور کو بھلا کیا اعتراض ہوسکتا تھا۔ اسے بھابیہ سیٹھ نے ان لوگوں کی خدمت کے لیے ہی مقرر کیا تھا۔ اب چاہے وہ شملہ میں رہتے یا چندی گڑھ میں رکتے اسے تو ان کے حکم کی تعمیل ہی کرنا تھی۔ بس وہ اتنا کرتا کہ شملہ میں اس بات کی اطلاع کردیتا کہ آنے والے مہمان فوری طور پر وہاں نہیں پہنچ رہے ہیں۔

''ادھر کسی اچھے ہوٹل میں لے چلو۔ اپنے ساتھ لیڈیز بھی ہے اس لیے ذرا ڈھنگ کا ہوٹل ہونا چاہیے۔'' ڈرائیور کو اپنے پروگرام سے آگاہ کرنے کے بعد ربن نے اسے حکم دیا۔

''او کے سر! میں آپ کو شوالک ویو ہوٹل لے چلتا ہوں۔ فیملی والوں کے لیے وہ ہوٹل اچھا ہے۔'' ڈرائیور نے جواب دیا اور ان لوگوں کا سامان ڈکی میں رکھنے لگا۔ یہ ایک بڑی گاڑی تھی جس کی ڈکی میں بھی خاصی گنجائش تھی۔ ان کا سارا سامان ڈکی میں سما گیا۔ صرف خواتین نے اپنے پرس اپنے ہاتھوں میں رکھے۔ وہ سب گاڑی میں سوار ہوگئے تو ڈرائیور نے گاڑی چلادی۔ اسٹیشن سے ہوٹل تک کا سفر طے کرتے ہوئے ان سب نے یہ بات خاص طور پر نوٹ کی کہ شہر میں ہریالی بہت ہے۔ پھول دار پودوں اور اشجار سے سجا یہ شہر آنکھوں کو بے حد بھلا لگ رہا تھا خاص طور پر اس لیے بھی کہ وہ بمبئی جیسے شہر سے یہاں آئے تھے جہاں بلند عمارتوں اور سڑکوں کے جال کے درمیان ہریالی بس تبرک کی طرح ہی نظر آتی تھی۔ چندی گڑھ کی ہریالی سے اپنی آنکھوں کو ٹھنڈک پہنچاتے وہ لوگ ہوٹل پہنچ گئے۔ ہوٹل واقعی صاف ستھرا تھا اور ماحول کا سکون دیکھ کر اندازہ ہو رہا تھا کہ یہاں شرفاء ہی قیام کرتے ہوں گے۔ یہاں ریسپشن پر گفتگو کرنے کے لیے ربن نے فاروق کو آگے کردیا کہ اس کا مہذب لب و لہجہ اور انگریزی دانی ہوٹل میں کمروں کے حصول کے لیے بہترین معاون ثابت ہوتی۔ جلد ہی انہیں کمرے دے دیے گئے۔ ربن کے حکم کے مطابق فاروق نے خواتین کے لیے ڈبل بیڈ کا ایک کمرا اور مردوں کے لیے علیحدہ علیحدہ سنگل بیڈروم بک کروائے تھے۔

کمروں کی بکنگ کے بعد پورٹرز نے انہیں ان کے سامان سمیت ان کے کمروں تک پہنچادیا۔ کھانے کے سلسلے میں انہوں نے پہلے ہی بتا دیا تھا کہ نہا دھو کر تازہ دم ہونے کے بعد ڈائننگ ہال میں ہی کھائیں گے اس لیے پورٹرز سامان کمروں میں رکھ کر واپس چلے گئے۔ کمروں کے ساتھ غسل خانے ملحق تھے۔ اگرچہ وہ فرسٹ کلاس میں سفر کر کے آئے تھے پھر بھی سفر کی تکان اتارنے کے لیے غسل کی ضرورت محسوس ہو رہی تھی چنانچہ سب ہی نے غسل کر کے لباس تبدیل کیے۔ تازہ دم ہونے کے بعد گولو اور فاروق تو اپنے اپنے کمروں تک ہی محدود رہے البتہ ربن نے لڑکیوں کے کمرے کا رخ کیا۔ وہ دونوں بھی تازہ دم ہوچکی تھیں۔ ربن کی دستک کے جواب میں دروازہ کھولنے کے لیے کیتھرائن آئی تھی۔ وہ کیتھرائن کے ہمراہ کمرے میں داخل

ہوا تو شگنتلا دونوں ہاتھ باندھے بیڈ پر گم صم سی بیٹھی نظر آئی۔

"کیا سوچ رہی ہے ری۔ اتنی فکر مت کر۔ ہم ہیں نا تیرے ساتھ۔ تیرے لیے کوئی نہ کوئی راہ نکال ہی لیں گے۔" اس کی پریشانی کو محسوس کرکے ربن نے اسے تسلی دی۔

"یہ بالکل ٹھیک کہہ رہے ہیں شگنتلا۔ یہ بہت مہربان اور انسان دوست لوگ ہیں۔ مجھے ان کی مہربانی کا ذاتی تجربہ ہے اس لیے تمہیں بھی یقین دلا سکتی ہوں کہ اگر انہوں نے تمہاری مدد کا وعدہ کیا ہے تو سمجھو تمہارا مسئلہ حل ہو جائے گا اور تم بالکل محفوظ رہو گی۔" کیتھرائن نے بھی اسے تسلی دی۔

"اپنے باپ کا ٹیلی فون نمبر دے مجھے۔ میں بمبئی کے لیے کال بک کرواتا ہوں۔" ربن نے اس سے فرمائش کی تو اس نے رونا شروع کردیا۔ کیتھرائن اسے خاموش کرواتی رہی۔

"پتا جی بہت سخت مزاج کے آدمی ہیں۔ انہیں یہ سب پتا لگے گا تو میری جان لے لیں گے۔" وہ خاصی خوف زدہ تھی۔ شاید اس کا باپ انوپم اگروال آدمیوں کی اس قسم سے تعلق رکھتا تھا جو اپنی اولاد کو ہر طرح کی آزادی اور سہولت دینے کے باوجود ان پر بہت زیادہ رعب رکھتے ہیں اور اولاد کو خود سے قریب نہیں آنے دیتے۔

"اپن تیرے کو گارنٹی دیتے ہیں کہ تیرے کو بچا لیں گے تو پھر کاہے کو فکر کرتی ہے۔" ربن نے اسے سمجھایا تو وہ فون نمبر دینے پر آمادہ ہوگئی۔ نمبر لینے کے بعد ربن اسے ایک بار پھر تسلی دے کر کمرے سے باہر نکل گیا۔ استقبالیہ پر نمبر دے کر اس نے کال بک کروانے کی فرمائش کی۔ استقبالیہ کلرک نے خندہ پیشانی سے اسے جواب دیا اور ایک گھنٹے بعد کی کال بک کروادی۔ گھنٹے بھر کا یہ وقفہ کھانا کھانے کے لیے کافی تھا چنانچہ اس نے سب کو ڈائننگ ہال میں جمع کرلیا۔ شگنتلا نے اپنا برقع ریل گاڑی سے اترنے سے قبل ہی اتار دیا تھا اور اس وقت گلابی رنگ کی پرنٹڈ ساڑی میں نظر آرہی تھی۔ کیتھرائن نے ہلکے آسمانی رنگ کے لانگ اسکرٹ کے ساتھ سفید بلاؤز پہن رکھا تھا۔ ہلکے رنگوں کے لباس میں دونوں لڑکیاں اپنی اپنی جگہ منفرد اور پیاری لگ رہی تھیں۔ فرق صرف اتنا تھا کہ کیتھرائن ایک بھرپور نوجوان دوشیزہ دکھائی دیتی تھی جبکہ شگنتلا کے وجود میں ابھی جوانی انگڑائیاں لے رہی تھی اور وہ ادھ کھلی کلی کے مانند نظر آتی تھی۔

سب کی پسند دریافت کرنے کے بعد کھانے کا آرڈر فاروق نے دیا.... ان لوگوں نے ناشتا صحیح طرح نہیں کیا تھا چنانچہ اب کھانا آیا تو سب نے کھل کر کھایا۔ کھانا تھا بھی خوش رنگ وخوش ذائقہ چنانچہ سب ہی نے انصاف کیا۔

صرف شگنتلا ہی اعصابی دباؤ کی وجہ سے کچھ پیچھے رہی تھی لیکن ان لوگوں نے اصرار کرکے اسے بھی اچھا خاصا کھلا پلا دیا۔ کھانے کے بعد سبز چائے کا دور چلا، یوں گھنٹے بھر کا دورانیہ آرام سے گزر گیا۔ گھنٹا پورا ہونے سے چند منٹ قبل ربن فاروق اور شگنتلا کو اپنے ساتھ آنے کا اشارہ کرکے اپنی جگہ سے اٹھ کھڑا ہوا۔ استقبالیہ پر موجود کلرک سے اس نے یہ بات پہلے ہی کہہ دی تھی کہ وہ یہاں کاؤنٹر پر کھڑے ہوکر گفتگو کرنے کے بجائے کسی الگ تھلگ کمرے میں بیٹھ کر کال کرنا پسند کرے گا۔ کال بک بھی اتنے ٹائم کے لیے کروائی گئی تھی کہ کلرک نے بھی سمجھ لیا تھا کہ وہ کھڑے کھڑے بات نہیں کرسکے گا۔ اس لیے اس نے یقین دہانی کروادی تھی کہ اس کا مطالبہ پورا کردیا جائے گا۔

جب وہ تینوں استقبالیہ پر پہنچے تو اس نے بغیر کچھ کہے ہی انہیں اپنے ساتھ آنے کا اشارہ کیا اور انہیں دفتر کے انداز میں سجے ایک کمرے میں پہنچا دیا۔ کمرا زیادہ بڑا نہیں تھا لیکن میز اور کرسیوں کی سیٹنگ اس انداز میں کی گئی تھی کہ تنگی کا احساس نہیں ہوتا تھا۔ ان تینوں کے کرسیاں سنبھالنے کے بعد وہ باہر نکل گیا البتہ جاتے جاتے اتنا ضرور کہہ گیا تھا کہ اگر کسی خدمت کی ضرورت ہو تو وہ حاضر ہو جائے گا۔ اس کے جانے کے بعد وہ تینوں فون کی گھنٹی بجنے کا انتظار کرنے لگے۔ سبز چائے کے دوران ربن نے اچھی طرح سمجھا دیا تھا کہ کیا اور کیسے بات کرنی ہے۔ فون کی گھنٹی بجی تو فاروق نے ریسیور اٹھا کر کان سے لگایا۔ دوسری طرف آپریٹر تھا جو کال مل جانے کی اطلاع دے رہا تھا۔ فاروق نے اسے اوکے کہہ کر ریسیور شگنتلا کو تھما دیا۔ اس نے کانپتے ہاتھوں سے ریسیور تھاما۔ دوسری طرف سے کال ریسیو کرنے والے کی "ہیلو" اتنی زوردار تھی کہ ربن اور فاروق نے بھی واضح طور پر آواز سنی۔ شگنتلا اس آواز کو سن کر کانپ سی گئی۔ اس کے ساتھ والی کرسی پر بیٹھے ربن نے اس کے سر پر ہاتھ رکھ کر اسے خاموش دلاسا دیا تو وہ کچھ کہنے کے قابل ہوسکی۔

"نمسکار پتا جی! میں شگنتلا بول رہی ہوں۔" اپنی تمام تر ہمت جمع کرکے اس نے گفتگو کا آغاز کیا۔

"شگنتلا......" بیٹی کی آواز سن کر انوپم اگروال حیرت زدہ رہ گیا۔ "آپریٹر نے تو مجھے بتایا تھا کہ چندی گڑھ سے کال ہے پھر تم کہاں سے بیچ میں آگئیں۔ تم تو اپنی سہیلی آشا کے گھر کمبائن اسٹڈی کے لیے گئی ہوئی تھیں نا؟" حیرت ہی حیرت تھی جس نے انوپم اگروال کو گھیر لیا تھا۔

"میں آشا کے گھر نہیں ہوں پتا جی۔ میں چندی گڑھ

میں ہوں اور وہیں سے کال کر رہی ہوں۔'' شکنتلا نے کانپتی آواز میں اسے بتایا۔

''واٹ۔'' انوپم اگروال نے اس لہجے میں کہا کہ اس کے نظر نہ آنے کے باوجود وہ لوگ یقین سے کہہ سکتے تھے کہ وہ اپنی جگہ سے اٹھ کھڑا ہوا ہوگا۔

''میں چندی گڑھ میں ہوں پتاجی۔'' شکنتلا نے اپنی بات دہرائی اور یکدم ہی پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔

''شکو...... پرابلم کیا ہے بیٹی۔ تم وہاں کیسے پہنچیں؟'' انوپم جو ابھی تک حیران تھا، اس کے رونے کی آواز سن کر بے حد پریشان بھی ہوگیا۔ ہچکیوں سے روتی شکنتلا اس قابل نہیں تھی کہ باپ کے کسی سوال کا جواب دے سکے چنانچہ ربن نے اس کے ہاتھ سے ریسیور لے لیا اور ٹھہری ہوئی آواز میں بولا۔

''نمسکار بڑے صاحب۔''

''کک...... کون ہو تم اور میری بیٹی تمہارے پاس کیسے پہنچی؟'' وہ فون پر اجنبی مرد کی آواز سن کر مزید پریشان ہوگیا۔

''اپنے کو ربن کہتے ہیں۔ ادھر بمبئی کے ہی رہنے والے ہیں۔ اپنے کسی کام سے ادھر چندی گڑھ آرہے تھے، ٹرین میں تمہاری بیٹی مل گئی۔ اکیلی بچی کسی مشکل میں نہ پھنس جائے اس لیے اپن اسے اپنے ساتھ ہوٹل لے کر آگئے۔ ابھی اپنے کو آگے شملہ جانا ہے ورنہ الٹے پیر لوٹ کر بچی کو تمہارے پاس بمبئی پہنچا دیتے۔ ابھی تم تکلیف اٹھاؤ اور خود یہاں آکر اسے اپنے ساتھ واپس لے جاؤ۔'' ربن نے اپنے مخصوص انداز میں گفتگو چھیڑی۔

''آپ کیا کہہ رہے ہیں میری سمجھ میں کچھ نہیں آرہا۔ شکنتلا تو یہیں بمبئی میں اپنی سہیلی کے گھر گئی تھی پھر وہ ٹرین میں کیسے پہنچ گئی؟'' وہ اب بھی الجھا ہوا تھا لیکن ربن کی آواز نے جو اس پر پہلے پہل ڈنک کھانے کی سی کیفیت طاری کردی تھی، اس میں کمی واقع ہوگئی تھی اور یہ محسوس کر کے کہ اس کی بیٹی اجنبیوں کے درمیان ہی سہی لیکن محفوظ ہے، وہ تھوڑا نرم پڑ گیا تھا۔

''اس بات کو جانے دو سیٹھ۔ بچے کبھی کبھی بڑی غلطیاں کر جاتے ہیں۔ شکنتلا نے تجھ سے جھوٹ بولا تھا کہ سہیلی کے ساتھ اسٹڈی کرنے اس کے گھر جارہی ہے۔ وہ اپنے ہم جماعتوں کے ساتھ گھومنے نکلی تھی۔ تیرے کو معلوم ہوگا کہ جب چار نوجوان ملتے ہیں تو انہیں شوخی زیادہ ہی سوجھتی ہے۔ شکنتلا اور اس کے ساتھیوں نے بھی سوچا کہ بغیر ٹکٹ کے ٹرین میں سفر کرتے ہیں۔ ان کا لوکل ٹرین میں بیٹھ کر شہر کے اندر اندر ایک اسٹیشن سے دوسرے تک جانے کا پروگرام تھا۔ پکڑے نہ جائیں اس لیے سب الگ الگ ہوگئے تھے۔ شکنتلا سے غلطی ہوئی کہ یہ چندی گڑھ جانے والی ٹرین میں سوار ہوگئی۔ اسے اپنی غلطی کا پتا بھی بہت دیر سے لگا، بس اپسے یہ پھنس گئی۔ اپن بیچ میں کہیں اتر کر اپنا پروگرام خراب نہیں کر سکتے تھے اس لیے اسے اپنے ساتھ لے آئے اور اب یہاں چندی گڑھ رک کر تمہیں فون کر رہے ہیں۔ تم بتاؤ کہ کب تک اسے لینے پہنچ جاؤ گے۔ اپنے کو آگے بھی جانے کا ہے۔'' ربن نے اپنی سوچی ہوئی کہانی اسے سنا ڈالی۔ شکنتلا جس کے رونے میں اب قدرے کمی آگئی تھی، شکر گزار نظروں سے اسے دیکھتی رہی۔

''میں جتنی جلدی ہوسکا آتا ہوں۔ ابھی معلوم کرتا ہوں کہ بمبئی سے چندی گڑھ کے لیے پہلی فلائٹ کب ملتی ہے۔ آپ مجھے ہوٹل کا نام، فون نمبر اور اپنا کمرا نمبر بتادیں۔ سیٹ کنفرم ہونے کے بعد میں آپ کو انفارم کردوں گا۔'' وہ جلدی جلدی بول رہا تھا۔ ربن نے اسے اس کی مطلوبہ معلومات فراہم کردیں۔

''تھینک یو سوچ۔ میں بس پہلی فلائٹ سے پہنچتا ہوں۔ آپ اس بیچ شکنتلا کا خیال رکھیے گا۔'' وہ یقینی طور پر بیٹی کے ایک دوسرے شہر میں اجنبی لوگوں کے درمیان موجود ہونے سے بوکھلایا ہوا تھا۔

''بولنے کا ضرورت نہیں ہے سیٹھ۔ اپن پہلے ہی اس کا اپنی بیٹیوں کی طرح خیال رکھ رہے ہیں۔''

''جی جی۔ مجھے احساس ہے اور میں اس کے لیے آپ کو بہت بہت دھنیواد بھی کہتا ہوں۔'' ربن کے جتانے پر وہ جلدی سے بولا اور دوبارہ شکنتلا سے بات کروانے کی خواہش ظاہر کی۔ ربن نے ریسیور شکنتلا کو تھما دیا۔ دوسری طرف سے انوپم اگروال دھیمی آواز میں اس سے بات کرنے لگا تھا اس لیے اب اس کی آواز ربن اور فاروق کو سنائی نہیں دے رہی تھی۔ شکنتلا بھی اس کی باتوں کے جواب میں صرف ہاں، ہوں، ٹھیک ہے پتاجی سے زیادہ نہیں بول رہی تھی اس لیے یک طرفہ گفتگو سے بھی کچھ سمجھنا مشکل تھا لیکن وہ دونوں اندازہ کر سکتے تھے کہ ایک باپ اجنبیوں کے درمیان موجود اپنی نوعمر بیٹی کو کس طرح کی نصیحتوں اور ہدایات سے نواز رہا ہوگا۔ ابھی یہ سلسلہ جاری تھا کہ کال کا وقت ختم ہوگیا اور لائن کٹ گئی۔

''اگر اور بات کرنے کی ہے تو بول۔ اپن دوبارہ

کال بک کروا دیں گے۔'' ربن نے شفقت سے اس سے دریافت کیا۔

''نہیں۔ چاچا جی کو بات کرنی ہوئی تو وہ خود کال کرلیں گے۔'' اس نے انکار کیا اور پھر یکدم ہی ربن کے دونوں ہاتھ تھام کر ان پر بوسہ دیتے ہوئے بولی۔ ''بہت بہت دھنیواد چاچا جی! آپ کا یہ سلوک میں سارا جیون نہیں بھولوں گی۔''

''چاچا جی بولتی ہے اور شکریہ بھی ادا کرتی ہے۔ شکریہ نہ بول بس یہ یاد رکھ کہ میرے جیسے چاچا جی ہمیشہ نہیں ملتے، پر ماجد علی جیسے لٹیرے بہت ملتے ہیں۔ ان لٹیروں سے بچنے کے لیے عورت ذات کو اپنی عقل کی آنکھیں پوری طرح کھلی رکھنی ہوتی ہیں ورنہ بری طرح لٹ جاتی ہے۔'' ربن نے اسے نصیحت کی۔

''میں آپ کی یہ ایڈوائز ہمیشہ یاد رکھوں گی چاچا جی۔'' شکنتلا نے اسے یقین دہانی کروائی۔

''چل۔ اب جا کر تھوڑی دیر اپنے کمرے میں آرام کرلے۔ تیرے پتا کو یہاں پہنچنے میں معلوم نہیں کتنا سمے لگے گا۔ اگر ٹائم ہوا تو شام میں فاروق کے ساتھ جا کر تم لوگ شہر دیکھ آنا۔'' ربن نے ایک بار پھر شکنتلا کے ساتھ شفقت کا مظاہرہ کیا۔ اس سارے منظر میں خاموش آدمی کا کردار ادا کرنے والے فاروق نے اس کا یہ روپ دیکھا تو سوچتا رہ گیا کہ ایسے شفیق آدمی نے بھابیہ کے بھتیجے منوہر بھابیہ کو نمونہ عبرت بنانے کے لیے خود پر جبر کیا ہوگا یا اپنا چولا بدلا ہوگا۔ برسوں کے ساتھ کے باوجود ربن کا سامنے آنے والا ہر نیا روپ اب بھی اسے حیران کردیتا تھا۔

☆☆☆

پنڈال کھچا کھچ لوگوں سے بھرا ہوا تھا۔ لوگوں کی اکثریت ہندوؤں پر مشتمل تھی لیکن مسلمانوں کی بھی اچھی خاصی تعداد موجود تھی۔ یہ وہ مسلمان تھے جو ابھی تک متحدہ ہندوستان کے حامی تھے اور ملک کے بٹوارے کے خلاف کانگریس کا ساتھ دے رہے تھے۔ کانگریس کی اس جلسہ گاہ میں موجود یہ ہجوم گاہے بگاہے جوشیلے نعرے بھی لگا رہا تھا۔ کانگریس کی لیڈر شپ جلسہ گاہ کے اسٹیج پر موجود تھی اور ہاتھوں کے اشارے سے لوگوں کے نعروں کا جواب دیا جا رہا تھا۔ اس پُرہجوم و پُرشور جلسہ گاہ میں جولیٹ بھی ایک فوٹوگرافر کے ساتھ اپنے اخبار کی نمائندگی کے لیے موجود تھی اور بہ ظاہر اپنی پیشہ ورانہ ذمے داریاں نبھا رہی تھی لیکن دل میں جلتا انتقام کا الاؤ ہر پل اسے یاد دلا رہا تھا کہ وہ یہاں دلدار آغا کو انجام تک پہنچانے کے لیے آئی ہے۔ فوٹوگرافر کو مختلف زاویوں سے تصاویر اتارنے کی ہدایت دیتے ہوئے خود اس کی نگاہیں دلدار آغا پر جمی ہوئی تھیں۔ آغا اپنی لیڈرشپ کے حکم پر بیرونِ ملک سے واپس آگیا تھا اور اب شیڈول کے مطابق ہونے والے جلسوں میں شرکت کر رہا تھا۔

اسٹیج پر بالکل پیچھے کی جانب ایک قطار میں کرسیاں لگی ہوئی تھیں جن پر دوسرے راہنماؤں کے ساتھ ہی آغا بھی براجمان تھا۔ جولیٹ کے پاس اس جلسے کی مکمل تفصیل موجود تھی اور اس تفصیل کے مطابق جن راہنماؤں نے جلسے سے خطاب کرنا تھا ان میں آغا کا نام شامل نہیں تھا۔ بطور صحافی جولیٹ کو جلسہ گاہ میں بالکل آگے جگہ ملی تھی لیکن پھر بھی وہ اسٹیج سے اچھے خاصے فاصلے پر موجود تھی۔ اگر آغا جلسے سے خطاب کرنے آگے ڈائس تک آتا تب بھی یہ ممکن تھا کہ وہ نشانہ بازی کی مشق کا فائدہ اٹھاتے ہوئے اس کو چاقو پھینک کر نشانہ بنانے کی کوشش کرتی لیکن جس جگہ آغا بیٹھا ہوا تھا، وہاں تک اس کے چاقو کا پہنچنا ناممکن ہوتا۔ اپنی جگہ موجود آغا کو دیکھ دیکھ کر پیچ و تاب کھاتے ہوئے اس کا دماغ مسلسل ایسی کوئی تدبیر سوچنے میں مصروف تھا کہ کسی طرح وہ آغا کے نزدیک پہنچ سکے۔ مسلسل ذہنی مشق نے آخر اسے ایک تدبیر سجھا ہی دی۔ اس نے اپنے ساتھ موجود فوٹوگرافر کو اشارے سے قریب بلایا اور بولی۔ ''سراج! کیمرا مجھے دو۔ دو تین تصویریں میں خود کھینچوں گی۔''

''آپ مجھے بتادیں میڈم۔ آپ جیسی چاہیں گی میں ویسی تصویر کھینچ دوں گا۔'' فوٹوگرافر نے مؤدبانہ پیشکش کی۔

''نہیں، تم نہیں کھینچ سکو گے۔ میں اپنے عورت ہونے کا فائدہ اٹھا کر زیادہ آگے تک جاسکتی ہوں۔ تم کیمرا مجھے دے دو۔'' اس نے فوٹوگرافر کو جواب دیتے ہوئے کیمرا لینے کے لیے ہاتھ آگے بڑھایا تو اس بار وہ اسے انکار نہیں کرسکا۔ جولیٹ نے اس سے کیمرا لے لیا اور اسٹیج کی طرف بڑھتی چلی گئی۔ اس وقت ڈائس پر ایک لیڈر کھڑا تقریر کر رہا تھا اور سامنے موجود ہجوم کے علاوہ اسٹیج پر براجمان صاحبان کی توجہ بھی اسی کی طرف مبذول تھی۔ جولیٹ نے اسٹیج کی سیڑھیاں چڑھنا شروع کیں تو سیکیورٹی پر مامور ایک کارکن نے اسے روک لیا۔

''سوری میڈم! یہاں سے آگے کسی کو بھی جانے کی اجازت نہیں ہے۔'' گلے میں لٹکا کارڈ اور ہاتھ میں موجود کیمرا اس کے صحافی ہونے کا اعلان کر رہے تھے اس لیے پارٹی کارکن نے اسے نہایت ادب کے ساتھ اوپر جانے

سے روکا تھا۔
''پلیز...... میں صرف قریب سے دو تین تصویریں لینا چاہتی ہوں۔ دور سے اسٹیج پر بیٹھے لیڈرز کی تصویر واضح نہیں آرہی ہے اس لیے میں اوپر جاکر تصویر لینا چاہتی ہوں۔'' اس نے دلنشین مسکراہٹ ہونٹوں پر سجانے کے ساتھ لہجے کو اتنا ملتجیانہ کرلیا کہ کارکن تذبذب میں پڑ گیا۔
''بس چند سیکنڈ کا کام ہے۔ میں فوراً نیچے اتر جاؤں گی۔'' اس کو تذبذب میں دیکھتے ہوئے اس نے ایک بار پھر لجاجت سے درخواست کی۔ اس بار وہ اسے اجازت دینے پر مجبور ہو ہی گیا۔
''بس صرف دو منٹ کے لیے۔ اس کے بعد آپ فوراً نیچے اتر جائیں گی۔'' اس نے جولیٹ کو مشروط اجازت دی۔
''اوکے اینڈ تھینک یو سو مچ۔'' جولیٹ لہراتی ہوئی آگے بڑھی۔ پارٹی کارکن کو منانے کے لیے اختیار کیے ہوئے شوخ انداز کے برعکس اندرونی طور پر وہ سخت مضطرب تھی اور سیڑھیاں چڑھتے ہوئے اس کی ٹانگیں لرز رہی تھیں۔ ٹانگوں کی اس لرزش کے دوران بھی وہ لمبی جراب میں چھپے چاقو کا لمس اپنی دائیں پنڈلی پر خوب محسوس کررہی تھی۔ جراب میں چھپے اس چاقو کو پوشیدہ رکھنے کے لیے اس نے ٹخنوں کو چھوتا لانگ اسکرٹ پہن رکھا تھا۔ اسکرٹ اور پھول دار بلاؤز کا یہ پہناوا اس کے متناسب جسم پر خوب جچ رہا تھا یہی وجہ تھی کہ وہ سیڑھیاں چڑھ کر اسٹیج پر پہنچی تو کرسیوں پر بیٹھے حضرات کی توجہ خود بخود اس کی طرف مبذول ہوگئی۔ خود کو توجہ کا مرکز بنتے دیکھ کر وہ ذرا سی کنفیوز ہوگئی۔ خود پر جمی اتنی ساری نظروں کی موجودگی میں وہ جراب میں چھپے چاقو کو کیسے نکال سکتی تھی لیکن جلد ہی اس کا یہ مسئلہ حل ہوگیا۔ ڈائس پر موجود لیڈر کی تقریر میں اچانک ہی تندی آگئی تھی اور وہ عالمِ جوش میں تقریباً چنگھاڑ رہا تھا چنانچہ اس کے ساتھی راہنماؤں نے ایک خوب صورت لڑکی کو دیکھنے کے مقابلے میں اس کی بات سننا زیادہ مناسب سمجھا۔ نظروں کے زاویے بدلے تو جولیٹ نے اطمینان کا سانس لیا اور قطار میں لگی کرسیوں سے ذرا فاصلے پر عین دلدار آغا کے مقابل گھٹنوں کے بل بیٹھ گئی۔ عین اسی وقت آغا اس کی طرف متوجہ ہوا اور اس کی آنکھوں میں شناسائی کی لہر چمکنے کے ساتھ ساتھ ہونٹوں پر مسکراہٹ بھی جاگی۔ اس مسکراہٹ میں جولیٹ کو خباثت نظر آئی۔ وہی خباثت جس نے اس کی زندگی کو برباد کرکے رکھ دیا تھا۔
سخت عالمِ طیش میں اس نے اپنا دایاں ہاتھ پیچھے لے جاکر پیچھے کی طرف مڑی اپنی ٹانگ کی جراب سے چاقو کھینچنے کی کوشش کی۔ چاقو کا دستہ اس کی انگلیوں کی گرفت میں آ بھی گیا لیکن وہ اسے باہر نہیں نکال سکی۔ اسے یوں لگا کہ اس کی انگلیاں چاقو کے دستے پر منجمد ہوگئی ہوں اور چاہتے ہوئے بھی انہیں حرکت دینے سے قاصر ہو۔۔۔ ایسا کیوں ہے وہ سمجھ نہیں پارہی تھی بس یوں محسوس ہورہا تھا کہ کسی غیبی قوت نے اس کی انگلیوں کی طاقت سلب کرلی ہے اور وہ انہیں حرکت نہیں دے سکتی۔ اپنی اس بے بسی پر سخت الجھن اور جھنجلاہٹ محسوس کرتے ہوئے اس نے ایک بار پھر دلدار آغا کی طرف دیکھا۔ اس کے ہونٹوں پر ہنوز مسکراہٹ تھی اور یوں محسوس ہورہا تھا کہ وہ جولیٹ کو کیمرا بدست دیکھ کرلی جانے والی تصویر کے لیے خصوصی پوز دے رہا ہو۔ آغا کی مسکراہٹ نے اس کے اشتعال کو مزید بڑھادیا اور غصے کی شدت کے باعث اس کا چہرہ سرخ ہوگیا لیکن رگ و پے میں دوڑتی طیش کی لہر کے باوجود وہ اپنی منجمد انگلیوں کو حرکت دینے میں کامیاب نہیں ہوسکی۔
''پلیز میڈم! آپ نیچے چلیے۔'' وہ جو اپنی جدوجہد میں معروف اردگرد کے ماحول کو فراموش کرچکی تھی، قریب سے سنائی دینے والی اس آواز پر چونکی۔ وہ رضا کار جس کی اجازت سے وہ اسٹیج پر آئی تھی، اس کے قریب جھکا اس سے مخاطب تھا۔ وہ صرف ایک فوٹوگراف لینے کا کہہ کر اسٹیج پر چڑھی تھی اور ظاہر ہے اس کا اسٹیج پر ٹھہرنے کا دورانیہ اس حساب سے خاصا بڑھ گیا تھا۔
''میرا کیمرا کچھ گڑبڑ کررہا ہے۔ اس لیے مجھے کچھ دیر لگ گئی...... سوری۔'' اس نے بہ مشکل ہونٹوں پر مسکراہٹ سجا کر یہ جملہ کہا اور اپنا ہاتھ واپس کھینچ لیا۔ رضا کار کارکن کے اپنے اتنے قریب موجود ہونے کے باعث اب ویسے بھی اس کے لیے چاقو کا استعمال ممکن نہیں رہا تھا۔ ہاتھ سامنے لانے کے بعد اس نے عجلت میں کیمرے کا بٹن دبا کر دو تصویریں لیں اور شل ہوتی ٹانگوں کو گھسیٹتی ہوئی اسٹیج سے نیچے اتر گئی۔ نیچے اس کا ساتھی فوٹو گرافر اس کا منتظر تھا۔ جولیٹ نے اسے کیمرا واپس کیا اور خود اس حصے میں جا بیٹھی جو صحافیوں کے لیے مخصوص کیا گیا تھا۔ وہ اتنی گم صم تھی کہ اس نے اپنے ساتھی فوٹوگرافر کا شکریہ تک نہیں سنا تھا۔ حقیقتاً اسے یہ بھی نہیں پتا تھا کہ جن تصاویر کے لیے وہ اس کا شکریہ ادا کررہا ہے وہ کیسی آئی ہوں گی کیونکہ اس نے تو غائب دماغی کے عالم میں کیمرے کا بٹن دبا دیا تھا۔ کیمرے نے کیا فوکس کیا ہے اور کیا نہیں، اسے

کچھ خبر نہیں تھی۔ اب بھی وہ جرنلسٹ ونگ میں بیٹھی اپنے دائیں ہاتھ کی انگلیوں کو اس طرح چھو چھو کر دیکھ رہی تھی جیسے ان کے صحت یاب ہونے کا یقین چاہتی ہو۔ آغا پر حملے کے لیے چاقو کے دستے پر جمی ان انگلیوں نے حرکت کرنے سے یکسر انکار کر دیا تھا اور پھر لمحہ بھر بعد ہی کیمرے کے بٹن پر خوب چلی تھیں۔ اب بھی وہ پوری طرح حرکت کر رہی تھیں۔ پھر...... پھر عین اس وقت کیا ہو گیا تھا کہ اس کی انگلیوں نے حرکت کرنے سے انکار کر دیا تھا؟ وہ بہت سوچنے پر بھی اس سوال کا جواب تلاش کرنے سے قاصر تھی۔

☆☆☆

''لڑکیوں کو ذرا شہر گھما لا۔ شکنتلا کے باپ کا فون آیا تھا۔ وہ رات نو بجے تک یہاں پہنچے گا۔ اتنی دیر کمروں میں پڑے پڑے بور ہونے سے بہتر ہے کہ شہر گھوم آ۔ لڑکیوں کا بھی دل بہل جائے گا اور گولو بھی خوش ہو جائے گا۔'' وہ آنکھیں موندے اپنے کمرے میں لیٹا ہوا تھا کہ ربن وہاں چلا آیا اور اس سے مخاطب ہوا۔

''تم چلے جاؤ میرا دل نہیں چاہ رہا۔'' اس نے کسلمندی سے انکار کیا۔

''کیوں طبیعت تو ٹھیک ہے تیری...... کہیں سر میں درد تو نہیں ہو رہا؟'' اس کے انکار پر ربن نے تشویش کا اظہار کیا اور جواب کا انتظار کیے بغیر مزید بولا۔ ''میں کیتھی کو بلاتا ہوں، تیرے کو چیک کر لے گی۔''

''اس کی ضرورت نہیں ہے استاد۔ میں بالکل ٹھیک ہوں۔ سسٹر ابھی تھوڑی دیر پہلے ہی میرا چیک اپ کر کے گئی ہے اور دوائیں بھی کھلا دی ہیں۔ مجھے بس سستی سی ہو رہی تھی اس لیے جانے سے منع کر رہا ہوں۔'' فاروق نے فوراً ہی اسے روک کر اپنے انکار کی وضاحت کی۔

''ایسے بستر پر پڑا رہے گا تو سستی ہی ہو گی۔ ذرا اٹھ کر باہر نکل اور گھوم پھر...... ہاتھ پیر کھلیں گے تو سستی خود ہی دور ہو جائے گی۔ اتنا خوب صورت شہر ہے۔ یہاں آ کر بستر پر پڑے رہنا تو بے وقوفی ہو گی۔ چل اٹھ، اٹھ کر کپڑے وپڑے بدل اور تھوڑا گھوم پھر کر آ۔'' ربن کے لہجے میں وہی شفقت بھرا حکم تھا جو کوئی بھی محبت کرنے والے بزرگ کے لہجے میں اپنے چھوٹوں کے لیے ہوتا ہے۔ ہمیشہ کی طرح اس وقت بھی فاروق اس کے آگے ہار گیا اور بستر چھوڑ دیا۔ استری شدہ کپڑے قرینے سے تہ کیے ہوئے اس کے سامان کے ساتھ موجود تھے چنانچہ اسے تیار ہونے میں چند منٹ سے زیادہ نہیں لگے۔ وہ عموماً پینٹ شرٹ پہنتا تھا اس لیے اس کے سفری سامان میں بھی اسی لباس کی تعداد زیادہ تھی لیکن چند جوڑے کرتہ شلوار کے بھی موجود تھے۔ اس وقت کیونکہ وہ ذرا ڈھیلے ڈھالے سے موڈ میں تھا۔ اس لیے پینٹ شرٹ کے بجائے آرام دہ کرتہ شلوار کا انتخاب کیا۔ آسمانی رنگ کا ہم رنگ کڑھائی والا کرتہ اس کے وجود پر خوب جچ رہا تھا۔ وہ تیار ہو کر سب کے درمیان پہنچا تو نگاہوں کی پسندیدگی نے اعلان کر دیا کہ وہ اس لباس میں بہت جچ رہا ہے۔ نگاہوں کی یہ پسندیدگی اس کے لیے کوئی نئی بات نہیں تھی اس لیے وہ اسے زیادہ اہمیت نہیں دیتا تھا۔ حقیقتاً وہ اپنی وجاہت کی طرف سے بے پروا تھا اور کبھی اس پر مغرور نہیں ہوا تھا کہ اس کی شخصیت اتنی جاذبِ نظر ہے کہ دیکھنے والا بندھ کر رہ جاتا ہے اور اس کے لیے اپنے دل میں انسیت محسوس کرنے لگتا ہے۔

''اے گولو...... یہ ٹکر ٹکر کیا دیکھ رہا ہے۔ یہ پکڑ، راستے میں کوئی فقیر دِکھے تو اپنے شہزادے کا صدقہ دے دیجیو۔'' ربن نے اس پر سے کئی نوٹ وار کر گولو کے ہاتھ میں تھمائے تو کیتھرائن اور شکنتلا بھی اپنی جگہ ذرا جھینپ کر رہ گئیں۔ گولو سے زیادہ تو وہ دونوں فاروق کو گھور گھور کر دیکھ رہی تھیں لیکن ربن کا بڑا پن تھا کہ اس نے انہیں کچھ نہیں کہا تھا۔

''تم بھی اپنے ساتھ چلتے بابا۔ تمہارے ساتھ سیر کرنے میں اور بھی مزہ آتا۔'' نوٹ اپنی جیب میں رکھتے ہوئے گولو نے ربن سے کہا۔

''تیرے کو بولا نا کہ اپن نہیں جا سکتا۔ اپنا ادھر ہوٹل میں رکنا ضروری ہے۔ اپن تمہارے ساتھ چل پڑا اور پیچھے سے شکنتلا کے باپ کا فون آ گیا تو کون اس سے بات کرے گا۔ وہ تو گھبرا جائے گا کہ کہیں اپن شکنتلا کو لے کر غائب تو نہیں ہو گئے۔'' ربن نے پیار سے گولو کا شانہ تھپتھپاتے ہوئے اپنے نہ جانے کی وجہ بیان کی۔

''تو اگر ایسا ہے تو میں رک جاتا ہوں۔ مسٹر اگروال کا فون آیا تو میں ان سے بات کر لوں گا۔ میرا تو ویسے بھی باہر جانے کا زیادہ موڈ نہیں ہے۔'' فاروق نے ہوٹل میں ہی رک جانے کا موقع ڈھونڈنا چاہا۔

''سیٹھ کو اپن ڈیل کر رہا ہے۔ اپنے بجائے کسی اور کی آواز سنے گا تو گھبرا جائے گا۔ اس لیے اب تو زیادہ بہانے بازی نہ کر اور ان لوگوں کو لے کر نکل جا۔ ٹائم ویسے بھی کم ہے۔ نو بجے سے پہلے پہلے تم لوگوں کو ہوٹل واپس بھی آنا ہو گا۔'' ربن کے دوٹوک لہجے نے مزید کسی بحث کی گنجائش ختم کر دی چنانچہ فاروق ان لوگوں کو اپنے ساتھ لیے ہوئے

ہوٹل کی پارکنگ میں پہنچ گیا۔ سیٹھ بھاٹیہ کا ڈرائیور گاڑی سمیت وہاں موجود تھا اور بالکل تیار تھا۔ یقیناً ربن نے اسے پہلے ہی ہدایت دے دی ہوگی۔ وہ لوگ گاڑی میں بیٹھ گئے تو اس نے گاڑی چلا دی۔

''پہلے کہاں لے کر چلوں سر؟ بازار چلنا ہے یا پہلے شہر کی سیر کرنی ہے؟'' گاڑی کو روڈ پر لاتے ہوئے اس نے فاروق کو مخاطب کیا۔

''پہلے شہر دیکھ لیتے ہیں۔ بازار بعد میں چلیں گے۔'' فاروق نے اسے جواب دیا۔ اس کے ساتھ دو عدد خواتین تھیں جن کے بارے میں یہ بات طے شدہ تھی کہ بلاضرورت بھی بازار میں کئی گھنٹے آسانی سے خرچ کر سکتی ہیں اس لیے بہتر تھا کہ بازار کا رخ کرنے کے بجائے پہلے شہر کی سیر کرلی جائے۔ ڈرائیور نے اس کی ہدایت پر عمل کیا۔ شملہ سے قریبی شہر ہونے کی وجہ سے اس کا چنڈی گڑھ آنا جانا لگا رہتا تھا اس لیے اسے شہر سے اچھی خاصی واقفیت تھی۔ مختلف راستوں سے گزرتے ہوئے وہ ان لوگوں کو معلومات بھی فراہم کرتا جا رہا تھا۔ لڑکیاں زیادہ دلچسپی سے نظارے کر رہی تھیں۔ شہر تھا بھی خوب صورت۔ سب سے بڑی خوب صورتی اس کی ہریالی تھی جو ویسے ہی آنکھوں کو بھلی لگتی ہے۔ جا بجا کھلتے پھول اور لہلہاتے اشجار خود بخود ہی مزاجوں پر اثرانداز ہونے لگے اور ایسا لگا کہ جسم سے تھکن بالکل نکل گئی ہو۔ فاروق نے بھی دل کی بے کلی کے باوجود اپنے اندر تبدیلی محسوس کی۔

''یہ دیو سماج کالج ہے۔'' ایک عمارت کے سامنے سے گزرتے ہوئے ڈرائیور نے انہیں بتایا۔ کالج کے اوقات کار عموماً صبح سے سہ پہر تک ہوتے ہیں لیکن اس وقت بھی گیٹ سے لڑکے لڑکیاں اندر باہر آتے جاتے نظر آرہے تھے۔ ان سب نے رنگ برنگے لباس پہن رکھے تھے اور کچھ تو باقاعدہ پنجاب کے ثقافتی لباس اور ہیئر اسٹائل کے ساتھ نظر آرہے تھے جس سے انہوں نے یہ اندازہ لگایا کہ کالج میں کوئی فنکشن ہو رہا ہے جس کی وجہ سے طلبا اتنے جوش و خروش کے عالم میں اس وقت بھی وہاں نظر آرہے ہیں۔ گاڑی کالج سے آگے بڑھ گئی اور ڈرائیور دوسرے کئی مقامات کے بارے میں معلومات فراہم کرتے ہوئے انہیں ایک پارک میں لے گیا۔ پارک ابھی زیر تعمیر تھا لیکن پھر بھی وہاں انہیں دلچسپی کی بہت سی چیزیں مل گئیں۔ ہریالی اور پھولوں کی موجودگی کا پارک میں ہونا تو لازم تھا ہی اس کے علاوہ بھی دیکھنے لائق بہت کچھ تھا۔ فاروق کو وہاں نصب جھولوں نے متاثر کیا تو لڑکیاں بڑے بڑے جھولوں کو دیکھ کر دیوانی ہو گئیں۔ دونوں نے فوراً ہی دوڑ کر ایک جھولے پر قبضہ کرلیا اور ہنستی کھلکھلاتی ہوا میں پینگیں لینے لگیں۔ لڑکیوں کی ہنسی کی آواز میں زندگی موجزن تھی۔ فاروق کو جولیٹ کا خیال آیا۔ وہ جو پچھلے دنوں اسے کچھ پریشان پریشان سی لگی تھی اور اب اپنی ماں کی دائمی جدائی کا صدمہ اٹھا رہی تھی، کہاں ایسے کھل کر ہنس پاتی ہوگی۔ فاروق نے اسے کبھی کھل کر ہنستے ہوئے نہیں دیکھا تھا۔ وہ بس مسکراتی تھی اور اس کی مسکراہٹ بھی بڑی دل موہ لینے والی تھی۔ فاروق کو یقین تھا کہ کھل کر ہنستے ہوئے تو وہ اور بھی دلکش لگتی ہوگی لیکن وہ تو اس کی دید سے بھی محروم ہو گیا تھا۔

اپنی اس محرومی کا خیال آتے ہی اس پر ایک بار پھر قنوطیت طاری ہونے لگی۔ اس نے گولو کو اشارہ کیا کہ کیتھرائن اور شکنتلا کو واپس بلا لائے۔ اس نے فوراً اس کے حکم کی پیروی کی۔ لڑکیاں بھی پیغام ملتے ہی چلی آئیں۔ ان کی شکلوں سے ظاہر تھا کہ وہ بہت لطف اندوز ہوئی ہیں۔ شکنتلا جو اپنی زندگی کے ایک بہت بڑے المیے سے گزری تھی اور اب بھی اپنے باپ کا سامنا کرنے کی دشواری سے گزر رہا تھا، ان لمحوں میں جیسے سب کچھ بھول گئی تھی۔ اس کی سانولی رنگت میں دمکتی سرخی سے ظاہر تھا کہ وہ بہت پُرجوش اور خوش ہے۔ شاید کچھ کمال اس کی نوعمری کا بھی تھا۔ اس عمر میں انسان بہت دیر تک کوئی فکر نہیں پالتا اور جلد بہل جاتا ہے۔ ہاں کچھ ایسے ہوتے ہیں جو اس عمر میں پیش آنے والے کسی حادثے یا واقعے کو پوری عمر کا روگ بنا لیتے ہیں۔ شکنتلا ان میں سے محسوس نہیں ہوتی تھی یا پھر یہ تھا کہ اسے اتنی سی عمر میں بھی اپنے جذبات کے اظہار پر قابو پالینے میں کمال تھا اور اس نے بہت تیزی سے خود کو سنبھال لیا تھا۔ بات کچھ بھی رہی ہو لیکن فاروق کو اس پر رشک آرہا تھا۔ اسے تو اپنے آپ کو نارمل ظاہر کرنے کے لیے بڑی جدوجہد کرنی پڑتی تھی تب کہیں جاکر دوسروں سے اپنی کیفیت کو چھپا پاتا تھا۔ اب بھی اس نے کوشش کی کہ لڑکیوں کو اس کے موڈ کا اندازہ نہ ہو اس لیے وقت کی کمی کا ذکر کرتے ہوئے بازار جانے کا پروگرام یاد دلایا۔

بازار میں وہی رونق تھی۔ حسب توقع دونوں لڑکیوں نے خریداری میں خوب دلچسپی لی۔ کیتھرائن خود کفیل تھی اور شکنتلا بھی باپ کے گھر سے اچھی خاصی رقم لے کر چلی تھی اس لیے دونوں ہی اطمینان سے اپنی پسند کی خریداری کرنے لگیں لیکن جب بل دینے کا وقت آیا تو فاروق نے دونوں

ہی کو ان کے پرس سے ادائیگی نہیں کرنے دی اور خود بل ادا کیا۔ گولو کو بھی اس نے اس کی پسند کی کئی چیزیں دلوائیں۔ اگر آگے کا سفر درپیش نہیں ہوتا تو وہ اڈے کے دوسرے افراد کے لیے بھی کچھ نہ کچھ ضرور لیتا لیکن ابھی زیادہ اسباب جمع کرنا مناسب نہیں تھا۔ ہاں شملہ سے واپسی میں وہ یہاں رک کر خریداری کر سکتے تھے۔ خریداری سے فارغ ہو کر اس نے ان لوگوں کو کھوئے والی قلفی کھلائی۔ کھانا چونکہ ہوٹل واپس جا کر ربن کے ساتھ ہی کھانے کا پروگرام تھا اس لیے کھانے پینے کی کئی چیزیں نظر آنے کے باوجود ان کی طرف توجہ نہیں دی گئی تھی۔ ٹھنڈی میٹھی قلفی نے سب ہی کو لطف دیا۔ لڑکیوں کا موڈ خاص طور پر بہت خوش گوار تھا۔ ان کے دمکتے چہروں نے فاروق کے ذہن میں یادوں کے دریچے کھول دیے۔ ایسے ہی کچھ چہرے وہ اپنے پیچھے بھی چھوڑ کر آیا تھا۔ اس کے ساتھ پلنے بڑھنے والی وہ نازک اندام شہزادیاں بھی خوش ہوں تو ایسے ہی چہچہاتی تھیں اور ایسے ہی پیاری لگا کرتی تھیں۔ ایسے وقت میں ان کے نقوش میں رچی بسی نخوت اور غرور کے رنگ بھی مدھم پڑ جاتے تھے اور وہ بس حسین گڑیا ئیں لگا کرتی تھیں۔ وہ نہیں جانتا تھا کہ ان میں سے کون اب کیسی ہو گئی ہو گی اور کس نے بابل کا آنگن چھوڑ کر پیا دیس بسیرا کر لیا ہو گا لیکن وہ سب اسے یاد تھیں۔ وہ ایک الگ دنیا میں ضرور بس رہا تھا لیکن اس دنیا کو نہیں بھولا تھا جسے اپنے پیچھے چھوڑ آیا تھا۔

چہچہاتی لڑکیوں اور ان کا ساتھ دیتے گولو کے پیچھے چلتے ہوئے وہ اپنے ماضی کے ان چہروں کو یاد کر رہا تھا کہ کوئی راہ گیر آہستہ سے اس سے ٹکرا گیا اور فوراً ہی معذرت کرتے ہوئے آگے بڑھنے لگا لیکن اس چھوٹے سے وقفے میں بھی اس نے ٹکرانے والے شخص کی انگلیوں کی خفیف سی حرکت کو محسوس کر لیا تھا۔ اس نے نہایت صفائی سے اس کے کُرتے کی جیب سے بٹوا اڑا لیا تھا لیکن مقابل بھی تو فاروق تھا جس نے ربن دادا سے بے شمار گن سیکھے تھے۔ بے ساختہ ہی اس نے جاتے راہ گیر کی کلائی تھام لی۔ وہ بدک کر پلٹا۔ ''کی گل ہے؟'' بھڑکتی ہوئی آواز میں اس نے فاروق سے سوال کیا۔ شاید وہ اپنے تیز لہجے سے اسے ڈرانا چاہتا تھا کیونکہ شریف آدمی تو عموماً تیز لہجوں کو بھی سہنے کی سکت نہیں رکھتے۔

''میرا بٹوا واپس کرو۔'' اس کے برعکس فاروق نے نہایت ٹھنڈے لہجے میں اس سے بات کی۔

''کیا بکواس کر رہا ہے اوئے۔ تیرا بٹوا میرے پاس کدھر سے آیا۔'' فاروق کے اعتماد نے یقیناً اسے متاثر کیا تھا لیکن پھر بھی اس نے سینہ زوری سے کام لیا۔ بیچ بازار میں لگنے والے اس تماشے نے کئیوں کی توجہ اپنی طرف مبذول کر لی۔ فاروق کے آگے چلتے گولو، کیتھرائن اور شگفتہ تو پہلے ہی رک چکے تھے، اب دوسرے لوگ بھی جمع ہونے لگے۔

کیتھرائن اور شگفتہ کے چہروں پر اس صورت حال کی وجہ سے پریشانی کے رنگ چھا گئے تھے البتہ گولو اطمینان میں تھا کیونکہ وہ جانتا تھا کہ فاروق خراب صورت حال سے نمٹنے کی اہلیت رکھتا ہے۔

''تم نے ابھی ابھی میری جیب سے میرا بٹوا نکالا ہے اور میں چاہتا ہوں کہ تم بغیر کسی جھگڑے کے شرافت سے میرا بٹوا واپس کر دو۔'' پہلوان نما پاکٹ مار کے بھڑکنے کے باوجود اس کے اعتماد میں کوئی فرق نہیں آیا تھا۔ یہاں تک کہ اس نے اس کی کلائی کو بھی اپنی گرفت سے آزاد کر دیا تھا۔

''تو مجھ پر پاکٹ مار ہونے کا الزام لگا رہا ہے۔'' پہلوان کی آنکھیں پھیل گئیں۔

''تمہاری تلاشی لینے پر یہ الزام ثابت بھی ہو سکتا ہے۔'' اس نے جواب دیا۔

''کون مائی کا لال ہے جو تلاشی لینے کے لیے جیدے پہلوان کو ہاتھ لگا سکے۔ میں اس کی بوٹی بوٹی کر دیاں گا۔'' پہلوان اتنے اشتعال میں آیا کہ جیب سے چاقو نکال لیا۔ چاقو نکلتے دیکھ کر لڑکیوں کے چہرے زرد پڑ گئے۔ ہجوم میں سے بھی چند کی سسکاریاں نکل گئیں البتہ فاروق اپنی جگہ اطمینان سے کھڑا رہا۔ اسی وقت پشت پر سے کسی نے اس کے شانے پر دھیرے سے ہاتھ رکھا۔ فاروق نے پلٹ کر دیکھا، وہ ایک عمر رسیدہ بزرگ تھے۔

''بٹوے میں زیادہ بڑی رقم نہیں ہے تو جانے دو بیٹا۔ تم اس شہر میں اجنبی لگتے ہو اور یہ یہاں کے ایک بڑے غنڈے منو پہلوان کا آدمی ہے۔'' اس کی توجہ پا کر انہوں نے سرگوشی میں اسے سمجھایا۔

''آپ فکر نہ کریں بزرگوار...... مجھے ایسے لوگوں سے نمٹنے کا خوب تجربہ ہے۔'' اس نے انہیں جواب دیا اور ایک بار پھر پہلوان کی طرف جس نے خود کو جیدا کہا تھا، متوجہ ہو گیا اور ایک ایک لفظ چبا کر بولا۔

''اس کھلونے سے مجھے ڈرانے کے بجائے بہتر ہوگا کہ تم میرا بٹوا واپس کر دو۔'' اس کی اس قدر خود اعتمادی نے جیدے پہلوان کو تھوڑا سا متزلزل تو کیا لیکن وہ اس کی بات مان کر اتنے ہجوم میں اپنی ناک نہیں کٹوا سکتا تھا۔ اس نے ایک بار چاقو نکال لیا تھا تو اب اسے اپنی جگہ ڈٹا ہی رہنا تھا

چنانچہ ردِعمل میں پہلے چاقو کو اوپر اچھال کر اسے دوبارہ ہوا میں ہی تھاما اور پھر یکدم ہی اس کی طرف لپکا۔ جیدے کی اس حرکت پر ہجوم میں سے کئی کی چیخیں نکل گئیں اور لوگ خود بخود ہی پیچھے ہٹنے لگے لیکن فاروق اپنی جگہ سے انچ بھر بھی نہیں ہلا اور جیدے کا چاقو والا ہاتھ نظروں سے تول کر عین اس وقت اس کی کلائی کو جکڑا جب تقریباً سب ہی کو یقین ہو گیا تھا کہ چاقو اس کے پہلو میں اتر جائے گا۔ کئی نے تو خوف سے آنکھیں بند کر لی تھیں لیکن پھر سب یہ دیکھ کر دنگ رہ گئے کہ نفیس سی شخصیت والے نوجوان نے پہلوان کی کلائی کو تھام کر اس زور سے موڑ دیا تھا کہ اس کا پورا جسم بل کھا کر رہ گیا تھا اور پانسا کچھ اس طرح پلٹا ہوا تھا کہ چاقو نوجوان کے ہاتھ میں تھا اور اس کی نوک پہلوان کی گردن سے لگی ہوئی تھی۔

''میرا بٹوا نکالو ورنہ ابھی شہ رگ کاٹ ڈالوں گا۔''

پہلی بار فاروق کی آواز میں غراہٹ اتری۔ جیدے پہلوان کے پاس اب مزاحمت کی کوئی گنجائش نہیں تھی۔ اس نے اپنے ریشمی کرتے کی جیب میں ہاتھ ڈال کر اس کا بٹوا نکالا اور جھکی نظروں سے اس کی طرف بڑھا دیا۔ فاروق نے بے نیازی سے بٹوا لے کر اپنی جیب میں رکھا اور جیدے پہلوان کو ایک دھکا دے کر خود سے دور ہٹاتے ہوئے قدم آگے بڑھائے اور اپنے ساتھیوں سے مخاطب ہوا۔

''آؤ واپس چلیں۔'' وہ سب سحر زدہ سے اس کے پیچھے چل پڑے اور پیچھے حیرت زدہ سا ہجوم اپنی جگہ کھڑا رہ گیا۔ وہ لوگ ڈرائیور کو گاڑی سمیت جس جگہ چھوڑ کر گئے تھے وہ سارے ہنگامے سے بے خبر وہیں ان کا منتظر موجود تھا۔ گاڑی میں بیٹھ کر وہ لوگ واپس ہوٹل کے لیے روانہ ہو گئے۔ گزرے واقعے نے سب ہی کو متاثر کیا تھا اس لیے واپسی کے سفر میں لڑکیوں کی شوخی سوئی رہی اور سفر خاموشی سے کٹا۔ ہوٹل میں ربن ان کا منتظر تھا اور فارغ بیٹھا بیڑی سے شغل کر رہا تھا۔

''تیرے باپ کا فون آیا تھا۔ آدھے پون گھنٹے میں وہ پہنچتا ہی ہوگا۔'' اس نے شکنتلا کی طرف دیکھتے ہوئے اسے اطلاع دی تو وہ محض سر ہلا کر رہ گئی۔ ربن فوراً ٹھٹک گیا۔

''کیا بات ہے رے۔ تم لوگ ہونٹ کیوں سیے ہوئے ہو؟'' اس نے ایک ایک کا چہرہ دیکھتے ہوئے سوال کیا۔

''کچھ نہیں بس چھوٹی سی بات تھی۔'' فاروق نے اسے اطمینان دلایا۔ ربن نے گولو کی طرف سوالیہ نظروں سے دیکھا۔ وہ تو جیسے منتظر ہی تھا، فوراً ہی سارا قصہ سنا دیا۔

خاص طور پر فاروق کے لمحہ بھر میں پہلوان کو قابو میں کر لینے والی بات کی منظر کشی بھرپور جوش و خروش کے ساتھ کی۔ ربن نے خاموشی سے سارا واقعہ سنا اور اس سے قبل کہ کوئی تبصرہ کرتا کیتھرائن بول پڑی۔

''مسٹر فاروق کو ایسا نہیں کرنا چاہیے تھا۔ ان کے لیے یہ سب کرنا ٹھیک نہیں ہے۔ کوئی لاس بھی ہو سکتا تھا۔ ابھی یہ فزیکلی فٹ نہیں ہیں۔ ہیڈ انجری کوئی معمولی چیز نہیں ہوتی۔ ذرا سی بے احتیاطی سے کچھ بھی ہو سکتا ہے۔'' وہ کچھ خفا سی تھی۔

''کیتھی ٹھیک بول رہی ہے رے۔ تیرے کو احتیاط کرنے کی تھی۔ جانے دیتا بٹوے کو۔ ایسا کون سا خزانہ رکھا تھا تیرے بٹوے میں جو چلا جاتا۔'' ربن نے بھی اس کا ساتھ دیتے ہوئے فاروق کو ٹوکا۔

''تم جانتے ہو استاد کہ بات رقم کی نہیں تھی۔ اگر کوئی پاکٹ مار میرا بٹوا اڑا کر لے جاتا تو اس سے تمہاری تربیت پر حرف آتا۔'' فاروق نے اسے جواب دیا تو ربن ہنس دیا پھر سنجیدہ ہوتے ہوئے بولا۔

''تو نے اپنی تربیت کی لاج رکھی وہ ٹھیک ہے، پر یاد رکھ کہ تو اپنے لیے سب سے قیمتی ہے۔ اپن تیرا نقصان برداشت نہیں کر سکتے ہیں۔''

''تو نہیں ہوا نہ نقصان۔ نقصان ہوتا تو تربیت کی لاج کہاں رہتی۔ اب یہ لو پکڑو۔'' اس نے جیدے پہلوان کا چھینا ہوا چاقو جیب سے نکال کر ربن کے ہاتھ میں دے دیا اور کمرے سے باہر نکل گیا۔

''سالا سچ مچ کا شہزادہ ہے۔ ناک پر مکھی نہیں بیٹھنے دیتا۔'' چاقو کی دھار کو جانچتا ربن دھیمی آواز میں بڑبڑایا پھر لڑکیوں کی طرف متوجہ ہو کر ان سے بولا کہ وہ اپنے کمرے میں جا کر کچھ دیر آرام کر لیں۔ کھانا شکنتلا کے باپ انوپم اگروال کے پہنچنے کے بعد اکٹھا ہی کھایا جائے گا۔ وہ دونوں فوراً ہی وہاں سے اٹھ گئیں البتہ گولو اس کے قدموں کے پاس بیٹھ کر اس کے پیر دابنے لگا۔

''تو بھی تھوڑا آرام کر لے رے۔ گھومنے پھرنے میں تھک گیا ہوگا۔'' ربن نے شفقت سے اس کے بالوں میں ہاتھ پھیرا لیکن گولو نے اس کے پیر نہیں چھوڑے۔ ربن اور فاروق کی خدمت گزاری وہ ہمیشہ ایسے ہی دل و جان سے کیا کرتا تھا۔

آدھے گھنٹے بعد انوپم اگروال بھی وہاں پہنچ گیا۔ وہ شکنتلا سے ملتے جلتے نقوش والا سانولی رنگت کا آدمی تھا جو گہرے نیلے رنگ کے پینٹ کوٹ میں اچھا خاصا جچ رہا تھا۔

پہلی ملاقات کے ابتدائی مراحل سے گزرنے کے بعد ربن نے اعلان کر دیا کہ پہلے کھانا کھایا جائے گا پھر تفصیلی گفتگو ہوگی تاہم ڈائننگ ہال میں جانے سے قبل اس نے باپ بیٹی کی ملاقات کروادی تھی۔ ملاقات کا یہ منظر خاصا جذباتی تھا۔ شکنتلا باپ کے سینے سے لگ کر پھوٹ پھوٹ کر روئی تھی، خود انوپم اگروال کی آنکھیں بھی نم ہوگئی تھیں۔ ربن نے ہی آگے بڑھ کر شکنتلا کو باپ سے الگ کیا اور اس کے آنسو پونچھے۔ اس کے بعد وہ سیدھا ان سب کو ڈائننگ ہال میں لے گیا۔

انوپم اگروال کی موجودگی کا خیال کر کے کھانے میں گوشت کی کوئی ڈش نہیں منگوائی گئی تھی۔ کھانا تھالیوں میں پروسا گیا۔ اس تھالی میں چھوٹی چھوٹی کٹوریوں میں مختلف آئٹم رکھ کر پیش کیے گئے تھے جن میں ارہر کی دال، ابلے ہوئے چاول، چولائی کی بھاجی، آلو کی ترکاری، پوریاں، اچار، رائتہ وغیرہ شامل تھے۔ سب نے ہی بڑے شوق سے یہ کھانا کھایا۔ کھانے کے بعد وہ سب ربن ہی کے کمرے میں جمع ہوگئے اور وہاں قہوہ منگوالیا گیا۔ انوپم اگروال پڑھا لکھا کاروباری آدمی تھا۔ قہوہ نوشی کے دوران وہ اپنے کاروبار کے بارے میں بتاتا رہا۔ ان سے بھی بمبئی میں ان کی رہائش اور ذریعہ معاش کے بارے میں دریافت کیا گیا۔ رہائش کے بارے میں تو ربن نے اسے بالکل درست جواب دیا البتہ ذریعہ معاش کو وہ یہ کہہ کر ٹال گیا کہ وہ لوگ باقاعدہ کوئی کاروبار یا نوکری نہیں کرتے بلکہ مال دار لوگوں کے مختلف کام ٹھیکے پر کرتے ہیں۔ اس نے بھاٹیہ سیٹھ کا حوالہ دیا کہ وہ بھی ان کے کرم فرماؤں میں سے ایک ہے اور شملہ میں وہ اسی کی رہائش گاہ پر ٹھہریں گے۔ انوپم اگروال بھاٹیہ سیٹھ سے واقف تھا۔ اس کا حوالہ دیے جانے کے بعد اس نے زیادہ جانچ پڑتال نہیں کی اور مختلف موضوعات پر بات کرتا رہا۔

وہ اچھی معلومات رکھنے والا آدمی تھا چنانچہ فاروق کو بھی اس سے تبادلہ خیال کرنے میں لطف آیا۔ وہ خود بھی فاروق کی معلومات اور انگریزی دانی سے متاثر ہوا اور ان کے درمیان گفتگو کا سلسلہ طول کھینچتا چلا گیا۔ لڑکیوں اور گولو کو اس گفتگو میں زیادہ دلچسپی نہیں تھی چنانچہ وہ تینوں جلد اس محفل سے اٹھ گئے۔ انوپم اگروال نے شکنتلا کو بتا دیا تھا کہ صبح کے لیے ان کی سیٹیں بک ہیں اس لیے وہ جلد جاگ جائے۔ وہ لوگ درمیان سے اٹھ کر چلے گئے تو انوپم اگروال نے ربن کا ہاتھ تھام لیا اور نہایت انکساری سے بولا۔

''آپ نے مجھ پر جو احسان کیا ہے میں اسے کبھی نہیں بھولوں گا۔ اگر آپ نہ ہوتے تو یقیناً میری عزت خاک میں مل جاتی۔''

''ایسا کیا سیٹھ۔ اپن نے انسانیت کے ناتے تمہاری بچی کا خیال رکھا۔ بچی سے ایک غلطی ہوگئی تھی، شکر ہے کہ وہ کسی غلط آدمی کے ہاتھ نہیں لگی اور ہمیں مل گئی۔ ہم نے بھی کیا تیر مارا بس تمہیں ایک ٹیلی فون ہی تو کرنا پڑا۔ اب تم بچی کو اپنے ساتھ لے جاؤ، اللہ نے چاہا تو آئندہ وہ ایسی کوئی غلطی نہیں کرے گی۔'' ربن اس کے احسان مندی کے مظاہرے پر کھسیا گیا اور جوابی انکساری کا مظاہرہ کیا۔

''یہ بھی آپ کا احسان ہے کہ آپ میری بیٹی کی اصل غلطی کو بیان نہ کر کے میری نظروں کو اپنے سامنے جھکنے سے بچا رہے ہیں۔ ورنہ میں نے بھی دنیا دیکھی ہے اور خوب سمجھتا ہوں کہ بات وہ نہیں جو آپ نے مجھے بتائی ہے۔ شکنتلا کے بہکے قدموں نے اسے آپ تک پہنچایا۔ اصل قصہ کیا تھا، وہ تو اسے اور آپ کو ہی معلوم ہوگا لیکن میں اتنا جانتا ہوں کہ وہ سیر و تفریح کے لیے بمبئی ریلوے اسٹیشن نہیں پہنچی تھی۔ میں نے یہاں آنے سے پہلے اس کے سارے قریبی دوستوں کے گھر فون کر کے دیکھا تھا اور بہانے سے یہ بات اگلوالی تھی کہ ان میں سے کوئی بھی آج شکنتلا کے ساتھ نہیں تھا اور نہ ہی کسی کو اس کے کسی پروگرام کی خبر تھی۔ خود اس کے پروگرام میں کیا گڑبڑ ہوئی، یہ بھی بھگوان کے بعد آپ لوگ ہی جانتے ہوں گے۔ میں تو بس آپ کا شکریہ ادا کر سکتا ہوں کہ آپ نے ایک باپ کی عزت بچالی۔'' اس کے لہجے میں اتنا یقین تھا کہ اس کی بات کو رد کرنے کا سوچا ہی نہیں جا سکتا تھا۔ ربن نے بھی فوراً ہی ہتھیار ڈال دیے اور آہستہ سے بولا۔

''تمہارا اندازہ ٹھیک ہے سیٹھ۔ لڑکی واقعی غلط ہاتھ میں چلی گئی تھی پر اچھا ہوا کہ ہم سے واسطہ پڑ گیا۔ ہم نے اسے دھوکے باز کے چکر سے نکال لیا۔ جو روپیا اور زیور وہ اپنے ساتھ گھر سے لے کر چلی تھی وہ اس کے پاس بالکل محفوظ ہے۔ تم اس سے اس بارے میں بات نہ کرو تو اچھا ہے۔ باپ بیٹی کے درمیان کا پردہ اور لحاظ قائم رہے گا۔ روپیا اور زیور اس نے جہاں سے نکالا تھا، وہاں خاموشی سے رکھ دے گی اور سب کچھ پہلے جیسا ہو جائے گا۔ اپنے کو امید ہے کہ ایک بار کی ندامت اب ساری زندگی اس کے قدموں کو بہکنے نہیں دے گی۔ تم مزید احتیاط کرنا چاہو تو اس کی جلدی کہیں شادی کر کے مطمئن ہو سکتے ہو۔ معاملات اب مکمل طور پر تمہارے ہاتھ میں ہیں۔''

"میں آپ کی یہ رائے یاد رکھوں گا۔ میں نے جیون میں یقیناً کوئی پُنے کا کام کیا ہوگا کہ بھگوان نے آپ جیسے لوگوں سے ملوا دیا۔" انوپم اگروال گویا اس کے آگے بچھا جا رہا تھا۔

"تم ٹھیک بولے سیٹھ۔ یہ پاپ اور پُنے کے سلسلے بڑی دور تک جاتے ہیں۔ خاص طور پر آدمی کو اولاد کے ہاتھوں اس کا بھگتان بھگتنا پڑتا ہے۔ تم صرف یہ سوچ کر خوش نہ ہو کہ تمہارے کسی پُنے سے خوش ہو کر بھگوان نے تمہاری عزت بچالی۔ یہ بھی سوچو کہ تم اس آزمائش میں پڑے تو اپنے کسی پاپ کے سبب۔" ربن جیسا آدمی سیٹھ کو کسی خوش فہمی میں کیسے مبتلا رہنے دیتا، اس نے فوراً ہی جتا دیا کہ اگر اس کی بیٹی گھر سے نکلی تھی تو اس کا سبب بھی اس کا ہی کوئی دوش ہوگا۔

انوپم اگروال بھی اس کی بات سن کر اچھل پڑا۔

"کک...... کیا مطلب ہے آپ کا۔ پلیز ذرا کھل کر مجھے بتائیں؟"

"اپنے کو تو بس اتنا ہی بولنے کا ہے سیٹھ کہ جب اوپر والے نے تمہیں کھل کر نوازا ہے تو اس کے بندوں کے لیے بھی اپنا ہاتھ کھلا رکھا کرو۔ وہ کسی ایک کو دوسروں سے زیادہ دیتا ضرور ہے پر اس لیے نہیں کہ وہ اسے اپنے پاس دبا کر بیٹھ جائے۔ اس کا دیا ہوا اس کے بندوں کی ضرورتیں پوری کرنے کے کام بھی آتا رہنا چاہیے۔" ربن نے ماجد علی کا نام لینا مناسب نہیں سمجھا لیکن اسے اتنا سمجھا دیا کہ اس کی کسی زیادتی کا شکار بننے والے نے اس سے انتقام لینے کی کوشش کی ہے۔

"میں آپ کی بات سمجھ گیا ہوں۔ کوشش کروں گا کہ پھر ایسی غلطی کو نہ دہراؤں۔"

انوپم اگروال نے اس بار تفصیل جاننے پر اصرار کرنے کے بجائے سمجھداری کا مظاہرہ کیا۔ ان کے درمیان ہونے والی یہ گفتگو ایسی تھی جس نے ماحول کو قدرے بوجھل کر دیا تھا اس لیے محفل مزید آباد نہیں رہی اور انوپم اگروال اگلی صبح درپیش سفر کا بہانہ بنا کر اٹھ گیا تاہم اٹھنے سے پہلے اس نے اپنے گھر کا پتا لکھوا کر شملہ سے واپسی میں ملاقات کے لیے آنے کی دعوت ضرور دی تھی۔ ساتھ ہی فاروق کے لیے نیک خواہشات کا اظہار بھی کیا تھا کہ وہ جلد از جلد مکمل طور پر صحت یاب ہو جائے۔ فاروق شکنتلا کے بارے میں اس کے اور ربن کے درمیان ہونے والی گفتگو کے دوران بالکل خاموش بیٹھا رہا تھا۔ اس نے انوپم اگروال کی نیک خواہشات کے لیے اس کا شکریہ ادا کیا اور اپنی جگہ سے اٹھ کر دروازے تک اسے رخصت کرنے گیا۔

"تو بھی اب جا کر سو جا۔ صبح اپن بھی شملہ کے لیے نکل جائیں گے۔" وہ سیٹھ کو رخصت کر کے پلٹا تو ربن نے اس سے کہا۔ بات معقول تھی اس لیے فاروق اس پر عمل کرنے کے لیے دوبارہ دروازے کی طرف بڑھا لیکن اس کے دروازہ کھولنے سے قبل ہی اس پر زوردار دستک دی گئی۔

"اس ٹیم کون آگیا؟" دستک کا انداز اجنبی تھا چنانچہ ربن چونک گیا۔

"میں دیکھتا ہوں۔" فاروق نے آہستہ سے کہا اور ایک جھٹکے سے دروازہ کھول دیا، بالکل سامنے دو ایسے اجنبی چہرے تھے جن کو دیکھ کر ہی کہا جا سکتا تھا کہ وہ شرفاء کی دنیا سے تعلق نہیں رکھتے۔ انہیں دیکھ کر فاروق کا جسم اکڑ سا گیا لیکن خلاف توقع انہوں نے کسی بدتہذیبی کا مظاہرہ نہیں کیا اور نہ ہی اپنی جگہ سے قدم آگے بڑھا کر دروازے کے اندر داخل ہونے کی کوشش کی۔

"کیا بات ہے؟ کون ہو تم لوگ؟" فاروق نے قدرے سخت لہجے میں ان سے دریافت کیا۔

"ہم منو پہلوان کے بندے ہیں اور اس کا پیغام لائے ہیں۔" ان میں سے ایک نے اس کے سوال کا جواب دیا۔ اپنے طور پر وہ لہجے کو نرم بنا کر ہی بات کر رہا تھا لیکن پھر بھی لہجے میں فطری سختی قائم تھی۔ فاروق کو فوراً ہی یاد آگیا کہ بازار میں جیدے نامی جس جیب تراش سے اس کا واسطہ پڑا تھا، اسے کسی منو پہلوان کا ہی آدمی بتایا گیا تھا۔

"کیسا پیغام؟" منو پہلوان کے نام پر اس کی آواز بھڑک اٹھی۔

"پہلوان جی نے تم کو اپنے اڈے پر بلوا بھیجا ہے۔" اس نے بتایا۔

"اور اگر میں جانے سے انکار کر دوں تو؟" فاروق نے اسے جانچتی نظروں سے دیکھ کر سوال کیا۔ وہ دونوں بالکل ڈھیلے ڈھالے انداز میں کھڑے تھے اور کہیں سے نہیں لگتا تھا کہ اس کے ساتھ کسی زبردستی کا ارادہ رکھتے ہیں۔

"ہم پہلوان جی کو تمہارے انکار کا بتا دیں گے۔ آگے جو وہ حکم دیں۔" مقابل نے اکڑنے کے بجائے سیدھے سادے انداز میں جواب دیا تو فاروق تذبذب میں پڑ گیا اور مڑ کر ربن کی طرف دیکھا۔ وہ اس گفتگو کے دوران اس کے پیچھے ہی آن کھڑا ہوا تھا۔

اس نے مڑ کر دیکھا تو اس کے شانے پر ہاتھ رکھتے ہوئے بولا۔ "ٹھیک ہے چل کر دیکھ لیتے ہیں۔"

اس کے جواب پر فاروق کے جسم کا تناؤ ڈھیلا پڑ گیا۔
اگلے ہی لمحے وہ پیامبروں کے ساتھ ہوٹل کے بیرونی راستے کی طرف جارہے تھے۔ باہر نکلنے سے قبل ربن نے ہوٹل کے استقبالیہ پر اپنے ساتھیوں کے لیے پیغام چھوڑ دیا تھا کہ وہ اور فاروق منو پہلوان کے بلاوے پر اس سے ملاقات کے لیے جارہے ہیں۔ استقبالیہ کلرک نے اس کا یہ پیغام خاموشی سے نوٹ کرلیا لیکن اس کی آنکھوں میں واضح حیرت اور تشویش کے رنگ تھے جو ظاہر کررہے تھے کہ منو پہلوان شہر کی ایسی جانی مانی شخصیت ہے جس سے لوگ کسی قدر ہراساں رہتے ہیں اور ہوٹل میں ٹھہرے ان معزز مہمانوں کو اس کی طرف سے بلائے جانے پر کلرک کو حیرت اور تشویش ہے کہ ان مہمانوں کا بھلا منو پہلوان سے کیا تعلق ہے۔ ربن اور فاروق کلرک کے تاثرات کو نظرانداز کرتے ہوئے پیغام لانے والوں کے پیچھے باہر نکل گئے۔ وہ اپنے ساتھ سواری کا انتظام کرکے لائے تھے۔ یہ دو عدد تانگے تھے۔ آگے والے تانگے میں ان دونوں کو سوار کروانے کے بعد دونوں میں سے ایک خود بھی اس تانگے میں سوار ہوگیا جبکہ دوسرے نے پیچھے والے تانگے کا رخ کیا۔ اس تانگے میں کوچبان کے علاوہ بھی مزید دو افراد سوار تھے۔ کہنے کو انہوں نے یہی کہا تھا کہ انکار کی صورت میں وہ خاموشی سے واپس پلٹ جائیں گے لیکن اس برات کی موجودگی میں تو یہی لگتا تھا کہ انکار کی صورت میں وہ زبردستی بھی کرسکتے تھے۔ وہ جو بھی ارادہ رکھتے تھے، بہرحال اب تو وہ دونوں ان کے ساتھ چل ہی پڑے تھے۔ آگے کی صورتِ حال کیا ہے، اس کی دونوں ہی کو فکر نہیں تھی کہ وہ ہر طرح کی صورتِ حال سے نمٹنا خوب جانتے تھے۔
ان کے سوار ہوتے ہی تانگے تیزی سے حرکت میں آگئے۔ اچھی خاصی رات ہوجانے کے باعث راستے سونے پڑے تھے۔ یوں بھی بمبئی کی طرح جاگتی راتیں ہندوستان بھر میں کسی اور شہر میں نہیں پائی جاتی تھیں۔ ہاں کچھ مخصوص طبقے کے لوگ ضرور راتوں کو دیر تک جاگتے ہوں گے جیسا کہ یہاں ان کا منو پہلوان کے حواریوں سے واسطہ پڑ گیا تھا۔ تانگے یکساں رفتار سے چلتے ہوئے ایک ایسے محلے میں پہنچ گئے جہاں سرخ اینٹوں اور پتھروں سے تعمیر شدہ مکانات بنے ہوئے تھے اور گلیاں کشادہ تھیں۔ ان کا تانگا ایک ایسی ہی عمارت کے بڑے سے پھاٹک کے سامنے رک گیا۔ تانگے کے رکتے ہی پھاٹک کھول دیا گیا اور کوچبان تانگے کو سیدھا اندر لے گیا۔ اندر کشادہ آنگن تھا۔ اس آنگن میں تانگے کو روک کر انہیں وہاں اتارا گیا، البتہ ان کے پیچھے آنے والے تانگے میں سوار لوگ پھاٹک کے باہر ہی اتر گئے تھے۔ ان کے ساتھ موجود شخص انہیں اپنی راہنمائی میں ایک دروازے سے گزار کر اندر لے گیا۔ ایک بڑے سے ہال میں چندی گڑھ کی سوئی ہوئی رات سے قطع نظر یہاں رونق لگی ہوئی تھی۔ متعدد افراد تھے جو فرش پر بچھی چاندنیوں پر بیٹھے ہوئے تھے اور ان کے سامنے لکڑی کے ایک بڑے اور اونچے سے منقش رنگین پایوں والے تخت پر مخملیں گاؤ تکیوں سے ٹیک لگائے دو ایک دوسرے سے قطعی متضاد افراد براجمان تھے۔ ایک شخص جوان، بے حد صحت مند، قدآور اور کلین شیو تھا۔ اس نے نارنجی رنگ کے ریشمی کرتے کے ساتھ نیلی ریشمی دھوتی پہن رکھی تھی اور اس کے بڑے بڑے صحت مند ہاتھوں کی موٹی موٹی انگلیوں میں مختلف پتھر جڑی انگوٹھیاں جگمگا رہی تھیں۔ اس کے پہلو میں ایک عمر رسیدہ مختنی سا بوڑھا بیٹھا ہوا تھا۔ بوڑھے کے چہرے پر سفید ڈاڑھی مونچھیں تھیں اور اس نے بالکل سفید رنگ کی دھوتی اور کرتہ پہن رکھا تھا۔ فاروق کو اس بوڑھے کا چہرہ شناسا لگا اور پھر فوراً ہی یاد آگیا کہ یہ وہی شخص ہے جس نے اسے بازار میں جیدے پہلوان سے نہ الجھنے کا مشورہ دیتے ہوئے اسے منو پہلوان کا آدمی بتایا تھا۔ بوڑھے کی یہاں موجودگی پر اسے اچنبھا ہوا۔ بوڑھے نے اس کی حیرت کو بھانپ لیا اور شرارت بھرے انداز میں مسکرایا۔ مسکراتے ہوئے اس نے اپنے برابر میں بیٹھے جوان آدمی کے شانے پر ہاتھ رکھا اور دونوں تخت سے نیچے اتر آئے۔ ان کا انداز استقبال کرنے والا تھا۔ ربن اور فاروق ان کے قریب پہنچے تو انہوں نے بڑے تپاک سے ان کا استقبال کیا۔ جوان العمر آدمی نے باقاعدہ ربن کے پاؤں چھوئے۔
”اے موہن داس عرف منو پہلوان ہے اور میں اس دا چاچا کپل داس ہوں۔“ بوڑھے نے ربن سے مصافحہ کرتے ہوئے تعارف کروایا۔
”اپن رب نواز ہے اور یہ اپنا جان جگر فاروق ہے۔“ ربن نے بھی مختصر الفاظ میں تعارف کی رسم پوری کی۔ ان کے میزبانوں نے انہیں اپنے ساتھ ہی کشادہ تخت پر بٹھالیا۔
”بمبئی دے لگدے ہو۔“ بوڑھے نے اپنی تجربہ کار نظروں سے ان دونوں کو گھورتے ہوئے اندازہ لگایا۔
”یہی سمجھ لو۔ اتنے برسوں بمبئی کا پانی پیا ہے کہ بمبئی اپنے اندر بس گیا ہے۔“ ربن نے اس کے اندازے کی تصدیق کی۔
”تساں دے اس منڈے کو اسیں بازار میں

دیکھیا سی۔ وڈا اوکھا جوان ہے۔ اس دے کھڑے ہونے دا انداز ہور لہجے دا اعتماد دیکھ کر ہی اسیں سمجھ لیے کہ کسی وڈے استاد دا شاگرد ہے۔ اسیں کوشش بھی کیے کہ جیدے دی عزت بچ جائے پر منڈا اپکا ہے۔ اساں جی لگ سن کر بھی ڈریا نئی ہور اپنی جگہ نوں ڈٹا رہا۔ خیر اینوں جس طرح ایک جھٹکے میں جیدے دی مٹی پلید کیا تے اسیں بھی دیکھدے ہی رہ گئے۔ ادھر اڈے وچ لوٹ کر بندے دوڑائے کہ ملوم کرو منڈا کون ہے اور کدھر ٹھہرا ہے۔ اسیں اس منڈے نوں ملنا چاہندے تھے۔ اب ساتھ تساں نوں دیکھ کر سمجھ رہے ہیں کہ اصل استاد تو تسی ہو ہور منڈا تساں دی تربیت دی لاج رکھ ریا ہے۔ اسی واسطے منو کو تساں دے چرن چھونے دا اشارہ کیے تھے۔'' بوڑھا ایک سانس میں بولتا چلا گیا۔

فاروق نے دل میں اس کی نظر شناسی کی داد دی۔ ایسے اندازے کوئی ایسا ہی شخص لگا سکتا ہے جو خود باکمال ہو اور یہ ظرف بھی باکمال آدمی میں ہی ہوتا ہے کہ دوسرے ہنر وکمال والے کو ایسی عزت وتکریم دے ورنہ کم ظرف تو مخاصمت پر اتر آتے ہیں۔

''کیا استاد؟ ایسے ہی بولے جا رہے ہو۔ اپن ایسا بھی استاد نہیں ہے، بس بمبئی میں تھوڑی عزت ہے اور لڑکے اپنی عزت کا خیال رکھتے ہیں۔'' ربن نے حسبِ عادت انکساری سے کام لیا۔

''ایسے وڈے استاد دی تھوڑی عزت ہو، ایسا نہیں ہوسکدا۔'' بوڑھا ازحد متاثر تھا۔

''ایسا بھی کیا دیکھ لیے تم۔ چھوٹا سا پھڈا ہی تو ہوا تھا ادھر بازار میں لڑکے کا اور کیا تھا۔'' ربن نے اس بار بھی انکساری دکھائی۔

''نہ نہ بھرا۔ پھڈا تو بہت وڈا ہوسکدا تھا پر منڈے نے موقع ہی نہیں دیا ہور اپنے سے دوگنا بدن رکھنے والے جیدے نوں چٹکیوں میں پچھاڑ ڈالا۔ اسیں اپنی انکھیاں وچ سارا تماشا دیکھیا سی۔ تو یہ عاجزی چھڈ اور اساں نوا پنا پورا تعارف کروا۔'' بوڑھے نے اپنا اصرار جاری رکھا۔ اس بار ربن نے بھی تکلف چھوڑ کر اسے ذرا تفصیل سے بتایا کہ وہ بمبئی کے کس علاقے کا رہائشی ہے اور کہاں کہاں اس کا سکہ چلتا ہے۔ بوڑھا کپل داس اور اس کا بھتیجا موہن داس غور سے سب سنتے رہے۔ ربن اپنی کہہ کر خاموش ہوا تو بوڑھے کے چہرے پر جوش کی سرخی تھی۔

''او مارا استاد۔ اسیں تساں نوں چنگی طرح پہچان گئے۔ تسی ربن استاد ہو اپنے نانا کے جگری یار۔ نانا اساں دا وی جگری یار ہے۔ بچپن میں اسیں اک ہی محلے نوں بستے تھے فیر ہوا ادھر ادھر اڑا کر لے گئی۔ اسیں ادھر چندی گڑھ نوں باہر نہیں نکلتے پر نانا دا آنا جانا لگا رہندا ہے۔ ہن اساں نوں تیری بابت کئی واری دسیا سی۔ اساں تینوں ملن دا شوق وی سی پر ملوم نہ تھا کہ ایسے اچانک ملاقات ہوسکدی ہے۔'' بوڑھا اسے پہچان کر بہت خوش تھا۔ ربن نے بھی خوش اخلاقی کا مظاہرہ کیا اور بوڑھے کپل داس کا ہاتھ تھام کر بولا۔

''نانا کا یار اپن کا یار ہے اور اپن مرتے دم تک یاری نبھانے والا آدمی ہے۔''

''اپنا وی ایسا ہی حساب ہے۔ اسیں عزت دے لائق بندے کو عزت دیندے ہیں ہور دشمن دا نرگ تک پیچھا نئی چھڈتے ہیں۔'' کپل داس نے بھی اپنی خصوصیت گنوائی۔ وہ اپنے قول میں سچا بھی لگتا تھا کیونکہ بازار میں فاروق اور اپنے آدمی جیدے کے درمیان ہونے والی لڑائی میں جیدے کی شکست کو اس نے اپنی انا کا مسئلہ نہیں بنایا تھا بلکہ فاروق کے ہنر کا قائل ہوکر انہیں یہاں بلا کر عزت دی تھی۔ اس کے اڈے کا ماحول بھی کچھ ربن کے اڈے جیسا تھا۔ اتنے لوگوں کی موجودگی کے باوجود وہاں کوئی شور شرابا نہیں تھا اور ربن اور اس کے درمیان ہونے والی گفتگو کے درمیان اس کے بھتیجے موہن داس سمیت کسی نے دخل نہیں دیا تھا حالانکہ صاف ظاہر تھا کہ اب کپل داس کے ہاتھ پیروں میں اتنا دم نہیں ہے کہ اڈے کا انتظام سنبھال رکھے۔ اڈا یقیناً اس کے بھتیجے موہن عرف منو پہلوان نے ہی سنبھال رکھا تھا لیکن وہ اپنے چاچا کو عزت دیتا تھا اسی لیے باقی سب بھی اس کی عزت کرتے تھے۔

''او جیدے ادھر آ۔ دادا دے پیر پکڑ تے مافی مانگ۔'' کپل داس نے اچانک ہی آواز دے کر فاروق سے الجھنے والے کو بلایا تو مجیم شحیم جیدا سر جھکائے فوراً ہی حاضر ہوگیا اور فوراً ہی ربن کے قدموں میں جھک گیا۔ ربن نے جلدی سے اپنے پیر پیچھے کرکے اس کی پیٹھ پر تھپکی دی اور فاروق کو اشارہ کیا کہ وہ جیدے کا چھینا ہوا چاقو اسے واپس کردے۔ فاروق نے حکم کی تعمیل کی اور چاقو جیدے کی طرف بڑھایا۔ چاقو لیتے ہوئے جیدے نے اچانک ہی فاروق کے ہاتھ تھام لیے۔ اس کی اس حرکت پر فاروق چونکا لیکن پھر جیدے کی آنکھوں سے بہتے آنسوؤں نے اسے ساری بات سمجھا دی۔ جیدے کا ہاتھ تھامنا دوستی اور عاجزی پر مبنی تھا۔ اس کے جذبات کی پذیرائی کے لیے فاروق نے فوراً ہی اسے گلے سے لگالیا۔ جیدا کسی ننھے بچے

کی طرح پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔ اس سارے منظر کو دیکھتے ہوئے کپل داس نے ربن کو بتایا کہ بازار سے واپس لوٹنے کے بعد جیدا خوف زدہ تھا کہ کہیں اسے فاروق کے ہاتھوں شکست پر سزا کا حق دار نہ ٹھہرا دیا جائے لیکن کپل داس نے اسے تسلی دی کہ اس کا کوئی قصور نہیں کیونکہ مقابل اس سے کہیں زیادہ ہنر مند تھا۔

ربن سر جھکائے یہ سب سنتا رہا جبکہ منو پہلوان کے اشارے پر ایک آدمی نے آگے بڑھ کر جیدے کو فاروق سے الگ کیا اور اسے پانی پلانے لگا۔ اس کارروائی کے دوران بھی کپل داس نے ربن سے گفتگو جاری رکھی اور بڑے قرینے سے اس سے یہ درخواست کی کہ ربن اور اس کے ساتھی ہوٹل چھوڑ کر اڈے پر قیام کریں۔ اس طرح وہ لوگ میزبانی کا شرف بھی حاصل کر لیتے اور لگے ہاتھوں ربن سے دو چار کمال بھی سیکھ لیے جاتے۔ اس کی درخواست پر ربن پل بھر کے لیے خاموش ہو گیا اور پھر نفی میں سر ہلاتے ہوئے بولا۔

"تمہاری دعوت کا بہت بہت دھنیواد استاد پر ابھی اپن نہیں رک سکتا۔ اپن تو ایک رات بھی ادھر رکنے والا نہیں تھا پر ایک مجبوری آن پڑی اور رکنا پڑ گیا۔ اپن کے پاس سے کم ہے۔ اپن تو بس اپنے شہزادے کو شملہ پہنچانے کے لیے بمبئی سے نکلا ہے ورنہ ابھی اپن کو ادھر بہت کچھ دیکھنے کا ہے۔" اس نے مجو دادا سے اپنے اختلاف اور پھر اس کی گدی پر اپنے قبضے تک کی داستان اختصار سے کپل داس کو سنائی۔ کپل اور موہن دونوں نے اس داستان کو بڑے شوق سے سنا۔ سننے کے بعد پہلے کپل نے مناسب داد دی پھر لجاجت سے بولا۔

"اسیں تساں دی مجبوری سمجھ رہے ہیں پر مینوں وچن دیو کہ تسی فیر کبھی چندی گڑھ ضرور آؤ گے۔"

"وچن نہیں دے سکتے استاد پر اتنا بولتے ہیں کہ اگر کبھی جیون میں موقع ملا تو تمہارے پاس ضرور چکر لگائیں گے۔" ربن نے اس کا ہاتھ تھام کر محبت سے جواب دیا۔ پھر منو پہلوان کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔ "اس لونڈے کو بھی اپنے پاس بمبئی بھیج دو نا، بمبئی بھی دیکھ لے گا اور اپن دو چار داؤ پیچ جو آتے ہیں، وہ بھی اسے سکھا دیں گے۔ ادھر تو اپنی پوری ٹیم بیٹھی ہے۔ سب کے ساتھ رہ کر تو جلدی سیکھ لے گا۔ کچھ فائدہ اپنے لونڈے بھی اٹھا لیں گے۔ پہلوانوں کے خاندان کا ہے، بہت سے داؤ پیچ آتے ہوں گے۔ اپنے بندوں کو بھی سکھا دے گا۔"

"ای خیال بھی چنگا ہے پر اساں نوں دکھ رہے گا کہ تسی اساں دے وچ نہیں ٹھہر یا سی۔"

"مجبوری ہے استاد ورنہ اپن ضرور ٹھہرتے۔" ربن نے اس کے دکھی لہجے میں کہنے پر جواب دیا اور مختصراً فاروق کی طبیعت کا احوال بھی بتا دیا کہ اسے شملہ کیوں پہنچایا جا رہا ہے اور سفر میں ان کے ساتھ ایک نرس بھی موجود ہے جس کے ہوتے وہ ویسے بھی اڈے پر کسی صورت نہیں ٹھہر سکتے تھے۔ کپل داس بھی جہاندیدہ آدمی تھا۔ اس نے ان کی مجبوری کو سمجھا اور فاروق کے لیے نیک خواہشات کا اظہار کیا۔ رات کے بالکل آخری پہر جب وہ لوگ واپسی کے لیے وہاں سے روانہ ہوئے تو کچھ ایسے کہ ربن کے لاکھ انکار کے باوجود کئی تحائف ان کے ساتھ کر دیے گئے تھے اور موہن داس ان افراد میں شامل تھا جو انہیں چھوڑنے ہوٹل تک جا رہے تھے۔

☆☆☆

وہ ہاتھ میں چاقو تھامے اس انداز میں کھڑی تھی کہ اس کی آنکھوں میں شعلے بھڑک رہے تھے اور وہ ان شعلہ برساتی آنکھوں سے دلدار آغا کے چہرے کو گھور رہی تھی۔ آغا کے ہونٹوں پر مسکراہٹ تھی اور یہ مسکراہٹ اس کے اشتعال میں مزید اضافہ کر رہی تھی۔ اسی شدید اشتعال کے زیر اثر اس نے ہاتھ کو حرکت دی اور اس کی انگلیوں میں دبا چاقو آزاد ہو کر ہوا میں تیرتا ہوا سیدھا آغا کی دائیں آنکھ میں پیوست ہو گیا۔ چاقو پیوست ہوتے دیکھ کر اس نے اپنے ماتھے پر آئے پسینے کے قطروں کو ہاتھ کی پشت سے صاف کیا اور دانت کچکچاتے ہوئے آگے بڑھی۔

"کاش اس روز میں اسی طرح تمہیں اپنے چاقو کا نشانہ بنا پاتی۔" چاقو کا دستہ پکڑ کر اسے کھینچتے ہوئے وہ آغا کی تصویر سے مخاطب ہوئی۔ ہاں وہ آغا کی تصویر ہی تھی جسے اس نے اپنے نشانہ بازی کے بورڈ پر چسپاں کر رکھا تھا۔ یہ وہی تصویر تھی جو اس نے اس روز جلسے میں کھینچی تھی۔ بغیر توجہ کے اکٹھی کھینچی گئی دو تصویروں میں سے ایک ایسی تھی جس میں آغا کے ساتھ دوسرے لیڈرز کے چہرے بھی نمایاں تھے۔ اس تصویر کو اگلے دن کے اخبار میں جگہ دے دی گئی تھی جبکہ دوسری تصویر جس میں صرف آغا کے چہرے کا کلوز اپ آیا تھا۔ اس نے اپنی تحویل میں لے لی تھی اور اب اسی تصویر کو تختہ مشق بنا رکھا تھا۔ اسے اس بات کا شدید دکھ تھا کہ جلسے میں وہ آغا کو نشانہ بنانے میں ناکام رہی تھی حالانکہ اسے ایک نہایت بہترین موقع میسر آ گیا تھا۔ اپنی انگلیوں کا

عین وقت پر حرکت کرنے سے محروم ہو جانا اسے ابھی تک حیران کیے ہوئے تھا۔ قوتِ عمل سے اس محرومی کو اس نے اردگرد موجود ہجوم سے ذہن پر پڑنے والے دباؤ کے کھاتے میں ڈالنے کی کوشش کی تھی لیکن خود بھی اس دلیل سے پوری طرح مطمئن نہیں تھی اور یہی محسوس کر رہی تھی کہ وہ کوئی غیبی طاقت تھی جس نے اسے اس کے ارادے میں کامیاب نہیں ہونے دیا تھا لیکن سمجھ نہیں آتا تھا کہ آغا جیسے کرپٹ آدمی کو بچانے کے لیے غیب سے مدد کیونکر آسکتی ہے۔ وہ اس اتفاق کی وجہ سے آغا سے انتقام لینے کے خیال کو دل سے نہیں نکال سکتی تھی اس لیے اگلے ہی دن اسے فون کر ڈالا تھا۔ اس کا ارادہ تھا کہ آغا سے ملاقات کے لیے وقت لے کر اس بار تنہائی میں اسے نشانہ بنانے کی کوشش کرے گی لیکن اس کی آغا سے بات نہیں ہو سکی۔ آغا کے پی اے نے اسے بتایا کہ آج کل وہ بہت مصروف ہے اور فون کالز یا ملاقاتوں کے لیے وقت نہیں نکال سکتا۔ اس کے اصرار پر بھی پی اے نے اسے وقت نہیں دیا تھا۔ اس بار وہ شنا کی دوستی کا بھی فائدہ نہیں اٹھا سکتی تھی کیونکہ شنا نے صاف لفظوں میں اسے رابطہ کرنے سے منع کر دیا تھا اور اس کے پاس صرف یہی چارہ رہ گیا تھا کہ وہ اگلے کسی جلسے میں دوبارہ کوشش کرے۔

اس کے پاس کانگریس کے جلسوں کا جو شیڈول موجود تھا اس کے مطابق مرکزی قیادت بمبئی میں مزید صرف ایک جلسے میں شرکت کرتی اور اس کے بعد وہ لوگ پنجاب کے مختلف شہروں کا رخ کرتے۔ آغا خود پنجاب سے تعلق رکھتا تھا اس لیے اس کا ان جلسوں میں شرکت کرنا لازمی تھا۔ جولیٹ نے یوں تو رندھاوا سے کہہ رکھا تھا کہ ان جلسوں کی کوریج کے لیے وہی جائے گی لیکن رندھاوا کے موڈ کا کچھ پتا نہیں تھا کہ کب وہ اپنے وعدے سے پھر جائے اور اسے خرچہ کر کے بھیجنے کے بجائے اپنے کسی مقامی رپورٹر کی ذمے داری لگا دے۔ اس حساب سے اس کے پاس اگلے دن بمبئی میں ہونے والے جلسے کا موقع ہی رہ گیا تھا جس سے وہ فائدہ اٹھا سکتی تھی۔ اس نے اپنے دل میں ٹھان لیا تھا کہ اس بار اس موقعے کو ضائع نہیں ہونے دے گی۔ اسی لیے زیادہ سے زیادہ نشانے بازی کی مشق کر رہی تھی۔ اپنے اس جنون میں آج اسے یہ بھی یاد نہیں رہا تھا کہ جوزف کے کھانے کا وقت گزر چکا تھا۔ کوئی یاددہانی کروانے والا بھی نہیں تھا۔ خود جوزف کے یاد دلانے کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا کہ وہ تو تھوڑا بہت بھی بس اس کی خاطر ہی کھاتا تھا ورنہ اسے جوزفین سے جدائی کے غم میں دنیا کی کسی شے سے کوئی رغبت نہیں رہ گئی تھی۔

وہ چاقو زنی کی مشق کرتے کرتے جب تھک کر نڈھال ہو گئی تو اسے جوزف کے کھانے کا خیال آیا۔ اس عرصے میں آغا کی تصویر کا حلیہ بگڑ چکا تھا اور کوئی نقش نظر نہیں آرہا تھا۔ شاید تصویر کا یہ حال ہو جانے پر ہی اس کا جنون تھما تھا اور بیمار جوزف کے کھانے کا خیال آیا تھا۔ اس خیال کے آتے ہی وہ تیزی سے باورچی خانے کی طرف دوڑی۔ آج اس نے کچھ پکایا بھی نہیں تھا اور اب کچھ پکانے کا وقت بھی نہیں رہا تھا چنانچہ جلدی سے پتیلی میں رکھا دودھ گرم کر کے اسے ایک پیالی میں نکالا اور ڈبل روٹی کے ٹکڑے اس میں ڈال کر جوزف کے کمرے کا رخ کیا۔ جوزف حسب معمول آنکھوں پر ہاتھ رکھے اپنے بستر پر لیٹا تھا۔ جولیٹ نے دودھ ڈبل روٹی کا پیالہ تپائی پر رکھتے ہوئے اسے آواز دی لیکن اس کی طرف سے کوئی ردعمل ظاہر نہیں ہوا اور وہ اسی انداز میں لیٹا رہا۔

''ڈیڈ...... کھانا کھالو۔'' جولیٹ نے اسے آواز دی پھر بھی کوئی ردِعمل ظاہر نہیں ہوا۔

''ڈیڈ......'' جولیٹ نے کچھ گھبرا کر اس کا ہاتھ آنکھوں پر سے ہٹایا۔ اس کا ہاتھ کسی بے جان شے کی طرح پلنگ کے ساتھ لٹک گیا۔ جولیٹ نے جلدی سے اس کی سانس کی آمدورفت چیک کی۔ وہ سانس لے رہا تھا لیکن بہت آہستہ آہستہ۔ ساتھ ہی اسے بہت تیز بخار بھی تھا۔ شاید بخار کی اس شدت نے ہی اسے بے ہوش کر دیا تھا۔ جولیٹ نے اسے اچھی طرح ہلا جلا کر دیکھا لیکن وہ اس قابل نہیں تھا کہ کوئی ردعمل دے پاتا۔ جولیٹ نے محسوس کیا کہ اسے فوری طور پر اسپتال لے جانا ضروری ہے۔ وہ بھاگتی ہوئی بیرونی دروازے پر گئی تاکہ کسی محلے دار کو پکار کر مدد کے لیے بلا سکے۔ دروازے پر پہنچتے ہی اسے گلی سے گزرتا جانی نظر آگیا۔

''برادر جانی۔'' اس نے جانی کو آواز دی۔

''یس سسٹر! اینی پرابلم؟'' اس کی پکار پر رک جانے والے جانی نے اس کی صورت سے ہی بھانپ لیا کہ اس کے ساتھ کوئی مسئلہ ہے۔

''ڈیڈ کی طبیعت بہت خراب ہے۔ انہیں ہاسپٹل لے کر جانا ہے۔'' اس نے جانی کو بتایا۔

''ٹھیک ہے۔ اپن ابھی سواری لے کر آتا ہے۔'' صورتِ حال کی سنگینی کو سمجھ کر جانی تیزی سے حرکت میں آگیا۔ اس اثنا میں غفور چاچا بھی وہاں پہنچ گئے۔ انہوں نے اندر جا کر جوزف کو دیکھا اور اس کی حالت دیکھ کر تشویش

میں مبتلا ہو گئے۔ جانی نے سواری لانے میں زیادہ دیر نہیں لگائی تھی۔ غفور چاچا اور اس نے مل کر جوزف کو اس کے بستر سے سواری میں منتقل کیا۔ جولیٹ کے ساتھ وہ دونوں بھی اسپتال گئے۔ وہاں پر بھی انہوں نے ہی معاملات سنبھالے۔ جولیٹ بس شل اعصاب کے ساتھ سب کچھ ہوتا دیکھتی رہی۔ ڈاکٹرز نے تیزی سے جوزف کو طبی امداد دی اور کچھ دیر میں اس کی حالت ذرا سنبھلی ہوئی نظر آنے لگی۔

''میرے اندازے کے مطابق ان صاحب کو مرض تو کوئی نہیں ہے لیکن یہ بات بھی اپنی جگہ حقیقت ہے کہ ان کے وجود میں زندگی کی علامات بہت کم محسوس ہوتی ہیں۔ عام فہم الفاظ میں آپ یہ سمجھ لیجیے کہ یہ صاحب اتنے کمزور ہو گئے ہیں کہ اگر ہم ان کی اس کمزوری کا توڑ نہیں کر سکے تو یہ کمزوری ہی ان کے لیے جان لیوا ثابت ہو سکتی ہے۔'' جوزف کو گلوکوز لگا کر لٹا دیا گیا تھا اور ڈاکٹر، جانی کے استفسار پر اسے یہ سب بتا رہا تھا۔

''کمزوری تو انہیں ہونی ہی تھی۔ یہ کچھ کھاتے پیتے جو نہیں ہیں۔ ممی کے بعد ڈیڈ کو زندگی سے کوئی انٹرسٹ ہی نہیں رہا ہے۔'' جولیٹ نے سسکتے ہوئے ڈاکٹر کی بات پر تبصرہ کیا۔

''اوہ...... آئی سی۔ پھر تو یہی بہتر ہے کہ ہم کچھ دن کے لیے انہیں ہاسپٹل میں ایڈمٹ کر لیں۔ یہاں انہیں گلوکوز اور انجکشنز وغیرہ لگیں گے تو ان کی حالت میں بہتری آنے کا امکان ہے۔'' ڈاکٹر نے صورتِ حال کو سمجھتے ہوئے فیصلہ سنایا۔

''ٹھیک ہے ڈاکٹر صاحب، جو آپ ٹھیک سمجھو ویسا کرو۔'' جانی نے فوراً اس سے اتفاق کیا پھر جولیٹ سے مخاطب ہو کر بولا۔

''ڈونٹ وری سسٹر۔ اپن ہے نا، اپن تمہارے ڈیڈ کو لک آفٹر کریں گا۔ اگر تم کو اپنی جاب پر جانا ہو تو بھی کوئی پرابلم نہیں ہے۔ تمہارے پیچھے اپن سب دیکھ لے گا۔''

''تھینک یو۔'' جولیٹ کے پاس اس کے اتنے اخلاص کے جواب میں یہی دو لفظ تھے۔

''تھینک یو کہنے کا کوئی ضرورت نہیں ہے۔ ابھی تم غفور چاچا کے ساتھ گھر واپس جاؤ۔ اپن ادھر ہاسپٹل میں ہے۔ تم مارننگ میں آنا چاہے تو آ جانا۔'' اس نے بہ اصرار جولیٹ کو گھر واپس بھجوا دیا۔ گھر پہنچتے ہی محلے کی خواتین اس سے ملنے کے لیے آ گئیں اور جوزف کی طبیعت کے بارے میں معلوم کرنے لگیں۔ اس نے غائب دماغی سے ان کے سوالوں کے جواب دیے۔ اصل میں اس کا ذہن اس وقت دو مختلف سمتوں میں بٹا ہوا تھا۔ ایک طرف جوزف کی حالت کی فکر تھی تو دوسری طرف کل ہونے والے جلسے کے بارے میں بھی سوچ رہی تھی۔ اسے کل کے جلسے میں اپنے انتقام کی آگ بجھانے کے لیے ایک بار پھر قسمت آزمائی تھی اور اس بار وہ ناکام ہونے کا بالکل بھی ارادہ نہیں رکھتی تھی۔ اس کی اس کیفیت کو محلے والیوں نے باپ کی بیماری کا نتیجہ سمجھا اور اپنے اپنے طور پر تسلیاں دیتی رہیں۔ پھر آہستہ آہستہ ان سب نے اپنے گھروں کو واپس لوٹنا شروع کر دیا۔ سب سے آخر میں للیتا موسی گئی۔ اس نے پیشکش کی تھی کہ اگر جولیٹ چاہے تو وہ رات کو اس کے ساتھ رک سکتی ہے لیکن جولیٹ نے اس سے کہا کہ اپنے گھر میں اسے کسی بات کا ڈر نہیں ہے اور وہ آسانی سے اکیلی رہ سکتی ہے۔ موسی اسے اندر سے اچھی طرح دروازہ بند کر لینے اور کسی پریشانی کی صورت میں آواز دے لینے کی نصیحت کر کے رخصت ہو گئی۔ اس کے رخصت ہونے کے بعد جولیٹ نے اپنے کمرے کا رخ کیا۔ وہاں اب بھی نشانہ بازی کے بورڈ پر دلدار آغا کی بدحال تصویر چسپاں تھی۔

''ایک دن اور جی لو آغا! کل تمہاری لائف کا دی اینڈ ہو کر ہی رہے گا۔'' اس نے نفرت انگیز لہجے میں تصویر کے مقابل اس انداز میں کھڑے ہو کر کہا جیسے آغا کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر یہ جملہ کہہ رہی ہو حالانکہ چاقو کے بے تحاشا نشانات کے باعث اس تصویر پر آنکھیں تو کیا کوئی بھی نقش سلامت نہیں رہا تھا۔

☆☆☆

حسبِ معمول فاروق صبح جلدی جاگ گیا حالانکہ رات وہ لوگ منو پہلوان کے اڈے سے بہت دیر سے لوٹے تھے اور انہیں سونے میں خاصی تاخیر ہو گئی تھی۔ جاگنے کے بعد وہ ضروریات سے فارغ ہو کر کمرے سے باہر آیا تو علم ہوا کہ باقی لوگوں نے بھی صبح خیزی میں اس کا ساتھ دیا ہے اور اب سب ناشتے کے لیے ڈائننگ ہال کی طرف جانے کا ارادہ کر رہے ہیں۔ فاروق کے آتے ہی انہوں نے اپنے ارادے کو عملی جامہ پہنا ڈالا۔ ناشتا خوش گوار ماحول میں کیا گیا۔ شگفتہ اور انوپم اگروال بھی ان کے ساتھ ایسے ہی شامل رہے جیسے ان ہی کے ساتھی ہوں۔

''چاچی! ممبئی پلٹ کر آنے کے بعد آپ سب کو ہمارے گھر ضرور آنا ہے۔ میں آپ کی راہ دیکھوں گی۔'' شگفتہ نے نہ جانے کتنی بار ربن کو یاد دہانی کروائی تو وہ

مدبرانہ انداز میں مسکراتے ہوئے سر ہلانے لگا۔

''جلدی سے اچھے ہوجائیے گا فاروق بھیا۔ میں بھگوان سے آپ کے لیے اوشلی پرارتھنا کروں گی۔'' اس بار وہ فاروق سے مخاطب ہوئی۔

''مجھے یقین ہے کہ تمہاری دعا سے میں بہت جلدی اچھا ہوجاؤں گا۔ ویسے بھی میں خود کب بمبئی سے دور رہنا چاہتا ہوں۔ یہ تو مجبوری اور تمہارے چاچاجی کا اصرار ہے جو مجھے شملہ لے جارہا ہے۔'' فاروق نے بھی مسکرا کر اس کی بات کا جواب دیا۔

''چاچاجی عقل والے آدمی ہیں۔ یہ آپ کو شملہ لے جارہے ہیں تو ٹھیک ہی ہوگا۔''

شکنتلا ربن سے حد درجے متاثر تھی۔ ناشتے کے دوران وہ لوگ اسی طرح کی ہلکی پھلکی گفتگو کرتے رہے۔ پھر اپنے اپنے کمروں میں واپس چلے گئے۔ شکنتلا اور انوپم اگروال کو کچھ دیر میں روانہ ہوجانا تھا اس لیے وہ اپنی باقی ماندہ تیاری کرنا چاہتے تھے۔ ان دونوں کی روانگی کے بعد وہ لوگ بھی شملہ کے لیے نکل جاتے۔ فاروق کے ساتھ ساتھ کیتھرائن بھی اس کے کمرے میں پہنچ گئی۔ اسے معمول کا چیک اپ کرنے کے بعد فاروق کو اس کی دوائیں کھلانی تھیں۔ فاروق نے اس سے کہا بھی تھا کہ وہ خود اپنی دوائیں کھا سکتا ہے لیکن کیتھرائن کو اپنی نگرانی میں ہی اسے دوائیں کھلانا مناسب لگتا تھا کیونکہ اسے علم تھا کہ اکثر مریض اس سلسلے میں کوتاہی کرجاتے ہیں۔

''یہ آپ کی آنکھیں سرخ کیوں ہو رہی ہیں؟'' معائنہ کرتے ہوئے کیتھرائن نے اس کی آنکھوں کے سرخ گوشوں کا نوٹس لیا۔

''بس رات ذرا ہم لوگ دیر سے سوئے تھے اس لیے۔'' فاروق نے اسے مختصر جواب دیا۔

''آپ کو وقت پر پوری نیند لینی چاہیے۔ آپ کی جلد ری کوری کے لیے بھرپور نیند اور آرام بہت ضروری ہے۔'' کیتھرائن نے نرم لہجے میں اسے نصیحت کی۔

''میں جانتا ہوں سسٹر لیکن بس اچانک ہی ایک کام پڑ گیا تھا۔'' فاروق نے اتنے سادہ لہجے میں اپنی صفائی پیش کی کہ کیتھرائن اسے مزید کچھ نہیں کہہ سکی۔

''سر میں درد تو نہیں ہے؟'' اس کا بلڈ پریشر چیک کرتے ہوئے اس نے سوال کیا۔

''معمولی سا بھاری پن ہے۔ وہ تو زیادہ جاگنے سے ہو ہی جاتا ہے۔'' فاروق نے اسے جواب دیا۔ اسی وقت اس کے سر میں درد کی ایک لہر سی اٹھی اور چمک دکھا کر غائب ہوگئی۔ اس نے مناسب نہیں سمجھا کہ کیتھرائن کو اس کے متعلق بتا کر پریشان کرے۔ وہ اس درد کو رات نیند پوری نہ ہونے کا شاخسانہ سمجھ رہا تھا اور خیال تھا کہ دوا کھانے اور آرام کرنے سے طبیعت سنبھل جائے گی۔ اسے اس بات کا بھی احساس تھا کہ ربن کو جلد بمبئی لوٹ جانا چاہیے تاکہ وہاں کے معاملات سنبھال سکے۔ اس لیے وہ اپنی طبیعت کی ناسازی کا ذکر کرکے آج کے سفر کو ملتوی کروانے کا خطرہ نہیں مول لے سکتا تھا۔ اس نے اپنے طور پر طے کرلیا تھا کہ سفر کے دوران نیند پوری کرنے کی کوشش کرے گا۔ بھاٹیہ سیٹھ کی بھجوائی ہوئی گاڑی بڑی اور آرام دہ تھی اس لیے وہ سمجھتا تھا کہ دورانِ سفر اسے کوئی مشکل پیش نہیں آئے گی۔

کیتھرائن اس کے معائنے کے بعد اسے اپنی نگرانی میں دوائیں کھلا کر رخصت ہوئی تو فوراً ہی گولو خبر لے کر آگیا کہ شکنتلا اور انوپم اگروال روانہ ہو رہے ہیں۔ ان کے درمیان پہلے ہی یہ بات طے پاچکی تھی کہ دونوں باپ بیٹی کو رخصت کرنے گاڑی میں صرف ربن ہی ان کے ساتھ جائے گا اور باقی لوگ یہیں سے الوداع کہہ دیں گے۔ گولو کی زبانی پیغام سنتے ہی فاروق اپنے کمرے سے باہر نکل گیا۔ سب ہی کوریڈور میں موجود تھے۔ سب نے باجماعت نیچے کا رخ کیا۔ ساتھ نہ جانے والے گاڑی تک شکنتلا کو رخصت کرنے کا ارادہ رکھتے تھے۔ باہر بھاٹیہ سیٹھ کا ڈرائیور حکم کے مطابق تیار کھڑا تھا۔ وہ لوگ باہر نکلے تو اس نے انوپم اگروال کا چھوٹا سا سفری بیگ مؤدبانہ مستعدی سے تھام کر گاڑی میں رکھا۔ شکنتلا کا بڑا سا پرس جس میں وہ نقدی اور زیور رکھ کر لائی تھی البتہ اسی کے پاس رہا۔ دونوں باپ بیٹی کے گاڑی میں سوار ہونے سے قبل رسمی الوداعی جملے ادا کیے جانے لگے پھر پہلے انوپم اگروال گاڑی کی پچھلی نشست پر بیٹھا۔ اس کے بعد ربن نے ڈرائیور کے ساتھ والی سیٹ سنبھال لی۔ شکنتلا البتہ تاخیر کررہی تھی۔ ایسا لگتا تھا اس کا ان لوگوں سے جدا ہونے کو دل ہی نہیں چاہ رہا ہے۔ اس نے ایک بار پھر گولو اور فاروق کو پرنام کیا اور کیتھرائن سے گلے ملنے کے بعد بادل ناخواستہ گھوم کر گاڑی کے دوسری طرف کے کھلے دروازے کی طرف جانے لگی۔ ابھی وہ دروازے سے کچھ دور تھی کہ ایک لڑکا نہ جانے کہاں سے بالکل اچانک ہی نمودار ہوکر اس سے ٹکرایا اور اس کا پرس کھینچ کر کسی چھلاوے کی طرح دوڑ گیا۔ فاروق نے یہ منظر دیکھا تو تیزی سے حرکت میں آیا۔ حرکت میں ربن بھی آیا تھا

لیکن اسے دروازے کا لاک کھول کر باہر نکلنے میں کچھ وقت لگا تھا۔ اس اثنا میں پرس چھیننے والا لڑکا اور فاروق خاصے دور نکل چکے تھے۔

لڑکا بہت تیز دوڑ رہا تھا اور اس کا تعاقب کرنے میں فاروق کو اپنی پوری جان لڑانی پڑ رہی تھی۔ اصل میں طبیعت کے اضمحلال نے بھی اس کی قوتِ عمل کو متاثر کیا تھا اور وہ لڑکے کے تعاقب میں دوڑتے ہوئے مسلسل اپنے سر میں دھماکے سے محسوس کر رہا تھا۔ یہ درد تھا جو اپنا رنگ دکھانے لگا تھا۔ پھر بھی اس نے اچکے کا تعاقب ترک نہیں کیا۔ وہ بھلا یہ بات کیسے برداشت کرسکتا تھا کہ اس کی موجودگی میں کوئی اچکا اس کے ساتھ موجود ایک خاتون کا پرس چھین کر بھاگ نکلنے میں کامیاب ہوجائے۔ وہ اس اچکے کو اس کی اتنی بڑی جرأت کا سبق سکھائے بغیر نہیں چھوڑ سکتا تھا لیکن بالکل اچانک ہی قسمت نے اس کا ساتھ چھوڑ دیا۔ وہ راہ میں پڑا کوئی پتھر تھا جسے وہ جوش میں نہیں دیکھ سکا اور اس سے ٹھوکر کھا کر بری طرح گر گیا۔ گرنے سے اس کے سر پر بھی چوٹ لگی اور اس کے سامنے ہفت آسمان گھوم کر رہ گئے۔ درد کی شدت اتنی تھی کہ وہ اپنے حواس بحال نہیں رکھ سکا اور بہت تیزی سے اس کا دماغ تاریکی میں ڈوب گیا۔

☆☆☆

آئینے کے سامنے کھڑے ہو کر جولیٹ نے اپنا جائزہ لیا۔ آج اس نے سفید فل آستینوں والے بلاؤز کے ساتھ سفید ہی پھول دار لانگ اسکرٹ پہن رکھا تھا۔ اسکرٹ پر بنے پھول ہلکے گلابی اور آسمانی رنگوں پر مشتمل تھے اور آنکھوں کو ٹھنڈک کا احساس دلا رہے تھے۔ جولیٹ کے کانوں میں پڑی چھوٹی چھوٹی نگینے جڑی نقرئی بالیاں اس لباس کے ساتھ بہت دلکش لگ رہی تھیں۔ آج اس نے بہت دنوں کے بعد اپنے ہونٹوں پر ہلکے گلابی رنگ کی لپ اسٹک لگائی تھی اور بے پناہ نکھری ہوئی لگ رہی تھی۔ اپنے ساتھ پیش آنے والے حادثے کے بعد اس نے اپنی ذات پر دھیان دینا قطعی ترک کر دیا تھا اور جو ہاتھ لگتا پہن کر دفتر چلی جاتی تھی لیکن آج اس نے بہت سوچ سمجھ کر لباس کا انتخاب اور یہ سارا اہتمام کیا تھا کیونکہ وہ طے کر چکی تھی کہ آج کا دن اس کی زندگی کا ایک فیصلہ کن دن ہوگا اور اس ساری تیاری کا مقصد اپنے اندر عزم و ہمت کو توانا کرنا تھا۔ کوئی اسے دیکھتا تو حیران رہ جاتا کہ اس کا باپ اسپتال میں پڑا ہے اور وہ بناؤ سنگار کر کے دفتر جا رہی ہے لیکن اپنے اندر کی کیفیت وہ خود اچھی طرح جانتی تھی۔ آج وہ اس شخص کو اس کے انجام تک پہنچانے کا حتمی فیصلہ کر چکی تھی جو اس کے باپ کو اس حال تک پہنچانے کا ذمے دار تھا۔ اسے معلوم تھا کہ دلدار آغا کے قتل کے بعد وہ خود بھی نہیں بچے گی اور اسے جیل کی کال کوٹھری میں ڈال دیا جائے گا اس لیے اپنی آزاد زندگی کے آخری دن بہت تازہ دم اور توانا دکھائی دینا چاہتی تھی۔ اسے یقین تھا کہ تازگی اور توانائی اسے نفسیاتی طور پر مضبوط کرنے کا سبب بنے گی اور اس بار اس کی قوتِ عمل عین وقت پر دھوکا نہیں دے گی۔

آئینے میں اپنا جائزہ لے کر مطمئن ہوجانے کے بعد اس نے سفید رنگ کے سینڈل پیروں میں پہنے اور گھر سے نکل پڑی۔ آج وہ معمول سے کافی پہلے گھر سے نکلی تھی اس لیے معمول کے مطابق گلی میں نظر آنے والوں سے سامنا بھی نہیں ہوا۔ جلدی نکلنے کا مقصد یہ تھا کہ وہ اسپتال میں جوزف سے ملاقات کرتی ہوئی دفتر جائے۔ جانی نے اسے اس سلسلے میں پہلے ہی تسلی دے دی تھی کہ اس کی عدم موجودگی میں وہ جوزف کا پورا خیال رکھے گا۔ اسے اڈے والوں کے مہربان رویے کا پہلے ہی تجربہ ہو چکا تھا اس لیے جانتی تھی کہ جانی اپنے کہے پر پورا عمل کرے گا اور جوزف کے علاج معالجے میں اس کے ہونے یا نہ ہونے سے کوئی فرق نہیں پڑے گا۔ وہ اسپتال پہنچی تو جوزف کے بستر کے ساتھ موجود بینچ پر جانی مستعد بیٹھا نظر آیا۔ جوزف البتہ گہری نیند میں تھا۔

''کیسی طبیعت ہے ڈیڈ کی؟'' اس نے آہستہ آواز میں جانی سے دریافت کیا۔

''رات بھر ڈسٹرب رہا، ابھی بی فور ہاف آور ہی ریلیکس ہو کر سویا ہے۔'' جانی نے اسے بتایا پھر اسے تیار دیکھ کر بولا۔

''تم شاید آفس جانا مانگتا ہے۔''

''ہاں۔ آج مجھے ایک اہم جلسے کی رپورٹنگ کے لیے جانا ہے۔ پتا نہیں کتنی دیر لگ جائے، اس واسطے سوچا کہ ڈیڈ کو دیکھتی ہوئی جاؤں۔ تم یہاں ڈیڈ کے ساتھ رہو گے نا؟'' اس نے جوزف کے چہرے پر نظریں جمائے جمائے یہ جملے ادا کیے۔ وہ اس شفیق چہرے کو اپنی نظروں میں سمو کر اپنی زندگی کے سب سے اہم مشن پر روانہ ہونا چاہتی تھی۔

''ڈونٹ وری سسٹر! تم آرام سے اپنے آفس جاؤ۔ اپن ہے ادھر، سب دیکھ لے گا۔'' جانی نے ایک بار پھر اسے یقین دہانی کروائی۔

''میں تمہارے اور ڈیڈی کے لیے بریک فاسٹ لائی تھی۔'' جولیٹ نے اس کی یقین دہانی پر ذرا اطمینان محسوس کیا اور ہاتھ میں موجود باسکٹ اسے تھمائی۔

''تھینک یو سسٹر! پر تم صبح صبح اتنی تکلیف کائے کو اٹھایا۔ اپن ادھر ہوٹل سے بریک فاسٹ منگوالیتا۔'' جانی نے دل کی گہرائی سے اس کا شکریہ ادا کیا۔ جولیٹ کے اس عمل نے اسے یکدم ہی..... اپنے خاندان کی یاد دلا دی تھی۔ وہ اپنے گھر والوں کے ساتھ رہتا تو شاید اس کی ماں یا بہنوں میں سے کوئی اس کے لیے اسی طرح ناشتا تیار کرتا لیکن نہیں، ان بے چاریوں کے پاس تو شاید اس کی فرصت ہی نہ ہوتی کہ رات کسی کی ہوس اور اپنی مجبوریوں کی صلیب پر چڑھنے والی وہ عورتیں بھلا ایسی دلداریاں کیسے کرسکتی تھیں۔

''تکلیف کی کوئی بات نہیں ہے۔ میرا دل چاہ رہا تھا کہ میں تم لوگوں کو اپنے ہاتھ سے بریک فاسٹ بنا کر کھلاؤں۔'' اس کی کیفیت سے بے خبر جولیٹ اسے جواب دے رہی تھی۔ اصل میں وہ خود بھی عجیب کیفیات کا شکار تھی۔ اس کے دل میں یہ خیال تھا کہ آج وہ آخری بار اپنے ہاتھ سے اپنے باپ کو ناشتا بنا کر کھلا دے۔ بعد میں ایسا موقع ملنا شاید ممکن نہ ہوتا۔ ''میں آفس سے لیٹ ہو رہی ہوں۔ ڈیڈ اٹھیں تو پلیز انہیں بریک فاسٹ کروا دینا۔'' اس نے ایک نظر گھڑی پر ڈالی اور دوسری سوئے ہوئے جوزف کے چہرے پر ڈال کر جانی سے بولی۔

''او کے۔ یو ڈونٹ وری، اپن تمہارے ڈیڈ کو اچھی طرح بریک فاسٹ کروا دے گا۔ تم ایزی ہو کر آفس جاؤ۔'' جانی نے اسے تسلی دی تو اس نے سر ہلایا اور جھک کر جوزف کے ماتھے پر بوسہ دیا۔ بوسہ دیتے ہوئے اس کی آنکھوں میں ہلکی سی نمی تیر گئی۔ جدائی کبھی بھی آسان نہیں ہوا کرتی۔ پھر اس کا باپ تو بیمار اور ناتواں تھا۔ اسے اس کے سہارے کی ضرورت تھی اور وہ ایسے وقت میں اس کا ساتھ چھوڑنے والی تھی۔

''اپن تمہیں بس اسٹاپ تک چھوڑ دیتا ہے۔'' آنکھوں کی نمی کو اندر اتارنے کی کوشش کرتے ہوئے اس نے جانی کی آواز سنی۔ گلے میں آنسوؤں کا پھندا سا اٹکا ہوا تھا اس لیے زبان سے کچھ کہنا ممکن نہیں تھا۔ اس نے صرف اثبات میں سر ہلانے پر اکتفا کیا۔

''اتنا پریشان کائے کو ہوتی ہو۔ تمہارا ڈیڈ ایک دم فرسٹ کلاس ٹھیک ہو جائیں گا... ڈاکٹر بولا تھا نا کہ اسے کوئی بیماری نہیں ہے، صرف ویک نیس ہے۔ تھوڑے دن ہاسپٹل میں رہے گا تو ویک نیس بھی دور ہو جائے گا۔'' اسپتال سے باہر کی طرف جاتے ہوئے جانی نے اس کا ستا ہوا چہرہ دیکھ کر تسلی دی۔ تسلی دیتے ہوئے جانی خود بھی پُریقین تھا یا نہیں، اسے اس بات کا علم نہیں تھا لیکن وہ خود جانتی تھی کہ اس کے باپ کا اصل مسئلہ کمزوری نہیں ہے، اسے تو جوزفین کی جدائی کا گھن کھا رہا تھا اور گھن کب کسی کو پنپنے کا موقع دیتا ہے۔

''تم میرے پیچھے میرے ڈیڈ کا کیئر کرو گے نا برادر؟'' جانی کی تسلی کے جواب میں اس نے بہت آس سے اس سے سوال کیا۔

''وائے ناٹ۔ ہم تم کو بولا نا کہ تم ایزی ہو کر آفس جاؤ، اپن ادھر ہی ہے۔'' جانی نے ذرا اپنایت بھری خفگی کا مظاہرہ کیا۔

''لیکن تم کب تک انہیں لک آفٹر کرسکتے ہو؟'' اس کا ذہن صرف آج کے بارے میں نہیں بلکہ آئندہ کے بارے میں بھی سوچ رہا تھا۔

''ضرورت پڑے تو اپن سارا لائف بھی اسے لک آفٹر کرسکتا ہے۔ اپن نے تمہیں سسٹر بولا ہے تو سمجھو تمہارا فادر بھی اپنے فادر کے ماقف ہے۔'' جانی نے اس کی کیفیت کو سمجھے بغیر جوش سے جواب دیا۔ اس جواب نے جولیٹ کے دل میں ٹھنڈک سی ڈال دی۔ جانی ایسا آدمی تھا کہ وہ اس کے کہے پر پورا یقین کرسکتی تھی۔ اس یقین دہانی نے اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ کے پھول کھلائے اور وہ آنے والی بس کو ہاتھ دے کر اس میں سوار ہوگئی۔ بس میں سوار آفس کی طرف جاتے ہوئے وہ اردگرد کے ماحول سے بے خبر اپنے خیالوں میں ڈوبی ہوئی تھی۔

''کیسی ہو جولی؟'' کوئی اس کے ساتھ والی سیٹ پر آ کر بیٹھا اور اس سے دریافت کیا تو وہ اپنے خیالات سے چونک کر باہر آئی۔ وہ عارف تھا جسے آج وہ کئی دن بعد دیکھ رہی تھی۔

''کیا پہچانا نہیں؟'' اس کی خاموشی پر عارف نے مسکرا کر پوچھا۔

''تمہیں میں بہت اچھی طرح پہچان چکی ہوں۔''

اس نے رخ موڑتے ہوئے ایک ذومعنی جملہ بولا جس پر عارف نے توجہ نہیں دی اور اس کے چہرے پر نظر جما کر بولا۔ ''یو آر لکنگ سو بیوٹی فل۔''

''آئی نو۔ آئی ایم۔'' جولیٹ نے اس کی تعریف کا

نہایت رکھائی سے جواب دیا۔ اس بار عارف کچھ جھینپ گیا اور اپنا دفاع کرنے والے انداز میں بولا۔

''ہم کلاس فیلوز اور اچھے دوست رہے ہیں، کیا اس حوالے سے میں تم سے بات نہیں کر سکتا؟''

''تم خود ہی سارے تعلق توڑ کر گئے تھے۔ اس کے بعد کوئی گنجائش کب رہتی ہے۔ یہ بتاؤ کلکتہ سے کب آئے؟ وہاں تمہاری جاب کیسی چل رہی ہے؟'' اس نے بروقت اپنی آزردگی پر قابو پالیا۔

''کل ہی آیا ہوں دو دن کی چھٹی لے کر۔ جاب بھی ٹھیک چل رہی ہے۔'' عارف نے اس بار قدرے بجھے ہوئے لہجے میں اسے جواب دیا پھر پوچھا۔ ''تم کیسی ہو؟''

''میرا اسٹاپ آگیا ہے۔'' اسے جواب دینے کے بجائے وہ یکدم ہی اپنی سیٹ پر سے اٹھ کر بس کے دروازے کی طرف بڑھ گئی۔ اسٹاپ ابھی قدرے دور تھا۔ وہ ڈنڈا پکڑ کر کھڑی ہوگئی۔ تیزی سے چلتی بس اسٹاپ پر رکی تو وہ عارف پر ایک نگاہِ غلط ڈالے بغیر نیچے اتر گئی۔ اس کی زندگی میں عارف کا باب ختم ہو چکا تھا اور وہ بھی پلٹ کر اس کی طرف دیکھنے والی نہیں تھی۔ دفتر پہنچنے تک وہ اس کا خیال بھی اپنے ذہن سے جھٹک چکی تھی۔ ایک بے وفا کو یاد رکھنے کا کوئی فائدہ بھی نہیں تھا کیونکہ اگر وہ بے وفائی نہ کرتا تو آج اس کی زندگی مختلف ہو سکتی تھی اور وہ انتقام کی راہ پر چلنے کے بجائے اپنے لیے بھی کچھ اور سوچ سکتی تھی لیکن اب اس کے پاس سوچنے کے لیے ایک ہی بات رہ گئی تھی۔ دفتر میں اپنا کام نمٹاتے ہوئے بھی وہ آج شام ہونے والے جلسے کے متعلق سوچتی رہی۔ لنچ ٹائم سے کچھ پہلے رندھاوا نے اسے بلا کر اس سلسلے میں بریفنگ دی۔ اسے رندھاوا کی بریفنگ سے زیادہ اپنی پلاننگ پر عمل کرنے میں دلچسپی تھی چنانچہ جب لنچ کے بعد رندھاوا نے اسے دوبارہ اپنے کمرے میں بلایا تو وہ تھوڑی سے جھنجلا گئی لیکن باس کے حکم کی تعمیل تو کرنی تھی۔

''تمہارے لیے جانی نام کے کسی آدمی کا فون آیا تھا۔ اس نے میسیج دیا ہے کہ تمہارے فادر کی طبیعت اچانک ہی بہت بگڑ گئی ہے اور وہ تم سے ملنا چاہتے ہیں اس لیے تم فوری ہاسپٹل پہنچو۔'' اس کی توقعات کے خلاف رندھاوا نے اسے کسی اور مقصد کے لیے کال کیا تھا۔ اس خبر کو سن کر اس کا دماغ سن سا ہوگیا۔ وہ تو جلسے میں شرکت کے لیے کچھ دیر بعد دفتر سے نکلنے والی تھی لیکن عین وقت پر ایسی بری خبر آگئی تھی۔

''تم ہاسپٹل چلی جاؤ۔ میں جلسے کی رپورٹنگ کے لیے کسی اور کو بھیج دوں گا۔'' رندھاوا نہیں جانتا تھا کہ اس کے لیے جلسے میں شریک ہونا کتنی اہمیت رکھتا ہے۔ وہ تو فون کرنے والے کے لہجے کی سنگینی محسوس کر کے خلافِ عادت انسانیت اور ہمدردی کا مظاہرہ کر رہا تھا۔

''جلسے میں آپ کسی اور کو میری جگہ بھیج دیں گے؟'' جولیٹ نے الجھے ہوئے ذہن کے ساتھ اس سے سوال کیا۔ اصل میں تو وہ یہ سوچ رہی تھی کہ آج پھر موقع اس کے ہاتھ سے نکل گیا ہے۔

''شیور۔ میں کسی اور کو بھیج دوں گا تم ہاسپٹل جا کر اپنے فادر کو دیکھو۔'' رندھاوا نے اسے جواب دیا اور پہلی بار اسے احساس ہوا کہ رندھاوا کی اتنی مہربانی کا مطلب تھا کہ جوزف کی حالت بہت سیریس ہے۔ وہ یکدم ہی اس کیفیت سے نکل آئی جو ہنوز مسلسل اس پر طاری تھی اور اس کے دماغ میں انتقام کے علاوہ کسی اور خیال کو نہیں آنے دے رہی تھی۔ انتقام لینے کا موقع تو اسے پھر بھی مل ہی سکتا تھا لیکن ابھی تو اسے اس شخص کے بارے میں سوچنا چاہیے تھا جس نے اپنی شفقت کے سائے میں اس کی پرورش کی تھی اور انگلی تھام کر چلنا سکھایا تھا۔ وہ محبت، وہ پیار یاد آیا تو وہ سب کچھ فراموش کر کے اسپتال کے لیے دوڑ گئی۔ وقت کی اہمیت کے پیشِ نظر اس بار اس نے بس سے سفر کرنے کے بجائے ٹیکسی کا انتخاب کیا تھا۔ ٹیکسی ڈرائیور نے بھی اس کی فرمائش پر ٹیکسی بہت تیزی سے چلائی۔ اسپتال کے گیٹ پر اتر کر وہ تقریباً بھاگتی ہوئی اس وارڈ تک پہنچی جہاں جوزف کو رکھا گیا تھا۔ وہاں جوزف کے بیڈ کے گرد جانی، ڈاکٹر اور پیرامیڈیکل اسٹاف اس طرح گھیرا ڈال کر کھڑے تھے کہ اسے جوزف کی شکل دکھائی نہیں دی۔

''ڈیڈ۔'' اس نے بے ساختہ دور ہی سے جوزف کو پکارا۔ اس کی پکار پر جانی نے مڑ کر اس کی طرف دیکھا۔ اس کا چہرہ بری طرح ستا ہوا تھا۔ جولیٹ کا تیزی سے دھڑکتا دل جیسے اچانک ہی دھڑکنا بھول گیا اور کوئی سوال کرنے کی کوشش کے نتیجے میں ہونٹ تھرتھرا کر رہ گئے۔

زندگی کے تلخ و ترش حقائق اور
محبت کی فریب کاریوں کا مزید
احوال اگلے ماہ ملاحظہ فرمائیں

میں نے دو جلدوں پر مشتمل کتاب کو حیرت سے دیکھا۔ اس کا عنوان بہت دلچسپ تھا...... ''دا انسائیکلو پیڈیا آف امریکن ریس ریوئس۔'' میں نے بچپن میں ورلڈ بک انسائیکلو پیڈیا اور برٹانیکا کے نام تو سنے تھے، اس کے علاوہ پرندوں اور درختوں کے انسائیکلو پیڈیا کے نام بھی ذہن میں آرہے تھے لیکن نسلی فسادات کے بارے میں ایسی کسی کتاب کا علم نہیں تھا۔ میں نے وہ دونوں جلدیں شیلف سے نکال لیں۔

بدلتے موسم

تنویر ریاض

کبھی کبھی وقت کا دائرہ بھی قدرت بہت عجیب فارمولے سے مکمل کرتی ہے... انسان کا بچپن اور پھر دھیرے دھیرے گزرتے لمحات کتاب زیست پر واقعات کو رقم کرتے چلے جاتے ہیں... لیکن اکثر لمحات آئینہ بن کر یوں سامنے کھڑے ہوجاتے ہیں جیسے وقت پھر سے پلٹ آیا ہو... جب وہ خود ایک معصوم بچہ تھا اور آج اس کا اپنا بچہ اس سے ویسے ہی سوالات کررہا تھا جو کبھی اسے پریشان رکھتے تھے۔

ماضی کی راکھ میں دبی چنگاریوں کا عبرت انگیز قصہ

میں اپنے بیٹے کے ساتھ قصبے کی لائبریری میں آیا تھا جسے اپنے ایک اسکول پروجیکٹ پر کام کرنے کے لیے لائبریری کی ضرورت پیش آگئی تھی۔ میرا بیٹا جرمی بہت ذہین، خوب صورت اور قدرت کا دیا ہوا تحفہ تھا جو شادی کے دس سال بعد میری اور بیگی کی زندگی میں آیا۔ اس کی چھٹی جماعت کی ٹیچر کا خیال تھا کہ اس کے شاگردوں کو صرف ویب سائٹ پر ہی انحصار نہیں کرنا چاہیے بلکہ انہیں کتابوں سے بھی مدد لینے کی ضرورت ہے۔ جرمی کیٹلاگ میں ایسی کتابیں تلاش کر رہا تھا جن میں امریکی خاندان میں ہونے والی تبدیلی کے پہلوؤں کو اجاگر کیا گیا ہو اور میری نظریں نسلی فسادات سے متعلق کتاب پر جمی ہوئی تھیں۔ ابھی تک میں نے صرف سرورق ہی دیکھا تھا اور کتاب کو کھولتے ہوئے میرے ہاتھ کپکپا رہے تھے۔ اس کتاب پر نظر پڑتے ہی میرے ذہن میں ماضی کے دریچے کھل گئے تھے۔

☆☆☆

''تمہیں یقین ہے کہ تم یہ کام کرنا چاہتے ہو؟'' میری بہن کیٹ نے پوچھا۔ وہ ڈیڈی کی پرانی مرکری کار چلا رہی تھی۔ وہ جون کا دوسرا سوموار تھا اور اسے ہائی اسکول پاس کیے ہوئے تین دن ہو چکے تھے۔ وہ کیمپ گرین بروک میں کونسلر کے طور پر اپنا دوسرا سال شروع کرنے والی تھی۔ یہ کیمپ ہمارے گھر سے چند میل کے فاصلے پر گرین بروک ایلیمنٹری اسکول کے میدان میں لگایا گیا تھا۔

''کیوں نہیں؟'' میں نے جواب دیا۔ ''میرا یہی خیال ہے۔''

بارہ سال کی عمر میں میں کوئی مضبوط قوتِ ارادی کا مالک نہیں تھا۔ مجھے جہاں بھیجا جاتا، میں چلا جاتا اور جہاں رہنے کو کہا جاتا، وہاں ٹھہر جاتا۔ کم از کم مجھے تو یہی یاد پڑتا ہے۔

''تمہیں اس کا کوئی معاوضہ نہیں ملے گا۔ کیا تمہارے لیے یہ پریشان کن بات نہیں؟''

''ابھی میں بہت چھوٹا ہوں اور کوئی تنخواہ والی ملازمت نہیں کر سکتا۔'' میں نے کندھے اچکاتے ہوئے کہا۔ ''مما، آنٹی میگ کی دیکھ بھال کے لیے ٹرینٹن جا رہی ہیں اور وہ گرمیوں کا زیادہ حصہ وہیں گزاریں گی۔ ان کا خیال ہے کہ میں سارا دن گھر میں تنہا نہیں رہ سکتا۔''

''اور تم نے ان کی یہ بات مان لی؟'' کیٹ نے سرد آہ بھرتے ہوئے کہا۔ ''کبھی کبھی تو مجھے یقین نہیں آتا کہ تم میرے بھائی ہو۔''

''اس لیے کہ تم ان سے لڑتی رہتی ہو لیکن اس کا یہ مطلب نہیں کہ میں بھی ایسا ہی کروں۔''

''میں ایسا نہیں سمجھتی۔'' اس نے کہا۔ ''بلکہ وہ تمہیں کسی اور وجہ سے گرین بروک بھیجنا چاہ رہی ہیں۔''

''مثلاً؟''

''میں نہیں جانتی۔ کہیں ایسا تو نہیں کہ مما نے تمہیں مجھ پر نظر رکھنے کے لیے کہا ہو؟''

میں نے اسے غور سے دیکھا اور بولا۔ ''وہ ایسا کیوں کریں گی؟''

''کوئی خاص وجہ نہیں۔ انہیں دوسروں پر شک کرنے کی عادت ہے۔ وہ ابھی تک انیسویں صدی میں رہ رہے ہیں۔ تم خود ہی دیکھ لو کہ جب میں سان فرانسسکو میں تھی تو وہ کبھی میرے بارے میں پریشان نہیں ہوئے۔''

''وہ اب بھی تمہارے لیے فکرمند رہتے ہیں۔''

وہ قہقہہ لگاتے ہوئے بولی۔ ''ہاں لیکن میں نے ان کی زبان سے کبھی نہیں سنا۔''

''میری سمجھ میں نہیں آتا کہ تمہیں کیلی فورنیا کیوں جانا پڑ رہا ہے؟''

''اس لیے کہ میں وہاں جانا چاہتی ہوں۔ مجھے وہاں کے ایک بہترین اسکول میں وظیفہ مل گیا ہے۔''

میں یہ بات جانتا تھا۔ سینٹ میری کا مونسگر میکم میرے والدین کا بہت اچھا دوست تھا۔ اسی نے کیٹ کی سفارش کی تھی۔ میں نے پوچھا۔ ''کیا تمہارا جانا صحیح رہے گا؟''

اس نے اسٹیئرنگ وہیل کو مضبوطی سے پکڑتے ہوئے کہا۔ ''مجھے کیتھولک کالج میں جانے کا شوق نہیں ہے لیکن ممی ڈیڈی ہم دونوں کو پرائیویٹ اسکول میں نہیں پڑھا سکتے۔''

''میں نہیں جانتا کہ کبھی کالج جا سکوں گا۔''

''تم ضرور جاؤ گے کِی۔'' اس نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ''ہماری منزل آگئی۔ تم اپنی پہلی ملازمت کے لیے تیار ہو جاؤ جو بغیر تنخواہ کی ہے۔''

گرین بروک اتنا اچھا اسکول نہیں تھا۔ اس کا اندازہ مجھے وہاں داخل ہوتے ہی ہو گیا۔ میدان میں گھاس نہیں تھی البتہ اسے سیمنٹ سے پختہ کر دیا گیا تھا۔ مجھے وہاں کوئی ہریالی یا چشمہ نظر نہیں آیا۔ ہم کیفے ٹیریا میں گئے جہاں تقریباً تیس کے قریب لوگ موجود تھے۔ میں نے وہاں اپنی عمر کے دو بچوں کو دیکھا۔ ان میں ایک لڑکا اور ایک لڑکی تھی۔ ہم جونیئر کونسلر کہلاتے تھے یعنی بغیر تنخواہ کے معاون جو قیمتی عملی تجربہ حاصل کرنے آئے تھے۔ یہ بات میرے باپ نے کہی تھی۔

"تمہیں دیکھ کر خوشی ہوئی کیٹ۔" ایک طویل قامت شخص نے کہا۔ اس نے سلیٹی رنگ کی قمیص پہن رکھی تھی جس پر باس لکھا ہوا تھا۔ "یہ ضرور مکی ہوگا۔" اس نے میرے کندھے کو ہلکے سے ہلاتے ہوئے کہا۔

"ہیلو مسٹر بیک۔" کیٹ نے کہا۔ "اسے اپنے ساتھ رکھنے کا شکریہ۔"

"اگر یہ بھی اپنی بہن کی طرح بہترین ہوا تو ہم اپنے آپ کو خوش قسمت سمجھیں گے۔" وہ کیٹ کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔

مسٹر بیک اس کمرے میں سب سے زیادہ عمر رسیدہ تھے۔ ان کی عمر تقریباً پینتیس برس ہوگی اور ان کے سر کے بال اڑنا شروع ہوگئے تھے۔ وہ ایک ایسے شخص کی طرح نظر آرہے تھے جس نے پوری دنیا کو اپنے کندھوں پر اٹھا رکھا ہو، وہ اپنی جگہ سے اٹھے اور انہوں نے تقریر شروع کردی جس کی توقع ہم لوگ ان سے کررہے تھے۔

"جیسا کہ تم لوگ جانتے ہو کہ ہم ان لوگوں کی خدمت کرتے ہیں جنہیں تمام مراعات حاصل نہیں۔"

"اس کا مطلب ہے کہ وہ غریب ہیں۔" کیٹ میری طرف دیکھتے ہوئے بڑبڑائی۔

"اور ان بچوں نے گزشتہ دو برسوں میں بہت سی تبدیلیاں دیکھی ہیں۔"

"اس کا مطلب ہے کہ وہ نیگرو ہیں۔" کیٹ نے وضاحت کی۔

"یہ کیمپ ان کے لیے بہترین موقع ہوسکتا ہے کہ وہ اپنی زندگیوں کو بہتر بنائیں۔" انہوں نے اپنی مٹھی کو ہتھوڑے کی طرح لہراتے ہوئے کہا۔ "ان کے اپنے مفاد میں ہمیں صورتِ حال کو قابو میں رکھنا ہے۔"

میں نے کیٹ کی طرف دیکھا۔ وہ کندھے اچکاتے ہوئے بولی۔ "وہ جو کہہ رہا ہے، اس کا یہی مطلب ہے۔"

اس تقریر کے بعد کیٹ نے میرا تعارف مس اوسگڈ سے کروایا۔ مجھے اسی کونسلر کے ساتھ کام کرنا تھا۔ وہ بہت زیادہ دبلی پتلی نیگرو عورت تھی اور اس کی عمر بھی مسٹر بیک جتنی ہوگی۔ کیٹ نے مجھے بتایا کہ اسکول کے زمانے میں وہ پہلی جماعت کو پڑھاتی تھی اور ہمیں اسی گروپ کے ساتھ پورے موسم گرما میں کام کرنا ہوگا۔

"تو تم ہی مکی ہو؟" وہ مجھے گھورتے ہوئے بولی۔

"یس میڈم۔" میں نے کہا۔

"اسکول میں تمہارے پسندیدہ مضامین کون سے تھے؟"

اس سوال نے مجھے چونکا دیا۔ میں شرماتے ہوئے بولا۔ "انگریزی۔"

اس نے اثبات میں سر ہلایا جیسے میں نے معقول اور دلچسپ جواب دیا ہو۔ "کیا تمہیں تیرنا آتا ہے؟"

"ہاں۔ مجھے فلائنگ فش کا ٹائٹل مل چکا ہے۔"

"ویری گڈ۔ میں ہفتے میں تین دن بچوں کو تیراکی کے لیے لے کر جاؤں گی۔"

اس نے مجھے بتایا کہ بقیہ دنوں میں وہ مختلف کھیل، ہنر اور معلوماتی دورے کروائے گی۔ ہماری گفتگو بہت دلچسپ رہی۔ جیسے وہ کسی بالغ فرد سے باتیں کررہی تھی۔

کھانے کے وقفے میں میں کیٹ کو تلاش کرتا رہا اور میں نے اسے ایک طویل قامت نیگرو سے باتیں کرتے دیکھ لیا۔ اس کی کالج جانے کی عمر تھی اور وہ اس سے چند سال بڑا لگ رہا تھا۔

"مکی! یہ لائیڈ موزرو ہے۔ یہاں کا اسپورٹس کونسلر۔" کیٹ نے اس کا تعارف کرواتے ہوئے کہا۔

اس نے مصافحے کے لیے ہاتھ بڑھاتے ہوئے کہا۔ "تمہیں کھیلوں سے دلچسپی ہے مکی؟"

"میں ایسا ہی سمجھتا ہوں۔" شاید یہ جواب کافی نہیں تھا۔ میں نے وضاحت کرتے ہوئے کہا۔ "میں ایک اچھا تیراک ہوں۔"

"یہ تمہارے لیے اچھا ہے لیکن میں تیراکی نہیں سکھاتا۔ ان کے اپنے انسٹرکٹرز ہیں۔"

"اس کے علاوہ، وہ نیگروز کے بارے میں کہتے ہیں کہ وہ اچھے تیراک نہیں ہوتے۔"

میں حیرت سے اسے دیکھنے لگا۔ میں نے ڈیڈی کو ایسی باتیں کرتے ہوئے سنا تھا لیکن کیٹ نے کبھی ایسا نہیں کہا اور کون ایسا احمق ہوگا جو کسی سیاہ فام کے سامنے یہ کہے۔

لائیڈ قہقہہ لگاتے ہوئے بولا۔ "مس، ایسی باتیں مت کرو۔ تمہارا بھائی سمجھے گا کہ تم سنجیدہ ہو۔"

"وہ مجھے اچھی طرح جانتا ہے۔" کیٹ نے کہا اور میرے بالوں میں ہاتھ پھیرتے ہوئے بولی۔ "لائیڈ دوڑ لگاتا ہے اور اگلے سال میکسیکو جارہا ہے۔"

"میکسیکو؟" میں نے حیرت سے کہا۔

"اس کا اشارہ اولمپکس کی طرف ہے۔" لائیڈ نے وضاحت کرتے ہوئے کہا۔ "اور ایسے کئی لوگ ہیں جو سمجھتے ہیں کہ وہ وہاں کامیاب ہوجائیں گے۔"

"مجھے یقین ہے کہ تم ضرور جیتو گے۔" کیٹ نے اپنا

ہاتھ اس کے بازو پر رکھتے ہوئے کہا۔
مجھے پورا یقین تھا کہ ڈیڈی بھی انہیں اس طرح باتیں کرتا ہوا دیکھنا نہیں چاہیں گے۔
''لائیڈ!'' مسٹر بیک نے قریب آتے ہوئے کہا۔ ''کیا تمہارے پاس لاکر کی چابیاں ہیں؟''
اس نے اپنی جیبیں دیکھیں اور بولا۔ ''میں پھر انہیں دفتر میں چھوڑ آیا۔''
''برائے مہربانی اپنی چابیاں سنبھال کر رکھا کرو۔'' مسٹر بیک نے لائیڈ کو جاتے ہوئے دیکھا، وہ بالکل ڈیڈی کی طرح اسے گھور رہے تھے۔
کیمپ میں حصہ لینے والے دو دن بعد پہنچے اور میں نے محسوس کیا کہ میں اس کام سے لطف اندوز ہو رہا ہوں۔ مس اوسگڈ کا خیال تھا کہ میں اپنا کام اچھی طرح کر رہا ہوں جبکہ دوسرے لوگ اپنے مسائل میں الجھے ہوئے تھے۔ مما چار جولائی کا جشن آزادی منانے کے لیے ٹرینٹن سے واپس آگئی تھیں۔ انہوں نے آنٹی میگ کی بیماری کے بارے میں کچھ نہیں بتایا لیکن میرا خیال تھا کہ وہ کینسر میں مبتلا ہوگئی تھیں۔
چھٹیوں میں خاندان کا ایک جگہ جمع ہونا کسی تفریح سے کم نہیں ہوتا لیکن یہ تفریح ایک ہفتے بعد ہی غارت ہوگئی۔ مما رات کا کھانا بنا رہی تھیں اور گھر کے بقیہ افراد کوریئر نیوز کا مطالعہ کر رہے تھے۔ کیٹ کے پاس عورتوں کا صفحہ تھا۔ میں بچوں کی کہانیاں پڑھ رہا تھا اور ڈیڈی پہلے صفحے پر نظریں جمائے ہوئے تھے۔ انہوں نے سر ہلاتے ہوئے کہا۔ ''ان لوگوں کو کیا ہو گیا ہے؟''
''آپ کن لوگوں کی بات کر رہے ہیں؟'' کیٹ نے پوچھا۔
''وہی جو نیوارک میں ہنگامہ آرائی کر رہے ہیں۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ یہ کیا چاہتے ہیں؟''
''آپ کا اشارہ نیگروز کی طرف ہے؟'' اس نے کہا۔
''بالکل۔ میں انہی کی بات کر رہا ہوں۔ ان کے علاوہ اور کون ہنگامہ آرائی کر سکتا ہے؟''
''ان کے مسائل کو سمجھنے کی ضرورت ہے۔'' کیٹ نے کہا۔ ''وہ اچھی ملازمتیں چاہتے ہیں، وہ چاہتے ہیں کہ انہیں بھی پبلک سوئمنگ پول میں تیراکی کرنے کی اجازت دی جائے۔ وہ چاہتے ہیں کہ سٹی کونسل میں ان کی نمائندگی بھی ہو۔ وہ......''
ڈیڈی نے اخبار میز پر پھینک دیا اور بولے۔ ''تم نہیں جانتیں کہ کن لوگوں کی بات کر رہی ہو۔ اگر انہیں یہ جگہ پسند نہیں تو واپس جنوب کی طرف کیوں نہیں چلے جاتے؟''
کیٹ حیرت انگیز طور پر پُرسکون تھی۔ اس نے کہا۔ ''ڈیڈی! آپ نیگروز سے کیوں نفرت کرتے ہیں؟''
اب وہ اپنی جگہ پر کھڑے ہو گئے۔ ان کا چہرہ غصے سے سرخ ہو رہا تھا۔ ''میں ان سے نفرت نہیں کرتا۔ میرے دل میں ان کے خلاف کچھ نہیں ہے لیکن مجھے گناہ سے نفرت ہے اور یہ دوسرے لوگوں سے زیادہ گناہ گار ہیں۔''
کیٹ کا منہ حیرت سے کھل گیا اور وہ بولی۔ ''کیا آپ نے خود یہ بات سنی ہے؟''
مما کچن سے باہر آئیں تو ڈیڈی، کیٹ کو اس کے کمرے میں جانے کا حکم دے رہے تھے۔
''میں خود بھی یہاں ٹھہرنا نہیں چاہتی۔'' کیٹ نے کہا اور اپنے کمرے میں چلی گئی۔
''نیوارک یہاں سے بیس میل کے فاصلے پر ہے۔'' ڈیڈی چلاتے ہوئے بولے۔ ''دعا کرو کہ وہ یہاں سے دور رہیں۔''
نیگروز پارک ایونیو کے شمال میں رہتے تھے جبکہ ہماری رہائش چند بلاک کے فاصلے پر جنوب میں تھی۔ جمعہ کی شب ایک پولیس والا ڈیوٹی ختم کر کے ایک ہوٹل پر سیکیورٹی گارڈ کے فرائض انجام دے رہا تھا کہ اس کا کچھ نیگروز سے جھگڑا ہو گیا۔ اسی پولیس والے پر چند ہفتے قبل دوران گرفتاری ایک نیگرو عورت سے بدسلوکی کا الزام بھی عائد کیا گیا تھا۔
ہوٹل پر ہونے والے جھگڑے نے آگ لگا دی۔ نوجوان لڑکوں نے تجارتی عمارتوں کی کھڑکیوں کے شیشے توڑ دیے۔ نصف شب تک ویسٹ اینڈ کی سڑکوں پر سیکڑوں لوگ نکل آئے تھے اور ان میں سے کچھ پولیس کی گاڑیوں پر پتھراؤ کر رہے تھے۔ پولیس نے کچھ لڑکوں کو ایک گیس اسٹیشن پر دستی بم بناتے ہوئے بھی پکڑا تھا۔
دوسرے روز مما نے ڈیڈی سمیت ہم میں سے کسی کو بھی گھر سے باہر نہیں جانے دیا۔ نیوجرسی میں کوئی ٹی وی اسٹیشن نہیں تھا۔ لہٰذا ہمیں اپنے شہر کی خبروں کے لیے ریڈیو پر انحصار کرنا پڑ رہا تھا۔ ہمارے میئر نے احتجاجی مظاہرین کے نمائندوں سے ملاقات کی اور ان کی شکایات کو نظرانداز کرنے کا فیصلہ کیا۔ اس کا کہنا تھا کہ وہ یہ شکایات پہلے بھی سن چکا ہے۔ مجھے یاد ہے کہ یہ سن کر میں بہت حیران ہوا تھا۔ ان کی شکایات کو دوبارہ نظرانداز کرنے کا مطلب تھا کہ اس نے ماضی میں بھی ان پر توجہ نہیں دی تھی۔

مظاہرین نے رات میں کھلنے والے اسٹورز کو آگ لگانا شروع کر دی۔ دوسرے شہروں کی طرح یہ اندھا دھند نہیں تھا بلکہ زیادہ تر ایسی دکانوں کو آگ لگائی گئی جن کے مالکان سفید چمڑی والے تھے اور جن کے بارے میں مشہور تھا کہ وہاں گھٹیا معیار کی چیزیں مہنگے داموں فروخت ہوتی ہیں۔ میں نے اس رات کیٹ کو ٹیلی فون پر روتے ہوئے دیکھا۔ اتوار تک معاملات اور بھی خراب ہو گئے۔ نوجوان لڑکوں نے اسٹورز سے لوٹے ہوئے سامان کی مدد سے رکاوٹیں کھڑی کر دیں اور انہوں نے سولوول کے علاقے کو پوری طرح بلاک کر دیا۔ پولیس کو ہدایت کر دی گئی کہ وہ اس مقام سے دور رہے تاکہ حالات مزید خراب نہ ہوں لہٰذا پولیس صرف تجارتی علاقے تک محدود ہو گئی۔ اگر نیگروز اپنے علاقے میں ہنگامہ آرائی کرنا چاہتے تو کسی کو اس پر اعتراض نہ ہوتا۔

سولوول ہمارے گھر سے صرف ایک میل کے فاصلے پر تھا۔

جب میں سوموار کی صبح ناشتا کرنے بیٹھا تو مما نے بتایا کہ... کیمپ ملتوی ہو گیا ہے۔ ان کے چہرے پر افسردگی چھائی ہوئی تھی۔

''کیوں؟'' میں نے پوچھا۔ ایسا صرف برف باری کے دنوں میں ہوتا تھا جبکہ باہر موسم بہت خوشگوار تھا۔

وہ کچن ٹیبل پر بیٹھتے ہوئے بولیں۔ ''ایسا صرف فسادات کی وجہ سے ہوا ہے۔ گزشتہ رات ایک افسوس ناک واقعہ پیش آیا اور ایک پولیس والا مارا گیا۔''

انہوں نے مجھے وہی بات بتائی جو وہ ریڈیو پر سن چکی تھیں۔ ''ایک گشتی سپاہی فساد زدہ علاقے کے باہر پہرا دے رہا تھا۔ وہ لٹیروں کا تعاقب کرتے ہوئے سولوول میں داخل ہو گیا اور ان میں سے ایک پر گولی چلا دی جس کے بعد نوجوانوں کے ایک گروپ نے اس پر حملہ کر دیا۔ چند لوگوں نے اسے بچانے کی کوشش کی جبکہ کچھ حملہ آوروں کی مدد کر رہے تھے پھر کسی نے اسی کی گن سے اس پر فائر کر دیا۔ زخمی لٹیرا تو زندہ ہے لیکن پولیس والا مارا گیا۔''

''یہ واقعی افسوس ناک خبر ہے۔'' میں یقین سے نہیں کہہ سکتا کہ یہ جملہ میں نے پولیس والے کے مرنے پر کہا تھا یا کیمپ کے بند ہونے پر۔

''حالات اور خراب ہو گئے ہیں۔'' ڈیڈی نے کہا۔ وہ راہداری میں کھڑے ہوئے تھے اور ان کے ہاتھ میں نیوارک نیوز کا تازہ شمارہ تھا۔ ''اب ان کے پاس مشین گنیں بھی ہیں۔''

مما اپنی جگہ سے کھڑے ہوتے ہوئے بولیں۔ ''تم کن لوگوں کی بات کر رہے ہو؟''

''ان فسادیوں نے گزشتہ روز مڈل سیکس کی ایک فیکٹری سے چھیالیس کاربائن چرائی ہیں۔''

''اوہ میرے خدا۔'' مما اپنے گالوں پر ہاتھ رکھتے ہوئے بولیں۔

''یہ کاربن کیا ہوتی ہے؟'' میں نے پوچھا۔

''کاربائن......'' ڈیڈی نے تصحیح کرتے ہوئے کہا۔ ''یہ رائفل سپاہی استعمال کرتے ہیں لیکن اب فسادیوں کے ہاتھ لگ گئی ہیں۔ اب وہ پولیس والوں کو مار سکتے ہیں۔''

میں نے ان کے پیچھے کیٹ کو کھڑے ہوئے دیکھا۔ اس کی آنکھیں پھیلی ہوئی تھیں۔ ''نیشنل گارڈ نے ویسٹ اینڈ کا محاصرہ کر لیا ہے۔'' اس نے کہا۔

''گڈ!'' ڈیڈی بولے۔ ''اب وہ باہر نکل کر ہم پر حملہ نہیں کر سکتے۔ اچھا ہے، وہ اندر ہی گل سڑ جائیں۔''

''آپ ایسی باتیں کیوں کر رہے ہیں؟'' وہ روتے ہوئے بولی۔

''کیونکہ یہی سچ ہے۔''

مما نے اسے گھورتے ہوئے کہا۔ ''تمہیں نیشنل گارڈ کے بارے میں کیسے معلوم ہوا۔ اخبار میں تو نہیں آیا!''

''میں نے ریڈیو پر سنا تھا۔'' کیٹ نے جواب دیا۔

ڈیڈی نے اسے مشتبہ انداز میں دیکھا۔ اس سے پہلے کہ وہ کچھ بولتے، ٹیلی فون کی گھنٹی بجنے لگی۔ فیکٹری سے فون تھا جہاں وہ فورمین تھے۔ انہوں نے بتایا کہ اس روز فیکٹری بند رہے گی۔

گورنر نے ہنگامی حالت نافذ کر کے کاربائن کی تلاش میں نیشنل گارڈ کو ویسٹ اینڈ بھیج دیا تھا۔ وہ سرچ وارنٹ کے بغیر ہی لوگوں کے گھروں پر چھاپے مار رہے تھے لیکن انہیں کہیں سے بھی گن نہیں ملی۔

کیٹ تہ خانے میں واقع ریکریئشن روم میں رکھے ہوئے ٹیلی فون پر زیادہ وقت گزار رہی تھی۔ میرے زیادہ تر دوستوں کو گھر سے نکلنے کی اجازت نہیں تھی لہٰذا میں ایڈی کے ساتھ کھیل رہا تھا جو مجھ سے صرف ایک سال چھوٹا تھا لیکن وہ کوئی بھی کھیل اچھی طرح نہیں کھیل سکتا تھا مگر پڑوسی ہونے کی وجہ سے مجھے اس کے ساتھ کھیلنے میں آسانی تھی۔

بدھ تک حالات ٹھیک ہونا شروع ہو گئے گو کہ نیشنل گارڈ اب بھی موجود تھے۔ رات کے کھانے پر مسٹر بیک کا

فون آیا اور انہوں نے اطلاع دی کہ اگلے روز سے کیمپ دوبارہ شروع ہو رہا ہے۔ ایک گھنٹے کی بحث کے بعد ہمارے والدین اس پر تیار ہوئے کہ کیٹ مجھے کیمپ تک لے کر جائے گی۔ اس نے وعدہ کیا کہ وہ وہی راستہ اختیار کرے گی جو ڈیڈی کے خیال میں محفوظ ترین تھا۔

''کیا وہ خیریت سے ہے؟'' میں نے کار میں بیٹھتے ہوئے کیٹ سے پوچھا۔

''کون؟'' وہ چونکتے ہوئے بولی۔

''لائیڈ...... میں نے تمہیں اس سے فون پر باتیں کرتے ہوئے سنا تھا۔''

''تم ہارڈی بوائے کی طرح میری جاسوسی کرتے ہو؟''

''ہارڈی بوائز گونگے ہوتے ہیں۔ میں تین سراغ رسانوں'' جیسا ہوں۔''

''کیا تم نے مما اور ڈیڈی کو یہ بات بتائی تھی؟''

''تمہارا کیا خیال ہے اگر میں انہیں بتا دیتا تو وہ خاموش رہتے۔''

وہ قہقہہ لگاتے ہوئے بولی۔ ''نہیں، میں ایسا نہیں سمجھتی۔ تم لائیڈ کے بارے میں کیا سوچتے ہو؟''

''وہ اچھا آدمی معلوم ہوتا ہے۔''

''واقعی وہ اچھا ہے اور اس کے ساتھ ہی بہت بڑا ایتھلیٹ بھی۔ کوچ کا خیال ہے کہ وہ میکسیکو ضرور جائے گا۔ تم میری باتوں سے بور تو نہیں ہو رہے؟''

صبح کی میٹنگ شروع ہوئے دس منٹ ہوئے تھے کہ لائیڈ اور اس کا دوست آ گئے۔ مسٹر بیک اس وقت کیمپ کے شرکاء کو تحفظ کا احساس دلانے کی کوشش کر رہے تھے۔ انہوں نے اپنا لیکچر روک دیا اور طنزیہ انداز میں بولے۔

''تم ہمارے ساتھ شامل ہو سکتے ہو۔''

''مسٹر بیک...... ہمیں افسوس ہے۔'' آئزک نے کہا۔ ''لیکن ہمیں یہاں تک پہنچنے کے لیے نیشنل گارڈز کی رکاوٹوں سے گزرنا پڑا۔''

یہ سن کر مسٹر بیک خاموش ہو گئے لیکن جب انہوں نے دیکھا کہ لائیڈ اور میری بہن کے درمیان مسکراہٹوں کا تبادلہ ہو رہا ہے تو وہ اپنا لیکچر بھول گئے اور انہیں سب باتیں دوبارہ دوہرانا پڑیں۔ اس دن کیمپ کے شرکا بہت پرجوش تھے اور جو کچھ انہوں نے فسادات کے دوران دیکھا، اس پر بات کرنا چاہ رہے تھے۔ تانیا کا بھائی گرفتار ہو گیا تھا اور اس وجہ سے وہ ایک اہم شخصیت بن گئی تھی۔

مس اوسگڈ نے انہیں دو ٹیموں میں تقسیم کیا اور ہم نے ان کے درمیان ریلے ریس کروائی۔ ''ہمیں ان کے انرجی لیول کو بڑھانا ہے۔'' اس نے مجھ سے کہا۔ ''یہ تقریباً ایک ہفتے تک اپنے گھروں میں قید رہے ہیں۔''

میں نے سر ہلاتے ہوئے کہا۔ ''کیا تمہیں بھی آج صبح نیشنل گارڈز نے روکا تھا؟''

وہ مجھے گھورتے ہوئے بولی۔ ''میں ایسٹ اینڈ میں رہتی ہوں اور وہاں کوئی فرد فسادات میں ملوث نہیں ہے۔''

وہ ٹھیک کہہ رہی تھی۔ وہاں متوسط طبقے کے سیاہ فام رہتے تھے جو کئی سالوں سے شمال میں مقیم تھے۔

لنچ کے بعد ہم نے بچوں کو بس میں بٹھایا اور مقامی فائر اسٹیشن لے گئے۔ یہ دورہ پورے موسم گرما کے لیے ترتیب دیا گیا تھا۔ جس فائرمین نے ہمیں وہاں کا دورہ کروایا وہ ایک خوش مزاج شخص تھا اور میرے اندازے کے مطابق عنقریب ریٹائر ہونے والا تھا۔ اس نے بچوں کو آگ بجھانے کے آلات، کینوس کے پائپ اور سیڑھیاں وغیرہ دکھائیں جو آگ بجھانے میں استعمال ہوتی تھیں۔ بچوں نے ان چیزوں میں بڑی دلچسپی ظاہر کی اور ان کے بارے میں مختلف سوالات کیے۔

''اب میں تمہیں ایک اور چیز دکھاتا ہوں۔'' اس نے کہا اور ہمیں بیرونی دروازے کی طرف لے گیا۔ اس نے سرخ رنگ کے دروازوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ''کیا تمہیں دروازے میں سوراخ نظر آ رہے ہیں؟''

بچوں نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

''تمہارے خیال میں یہ کس چیز کے ہو سکتے ہیں؟''

کچھ بچوں نے اندازہ لگانے کی کوشش کی لیکن کوئی بھی صحیح جواب نہیں دے سکا۔ اس نے کہا۔ ''یہ گولیوں کے نشان ہیں۔ گزشتہ ہفتے جب عمارتیں جل رہی تھیں تو لوگوں نے ہم پر گولیاں چلائیں جس کی وجہ سے ہم آگ بجھانے نہیں جا سکے۔ قرب و جوار میں رہنے والے لوگوں نے خود ہی آگ بجھائی۔''

''کوئی ایسا کیوں کرے گا؟'' ایک چھوٹی بچی نے کہا۔

کسی کے پاس اس سوال کا جواب نہیں تھا۔ بعد میں آئزک نے ہمیں ایک اور کہانی سنائی۔

وہ اور لائیڈ سہ پہر کے وقت کام ختم کرنے کے بعد لائیڈ کی کار میں گھر جا رہے تھے۔ نیشنل گارڈ نے ابھی تک علاقے کا محاصرہ کر رکھا تھا۔ ''یہ سلسلہ کب تک چلے گا؟'' آئزک نے پوچھا۔

''آرام سے بیٹھے رہو اور کوئی ایسی بات نہ کرو جسے

سن کر میرا دماغ خراب ہوجائے۔ ہم کھانے کے وقت تک گھر پہنچ جائیں گے۔ آج میری مما نے گوشت کے پارچے بنائے ہیں۔''

''تم خوش قسمت ہو۔ مجھے تو اپنا کھانا خود بنانا پڑتا ہے۔ میں تو اس ہفتے کھانے کے لیے گرینڈ یونین بھی نہیں جاسکا۔''

''کیا؟ تم معمولی فسادات سے ڈر گئے۔'' لائیڈ مسکراتے ہوئے بولا۔ ''تمہاری مہم جوئی کی حس کہاں چلی گئی؟ میں ہر رات دوڑنے کے لیے باہر جاتا رہا ہوں تاکہ اپنے جسم کو فٹ رکھ سکوں۔''

وہ پہلی چیک پوسٹ پر پہنچے۔ گارڈز نے ان کی نمبر پلیٹ دیکھی۔ ان کے جسم کمان کی طرح تن گئے۔ ان میں سے ایک بولا۔ ''یہی ہے۔''

''کیا مصیبت ہے؟'' لائیڈ بڑبڑایا۔

اب تین سپاہیوں نے ان پر اپنی رائفلیں تان لی تھیں۔ ان میں سے ایک بولا۔ ''لڑکو...... تم دونوں اپنے ہاتھ کھڑکی سے باہر نکالو۔''

''لڑکو؟'' آئزک بڑبڑایا۔

''پُرسکون رہو۔'' لائیڈ نے کہا۔ ''انہیں اپنا کام کرنے دو۔ ہمیں کچھ نہیں ہوگا۔''

لیفٹیننٹ انچارج نے انہیں کار سے باہر آنے کے لیے کہا اور لائیڈ سے اس کا ڈرائیونگ لائسنس مانگا۔

کار سے باہر نکل کر لائیڈ نے پوچھا۔ ''یہ سب کیا ہورہا ہے آفیسر؟''

''ہمیں اطلاع ملی ہے کہ اس گاڑی میں چوری کا سامان ہے، اگر تم مائنڈ نہ کرو تو ہم کار کی تلاشی لینا چاہتے ہیں۔''

دو گارڈز نے پہلے سے ہی دروازے کھول دیے تھے۔ اس لیے یہ سوال کوئی اہمیت نہیں رکھتا تھا۔

''تم جانتے ہو کہ لوٹ مار ویسٹ اینڈ میں ہوئی تھی۔'' لائیڈ نے کہا۔ ''ہم چوری کا مال وہاں واپس لے کر کیوں جائیں گے؟''

گارڈ کا چہرہ پتھر کے مانند سخت ہوگیا۔ اس نے کہا۔ ''لوٹ مار کے بارے میں تمہیں کس نے بتایا۔ کیا تم بھی اس میں شامل تھے؟''

''نہیں۔''

''آخری بار تم مڈل سیکس کب گئے تھے؟''

آئزک نے ہمیں بتایا کہ تب اسے معلوم ہوا کہ وہ کس چیز کی تلاش میں تھے۔ نہ جانے انہوں نے کیسے سوچ لیا کہ لائیڈ مشین گنیں اسمگل کرے گا لیکن انہیں اسی کی تلاش تھی۔ لائیڈ کے پاس سے کچھ برآمد نہیں ہوا۔

''مڈل سیکس؟'' لائیڈ نے گارڈ سے کہا۔ ''میں یقین سے کہہ سکتا ہوں کہ کبھی وہاں نہیں گیا۔''

گارڈز نے کار کے اندرونی حصے کی تلاشی مکمل کرلی اور نفی میں سر ہلا دیا۔ تب لیفٹیننٹ بولا۔ ''ہم نے اندر سے دیکھ لیا ہے، کار کی ڈکی کھولو۔''

لائیڈ نے ایک ٹھنڈی سانس لی اور کندھے اچکاتے ہوئے بولا۔ ''یہ کام بھی مجھے ہی کرنا ہوگا۔'' یہ کہہ کر اس نے اپنے گچھے میں سے چابی نکالی اور ڈکی کھول دی۔

آئزک نے ہمیں بتایا۔ ''میں ڈکی میں نہیں دیکھ سکا لیکن میں نے اسے غصے کی حالت میں دیکھا۔

''یہ کیا ہے؟'' اس کی زبان سے بے اختیار نکلا۔

''گن!'' ایک گارڈ چلایا اور ڈکی میں جھانکنے لگا۔ لائیڈ پیچھے ہٹا اور لیفٹیننٹ سے ٹکرا گیا جو آگے کی طرف بڑھ رہا تھا۔ وہ لڑکھڑایا اور فٹ پاتھ سے جا ٹکرایا۔ لائیڈ نے پوری رفتار سے سڑک پر بھاگنا شروع کردیا۔ ایک گارڈ نے چلا کر اسے رکنے کے لیے کہا اور اس پر اپنی رائفل تان لی۔

''میں کار کی دوسری طرف تھا۔'' آئزک نے کہا۔ ''ابھی تک والٹ میرے ہاتھ میں دبا ہوا تھا۔ میں نے اسے پھینک دیا جو گارڈ کے سر پر جا کر لگا۔ میں نہیں جانتا کہ وہ اسے اپنے مقصد سے روکنے میں کامیاب ہوسکا یا نہیں۔

گولی سے لائیڈ مرا نہیں لیکن وہ اس کے گھٹنے کے پچھلے حصے میں لگی اور وہ زمین پر گر کر چلانے لگا۔ اب وہ کبھی بھی لنگڑائے بغیر نہیں چل سکے گا۔ اولمپکس میں جانے کا خواب ہمیشہ کے لیے ادھورا رہ گیا۔

ہمیں کئی دنوں تک لائیڈ کی کہانی معلوم نہیں ہوسکی لیکن کیٹ نے ایک اور نیگرو کونسلر نتالی جیمرسن سے لائیڈ کی گرفتاری اور اسپتال میں داخلے کے بارے میں اسی رات سن لیا تھا۔ وہ اسی وقت اسپتال جانا چاہ رہی تھی لیکن ڈیڈی نے اس کی مخالفت کرتے ہوئے کہا۔ ''وہ زیرحراست ہے۔ تم کیا سمجھتی ہو کہ وہ تمہیں اس سے ملنے دیں گے؟''

کیٹ اتنی زیادہ پریشان تھی کہ وہ والدین کا ادب لحاظ بھی بھول گئی۔ اس نے روتے ہوئے کہا۔ ''اس کے ساتھ کیا ہونے والا ہے؟''

ڈیڈی نے اپنی رائے کا اظہار کرنے میں کوئی ہچکچاہٹ محسوس نہیں کی اور بولے۔ ''اگر اس نے بتا دیا کہ بقیہ مشین گنیں کہاں ہیں تو شاید اس کے ساتھ کوئی رعایت

ہو جائے ورنہ وہ دس بیس سال کے لیے جیل چلا جائے گا۔''
''بیس سال!'' کیٹ نے اپنے بالوں کو مٹھی میں جکڑتے ہوئے کہا۔ ''لیکن اس نے کچھ نہیں کیا۔ وہ کیوں جائے گا۔''
''تم اس لڑکے میں اتنی دلچسپی کیوں لے رہی ہو؟'' مما نے اپنی آنکھیں سکیڑتے ہوئے پوچھا۔ ''دوسرے کے لیے تم پریشان نہیں دکھائی دیتیں۔ وہ بھی مشکل میں ہے۔''
کیٹ کے چہرے پر سختی آگئی اور وہ بولی۔ ''ایک بے گناہ شخص کی زندگی تباہ ہوگئی اور تمہیں یہ فکر کھائے جارہی ہے کہ میں دوسرے کے لیے پریشان کیوں نہیں ہوں۔'' یہ کہہ کر اس نے بیڈروم کا دروازہ زور سے بند کر دیا۔
ڈیڈی نے کچھ کہنا چاہا لیکن مما نے ہاتھ کے اشارے سے انہیں روک دیا اور بولیں۔ ''سونے کا وقت ہوگیا ہے، بکی تم بھی جاؤ۔''
میں بستر پر لیٹ گیا لیکن میرے کانوں میں کیٹ کے رونے کی آواز آتی رہی جب تک کہ مجھے نیند نہیں آگئی۔
دوسرے دن کیمپ میں طرح طرح کی افواہیں پھیلتی رہیں اور بچے مزے لے لے کر ایک دوسرے کو گزشتہ شب کا واقعہ سناتے رہے۔ لائیڈ کی غیر موجودگی میں مسٹر بیک نے جمناسٹک کی نگرانی کی جبکہ آئزک کی کلاس کو دو حصوں میں تقسیم کر کے مس اوسگڈ اور نتالی کے سپرد کر دیا گیا۔ بچے مسٹر بیک کی نگرانی میں باسکٹ بال کھیل رہے تھے کہ مس اوسگڈ آئی اور اس نے ان کے کان میں کچھ کہا اور وہ دونوں باہر چلے گئے۔ ان کے جانے کے بعد کلاس کی نگرانی میرے ذمے تھی۔ اچانک ہی بچے کھیلتے کھیلتے آپس میں الجھ پڑے۔ میں نے انہیں روکنے کی بہت کوشش کی لیکن کسی نے میری نہیں سنی۔ میں مسٹر بیک کو بلانے کے لیے دوڑا۔ وہ دفتر میں کسی سے فون پر باتیں کر رہے تھے۔ میں نے انہیں صورتِ حال بتائی تو انہوں نے مجھے گھورتے ہوئے فون بند کر دیا اور میرے ساتھ جمنازیم میں چلے آئے۔ انہیں دیکھتے ہی بچے سہم گئے اور معمول کے مطابق پریکٹس کرنے لگے۔
مسٹر بیک نے مجھ سے کہا۔ ''تم ان بچوں کو اپنے اوپر حاوی مت ہونے دو۔ تمہیں معلوم ہونا چاہیے کہ صورتِ حال پر کیسے قابو پایا جاتا ہے۔''
میں شرمندہ ہوتے ہوئے بولا۔ ''ٹھیک ہے، آئندہ خیال رکھوں گا۔''
''شام کو اسٹاف کی میٹنگ ہے۔ تمہیں بھی اس میں موجود رہنا ہے۔'' یہ کہہ کر وہ دوبارہ دفتر میں چلے گئے۔

میٹنگ میں دو پولیس آفیسرز بھی موجود تھے۔ مسٹر بیک نے ان کا تعارف کروایا۔ ان میں سے ایک سادہ کپڑوں میں ملبوس سراغ رساں کو پیلا تھا۔ اس نے ہمیں مخاطب کرتے ہوئے کہا۔
''تم سب نے سن لیا ہوگا کہ گزشتہ شب جو واقعہ پیش آیا۔ اس میں تمہارے دو ساتھی ملوث ہیں۔ ہم جاننے کی کوشش کر رہے ہیں کہ اس کی بنیاد کیا تھی اور مجھے یقین ہے کہ تم اس سلسلے میں ہم سے تعاون کرو گے۔'' یہ کہہ کر اس نے نیگروز کی طرف دیکھا جو سب ایک ساتھ بیٹھے ہوئے تھے۔ ان میں مس اوسگڈ بھی شامل تھی۔
''آفیسر پرکی اور میں تم لوگوں سے فرداً فرداً بات کریں گے۔ ہم جاننا چاہتے ہیں کہ کیا لائیڈ اور آئزک کا رویہ معمول سے ہٹ کر تھا۔ کیا ان کے پاس غیر معمولی مقدار میں پیسے تھے یا انہیں ہتھیاروں سے خاص دلچسپی تھی۔ اپنے ذہن پر زور دو اور اس بارے میں سوچنا شروع کر دو۔''
پانچویں جماعت کے طالب علم ڈیوس ملر نے اپنا سیاہ ہاتھ بلند کرتے ہوئے کہا۔ ''کیا یہ سچ ہے کہ چوری کی گئی مشین گنوں میں سے ایک لائیڈ کی کار کی ڈکی سے برآمد ہوئی؟''
کو پیلا بے چین نظر آنے لگا۔ بظاہر وہ کسی بات کا جواب دینے کے بجائے صرف سوالات کرنا چاہ رہا تھا لیکن اسے ہم لوگوں کے تعاون کی بھی ضرورت تھی۔ اس لیے بحالت مجبوری بولا۔ ''ان کی گاڑی سے ایک ہتھیار برآمد ہوا جسے انہیں کرفیو زدہ علاقے میں نہیں لانا چاہیے تھا لیکن وہ کار بائن نہیں بلکہ شکاری بندوق تھی۔''
کسی نے ایک اور سوال پوچھا لیکن میں اسے نہ سن سکا کیونکہ میرے کانوں میں سیٹیاں سی بج رہی تھیں۔ اس خبر سے صورتِ حال بالکل بدل گئی تھی۔ اگر کار کی ڈکی سے چوری شدہ کار بائن برآمد ہوتی تو ظاہر ہے کہ لائیڈ مجرم تھا لیکن اگر وہ محض ایک پرانی شکاری بندوق تھی جو کسی بھی جگہ رکھی جاسکتی ہے تو یہ معاملہ مختلف تھا۔
مجھے یاد آگیا کہ لائیڈ کو چابیاں دفتر میں چھوڑنے کی عادت تھی کوئی بھی شخص کار کی ڈکی کھولنے کے لیے انہیں استعمال کر سکتا تھا اور اسی نے پولیس کو اطلاع دی ہوگی۔ میں جانتا تھا کہ وہ شخص کون ہے لیکن میں اسے ثابت نہیں کر سکتا تھا۔ میں نے تین سراغ رسانوں کے ایک کردار جوپیٹر جونز کی طرح سوچنا شروع کیا۔ ان حالات میں وہ کیا کرتا۔
مجھے اس سوال کا جواب مل گیا لیکن ایسی صورت میں مجھے پولیس سے جھوٹ بولنا ہوتا۔ میں نے زندگی میں

ایسا برا کام نہیں کیا تھا۔ وہ جھوٹ بولنے کے الزام میں مجھے جیل بھی بھیج سکتے تھے یا کم از کم مجھے کیمپ سے توضرور نکال دیا جاتا۔

میری خواہش تھی کہ یہ الزام اپنے سر لے لوں لیکن بارہ سال کی عمر میں، میں اتنا ذہین نہیں تھا جب میں نے کمرے میں ایک طرف اپنی بہن کیٹ کو مسز ایمبر وز کے کندھے پر سر رکھ کر روتے ہوئے دیکھا تو مجھ سے نہ رہا گیا اور میں نے سراغ رساں کو مخاطب کیا تو وہ بولا۔ ''کیا کہنا چاہتے ہو؟''

''اگر میں نے کسی کو گزشتہ روز لائیڈ کی کار میں کوئی چیز رکھتے ہوئے دیکھا ہو تو کیا تم اس بارے میں جاننا چاہو گے؟''

سراغ رساں کسی شکاری کتے کی طرح چوکنا ہو گیا اور بولا۔ ''ضرور! کیا تم نے کسی کو ایسا کرتے ہوئے دیکھا تھا؟''

میں نے اثبات میں سر ہلا دیا لیکن میں اتنا خوفزدہ تھا، لگ رہا تھا کہ ابھی گر پڑوں گا۔''

''بتاؤ وہ کون تھا؟''

''وہ...'' میں نے اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ''مسٹر بیک!''

ڈائریکٹر کے جبڑے بھنچ گئے اور اس کی آنکھیں پھیل گئیں۔ وہ غراتے ہوئے بولا۔ ''جھوٹے لڑکے! تم اس وقت فائر ہاؤس میں تھے۔''

کوپیلا نے قدم بڑھایا اور ہمارے درمیان آتے ہوئے بولا۔ ''تم یہ کہنا چاہ رہے ہو کہ جب یہ فائر ہاؤس میں تھا تو تم نے اسی دوران رائفل کار کی ڈکی میں رکھ دی تھی؟''

مسٹر بیک اپنی جگہ پر ساکت رہ گئے۔ انہوں نے کچھ کہنے کے لیے منہ کھولا لیکن الفاظ ادا نہ ہو سکے۔ بالآخر انہیں ایک ایسی صورت حال کا سامنا کرنا پڑ گیا جس پر ان کا کوئی کنٹرول نہیں تھا۔

لائیڈ کو بہرحال جیل جانا پڑا۔ ایک گارڈ نے اس پر گولی چلائی تھی جس کا مطلب تھا کہ اس سے کوئی جرم سرزد ہوا ہے۔ اس پر پولیس آفیسر پر حملہ کرنے اور گرفتاری میں مزاحمت کرنے جیسے الزامات تھے۔

آئزک کو تنبیہ کرنے کے بعد چھوڑ دیا گیا۔ اس نے ہمیں بعد میں بتایا۔ ''میں نہیں جانتا کہ انہوں نے کس بارے میں وارننگ دی تھی کہ میں انہیں بے گناہ لوگوں کو مارنے سے باز رکھوں۔''

مسٹر بیک پر کوئی الزام عائد نہیں کیا گیا لیکن انہوں نے اس واقعے کے فوراً بعد وہ قصبہ ہی چھوڑ دیا۔ ان کی جگہ مس اوسگڈ نے بقیہ مدت کے لیے کیمپ ڈائریکٹر کی ذمے داری سنبھال لی۔ کیٹ نے کالج نہ جانے کا فیصلہ کر لیا اور والدین کے ساتھ رہنے کو ترجیح دی۔

''اب اس کی شادی ہو جائے گی اور وہ بچے پالے گی۔'' میں نے مما کو کہتے ہوئے سنا۔ ''اور اس طرح ساری پڑھائی بے کار چلی جائے گی۔''

ڈیڈی نے بات کو آگے بڑھاتے ہوئے کہا۔ ''ایسی صورت میں ہم اس قابل ہوں گے کہ کلی کو کسی پرائیویٹ کالج میں بھیج سکیں۔ اس کے پاس مطلوبہ ذہانت ہے۔''

کیٹ نے ایک قانونی فرم میں فائل کلرک کے طور پر ملازمت کر لی جو لائیڈ کا مقدمہ لڑ رہی تھی۔ میرے والدین خوش تھے اور توقع لگائے بیٹھے تھے کہ وہ اپنے لیے کوئی اچھا وکیل پسند کرے گی۔ وہ اپنا زیادہ وقت گھر پر ہی گزارتی البتہ اس نے اپنی کمائی سے ایک پرانی کنورٹیبل ضرور خرید لی۔ ایک سال گزر گیا پھر کسی نے سیاہ فام لیڈر مارٹن لوتھر کنگ کو قتل کر دیا جس پر ایک مرتبہ پھر فسادات پھوٹ پڑے پھر بوبی کینیڈی کو گولی ماردی گئی لیکن اس پر کوئی ہنگامہ نہیں ہوا۔

ایک دن کیٹ نے مجھ سے کہا۔ ''کیا تمہیں ایک راز کی بات بتاؤں؟''

''ضرور۔ میں اسے اپنے تک ہی رکھوں گا۔'' اس وقت ہم اوپر کے کمرے میں ٹی وی کے سامنے بیٹھے ہوئے تھے جبکہ مما اور ڈیڈی بھی گھر میں نہیں تھے۔ شاید انہیں کسی تقریب میں جانا تھا۔

''لائیڈ کل جیل سے رہا ہو رہا ہے۔''

اس نے لائیڈ کی گرفتاری کے بعد کبھی اس کا تذکرہ نہیں کیا تھا اور میں بھی تقریباً اسے بھول چکا تھا لہٰذا میرا چونکنا ایک فطری بات تھی۔

''کیا واقعی...... یہ تو بہت اچھی خبر ہے۔'' پھر میری سمجھ میں سب کچھ آگیا۔ ''تم نے اسی لیے اس قانونی فرم میں ملازمت کی تھی تاکہ لائیڈ سے باخبر رہو؟''

''یہ بھی ایک وجہ ہے لیکن مجھے پیسوں کی ضرورت تھی۔'' وہ مسکراتے ہوئے بولی۔ ''تم نے اس کے لیے جو کچھ کیا، اس پر میں ہمیشہ تمہاری شکر گزار رہوں گی۔''

میں شرماتے ہوئے بولا۔ ''میں نے کچھ نہیں کیا۔''

''ایسی بات نہیں ہے۔ اگر تم نہ بولتے تو مسٹر بیک اپنی سازش میں کامیاب ہو جاتے۔''

''تم لائیڈ سے دوبارہ ملنا شروع کر دو گی؟'' میں نے پوچھا۔

''ہوسکتا ہے لیکن اس کی رہائی کے بارے میں ہمارے والدین کو معلوم نہیں ہونا چاہیے۔''

''اس بات سے تمہارا کیا مطلب ہے؟''

''درحقیقت وہ خود برے نہیں ہیں لیکن ان کی سوچ محدود ہے۔ وہ نہیں جانتے کہ کیا بہتر ہے۔'' میں نہیں جانتا تھا کہ اس کے جواب میں کیا کہوں اس لیے خاموش رہا۔

وہ کھڑے ہوتے ہوئے بولی۔ ''چلو، سونے کا وقت ہوگیا ہے۔'' اس نے میرے بالوں پر ہاتھ پھیرا اور اپنے کمرے میں چلی گئی۔ اس کے بعد میں نے اسے بھی نہیں دیکھا۔

بعد میں مجھے معلوم ہوا کہ کام پر جانے کے بجائے اس نے اپنا سوٹ کیس اٹھایا اور اپنی کار میں جیل چلی گئی۔ وہاں سے اس نے لائیڈ کو اپنے ساتھ لیا اور اس کے گھر لے گئی۔ اس کی ماں کا انتقال ہو چکا تھا اور گھر پر تالا پڑا ہوا تھا۔ وہ اپنے کزنز سے ملا اور انہیں بتادیا کہ وہ تفریحی دورے پر جارہا ہے پھر اس نے اپنا بیگ تیار کیا اور وہاں سے روانہ ہوگیا۔

فسادات سے ایک ماہ قبل امریکی سپریم کورٹ نے حکومت کی جانب سے بین النسلی شادیوں پر پابندی کے قانون کو غیر آئینی قرار دے دیا تھا۔ لہٰذا کیٹ اور لائیڈ کہیں بھی جاسکتے تھے اور ان کی شادی میں بھی کوئی رکاوٹ نہیں تھی۔

کیٹ کے اس طرح چلے جانے سے مما کا دل ٹوٹ گیا۔ ڈیڈی کو اس بات پر غصہ نہیں تھا کہ وہ بغیر بتائے کیوں چلی گئی بلکہ وہ لائیڈ کے ساتھ جانے پر ناراض تھے۔ وہ بار بار پوچھ رہے تھے کہ میں اس بارے میں کیا جانتا ہوں۔ میں نہیں سمجھتا کہ جو کچھ میں نے بتایا اس پر انہوں نے یقین کرلیا ہوگا۔

میں نے پرائیویٹ کالج کے بجائے ایک لاء اسکول میں داخلہ لے لیا کیونکہ والدین کی جمع پونجی کا ایک بڑا حصہ سرمایہ کاری میں لگ گیا تھا۔ جہاں سے کئی برسوں تک کسی آمدنی کی امید نہیں تھی۔ قانون کی تعلیم حاصل کرنے کے بعد میں نے ڈسٹرکٹ اٹارنی کے دفتر میں ملازمت کرلی اور وہ تمام فائلیں دیکھنا شروع کردیں جن تک قانوناً رسائی ممکن تھی تاکہ کیٹ اور لائیڈ کا کوئی سراغ مل سکے لیکن کوئی کامیابی نہیں ہوئی۔

لیکن پانچ سال پہلے ورلڈ وائیڈ ویب کے ذریعے مجھے اس سوال کا جواب مل گیا۔ مونٹیری سے شائع ہونے والے ایک اخبار نے اپنے پرانے شمارے نیٹ پر ڈال دیے تھے، اسی سے مجھے معلوم ہوا کہ لائیڈ اور کیٹ انیس سو ستر کے موسم گرما میں ایک حادثے میں مارے گئے تھے۔ ان کی گاڑی کو ایک شرابی ڈرائیور نے ٹکر ماردی تھی۔ اخبار کے مطابق ان دونوں کی موت اسی وقت واقع ہوگئی تھی۔ جب میں نے یہ خبر پڑھی، تب تک ہمارے والدین اس دنیا سے رخصت ہو چکے تھے اور میری بیوی کے سوا کوئی اور ایسا نہیں تھا جسے میں یہ خبر سناتا۔

☆☆☆

''ڈیڈی!''

میں نے مڑکر اپنے بیٹے جری کی طرف دیکھا۔ میں ابھی تک لائبریری کی کرسی پر بیٹھا ہوا تھا اور میرے ہاتھ میں انسائیکلوپیڈیا کی دونوں جلدیں تھیں۔

''آپ ٹھیک تو ہیں ڈیڈی؟''

''ہاں، تمہاری ریسرچ کیسی جارہی ہے؟''

''میرا کام ابھی پورا نہیں ہوا کیونکہ لائبریری بند ہونے والی ہے لیکن یہاں اس موضوع پر بہت مواد موجود ہے۔''

''کیا تم نے بدلتے ہوئے امریکی خاندان کے حوالے سے اپنا موضوع منتخب کرلیا؟''

''ہاں، آپ کیا پڑھ رہے تھے؟''

''کچھ خاص نہیں۔ بس ایسے ہی چند پرانی باتیں یاد آگئی تھیں۔''

باہر نکلتے وقت میں نے سوچا کہ اسے اس بارے میں بتادوں لیکن نہیں۔ ابھی وہ بہت چھوٹا تھا حالانکہ اس کی عمر بھی اتنی ہی تھی جو 1967 میں میری تھی۔

میں نے کار کا دروازہ کھولتے ہوئے کہا۔ ''تمہارے پاس سیل فون ہے؟''

''ہاں۔''

''اپنی مما کو بتادو کہ ہمیں آنے میں دیر ہوجائے گی۔ ہم آئس کریم پارلر جارہے ہیں۔''

اس کا چہرہ خوشی سے چمک اٹھا۔ وہ شرماتے ہوئے بولا۔ ''لیکن کیوں؟ میں نے تو ایسی کوئی فرمائش نہیں کی۔''

''مگر میں تمہیں ایک کہانی سنانا چاہتا ہوں۔'' میں نے کہا۔ ''ایک بدلتے ہوئے امریکی خاندان کے بارے میں۔'' یہ کہہ کر میں نے سڑک پر نظریں جمادیں جو بالکل سنسان اور ہموار تھی۔

آسمان سے گرا

ملک صفدر حیات

خودکو عقل مند سمجھنے والے اکثر حماقت کی رفعتوں کو چھو کر منہ کے بل گرتے ہیں۔ کچھ ایسا ہی حال اس بے وقوف عورت کا تھا جو آسمان سے گر کر کھجور میں اٹک گئی تھی۔ ایسے میں سوائے پچھتاوئوں کے اور کیا رہ جاتا ہے لیکن پچھتانے کے لیے بھی تو زندہ رہنا ضروری ہوتا ہے جبکہ قدرت نے اسے رونے کا موقع بھی نہ دیا تھا... اور وہ جو موقع کی تاک لگا کر جال پھیلائے بیٹھا تھا، اسے سونے کی چڑیا سمجھ کر قید کر لایا مگر... یہ بھول گیا کہ عورت اور دولت صرف قسمت سے پاس رہ سکتی ہیں لیکن یہ بات کچھ لوگوں کو آسانی سے سمجھ نہیں آتی۔ لہٰذا کبھی کبھی ملک صفدر جیسے زیرک انسانوں کی ضرورت پڑتی رہتی ہے۔

عزتوں اور انسانوں کا بیوپار کرنے والے ایک سوداگر

کا ماجرا

یہ ان دنوں کا واقعہ ہے جب سیلِ آب نے بہت زیادہ تباہی پھیلائی تھی گویا اس نے اپنی گزشتہ تمام ظلمتوں کے ریکارڈ توڑ ڈالے تھے۔ اس ہلاکت خیز افراتفری نے عوام الناس کے علاوہ دھرتی کو بھی بے پناہ نقصان کے تحائف دیے تھے۔ بہرحال، طوفان اور مصیبت چاہے کتنے ہی بڑے اور شوریدہ سر کیوں نہ ہوں گزر ہی جاتے ہیں اور اپنی گزرگاہوں پر عبرت کے نشان چھوڑ جاتے ہیں۔

ان دنوں میری تعیناتی ایک ایسے قصبے میں تھی جو دریائے چناب کے کنارے پر واقع تھا۔ اگرچہ موسم برسات اور سیلِ آب کے زمانے کو گزرے دو ڈھائی ماہ کا عرصہ بیت چکا تھا تاہم ان کی دل کھول کر کی جانے والی کارروائیوں کے آثار ابھی تک معدوم نہیں ہوئے تھے اور دیکھنے والوں کو درسِ عبرت دیتے تھے۔ ایسے درس اور سبق صرف انہی لوگوں پر اثر کرتے ہیں جن میں اصلاح کا رجحان پایا جاتا ہو یا پھر قدرت جس کو ہدایت دینا چاہے ورنہ یہ معاملات بہت ہی نازک اور آسانی سے سمجھ میں نہ آنے والے ہوتے ہیں۔

ایک روز میں حسبِ معمول تیار ہو کر تھانے پہنچا تو ایک چونکا دینے والی اطلاع میری منتظر تھی۔ میں کمرے میں آکر بیٹھا ہی تھا کہ ایک کانسٹیبل نے آکر بتایا۔

''ملک صاحب! آج صبح ایک نوجوان عورت کی لاش ملی ہے۔''

یہ خاصی سنسنی خیز اطلاع تھی جس نے مجھے چونکنے پر مجبور کر دیا تھا۔ ''کون ہے وہ عورت؟'' میں نے کانسٹیبل سے پوچھا۔ ''اور اس کی لاش کہاں سے ملی ہے......؟''

''پتا نہیں جناب، وہ بدقسمت عورت کون ہے۔'' کانسٹیبل نے بتایا۔ ''وہ اس علاقے کی نہیں لگتی۔ اس کی لاش اس وقت دریا کے کنارے پر پڑی ہے۔''

''ٹھیک ہے، تم قدیر خان کو میرے پاس بھیجو۔'' میں نے تحکمانہ انداز میں کہا۔


Downloaded From
paksociety.com

''او کے سر......'' کانسٹیبل نے فرماں برداری سے کہا اور کمرے سے نکل گیا۔

قدیر خان ایک چست اور معاملہ فہم پولیس اہل کار تھا اور اپنی قابلیت کی بنا پر وہ سپاہی سے ترقی کرتے ہوئے اے ایس آئی کے عہدے تک پہنچا تھا۔ وہ میری گڈ بکس میں تھا۔ تھوڑی ہی دیر کے بعد وہ میرے سامنے کھڑا تھا۔

''جی ملک صاحب! حکم......؟'' وہ ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولا۔

''حکم نہیں، ڈیوٹی......'' میں نے گہری سنجیدگی سے کہا۔ ''کارِ سرکار کے سلسلے میں دریا کی طرف جانا ہے۔ سنا ہے، ادھر کسی جوان عورت کی لاش ملی ہے؟''

''جی ملک صاحب! آپ نے بالکل ٹھیک سنا ہے۔'' وہ اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔ ''میں آپ کی آمد کا انتظار کر رہا تھا۔ جائے وقوعہ پر جانے کی تیاری مکمل ہے۔ اب آگے جو آپ کا حکم......؟'' بات ختم کر کے وہ سوالیہ نظر سے مجھے دیکھنے لگا۔

''جب تیاری مکمل ہے تو پھر دیر کس بات کی۔'' میں نے فیصلہ کن انداز میں کہا اور اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ ''ہمیں فوری طور پر روانہ ہو جانا چاہیے۔''

میرے تھانے سے دریائے چناب کا کنارہ لگ بھگ ساڑھے تین فرلانگ کے فاصلے پر تھا۔ ماہِ نومبر کا آغاز ہو چکا تھا۔ فضا میں اچھی خاصی خنکی رچی بسی تھی۔ دھوپ اگرچہ موجود تھی تاہم اس میں تپش نام کی کوئی شے نہیں پائی جاتی تھی۔ کم و بیش دس بجے میں جائے وقوعہ پر پہنچ گیا۔

اس جوان عورت کی لاش ایک چارپائی پر چادر کے نیچے ڈھکی پڑی تھی۔ وہاں چارپائی کے آس پاس درجن بھر سے زیادہ افراد جمع تھے اور مختلف قسم کی چہ میگوئیاں کر رہے تھے۔ پولیس کی آمد پر وہ لاش والی چارپائی سے دور ہٹ گئے۔ میں نے آگے بڑھ کر عورت کی لاش کے منہ سے چادر ہٹانے کا قصد کیا ہی تھا کہ عقب میں ابھرنے والی ایک سنجیدہ آواز نے میرے ہاتھوں کو بریک لگا دیے۔

''تھانے دار جی! ذرا خیال سے۔ اس بدقسمت عورت کے بدن پر لباس وغیرہ کچھ بھی نہیں ہے......''

''اوہ......!'' میں نے ایک گہری سانس خارج کی اور مڑ کر تنبیہ کرنے والے شخص کی طرف دیکھا۔

اس کی عمر پچاس کے آس پاس رہی ہوگی۔ اس نے تہ بند کے اوپر پاپلین کا کرتہ پہن رکھا تھا۔ صورت شکل سے وہ کوئی کھیت مزدور نظر آتا تھا۔ میں نے جب سوالیہ نظر سے اسے گھورا تو وہ جہاں دیدہ شخص میری نگاہ کے مفہوم کو فوراً بھانپ گیا اور جلدی سے بولا۔

''تھانے دار صاحب! میرا نام اللہ بخش ہے۔ دریا سے مچھلیاں پکڑ کر انہیں بازار میں فروخت کرنا میرا روزگار ہے۔ اس عورت کی لاش سب سے پہلے میں نے ہی دیکھی تھی۔''

میں نے اللہ بخش مچھیرے کو گردن کی جنبش سے اپنے پاس بلا لیا اور بہ آہستگی اس بدنصیب عورت کے چہرے پر سے چادر ہٹا دی۔ اگلے ہی لمحے مجھے حیرت کا ایک جھٹکا لگا۔ اس حیرت میں افسوس کا عنصر بھی شامل تھا۔

اس بدقسمت کی عمر بیس اور پچیس کے درمیان رہی ہوگی۔ اگرچہ اس کی آنکھیں بند تھیں تاہم چہرے کے نقوش سے وہ ایک خوب صورت اور پُرکشش عورت نظر آتی تھی۔ اس کے بے جان چہرے پر اذیت کے آثار منجمد ہو کر رہ گئے تھے جس سے اندازہ ہوتا تھا کہ اس کی جان بڑے کرب ناک حالات میں نکلی ہوگی۔ اپنی زندگی کے آخری لمحات میں وہ کسمپرسی اور لاچاری کی انتہا کو چھو گئی ہوگی۔

اللہ بخش کے علاوہ اے ایس آئی قدیر خان بھی میرے نزدیک ہی کھڑا تھا۔ اس نے خیال آرائی کی۔

''ملک صاحب! مجھے تو یہ خودکشی کا معاملہ لگتا ہے۔ اس عورت نے دریا میں کود کر اپنی جان دے دی ہے۔''

''قدیر خان......!'' میں نے نفی میں گردن ہلاتے ہوئے کہا۔ ''میں تم سے اتفاق نہیں کر سکتا۔ اس عورت کے چہرے پر موجود کرب سے اندازہ ہوتا ہے کہ اسے اذیت دے کر موت کے گھاٹ اتارا گیا ہے۔ یہ خودکشی کا کیس نہیں ہو سکتا۔ اس عورت کو باقاعدہ ایک سوچے سمجھے منصوبے کے تحت قتل کیا گیا ہے۔''

''تھانے دار جی! آپ بالکل ٹھیک کہہ رہے ہیں۔'' اللہ بخش مچھیرا میری بات کی تائید کرتے ہوئے بولا۔ ''میرا پانی کے ساتھ سالہا سال کا ساتھ ہے۔ دریا میں ڈوب کر مرنے والوں میں زیادہ تعداد ان افراد کی ہوتی ہے جو شوقیہ وہاں نہانے جاتے ہیں اور انہیں تیراکی کا زیادہ تجربہ نہیں ہوتا۔ خودکشی کی وارداتیں بہت کم ہوتی ہیں اور ایک خاص بات......''

وہ بولتے بولتے اچانک رک گیا تو میں نے جلدی سے پوچھا۔ ''کیا خاص بات اللہ بخش؟''

''میں کہہ رہا تھا کہ......'' وہ ادھوری بات کو مکمل کرتے ہوئے بولا۔ ''خاص بات یہ کہ خودکشی کرنے والا چاہے وہ مرد ہو یا عورت، وہ کپڑے اتار کر الف ننگا دریا

میں چھلانگ نہیں لگاتا۔"
اللہ بخش مچھیرے نے بڑی نکتے کی بات اٹھائی تھی۔
تھوڑی دیر پہلے جب میں نے مردہ عورت کے چہرے سے چادر اٹھانے کے لیے اپنے ہاتھ آگے بڑھائے تھے تو اللہ بخش نے مجھے بتایا تھا کہ عورت کے بدن پر لباس نہیں ہے۔ عورت کی برہنہ لاش کو دریا سے نکالنے کا سہرا اللہ بخش ہی کے سر جاتا تھا۔ ایک فوری خیال کے تحت میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے سوال کیا۔
"اللہ بخش! تم نے کب اور کیسے اس عورت کی لاش کو دریا سے نکالا تھا؟"
"جناب! میں اپنے معمول کے مطابق، آج بھی صبح ہی صبح اپنے جال اور دیگر سازوسامان کے ساتھ مچھلیاں پکڑنے دریا پر پہنچا تھا۔" وہ بڑے اعتماد سے وضاحت کرتے ہوئے بولا۔ "پھر جیسے ہی میں نے جال کو دریا میں پھینکنے کا ارادہ کیا، میرے دماغ کو ایک جھٹکا سا لگا۔ حیرت اور الجھن نے مجھے جال پھینکنے کی مہلت نہیں دی اور میں دیدے پھاڑ پھاڑ کر دریا کے اس حصے کو دیکھنے لگا جہاں اس عورت کی برہنہ لاش پڑی تھی۔ موسم سرما کا آغاز ہو چکا ہے اس لیے دریا میں پانی کا وہ بہاؤ دیکھنے میں نہیں آتا جو موسم گرما میں نظر آتا ہے۔ دریا کی سست روی کے باعث اس عورت کی لاش کنارے آ لگی تھی۔ یہ دریا کا وہی حصہ تھا جہاں میں جال ڈال کر مچھلیاں پکڑتا ہوں۔" لمحاتی توقف کر کے اس نے گہری سانس لی پھر اضافہ کرتے ہوئے بولا۔
"آپ میرے ساتھ آئیں۔ میں آپ کو وہ مقام دکھاتا ہوں جہاں اس عورت کی لاش آکر رک گئی تھی......"
"میں ضرور اس جگہ کا معائنہ بھی کروں گا لیکن پہلے چند ضروری باتیں ہو جائیں۔" میں نے اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے کہا پھر مچھیرے سے پوچھا۔ "کیا تم نے اکیلے ہی اس عورت کی لاش کو دریا سے نکالا تھا یا کسی اور نے بھی اس سلسلے میں تمہاری مدد کی تھی؟"
"تھانے دار جی! میں ایک الف ننگی عورت کو دیکھ کر بہت زیادہ گھبرا گیا تھا۔" وہ ایک جھرجھری لیتے ہوئے بولا۔ "قریب ہی کھیتوں میں چند لوگ کام کر رہے تھے۔ میں نے آوازیں دے کر انہیں اپنے پاس بلا لیا۔ ایک بندہ بھاگا بھاگا اپنے گھر کی طرف گیا اور ایک چارپائی اور چادر اٹھا لایا۔ اس دوران میں ہم دو بندوں نے کسی طرح کھینچ اٹھا کر اس عورت کو دریا سے باہر نکال لیا اور جیسے ہی چارپائی آئی، ہم نے اس بدنصیب کو چارپائی پر ڈال کر چادر سے ڈھانپ دیا اور ایک بندے کو تھانے کی جانب دوڑا دیا تاکہ اس واقعے کی اطلاع آپ کو دی جا سکے۔ یہ ہے کل کہانی جناب۔"
"یہ کل کہانی نہیں بلکہ ابھی بہت کچھ باقی ہے۔" میں نے اللہ بخش کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔ "تم نے اس عورت کو دریا سے نکال کر چارپائی تک پہنچایا ہے۔ کیا تم نے اس کے بدن پر چوٹ یا زخم کے نشانات بھی دیکھے ہیں......؟"
"جناب! سچی بات تو یہ ہے کہ میں نے اپنی آنکھیں بند کر لی تھیں۔" وہ گہری سنجیدگی سے بولا۔ "بس میری نظر زمین میں گڑی جا رہی تھی۔ میرے ضمیر نے گوارا نہیں کیا کہ میں کسی عورت کو بے لباس دیکھوں۔ بس جیسے تیسے میں نے اس عورت کی لاش کو چارپائی تک پہنچا دیا تھا۔"
اللہ بخش مچھیرا ایک شریف النفس انسان تھا اور سچائی اس کے چہرے سے جھلکتی تھی۔ مجھے اس بات کا اندازہ لگانے میں کسی دقت کا سامنا نہیں کرنا پڑا کہ وہ مجھ سے کسی قسم کی غلط بیانی نہیں کر رہا تھا۔ میں نے اس عورت کے چہرے پر جس نوعیت کے تاثرات دیکھے تھے، ان کی روشنی میں لاش کا تفصیلی طبی معائنہ بہت ضروری تھا۔ مجھے یقین تھا کہ اس بدبخت کو ذہنی اور جسمانی اذیت دینے کے بعد موت کے گھاٹ اتارا گیا ہوگا۔ پوسٹ مارٹم رپورٹ میرے ان اندازوں کی زیادہ بہتر انداز میں تصدیق کر سکتی تھی۔
فوری طور پر سب سے اہم معاملہ اس عورت کی شناخت کا تھا۔ اس دوران میں جائے وقوعہ پر بیس پچیس افراد جمع ہو چکے تھے تاہم وہ لوگ متوفی عورت کی چارپائی سے کافی فاصلے پر کھڑے باہمی گفتگو میں مختلف قسم کی خیال آرائیاں کر رہے تھے۔ میں نے باری باری انہیں اپنے پاس بلا کر مردہ عورت کا چہرہ دکھایا تاکہ شناخت کے مراحل کی تکمیل ہو سکے لیکن آدھے گھنٹے کی اس "شناخت پریڈ" کے بعد کوئی مثبت نتیجہ برآمد نہیں ہوا تاہم یہ بات پایۂ ثبوت کو پہنچ گئی کہ اس عورت کا ہمارے قصبے سے دور دور کا بھی کوئی تعلق نہیں تھا۔ چناب کا بہاؤ مشرق سے مغرب کی سمت تھا۔ اس کا مطلب تھا، وہ نامعلوم متوفی عورت بالائی طرف سے پانی کے ساتھ بہتے ہوئے ہمارے علاقے میں پہنچی تھی۔
میری معلومات کے مطابق مشرقی جانب یعنی دریا کے بالائی حصے کی طرف سب سے نزدیکی گاؤں لگ بھگ آٹھ میل کے فاصلے پر واقع تھا۔ اس گاؤں کا نام کرم کوٹ تھا۔ وہاں کا کرتا دھرتا نمبردار رانا نواز میرے شناساؤں

میں شمار ہوتا تھا۔ اگر یہ فرض کرلیا جاتا کہ اس نامعلوم عورت کی لاش کو کرم کوٹ کے علاقے سے دریا برد کیا گیا تھا تو پھر مجھے تفتیش کے لیے ''کرم کوٹ'' کارخ کرنا تھا۔ اگر ادھر بھی اس عورت کے حوالے سے کوئی سراغ نہ ملتا تو پھر مشرق بعید یعنی مزید پیچھے کی طرف جانا تھا کیونکہ یہ بات تو طے تھی کہ عورت کی لاش مشرقی سمت سے بہتے ہوئے ہمارے علاقے میں پہنچی تھی اور کرم کوٹ سے ہمارے قصبے کے درمیان اور کوئی گاؤں دیہات نہیں پڑتا تھا۔

میں نے اللہ بخش سے پوچھا۔ ''تم نے لگ بھگ کتنے بجے عورت کی لاش کو دیکھا تھا؟''

''سات بجے ہوں گے جی۔'' اس نے ایک لمحہ سوچنے کے بعد جواب دیا۔ ''میں اسی وقت دریا پر پہنچا تھا جناب۔''

ان دنوں دریا پوری طرح پانی سے بھرا ہوا نہیں تھا جس کی وجہ سے پانی کی رفتار خاصی سست نظر آرہی تھی۔ میرے محتاط اندازے کے مطابق دریا کے پانی کی رفتار پانچ چھ میل فی گھنٹا رہی ہوگی۔ اگر مچھیرے اللہ بخش نے سات بجے اس نامعلوم عورت کی لاش کو دریافت کیا تھا تو اس کا مطلب یہی تھا کہ پانچ بجے کے بعد ہی اس بدقسمت کو کرم کوٹ سے دریا برد کیا گیا ہوگا۔ کرم کوٹ کے حوالے سے یہ میرا قیاس تھا۔ عین ممکن تھا، وہ عورت دور کہیں پیچھے سے پانی میں بہتے ہوئے ہمارے علاقے میں پہنچی ہو اور ...... یہ بھی کوئی ضروری نہیں تھا کہ وہ ہمارے علاقے میں پہنچتے ہی اللہ بخش کی نظر میں آگئی ہو۔ یہ بھی ہوسکتا تھا کہ وہ لاش اللہ بخش کی آمد سے بہت پہلے وہاں پہنچ گئی ہو۔

''اللہ بخش!'' میں نے مچھیرے کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ''تم مجھے وہ جگہ دکھاؤ جہاں سے اس عورت کی لاش کو نکالا گیا ہے؟''

''آئیں جی، میرے ساتھ......'' وہ اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے بولا اور دریا کے کنارے کی جانب قدم بڑھا دیے۔

میں نے اے ایس آئی قدیر خان کو چارپائی کے پاس رکنے کے لیے کہا اور خود اللہ بخش کی تقلید میں دریا کی سمت بڑھ گیا۔ وہ مجھے اپنے ساتھ اس مقام تک لے گیا جہاں کھڑے ہوکر وہ دریا میں جال پھینکا کرتا تھا۔

''میں نے یہاں کھڑے کھڑے اس عورت کی برہنہ لاش دیکھی تھی تھانے دار صاحب۔'' وہ دریا کے اندر اس جگہ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے بولا۔ ''وہاں پڑی تھی وہ!''

میں نے مچھیرے کے اشارے کی تقلید میں نگاہ دوڑائی تو چونک اٹھا۔ اللہ بخش ایک ٹیکری پر کھڑے ہوکر دریا میں جال پھینکا کرتا تھا۔ وہ جہاں جال ڈالتا تھا، وہاں دریا کے کٹاؤ کی وجہ سے ایک ننھی منی سی کھاڑی بن گئی تھی اور پانی بھی رکا ہوا تھا۔ اسی رکے ہوئے پانی کی وجہ سے وہاں مچھلیاں آکر جمع ہوجاتی ہوں گی۔ اگر اس عورت کی لاش اسی کٹاؤ والے مقام سے ملی تھی تو پھر یہ کہنا یا بتانا آسان نہیں تھا کہ وہ کب وہاں پہنچی ہوگی۔ عین ممکن تھا، وہ لاش سرِشام ہی وہاں آکر پھنس گئی ہو۔

میں نے ٹیکری پر کھڑے کھڑے اللہ بخش سے سوال کیا۔ ''تھوڑی دیر پہلے تم نے مجھے بتایا ہے، دو بندوں نے کھینچ اٹھا کر اس عورت کی لاش کو چارپائی تک پہنچایا تھا۔ دوسرا کون تھا تمہارے ساتھ......؟''

''اس بندے کا نام فیکا ہے جی...... فیکا کوچوان!'' مچھیرے نے جواب دیا۔

''کیا فیکا کوچوان بھی ان لوگوں کے اندر موجود ہے؟''

''تھوڑی دیر پہلے تو تھا جناب......'' وہ وہاں موجود لوگوں کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔ ''مگر اب نظر نہیں آرہا۔'' پھر اس نے باقاعدہ آواز بھی دے ڈالی۔ ''اوئے فیکے...... ادھر آ......!''

مگر فیکا کوچوان وہاں موجود نہیں تھا۔ مجھے بتایا گیا کہ وہ اپنے گھر جاچکا ہے۔ میں نے فیکا سے پوچھ پچھ والا معاملہ بعد پر چھوڑا اور موقع کی کارروائی مکمل کرنے کے بعد نامعلوم متوفی عورت کی لاش کو پوسٹ مارٹم کے لیے ضلعی اسپتال بھجوا دیا۔

☆☆☆

اگلے روز میں اے ایس آئی قدیر خان کو تھانے میں چھوڑ کر کانسٹیبل باسط علی کے ساتھ موضع ''کرم کوٹ'' کی جانب روانہ ہوگیا۔ کرم کوٹ ہمارے قصبے سے آٹھ میل کے فاصلے پر مشرقی سمت میں واقع ایک چھوٹا سا گاؤں تھا جو دریائے چناب کے کنارے سے محض ایک فرلانگ کی دوری پر تھا اور یہ ایک فرلانگ کھیتوں پر مشتمل علاقہ تھا۔

جیسا کہ میں نے بتایا، کرم کوٹ ایک چھوٹا سا گاؤں تھا۔ زیادہ سے زیادہ ساٹھ گھر ہوں گے وہاں۔ نمبردار رانا نواز ان دو ڈھائی سو نفوس کی آبادی کے لیے چودھری کی حیثیت رکھتا تھا۔ میری چونکہ رانا نواز سے پرانی شناسائی تھی اس لیے ہمیں فوراً ہی اس کی حویلی کی بیٹھک (ڈرائنگ روم) میں پہنچا دیا گیا اور اس سے پہلے کہ رانا خود بیٹھک میں داخل ہوتا، اس کے ملازموں نے ہماری خاطر تواضع کے لیے کھانے پینے کا اچھا خاصا سامان بھی لاکر ہمارے سامنے

رکھ دیا تھا۔

تھوڑی ہی دیر میں رانا نواز بیٹھک کے دروازے پر نمودار ہوا اور ''السلام علیکم'' کا نعرہ لگاتے ہوئے اندر آ گیا۔ ہم ''وعلیکم السلام'' کہتے ہوئے اٹھ کر کھڑے ہو گئے۔ اس نے باری باری ہم دونوں سے بڑا گرم جوش مصافحہ کیا پھر ہمارے سامنے بیٹھتے ہوئے حیرت بھرے لہجے میں بولا۔

''یہ آپ کیا ظلم کر رہے ہیں......؟''

پہلے تو اس کی بات میرے پلے نہ پڑی لیکن جب میں نے اس کی نگاہ کا تعاقب کیا تو صورتِ حال واضح ہو گئی۔ اس کا اشارہ ہمارے سامنے میز پر سجی اللہ کی مختلف نعمتوں کی طرف تھا۔

''کھانے پینے کی چیزوں کو انتظار نہیں کراتے ملک صاحب۔'' وہ اپنی بات کو آگے بڑھاتے ہوئے بولا۔ ''بسم اللہ کریں جناب...... باتیں تو ہوتی ہی رہتی ہیں اور ہوتی ہی رہیں گی۔''

''جی ہاں، رانا جی! یہ تو آپ بالکل ٹھیک کہہ رہے ہیں۔'' میں نے اپنے ہاتھوں کو میز کی جانب جنبش دیتے ہوئے کہا۔ ''جب تک انسان زندہ رہتا ہے، باتوں کا سلسلہ تو چلتا ہی رہتا ہے۔''

میری دیکھا دیکھی کانسٹیبل باسط علی نے بھی سارے تکلفات کو ایک طرف رکھ دیا تھا اور اس کارِ خیر میں رانا نواز بھی ''حصہ بہ قدر جثہ'' شامل ہو گیا تھا۔ رانا ڈیل ڈول والا ایک ہٹا کٹا شخص تھا اور اسے کھانے وکھلانے کا بہت شوق تھا۔ یہ بات میرے تجربے میں آئی ہے کہ جن لوگوں کو کھانے کا ذوق ہوتا ہے، وہ کھانا پکانے کے بھی بہت شوقین ہوتے ہیں۔ رانا بھی بہ دستِ خود بہت سی ڈشیں بنانے میں ید طولیٰ رکھتا تھا جن میں پایہ کا نمبر سب سے اوپر تھا۔

''لگتا ہے، آج کسی خاص معرکے پر نکلے ہوئے ہیں آپ۔'' رانا نے سوالیہ نظر سے مجھے دیکھتے ہوئے کہا۔ ''کسی خطرناک مجرم کو کھوجتے ہوئے آپ یہاں پہنچے ہوں گے ورنہ......'' اس نے لمحاتی توقف کر کے ٹٹولتے ہوئے انداز میں مجھے دیکھا پھر بات مکمل کرتے ہوئے بولا۔ ''ورنہ آپ کے پاس اتنی فرصت کہاں کہ صرف میل ملاقات کے لیے آپ باوردی میرے پاس چلے آئیں......''

''آپ کا اندازہ بالکل درست ہے رانا جی۔'' میں نے گہری سنجیدگی سے کہا۔ ''پیشہ ورانہ مصروفیت کہیں آنے جانے اور ملنے ملانے کا موقع ہی نہیں دیتی۔ اس وقت بھی میں کارِ سرکار پر ہی ہوں مگر یہ کسی خطرناک مجرم کی گرفتاری کا معاملہ نہیں ہے بلکہ تلاشِ گمشدہ کا قصہ ہے......''

''تلاشِ گمشدہ......'' اس نے الجھن زدہ نظر سے مجھے دیکھا اور بولا۔ ''یہ کس قسم کا قصہ ہے...... میری سمجھ میں تو کچھ بھی نہیں آیا؟''

''میں سمجھاتا ہوں۔'' میں نے ایک گہری سانس خارج کرتے ہوئے کہا۔ ''میرے اندازے کے مطابق کرم کوٹ کی آبادی دو ڈھائی سو افراد سے زیادہ نہیں ہوگی۔''

''جی، آپ کا اندازہ بالکل درست ہے ملک صاحب!'' وہ اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔ ''ڈھائی سو نہیں تو زیادہ سے زیادہ تین سو ہوگی۔''

''اللہ آپ کا بھلا کرے رانا جی۔'' میں نے اپنی بات کو آگے بڑھاتے ہوئے کہا۔ ''ان تین سو میں سے اگر ہم ایسے ایک سو افراد کو الگ کر دیں جن کی عمریں پندرہ سال یا اس سے کم ہیں تو باقی دو سو رہ جائیں گے...... ہیں نا؟''

''جی بالکل......!'' اس نے مختصر سا جواب دیا اور سوالیہ نظر سے مجھے دیکھنے لگا۔

میں نے کہا۔ ''رانا جی! ہم فرض کر لیتے ہیں کہ باقی بچ رہنے والے دو سو افراد میں سو عورتیں اور سو مرد ہیں۔ ان سو عورتوں میں سے مجھے ایک ایسی جوان عورت کی تلاش ہے جو خوب صورت اور دلکش بھی ہو مگر...... اس وقت گاؤں میں موجود نہ ہو...... تلاشِ گمشدہ کے الفاظ میں نے اسی عورت کے لیے استعمال کیے ہیں۔''

''مگر وہ ہے کون......'' وہ سرسراتی ہوئی آواز میں بولا۔

''یہ تو آپ پتا کر کے بتائیں گے رانا جی۔'' میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔ ''آپ کرم کوٹ کے کرتا دھرتا ہیں۔ گاؤں کی سو عورتوں کو چیک کرا کے یہ معلوم کرنا کہ ان میں سے کون گاؤں میں موجود نہیں، یہ آپ کے لیے مشکل تو نہیں ہوگا۔''

''بالکل مشکل نہیں ہے ملک صاحب۔'' وہ ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولا۔ ''میں ایک گھنٹے کے اندر اندر یہ معلومات حاصل کر لوں گا مگر آپ بھی بجھارتیں نہ ڈالیں۔ صاف صاف بتائیں کہ ''تلاشِ گم شدہ'' کے پیچھے کون سی کہانی ہے؟''

میں نے نہایت ہی مختصر مگر جامع الفاظ میں رانا نواز کو صورتِ حال سے آگاہ کر دیا۔ اس نے نہایت ہی توجہ سے میری بات سنی پھر ایک طویل سانس خارج کرتے ہوئے بولا۔

''تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ میرے پنڈ کی کسی عورت

نے دریا میں کود کر خودکشی کی ہے؟''

''خودکشی نہیں رانا جی...... قتل کہیں۔'' میں نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا۔ ''میرے پیشہ ورانہ تجربے کے مطابق اس عورت کو باقاعدہ موت کے گھاٹ اتارنے کے بعد دریا برد کیا گیا ہے اور ویسے بھی......'' میں نے لمحاتی توقف کر کے ایک مضمحل سی سانس خارج کی پھر اپنی بات مکمل کرتے ہوئے کہا۔

''ویسے بھی ظالم ماں باپ سے عاجز یا سسرال کی ستائی ہوئی جو عورتیں دریا میں چھلانگ لگا کر اپنی جان کی بازی ہار جاتی ہیں، ان کے جسم پر لباس بہرحال موجود ہوتا ہے۔ وہ خود کو سپردِ موت کرنے سے پہلے بے لباس ہو کر دریا میں نہیں کودا کرتیں۔ آپ میری بات کو سمجھنے کی کوشش کریں رانا جی......!''

وہ گہری سوچ میں ڈوب گیا پھر سر سراتے ہوئے لہجے میں بولا۔ ''آپ کی بات میں وزن ہے ملک صاحب! گویا آپ کا مطلب یہ ہے کہ جس جوان عورت کی لاش آپ کو اپنے علاقے سے ملی ہے، اس کا تعلق ہمارے پنڈ سے ہے اور اسے قتل کرنے کے بعد کرم کوٹ سے دریا میں پھینکا گیا ہے؟''

''اس امکان کو نظر انداز تو نہیں کیا جاسکتا رانا صاحب!'' میں نے بہ دستور اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے مضبوط لہجے میں کہا۔ ''ہمارے علاقے سے لاش ملنے کا مطلب یہ ہے کہ وہ کہیں پیچھے سے بہتے ہوئے وہاں تک پہنچی ہے۔ اس جانب سب سے پہلے آپ کا گاؤں کرم کوٹ ہی پڑتا ہے اسی لیے میں نے تفتیش کا آغاز یہاں سے کیا ہے۔ آپ اپنے گاؤں کو چیک تو کرائیں۔''

رانا نواز نمبردار نے معقولیت کا مظاہرہ کرتے ہوئے اپنے دو خاص بندوں کو بلا لیا پھر انہیں میرے سامنے ہی ہنگامی ہدایات دے کر روانہ کر دیا۔ ان بندوں نے رانا کو یقین دلایا تھا کہ آدھے گھنٹے کے اندر وہ رپورٹ پیش کر دیں گے۔ ہمارے درمیان دوبارہ اس نامعلوم متوفی عورت کے حوالے سے گفتگو شروع ہو گئی۔

''یہ بھی تو ہوسکتا ہے ملک صاحب......'' رانا نواز نے گہری سنجیدگی سے کہا۔ ''اس بدنصیب عورت کو پیچھے کہیں سے دریا میں پھینک دیا گیا ہو؟''

''بالکل ایسا ہوسکتا ہے۔'' میں نے تائیدی انداز میں گردن ہلاتے ہوئے کہا۔ ''لیکن تفتیش کا تقاضا یہی ہے کہ میں سب سے پہلے آپ کا گاؤں چیک کروں۔ اگر یہاں سے کلیئرنس مل جاتی ہے تو پھر میں مزید پیچھے جاؤں گا۔''

''ملک صاحب! پھر تو آپ کے لیے بڑی مشکل ہو جائے گی۔'' وہ تشویش بھری نظر سے مجھے دیکھنے لگا۔

''کیسی مشکل رانا جی؟'' میں نے الجھن زدہ انداز میں پوچھا۔

''ہمارے گاؤں سے آپ اوپر مشرق کی طرف جائیں گے تو پہلا گاؤں دس میل کے فاصلے پر پڑے گا۔'' وہ وضاحت کرتے ہوئے بولا۔ ''پھر اس کے بعد اگلا گاؤں پندرہ میل پر ہے۔ اس سے اگلا گاؤں آٹھ میل دور اور...... اس کے بعد پھر بارڈر تک کوئی گاؤں نہیں ہے۔ کیا آپ اس عورت کا اتا پتا ڈھونڈتے ہوئے بارڈر کراس کر کے انڈیا جانے کا ارادہ رکھتے ہیں؟''

''میں نہ تو کوئی ایسا ارادہ رکھتا ہوں اور نہ ہی ان شاء اللہ اس کی ضرورت پیش آئے گی۔'' میں نے بڑے اعتماد کے ساتھ کہا۔ ''اس نامعلوم متوفی عورت کا تعلق اسی دھرتی سے ہے اور جہاں تک ''مشکل'' ہو جانے کا سوال ہے تو میں نے فرض کی بجا آوری کے دوران میں کبھی آسان اور مشکل میں فرق نہیں کیا۔''

''اللہ آپ کو اس مشن میں کامیابی عطا فرمائے۔'' رانا نے خلوصِ دل سے کہا۔

میں نے اس کے خلوص کو خراجِ تحسین پیش کر دیا۔ ''آمین......!''

تھوڑی ہی دیر میں رانا نواز کے بندے واپس آگئے۔ رانا نے باری باری ان کے چہروں کا جائزہ لیا پھر تحکمانہ انداز میں پوچھا۔ ''کیا رپورٹ ہے؟''

''سب ٹھیک ٹھاک ہے رانا صاحب۔'' ان میں سے ایک نے بتایا۔

''ٹھیک ٹھاک سے تم لوگوں کی کیا مراد ہے؟'' رانا نے سوال کیا۔

''مطلب یہ جی کہ...... گاؤں کی ساری عورتیں اپنے اپنے گھروں میں موجود ہیں۔'' رانا کو بتایا گیا۔ ''ان میں سے کوئی ایک بھی کم نہیں۔''

جب نمبردار اپنے بندوں کو اس مشن پر بھیج رہا تھا تو انہیں معاملے کی سنگینی کے بارے میں مختصراً بتا کر یہ ہدایت بھی کر دی تھی کہ کسی کو کچھ پتا نہیں چلنا چاہیے۔ یعنی رانا کے وہ دونوں بندے اس بات سے واقف تھے کہ کل صبح ہمارے علاقے میں، دریا میں سے کسی خوب صورت اور دلکش عورت کی لاش ملی ہے۔ ایک فوری خیال کے تحت میں نے رانا سے کہا۔

''رانا جی! آج نومبر کی چھ تاریخ ہے۔ اس بدنصیب عورت کی لاش ہمیں پچھلے روز یعنی پانچ نومبر کی صبح ملی تھی اور اس کی حالت سے اندازہ ہوتا تھا کہ اسے چار نومبر کی تاریخ میں کسی وقت موت کے گھاٹ اتارا گیا ہے۔''

رانا سوالیہ نظر سے مجھے دیکھتے ہوئے بولا۔ ''اس سے آپ کا کیا مطلب ہے جناب؟''

''مطلب بہت سیدھا اور واضح ہے رانا جی۔'' میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''ایک محتاط اندازے کے مطابق اس نامعلوم عورت کی موت چار نومبر کو واقع ہوئی تھی۔ آپ لوگوں کی رپورٹ کے مطابق اس وقت گاؤں کی ساری عورتیں اپنے اپنے گھروں میں موجود ہیں۔ یہ بھی تو ہوسکتا ہے کہ دو تین یا پھر چار پانچ دن پہلے کوئی جوان عورت کسی دوسرے علاقے سے کرم کوٹ آئی ہو اور پھر واپس نہ گئی ہو۔ مہمانوں کے حوالے سے بھی گاؤں کو چیک کرنا بہت ضروری ہے۔''

''میں آپ کی بات سمجھ گیا تھانے دار صاحب!'' رانا کے بندوں میں سے ایک نے بڑے احترام سے کہا۔ ''ہم نے اس بات کو ذہن میں رکھتے ہوئے بھی پوچھ گچھ کی ہے۔''

''پھر اس پوچھ گچھ کا کیا نتیجہ برآمد ہوا......؟'' میں نے اس شخص کے چہرے پر نگاہ جماتے ہوئے پوچھا۔ ''کوئی خاص بات سامنے آئی......؟''

''جی ہاں!'' وہ اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔ ''ایک بات پتا تو چلی ہے لیکن میرا خیال ہے، اس میں ایسا کچھ خاص نہیں ہے......''

''اس میں کچھ خاص ہے یا نہیں، اس کا فیصلہ میں خود کرلوں گا۔'' میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''تم مجھے بتاؤ، وہ بات ہے کیا؟''

''ملک صاحب میرے بہت پرانے دوست ہیں۔ میں ان پر بہت بھروسا کرتا ہوں اور یہ بھی مجھ پر بھروسا کرکے ہی یہاں آئے ہیں۔'' نمبردار نواز نے اپنے بندے سے کہا۔ ''تم ہر بات صاف صاف ان کو بتادو۔''

''ٹھیک ہے جی، آپ کا حکم سرآنکھوں پر۔'' وہ رانا نواز کی طرف دیکھتے ہوئے بولا۔ ''میں تھانے دار صاحب کو سب کچھ بتادیتا ہوں۔''

میں سیدھا ہوکر بیٹھ گیا۔ رانا کے بندے نے جو تفصیل بتائی، اس کا لب لباب کچھ اس طرح تھا کہ کرم کوٹ کے ایک گھر میں ایک ہفتہ پہلے ایک جوان اور خوب صورت عورت آئی تھی۔ وہ چند دن اس گھر میں رہی پھر دو روز پہلے وہ کہیں چلی گئی تھی۔

''وہ خوب صورت عورت کہاں سے آئی تھی؟ کس کے گھر میں آئی تھی؟ اور پھر کہاں چلی گئی؟'' میں نے اس آدمی کے خاموش ہونے پر ایک ہی سانس میں متعدد سوال کرڈالے۔

اس کے جواب کے مطابق وہ خوب صورت عورت رحمت چاچی کے گھر میں آئی تھی اور اس رحمت چاچی کا گھر کرم کوٹ کے آخری کنارے پر، جوہڑ کے سامنے واقع تھا۔ اس آدمی نے بات مکمل کی تو میں نے رانا نواز کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

''رانا جی! میں ابھی اور اسی وقت رحمت چاچی سے ملنا چاہتا ہوں۔''

رانا نے اپنے آدمی کی طرف دیکھا اور پوچھا۔ ''تم سراجے کی ماں کی بات کررہے ہو نا؟''

مذکورہ آدمی نے اثبات میں گردن ہلادی۔ ''جی، رانا جی۔''

''ملک صاحب!'' رانا میری جانب متوجہ ہوتے ہوئے بولا۔ ''یہ چاچی رحمتے اپنے بیٹے سراج دین کے ساتھ گاؤں کے آخری سرے پر رہتی ہے۔ سراجے کی شادی ہوچکی ہے مگر ابھی تک کوئی بچی بچہ پیدا نہیں ہوا۔ لوگوں کا خیال ہے کہ سراجے کی بیوی جمیلہ ایک بانجھ عورت ہے۔'' وہ سانس ہموار کرنے کے لیے لمحے بھر کو رکا پھر اپنی بات مکمل کرتے ہوئے بولا۔

''ملک صاحب! آپ کیوں تکلیف کرتے ہیں۔ میں بندے کو بھیج کر چاچی رحمتے...... بلکہ اس کے گھر کے سارے لوگوں کو ادھر حویلی ہی میں بلالیتا ہوں۔ پھر آپ ان سے جی چاہے، جتنی بھی پوچھ پرتیت کرتے رہنا......''

''نہیں...... یہ مناسب نہیں ہوگا۔'' میں نے قطعی انداز اختیار کرتے ہوئے کہا۔ ''میں خود جاتا ہوں رحمتے کے گھر۔ آپ اپنے بندے کو میرے ساتھ بھیج دیں تاکہ وہ گھر کی نشان دہی کرسکے۔''

نمبردار نے میرا اٹل انداز دیکھا تو بحث نہیں کی اور اپنے بندے کو ہمارے ساتھ روانہ کردیا۔ ہم حویلی سے باہر آئے تو صدیق کوچوان نے مجھ سے پوچھا۔

''ملک صاحب! میرے لیے کیا حکم ہے؟''

شاید میں ایک بات کا ذکر کرنا بھول گیا کہ ہم ایک تانگے پر سوار ہوکر کرم کوٹ آئے تھے۔ صدیق اسی تانگے کا کوچوان تھا۔ یہ رفیق عرف فیکا کوچوان کا بڑا بھائی تھا۔ رفیق کوچوان سے ابھی تک میری ملاقات نہیں ہوسکی تھی۔ یہ

وہی شخص تھا جس نے مچھیرے اللہ بخش کے ساتھ مل کر اس نامعلوم عورت کی لاش کو دریا سے نکالا تھا۔

''تم ادھر ہی تانگے کے پاس رکو۔'' میں نے صدیق کوچوان کے سوال کے جواب میں کہا۔ ''ہم تھوڑی دیر میں واپس آتے ہیں۔''

''جو سرکار کی مرضی۔'' وہ فرماں برداری سے گردن ہلاتے ہوئے بولا۔

ہم رانا نواز کے آدمی کی راہنمائی میں کرم کوٹ کے اندر سے گزر کر آخری سرے کی جانب بڑھنے لگے۔ کرم کوٹ دو ڈھائی سو نفوس پر مشتمل ایک چھوٹا سا گاؤں تھا۔ جلد ہی ہم اس جوہڑ کے قریب پہنچ گئے جس کے سامنے چاچی رحمتے کا گھر واقع تھا۔ میں نے رانا کے بندے کو فارغ کر دیا اور کانسٹیبل باسط علی کے ہمراہ مطلوبہ گھر کی سمت بڑھنے لگا۔

وہ دراصل دو گھر تھے جو پہلو بہ پہلو بنے ہوئے تھے۔ ان میں سے ایک میں رحمت بی بی اپنے بیٹے اور بہو کے ساتھ رہتی تھی اور دوسرے گھر کے بارے میں مجھے کوئی معلومات نہیں تھی۔ یہ ٹھیک ہے کہ رانا نواز سے میری پرانی شناسائی تھی اور اس سے پہلے بھی میں دوبار کرم کوٹ آچکا تھا مگر وہ آنا کسی تفتیش کا حصہ نہیں تھا۔ بہر حال، رحمت بی بی کے دروازے پر پہنچ کر میں نے باسط علی سے کہا۔

''دروازے پر دستک دو۔''

میں خود ذرا ہٹ کر ایک طرف کھڑا ہو گیا تھا۔ کانسٹیبل نے فوراً میرے حکم کی تعمیل کر دی۔ تھوڑی ہی دیر کے بعد اندر سے ایک نسوانی آواز سنائی دی۔

''کون ہے......؟''

اس کے ساتھ ہی گھر کے صحن میں کسی کے چلنے کی آواز بھی ابھری۔ مجھے یہ اندازہ قائم کرنے میں دیر نہیں لگی کہ کوئی دروازے کی طرف آرہا تھا۔ اگلے ہی لمحے دروازہ ذرا سا کھلا اور ایک عورت نے جھانک کر باہر دیکھا۔

ہم پر نظر پڑتے ہی وہ بے ساختہ بولی۔ ''ہائے وے ربا...... پولیس......''

''جمیلہ! باہر کون ہے......؟'' گھر کے اندر ہی سے ایک دوسری نسوانی آواز نے دروازہ کھولنے والی سے پوچھا۔

ہم دونوں اس وقت پولیس کی وردی میں تھے اسی لیے دروازہ کھولنے والی نے ہمیں دیکھتے ہی ''ہائے وے ربا، پولیس......'' کا نعرہ لگایا تھا۔ پولیس کو اچانک اپنے سامنے دیکھ کر چونک جانا تو ایک عام سی بات ہے مگر گھبرا جانا کچھ نہ کچھ خاص معنی رکھتا تھا۔ وہ عورت نہ صرف خوف زدہ ہوگئی تھی بلکہ اس نے جلدی سے دروازہ بند کرنے کی کوشش بھی کی تھی تاہم میں نے دروازے کے بیچ پاؤں پھنسا کر اس کی یہ کوشش ناکام بنادی تھی۔

وہ عورت دروازے ہی میں رک کر سوالیہ نظر سے مجھے تکنے لگی۔ اندر والی عورت نے اسے جمیلہ کہہ کر مخاطب کیا تھا۔ میری معلومات کے مطابق اس گھر میں صرف دو عورتیں رہتی تھیں۔ ایک رحمت بی بی اور دوسری اس کی بہو جمیلہ اور یہی جمیلہ اس وقت میرے سامنے کھڑی تھی۔

اس کی عمر تیس اور پینتیس کے درمیان رہی ہوگی۔ اس نے شوخ رنگوں والا بھڑکیلا لباس پہن رکھا تھا جو چست ہونے کی وجہ سے اس کے بدن میں پھنسا ہوا تھا۔ وہ ایک فربہ اندام عورت تھی۔ اس جثے کی عورتیں چست لباس پہننے سے عموماً احتراز برتتی ہیں مگر یہ جمیلہ تو الٹی گنگا بہا رہی تھی۔ میں نے کھنکھار کر گلا صاف کیا اور کہا۔

''جمیلہ! میں تمہاری ساس رحمت بی بی عرف چاچی رحمتے سے ملنے آیا ہوں۔ میرا نام ملک صفدر حیات ہے اور میں اس علاقے کا تھانے دار ہوں۔''

اندر سے ایک مرتبہ پھر رحمتے کی آواز ابھری۔ ''او جمیلہ...... دروازے پر کھڑی کس کے ساتھ کھپری کر رہی ہو۔ بتاؤ تو سہی، باہر کون ہے......؟''

''چاچی! تھانے دار صاحب آئے ہیں، تم سے ملنے۔'' جمیلہ نے بہ آواز بلند کہا پھر میری طرف دیکھتے ہوئے بولی۔ ''میں چاچی کو بھیجتی ہوں جی...... آپ کو چاچی ہی سے کام ہے نا......؟''

''مجھے تم تینوں ہی سے کام ہے......'' میں نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا۔

''تینوں سے......'' وہ دیدے گھماتے ہوئے بولی۔ ''کون تینوں؟''

اپنی بات چیت سے جمیلہ خاصی تیز طرار لگتی تھی۔ میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے بتایا۔ ''جمیلہ، رحمت بی بی اور سراج دین عرف سراجا سے۔ اب آئی سمجھ میں بات؟''

''مم...... مگر سراجا تو اس وقت گھر میں نہیں ہے۔'' وہ جلدی سے بولی۔ ''آپ...... ہم تینوں سے کس سلسلے میں ملنا چاہتے ہیں...... ہم نے کیا جرم کیا ہے جی......؟''

میں نے ابھی جرم و سزا والی کوئی بات نہیں کی تھی اور وہ چالاک عورت جرم کا ذکر نکال لائی تھی۔ میں نے بہ دستور اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے سپاٹ آواز میں کہا۔

حسین و پُر کیف مضامین کا مرقع فروری 2016ء کا پُر لطف پاکیزہ

ماہنامہ **پاکیزہ** کراچی

☆ **ڈاکٹر ذکیہ بلگرامی** اور **اختر شجاعت** کے ایمان افروز اسلامی مضامین

☆ **انجم انصار** کے مشّاق قلم سے شاہکار ناول...... **گم شدہ محبت** کی پہلی قسط

☆ **نگہت سیما** کا خوب صورت ناول **اعتبارِ وفا** اختتامی مراحل کی طرف گامزن

☆ **دُرِ ثمن بلال، نایاب جیلانی** اور **تابندہ نعیم** کی مسلسل کاوشوں کی نئی داستانیں

☆ **مکافات**...... **ناہید سلطانہ اختر** کی ایک اور دل پزیر کہانی

☆ **انکشاف**...... **شیریں حیدر** کی چونکا دینے والی تحریر

☆ **جگمگاتا ستارہ**...... **رفاقت جاوید** کے قلم سے ایک جاں گداز کاوش

شیف گلزار حسین اور
روبینہ گلزار کی مزیدار باتیں......
پاکیزہ کے مہمان میں

اس کے علاوہ

ان رائٹرز نے بخشی پاکیزہ کے صفحات کو مزید رونق جن میں **اُمِ ایمان قاضی، فرح طاہر قریشی، صائمہ قریشی، ثریا انجم، قانتہ رابعہ، سیما راجپوت** ودیگر شامل ہیں۔

اس کے ساتھ، ساتھ دلکش تفریحی معلومات اور دیگر تعمیری، تفریحی اور اصلاحی سلسلے آپ کے ذوق کی نذر

''جمیلہ! کس نے کیا جرم کیا ہے اور اس جرم کی کیا سزا ہونا چاہیے، اس بات کا فیصلہ تو بعد میں ہوگا۔ فی الحال میں تم لوگوں سے بہت ضروری باتیں کرنا چاہتا ہوں اور یہ ضروری باتیں یوں گلی میں کھڑے کھڑے نہیں ہو سکتیں۔ کیا تمہارے گھر میں بیٹھنے کی کوئی جگہ نہیں ہے؟''

اس نے ایک لمحہ سوچا پھر دروازے سے ہٹتے ہوئے بولی۔ ''آپ اندر آجائیں۔''

جمیلہ چالاک اور تیز وطرار ہونے کے علاوہ معاملہ فہم عورت بھی تھی۔ اس نے میرے انداز اور تیوروں سے اندازہ لگا لیا تھا کہ اگر اس نے مجھے گھر میں داخل ہونے کی اجازت نہیں دی تو یہ کام میں زبردستی بھی کرلوں گا جبھی اس نے پسپائی کی راہ اختیار کرلی تھی۔

جب میں جمیلہ کے گھر کے اندر داخل ہو رہا تھا تو مجھے ایک عجیب سا احساس ہوا۔ مجھے یوں لگا جیسے کوئی چھپ کر مجھے دیکھ رہا ہو۔ رحمت بی بی کے گھر کے سامنے تو باقاعدہ کوئی گلی بھی نہیں تھی۔ وہاں ایک کھلا میدان تھا جس کے وسط میں ایک بڑا جوہڑ نظر آرہا تھا گویا وہاں کسی کے چھپ کر مجھے دیکھنے کا کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ میں نے اپنے احساس کو وہم کے کھاتے میں ڈالا اور گھر میں داخل ہوگیا۔

تھوڑی ہی دیر کے بعد ہم سب بیٹھک میں بیٹھے ہوئے تھے۔ ہم سب سے مراد ہے، میں، باسط علی، جمیلہ اور اس کی ساس رحمت بی بی......!

رحمت بی بی کی عمر ساٹھ کو چھوتی ہوئی نظر آتی تھی۔ اس کی حرکات وسکنات اور ''دیکھنے'' کے انداز سے مجھے پتا چل گیا کہ اس کی بینائی خاصی کمزور تھی۔ وہ مجھ سے مخاطب ہوتے ہوئے بولی۔ ''تھانے دار پتر...... کی ہویا اے...... آپ ہم سے کیا پوچھنا چاہتے ہو؟''

''چاچی! آپ کی باری بھی آئے گی۔'' میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''پہلے میں ذرا تمہاری بہو سے نمٹ لوں......'' پھر میں نے جمیلہ کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔

''ہاں بھئی...... سب سے پہلے تو یہ بتاؤ کہ دروازے پر دو پولیس والوں کو کھڑے دیکھ کر تم نے دروازہ بند کرنے کی کوشش کیوں کی تھی؟ اس قسم کی حرکت تو وہی بندہ کرسکتا ہے جس نے کوئی خطرناک جرم کر رکھا ہو یا جرم کرنے جارہا ہو......؟''

''وہ جی...... وہ جی...... میں آپ لوگوں کو دیکھ کر گھبرا گئی تھی۔'' وہ گڑبڑائے ہوئے انداز میں بولی۔ ''آج سے پہلے کبھی پولیس ہمارے دروازے پر نہیں آئی

نا...... اس لیے!''

پتا نہیں، مجھے کیوں ایسا محسوس ہوا کہ وہ نارمل انداز میں بات کرنے کے دوران میں مجھ سے کچھ چھپانے کی کوشش کررہی تھی۔ میں نے اس پر گہری نظر رکھتے ہوئے سوال کیا۔

''تمہارا گھر والا کہاں گیا ہے......؟''

''وہ آج صبح حافظ آباد گیا ہے جی۔'' جمیلہ نے بتایا۔

''خیریت!'' میں نے پوچھا۔ ''حافظ آباد وہ کیا لینے گیا ہے؟''

''سراجے کا ڈنگروں کا کاروبار ہے پتر۔'' چاچی رحمتے نے بتایا۔ ''وہ مال مویشی کی خرید وفروخت کے لیے پنڈ پنڈ، نگر نگر گھومتا رہتا ہے۔ ایک دو دن میں وہ حافظ آباد سے واپس آجائے گا۔ پر پتر......'' وہ سانس ہموار کرنے کے لیے رکی پھر بات مکمل کرتے ہوئے بولی۔

''ابھی تک تم نے یہ نہیں بتایا کہ ہمارے گھر میں کیا لینے آئے ہو۔ ہم سے ایسی کیا خطا ہوئی کہ آپ کو یہاں آنا پڑا؟''

''چاچی! بات دراصل یہ ہے کہ میں ایک جوان اور حسین عورت کی تلاش میں کرم کوٹ آیا ہوں۔'' میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں بتانا شروع کیا۔ ''مجھے پتا چلا ہے کہ وہ عورت پچھلے ایک ہفتے سے تمہارے گھر میں تھی اور دو دن پہلے یہاں سے گئی ہے۔''

میں نے گھما پھرا کر بات کی تھی تاکہ ان کی زبان سے سن کر اندازہ کرسکوں کہ ماجرا کیا ہے۔ رحمت بی بی، میری بات کے مکمل ہونے پر جلدی سے بولی۔

''تھانے دار پتر! آپ کہیں عابدہ کی بات تو نہیں کررہے......؟''

''عابدہ کون؟'' میں نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔

''عابدہ میری اکلوتی بیٹی ہے جی۔'' وہ وضاحت کرتے ہوئے بولی۔ ''وہی آٹھ دس دن یہاں رہ کر، دو دن پہلے گئی ہے۔''

''کہاں گئی ہے......؟'' میں نے اضطراری لہجے میں پوچھا۔

''اپنے میاں کے ساتھ سسرال گئی ہے۔'' اس نے جواب دیا۔

جمیلہ اپنی ساس کی بات کو آگے بڑھاتے ہوئے بولی۔ ''عابدہ کی ادھر وزیر آباد میں شادی ہوئی ہے۔ اپنے خاوند سے لڑ جھگڑ کر میکے آگئی تھی۔ وہ لگ بھگ دس دن یہاں رہی ہے۔ دو دن پہلے اس کا خاوند زبیر آیا تھا، منا کر لے گیا ہے مگر آپ......'' وہ لمحاتی توقف کرکے شک بھری

نظر سے مجھے تکنے لگی پھر پوچھا۔

''مگر آپ عابدہ کی تلاش میں یہاں کیوں آئے ہیں...... سب خیریت تو ہے نا؟''

''پتر تھانے دار! سچ سچ بتا، یہ معاملہ کیا ہے؟'' رحمت بی بی گھبرائے ہوئے لہجے میں بولی۔ ''میری بیٹی کے ساتھ کوئی اونچ نیچ تو نہیں ہو گئی......؟''

''اونچ نیچ کے بارے میں تو میں بعد میں بتاؤں گا۔'' میں نے سوچ میں ڈوبے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''پہلے اس بات کا فیصلہ ہو جائے کہ میں جس خوب صورت اور دلکش عورت کی تلاش میں آیا ہوں، وہ تمہاری بیٹی عابدہ ہی تھی یا کوئی اور......؟''

''کوئی اور...... کیا مطلب جی؟'' جمیلہ نے چونک کر پوچھا۔

''مطلب یہ کہ جن لوگوں نے مجھے یہ بتایا ہے کہ کوئی خوب صورت عورت ہفتہ دس دن تمہارے گھر میں رہ کر گئی ہے، وہ بھی کرم کوٹ ہی سے تعلق رکھتے ہیں۔'' میں نے صاف گوئی کا مظاہرہ کرتے ہوئے کہا۔ ''ظاہر ہے، وہ تمہاری بیٹی عابدہ کو بھی اچھی طرح جانتے ہوں گے مگر انہوں نے ایک بار بھی عابدہ کا ذکر نہیں کیا۔ اس سے یہ ظاہر ہوتا ہے، میں جس عورت کی تلاش میں ہوں وہ تمہاری بیٹی نہیں ہو سکتی۔''

''پھر...... پھر وہ کون ہو سکتی ہے؟'' رحمت بی بی الجھن زدہ انداز میں بولی۔ ''یہاں تو عابدہ کے سوا اور کوئی آیا ہی نہیں۔ میرا مطلب ہے...... کوئی اور عورت اس گھر میں نہیں آئی۔''

''پھر ان لوگوں نے مجھ سے جھوٹ کیوں بولا؟'' میں نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا۔ ''اگر عابدہ کے سوا کوئی اور عورت یہاں نہیں آئی تو پھر وہ کون تھی جس کی تلاش میں، میں یہاں آیا ہوں؟''

''یہ تو آپ جا کر انہی لوگوں سے پوچھیں جنہوں نے جھوٹ بولا ہے۔'' جمیلہ بیزاری سے بولی۔ ''ہمیں کیوں پریشان کر رہے ہیں؟''

''ان لوگوں سے تو میں ضرور پوچھوں گا۔'' میں نے جمیلہ کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے ٹھوس لہجے میں کہا۔ ''اور یہ بات ذہن نشین کر لو کہ میں تم لوگوں کو بالکل پریشان نہیں کر رہا۔ پریشانی کی بات تو اس وقت ہوتی اگر میں تم تینوں کو تھانے بلا کر تفتیش کرتا۔''

وہ دونوں ساس بہو سراسیمہ نظروں سے ایک دوسرے کو دیکھنے لگیں۔ میں نے جمیلہ کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔

''تمہارے گھر میں عابدہ کی کوئی تصویر وغیرہ بھی رکھی ہوئی ہے؟''

''جی...... ایک آدھ تصویر مل جائے گی۔'' اس نے جواب دیا۔

''ٹھیک ہے، وہ تصویر لا کر مجھے دکھاؤ۔'' میں نے کہا۔

جمیلہ اٹھی اور بیٹھک سے نکل کر گھر کے اندرونی حصے میں چلی گئی۔ میں اس نکتے پر غور کرنے لگا کہ رانا نواز کے بندوں نے جو اطلاع دی تھی اگر وہ رحمت بی بی کے بارے میں تھی تو پھر عابدہ کا نام لینے میں کوئی حرج نہیں تھا۔ ان کے انداز سے تو یہی جھلکتا تھا کہ وہ کسی ایسی عورت کا ذکر کر رہے ہیں جس کا کرم کوٹ سے کبھی کوئی تعلق نہ رہا ہو۔ خیر اس نکتے کو حل کرنے کے لیے مجھے ایک بار پھر رانا نواز کی حویلی جانا تھا۔

تھوڑی ہی دیر کے بعد جمیلہ ایک تصویر لے کر بیٹھک میں آ گئی۔ میں نے اس کے ہاتھ سے وہ تصویر لے کر بغور اس کا جائزہ لیا۔ اس تصویر میں عابدہ اپنے شوہر زبیر کے ساتھ نظر آ رہی تھی۔ یہ بات مجھے جمیلہ نے بتائی تھی کہ تصویر میں نظر آنے والا مرد عابدہ کا شوہر زبیر ہے۔

میں لگ بھگ دو منٹ تک اس تصویر کا معائنہ کرتا رہا اور اس نتیجے پر پہنچا کہ جس نامعلوم عورت کی لاش اللہ بخش مچھیرے نے دریا سے نکالی تھی، وہ ہرگز ہرگز عابدہ نہیں تھی۔ وہ کوئی دوسری ہی بدنصیب عورت تھی۔

جمیلہ نے مجھے سوچ بچار میں ڈوبا ہوا دیکھا تو ایک بار پھر وہی سوال کر ڈالا جو دو تین مرتبہ پہلے بھی کر چکی تھی۔

''تھانے دار جی! اب تو بتا دیں کہ اس عورت کا کیا قصہ ہے جس کی تلاش میں آپ کرم کوٹ آئے ہیں؟''

میں نے مختصر الفاظ میں ان ساس بہو کو دریا سے ملنے والی اس نامعلوم خوب صورت عورت کی لاش کے بارے میں بتا دیا اور ساتھ ہی اس بات کا اضافہ بھی کر دیا کہ وہ عورت عابدہ نہیں ہے۔ یہ سن کر رحمت بی بی کی جان میں جان آئی کہ اس کی بیٹی زندہ سلامت ہے۔

''آپ لوگ مجھے عابدہ کی سسرال کا ایڈریس نوٹ کرا دو۔'' میں نے باری باری ان دونوں کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ''میں وزیر آباد جا کر خود چیک کروں گا۔''

''اب کسی چیکنگ کی کیا ضرورت ہے تھانے دار صاحب۔'' جمیلہ برہمی سے بولی۔ ''آپ نے تو خود تصدیق کی ہے کہ آپ کو جس عورت کی تلاش ہے وہ عابدہ نہیں ہے......''

''مگر ابھی اس امر کی تصدیق نہیں ہو سکی کہ میری مطلوبہ عورت ہفتہ دس دن اس گھر میں رکی تھی یا نہیں؟'' میں

نے تیز نظر سے اسے گھورتے ہوئے کہا۔

''تو کیا آپ کو ہماری بات کا یقین نہیں ہے؟'' وہ خفگی آمیز انداز میں بولی۔

''اگر ہم یوں ہی خاموشی اور شرافت سے ہر کسی کی بات کا یقین کرنے لگیں تو پھر ہوگئی تھانے داری۔'' میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''آپ لوگوں نے جو کہا وہ میں نے سن لیا۔ یہاں آنے سے پہلے مجھے دوسرے لوگوں نے جو کچھ بتایا تھا، وہ بھی میرے ذہن میں محفوظ ہے۔ تحقیق اور تفتیش کے بعد ہی پتا چلے گا کہ تم میں سے کون سچا ہے اور کون جھوٹا......!''

میں نے معنی خیز انداز میں بات ادھوری چھوڑی تو وہ دونوں الجھن زدہ نظروں سے مجھے تکنے لگیں۔ میں نے کہا۔

''ایک بات اور...... اور وہ یہ کہ جب سراج دین اپنے کاروباری دورے سے واپس آجائے تو اسے میرے پاس تھانے بھیج دینا۔ میں اس سے بھی پوچھ گچھ کروں گا۔''

انہوں نے میری ہدایت پر عمل کرنے کا یقین دلایا اور میں عابدہ کی سسرال واقع وزیرآباد کا تفصیلی ایڈریس نوٹ کرکے چاچی رحمتے کے گھر سے نکل آیا۔ جب میں کانسٹیبل باسط علی کے ساتھ رحمتے چاچی کے گھر سے نکل رہا تھا تو ایک بار پھر وہی احساس ہوا جیسے کہ کوئی چھپ کر مجھے دیکھ رہا ہو۔ ایسا احساس اس وقت بھی ہوا تھا جب میں اس گھر میں داخل ہو رہا تھا۔

اس بار میں نے اپنے احساس کو وہم نہیں جانا اور چاروں جانب نگاہ دوڑا کر یہ جانچنے کی کوشش کی کہ ایسا کون ہے جو چپکے چپکے مجھ پر نظر رکھے ہوئے ہے مگر باوجود کوشش کے میں اس پراسرار نامعلوم شخصیت کو تلاش کرنے میں کامیاب نہیں ہوسکا۔ میرے اس احساس کا معاملہ اتنا اہم نہیں تھا جتنا کہ اس نامعلوم خوب صورت عورت کا سراغ لگانا جس کی لاش گزشتہ روز دریا کے اندر سے مچھیرے اللہ بخش نے نکالی تھی لہٰذا میں اپنے ذہن کو جھٹک کر رانا نواز کی حویلی کی جانب چل پڑا۔

راستے میں باسط علی نے مجھ سے کہا۔ ''ملک صاحب! مجھے ایسا لگا ہے کہ یہ دونوں عورتیں آپ سے کچھ چھپانے کی کوشش کر رہی ہیں...... مطلب یہ کہ وہ کچھ چھپانے کی کوشش کر رہی تھیں۔ اب تو ہم ان کے گھر سے باہر نکل آئے ہیں۔''

اگرچہ میرا خیال بھی یہی تھا تاہم میں نے اپنے دلی جذبات کو پوشیدہ رکھتے ہوئے کانسٹیبل سے پوچھا۔ ''تمہیں ان کی کس بات سے ایسا لگا ہے؟''

''میں نے محسوس کیا ہے کہ وہ آپ سے بات کرتے ہوئے بہت گھبرا رہی تھیں۔'' باسط علی نے جواب دیا۔ ''بہت ہی سوچ سوچ کر اور ناپ تول کر جواب دے رہی تھیں۔''

''پولیس کی وردی کی بڑی دہشت ہوتی ہے باسط علی!'' میں نے سرسری انداز میں کہا۔ ''بڑے بڑے پولیس کو سامنے دیکھ کر ہراساں ہوجاتے ہیں۔ یہ تو پھر دو عورتیں ہیں۔''

''ہوسکتا ہے، یہی بات ہو۔'' وہ سادگی سے بولا۔

میں نے کہا۔ ''باسط علی! میری ایک بات اچھی طرح ذہن میں بٹھالو۔ سمندر اور عورت کی فطرت یہ ہے کہ یہ دونوں کسی بھی شے کو زیادہ عرصے تک اپنے پیٹ میں نہیں رکھ سکتے۔ اگر جمیلہ اور اس کی ساس نے مجھ سے کچھ چھپانے کی کوشش بھی کی ہے تو میری کڑی تفتیش بہت جلد انہیں سب کچھ اگلنے پر مجبور کردے گی۔''

وہ اثبات میں سر ہلا کر رہ گیا۔ ہم باتیں کرتے ہوئے رانا نواز کی حویلی میں پہنچ گئے۔ تھوڑی ہی دیر کے بعد میں رانا کے ساتھ بیٹھک میں بیٹھا ہوا تھا۔ کانسٹیبل باسط کو میں نے باہر تانگے میں چھوڑ دیا تھا۔ نمبردار رانا نواز نے مجھ سے پوچھا۔

''جی ملک صاحب! کچھ پتا چلا اس خوب صورت عورت کا جس کی تلاش میں آپ یہاں آئے ہیں؟''

میں نے مختصر الفاظ میں رانا کو صورت حال سے آگاہ کردیا پھر کہا۔ ''آپ اپنے اس بندے کو بلائیں جس نے آکر مجھے بتایا تھا کہ چاچی رحمتے کے گھر میں کئی دنوں سے ایک خوب صورت اجنبی عورت ٹھہری ہوئی تھی جو دو دن پہلے چلی گئی ہے۔ یقیناً اس کا اشارہ چاچی رحمتے کی بیٹی عابدہ کی طرف تو نہیں ہوسکتا تھا۔''

''آپ بالکل ٹھیک کہہ رہے ہیں ملک صاحب۔'' وہ اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔ ''عابدہ تو ادھر کرم کوٹ ہی میں پل بڑھ کر جوان ہوئی تھی اور ہماری نظروں کے سامنے ہی بیاہ کر وہ یہاں سے وزیرآباد گئی ہے۔ وہ جیدا اور مشتاقا کے لیے اجنبی کیسے ہوسکتی ہے۔''

یہ جیدا اور مشتاقا وہی دو بندے تھے جنہیں رانا نے نامعلوم عورت کے حوالے سے معلومات حاصل کرنے کے لیے بھیجا تھا اور جیدا نے آکر بتایا تھا کہ چاچی رحمتے کے گھر میں کوئی اجنبی خوب صورت عورت ہفتہ دس دن ٹھہری تھی۔ اب یہ جیدا ہی اس بات کی وضاحت کرسکتا تھا کہ اس نے کس بنا پر اتنی بات کی تھی۔

"رانا جی! آپ جیدا کو فوراً یہاں بلائیں۔" میں نے سرسراتے ہوئے لہجے میں کہا۔ "میں اس سے پوچھ گچھ کرنا چاہتا ہوں......"

"فوری طور پر تو یہ ممکن نہیں ہے ملک صاحب۔" وہ معذرت خواہانہ انداز میں بولا۔ "اگر آپ شام تک رکتے ہیں تو پھر ٹھیک ہے۔"

"شام تک رکنے کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا رانا جی۔" میں نے دوٹوک الفاظ میں کہا پھر پوچھا۔ "ابھی جیدا کو یہاں بلانا ممکن کیوں نہیں ہے؟"

"اصل میں تھوڑی دیر پہلے میں نے جیدا اور مشتاقا کو کسی ضروری کام سے کرم کوٹ سے باہر بھیجا ہے۔" رانا وضاحت کرتے ہوئے بولا۔ "وہ شام تک ہی واپس آئیں گے۔ اگر آپ کا فوری طور پر واپس جانا ضروری ہے تو آپ روانہ ہو جائیں۔ میں جیدا کو آپ کے پاس تھانے بھیج دوں گا۔"

"ہاں یہی مناسب رہے گا۔" میں نے تائیدی انداز میں گردن ہلاتے ہوئے کہا۔

ہمارے درمیان مزید دس پندرہ منٹ تک گفتگو کا سلسلہ جاری رہا پھر میں وہاں سے اٹھ آیا۔ رانا کا بڑا شدید اصرار تھا کہ میں دن کا کھانا اس کی حویلی میں کھا کر جاؤں مگر میرا ذہن اس کیس میں اس بری طرح الجھا ہوا تھا کہ میں مزید ایک منٹ بھی وہاں نہیں رک سکتا تھا لہٰذا واپسی کی راہ اختیار کرنے میں، میں نے تاخیر سے کام نہیں لیا۔

جب ہمارا تانگا دریا کے کنارے کچے راستے پر کرم کوٹ سے تھانے کی طرف بڑھ رہا تھا تو مسجد میں ظہر کی اذان کی صدا گونجنے لگی۔ تانگے پر سوار ہوتے ہی میں نے اپنے اور رانا کے بیچ ہونے والی حالیہ بات چیت سے باسط علی کو آگاہ کر دیا تھا۔ تھوڑی ہی دیر کے بعد باسط علی نے مجھ سے پوچھا۔

"ملک صاحب! نمبردار کے بارے میں آپ کا کیا خیال ہے؟"

"مطلب......!" میں نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔

"آپ کی نظر میں وہ کیسا بندہ ہے؟"

"اچھا، بھلا مانس بندہ ہے۔" میں نے الجھن زدہ لہجے میں جواب دیا۔ "میں اسے کافی عرصے سے جانتا ہوں۔ تم کس حوالے سے پوچھ رہے ہو؟"

"جناب! سچی بات یہ ہے کہ مجھے نمبردار میں کوئی گڑبڑ محسوس ہو رہی ہے۔" وہ سوچ میں ڈوبے ہوئے لہجے میں بولا۔

"کیسی گڑبڑ...... ذرا کھل کر بتاؤ۔" میں سوالیہ نظر سے باسط علی کو دیکھنے لگا۔

"جناب!" وہ ٹھہرے ہوئے لہجے میں وضاحت کرتے ہوئے بولا۔ "پہلے اس نے اپنے بندوں کو گاؤں کا سروے کرنے بھیج دیا جس کے نتیجے میں جیدا ایک سنسنی خیز خبر بھی لایا۔ یونہی محسوس ہو رہا تھا، ہم چاچی رحمتے کے گھر پہنچیں گے اور مسئلہ حل ہو جائے گا مگر وہاں جمیلہ اور چاچی رحمتے نے جو اسٹوری سنائی، وہ بھی آپ کے سامنے ہے......" لمحاتی توقف کر کے اس نے ایک گہری سانس لی پھر اپنی بات کو آگے بڑھاتے ہوئے بولا۔

"ہم واپس حویلی اس نیت سے آئے تھے کہ جیدا سے اس بابت پوچھ تاچھ کریں گے مگر ہماری آمد سے قبل ہی نمبردار نے اپنے دونوں بندوں کو کہیں بھیج دیا تاکہ ہم ان سے بات نہ کر سکیں۔"

"تو تمہارے خیال میں رانا نے یہ سب کچھ ایک سوچے سمجھے منصوبے کے تحت کیا ہے؟" میں نے گہری سنجیدگی سے پوچھا۔ "تمہارے اندازے کے مطابق رانا کا اس معاملے میں کہیں نہ کہیں کوئی ہاتھ ہے؟"

"جی ہاں!" وہ اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔ "میں نے جو محسوس کیا وہ بے دھڑک آپ سے کہہ دیا ہے۔ یقین کرنا یا نہ کرنا آپ کی مرضی ہے......"

"بات یقین کرنے یا نہ کرنے کی نہیں ہے باسط علی!" میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے گمبھیر انداز میں کہا۔ "مجھے اس بات کی خوشی ہے کہ تمہارے اندر تجسس اور شک کا مادہ پایا جاتا ہے۔ پولیس ڈیپارٹمنٹ میں اس جوہر کی بڑی اہمیت ہے اور جہاں تک اس بات کا تعلق ہے کہ نمبردار نواز نے ہمارے ساتھ غلط بیانی کر کے کوئی کھیل کھیلنے کی کوشش کی ہے تو میں تمہارے اس خیال کی تصدیق کے لیے رانا کو اپنے انداز میں ضرور چیک کروں گا۔ ویسے ہمیں ایک اور بات کو بھی نظرانداز نہیں کرنا چاہیے کہ......"

میں نے جملہ ادھورا چھوڑا تو وہ جلدی سے پوچھ بیٹھا۔ "کون سی بات ملک صاحب؟"

"جیسا کہ تم نے محسوس کیا اور میں نے بھی کہ......" میں نے وضاحت کرتے ہوئے کہا۔ "جمیلہ اور اس کی ساس چاچی رحمتے ہم سے کچھ چھپانے کی کوشش کر رہی تھیں۔ عین ممکن ہے کہ دریا سے ملنے والی لاش جس خوب صورت عورت کی ہے، وہ واقعی ان کے گھر میں وقت گزار کر گئی ہو اور یہ دونوں کسی خاص وجہ سے اس بات کو چھپانے کی کوشش کر

رہی ہوں......''

''جی، یہ تو ہے۔'' وہ تائیدی انداز میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔

''بس، اگر یہ ہے تو پھر ہمیں مناسب موقع کا انتظار کرنا ہوگا۔'' میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''بہت جلد صورتِ حال واضح ہوجائے گی۔''

اس کے بعد باسط علی نے مجھ سے کوئی سوال نہیں کیا۔

☆☆☆

چھ نومبر کی شام پوسٹ مارٹم کی ابتدائی رپورٹ آگئی۔ اس رپورٹ کے مطابق متوفی عورت کی موت چار اور پانچ نومبر کی درمیانی رات، نصف شب کے بعد کسی وقت واقع ہوئی تھی۔ اس نامعلوم عورت کو جسمانی تشدد کا نشانہ بنانے کے علاوہ ایک ایسے روحانی عذاب سے بھی گزارا گیا تھا کہ اسی صدمے سے اس کی موت واقع ہوگئی تھی۔ میڈیکل ایگزامنر کی رپورٹ سے یہ بات واضح ہوتی تھی کہ اس بدنصیب عورت کی بڑی بے دردی سے آبروریزی کی گئی تھی اور اسی عصمت دری کے دوران میں اس کی روح قفسِ عنصری سے پرواز کرگئی تھی۔ یہ تصور ہی لرزا دینے والا تھا کہ ایک خوب صورت اور پُرکشش عورت کو اس کی مرضی کے خلاف نوچتے، کھسوٹتے اور اس کی معصومیت کو تارتار کرتے ہوئے موت کے گھاٹ اتار دیا جائے۔ ان لمحات میں اس بدبخت کی کسمپرسی اور بے بسی کا شمار یا حساب کرنا ممکن نہیں تھا۔ اس نامعلوم عورت کے پورے بدن پر ایسے نشانات پائے گئے تھے جیسے اس کی عزت سے کھلواڑ کرتے ہوئے کسی شقی القلب شخص نے دو چٹکیوں سے اس کے پورے جسم کو نوچ ڈالا ہو۔

چونکہ میں ابھی تک اس بدقسمت عورت کے حوالے سے کچھ بھی نہیں جانتا تھا، اس لیے اس کی لاش کو میں نے سرکاری اسپتال کے مردہ خانے ہی میں چھوڑ دیا تھا۔ جب تک اس کا کوئی والی وارث سامنے نہ آتا، لاش کا سردخانے میں ہی رہنا مناسب تھا۔ بعد کی بعد میں دیکھی جاتی۔

اگلی صبح میں نے اے ایس آئی قدیر خان کو ایک کانسٹیبل کے ہمراہ وزیر آباد روانہ کردیا۔ میں نے انہیں عابدہ کی سسرال کا ایڈریس بھی لکھ کر دے دیا تھا تاکہ وہ جمیلہ اور چاچی رحمتے کی بات کی تصدیق کرسکیں۔ یہ بہت ضروری تھا کیونکہ نامعلوم عورت کی شناخت کا معاملہ ابھی تک الجھا ہوا تھا۔ ذہن کو بٹانے کے لیے میں دیگر کاموں میں لگ گیا۔

میں تھانے میں بیٹھا امورِ تھانے داری انجام دے رہا تھا کہ ایک کانسٹیبل نے اندر آکر دو اطلاعات دیں۔ ''ملک صاحب! کچھ لوگ آپ سے ملنے آئے ہیں۔''

''کون لوگ؟'' میں نے سوالیہ نظر سے کانسٹیبل کی طرف دیکھا۔

''ایک تو اپنا فیکا کوچوان ہے جی۔'' اس نے پہلی اطلاع دی پھر بتایا۔ ''اور دوسرے تین بندے ادھر کرم کوٹ سے بھی آئے ہیں جن میں ایک عورت اور مرد ہیں جناب......!''

''کرم کوٹ......!'' میں نے پُرسوچ انداز میں کہا اور میرا دھیان رانا نواز کی طرف چلا گیا۔ میں نے کانسٹیبل سے پوچھا۔ ''فیکا نے کچھ بتایا، وہ کس سلسلے میں مجھ سے ملنے آیا ہے؟''

وقوعہ کے روز میں جس مقصد کے لیے فیکا کوچوان سے ملنا چاہتا تھا، اب اس کی ضرورت نہیں رہی تھی۔ فیکا نے اللہ بخش کے ساتھ مل کر اس نامعلوم عورت کی لاش کو دریا سے نکالا تھا۔ اس عمل کے دوران میں اللہ بخش نے تو نگاہ اٹھا کر بھی برہنہ لاش کی طرف نہیں دیکھا البتہ یہ احتیاط فیکا کوچوان نے نہیں برتی تھی۔ میں اس سے یہی معلوم کرنا چاہتا تھا کہ اس نے متوفی کے بدن پر تشدد وغیرہ کے آثار یا کسی زخم کے نشانات تو نہیں دیکھے تاہم پوسٹ مارٹم کی رپورٹ نے یہ معاملہ صاف کردیا تھا۔

کانسٹیبل نے میرے سوال کے جواب میں بتایا۔ ''جناب! فیکا کہتا ہے کہ آپ نے اسے یاد فرمایا ہے۔ آپ اس سے کچھ پوچھنا چاہتے ہیں۔''

''ٹھیک ہے، فیکا سے کہو کہ ابھی جائے۔ میں بعد میں جب ضرورت محسوس کروں گا تو اسے بلالوں گا۔'' میں نے کہا۔ ''اور ان بندوں کو اندر بھیج دو جو کرم کوٹ سے آئے ہیں۔''

''اوکے ملک صاحب!'' یہ کہتے ہوئے کانسٹیبل واپس چلا گیا۔

تھوڑی ہی دیر کے بعد وہ لوگ میرے سامنے بیٹھے تھے۔ ان میں ایک تو رانا نواز کا ملازم خاص جیدا تھا۔ دوسرے دو افراد کو میں نہیں جانتا تھا۔ اپنے انداز واطوار سے وہ دونوں میاں بیوی لگتے تھے۔ میں نے باریک بینی سے ان کا جائزہ لیا پھر جاوید عرف جیدا کی طرف دیکھتے ہوئے پوچھا۔

''جیدا! تم کل کہاں غائب ہوگئے تھے۔ ہم چاچی رحمتے کے گھر سے واپس آئے تو تم اور مشتاق کرم کوٹ چھوڑ

کر کہیں جا چکے تھے؟''

''تھانے دار جی! ہم تو حکم کے غلام ہیں۔'' وہ سادہ سے لہجے میں بولا۔ ''نمبردار صاحب جدھر بھیجیں، ہم انکار تو نہیں کر سکتے نا۔ انہوں نے ہمیں ایک ضروری کام سے مراد آباد بھیجا تھا۔ رات کو واپسی میں کافی دیر ہوگئی اس لیے آپ کی خدمت میں حاضری نہ دے سکے......'' لمحاتی توقف کر کے اس نے ایک گہری سانس لی پھر اضافہ کرتے ہوئے بولا۔

''ویسے نمبردار صاحب نے رات ہی ہمیں بتا دیا تھا کہ آپ کس سلسلے میں ہمیں ڈھونڈ رہے تھے۔ میں نے آپ کا کام رات ہی کو کر دیا تھا اور صبح ان دونوں بندوں کو لے کر آپ کے پاس آ گیا ہوں۔''

موضع مراد آباد، کرم کوٹ سے پانچ میل کے فاصلے پر جنوب میں واقع تھا۔ میں نے جیدا سے اس ضروری کام کی تفصیل جاننا مناسب نہ سمجھا جس کی غرض سے رانا نے ان دونوں کو مراد آباد بھیجا تھا۔ یہ سراسر وقت برباد کرنے کے مترادف ہوتا اور میں اس کا متحمل نہیں ہو سکتا تھا۔ میں نے جیدا کے ساتھ آنے والے مرد اور عورت کی طرف دیکھتے ہوئے سوال کیا۔

''ان دونوں کی تعریف......؟''

''تھانے دار صاحب! یہ ادریس اور زرینہ ہیں۔'' جیدا ان دونوں کا تعارف کراتے ہوئے بولا۔ ''ادریس کی ادھر کرم کوٹ میں پرچون کی دکان ہے اور یہ چاچی رحمتے کے گوانڈی ہیں جناب......!''

''اوہ......!'' میں نے ایک گہری سانس خارج کرتے ہوئے کہا۔ ''تو چاچی رحمتے کے گھر کے ساتھ جو دوسرا گھر بنا ہوا ہے، یہ لوگ وہاں رہتے ہیں۔ دونوں ایک دوسرے کے گوانڈی یعنی پڑوسی ہیں......''

''جی جناب۔'' جیدا اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔ ''چاچی رحمتے اور جمیلہ نے جھوٹ بول کر آپ کو بے وقوف بنانے کی کوشش کی ہے نا...... یہ دونوں اس حقیقت کی گواہی دیں گے پھر آپ کو یقین آ جائے گا کہ میں نے کتنی خالص تحقیق کی تھی۔''

جیدا فخریہ انداز میں اپنی کارگزاری بیان کرنے کے بعد خاموش ہوا تو میں نے سنسناتے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''تو یہ دونوں میاں بیوی اس بات کے گواہ ہیں کہ چاچی رحمتے کے گھر میں کوئی خوب صورت اجنبی عورت ہفتہ، دس دن کے لیے رکی تھی؟''

''جی ہاں، بالکل......!'' وہ بڑے اعتماد سے بولا۔

میں چاچی رحمتے کے پڑوسی میاں بیوی کی جانب متوجہ ہوگیا پھر مرد کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے سوال کیا۔

''ہاں بھئی ادریس! یہ کیا ماجرا ہے؟''

''جناب! ماجرا تو ہماری بھی سمجھ میں نہیں آیا۔'' ادریس نے سادہ سے لہجے میں جواب دیا۔ ''لیکن یہ ضرور ہے کہ چاچی رحمتے کے گھر میں ہم نے ایک اجنبی عورت کو دیکھا ضرور ہے۔ تین چار دن پہلے وہ اچانک غائب ہوگئی تھی۔''

ادریس نے واضح طور پر ''اجنبی عورت'' کے الفاظ استعمال کیے تھے لیکن میں نے پھر بھی اتمام حجت کے طور پر پوچھ لیا۔

''ادریس! کہیں تم چاچی رحمتے کی بیٹی عابدہ کی بات تو نہیں کر رہے...... وہ بھی تو ہفتہ، دس دن وہاں رک کر واپس اپنے سسرال وزیرآباد چلی گئی ہے......؟''

''آپ بھی کیسی باتیں کرتے ہیں تھانے دار صاحب۔'' وہ عجیب سے لہجے میں بولا۔ ''عابدہ کو ہم بچپن سے جانتے ہیں۔ ہمیں مغالطہ کیسے ہو سکتا ہے۔ وہ عورت کوئی اور ہی تھی۔ اسے ہم نے پہلے کبھی نہیں دیکھا تھا۔''

''اور جناب......'' زرینہ نے گہری سنجیدگی سے کہا۔ ''عابدہ کا یہاں آنا اور رہ کر واپس جانا تو پہلے کا واقعہ ہے۔ جس عورت کا ابھی ذکر ہو رہا ہے، وہ بعد میں چاچی رحمتے کے گھر میں آئی تھی۔''

''کیا مطلب ہے تمہارا؟'' میں نے چونک کر اس کی طرف دیکھا۔

''جی، میں سچ کہہ رہی ہوں۔'' وہ ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے بولی۔ ''عابدہ اپنے خاوند سے ناراض ہو کر کرم کوٹ ضرور آئی تھی اور زبیر اسے منا کر بھی لے گیا تھا لیکن اس بات کو پندرہ دن سے زیادہ کا عرصہ گزر گیا ہے۔ وہ پراسرار عورت اچانک ہی کہیں سے آ گئی تھی اور پھر اچانک ہی غائب بھی ہوگئی۔ مجھے تو یہی لگتا ہے کہ سراجا اس معصوم کو کہیں سے اغوا کر کے یا ورغلا کر لایا تھا لیکن جمیلہ نے اسے رکنے نہیں دیا اور وہ چپ چاپ کہیں نکل گئی۔''

''خوامخواہ کی بات نہ کرو زرینہ۔'' ادریس نے گھور کر اپنی بیوی کو دیکھا۔ ''دوسروں کے گھریلو معاملات کی ٹوہ میں نہیں رہنا چاہیے۔ پتا نہیں، اس عورت کا کیا معاملہ تھا۔ حقیقت صرف خدا ہی کو معلوم ہے۔''

''یہ ٹھیک ہے کہ اللہ ہی بہتر جانتا ہے لیکن گوانڈیوں

سے بھی سب چھپا نہیں رہتا۔'' میں نے زرینہ کی تائید میں کہا۔ ''زرینہ نے کچھ دیکھا ہے تو کہہ رہی ہے نا......؟''

''میں تو کل ہی جناب آپ کو سب کچھ بتانے والی تھی جب آپ پوچھ گچھ کے لیے چاچی رحمتے کے گھر آئے تھے۔'' زرینہ نے گہری سنجیدگی سے کہا۔ ''لیکن مجھے اس کا موقع نہیں ملا۔ میں پہلے اپنے گھر کے دروازے کے پیچھے کھڑے ہو کر اور بعد میں دونوں گھروں کی درمیانی دیوار سے کان لگا کر چاچی کے گھر میں ہونے والی آپ کی باتیں سننے کی کوشش کر رہی تھی۔''

''اوہ...... تو وہ تم تھیں......!'' بے ساختہ میرے منہ سے نکلا۔

میں نے گزشتہ روز چاچی رحمتے کے گھر آس پاس جو محسوس کیا تھا کہ کوئی کہیں چھپ کر مجھے دیکھ رہا ہے تو میرا وہ احساس بالکل درست تھا۔ اب زرینہ تصدیق کر رہی تھی کہ وہ میری ٹوہ میں تھی۔ مردوں کی بہ نسبت عورتوں میں تجسس کا مادہ کچھ زیادہ ہی ہوتا ہے۔

''تھانے دار صاحب!'' ادریس مجھ سے مخاطب ہوتے ہوئے منت ریز لہجے میں بولا۔ ''میں دکان کھلی چھوڑ کر آیا ہوں۔ میرا چھ سال کا لڑکا احمد وہاں بیٹھا ہے۔ آپ کو جو کچھ پوچھنا ہے، جلدی سے پوچھ لیں۔''

''اور احمد سے چھوٹے حامد کو میں اپنی بہن کے پاس چھوڑ کر آئی ہوں۔'' زرینہ نے ادریس کی بات کو آگے بڑھاتے ہوئے کہا۔ ''حامد ابھی صرف دو سال کا ہے......''

میں نے ان کی مجبوری کا خیال کرتے ہوئے انہیں جلدی نمٹانے کا فیصلہ کرلیا اور زرینہ سے پوچھا۔ ''وہ عورت تمہارے پڑوس میں آئی تھی۔ تم سے اس کا میل جول تو ہوا ہوگا۔ اس نے تمہیں بتایا ہوگا، اس کا نام کیا ہے، وہ کون ہے اور کہاں سے آئی ہے......؟''

''نہیں جناب! ایسی کوئی بات نہیں۔'' میرے متعدد سوالات کے جواب میں اس نے بتایا۔ ''وہ عورت ایک بار بھی مجھ سے نہیں ملی بلکہ یوں سمجھیں کہ اس دوران میں وہ گھر سے باہر نکلی ہی نہیں تھی۔''

''تمہارے اندر تو تجسس بہت زیادہ ہے۔'' میں نے زرینہ کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔ ''تمہیں یقیناً تشویش ہوئی ہوگی کہ آخر وہ عورت ہے کون۔ تم نے چاچی رحمتے کے گھر جا کر اس کے بارے میں معلومات حاصل کرنے کی کوشش نہیں کی؟''

''ان لوگوں کے گھر جانے کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھانے دار صاحب!'' ادریس نے برا سا منہ بناتے ہوئے کہا۔

''کیوں سوال پیدا نہیں ہوتا؟'' میں نے پوچھا۔ ''کوئی خاص وجہ؟''

''ہمارے گوانڈی بہت جھگڑالو اور فتنے باز لوگ ہیں جناب!'' ادریس نے جواب دیا۔ ''لڑائی کرنے کا کوئی نہ کوئی بہانہ ڈھونڈتے رہتے ہیں۔''

''میں آپ کو بتاتی ہوں جی!'' زرینہ نے توانا لہجے میں کہا۔ ''یہ جو جمیلہ ہے نا...... یہ بہت ہی سڑیلی عورت ہے۔ میرے بچوں سے وہ شدید نفرت کرتی ہے۔ خود تو بچہ پیدا کرنے کے قابل نہیں، دوسروں کے بچوں کو دیکھ کر جلتی ہے۔ میرے بچے گھر کے باہر کھیلتے ہیں تو اسے تکلیف، اپنے گھر کے اندر شور مچاتے ہیں تو اس کے سینے پر سانپ لوٹ جاتے ہیں۔ ڈائن ہے پوری، میرے بچوں کو بددعائیں اور گالیاں دیتی رہتی ہے منحوس ماری!''

''زرینہ......!'' ادریس نے تنبیہہ کرنے والے انداز میں کہا۔ ''کیوں گناہ گار ہوتی ہو جمیلہ کی پیٹھ پیچھے برائی کرکے۔ نیتوں کا حال تو اللہ جانتا ہے اور پھر کسی کی بددعاؤں سے کیا ہوتا ہے۔ گِدھوں کی دعاؤں سے اگر ڈنگر مرنے لگیں تو پھر ہو گیا کام، چمار تو راتوں رات امیر ہو جائیں گے۔''

''مجھے تو یہ جمیلہ کسی چمار ہی کی اولاد لگتی ہے۔'' زرینہ نے برہمی سے کہا۔

''بری بات۔'' ادریس نے اسے دوبارہ ٹوکا۔ ''اپنی زبان گندی نہ کرو زرینہ!''

''وہ میرے کلیجے کے ٹکروں کو برا بھلا کہے اور میں چپ بیٹھی تماشا دیکھتی رہوں۔'' زرینہ ہاتھ نچاتے ہوئے بولی۔ ''برے کو برا کہنے سے زبان گندی نہیں ہوتی۔''

''اس وقت تو وہ تمہیں اور تمہارے بچوں کو کچھ نہیں کہہ رہی نا۔'' ادریس نے قدرے سخت لہجے میں کہا۔ ''گھر جا کر تم اپنے دل کا غبار دھو لینا۔ یہاں تھانے میں تماشا نہیں بناؤ۔''

میں چپ چاپ بیٹھا ان میاں بیوی کی نوک جھونک سے محظوظ ہو رہا تھا۔ زرینہ نے شکایتی لہجے میں کہا۔

''وہاں بھی تو تم مجھے روک لیتے ہو۔ وہ جب بھی میرے بچوں کے خلاف بکواس شروع کرتی ہے اور میں اسے مزہ چکھانے کا ارادہ ہی کرتی ہوں تو تم مجھے پکڑ کر گھر کے اندر لے جاتے ہو...... دل کا غبار کیا خاک نکالوں گی؟''

''اگر کوئی برا ہے تو یہ ضروری نہیں ہوتا کہ انسان خود بھی اس کے ساتھ برا ہی بن جائے۔'' ادریس نے سمجھانے والے انداز میں کہا۔ ''بھونکنے والوں کو بھونکنے دینا چاہیے اور یہ اطمینان رکھنا چاہیے کہ وہ کاٹیں گے نہیں۔ اگر بھونکنے والے کی بھوں بھوں کانوں کو بھلی نہ لگ رہی ہو تو تھوڑی دیر کے لیے کان بند کر لینا چاہئیں۔ اللہ اللہ، خیر سلا!''

''اللہ اللہ، خیر سلا...... اونہہ!'' زرینہ نے بگڑے ہوئے لہجے میں کہا۔

زرینہ کی بہ نسبت ادریس امن پسند اور صلح جو نظر آتا تھا۔ میں نے ان کی کچہری ختم کرانے کی غرض سے کہا۔ میری مخاطب ادریس کی بیوی تھی۔

''زرینہ! کیا تم لوگ مستقبل قریب میں وہ گھر چھوڑ کر کہیں اور جا رہے ہو؟''

''نہیں جی، ایسی تو کوئی بات نہیں۔'' وہ الجھن زدہ نظر سے مجھے دیکھتے ہوئے بولی۔ ''پر دل تو یہ چاہتا ہے آج ہی اس کم ذات جمیلہ کا گوانڈ چھوڑ کر اتنی دور جا بسیں کہ اس کمینی کو چھونے والی ہوا بھی ہم تک نہ پہنچ سکے۔''

زرینہ کے انداز سے یہی ظاہر ہوتا تھا کہ جمیلہ کی حرکتوں نے اس کا دل پکا دیا ہے۔ میرا ایک ملاقاتی ذاتی تجربہ بھی یہی تھا کہ جمیلہ گرم مزاج کی ایک چنٹ عورت تھی جس کی آنکھیں ہر وقت حرکت میں رہتی تھیں جیسے وہ بیک وقت چاروں جانب کی خبر گیری کر رہی ہو۔

''بس تو پھر ٹھیک ہے۔'' میں نے زرینہ کی جانب دیکھتے ہوئے کہا۔ ''اگر ابھی جمیلہ کے پڑوس میں رہنا تمہاری مجبوری ہے تو اللہ جنگ و جدال کے بہت سے مواقع دے گا۔ وہ اپنی عادت سے باز آنے والی نہیں۔ جب بھی وہ تمہارے بچوں کو ڈانٹ ڈپٹ شروع کرے تو تم بھی اللہ کا نام لے کر شروع ہو جانا۔ ایک ہی بار اپنے دل کا سارا غبار دھو ڈالنا......'' لمحاتی توقف کر کے میں نے باری باری ان دونوں میاں بیوی کی طرف دیکھا پھر کہا۔ ''فی الحال ہم لوگ کام کی باتیں کر لیتے ہیں۔''

''جی بالکل۔'' ادریس نے تائیدی انداز میں گردن ہلاتے ہوئے کہا۔ ''تھانے دار صاحب! آپ کو جو بھی پوچھنا ہے، بس جلدی سے پوچھ لیں تاکہ ہم واپس کرم کوٹ جاسکیں۔''

میں نے اپنی میز کی دراز کھولتے ہوئے کہا۔ ''زرینہ! تم نے تو اس اجنبی عورت کو خوب اچھی طرح دیکھ لیا ہے۔ اگر وہ دوبارہ تمہارے سامنے آجائے تو تم اسے پہچان لو گی نا؟''

''جی ہاں، کیوں نہیں۔'' وہ بڑے وثوق سے بولی۔ ''اس کا ایک ایک نقش میرے ذہن میں محفوظ ہے جی۔''

''کیا اس کی تصویر دیکھ کر بھی تم اسے پہچان سکتی ہو؟'' میں نے دراز میں سے ایک بھورا لفافہ نکالتے ہوئے استفسار کیا۔

''جی ضرور...... بہت آسانی سے۔'' وہ بڑے وثوق سے بولی۔

پوسٹ مارٹم سے پہلے سرکاری فوٹو گرافر نے نامعلوم عورت کی لاش کی چند تصاویر بنالی تھیں جن میں سے ایک پوسٹ مارٹم کی ابتدائی رپورٹ کے ساتھ مجھے بھیج دی گئی تھی۔ میں نے بھورے لفافے میں سے مذکورہ تصویر نکال کر زرینہ کی جانب بڑھاتے ہوئے پوچھا۔

''اس کے بارے میں کیا کہتی ہو؟''

اس نے ایک لحہ تصویر کو دیکھا پھر بڑے اعتماد سے بولی۔ ''جی...... بالکل...... یہ وہی عورت ہے جناب جسے میں نے جمیلہ کے گھر میں دیکھا تھا مگر......'' وہ لمحے بھر کو رکی پھر الجھن زدہ لہجے میں بولی۔ ''اس نے سفید چادر کیوں اوڑھ رکھی ہے اور...... یہ سوئی ہوئی کیوں ہے...... کیا یہ بیمار ہے......؟''

''اب یہ بدنصیب ایسی جگہ پہنچ چکی ہے جہاں یہ کبھی بیمار نہیں ہوگی۔'' میں نے انکشاف انگیز انداز میں کہا۔ ''یہ پوسٹ مارٹم سے پہلے لی گئی اس کی تصویر ہے۔''

''اوہ......!'' ادریس میری بات کی تہ میں پہنچ گیا تھا۔ اس نے افسوس ناک انداز میں گردن ہلاتے ہوئے کہا۔ ''اس کو کیا حادثہ پیش آیا ہے تھانے دار صاحب؟''

لفظ ''حادثے'' پر زرینہ کے چہرے پر تشویش ابھری۔ اس نے سرسراتی آواز میں مجھ سے پوچھا۔ ''کیا یہ مر گئی ہے؟''

میں نے نہایت ہی مختصر الفاظ میں ان میاں بیوی کو صورت حال سے آگاہ کیا۔ جیدا اور مشتاقا اس نامعلوم خوب صورت عورت کو پیش آنے والے حادثے سے کل ہی باخبر ہو چکے تھے۔ زرینہ اور ادریس کی لاعلمی اس امر کی غماز تھی کہ جیدا نے انہیں اس بارے میں کچھ نہیں بتایا تھا۔

''اس بدنصیب کی جان کس نے لی ہے؟'' زرینہ نے مجھ سے پوچھا۔

''میں یہی پتا چلانے کی کوشش کر رہا ہوں۔'' میں نے جواب دیا۔ ''اور اس سے پہلے یہ بھی معلوم کرنا ہے کہ یہ

آخر ہے کون......؟"

"میں تو کہتی ہوں جی آپ سراجے کو تھانے میں بند کر کے پوچھیں۔" وہ گہری سنجیدگی سے بولی۔ "وہی اس عورت کو کہیں سے پکڑ کر لایا تھا۔"

"ضرور...... میں سراجے سے بھی تفتیش کروں گا اور اس کی بیوی وہاں سے بھی۔" میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ "آپ لوگوں کو ایک کام کرنا ہے......"

"آپ حکم کریں جی، کون سا کام؟" ادریس نے پوچھا۔

میں نے ادریس کے سوال کا جواب دینے سے پہلے جیدا سے سوال کیا۔ "کیا کرم کوٹ کے لوگوں کو اس بات کا پتا ہے کہ تم ان دونوں کو لے کر میرے پاس آئے ہو؟"

"نہیں جناب، اس بات کو بالکل خفیہ رکھا گیا ہے۔" وہ گہری سنجیدگی سے بولا۔ "نمبردار صاحب کے مشورے پر ادریس اور اس کی گھر والی کو چپکے سے حویلی بلا لیا گیا تھا پھر وہاں سے میں ان دونوں کو لے کر آپ کے پاس آیا ہوں۔"

"اس کا مطلب ہے، چاچی رحمتے اور جمیلہ کو بھی ان کے بارے میں کچھ پتا نہیں ہے؟" میں نے سوالیہ نظر سے باری باری ان تینوں کی طرف دیکھا۔

"جی بالکل نہیں۔" زرینہ بڑے وثوق سے بولی۔

"بس، یہی صورتِ حال برقرار رہنا چاہیے۔" میں نے سمجھانے والے انداز میں کہا۔ "تم لوگ جیسے چپ چاپ آئے ہو ویسے ہی خاموشی سے واپس جا کر اپنے اپنے کام میں لگ جاؤ اور جیدا تم......" میں نے لمحاتی توقف کے بعد اضافہ کیا۔

"تم ذرا چاچی رحمتے پر بھی نظر رکھنا۔ یہ لوگ کہیں اِدھر اُدھر نہ جائیں۔ میں آج کسی بھی وقت کرم کوٹ کے دورے پر آ سکتا ہوں۔"

"جی ضرور......" وہ فرماں برداری سے بولا۔ "میں آپ کے حکم کی تکمیل کروں گا۔"

میں نے تھوڑی دیر کے بعد مزید ہدایات کے ساتھ انہیں تھانے سے رخصت کر دیا اور اس کیس کے نئے نئے پہلوؤں پر غور کرنے لگا۔ اس نامعلوم عورت کی شناخت کا معاملہ ابھی تک ایک معما بنا ہوا تھا تاہم ایک واضح اشارہ یہ ضرور مل گیا تھا کہ اس عورت کے بارے میں سب سے زیادہ سراج دین عرف سراجا ہی جانتا تھا۔

زرینہ اور ادریس کے بیانات کی روشنی میں جمیلہ اور چاچی رحمتے کے جھوٹ کا پول کھل گیا تھا۔ یہ سمجھنا زیادہ مشکل نہیں تھا کہ انہوں نے کس مقصد کی خاطر جھوٹ بولا ہوگا کیونکہ جب انسان جھوٹ بولتا ہے تو اس کی کوئی نہ کوئی ٹھوس وجہ ضرور ہوتی ہے اور عموماً اپنے کسی جرم یا سنگین غلطی کی پردہ پوشی کے لیے اسے جھوٹ کا سہارا لینا پڑتا ہے۔

نامعلوم مقتولہ عورت کے حوالے سے جمیلہ اور چاچی رحمتے سے میری جتنی بھی گفتگو ہوئی تھی اس میں یہی وجہ کارفرما دکھائی دیتی تھی۔ اب سوال یہ پیدا ہوتا تھا کہ انہوں نے نامعلوم مقتولہ کے اپنے یہاں قیام سے انکار کیوں کیا؟ نہ صرف اس کے قیام سے انکار بلکہ وہ تو اس بات پر بھی بضد تھیں کہ وہ ایسی کسی عورت کو جانتی تک نہیں جبکہ زرینہ نے فوٹو دیکھ کر نہ صرف یہ کہ اس عورت کی شناخت کر لی تھی بلکہ اس بات کی تصدیق بھی کی تھی کہ اس نے پچھلے دنوں اسی عورت کو اپنے پڑوس میں دیکھا تھا۔ اس نے چند روز وہاں قیام کیا اور پھر اچانک ہی غائب ہو گئی۔

زرینہ کے ایک اور پوائنٹ میں بھی اچھی خاصی جان تھی۔ اس کا فوکس اس بات پر تھا کہ جمیلہ کا شوہر سراجا اس خوب صورت عورت کو کہیں سے بھگا کر لایا تھا تاہم جمیلہ نے اسے گھر میں ٹکنے نہیں دیا اور وہ منظر سے آؤٹ ہو گئی۔

یہ نکتہ خاصا فکرانگیز اور حقیقت سے قریب تر تھا۔ عین ممکن تھا کہ سراجا اس عورت کو کہیں سے بہلا پھسلا کر لے آیا ہو اور اس سے شادی وغیرہ کا ارادہ رکھتا ہو مگر جمیلہ نے اس کی دال نہ گلنے دی ہو۔ میں نے جمیلہ کے جو تیور دیکھے تھے، ان کی روشنی میں کہا جا سکتا تھا کہ وہ تو سراجا کی بھی دال نہیں گلنے دیتی ہوگی۔ اپنی ہونے والی سوتن کی دال وہ کیسے گلنے دے سکتی تھی۔

بہر حال، اس معاملے کی تہ تک پہنچنے کے لیے سراجا سے کڑی پوچھ گچھ کرنا ضروری تھا اور وہ حافظ آباد گیا ہوا تھا تاہم جمیلہ کے بیان کی روشنی میں وہ آج کل میں واپس آنے ہی والا تھا۔ گویا یہ کیس ایک آدھ دن میں کسی کنارے لگ ہی جاتا۔

میں نے شام سے تھوڑی دیر پہلے کرم کوٹ جانے کا پروگرام بنایا تھا۔ جانے کو تو میں جیدا اینڈ کمپنی کے ساتھ بھی جا سکتا تھا مگر دراصل مجھے اے ایس آئی قدیر خان کی واپسی کا انتظار تھا۔ وہ وزیرآباد سے واپس آ جاتا تو صورتِ حال زیادہ کھل کر سامنے آ جاتی اور میں زیادہ آسانی کے ساتھ پیش قدمی کر سکتا تھا۔

دوپہر کے بعد قدیر خان وزیرآباد سے لوٹ آیا اور اس کی رپورٹ نے اس کیس کو حتمی شکل دے دی۔ اے ایس آئی قدیر خان وزیرآباد جا کر عابدہ اور اس کے شوہر

زبیر سے ملا تھا۔ میں نے اسے جن ہدایات کی روشنی میں ..... وزیر آباد روانہ کیا تھا، اس کے مطابق جب ان میاں بیوی سے تفتیش کی تو زرینہ اور ادریس کی بات بالکل سچ نکلی۔

عابدہ اپنے شوہر سے لڑ جھگڑ کر وزیر آباد سے آگئی تھی اور کرم کوٹ میں اس نے ایک ہفتہ قیام بھی کیا تھا۔ بعد ازاں زبیر کرم کوٹ آیا تھا اور روٹھی ہوئی بیوی کو منا کر لے گیا تھا لیکن یہ پندرہ بیس دن پہلے کا قصہ تھا۔ مجھے جس نامعلوم مقتولہ عورت کی تلاش تھی وہ عابدہ کی روانگی کے بعد چاچی رحمتے کے گھر میں آکر ٹھہری تھی۔ عابدہ نے ایسی کسی عورت کی جان کاری سے بھی اپنی لاعلمی کا اظہار کیا تھا۔

''ملک صاحب! یہ چاچی رحمتے جھوٹی اور دھوکے باز عورت ہے۔'' قدیر خان نے گہری سنجیدگی سے کہا۔ ''اس نے کسی خاص مقصد کی خاطر جان بوجھ کر آپ سے غلط بیانی کی ہے۔ زبیر کی رائے بھی اپنی ساس کے بارے میں اچھی نہیں ہے۔ میرا مشورہ ہے کہ اگر چاچی رحمتے سے کڑی پوچھ گچھ کی جائے تو نامعلوم مقتولہ عورت کے بارے میں درست معلومات حاصل کی جاسکتی ہیں۔''

''میں تمہاری بات سے پوری طرح اتفاق کرتا ہوں قدیر خان۔'' میں نے تائیدی انداز میں گردن ہلاتے ہوئے کہا۔ ''صرف چاچی رحمتے ہی نہیں، اس کے بیٹے سراجا اور بہو جمیلہ سے بھی کڑی تفتیش کرنے کی ضرورت ہے مگر کرم کوٹ جا کر نہیں بلکہ اپنے تھانے کی حوالات میں۔'' لمحاتی توقف کر کے میں نے ایک گہری سانس لی پھر اپنی بات مکمل کرتے ہوئے اے ایس آئی کو اس تفصیل سے آگاہ کر دیا جو مجھے تھوڑی دیر پہلے زرینہ اور ادریس کی زبانی پتا چلی تھی۔ آخر میں، میں نے اس سے پوچھ لیا۔

''زبیر نے اپنی ساس کے بارے میں کیا کہا ہے؟''

''زبیر کے مطابق چاچی رحمتے ایک فتنہ پرور اور گھُنی عورت ہے۔'' قدیر خان نے جواب دیا۔ ''وہ گاہے بگاہے اپنی بیٹی کے کان بھرتی رہتی ہے۔ عابدہ بنیادی طور پر ایک اچھی عورت ہے مگر ماں کی الٹی سیدھی پٹیاں اس کا دماغ خراب کر دیتی ہیں۔ آخری بار تو حد ہی ہو گئی تھی۔''

''کیسی حد قدیر خان؟'' اے ایس آئی سانس ہموار کرنے کے لیے رکا تو میں نے پوچھ لیا۔

''اب کی بار جو عابدہ میکے آئی تو واپس جانے کا نام ہی نہیں لے رہی تھی۔'' قدیر خان وضاحت کرتے ہوئے بولا۔ ''چاچی رحمتے نے مطالبہ کر دیا تھا کہ زبیر عابدہ کو اپنے والدین کے ساتھ نہ رکھے بلکہ اسے الگ گھر لے کر دے۔ زبیر نے مجھے بتایا ہے کہ ساس کی طرف سے اس قسم کا مطالبہ سن کر اس کا تو دماغ ہی گھوم گیا تھا اور غصے میں آکر اس نے بھی کہہ دیا۔ چاچی! تم اپنی بیٹی کو اپنے پاس ہی رکھو، میں واپس جا رہا ہوں۔ میں بیوی کی خاطر اپنے والدین کو نہیں چھوڑ سکتا۔ بولو چاچی، بیٹی کا گھر اجاڑنا چاہتی ہو یا اسے میرے ساتھ وزیر آباد بھیج رہی ہو؟ یہ ایسی نازک صورت حال تھی کہ چاچی رحمتے کو پسپائی اختیار کرنا پڑی اور زبیر، عابدہ کو اپنے ساتھ وزیر آباد لے گیا۔''

''زبیر کی اپنے سالے سراجا کے بارے میں کیا رائے ہے؟'' میں نے روا روی میں پوچھ لیا۔

''وہ سراجا سے نفرت کرتا ہے۔'' قدیر خان نے جواب دیا۔ ''اس کے مطابق سراجا کوئی اچھا آدمی نہیں۔ پتا نہیں کیسے کیسے الٹے سیدھے دھندے کرتا رہتا ہے۔ اس نے ڈھکے چھپے الفاظ میں اس بات کا اظہار بھی کیا ہے کہ سراجا چوری کے ڈنگر اِدھر اُدھر کرتا رہتا ہے اسی لیے وہ گھر سے دو دو تین تین دن کے لیے غائب بھی رہتا ہے۔''

''یہ سراجا جب ہتھے چڑھے گا تو اس سورما کو بھی دیکھ لیں گے۔'' میں نے ٹھہرے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''ابھی تو وہ حافظ آباد گیا ہوا ہے۔ اس کی واپسی تک ہم کرم کوٹ والے معاملے کو دیکھ لیتے ہیں۔''

''آپ کا کیا پروگرام ہے ملک صاحب؟'' اے ایس آئی سوالیہ نظر سے مجھے دیکھنے لگا۔

''میں صرف تمہاری واپسی کا انتظار کر رہا تھا۔'' میں نے جواب دیا۔ ''بس اب تھوڑی دیر میں، میں کرم کوٹ کے لیے روانہ ہو رہا ہوں۔''

''ابھی تھوڑی دیر پہلے آپ نے بتایا ہے کہ چاچی رحمتے وغیرہ سے حوالات میں پوچھ گچھ کی جائے گی۔'' وہ متذبذب نظر سے مجھے تکنے لگا۔

''ہاں......تو......؟'' میں نے الجھن زدہ انداز میں اس کی طرف دیکھا۔

''جناب! اگر انہیں تھانے میں لاکر ہی پوچھ گچھ کرنا ہے تو پھر آپ کیوں کرم کوٹ جانے کی زحمت کرتے ہیں۔'' وہ گہری سنجیدگی سے بولا۔ ''مجھے حکم کریں، میں انہیں پکڑ کر لے آتا ہوں۔''

''تم ابھی وزیر آباد سے تھکے ہوئے آئے ہو۔'' میں نے کہا۔

''ملک صاحب! نوکری کی تے تھکاوٹ کی......'' وہ بڑی سادگی سے بولا۔ ''میں بالکل فریش ہوں۔ اگر آپ

مجھے کرم کوٹ جانے کی اجازت دیں گے تو مجھے خوشی ہوگی۔''
اے ایس آئی نے لفظ ''خوشی'' اس طرح ادا کیا تھا کہ میں چونک اٹھا۔ میں نے اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے پوچھا۔ ''یہ خوشی ان لوگوں کی گرفتاری سے ہوگی یا کوئی اور معاملہ ہے قدیر خان؟''
''سمجھ لیں، کوئی اور معاملہ ہے۔'' وہ اضطراری انداز میں بولا۔
''ایسے کیسے سمجھ لوں قدیر خان۔'' میں نے کریدنے والے انداز میں کہا۔ ''جب تک تم مجھے کھل کر نہیں بتاؤ گے۔''
اس نے مجھے کھل کر بتادیا۔ قدیر خان کے مطابق اس کے گھر والوں نے کرم کوٹ کی ایک لڑکی کو اس کے لیے پسند کرلیا تھا۔ ایک آدھ ماہ میں منگنی وغیرہ بھی ہونے والی تھی۔ لڑکی والوں کو تو یہ پتا تھا کہ جس شخص سے وہ اپنی بیٹی بیاہنے جارہے ہیں، وہ پولیس میں ہے لیکن اس کے کارناموں کی دھوم ابھی ان لوگوں تک نہیں پہنچی تھی۔ قدیر خان اس گرفتاری والے معاملے کو بڑے طمطراق کے ساتھ نمٹانا چاہتا تھا تاکہ کرم کوٹ والوں کو پتا چل جائے کہ ان کا ہونے والا داماد کس پائے کا پولیس والا ہے۔
قدیر خان کی یہ خواہش پوری کرنے میں کوئی حرج نہیں تھا لہٰذا میں نے چاچی رحمتے اینڈ کمپنی کی گرفتاری کے لیے اسے دو کانسٹیبلز کی معیت میں کرم کوٹ جانے کی اجازت دے دی۔ میں نے رانا نواز کے لیے ایک رقعہ بھی قدیر خان کے ہاتھ بھیج دیا تھا۔ اس رقعے میں، میں نے نمبردار صاحب سے ایک خصوصی درخواست کی تھی جس کی روشنی میں قدیر خان کی خواہش پوری دھوم دھام سے کی جاسکتی تھی۔

☆☆☆

آٹھ نومبر کی صبح میں حسب معمول تیار ہوکر تھانے پہنچا تو ایک خوش خبری میری منتظر تھی۔ جمعہ خان نے آکر بتایا کہ حوالاتی ''تیار'' ہیں۔
حوالدار جمعہ خان نے لفظ ''تیار'' پر خصوصی زور ڈالا تھا اور حوالاتیوں سے اس کی مراد رحمتے اور اس کی بہو جمیلہ تھی۔ گزشتہ رات اے ایس آئی قدیر خان ان دونوں چال باز عورتوں کو گرفتار کرکے کرم کوٹ سے تھانے لے آیا تھا۔ میری پوچھ تاچھ پر جب انہوں نے دوبارہ چلتر بازی دکھانا شروع کی تو میں انہیں حوالدار جمعہ خان کے حوالے کرکے اپنے سرکاری کوارٹر میں آگیا تھا۔ اس حوالگی کا سیدھا سیدھا مطلب یہ تھا کہ ان عورتوں کی زبانوں کی ٹیڑھ کو سیدھا کرنا تھا اور جمعہ خان نے ابھی اسی حوالے سے خوش خبری سنائی تھی جس کا مطلب تھا، وہ دونوں سچ بولنے کے لیے تیار ہوگئی ہیں۔
''ٹھیک ہے۔'' میں نے زیرِلب مسکراتے ہوئے کہا۔ ''انہیں میرے پاس لے آؤ۔''
حوالدار مجھے سلام کرکے واپس چلا گیا۔ رات قدیر نے واپسی پر مجھے بتایا تھا کہ جب وہ دو کانسٹیبلز اور رانا نواز کے خاص بندے جاوید عرف جیدا کے ہمراہ چاچی رحمتے کے گھر پہنچا تھا تو ان دونوں عورتوں نے گرفتاری دینے سے پہلے اچھا خاصا ہنگامہ کردیا تھا۔ انہوں نے چیخ چیخ کر پورے پنڈ کو اپنے گھر کے سامنے اکٹھا کرلیا تھا کہ پولیس ان کے ساتھ زیادتی کررہی ہے۔ اس موقع پر قدیر خان نے ہیرو شپ کا مظاہرہ کرتے ہوئے بڑے رنگ ڈھنگ اور شان بان سے گاؤں والوں کو بتایا تھا کہ یہ دونوں عورتیں ایک خوب صورت نامعلوم عورت کے قتل کے حوالے سے پولیس کو مطلوب ہیں۔ گاؤں والوں میں سے اکثر لوگوں کو قدیر خان کی آئندہ حیثیت کا علم تھا لہٰذا انہوں نے قدیر خان کی حوصلہ افزائی کی تھی۔ گاؤں میں جمیلہ اور چاچی رحمتے کے حوالے سے ''لڑاکا عورتوں'' کا تصور پایا جاتا تھا خصوصاً سراجا کو اکثر کرم کوٹی اس کی حرکتوں کی وجہ سے سخت ناپسند کرتے تھے۔
تھوڑی ہی دیر کے بعد جمیلہ اور چاچی رحمتے کو میرے سامنے حاضر کردیا گیا۔ میں نے انہیں بیٹھنے کے لیے کہا اور انہیں پیش کرنے والے کانسٹیبل کو واپس جانے کا اشارہ کردیا۔ اگرچہ میں مجرموں اور قانون کی آنکھوں میں دھول جھونکنے والے افراد کو اپنے سامنے بیٹھنے کی بھی اجازت نہیں دیتا تاہم لیڈیز کے حوالے سے میں نے ہمیشہ اپنے رویے میں لچک کا مظاہرہ کیا تھا۔
میں اپنے سامنے بیٹھی ان ساس بہو کو تیز نظر سے گھور کر دیکھ ہی رہا تھا کہ جمیلہ نے برا سا منہ بناتے ہوئے کہا۔ ''تھانے دار صاحب! آپ کے لوگوں نے ہمارے ساتھ بہت زیادتی کی ہے۔''
''زیادتی'' کے لفظ اور جمیلہ کی ادائیگی پر میں بری طرح چونکا اور باری باری ان دونوں کے چہروں کے تاثرات کا جائزہ لیتے ہوئے اضطراری لہجے میں استفسار کیا۔ ''کیسی زیادتی؟''
''وہ جی......'' جمیلہ وضاحت کرتے ہوئے بولی۔ ''انہوں نے ہماری زبان کھلوانے کے لیے ہمارے ساتھ بہت برا سلوک کیا ہے۔ ہم آپ کو بتا نہیں سکتے۔''

میں نے ایک گہری اطمینان بخش سانس خارج کی اور کہا۔ ''بتائیں بتائیں، میں سن رہا ہوں۔ انہوں نے ایسا کیا کر دیا جو بیان نہیں کیا جا سکتا۔''

''آپ کا یہ مچھیل حوالدار ہمیں زبردستی پانی پینے پر مجبور کرتا رہا۔'' چاچی رحمتے نفرت بھرے انداز میں حوالدار جمعہ خان کا ذکر کرتے ہوئے بولی۔ ''ہم اس کے کہنے پر گلاس بھر بھر کر پانی پیتی رہیں۔ ہمیں پتا نہیں تھا کہ یہ مرجاناں اس کے بعد ہمارے ساتھ کیا سلوک کرنے والا ہے۔ جب پانی پی پی کر ہمارے مثانے بھر گئے تو......''

''تو کیا......؟'' میں نے بات کی تہ میں پہنچتے ہوئے پوچھا۔

''اس کے آگے تو بتا جمیلہ۔'' چاچی رحمتے عجیب سے لہجے میں بولی۔

''آگے بتانے کو رہ ہی کیا گیا ہے جی۔'' جمیلہ برہمی کا اظہار کرتے ہوئے بولی۔ ''جب ہمارے مثانے پھٹنے کو تھے اور ہمیں بہت شدت سے پیشاب کی حاجت ہو رہی تھی تو اس مردود حوالدار نے کہا کہ اگر ہم سب کچھ سچ سچ بتا دیں تو وہ ہمیں پیشاب کرنے جانے دے گا ورنہ ہم ادھر حوالات ہی میں......'' وہ بولتے بولتے رکی اور خفت بھری نظر سے مجھے دیکھنے لگی۔

''تو تم لوگوں نے زبان کھولنے کو ترجیح دی؟'' میں نے معنی خیز انداز میں مسکراتے ہوئے استفسار کیا۔

''آپ ہماری بے بسی پر ہنس رہے ہیں۔'' وہ غصے سے بولی۔ ''آپ کو شرم آنا چاہیے تھانے دار جی۔ ہم عورتیں ہیں اگر زبان نہ کھولتیں تو کیا ادھر حوالات ہی میں آپ کے مسٹنڈے حوالدار کے سامنے اپنے کپڑے خراب کر لیتیں۔''

''ہمیں نہیں پتا تھا۔ پولیس والے اتنے بے حیا ہوتے ہیں۔'' چاچی رحمتے بگڑے ہوئے لہجے میں بولی۔ ''میں تو تمہیں تھانے دار پتر، تھانے دار پتر کہتی رہی اور تمہارے حوالدار نے ہمارے ساتھ یہ سلوک کیا ہے۔''

ان دونوں عورتوں کی شکایات ایک حوالے سے درست تھیں مگر ہم پولیس والوں کی تفتیش کی بعض مجبوریاں ایسی ہوتی ہیں کہ ہمیں اختیار کرنا ہی پڑتی ہیں۔ جس شخص پر ہمیں شک ہو جاتا ہے، اس کی زبان کھلوانے کے لیے ہمیں بعض پیچیدہ، مگر تشدد اور اخلاق سے گرے ہوئے طریقے بھی اپنانا پڑتے ہیں ورنہ مجرم اتنے معصوم اور شرافت کے علمبردار نہیں ہوتے کہ ہمارے ایک سوال پر وہ دست بستہ کھڑے ہو کر اپنے جرم کا اقرار کر لیں تاہم دوسرے تھانے داروں کی بہ نسبت میں خواتین کے ساتھ قدرے نرمی کا برتاؤ

کیا کرتا تھا۔ بعض تھانے دار تو عورتوں کی زبان کھلوانے کے لیے چوہے ڈال کر ان کے پائنچے باندھنے کی دھمکی بھی دیا کرتے ہیں۔

''تمہاری شکایات پر میں مچھیل حوالدار کی کھال کھینچ لیتا اگر تم لوگوں نے میری بات کو سنجیدگی سے لیا ہوتا۔'' میں نے باری باری دونوں کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔ ''یاد ہے نا، میں نے پرسوں تمہارے گھر میں بیٹھ کر کیا کہا تھا۔ میں نے ٹھوس الفاظ میں تم دونوں پر واضح کر دیا تھا کہ اگر تمہاری کوئی بھی بات جھوٹی نکلی تو تھانے میں بند کر کے تمہارے ساتھ وہ سلوک کروں گا کہ ساری عمر یاد کروگی۔ یہ تو اچھا ہوا کہ تم لوگوں نے شرافت سے زبان کھول دی۔ ورنہ میرا حوالدار اتنا آگے جا سکتا تھا جس کا تم تصور بھی نہیں کرسکتی ہو۔''

ایک رات حوالات میں گزارنے اور خاطر مدارات کرانے کے بعد ان کی ساری ہوشیاری، چالاکی اور چلتر بازی دھواں بن کر ناک کے راستے نکل چکی تھی۔ ابھی ان میں جو اکا دکا بل نظر آرہے تھے، یہ رسّی جل جانے کے بعد کی کیفیت تھی۔ اب ان کی تن فن غائب ہو چکی تھی اور وہ خوف زدہ چہروں اور سراسیمہ نظروں سے مجھے دیکھ رہی تھیں۔

میں نے مقتولہ نامعلوم عورت کی تصویر جمیلہ کی جانب بڑھاتے ہوئے پوچھا۔ ''یہی عورت چند دن کے لیے تمہارے گھر میں ٹھہری تھی نا......؟''

''ج ج......جی۔'' وہ لکنت زدہ لہجے میں بولی۔ ''ٹھہری تھی۔''

''پھر اس روز تم دونوں نے مجھ سے جھوٹ کیوں بولا تھا؟'' میں نے سخت لہجے میں استفسار کیا۔

چاچی رحمتے نے نحیف آواز میں جواب دیا۔ ''وہ جی......بس پولیس کی پچھ پرتیت کی وجہ سے ہمیں غلط بیانی کرنا پڑی تھی۔ ہم بیٹھے بٹھائے کسی مصیبت میں نہیں پڑنا چاہتے تھے۔''

''تم لوگوں نے ایسا کون سا جرم کیا تھا جو پولیس کے سوال و جواب سے تمہیں ڈر لگ رہا تھا؟'' میں نے سخت لہجے میں دریافت کیا۔

''ہم نے کوئی جرم نہیں کیا تھانے دار جی۔'' جمیلہ منت ریز لہجے میں بولی۔ ''سراجا نے حافظ آباد جاتے ہوئے سختی سے ہمیں تاکید کی تھی کہ اگر پولیس ادھر آکر کوئی پچھ پڑتال کرے تو ہمیں اس عورت کے بارے میں کچھ نہیں بتانا۔''

''تو اس کا مطلب ہے سراجا کو اس بات کا پتا تھا کہ پولیس اس عورت کے بارے میں تفتیش کرتے ہوئے تمہارا دروازہ کھٹکھٹا سکتی ہے؟'' میں نے ٹٹولتی ہوئی نظر سے جمیلہ کو دیکھا۔

''پتا نہیں جی، اس کے ذہن میں کیا تھا۔'' وہ سادہ سے لہجے میں بولی۔ ''اس نے حافظ آباد جاتے ہوئے ہم سے جو کہا ہم نے وہی کیا تھا جی۔''

ایک لمحے کے لیے مجھے شک ہوا کہ سراجا کو اس بات کی خبر ہوگئی تھی کہ اس عورت کی لاش دریا میں سے دریافت ہو چکی ہے۔ جبھی وہ صبح ہی صبح اس دن حافظ آباد کے لیے روانہ ہوگیا تھا۔ اس خیال کی تصدیق کے لیے میں نے جمیلہ سے سوال کیا۔

''سراجا اسی دن حافظ آباد گیا ہے نا جس روز ہم تمہارے گھر آئے تھے؟''

''جی......جی......اسی صبح۔'' وہ جلدی سے بولی۔

''اور یہ بھی سچ ہے کہ سراجا ہی اس عورت کو کہیں سے لے کر آیا تھا؟'' میں نے اپنی تفتیش کو آگے بڑھاتے ہوئے پوچھا۔ ''بتاؤ وہ بدقسمت خوب صورت عورت کون تھی اور سراجا کس مقصد سے اسے کہاں سے بھگا کر لایا تھا؟'' لمحاتی توقف کر کے میں نے گہری سانس لی پھر اسے چیک کرنے کی خاطر اندھیرے میں ایک تیر چھوڑا۔

''جمیلہ! میں نے سنا ہے، سراجا اس عورت سے شادی کرنا چاہتا تھا مگر تم نے رولا ڈال دیا اور مجبوراً وہ گھر چھوڑ کر کہیں غائب ہوگئی تھی؟''

''جی، یہ بات بالکل ٹھیک ہے کہ وہ عورت سراجا ہی کے ساتھ آئی تھی۔'' جمیلہ اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے بولی۔ ''لیکن یہ بات غلط ہے کہ میں نے گھر میں کوئی رولا ڈال دیا تھا۔''

''جھوٹ کیوں بولتی ہے جمیلہ۔'' چاچی رحمتے چمک کر بولی۔ ''جو سچ ہے وہ تھانے دار کو بتا ورنہ یہ لوگ دوبارہ ہمیں پانی پلا پلا کر مار ڈالیں گے۔''

چاچی رحمتے کی بات سے یہ تو واضح ہوگیا تھا کہ جمیلہ نے جواب دیتے ہوئے کوئی گڑبڑ کردی تھی۔ میں نے کھا جانے والی نظر سے گھور کر اس تیز وطرار عورت کی طرف دیکھا پھر اس کی ساس کی جانب متوجہ ہوگیا۔

''چاچی! میں تمہاری بہو کی بات پر بھروسا نہیں کرسکتا۔'' میں نے معتدل انداز میں کہا۔ ''جو سچ ہے وہ تو اپنی زبان سے بتادے۔''

''پتر تھانے دار۔'' وہ ایک بوجھل سانس خارج کرتے ہوئے بولی۔ ''سچی بات یہ ہے کہ شکیلہ سراجا کو لالہ موسیٰ کے ریلوے اسٹیشن سے ملی تھی۔''

''شکیلہ کون؟'' میں نے چونک کر چاچی رحمتے کی طرف دیکھا۔

''وہی عورت جی جس کی وجہ سے یہ سارا پواڑا پڑا ہوا ہے۔'' چاچی رحمتے برا سامنہ بناتے ہوئے بولی۔ ''آپ کو بتایا ہے نا سراجا ڈنگروں کی خرید وفروخت کا کام کرتا ہے۔ اس لیے مختلف جگہوں پر اس کا آنا جانا رہتا ہے۔ ایک دن وہ لالہ موسیٰ کے اسٹیشن سے ٹرین میں بیٹھ کر وزیر آباد کی طرف آنے والا تھا کہ پلیٹ فارم پر شکیلہ سے اس کی ملاقات ہو گئی۔'' تھوڑی دیر کو رک کر اس نے ایک بوجھل سانس لی پھر اپنی بات کو آگے بڑھاتے ہوئے بولی۔

''سراجے کا ہر قسم کے بندوں سے ملنا جلنا رہتا ہے۔ یہ بندے کو دیکھ کر ایک نظر ہی میں پہچان جاتا ہے کہ اس کے ساتھ کس قسم کا معاملہ ہے۔ شکیلہ پر نگاہ پڑتے ہی وہ سمجھ گیا کہ یہ لڑکی گھر سے بھاگی ہوئی ہے۔ سراجے نے کسی طرح بہلا پھسلا کر شکیلہ سے اس کے دل کا حال معلوم کرلیا اور اسے اپنے ساتھ گھر لے آیا۔ بس یہ بات ہے جناب۔''

''بس اتنی سی بات نہیں ہے چاچی۔'' جمیلہ جلے کٹے انداز میں بولی۔ ''یہ ٹھیک ہے کہ شکیلہ اپنے گھر سے بھاگی ہوئی لڑکی تھی اور سراجا ہمدردی کے دو بول، بول کر اسے اپنے ساتھ لے آیا تھا مگر گھر لاتے ہی اس کی نیت خراب ہو گئی تھی اس گوری چٹی عورت پر۔''

''اے جمیلہ، بکواس نہیں کر۔'' چاچی رحمتے نے برہمی سے کہا۔ ''سراجے کی نیت کو خراب کیوں کہہ رہی ہو۔ وہ تو اس سے نکاح کرنا چاہتا تھا۔ سراجا مرد ہے اور مرد تو ایک سے زیادہ شادیاں کرتے ہی ہیں۔''

''چاچی! خدا کا خوف کرو۔'' جمیلہ نے کڑوے لہجے میں کہا۔ ''سچ یہی ہے کہ سراجا اس عورت پر اپنی نیت خراب کر چکا تھا اور اسے گھر میں ڈال کر رکھنا چاہتا تھا۔ جب میں نے شور مچایا تو وہ شادی کی باتیں کرنے لگا۔'' لمحاتی توقف کر کے اس نے ایک گہری سانس لی پھر مجھ سے مخاطب ہوتے ہوئے بولی۔

''تھانے دار جی! یہ ٹھیک ہے کہ سراجا نے میرے واویلا مچانے کے بعد دوسری شادی والی بات نکالی تھی ورنہ وہ تو اسے ایسے ہی گھر میں ڈال کر رکھنا چاہتا تھا اور یہ بھی سچ ہے کہ میں نے سراجا کی دوسری شادی والی بات پر بھی بہت کھپ ڈالی تھی اور صاف صاف کہہ دیا تھا کہ یہ شادی ہرگز نہیں ہوسکتی۔ ہم دونوں میں سے کوئی ایک اس گھر میں رہے گی۔ اگر سراجا کو اس عورت سے نکاح کرنا ہے تو مجھے فارغ کر دے۔''

''دیکھا تھانے دار پتر! اب یہ اپنے منہ سے خود ہی بتا رہی ہے۔'' چاچی رحمتے نے طنزیہ لہجے میں کہا۔ ''اسی کے کتے پن سے وہ لڑکی چپ چاپ گھر سے نکل گئی تھی۔ اس کے بعد اس بدنصیب کے ساتھ کیا ہوا، ہمیں کچھ خبر نہیں۔ صبح جب ہم سو کر اٹھے تو وہ غائب تھی۔''

''وہ میرا کتاپن نہیں تھا بلکہ حق سچ بات تھی جو سب کو کڑوی ہی لگتی ہے۔'' جمیلہ نے زہریلے لہجے میں کہا۔ ''سراجانے تو مجھے یہ طعنہ بھی دیا تھا کہ میں بانجھ ہوں۔ اس کے لیے کوئی وارث بھی پیدا نہیں کر سکتی۔ وارث...... اونہہ۔'' اس نے تحقیر آمیز انداز میں گردن کو جھٹکا دیا اور اپنی بات مکمل کرتے ہوئے بولی۔

''وارث تو وہ ایسے کہہ رہا تھا جیسے اس کی لاکھوں کروڑوں کی زمین اور جائداد ہو...... ڈنگر فروش...... ٹٹ پونجیا کہیں کا۔''

''زبان کو لگام دے جمیلہ! ورنہ میں گدی سے کھینچ کر باہر نکال دوں گی تیری اس گندی زبان کو۔'' چاچی رحمتے نے دھمکی آمیز لہجے میں کہا۔ ''میرا بیٹا دن رات محنت کرتا ہے۔ رزق حلال کما کر لاتا ہے۔ اس کے پاس زمین جائداد نہیں تو کیا ہوا، تجھ جیسی بنجر زمین کو تو اتنے عرصے سے کما کر کھلا ہی رہا ہے نا......؟''

''بنجر زمین'' کے الفاظ نے جلتی پر تیل کا کام کیا تھا۔ جمیلہ بانجھ تھی یا سراجا ناکارہ تھا، اس بحث میں پڑے بغیر جمیلہ کو اولاد پیدا نہ کرسکنے کے جرم میں بنجر زمین سمجھ لیا گیا تھا۔ کسی بھی عورت کے لیے سب سے تکلیف دہ بات یہ ہوتی ہے کہ لوگ اسے بانجھ سمجھتے ہوں اور کسی بھی مرد کے لیے سب سے زیادہ اذیت ناک صورت حال یہ ہوتی ہے کہ دوسرے اس کی مردانگی کو شک کی نظر سے دیکھیں...... لیکن ہمارے معاشرے کا ایک جیتا جاگتا المیہ یہ ہے کہ اگر شادی کے بعد دو تین سال کے اندر اولاد نہ ہو تو خصوصاً شوہر کی ماں کو اپنی بہو کے اندر بغیر کسی میڈیکل ٹیسٹ کے ہی بڑا کھلم کھلا بانجھ پن دکھائی دینے لگتا ہے اور بعض کچھ زیادہ ہی تجربہ کار مائیں تو اپنے بیٹے کے لیے دوسری اور تیسری زرخیز زمین والی لڑکی کی تلاش میں بھی اٹھ کھڑی ہوتی ہیں۔

ہمارے معاشرے میں ایسے باشعور افراد کی تعداد بہت کم ہے جو اس ایشو پر مرد اور عورت کو ترازو کے دو پلڑوں میں رکھ کر برابر تولتے ہیں۔

''کما کر کھلا رہا ہے تو مجھ پر کوئی احسان نہیں کر رہا۔''

یہ کیسے ممکن تھا کہ جمیلہ اپنی ساس کے وار پر بلبلا کر جوابی حملہ نہ کرتی۔ اس نے تپتے ہوئے لہجے میں کہا۔ ''میں بھی تو سارا دن نوکرانی بنی اس گھر میں کام کرتی رہتی ہوں اور چاچی...... تم جیسی اس کی زبان دراز ماں کو بھی برداشت کرتی ہوں۔ وہ خود تو دو دو تین تین دن کے لیے گھر سے باہر رہتا ہے۔ اس کے پیچھے بھگتنا تو مجھے ہی پڑتا ہے نا؟''

ساس اور بہو کے بیچ جنم لینے والی یہ گرما گرم بحث رفتہ رفتہ عروج کی طرف جا رہی تھی۔ جب میں نے دیکھا کہ اس سے کچھ حاصل نہیں بلکہ خوامخواہ وقت برباد ہو رہا ہے تو مداخلت ضروری جانی اور جمیلہ کی طرف دیکھتے ہوئے سخت لہجے میں کہا۔

''تم آپس میں گھر جا کر خوب جھگڑا کر لینا لیکن یہاں میرے کمرے میں بندر تماشا نہ لگاؤ۔ میں جو بھی پوچھوں، اس کا سیدھا اور کھرا جواب دو ورنہ مجبوراً مجھے دوبارہ تم دونوں کو تحصیل حوالدار کے سپرد کرنا پڑے گا۔''

وہ ساری چوکڑی بھول کر سراسیمہ نگاہوں سے مجھے دیکھنے لگیں۔ میں نے جمیلہ کو مخاطب کرتے ہوئے سخت لہجے میں پوچھا۔ ''سراجا کے مطابق شکیلہ گھر سے بھاگی ہوئی کوئی لڑکی تھی۔ وہ تین چار یا اس سے زیادہ دن تم لوگوں کے پاس رہ کر گئی ہے۔ تم نے اس سے یہ تو ضرور پوچھا ہوگا کہ وہ گھر سے کیوں بھاگی تھی اور یہ کہ...... اس کا گھر کہاں ہے؟''

''حقیقت تو سوہنا رب ہی جانتا ہے تھانے دار صاحب۔'' وہ ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولی۔ ''ہمیں تو جو سراجے نے اور جو شکیلہ نے بتایا، وہی جانتے ہیں۔''

''میں بھی وہی پوچھ رہا ہوں جو تم جانتی ہو؟'' میں نے زور دے کر کہا۔

''جی شکیلہ کے مطابق اس کا تعلق چاند نگر نامی ایک گاؤں سے تھا۔'' جمیلہ نے بتانا شروع کیا۔ ''چاند نگر لالہ موسیٰ سے دو میل مغرب میں واقع ایک چھوٹا سا گاؤں ہے۔ شکیلہ کے ماں باپ...... بلکہ اس کا باپ اس کی شادی ایک ساٹھ سالہ بڈھے سے کرانا چاہتا تھا۔ یہ رشتہ اسے بالکل پسند نہیں تھا مگر گھر میں اس کی کوئی سننے والا نہیں تھا۔ شکیلہ نے یہ بھی بتایا کہ اس کا باپ سوتیلا ہے اور اس نے کسی بڈھے زمیندار سے تگڑی رقم پکڑ لی تھی اور ہر قیمت پر وہ شکیلہ کی شادی اس بڈھے سے کرنا چاہتا تھا۔ ان حالات میں شکیلہ نے یہی مناسب سمجھا کہ وہ گھر سے بھاگ جائے۔ اللہ کوئی نہ کوئی سبب بنا ہی دے گا۔''

''اللہ نے سبب بنایا بھی تو جمیلہ تم نے اسے ٹکنے نہیں دیا۔'' چاچی رحمتے نے جمیلہ کے زخموں پر مرچ چھڑکتے ہوئے کہا۔ ''وہ بدنصیب اگر سراجے سے نکاح کر لیتی تو دونوں کی زندگی میں بہار آجاتی۔''

''دونوں کی زندگی میں۔'' جمیلہ نے نفرت بھرے لہجے میں چبا چبا کر ادا کیا۔ ''کون دونوں چاچی؟''

''میں اور شکیلہ۔'' چاچی رحمتے نے جواب دیا۔

''ہیں۔'' جمیلہ نے دیدے گھما کر اپنی ساس کی طرف دیکھا۔

جمیلہ کی طرح مجھے بھی چاچی رحمتے کی بات پر حیرت ہوئی تھی۔ میں نے رحمتے کی طرف دیکھتے ہوئے سپاٹ لہجے میں دریافت کیا۔

''وہ کیسے چاچی...... تمہاری اور شکیلہ کی زندگی میں بہار کیسے آجاتی؟''

''دیکھو نا پتر تھانے دار......'' وہ سمجھانے والے انداز میں بولی۔ ''اس بے چاری کو گھر کا سکون مل جاتا۔ سراجے سے نکاح کرنے کے بعد وہ گھر والی، خاوند والی ہو جاتی اور مجھے بڑھاپے میں گود میں پوتے پوتیاں کھلانے کی خوشی مل جاتی۔''

''کوا اس گھر کی منڈیر پر بیٹھ کر کائیں کائیں شروع کر دیتا ہے جہاں سے دھواں اٹھتا دیکھتا ہے۔'' جمیلہ نے زہر خند انداز میں اپنی ساس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ ''چاہے اس گھر کے چولہے میں ایسے ہی آگ جل رہی ہو۔''

ایک مرتبہ پھر ان میں نئے سرے سے محاذ آرائی کا سلسلہ شروع ہونے والا تھا لیکن میں نے موقع کی نزاکت کو دیکھتے ہوئے انہیں سختی سے ڈانٹا اور جمیلہ سے کہا۔ ''اب میرے ہر سوال کا جواب صرف تم دوگی اور چاچی تم......'' میں نے روئے سخن چاچی رحمتے کی طرف پھیرتے ہوئے تنبیہی انداز میں کہا۔ ''تم بالکل خاموش بیٹھو گی۔ ہمارے بیچ اگر تم نے بولنے کی کوشش کی تو پھر مجھ سے برا کوئی نہیں ہوگا۔ سمجھ گئی نا؟''

''تھانے دار پتر...... میں سمجھ گئی۔'' وہ برا سا منہ بناتے ہوئے بولی۔

''جمیلہ! جب تمہارا خاوند شکیلہ کو اپنے ساتھ گھر لے کر آیا تو اس کے پاس کوئی سامان وغیرہ بھی تھا؟'' میں نے گہری سنجیدگی سے پوچھا۔

''جی ایک چھوٹی سی پوٹلی تھی اس کے پاس۔'' وہ اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے بولی۔

میں نے استفسار کیا۔''اس پوٹلی میں کیا تھا؟''

''دو جوڑے کپڑوں کے تھے۔'' جمیلہ نے جواب دیا۔''اور زنانہ استعمال کی چھوٹی موٹی چیزیں تھیں۔''

''اور کوئی زیور وغیرہ......؟''

''جی نہیں۔'' اس نے نفی میں گردن ہلائی۔''بس کانوں میں سونے کی بالیاں تھیں۔''

پانچ نومبر کی صبح دریا سے جو لاش برآمد کی گئی تھی، اس عورت کے کانوں میں بالیاں موجود نہیں تھیں۔ زیورات تو رہ گئے ایک طرف، اس بدقسمت عورت کے تو بدن پر بھی لباس نام کی کوئی چیز موجود نہیں تھی۔ بہرحال اس تفتیش کے دوران میں دو اچھے کام یہ ہوئے تھے کہ ایک تو اس نامعلوم مقتولہ عورت کا نام معلوم ہو گیا تھا، دوسرے یہ پتا چل گیا تھا کہ وہ موضع چاند نگر کی رہنے والی تھی۔ اب میں بہ آسانی اس کے ورثاء سے رابطہ کر سکتا تھا لیکن اس عورت کے ساتھ ہونے والی مبینہ زیادتی کے ذمے داروں کو تلاش کر کے انہیں کیفر کردار تک پہنچانا ابھی باقی تھا۔ جب تک اس کے قاتل کی گردن میری گرفت میں نہ آ جاتی، میں سکون سے نہیں بیٹھ سکتا تھا۔

میں مزید دس منٹ تک گھما پھرا کر جمیلہ سے مختلف سوالات کرتا رہا مگر مجھے اندازہ ہو گیا کہ وہ جتنا کچھ بتا چکی تھی، اس سے زیادہ نہیں جانتی تھی۔ میں نے ان دونوں ساس بہو کو دوبارہ حوالات میں بند کر دیا اور اے ایس آئی قدیر خان کو اپنے پاس بلا لیا۔

''حکم ملک صاحب۔'' قدیر خان میرے سامنے بیٹھتے ہوئے بولا۔

میں نے مختصر الفاظ میں اسے تازہ ترین صورت حال سے آگاہ کیا اور کہا۔''نامعلوم مقتولہ عورت کا پتا ٹھکانا اور نام معلوم ہو گیا ہے۔ اب اس کے ورثاء کو اطلاع دینے کا وقت آ گیا ہے۔ اس کی لاش آخر کب تک اسپتال کے سرد خانے میں پڑی رہے گی۔''

''اگر آپ کی اجازت ہو تو میں ابھی چاند نگر روانہ ہو جاتا ہوں۔'' وہ گہری سنجیدگی سے بولا۔''چاند نگر ایک چھوٹا سا گاؤں ہے۔ شکیلہ کے ماں باپ کو ڈھونڈنا مشکل ثابت نہیں ہو گا۔''

''میں نے تمہیں اسی لیے بلایا ہے۔'' میں نے کہا۔''تم ابھی نکل جاؤ اور شام سے پہلے واپس آنا ہے۔''

''ٹھیک ہے جناب۔'' وہ فرماں برداری سے بولا۔''اور کوئی حکم ملک صاحب؟''

میں نے ایک فوری خیال کے تحت پوچھ لیا۔''کل رات کو تم کرم کوٹ گئے تھے، کیا تم نے رانا نواز کو میرا پیغام پہنچا دیا تھا؟''

''جی ملک صاحب۔'' وہ اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔''اور نمبردار صاحب نے اسی وقت میرے سامنے ہی اپنے خاص ملازم کو ضروری ہدایات بھی دے دی تھیں۔''

''بس تو پھر ٹھیک ہے۔'' میں نے مطمئن انداز میں کہا۔

قدیر خان کو رخصت کرنے کے بعد میں سراج دین عرف سراجا کے بارے میں سوچنے لگا۔ اس شخص کا کردار مجھے شک میں مبتلا کر رہا تھا۔ چاچی رحمتے کے مطابق وہ مال مویشی کی خرید و فروخت کا کام کرتا تھا جس کے لیے اسے گاؤں گاؤں قصبہ قصبہ گھومنا پڑتا تھا۔ جیدا کے مطابق سراجا ڈنگر چوری کے کام میں بھی ملوث تھا۔ وہ کرم کوٹ میں تو ایسی حرکت نہیں کرتا تھا۔ البتہ وہ ایک گاؤں سے مال مویشی چرا کر دوسرے گاؤں میں فروخت کر دیتا تھا۔ میں نے گزشتہ روز قدیر خان کے ہاتھ رانا نواز کے لیے یہ پیغام بھجوایا تھا کہ وہ کسی سے کہہ کر سراجا کی نگرانی کا بندوبست کر دے تاکہ وہ جیسے ہی کرم کوٹ میں قدم رکھے، اسے پکڑ کر میرے سامنے حاضر کر دیا جائے۔ ابھی میں نے قدیر خان سے اسی بابت پوچھا تھا۔

سراجا ویسے ہی اس کیس کا ایک اہم کردار تھا۔ مقتولہ شکیلہ اسی کی دریافت تھی اور وہ عین اسی روز صبح کرم کوٹ سے غائب ہو گیا تھا جب دریا میں سے شکیلہ کی لاش برآمد ہوئی تھی اور جاتے ہوئے وہ اپنی ماں اور بیوی کو بھی یہ ہدایت کر گیا تھا کہ اگر پولیس ان سے شکیلہ کے بارے میں کوئی سوال کرے تو وہ اپنی لاعلمی کا اظہار کریں۔ سراجا کی اس ہدایت نما احتیاط سے ظاہر ہوتا تھا کہ اسے اپنے گھر پر پولیس کی آمد کا خدشہ نہیں بلکہ یقین تھا......مگر کیوں......؟

اس ''کیوں'' کا ایک سیدھا سیدھا جواب تو یہی تھا کہ اس کے دل میں کسی قسم کا چور چھپا ہوا تھا۔ اگر اسے یقین

تھا کہ پولیس شکیلہ کی ذات کے حوالے سے اس کے گھر آکر پوچھ تاچھ کرسکتی ہے تو اس کا مطلب یہی تھا کہ... وہ شکیلہ کو پیش آنے والے اندوہناک واقعے میں ملوث تھا۔

☆☆☆

میں عصر کی نماز کے بعد تھانے میں بیٹھا قدیر خان کی واپسی کا انتظار کر رہا تھا کہ ایک کانسٹیبل نے کمرے میں آکر جیدا کی آمد کی اطلاع دی۔ رانا نواز کے خاص آدمی کی آمد کی اطلاع پر میں چونک اٹھا اور بے ساختہ میرے منہ سے نکلا۔

''جیدا اکیلا ہی ہے یا اپنے ساتھ کسی لفنڈر کو بھی لے کر آیا ہے؟''

''لفنڈر......؟'' کانسٹیبل نے الجھن زدہ نظر سے مجھے دیکھا۔

مجھے یہ اندازہ لگانے میں چنداں کوئی مشکل پیش نہیں آئی کہ وہ لفنڈر کے مفہوم تک نہیں پہنچ سکا تھا۔ میں نے وضاحت کرتے ہوئے کہا۔

''کیا جیدا کے ساتھ کوئی ایسا بندہ بھی آیا ہے جو اپنے حلیے اور وضع قطع سے چوراچکا یا اٹھائی گیرا لگتا ہو؟''

''جی ہاں......'' کانسٹیبل اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔ ''ایک ایسا بندہ ہے تو اس کے ساتھ۔''

''ٹھیک ہے، ان دونوں کو میرے پاس لے آؤ۔'' میں نے تحکمانہ انداز میں کہا۔

ابھی میں نے کانسٹیبل کے سامنے جس لفنڈر یعنی لفنگے اور آوارہ شخص کا ذکر کیا تھا، اس سے میری مراد جمیلہ کا گھر والا یعنی ڈنگر فروش سراج دین عرف سراجا تھی پھر جب جیدا میرے کمرے میں داخل ہوا تو میری مراد برآئی۔ جیدا نے مجھے سلام کرنے کے بعد مسرت آمیز انداز میں بتایا۔

''تھانے دار صاحب! یہ سراجا ہے چاچی رحمتے کا بیٹا۔''

میں نے سرتاپا سراجے کا جائزہ لیا۔ وہ عام سی شکل و صورت اور کنگ سائز ہاتھ پاؤں کا مالک ایک دبلا پتلا اور دراز قامت شخص تھا۔ رنگت سانولی اور سر کے بال گھنگرالے تھے۔ اسے دیکھ کر میرے ذہن میں اس کے لیے ''خرکار'' کا لفظ چمکا تھا۔ مجھے اس بات پر شدید حیرت ہوئی کہ شکیلہ جیسی خوب صورت اور دل کش لڑکی اس کی باتوں میں آکر لالہ موسیٰ کے ریلوے اسٹیشن سے کرم کوٹ تک کیسے چلی آئی تھی۔ مجھے سراجا کی بیان کردہ اسٹوری کے پیچھے بھی کوئی اور ہی سنسنی خیز ڈراما چھپا نظر آرہا تھا۔

''بیٹھ جاؤ۔'' میں نے سرسری انداز میں کہا۔

جیدا میری میز کے سامنے بچھی دو کرسیوں میں سے ایک کو کھینچ کر بیٹھ گیا۔ جب سراجے نے جیدا کی دیکھا دیکھی دوسری کرسی کی جانب ہاتھ بڑھایا تو میں نے سخت لہجے میں کہا۔

''تم سیدھے کھڑے رہو۔''

وہ شکایتی نظر سے مجھے دیکھتے ہوئے بولا۔ ''تھانے دار جی......ساری زیادتیاں میرے ساتھ ہی کیوں جناب!''

''اوئے زیادتی کے گھوڑے۔'' میں نے تیز نظر سے گھور کر اسے دیکھا۔ ''ہم نے تمہاری کتنی بھینسیں اور بکریاں چوری کی ہیں جو شکوہ کر رہے ہو؟''

''جناب! یہ زیادتی کیا کم ہے کہ آپ نے پچھلی رات سے میری بوڑھی ماں اور جوان بیوی کو تھانے میں بند کر رکھا ہے۔'' وہ نیم احتجاجی انداز میں بولا۔ ''آخر ان کا قصور کیا ہے؟''

''ان دونوں کا قصور تم ہو سراجے۔'' میں نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا۔

''اگر تم چاچی رحمتے کے بیٹے اور جمیلہ کے گھر والے نہ ہوتے تو انہیں پچھلی رات حوالات میں نہ گزارنا پڑتی۔ یہ سب تمہاری وجہ سے ہوا ہے۔''

''مم......میری وجہ سے۔'' وہ حیرت اور الجھن کی اداکاری کرتے ہوئے بولا۔ ''مگر میں نے کیا کیا ہے؟''

''تم نے کیا کیا ہے۔'' میں نے نفرت آمیز انداز میں اسی کے الفاظ دہراتے ہوئے کہا۔

''تم نے جو کچھ بھی کیا ہے، اس کا پچاس فیصد جمیلہ اور چاچی رحمتے نے مجھے بتادیا ہے اور باقی کا پچاس فی صد تم بتاؤ گے۔ اب یہ تمہاری مرضی ہے کہ لات جوتا کھانے کے بعد زبان کھولو یا چپ چاپ شرافت سے بتادو۔'' بات ختم کرتے ہی میں نے بہ آواز بلند پکارا۔

''رحیم......اوئے رحیمے۔''

اگلے لمحے رحیم نامی کانسٹیبل میرے سامنے حاضر ہو گیا۔ وہ سیلیوٹ مارنے کے بعد فدویانہ لہجے میں بولا۔

''جی ملک صاحب؟''

''حوالدار جمعہ خان سے کہو کہ دونوں عورتوں کو حوالات سے نکال کر برآمدے میں بٹھادے۔'' میں نے تحکمانہ انداز میں کہا۔ ''انہوں نے سراجے کے کالے کرتوتوں کی بہت سزا بھگت لی۔ اب اس سرکاری لم ڈھینگ کی باری ہے۔''

کانسٹیبل ''اوکے سر'' کہتے ہوئے کمرے سے نکل گیا۔
پھر میں نے سراجے کی طرف دیکھتے ہوئے کڑے لہجے میں استفسار کیا۔ ''ہاں بھئی مامے خان۔ دو تین دن سے کہاں سیر سپاٹے کرنے نکلے ہوئے تھے؟''
''وہ جی...... میں حافظ آباد گیا ہوا تھا۔'' اس نے جواب دیا۔
''حافظ آباد میں کون ہے تیرا؟'' میں نے درشت انداز اختیار کرتے ہوئے پوچھا۔ ''کون سے مامے سے ملاقات کرنے گیا تھا؟''
''میں کاروبار کے سلسلے میں ادھر گیا تھا جناب۔'' وہ معتدل انداز میں بولا۔
اس کے چہرے کے تاثرات سے بہ خوبی اندازہ ہوتا تھا کہ وہ اس وقت خود کو کسی مصیبت میں گھرا ہوا محسوس کر رہا ہے تاہم ڈھیٹ ہڈی اور موٹی کھال کا ہونے کے باعث وہ میرے سوالات کے سامنے ڈٹا ہوا تھا۔
''ایسا کون سا کاروبار ہے جس کے لیے تین دن سے تم حافظ آباد میں گھسے ہوئے تھے؟'' میں نے چبھتے ہوئے لہجے میں دریافت کیا۔
''جی...... میں ڈنگروں کی خرید و فروخت کرتا ہوں۔'' وہ مسکین سی صورت بنا کر بولا۔ ''اس سلسلے میں مجھے گاؤں گاؤں، بستی بستی گھومنا پڑتا ہے۔ میں حافظ آباد، وزیر آباد، گجرات، لالہ موسیٰ، کھاریاں تک جاتا ہوں جی اور آلے دوالے کے سارے پنڈ بھی میرے لیے کوئی اجنبی نہیں ہیں۔''
''جانوروں کا کاروبار کرتے کرتے تم خود بھی جانور بن گئے ہو۔'' میں نے طنزیہ لہجے میں کہا۔ ''اسی لیے ایک چھوٹی سی بات تمہاری عقل میں نہیں آئی؟''
وہ حیرت بھری نظر سے مجھے دیکھنے لگا اور بولا۔
''کون سی بات جناب عالی!''
''اچھا اب یہ بھی میں بتاؤں تمہیں۔'' میں نے گھور کر اسے دیکھا اور پوچھا۔ ''اس اپنی بہن شکیلہ کو لالہ موسیٰ کے ریلوے اسٹیشن سے تم ہی اپنے ساتھ لے کر کرم کوٹ آئے تھے نا؟''
''جی...... جی ہاں۔'' وہ اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔ ''مجھے پتا چلا ہے اس عورت نے دریا میں چھلانگ لگا کر خودکشی کر لی ہے۔''
''زیادہ ہوشیاری دکھانے کی کوشش نہیں کرو سراجے۔'' میں نے خونخوار لہجے میں کہا۔ ''شکیلہ نے خودکشی نہیں کی بلکہ اسے باقاعدہ قتل کیا گیا ہے اور وہ بھی اس طریقے سے کہ اس کی روح بھی کانپ اٹھی ہوگی۔ اگر تم نے سچ سچ نہیں بتایا کہ اس بدنصیب کا قاتل کون ہے تو میں تمہاری کھال کھینچ کر بھوکے شکاری کتوں کو تم پر چھوڑ دوں گا۔ پھر تمہارا جو بھی حشر ہو۔''
وہ تھر تھر کانپنے لگا اور منت ریز لہجے میں بولا۔ ''میں اس کے بارے میں کچھ نہیں جانتا جناب۔ مجھے نہیں پتا اسے کس نے قتل کیا ہے۔''
''تمہارے تو اچھے بھی بتائیں گے۔'' میں نے دھمکی آمیز انداز میں کہا۔ ''تمہاری جان ایک ہی صورت میں چھوٹ سکتی ہے اور وہ ہے...... سچ!''
''آپ میری بات کا یقین کریں جناب۔'' وہ دونوں ہاتھ جوڑتے ہوئے بولا۔ ''آپ کہیں تو میں بڑی سے بڑی قسم کھانے کو تیار ہوں۔ میں نہیں جانتا شکیلہ کے ساتھ کیا واقعہ پیش آیا ہے۔''
''شکیلہ کو تو جانتے ہو نا؟'' میں نے اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے طنزیہ لہجے میں پوچھا۔ ''یا اس حقیقت سے بھی انکار کرو گے؟''
وہ تھوک نگلتے ہوئے بولا۔ ''بس جی اس کے بارے میں، میں اتنا ہی جانتا ہوں کہ اس کا سوتیلا باپ کسی بڈھے سے تگڑی رقم پکڑ کر اس سے شکیلہ کی شادی کرنا چاہتا تھا۔ وہ اپنے باپ کی عمر سے بھی زیادہ کے بندے سے شادی کے لیے ہرگز تیار نہیں تھی اس لیے مجبوراً اسے گھر سے بھاگنا پڑا۔''
''اس نے تمہیں جو اسٹوری سنائی، تم نے یقین کر لیا؟''
''جی...... وہ مجھ سے جھوٹ کیوں بولے گی۔'' وہ سادگی سے بولا۔
''تمہیں اس نے بتایا تھا نا کہ وہ لالہ موسیٰ کے ایک نواحی گاؤں چاند نگر کی رہنے والی ہے جو لالہ موسیٰ سے صرف دو میل کے فاصلے پر مغربی سمت میں واقع ہے؟'' میں نے بدستور اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے سخت لہجے میں استفسار کیا۔
وہ اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے بولا۔ ''جی...... جی ہاں۔''
''اور تم ڈنگروں کی خرید و فروخت کے سلسلے میں اکثر گجرات، لالہ موسیٰ اور کھاریاں کے آلے دوالے کے گاؤں کے چکر بھی لگاتے رہتے ہو۔'' میں نے کہا۔ ''ابھی

تھوڑی دیر پہلے تم نے مجھے یہی بتایا ہے نا؟''
اس نے ایک مرتبہ پھر اثبات میں گردن ہلا دی۔
میں نے چبھتے ہوئے لہجے میں پوچھا۔ ''جب تمہیں پتا چلا تھا کہ شکیلہ گھر سے بھاگی ہوئی ایک لڑکی ہے اور لالہ موسیٰ کے ریلوے اسٹیشن سے صرف دو میل کے فاصلے پر اس کا گاؤں چاند نگر واقع ہے تو تم اسے اس کے گھر پہنچانے کیوں نہیں چلے گئے؟''
''جناب! میں نے آپ کو بتایا تو ہے کہ وہ کن حالات میں گھر چھوڑنے پر مجبور ہوئی تھی۔'' وہ وضاحت کرتے ہوئے بولا۔ ''اگر میں واپس اسے چاند نگر پہنچا دیتا تو اس کا سوتیلا ظالم باپ بڈھے کھوسٹ سے اس کی شادی کر دیتا۔''
''تو کر دیتا۔'' میں نے بے پروائی سے کہا۔ ''تم کیا اس کے چاچے یا مامے لگے ہوئے تھے؟''
''جناب! میں تو انسانی ہمدردی کے باعث شکیلہ کو کرم کوٹ لے آیا تھا۔'' وہ قدرے مضبوط لہجے میں بولا۔ ''مجھے اس غریبنی پر بڑا ترس آیا تھا۔''
''غریبنی پر بڑا ترس آیا تھا۔'' میں نے طنزیہ انداز میں اسی کے الفاظ دہرا دیے۔ ''جیسے خود تو تم کسی گاؤں کے چودھری لگے ہوئے ہونا، ہیں؟''
میرے اس تیکھے استفسار پر اس نے کوئی جواب نہیں دیا۔
میں نے پوچھا۔ ''تم انسانی ہمدردی کے ناتے شکیلہ کو اپنے گھر لے آئے تھے یا اس گوری چٹی اور دل کش لڑکی پر تمہاری نیت خراب ہو گئی تھی؟'' لمحاتی توقف کرکے میں نے ایک گہری سانس لی پھر اپنی بات مکمل کرتے ہوئے پوچھا۔
''کیا یہ درست نہیں کہ تم شکیلہ کو اپنی دوسری بیوی بنانے کی نیت سے گھر لے آئے تھے؟''
''جی...... یہ بالکل درست ہے۔'' وہ نگاہ چراتے ہوئے بولا۔ ''وہ مجھے بہت اچھی لگی تھی۔ میں نے یہی سوچا تھا کہ اسے گھر میں لے جا کر شادی کر لوں گا لیکن یہ بات میں نے اسے لالہ موسیٰ کے ریلوے اسٹیشن پر نہیں بتائی تھی اور گھر میں جب میں نے یہ ذکر نکالا تو جمیلہ نے ایک طوفان کھڑا کر دیا اور......''
''اس طوفان کی کہانی میں جمیلہ کی زبانی پوری تفصیل سے سن چکا ہوں۔'' میں نے اس کی بات پوری ہونے سے پہلے ہی کہہ دیا۔ ''تم تو شکیلہ کی خاطر جمیلہ کو فارغ کرنے پر بھی تل گئے تھے۔ میں غلط تو نہیں کہہ رہا نا؟''
''نہیں جی، آپ بالکل ٹھیک کہہ رہے ہیں۔'' وہ میری بات کی تائید کرتے ہوئے بولا۔ ''میں شکیلہ کو اپنے نکاح میں لا رہا تھا۔ دوسری شادی کرنا کوئی جرم تو نہیں جناب۔''
''دوسری شادی کرنا یقیناً کوئی جرم نہیں مگر گھر سے بھاگی ہوئی کسی لڑکی کو اپنے گھر میں پناہ دینا یقیناً ایک سنگین جرم ہے۔'' میں نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا۔
''خاص طور پر اس صورت میں کہ تمہیں اس کے گھر کا پتا ٹھکانا بھی معلوم تھا۔ تمہیں پہلی فرصت میں شکیلہ کو اس کے گھر پہنچانا چاہیے تھا لیکن اس خوب صورت جوان لڑکی کو دیکھ کر تو تمہارے ہوش ٹھکانے نہیں رہے تھے بلکہ تمہاری نیت کے دانت نکل آئے تھے۔''
''بس جی غلطی ہو گئی۔'' وہ رونی صورت بنا کر بولا۔
''غلطی ہوئی ہے تو اب اسے بھگتنا بھی پڑے گا بچو......'' میں نے اس کے چہرے پر نگاہ جماتے ہوئے کہا۔ ''اس بدنصیب کی آبرو کو تار تار کرتے ہوئے موت کے گھاٹ اتارا گیا ہے۔ میں جب تک اس کی عزت کے لٹیرے اور اس کے سفاک قاتل کو عبرت ناک سزا نہیں دلوا دوں گا، مجھے چین نہیں آئے گا اور تم...... تم مجھے اس درندے تک پہنچاؤ گے جس نے شکیلہ کا حشر نشر کیا ہے۔''
''م...... میں نے کچھ نہیں کیا جناب۔'' وہ عاجزی سے بولا۔ ''شکیلہ کی موت میں میرا کوئی ہاتھ نہیں۔''
''اس کی موت میں تمہارا کوئی ہاتھ ہے یا پاؤں، اس کا پتا آج ہی چل جائے گا۔'' میں نے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے کہا۔ ''میں نے شکیلہ کے وارثوں کو بلانے کے لیے اپنا ایک بندہ ادھر چاند نگر روانہ کیا ہوا ہے۔ بس وہ تھوڑی دیر میں واپس آنے ہی والا ہے۔ پھر دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی الگ ہو جائے گا۔ تمہاری بھلائی اسی میں ہے کہ سچ سچ بتاؤ شکیلہ کی بربادی کا ذمے دار کون ہے؟ یہ تو میں مان ہی نہیں سکتا کہ تمہیں کچھ خبر نہ ہو۔''
''جناب! آپ مجھ سے بڑی سے بڑی قسم لے لیں مگر میری بات کا یقین کر لیں۔'' وہ منت ریز لہجے میں بولا۔ ''مجھے تو یہ بھی پتا نہیں، شکیلہ کب میرے گھر سے غائب ہو گئی۔ جب صبح میں سو کر اٹھا تو پتا چلا، وہ گھر میں نہیں ہے۔''
''جس خوب صورت لڑکی سے تم شادی کے خواب دیکھ رہے تھے، وہ چپ چاپ گھر سے نکل گئی اور تمہیں خبر ہی نہیں ہوئی؟'' میں نے تیز نظر سے اسے گھورا۔ ''کیا تم نے

مجھے اتنا ہی بے وقوف سمجھ رکھا ہے کہ جو بھی کہانی سناؤ گے میں فوراً یقین کرلوں گا۔ سچ بولنے کے لیے تیار ہو یا میں تمہیں حوالدار جمعہ خان کے حوالے کروں؟''

''تھانے دار صاحب! میں بالکل بے قصور ہوں۔'' وہ بھرائی ہوئی آواز میں بولا۔

''تم کسی بھی زاویے سے بے قصور نہیں ہو۔'' میں نے سخت لہجے میں کہا۔ ''مجھے پتا چلا ہے تم ڈنگروں کی خرید و فروخت کے بہانے لوگوں کے مال مویشی چرانے کا دھندا بھی کرتے ہو۔''

اس کے چہرے پر ایک رنگ سا آکر گزر گیا۔ وہ گڑبڑائے ہوئے لہجے میں بولا۔ ''کسی نے آپ کو میرے خلاف بھڑکانے کی کوشش کی ہے...... م...... میں نے...... کسی کے ڈنگر نہیں چرائے۔''

اس کی زبان انکار کررہی تھی مگر آنکھوں اور چہرے کے تاثرات اس کی زبان کا ساتھ نہیں دے رہے تھے۔ یہ بات تو طے ہوگئی کہ وہ مال مویشی کی چوری میں گھٹنے گھٹنے دھنسا ہوا تھا۔ میں نے موقع غنیمت جانتے ہوئے ایک فوری خیال کے تحت کہا۔

''ڈنگروں کی چوری تو کوئی خاص بات نہیں ہے سراجے۔ مجھے تو تمہارے ایک اور سنگین جرم کا بھی سراغ ملا ہے۔''

وہ منہ سے کچھ نہیں بولا۔ سراسیمہ نظر سے مجھے دیکھتا چلا گیا۔

میں نے ''سو سنار کی اور ایک لوہار کی'' والے فارمولے پر عمل کرتے ہوئے سنسنی خیز انداز میں کہا۔ ''سراجا! کیا یہ سچ ہے کہ تم عورتوں کے بیوپار میں بھی ملوث ہو۔ ایک علاقے کی عورتوں کو مختلف بہانوں سے بہلا پھسلا کر تم اپنے ساتھ لے آتے ہو اور پھر دوسرے علاقے میں لے جاکر فروخت کردیتے ہو؟''

اس کے چہرے اور آنکھوں میں بے پناہ خوف امڈ آیا۔ مجھے یوں محسوس ہوا کہ وہ ابھی چکرا کر زمیں بوس ہو جائے گا۔ اگلے ہی لمحے میرے احساس نے عملی شکل اختیار کرلی۔

☆☆☆

بعض اوقات اندھیرے میں چھوڑا ہوا تیر اس طرح نشانے پر جاکر بیٹھتا ہے کہ آپ کو اپنی کارکردگی پر یقین ہی نہیں آتا۔ سراجا کے معاملے میں میرے ساتھ بھی کچھ ایسا ہی ہوا تھا۔ میرے چبھتے ہوئے تیز سوال کے جواب میں وہ تیورا کر کمرے کے فرش پر جا گرا تھا۔ یہ اس کی شکست کا بین ثبوت تھا۔ میں نے اسے حوالدار کے حوالے کردیا تھا۔

جمعہ خان کو سراجا پر زیادہ محنت نہیں کرنا پڑی تھی۔ اگلی صبح میں حسب معمول تھانے پہنچا تو اس کیس کے آخری اور مرکزی کردار کا سراغ بھی مل گیا تھا۔ میرا یہ اندازہ بالکل درست ثابت ہوا تھا کہ سراجا ڈنگروں کے کاروبار کے علاوہ عورتوں کی خرید و فروخت میں بھی ملوث تھا۔ اس نے اقبال جرم کرتے ہوئے بتایا۔

''جناب! یہ سچ ہے کہ مویشیوں کے کاروبار میں زیادہ بچت نہیں ہے اس لیے آوارہ گھومتے پھرتے مویشیوں کو بھی چھپر کرنا پڑ جاتا ہے۔ مجھے جو بھی لاوارث جانور نظر آتا ہے، اسے بھی گھیر کر اپنے ریوڑ میں شامل کرلیتا ہوں۔''

''صرف جانوروں تک محدود نہیں ہو تم۔'' میں نے اسے گھورا۔ ''شکیلہ کی طرح گھر سے بھاگی ہوئی کوئی لڑکی تمہارے ہتھے چڑھ جائے تو تم اسے بھی ایک قیمتی جانور سمجھ کر اپنے قابو میں کرلیتے ہو اور پھر مہنگے داموں کسی قدردان کے حوالے کردیتے ہو۔ یہی بات ہے نا؟''

''جی یہی بات ہے۔'' وہ عجیب سی بے غیرتی سے بولا۔ ''لیکن شکیلہ کے معاملے میں میری نیت صاف تھی۔ میں اس سے باقاعدہ شادی کرنا چاہتا تھا۔ خدا برا کرے صفدر کا۔ اس کی وجہ سے سارا کام خراب ہوگیا۔'' بات ختم کرکے اس نے گردن جھکادی۔

''یہ صفدر کون ہے؟'' میں نے سرسراتے ہوئے لہجے میں سوال کیا۔ ''اور اس نے کس طرح تمہارا کام خراب کردیا تھا؟''

''صفدر، چودھری افتخار کا خاص بندہ ہے جی۔'' اس نے بتایا۔ ''صفدر کو پتا چل گیا تھا کہ میرے پاس ایک بہت ہی خوب صورت عورت آئی ہے۔ اس نے جاکر چودھری افتخار کو بتادیا۔ چودھری افتخار بہت ہی عیاش اور پہنچ والا بندہ ہے جی۔ اس نے مجھے اپنی حویلی بلایا اور شکیلہ کو اس کے حوالے کرنے کو کہا۔ میں نے چودھری افتخار کو سچ بتادیا کہ میں شکیلہ سے شادی کرنا چاہتا ہوں۔ وہ ڈھٹائی سے بولا کہ شادی تم دو تین دن بعد بھی کرسکتے ہو۔ ابھی تم شکیلہ کو ایک دو دن کے لیے میرے حوالے کردو۔ تھانے دار صاحب! میں چودھری افتخار کے سامنے مجبور ہوگیا تھا۔''

''اوہ......'' میں نے ایک گہری سانس خارج کی اور کہا۔ ''تم اسی چودھری افتخار کی بات کررہے ہو نا جو نور پور کا

چودھری ہے؟''

موضع نور پور میرے علاقے سے زیریں سمت، دو میل کے فاصلے پر واقع تھا۔ یعنی وہ دریا کے بہاؤ کی جانب مغرب میں واقع تھا۔ چودھری افتخار کی عیاشی، بدمعاشی اور ظلم و جبر کی میں نے بہت سی داستانیں سن رکھی تھیں لیکن ابھی تک اس پر براہِ راست ہاتھ ڈالنے کا مجھے موقع نہیں مل سکا تھا۔

''جی...... میں اسی چودھری افتخار کی بات کررہا ہوں۔'' سراجا نے اثبات میں گردن ہلاتے ہوئے جواب دیا۔ ''چودھری نے مجھے دھمکی دی تھی کہ اگر میں نے ایک دو دن کے لیے شکیلہ کو اس کے حوالے نہ کیا تو وہ ہم دونوں کے ٹکڑے کرکے چیل کوؤں کو کھلا دے گا۔ چودھری بہت ہی ظالم انسان ہے جناب۔ میں شکیلہ کو اس کے حوالے کرنے پر مجبور ہوگیا تھا۔ مجھے کیا پتا تھا کہ وہ ہوس کے نشے میں ایسا درندہ بن جائے گا کہ شکیلہ اس کی بربریت کا نشانہ بن کر موت کے منہ میں چلی جائے گی۔'' اس کی آواز میں نمی اتر آئی۔ وہ بھرائے ہوئے لہجے میں بولا۔ ''جناب! شکیلہ کی موت کا مجھے بھی بہت دکھ ہے مگر میں اس سلسلے میں چودھری کا کچھ نہیں بگاڑ سکتا۔''

''میں بگاڑوں گا چودھری کا......'' میں نے بڑے عزم سے کہا۔ ''میں اس کا سب کچھ بگاڑ کر رکھ دوں گا۔''

سراجا کو میں نے دوبارہ حوالات میں بند کردیا۔ اس کے ہاتھ اتنے بھی صاف نہیں تھے کہ میں اقبالِ جرم کے بعد اسے گھر جانے کی اجازت دے دیتا۔ اس نے ڈنگروں کی چوری چکاری کے علاوہ لڑکیوں کی خرید و فروخت کا بھی اقرار کرلیا تھا جو کہ ایک سنگین جرم تھا۔ میں سراجا کو آسانی سے نہیں چھوڑ سکتا تھا۔ اس کی گواہی سے تو میں چودھری افتخار کی ایسی کم تیسی کرنے والا تھا۔

اسی روز دوپہر سے پہلے میں نے چودھری افتخار کو گرفتار کرکے حوالات میں بند کردیا۔ اس نے سارا الزام اپنے ملازم صفدر پر ڈال دیا۔ میں نے صفدر کو بھی شاملِ تفتیش کرلیا۔ اس تفتیش کے دوران میں چودھری پہلے تو مجھے خطرناک نتائج کی دھمکیاں دیتا رہا۔ جب اس نے دیکھا کہ میں اس کی دھمکیوں سے مرعوب نہیں ہورہا تو وہ منت سماجت پر اتر آیا اور میری خدمت شدمت کا خیال ظاہر کیا۔ جب وہ مجھے ایک بھاری رقم رشوت میں دینے کی پیشکش کررہا تھا تو اس لمحے میرے تصور میں مظلوم مقتولہ شکیلہ کا اذیت سے بھرا ہوا چہرہ گھوم گیا۔ میں اس رونگٹے کھڑے کردینے والے منظر کو کبھی نہیں بھول سکتا تھا۔

میں نے طیش میں آکر چودھری افتخار کو لاتوں مکوں پر رکھ لیا اور حوالات کے اندر ہی اس کی وہ دھلائی کرڈالی کہ جس کا اس نے کبھی تصور بھی نہیں کیا ہوگا۔

آئندہ روز میں نے اس کیس کا چالان تیار کرکے چودھری افتخار کو عدالت کے حوالے کردیا۔ سراجا نے اس کے خلاف وعدہ معاف گواہ بننے کا ارادہ ظاہر کیا تو میں نے اس کی بات مان لی۔ میں ہر قیمت پر چودھری افتخار کو سخت سے سخت سزا دلوانا چاہتا تھا اور اس سلسلے میں سراجا کی گواہی بہت ہی اہم کردار ادا کرسکتی تھی۔

یہ معاملہ تو کسی طرح نمٹ گیا۔ چودھری افتخار پر کوئی دو سال تک کیس چلا پھر عدالت سے اسے عمر قید کی سزا ہوگئی لیکن اس کیس کا ایک پہلو آپ کے ذہن میں چبھ رہا ہوگا اور وہ یہ کہ موضع نور پور تو میرے قصبے کی مغربی سمت میں واقع تھا۔ یعنی دریا کے زیریں حصے میں...... پھر شکیلہ کی لاش پانی میں الٹی سمت تیرتے ہوئے ہمارے قصبے تک کیسے پہنچ گئی؟

پانی کی مخالف سمت میں تیرنا کسی لاش کے بس کا کام نہیں۔ اس سلسلے میں چودھری افتخار کے خاص آدمی نے بڑی چالاکی سے کام لیا تھا۔ جب رات کے کسی حصے میں شکیلہ چودھری کے ظلم و ستم کا نشانہ بن کر اپنی جان سے ہاتھ دھو بیٹھی تو چودھری نے فرید کو اس کی لاش ٹھکانے لگانے کی ذمے داری سونپ دی اور اس شاطر شخص نے قانون کی آنکھوں میں دھول جھونکنے کے لیے یہ سارا ڈراما رچایا تھا۔ اس نے شکیلہ کی لاش کو ایسے مقام پر دریا برد کیا کہ ایسا لگے...... لاش پیچھے سے کہیں بہتی ہوئی آئی ہے اور واقعی شروع میں، میں نے ایسا ہی سمجھا تھا۔ یہ الگ بات کہ بعدازاں ایک کے بعد ایک حقیقت کھلتی چلی گئی اور میں شکیلہ کی بربادی کے ذمے دار، اس کے قاتل تک پہنچنے میں کامیاب ہوگیا۔

اللہ بھی ایک حد تک ہی اپنی رسی کو دراز کرتا ہے پھر جب وہ پکڑ اور جکڑ پر آتا ہے تو بڑے بڑے پھنے خان.... بےبس ہوجاتے ہیں۔ قانونِ قدرت کے ساتھ کھلم کھلا مذاق کرنے والے زیادہ عرصے تک آزاد دندناتے نہیں پھر سکتے۔ ایسے نافرمانوں کا انجام بڑا ہی بھیانک اور حسرت ناک ہوتا ہے۔

جیسا کہ چودھری افتخار کا ہوا......!

(تحریر: حسام بٹ)

فرینک جوں ہی اس پس ماندہ علاقے کے کارنر سے گھوما تو اس نے اپنی رفتار کم کردی۔ وہاں سامنے ہی اسے اپنا ممکنہ ٹارگٹ دکھائی دے گیا۔ وہ ایک پستہ قد آدمی تھا جو اپنی کار کی ڈکی بند کررہا تھا۔

فرینک نے اطراف میں نگاہ دوڑائی۔ دور دور تک کوئی فرد دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ ''پرفیکٹ!'' فرینک کو اس بات کا کوئی ڈر نہیں تھا کہ وہ پہچان لیا جائے گا۔ سڑک پر نصب کھمبوں پر بجلی کے چند ہی بلب روشن تھے جن کی روشنی میں اس کے چہرے کے نقوش واضح دکھائی نہیں دے رہے تھے۔ اس کے سر پر موجود براؤن رنگ کے بالوں کی وگ اور گول شیشوں والی فرضی عینک نے اس کا حلیہ بڑی حد تک بدل دیا تھا۔ اس حلیے میں تو لارین بھی اسے نہیں پہچان سکتی تھی۔

فرینک نے ایک بار پھر طائرانہ نظریں اطراف میں ڈالیں۔ پھر تیزی سے اس پستہ قد کی جانب لپکا جو اب گھوم کر اپنی کار کے ڈرائیور سائڈ کے دروازے کی جانب بڑھ رہا تھا۔

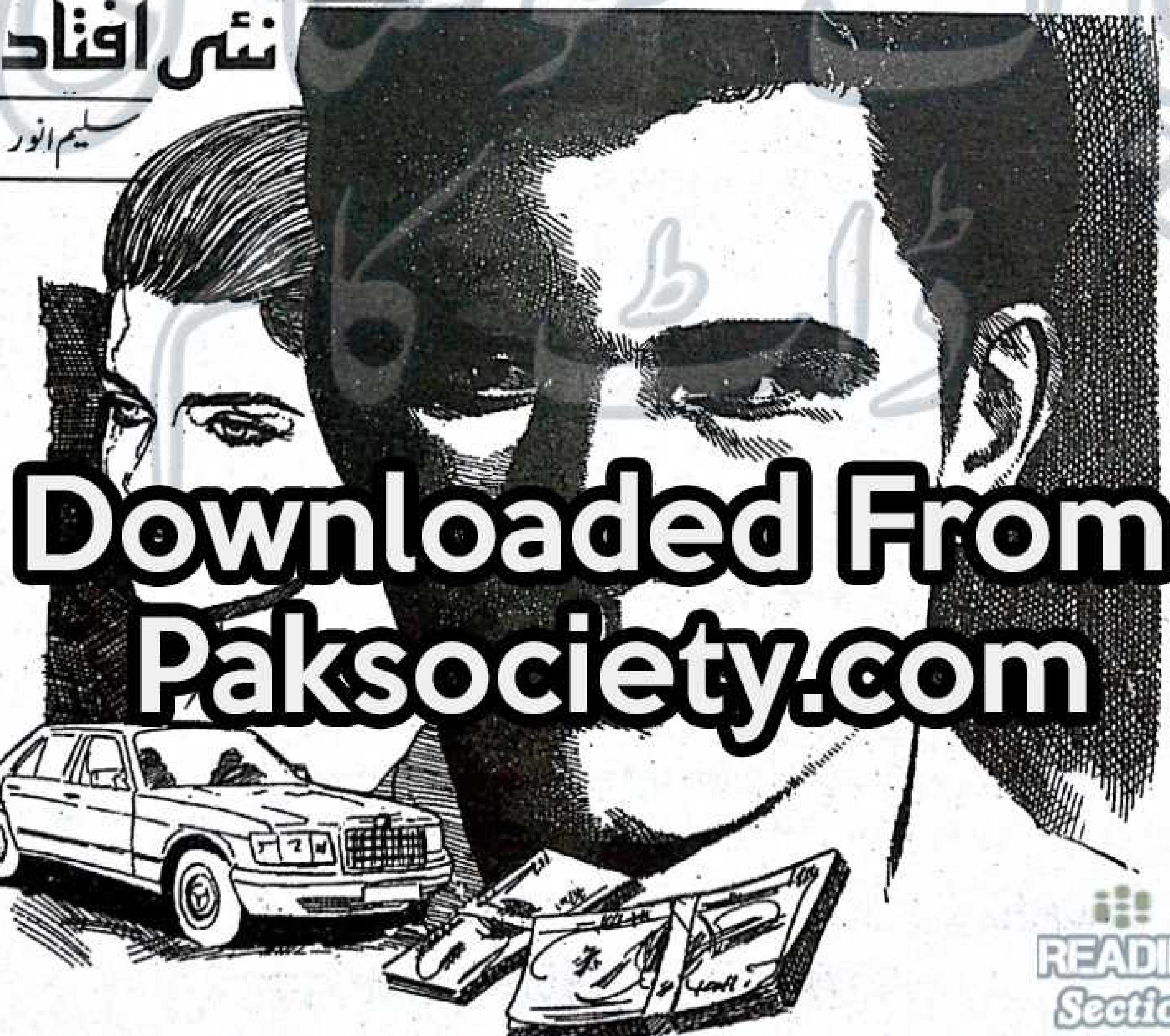
فرینک نے اس کے عقب میں پہنچ کر کراٹے کا ایک نپا تلا وار اس شخص کی گردن پر کیا۔ اس سے قبل کہ وہ شخص فٹ پاتھ پر گرتا، فرینک نے اس کے ہاتھ میں موجود کار کی چابیاں جھپٹ لیں اور ایک جھٹکے سے کار کا دروازہ کھول کر اس میں سوار ہو گیا۔ اس نے کار کا انجن اسٹارٹ کیا اور کار تیزی سے آگے بڑھا دی۔

جیسی کرنی ویسی بھرنی کی کھلی تفسیر ایک سبق آموز لمحے کی گرفت

اس وقت صورتِ حال انتہائی دلچسپ ہوجاتی ہے جب چوروں کو مور پڑتے ہیں اور اسی لمحے دوسروں پر مظالم ڈھانے والا خود کو دنیا کی مظلوم ترین مخلوق سمجھ کر رحم کی غلط فہمی میں مبتلا دکھائی دیتا ہے اور بھول جاتا ہے کہ انسان اور قدرت میں یہی فرق ہے... انسان غلطیاں نظرانداز کردیتا ہے مگر قدرت گرفت میں لے لے تو پھر معاف نہیں کرتی۔

نئی افتاد

سلیم انور



وہ پستہ قد فٹ پاتھ پر گرنے کے بعد بے ہوش ہو چکا تھا۔ فرینک کو یہ بھی اطمینان تھا کہ اس کا ٹارگٹ اس کا چہرہ اور اس کا حلیہ دیکھنے سے قاصر رہا تھا کیونکہ فرینک نے اس کی لاعلمی میں اس پر عقب سے وار کیا تھا۔

فرینک مسکرا دیا۔ اپنے انتقام کے منصوبے کا پہلا حصہ اس نے کامیابی سے مکمل کرلیا تھا۔ جہاں تک اس کے منصوبے کے دوسرے مرحلے کا تعلق تھا اور جہاں اس نے اس پر عمل کرنا تھا، وہ مقام ایک اسپتال تھا جو صرف دو میل کے فاصلے پر تھا۔ لارین کی نرسنگ شفٹ جلد ہی ختم ہونے والی تھی اور پھر وہ اسپتال سے پیدل تین بلاک کے فاصلے پر واقع اپنے اپارٹمنٹ کی جانب روانہ ہوجاتی۔ اس کا مطلب تھا کہ اسپتال سے نکلنے کے بعد لارین کو تین سڑکیں پار کرنا تھیں۔ فرینک نے ان ہی تین سڑکوں میں سے کسی ایک پر لارین کو اپنی کار تلے کچلنا تھا پھر وہ اس کار کو کسی نالے یا گڑھے میں پھینک دیتا اور اپنے بہروپی حلیے سے بھی فوری نجات حاصل کرنے کے بعد بس میں سوار ہوکر نصف شب سے قبل اپنے گھر پہنچ جاتا اور اپنے بستر پر دراز ہوجاتا۔

اسے یقین تھا کہ آج کی رات اسے پُرسکون نیند آئے گی کیونکہ وہ لارین سے اپنے ٹھکرائے جانے کا انتقام لے چکا ہوگا۔

فرینک نے اسپتال کی پارکنگ لاٹ میں ایک خالی جگہ تلاش کرلی اور وہاں اپنی کار کھڑی کرنے کے بعد اسی میں بیٹھ کر انتظار کرنے لگا۔ اس کی نگاہیں اسپتال کے داخلی دروازے پر جمی ہوئی تھیں۔ کچھ دیر انتظار کے بعد اس نے دروازہ کھلتے ہوئے دیکھا۔ لارین شیڈول کے مطابق اپنے وقتِ مقررہ پر باہر نکل رہی تھی۔ اس کا سفید یونیفارم اس کے سیاہ رنگ کے کوٹ کے ساتھ کنٹراسٹ میں تھا اور بے حد بھلا لگ رہا تھا۔

یہ سیاہ کوٹ اس نے خرید کر لارین کو اس وقت تحفے میں دیا تھا جب ان کے آپس میں تعلقات خوشگوار تھے۔ یہ بات خود اس کی ملازمت چھوٹ جانے سے پہلے کی تھی۔ ملازمت چھوٹ جانے کے غم میں اس نے ایک بار پھر شراب نوشی شروع کردی تھی۔

اور پھر فرینک کا جسم تن گیا۔

لارین تنہا نہیں تھی۔ ایک سیاہ بالوں والے شخص نے لارین کے باہر نکلنے کے لیے اسپتال کے دروازے کو تھام رکھا تھا اور اب وہ دونوں ایک ساتھ چل رہے تھے۔ فرینک نے اپنی کار کی کھڑکی کا شیشہ قدرے نیچے کھسکا لیا تو اسے لارین کی آواز ہوا کے دوش پر لہراتی ہوئی سنائی دی جیسے اسے چڑا رہی ہو۔ ''کیوں نہیں، کارل...... مجھے بے حد لطف آئے گا۔ تمہاری پیشکش کا شکریہ۔''

وہ دونوں اس کی کار کے عین قریب سے گزرے تو فرینک نے غصے سے اپنی مٹھیاں بھینچ لیں۔ وہ چند لمحوں تک انہیں اپنی کار کے عقبی آئینے میں جاتا دیکھتا رہا پھر گردن گھما کر انہیں دیکھنے لگا۔

کارل نے ایک سرخ اسپورٹس کار کا پسنجر سائڈ کا دروازہ کھولا اور فرینک نے دیکھا کہ لارین اس اسپورٹس کار میں بیٹھ رہی تھی۔

'یہ ٹھیک نہیں ہو رہا۔' فرینک نے سوچا۔ اس نے اپنا منصوبہ پوری احتیاط کے ساتھ اور نہایت باریک بینی سے بنایا تھا اور اب یہ بے وقوف کارل اس کے بنے بنائے منصوبے کو تباہ کرنے پر تلا ہوا تھا۔ نہیں، وہ اسے ایسا ہرگز نہیں کرنے دے گا۔

وہ سرخ اسپورٹس کار پارکنگ لاٹ سے نکل کر سڑک پر آگئی تو فرینک نے اپنی کار اسٹارٹ کی اور اس کا تعاقب شروع کردیا۔ اس اسپورٹس کار کا رخ لارین کی رہائش گاہ کی جانب نہیں تھا۔ شاید وہ کارل کی رہائش گاہ کی جانب جا رہے ہیں، فرینک نے سوچا۔

جب وہ سرخ اسپورٹس کار ایک سگنل کی سرخ بتی پر رکی تو فرینک نے اپنی کار اس کے برابر میں لے جا کر روک دی اور ایک اچٹتی نگاہ اس کار پر ڈالی۔ لارین نے اپنا ہاتھ اس شخص کے بازو پر رکھا ہوا تھا اور مسکرا رہی تھی۔

فرینک نے دانت پیستے ہوئے اپنی نظروں کا رخ پھیر لیا۔

جب سگنل کی بتی سبز ہوئی تو فرینک نے اس اسپورٹس کار کو آگے نکلنے کا موقع دیا اور درمیان میں کافی کاروں کا فاصلہ کرلیا۔ وہ جانتا تھا کہ اسے صحیح موقع مل جائے گا جب وہ اپنے منصوبے کے دوسرے مرحلے کو پایۂ تکمیل تک پہنچا سکے گا۔ اس وقت تک بہتر یہی ہوگا کہ وہ قدرے فاصلے پر رہے اور......

کارل کی اسپورٹس کار دائیں جانب مڑنے کا انڈیکیٹر دے رہی تھی۔ وہ ایک رات بھر کھلے رہنے والے ڈائنر کی پارکنگ لاٹ میں داخل ہو رہے تھے۔

فرینک سیدھا آگے نکل گیا، پھر کارنر پر پہنچ کر اس نے کار واپس موڑی اور واپس اس آل نائٹ ڈائنر پر آگیا۔ اس نے کارل اور لارین کو ڈائنر میں داخل ہوتے دیکھا۔ وہ سوچ میں پڑ گیا کہ۔ وہ اپنی کار میں بیٹھ کر ان کی واپسی کا انتظار کرے یا......

اتنے میں ایک پراگندہ حال شخص نے اس کی کھڑکی میں

جھانکا اور چیخ کر بولا۔ ''تمہارے پاس کوئی فالتو چینج ہے؟''

فرینک نے ایک جھٹکے سے اپنی کار کا دروازہ کھولا اور ایک ڈالر کا مڑا تڑا نوٹ اس کی جانب اچھالتے ہوئے بولا۔ ''اب چلتے بنو!''

اس سے پہلے کہ وہ آوارہ گرد اسے مزید پریشان کرتا، فرینک ریسٹورنٹ کی جانب چل پڑا۔ اس نے کافی کا ایک فاسٹ کپ لیا اور لارین کی تلاش میں نظریں دوڑانے لگا۔ اسے یقین تھا کہ لارین اسے پہچان نہیں پائے گی کیونکہ اس نے اپنا اصل حلیہ بدلا ہوا تھا۔

اوہ، اوہ! اس نے دیکھا کہ لارین اور کارل کھڑکی کے پاس والی ایک نشست پر براجمان ہوچکے تھے اور لارین کی نظریں کھڑکی سے اسی پر جمی ہوئی تھیں۔

فرینک نے فوراً ہی اپنا رخ تبدیل کرلیا۔ وہ ریسٹورنٹ کے دروازے کی جانب جانے کے بجائے اخبارات کے ریک کی جانب بڑھ گیا۔ اس نے مشین میں چند سکے ڈالے اور ایک اخبار باہر کھینچ لیا۔

اس نے ایک سرسری نظر اخبار کی سرخیوں پر ڈالی جو کچھ یوں تھیں۔ ''پیٹرول کی قیمتوں میں ایک بار پھر اضافہ...... منشیات کے خلاف چھاپا مار کارروائیاں صرف چھوٹے مجرموں تک محدود......''

فرینک بہ ظاہر تو جیسے اخبار کی ان سرخیوں کا مطالعہ کرنے میں مصروف تھا لیکن کن انکھیوں سے ریسٹورنٹ کی جانب دیکھ رہا تھا۔ اس نے دیکھا کہ لارین کی نظریں اب بھی اس کی جانب اٹھی ہوئی تھیں۔

نہیں، ایسا کسی صورت ممکن نہیں ہوسکتا کہ لارین نے اسے پہچان لیا ہو لیکن اس کے باوجود بھی......

وہ اپنی کار کی جانب پلٹ آیا۔ اس نے سوچا کہ اپنی کار ایسی جگہ لے جاکر کھڑی کردے جہاں وہ ریسٹورنٹ کی اس کھڑکی سے نظر نہ آئے جس کے پاس لارین بیٹھی ہوئی تھی۔

اسی سوچ میں گم فرینک نے اپنی کار ریورس گیئر میں ڈالی تو اسے ٹکرانے اور چیخنے کی بلند آواز سنائی دی۔ اس نے بے خیالی میں اپنی کار ریورس کرتے ہوئے کسی دوسری کار سے ٹکرا دی تھی۔

''تم کیا پاگل ہو؟'' کسی نے چیخ کر کہا۔

فرینک کار سے اچھل کر نیچے آگیا۔ ''پاگل تم ہوگے!'' اس نے جواباً چیخ کر کہا۔ پھر دوسرے ہی لمحے جب اس نے دو آدمیوں کو اپنی جانب بڑھتے دیکھا تو ٹھٹک گیا۔ پھر خوف سے اس کا چہرہ پھیکا پڑ گیا جب اس کی نظر ان کی گاڑی پر پڑی۔

وہ ایک پولیس پیٹرول کار تھی اور وہ دونوں افراد پولیس کی وردی میں ملبوس تھے۔

''ذرا اپنا لائسنس تو دکھاؤ۔'' دراز قامت پولیس افسر نے کہا۔

''آں، او کے...... لیکن اس پر موجود میری تصویر خاصی پرانی ہے۔'' فرینک نے اپنے بٹوے کی جانب ہاتھ بڑھاتے ہوئے کہا۔

''ساکت ہوجاؤ۔'' دوسرے پولیس افسر نے اچانک اپنا سروس ریوالور نکالتے ہوئے فرینک کو اس کی زد میں لیتے ہوئے چیخ کر کہا۔

''کیا......''

''جب تم نے اپنی کار ہماری کار سے ٹکرائی تو تمہاری کار کی ڈکی ٹکر لگنے سے کھل گئی تھی اور......'' پولیس افسر نے فرینک کی کار کی روشن ڈکی کے اندرونی حصے کی جانب اشارہ کیا جہاں سفید پاؤڈر کی تھیلیاں ایک کھلے ہوئے بکس میں رکھی ہوئی تھیں۔ ''یہ تو خاصا بڑا خفیہ خزانہ ہے۔''

''منشیات؟'' فرینک کا خیال بے ساختہ اس پستہ قد کی جانب چلا گیا جس کی کار اس نے چوری کی تھی۔ پھر اس کی نظروں کے سامنے اخبار کی وہ سرخی گھومنے لگی جو ابھی کچھ دیر پہلے اس نے دیکھی تھی۔ وہ بے بسی سے تلملانے لگا۔ اس دوران دراز قامت پولیس افسر اس کے ہاتھوں میں ہتھکڑیاں پہنا چکا تھا۔

دوسرے پولیس افسر نے اسے اس کے حقوق پڑھ کر سنانا شروع کردیے۔

''لیکن یہ میری کار نہیں ہے...... اور نہ ہی یہ منشیات میری ہے۔'' فرینک نے صدائے احتجاج بلند کی۔

''واقعی؟'' دراز قامت پولیس افسر نے ہاتھ بڑھا کر فرینک کے سر پر سے مصنوعی بالوں کی وگ ایک جھٹکے سے کھینچتے ہوئے کہا۔ ''ویل، اب تم یہ بھی کہوگے کہ یہ بال بھی تمہارے نہیں ہیں۔ میرے خیال سے تم ایک بڑی مشکل میں پھنس چکے ہو، بڑی۔ حقیقت میں ٹنوں وزنی مشکل میں۔''

فرینک نے بے بسی سے گردن گھما کر ریسٹورنٹ کی جانب دیکھا تو اسے یوں لگا جیسے دور بیٹھی ہوئی لارین کی نگاہیں بدستور اس پر جمی ہوئی ہیں اور وہ یہ تماشا دیکھ کر محظوظ ہورہی ہے۔

فرینک کو اپنے منصوبے کے خاک میں ملنے اور اس نئی افتاد پر بے ساختہ رونا آگیا اور اس نے اپنا سر اپنے ہاتھوں میں تھام لیا۔

محفلِ شعروسخن

❁ محمد یوسف سانول لنگڑیال.....نور پور تھل
سرد موسم سے کون ڈرتا ہے
سرد لہجوں سے جان جاتی ہے

❁ ثنا......ناظم آباد، کراچی
زرد ہوتا جارہا ہے صحن دل کا ہر شجر
جس طرح اندر ہی اندر دکھ کوئی کھانے لگے
تیری دنیا سے نکل جاؤں میں خاموشی کے ساتھ
قبل اس کے تو برے سائے سے کترانے لگے

❁ اشفاق شاہین.....کراچی
ہر فکر سے آزاد ہو جاؤں بس وہ اتنا کہہ دیں اگر
تیرے تھے، تیرے ہیں، تیرے ہی رہیں گے



❁ سعد یکمال......کوئٹہ
آجاؤ اس موڑ سے شروع کریں پھر سے سفر زندگی
ہر شے جہاں حسین تھی اور ہم تم تھے اجنبی

❁ محمد کمال انور.....اورنگی ٹاؤن، کراچی
ذکرِ شب فراق سے وحشت اسے بھی تھی
میری طرح کسی سے محبت اسے بھی تھی
مجھ کو بھی شوق تھا نئے چہروں کی دید کا
رستہ بدل کے چلنے کی عادت اسے بھی تھی

❁ ماہین فاطمہ.....اوکاڑہ
یوں محبت سے نہ ہم خانہ بدوشوں کو بلا
اتنے سادہ ہیں کہ گھر بار اٹھا لائیں گے

❁ داؤد اشفاق.....اوکاڑہ
تو محبت سے کوئی چال تو چل
ہار جانے کا حوصلہ ہے مجھ میں

❁ مدحت.....کراچی
خوشیوں کی آرزو میں مقدر بھی سو گئے
آندھی چلی کچھ ایسی کہ اپنے بھی کھو گئے
کیا خوب تھا تمہارا انداز دوستو
ہمدرد بن کے آئے تھے کانٹے چبھو گئے

❁ ملائکہ حریم.....اوکاڑہ
اشکوں کی ضمانت بھی جہاں کام نہ آئی
وہ شخص لفظوں کا یقیں خاک کرے گا؟

❁ کرن شفیق.....حیدر آباد
بہت سے لوگ تھے مہمان میرے گھر لیکن
وہ جانتا تھا کہ ہے اہتمام کس کے لیے

❁ مسٹر اینڈ مسز محمد صفدر معاویہ.....خانیوال
میرے جذبہ محبت کو زاہد
دراصل تو نے سمجھا نہیں
سر جھکانا کسی آستاں پر
یہ سلامی ہے سجدہ نہیں

❁ آغا سلمان پاشا.....پاکیشیا
ہزار جوابوں سے اچھی ہے میری خاموشی
نہ جانے کتنے سوالوں کی آبرو رکھے

❋ سید عبادت کاظمی.....ڈیرہ اسماعیل خان
ہم نے ماضی کی سخاوت پر جو پل بھر سوچا
دکھ بھی کیا کیا ہمیں یادوں کے سبب یاد آئے
پھول کھلنے کا جو موسم میرے دل میں اترا
تیرے بخشے ہوئے کچھ زخم عجب یاد آئے

❋ قاضی عرفان احمد، جمیل انور.....آڑہ چوآسیدن شاہ
ریت کے ذروں میں اللہ بدل دیتا مجھے
اور مجھے راہ محمدؐ میں بچھایا ہوتا
خاک ہوجاتا میں سرکار کے قدموں کے تلے
خاک کو خاکِ مدینہ میں ملایا جاتا

❋ جنید احمد ملک.....گلستان جوہر، کراچی
خوشبو کو ترک کرکے نہ لائے چمن میں رنگ
اتنی تو سوجھ بوجھ مرے باغباں میں ہے
لشکر کی آنکھ مالِ غنیمت پہ ہے لگی
سالارِ فوج اور کسی امتحاں میں ہے

❋ جاوید اختر رانا.....پاکپتن شریف
کس قدر قحطِ وفا ہے میری دنیا میں ندیم
جو ذرا ہنس کے ملے اس کو مسیحا سمجھوں

❋ ریاض بٹ.....حسن ابدال
فطرت کے تقاضے کبھی بدلے نہیں جاتے
خوشبو ہے اگر وہ تو بکھرنا ہی پڑے گا

❋ جبران احمد ملک.....گلشن اقبال، کراچی
بہانے سے اسے بس دیکھ آنا پل دو پل کو
یہ فردِ جرم ہے اور آنکھ انکاری نہیں ہے
میں تیری سرد مہری سے ذرا بددل نہیں ہوں
مرے دشمن! ترا وار بھی کاری نہیں ہے

❋ نورین ناز.....میرپور خاص
آیا نہیں وہ رہ گئے رستے سجے ہوئے
یہ سال بھی گزر گیا ہر سال کی طرح

❋ سید ثاقب علی شاہ.....راولپنڈی
مجھے کہیں لکھ کر محفوظ کرلو اے دوست
تمہاری یادداشت سے نکلتا جارہا ہوں میں

❋ ظفر اقبال ظفر.....کامرہ شرقی
تم میری زندگی ہو، یہ سچ ہے
مگر زندگی کا بھروسا کیا

❋ عمران جمال.....راولپنڈی
شاید اس نے مجھ کو تنہا دیکھ لیا ہے
دکھ نے میرے گھر کا رستہ دیکھ لیا ہے
اب بھی سپنے بوئے تو ایمان ہے اس کا
اس نے ان آنکھوں میں صحرا دیکھ لیا ہے

❋ مدثر علی.....سرگودھا
جاں سے گزر گئے مگر بھید نہیں کھلا کہ ہم
کس کی شکارگاہ تھے کس کے لیے ہدف ہوئے
اب تو فقط قیاس سے راہ نکالی جائے گی
جن میں تھیں کچھ بشارتیں خواب تو وہ تلف ہوئے

❋ محمد صفدر.....حیدرآباد
میں تو تاعمر، ترے شہر میں رکنا چاہوں
کوئی آکر مرا اسبابِ سفر تو کھولے
خود بھی جنگل کو مجھے کاٹنا آجائے گا
پر وہ شہزادہ مری نیند کا در تو کھولے

❋ ادریس احمد خان.....ناظم آباد، کراچی
بھولے بن کر حال نہ پوچھو بہتے اشک کو بہنے دو
جس سے بڑھے بے چینی دل کی ایسی تسلی رہنے دو

❋ وزیر محمد خان.....بٹل ہزارہ
جینا آسان تو نہیں تجھ سے بچھڑ کر لیکن
اپنے ہاتھوں کی لکیروں کو مٹاؤں کیسے

❋ محمد اسلم گھلو.....خانیوال
تیرے ہوتے ہوئے محفل میں جلاتے ہیں چراغ
لوگ کیا سادہ ہیں سورج کو دکھاتے ہیں چراغ

❋ احمد علی.....کوئٹہ
جو دھوپ میں رہا نہ روانہ سفر پہ تھا
اس کے لیے عذاب کوئی اور گھر پہ تھا
چکر لگا رہے تھے پرندے شجر کے گرد
بچے تھے آشیانوں میں، طوفان سر پہ تھا

❋ عبدالرحیم.....لاہور
خود اس کے گھر کی دیوار گر پڑی اس پر
یہ فن آج ہوا ہے مرا تو کب کا تھا

❋ رمضان پاشا.....گلشن اقبال، کراچی
زمانہ دوست ہے کس کس کو یاد رکھو گے
خدا کرے تمہیں مجھ سے دشمنی ہوجائے

❄ محمد قدرت اللہ نیازی.....حکیم ٹاؤن، خانیوال
یوں نہ جھانکیے غریب کے دل میں صاحب!
ہزاروں حسرتیں یہاں بے لباس رہتی ہیں

❄ زوہیب احمد ملک.....گلستان جوہر، کراچی
سانپوں کے مقدر میں وہ زہر کہاں؟
انسان جو اگلتے ہیں [redacted]اوت میں

❄ بلقیس فاطمہ.....پشاور
تجھے دیکھنا اچھا لگتا تھا مجھے
کیا خبر تھی محبت ہوجائے گی؟

❄ ناہید اختر.....اسلام آباد
ہاں! محبت تمام اس پہ ہوئی
اب جو ہوگی، دل لگی ہوگی

❄ اطہر حسین.....کراچی
کوئی خاطر نہ مدارات نہ تقریبِ وصال
ہم تو بس چاہتے ہیں تیری نظر میں رہنا

❄ وقار حسن.....راولپنڈی
میں ہجر کے عذاب سے انجان بھی نہ تھی
پر کیا ہوا کہ صبح تلک جان بھی نہ تھی

❄ زرمین.....نواب شاہ
اک دوسرے کو جان نہ پائے تمام عمر
ہم ہی عجیب تھے کہ زمانہ عجیب تھا

❄ حسیب احمد.....میرپور خاص
کچھ فیصلہ تو ہو کہ کدھر جانا چاہیے
پانی کو اب تو سر سے گزر جانا چاہیے

❄ امتیاز.....منڈی بہاؤ الدین
فرشِ فلک پہ پاؤں رکھ، دیکھ تو کس طرح سے ہیں
تارے بچھے ہوئے تیری چشمِ سیاہ کے لیے

❄ شازیہ.....کراچی
بخت سے کوئی شکایت ہے نہ افلاک سے ہے
یہی کیا کم ہے کہ نسبت مجھے اس خاک سے ہے

❄ ظہیر الدین.....شاہ فیصل کالونی، کراچی
میری پوشاک میں تارے سے اچانک چمکے
کس کے آنگن سے یہ ہوتی ہوئی شب آئی ہے

❄ کوثر محبوب.....نواب شاہ
کارِ جہاں ہمیں بھی بہت تھے سفر کی شام
اس نے بھی التفات زیادہ نہیں کیا

❄ مہتاب احمد.....حیدر آباد
قبولیت کی ہے ساعت تو اس کو مانگ ہی لیں
کہ یہ گھڑی کبھی بارِ دگر نہیں آتی

❄ وسیم خان.....ملتان
تمکنت سے تجھے رخصت تو کیا ہے لیکن
ہم سے ان آنکھوں کی حسرت نہیں دیکھی جاتی

❄ فرحانہ عاصم.....سکھر
مجھے تجھ سے جدا رکھتا ہے اور دکھ تک نہیں ہوتا
مرے اندر ترے جیسا یہ آخر کون رہتا ہے

❄ برہان شکیل.....کراچی
رات تھے گھر پر چراغ اور عطر اس کے منتظر
پاؤں تک لیکن ہوا نے بام پر رکھا نہیں

❄ عارفہ جاوید.....فیصل آباد
میں ستاروں کی سفارش بھی اگر لے آتی
یہی لکھی تھی مرے خوابوں کی تعبیر، سو ہے

❄ انعم کمال.....کراچی
عشق کرنا ہے تو پھر سارا اثاثہ لائیں
اس میں تو کچھ بھی پس انداز نہیں کر سکتے

❄ نعمان علی.....لاہور
خدا کرے کہ ہوا کو ابھی پتا نہ چلے
کہ کچھ چراغ مرے بام ودر پہ زندہ ہیں

❄ محمد جاوید خان.....تحصیل علی پور
سنو کئی آئینے سجا کر بھی
میں نے خود کو تنہا دیکھا ہے

کوپن
برائے شمارہ
مارچ 2016

مُحفلِ شعر و سخن

نام: --

پتا: --

سارینا س کا اسٹیڈیم تماشائیوں سے کھچا کھچ بھرا ہوا تھا۔ جہاں اب سے کچھ دیر بعد بیس بال کی قومی چیمپئن شپ کا پہلا میچ ہونے والا تھا۔ یہ میچ کرائیوتھیوس ڈی اور فیڈی کیمپرس کی ٹیموں کے درمیان ہو رہا تھا۔ اسکول و کالج کی طالبات اور طلبا کی کثیر تعداد بسوں میں بھر بھر کر وہاں لائی جا رہی تھی۔ اسٹیڈیم کے گیٹس پر کھڑے انتظامیہ کے رضا کار آنے والے تماشائیوں کو ان کی ٹکٹس دیکھ کر اندر داخل کر رہے تھے۔

سارینا س کے قریبی قصبے کے اسکول جولین پینو اسکول کی طالبات اور طلبا بس میں ابھی ابھی یہاں پہنچے تھے۔ وہ بڑی ہی بے ترتیبی سے اتر رہے تھے، ایک دوسرے کو دھکیلتے ہوئے۔ ان کے ساتھ آنے والی ٹیچر انہیں ترتیب سے اترنے کا کہہ رہی تھی۔ اس کے لہجے میں جھلاہٹ نمایاں تھی۔

دوسرا گال

علی اختر

دولت کسی کی جاگیر نہیں لیکن... لوگ پھر بھی اس پر حکومت کرنا چاہتے ہیں اور بعض اوقات عُسرت میں زندگی گزارنے والے عشرت کے شیدائی ثابت ہوجائیں تو ان سے ہر جائز اور ناجائز طریقہ اختیار کرنے کی امید کی جاسکتی ہے۔ اسے بھی دولت سے پیار ہو گیا تھا جسے پانے کے لیے اسے اپنا دوسرا گال بھی پیش کرنا پڑا کہ پانچ انگلیوں کا نقشہ یہاں بھی ثبت ہو جائے تو کوئی مضائقہ نہیں۔

ترکِ محبت کرنے والے ایک چالاک عاشق کی بے وفائی کا قصہ



لڑکو...... بچو...... کیا بے ہودگی ہے۔ آرام سے اترو۔ کہیں چوٹ نہ لگوا لینا......"

اس کے چہرے کے تناؤ اور آواز کی جھلاہٹ سے لگ رہا تھا کہ وہ بمشکل تمام ان کو قابو کیے ہوئے ہے۔ جب سارے بچے بس سے اتر گئے تو وہ انہیں لے کر قریبی گیٹ کی طرف بڑھی اور وہاں پر موجود انتظامیہ کے کارکن کو اسکول کا اجازت نامہ دکھایا۔ اتنی دیر میں تمام لڑکے اور لڑکیاں ایک لائن بنا چکے تھے۔

اسٹیڈیم میں داخل ہوتے ہی وہ ایک بار پھر سے ادھر ادھر بکھر گئے۔ اتنی دیر میں اسٹیڈیم میں ایمپائر داخل ہوئے اور پھر اس کے ساتھ ہی ایک ٹیم تالیوں کی گونج میں میدان کے وسط میں بنی ہوئی پچ کی طرف بڑھنے لگی۔ ابھی ان کا شور ذرا تھما ہی تھا کہ دوسری ٹیم کے کھلاڑیوں کا اس سے بھی زوردار استقبال کیا گیا...... جب کھلاڑی کوئی شاٹ لگاتا اور گیند ہوا کے دوش پر اڑتی ہوئی باؤنڈری سے باہر لوگوں پر گرتی تو اس کے ساتھ ہی ڈرم بجنے لگتے اور کئی منچلے اٹھ کر ناچنے لگتے۔

روز آئینز بھی ان میں سے ایک تھی جو کرائیوتھیوس ڈی کے مشہور اور اپنے پسندیدہ کھلاڑی لوکس رنکن کا کھیل دیکھنے کے لیے آج خصوصی طور پر آئی تھی۔ لوکس رنکن تمام کھلاڑیوں میں سے نمایاں کارکردگی کا حامل تھا۔ وہ جب بھی کوئی ہٹ لگاتا، روز آئینز اچھل اچھل کر اور اپنے ہاتھ کی دو انگلیاں منہ میں لے جا کر زور سے سیٹیاں مارتی اور اپنے جذبات کا اظہار کرتی۔ جتنی دیر تک میچ ہوتا رہا، روز آئینز کا جوش وجذبہ دیکھنے سے تعلق رکھتا تھا۔

روز آئینز کا تعلق ساریناس کے قصبے سابینا سے تھا۔ اس کے آباؤ اجداد امریکی، انڈین، افریقی اور ہسپانوی ملی جلی نسل کے تھے۔ یہی وجہ تھی کہ اس کے خدوخال میں ان تمام نسلوں کی آمیزش نے اسے نہ صرف دوسروں سے مختلف بلکہ خوب صورت بھی بنا دیا تھا۔ روز آئینز کا خاندان ایک ہی جگہ رہتا تھا۔ اس کے دو بھائی ایڈن اور رائیل تھے۔ جو اسی اسکول میں اس سے نچلے درجے میں پڑھتے تھے۔ روز آئینز اپنے والدین رائیل کالڈیرا اور ایلینا کالڈیرا کی اکلوتی بیٹی تھی۔ اس کے والدین اسکول ٹیچر تھے۔

روز آئینز کو اچھی طرح یاد ہے جب اس نے ہوش سنبھالا تو وہ سابینا کا ایک غریب گھر تھا۔ وہ دریا کے کنارے ایک جھونپڑا نما مکان میں رہتے تھے جس کی چھت کھجور کے پتوں کی بنی ہوئی تھی اور فرش کچا ہوتا تھا۔ سخت سردیوں میں جب بارش ہوا کرتی تو اس کے گھر کی چھت ٹپکنے لگتی اور گھر کا فرش کچا ہونے کی وجہ سے کیچڑ ہو جاتا تھا۔ تب وہ اور اس کے دونوں بھائی اس کیچڑ میں کھیلا کرتے تھے پھر بڑی مشکلوں سے اس کی والدہ کو جب ٹیچری کی جاب ملی تو گھر میں کچھ آسودگی آگئی تھی۔

اسے آبادی کے دوسرے صاحب حیثیت بچوں کی طرح اسکول میں داخل کروا دیا گیا۔ پھر آہستہ آہستہ وہ پڑھتے ہوئے اسکول کے آخری درجے میں پہنچ گئی تھی۔ اب اس کی عمر سولہ سال تھی۔ وہ اسکول کی ثقافتی اور تعلیمی سرگرمیوں میں بڑھ چڑھ کر حصہ لینے کی وجہ سے بہت مقبول تھی۔ بیس بال سے اس کی دلچسپی بھی اسی دور میں ہوئی تھی۔ پھر نہ جانے کیسے اس کے ذہن کے کسی کونے میں لوکس رنکن کا نام آ کر بس گیا۔

اب ان کا گھر قدرے پختہ ہو گیا تھا مگر اب بھی اس کے درودیوار سے غربت جھلک رہی تھی۔ اس کا والد رائیل کالڈیرا اپنے بچوں سے بے حد پیار کرتا تھا۔ وہ ہر چھٹی پر انہیں لے کر دریا کے کنارے پر چلا جاتا۔ جہاں وہ فشنگ راڈ دریا میں ڈال کر بیٹھے رہتے۔ روز آئینز اکثر اس راڈ کو بڑی خوشی کے ساتھ پکڑ کر بیٹھی رہتی۔ پھر جونہی ڈوری ہلتی تو وہ والد کو خوشی سے پکار کر متوجہ کرتی۔

اس کا والد ڈوری میں پھنسی ہوئی مچھلی کو دریا کنارے کی زمین پر پٹخ دیتا۔ اس طرح شام تک وہ چھوٹی بڑی بہت سی مچھلیاں پکڑ کر بستی میں لے آتے تھے۔ اس کی والدہ اور دادی ان مچھلیوں میں سے اپنی ضرورت کے مطابق مچھلیاں رکھ لیتیں اور باقی پڑوسیوں میں بانٹ دیتی تھیں۔

☆☆☆

پہلا میچ ختم ہوا تو کھلاڑی اسٹیڈیم کی گیلری میں آ گئے۔ میچ ایک بڑے مارجن کے ساتھ کرائیوتھیوس ڈی کی ٹیم نے جیت لیا تھا۔ دوسرے میچ میں ابھی وقفہ تھا۔ جب روز آئینز گیلری میں پہنچی تو وہاں کھلاڑیوں سے آٹوگراف لینے والوں کا تانتا بندھا ہوا تھا۔ تمام لوگوں نے آٹوگراف بکس کھول کر ہاتھوں میں پکڑی ہوئی تھیں اور اپنے اپنے پسندیدہ کھلاڑیوں سے آٹوگراف لے رہے تھے۔ زیادہ رش لوکس رنکن کے پاس تھا۔ روز آئینز بھی اسی قطار میں کھڑی ہو گئی جہاں اس کا فیورٹ لوکس رنکن آٹوگراف دے رہا تھا۔ جب روز آئینز کی باری آئی تو وہ آہستہ سے بڑبڑائی۔

"آٹوگراف پلیز......" رنکن اس وقت دوسرے

کھلاڑی سے بات کر رہا تھا اور اسے متوجہ کرنے کے لیے آئینز نے دوبارہ ذرا اونچی آواز میں کہا۔
''آٹو گراف پلیز......''
رنکن نے اس کی طرف سوالیہ نظروں سے دیکھتے ہوئے پوچھا۔
''آٹو گراف بُک کدھر ہے......''
آئینز نے ہنستے ہوئے اپنے ہاتھ کی ہتھیلی اس کے آگے کر دی۔ رنکن نے عجیب نظروں سے اسے دیکھا اور بولا۔
''یہاں دیا ہوا آٹو گراف تو مٹ جائے گا۔''
''دل پہ لکھی ہوئی تحریریں کبھی ختم نہیں ہوا کرتیں......'' یہ کہہ کر وہ پھر سے مسکرا دی۔
''ہوں...... ہمت والی لگتی ہو......'' رنکن بھی ہنس پڑا۔
''محبت کرنا جانتی ہوں......'' آئینز میں نہ جانے کہاں سے اس قدر جرأت آ گئی تھی کہ وہ رنکن سے جھجکنے کے بجائے اس کی باتوں کا جیسے سامنا کرنے پر تلی ہوئی تھی۔
رنکن نے کچھ دیر سوچا...... اور پھر اس کی پھیلی ہوئی ہتھیلی پر لکھ دیا۔
''جذبوں کی سلامتی کے نام......'' یہ لکھ کر اس نے نیچے اپنے مخصوص دستخط بھی کر ڈالے۔ آئینز نے ہتھیلی پر لکھے ہوئے حروف چومے اور آگے بڑھنے لگی تو رنکن نے بڑے دلار سے پوچھا۔
''نام پوچھ سکتا ہوں......''
''روز آئینز فرام جولیمن پینو اسکول سانیتا......''
''گڈ۔ تم تو بڑی ہمت والی لڑکی ہو...... ہمارا اگلا میچ کل ہوگا......'' رنکن نے بتایا۔
''میں کل بھی آؤں گی......'' روز آئینز چہکی۔
''مجھے تمہارا انداز خوب صورت لگا...... اور تعارف کروانے میں بھی ندرت ہے۔'' رنکن ہنسا تو کسی دوسرے نے اس کے ہاتھ پر اپنی آٹو گراف بک مار کر اسے اپنی طرف متوجہ کیا۔
''شکریہ...... مجھے بھی بہادر لوگ اچھے لگتے ہیں۔''
روز آئینز نے کہا اور دوبارہ نیچے پویلین میں آ گئی۔
''کہاں گئی تھیں۔ میں کتنی دیر سے تمہیں ڈھونڈ رہی تھی۔''
اس کی سہیلی اور کلاس فیلو نورا پرنانڈیز نے غصے سے پوچھا۔
''میں...... اوپر کھلاڑیوں کی گیلری میں گئی تھی......''
روز آئینز نے مسکراتے ہوئے جواب دیا۔
''آخر نہیں رہا گیا۔ مجھے بتاتیں...... میں بھی آٹو گراف لے لیتی۔'' نورا نے کہا۔ ''دکھاؤ تو کیا لکھا ہے تمہارے پسندیدہ کھلاڑی نے......''
روز آئینز نے اپنے ہاتھ کی ہتھیلی پر لکھی تحریر کو ایک بار پھر چوما اور ہتھیلی اس کے سامنے کر دی۔
''یہ کیا......'' نورا نے پوچھا۔
''آٹو گراف......'' روز آئینز نے ہنس کر جواب دیا۔
''آئینز...... آئینز...... تم نہیں سمجھو گی۔ بھلا ہتھیلی پر بھی کوئی آٹو گراف لیتا ہے۔ یہ کتنی دیر تک زندہ رہ سکتا ہے پگلی...... آٹو گراف بک پر لیا ہوا آٹو گراف پوری زندگی ہنستا رہتا ہے، جاگتا نظر آتا ہے مگر ہتھیلی کا آٹو گراف ایک بار پسینا آیا تو ختم......!'' نورا نے اسے سمجھانے کے انداز میں کہا۔
''جو تحریریں...... اور جو باتیں ایک بار دل پر تحریر ہو جائیں وہ کبھی ختم نہیں ہوتیں...... اور تمہیں پتا ہے رنکن میرا پسندیدہ اور آئیڈیل کھلاڑی ہے۔ میں تو اس سے آج پہلی بار ملی ہوں۔ یقیناً وہ میری سوچوں سے بہت بڑھ کر ہے......'' روز آئینز نے بڑے جذباتی انداز میں کہا۔
''وہ تمہاری سوچوں سے بہت آگے ہے۔ وہ بین الاقوامی شہرت کا حامل کھلاڑی ہے، یقیناً اس کی زندگی میں تم ایسی ہزاروں لڑکیاں صبح شام آتی ہوں گی۔ ویسے بھی تمہارا اور اس کا جوڑ نہیں ہے۔ میں اسے بڑی اچھی طرح جانتی ہوں......'' نورا نے سنجیدگی سے بتایا۔
''تو کیا تم رنکن کو پہلے سے جانتی ہو...... کیسے......؟''
روز آئینز نے حیرانی سے پوچھا۔ پھر تردد دیا۔
''مجھے بتاؤ...... تم اسے کیسے جانتی ہو؟ کیا تم اس سے پہلے ملتی رہی ہو...... یا کسی نے تمہیں اس کے بارے میں بتایا ہے......؟'' روز آئینز حیرت اور جذباتی انداز میں اس سے پوچھنے لگی۔
''ذرا سانس لو...... میں تمہیں سب بتا دوں گی۔''
نورا نے مطمئن انداز میں کہا۔
''لیکن کب...... مجھے ابھی بتاؤ...... میں نے ابھی سننا ہے۔'' روز آئینز اسی انداز میں بولی۔
''یہاں...... اس وقت بہت شور ہو رہا ہے۔ میں رنکن کو کس طرح جانتی ہوں، یہ ایک طویل کہانی ہے۔ فارغ وقت میں تمہیں بتاؤں گی۔'' نورا نے جواب دیا۔
''ہم پویلین سے ایک طرف ہٹ جاتے ہیں۔''
روز آئینز بولی۔
''کل بتاؤں گی......'' نورا نے کہا۔ ''کل اسکول کے گراؤنڈ میں بیٹھیں گے تو سب بتا دوں گی۔'' نورا نے

وضاحت کی۔
''لیکن میں تو کل اسکول نہیں بلکہ اسٹیڈیم آؤں گی۔ مجھے رنکن نے بتایا تھا کہ کل بھی اس کا میچ ہے، جب تک اس کی ٹیم باہر نہیں ہو جاتی یا جب تک چیمپئن شپ کے میچ اختتام پذیر نہیں ہو جاتے، رنکن کھیلتا رہے گا۔''
''تم ہر روز یہاں آؤ گی؟'' نورا نے پوچھا۔
''جی تو میرا یہی چاہتا ہے۔ اگر نہ بھی ہوا تو کل میں ضرور آؤں گی...... کیونکہ میں اس سے وعدہ کر چکی ہوں......'' روز نے جواب دیا۔
''تو پھر بھی سہی، جب تمہیں فرصت ملے گی۔'' نورا نے کہا۔
''تم بھی میرے ساتھ کیوں نہیں آجاتیں۔ دونوں مل کر میچ دیکھیں گے اور خوب مزے کریں گے۔'' روز نے کہا۔
''اگر پسند کرو گی تو آجاؤں گی......'' نورا نے جواب دیا۔
''اوکے...... ہم دونوں اسکول آئیں گے اور وہیں سے اسٹیڈیم آجائیں گے۔ ڈن؟'' روز نے اپنے دونوں ہاتھ فضا میں بلند کیے تو نورا نے بھی اپنے دونوں ہاتھ اس کے ہاتھوں پر مارتے ہوئے کہا۔ ''ڈن!''

☆☆☆

اگلے روز وہ دونوں اسٹیڈیم پہنچ گئیں۔ کل کے مقابلے میں آج اسٹیڈیم میں تماشائیوں کی تعداد کم تھی۔ وہ دونوں اسٹیڈیم میں ایک گھاس والی جگہ پر بیٹھ گئیں۔ میچ شروع ہو چکا تھا۔ رنکن اپنی ٹیم کا سب سے پھرتیلا اور تیز کھلاڑی لگ رہا تھا۔ مجال ہے کہ گیند اس کے قریب سے سرگوشی کرتی ہوئی گزر جائے۔

اس کی بہترین فیلڈنگ کی داد تماشائی کھل کر دے رہے تھے اور نورا دیکھ رہی تھی کہ روز آئینز اس کی ہر ادا پر فریفتہ ہو کر جذباتی انداز میں داد دے رہی تھی اور ایک بار جب رنکن نے تیزی سے جاتی گیند کو بڑی پھرتی سے پکڑا اور پیروں پر گھومتے ہوئے کھلاڑی کو رن آؤٹ کر دیا تو روز آئینز اٹھ کر باقاعدہ خوشی کے ساتھ ناچنے لگی تھی۔ دوسری ٹیم معمولی پوائنٹ کے ساتھ اپنی باری ختم کر چکی تو رنکن کی ٹیم باری لینے کے لیے میدان میں اتری۔ رنکن نے بڑی بے جگری سے مخالف ٹیم کی گیندوں کا مقابلہ کیا تھا اور ایک بار پھر سے میچ جیت لیا تھا۔

روز آئینز چیختی چلاتی میدان کی طرف بھاگی تو نورا نے اسے جلدی سے پکڑ لیا۔ میدان میں مرد بھاگتے ہوئے اچھے لگتے ہیں۔ اگر اتنے مردوں میں ایک لڑکی بھاگتی ہوئی جائے گی تو کیا اچھی لگے گی......'' روز اس کی بانہوں میں جھول کر رہ گئی۔

کھلاڑی میدان سے نکل کر ایک بار پھر گیلری میں آگئے تھے۔
''میرے ساتھ گیلری تک چلو گی......'' روز نے نورا سے پوچھا۔
''مشکل ہے، تم جاؤ...... لیکن دیکھو جلدی آجانا...... میں یہاں اکیلی بور ہو جاؤں گی۔ مجھے پتا ہے، تم میرے روکے سے رکنے والی نہیں ہو......'' نورا نے کہا۔

روز آئینز بھاگتی ہوئی گیلری میں چلی گئی۔ ایک بار پھر کھلاڑیوں کے چاہنے والوں کی قطار لگی ہوئی تھی۔ روز آئینز ایک طرف کھڑی ہو کر رنکن کی توجہ کا انتظار کرنے لگی۔ معاً رنکن کی اس پر نظر پڑی تو وہ سب کو چھوڑ کر اس کی طرف آگیا۔
''ہائے......'' رنکن نے اس کی طرف بڑھتے ہوئے کہا۔
''روز...... روز آئینز...... میں نے کہا تھا نا کہ میں پھر آؤں گی......'' روز نے جذباتی انداز میں کہا۔
''مجھے بھی یقین تھا۔ جذبات کے حصار میں جکڑا ہوا شخص اپنے وعدے کا ضرور پاس رکھتا ہے......'' رنکن نے آہستہ سے جواب دیا۔
''خوب کھیلے ہو......'' روز نے بات آگے بڑھائی۔
''میں ہمیشہ ہی اپنی استطاعت سے بڑھ کر کھیلتا ہوں اور اچھا کھیلنے کی کوشش کرتا ہوں۔'' رنکن نے مسکرا کر کہا۔
''کچھ وقت میرے لیے ہوگا......'' روز آئینز نے جھجکتے ہوئے پوچھا۔ ''میں آپ کی بہت بڑی فین ہوں۔'' اسی لہجے میں کہا گیا۔
''مشکل ہے...... معذرت خواہ ہوں۔'' رنکن نے جواب دیا۔
''پھر؟'' روز آئینز نے دوبارہ پوچھا۔
''یہ میرا موبائل نمبر ہے......'' روز آئینز نے جلدی سے ایک کاغذ پر اپنا سیل نمبر لکھ کر اسے دے دیا۔ ''میں آپ کی کال کی منتظر رہوں گی۔''
''کوشش کروں گا۔ اگر یاد رہا......'' رنکن نے سپاٹ لہجے میں جواب دیا اور ایک بار پھر آٹو گراف لینے والے تماشائیوں کی طرف بڑھ گیا۔
روز آئینز تیزی سے گیلری کراس کر کے نیچے آگئی جہاں نورا اس کا انتظار کر رہی تھی۔
''تو آخر مل ہی آئی ہو اپنے دوست سے......'' نورا

نے پوچھا۔

"ہاں...... نورا! میں بہت خوش ہوں...... اس نے جاتے ہی مجھے پہچان لیا تھا۔ اس طرح لگ رہا تھا، جیسے آج میں نے ایک بہت بڑا قلعہ فتح کرلیا ہے۔" روز نے جذبات سے بھرے لہجے میں کہا۔

"خدا کرے ایسا ہو...... آؤ باہر چلتے ہیں اور میں تمہیں بتاتی ہوں رنکن سے میری ملاقات کیسے ہوئی۔" وہ دونوں میدان سے نکل کر گھاس لگے ایک اور قطعۂ اراضی پر آگئیں۔

☆☆☆

"لوکس رنکن کارا کاس شہر کی مضافاتی بستی کا رہائشی ہے۔ یہ بستی آج بھی پسماندہ اور غریب ترین بستی ہے۔ یہاں کے رہنے والوں کے مکانات کی چھتیں پتوں کی بنی ہوئی ہیں اور مکانوں کے فرش کچے ہیں۔ بارشوں کے دنوں میں اس بستی کی زمین سے ایسی سڑاند اٹھتی ہے کہ وہاں سے گزرنا مشکل ہوجاتا ہے۔ میرے والد جوزے فیلکس کا تو تمہیں علم ہے، وہ کارا کاس میں موٹر گاڑیوں کو اسمبل کرنے والی فرم میں کام کرتے تھے۔ وہ اکثر و بیشتر اس آبادی میں غریب لوگوں کی مدد کرنے جاتے رہتے تھے اور کبھی کبھار میں بھی ان کے ساتھ اس بستی میں چلی جاتی تھی۔ لوکس رنکن کی والدہ میرے والد کو جانتی تھی۔ وہ ابھی تک نہایت کسمپرسی کی حالت میں زندگی کے دن پورے کررہی تھی۔ اس کے شوہر کو حکومت سے بغاوت کے جرم میں گرفتار کرکے اس پر اتنا تشدد کیا گیا تھا کہ وہ ان کی حراست ہی میں دم توڑ گیا اور پھر اس کی لاش کتنے دن جنگل میں پڑی رہی۔ اس کے گھر کو فوجیوں اور گوریلوں نے مل کر آگ لگادی تھی۔ لوکس رنکن نے اس کے بعد اسکول جانا چھوڑ دیا تھا اور اس کی والدہ لوگوں کا بچا کھچا کھانا اکٹھا کرکے لاتی تو یہ لوگ اپنے پیٹ کی آگ بجھاتے۔ یہ سب مجھے میرے والد نے بتایا تھا۔

"لوکس رنکن بچپن ہی میں مزدوری کرنے لگا تھا کیونکہ اس کے علاوہ اس کے چھوٹے چھوٹے اور بھی بھائی بہن تھے اور ان کا پیٹ تو بہرحال ان کو بھرنا ہی تھا۔ میرے والد جب بھی اس آبادی میں جاتے، وہ لوکس رنکن کی والدہ کی ضرور امداد کرتے تھے۔ مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ ایک روز میں جب اپنے والد کے ساتھ اس بستی میں گئی تو اس کی والدہ نے روتے ہوئے میرے والد سے کہا تھا۔

"برادر...... آپ کو گاڈ...... کا واسطہ، میرے بچے کو بچالیں۔ وہ آج پھر آئے تھے......"

"کون؟" میرے والد نے پوچھا تو اس نے سسکیوں میں بتایا۔

"وہ فوج کے سپاہی تھے یا شاید گوریلا تھے۔ انہیں ابھی تک شک ہے کہ ہم حکومت کے خلاف کام کرتے ہیں حالانکہ سب جانتے ہیں کہ جو عورت لوگوں کے بچے کھچے کھانے اکٹھا کرکے اپنے بچوں کا پیٹ پالتی ہو، وہ حکومت سے کس طرح ٹکر لے سکتی ہے۔ ان کو شک ہے کہ میرے شوہر کے بعد میرا۔ بیٹا حکومت کی مخالفت میں کام کررہا ہے۔ لوکس تو ابھی بہت چھوٹا ہے، وہ جہاں محنت کرنے جاتا ہے وہاں کا مالک بھی اسے کبھی محنتانہ دے دیتا ہے اور کبھی جواب دے دیتا ہے۔ وہ بھی سرمایہ داروں کے ساتھ ملا ہوا ہے۔ اس کا چھوٹا بھائی ایسو اکثر بیمار رہتا ہے وہ ہر وقت ایک چبوترے پر لیٹا رہتا ہے۔ اس کی دوا کے لیے ہمارے پاس پیسا نہیں ہے۔ مگر وہ بضد ہے کہ ہم حکومت مخالف گروہ سے تعلق رکھتے ہیں۔ برادر...... ہمارے لیے کچھ کیجیے......"

"اس کی باتیں سن کر میرے والد کی آنکھوں میں آنسو آگئے تھے اور میں تو زار زار رونے لگی تھی۔ میں نے اپنے والد کا ہاتھ تھامتے ہوئے انہیں کہا تھا کہ وہ ان کے لیے ضرور کچھ کریں۔"

"ابھی وہ یہ باتیں بتا رہی تھی کہ باہر سے رنکن بھی آگیا۔ وہ ابھی نوجوانی کی عمر میں تھا لیکن اس کے جسمانی اعضا ابھی سے خاصے مضبوط نظر آرہے تھے۔ ڈیڈی رنکن کو اپنے ساتھ ہی لے آئے اور اسے بڑی تگ و دو کے بعد اپنی فرم میں ملازم رکھوادیا۔ اس کے بعد بھی ہم اس بستی میں جاتے رہے۔ اب رنکن کے گھرانے کو کچھ آسودگی مل گئی تھی۔ مگر ابھی تک ان کے رہنے سہنے کا انداز نہ بدلا تھا۔ وہ کہتے ہیں نا، غربت کی بیماری انسانی جسم سے چمٹ جائے تو وہ کئی نسلوں تک اپنے اثرات نہیں چھوڑتی۔ یہی ان کے ساتھ ہوا۔ رنکن فرم میں کیا ملازم ہوا، اس نے پر پرزے نکالنے شروع کردیے۔ پھر ایک روز وہ فرم سے کاروں کے پرزے چراتا ہوا پکڑا گیا۔ ڈیڈی بتاتے ہیں کہ اس معاملے پر فرم نے انکوائری کمیٹی بٹھادی اور اس کی پاداش میں ڈیڈی پر بھی الزام عائد کیا گیا۔ کیونکہ ڈیڈی کی سفارش پر اسے ملازمت دی گئی تھی۔ جب ڈیڈی انکوائری کمیٹی کے آگے پیش ہوئے، تو اس کے ایک رکن نے انتہائی رعونت سے ان پر سوالات کی بارش کردی۔

"تو کیا جوزے فیلکس تم نے اسے فرم میں ملازم رکھوایا تھا؟ اس کے ساتھ تمہارے تعلقات کی نوعیت......" ڈیڈی نے بڑے تحمل سے جواب دیا۔

''محض غربت ......! اس کی والدہ لوگوں کا چھوڑا ہوا کھانا اکٹھا کر کے اپنے بچوں کو کھلاتی تھی، مجھ سے برداشت نہ ہوا۔''

''تمہیں پتا ہے، اس لڑکے کا والد حکومت کا باغی تھا اور اسے حکومتی کارندوں نے ہلاک کر ڈالا تھا۔'' دوسرا سوال کیا گیا۔

''میں نے بھی یہی سنا تھا لیکن میرے نظریے کے مطابق ایک کی سزا اس کے کنبے کو تو نہیں دی جا سکتی۔'' ڈیڈی نے جواب دیا۔

''لیکن اس کا تعین کرنا تمہارا کام نہیں ہے۔ ہمیں پتا چلا ہے کہ تم بھی اس کے جرم میں برابر کے شریک ہو۔''

''میری ملازمت کا پچھلا ریکارڈ میری گواہی دے گا کہ میں نے کبھی بھی فرم کے کسی معاملے میں بددیانتی نہیں کی۔''

''جوزے فیلکس ہمیں یہ بھی پتا چلا ہے کہ تمہارا اور رنکن کی والدہ کا معاملہ کچھ اور بھی ہے۔ جس کی بنا پر تم ان لوگوں کو دوسرے معاملات میں زیادہ عزیز جانتے ہو۔'' دوسرے رکن کمیٹی نے پوچھا۔

''یہ میرے کردار پر ایک رکیک حملہ ہے۔ میں اسے برداشت نہیں کر سکتا۔'' ڈیڈی نے مضبوط لہجے میں جواب دیا۔

''ٹھیک ہے، آپ جا سکتے ہیں۔'' انہوں نے کہا۔

''بہت جلد تمہیں فیصلے کا پتا چل جائے گا......'' انکوائری کمیٹی کے بڑے رکن نے کہا اور ڈیڈی کو ان کے ملازمتی عہدے سے فی الوقت ہٹا کر گھر بھیج دیا گیا۔

''جرم ثابت ہونے پر رنکن کو فرم نے ملازمت سے فارغ کر دیا اور میرے ڈیڈی جوزے فیلکس کو وارننگ دیتے ہوئے اس شہر میں بھیج دیا گیا۔ سارینا اس میں موٹر گاڑیوں کی اسمبلنگ کا نیا کارخانہ لگایا گیا تھا۔ یوں ہم ادھر تمہارے قریبی قصبے میں شفٹ ہو گئے۔'' وہ کہانی سنا کر ذرا دیر کو رکی تھی کہ روز آئینز بول اٹھی۔

''پھر لوکس رنکن کا کیا ہوا؟''

''ہمیں یہاں آئے کافی عرصہ بیت گیا۔ جب ایک روز ڈیڈی صبح کا ناشتا کر رہے تھے۔ ان کی عادت تھی کہ وہ ناشتے کے ساتھ اخبار بھی پڑھتے رہتے تھے۔ انہوں نے ایل ناسیونال اخبار میں چھپی ایک خبر پڑھ کر حیرت سے مام کو مخاطب کرتے ہوئے اونچی آواز میں کہا۔

''سنتی ہو...... ماویس...... رنکن کو بیس بال کی قومی ٹیم کا رکن بنا دیا گیا ہے۔''

اس بات پر میرے بھی کان کھڑے ہو گئے...... مام نے پوچھا۔

''کس کی بات کر رہے ہو جوزے......!''

''ارے وہی لڑکا...... جس کو میں نے اپنی فرم میں ملازم رکھوایا تھا۔ لوکس رنکن...... جو فرم سے پرزے چراتا ہوا نکالا گیا تھا اور کتنے عرصے تک میں تجل ہوتا رہا تھا۔ اسی جرم میں میرا کارا کاس سے تبادلہ کر دیا گیا تھا۔''

''پتا چلا کہ آج کے دور میں کسی سے نیکی کا کیا صلہ ملتا ہے...... میرے خیال میں آئندہ تم ایسی غلطی نہیں دہراؤ گے، کس قدر ہزیمت اٹھانا پڑی تھی یاد ہے نا......'' مام نے ڈیڈی پر چوٹ کی۔

''روز آئینز یہی وہ لوکس رنکن ہے......'' نورا پرنانڈیز نے کہانی ختم کی۔

''میرا خیال ہے ماضی سے انسان بہت کچھ سیکھ جاتا ہے اور پھر تمہیں یہ تو علم ہے غربت انسان کا سب سے بڑا جرم ہوتا ہے۔ میرے خیال میں لوکس رنکن اپنے ماضی سے بہت کچھ سیکھ چکا ہے۔ اب وہ امیر ہو چکا ہے اور اس کی عادات میں بھی خاصی تبدیلی آ چکی ہے......'' روز آئینز نے آہستہ سے جواب دیا۔

''ماضی انسان کا پیچھا نہیں چھوڑتا...... بالکل اسی طرح جیسے برسوں کی غلامی کے اثرات قوموں کی شناخت بن کر رہ جاتے ہیں۔ مجھے بھی رنکن کے کردار میں دلچسپی پیدا ہو چکی تھی۔ اب وہ ایک مشہور اور عالمگیر شہرت رکھنے والا کھلاڑی بن چکا تھا اور اس کے کردار سے بہت سی رومانوی داستانیں بھی وابستہ ہو چکی تھیں جن کا انجام ہمیشہ کی طرح بھیانک رہا ہے۔ وہ بھی اسی بستی کی رہنے والی تھی۔'' نورا پرنانڈیز دوبارہ گویا ہوئی۔

☆☆☆

''سونیا ایلواریز اسی بستی کی وینز ویلوی حسن کا شاہکار تھی۔ اس کا بچپن لوکس رنکن کی طرح غربت ہی میں گزرا تھا۔ اس کے والدین کھیتوں میں کام کرتے تھے۔ سونیا اپنی ماں کے ساتھ اکثر امداد لینے ہمارے گھر آیا کرتی تھی۔ اس سے میری واقفیت اپنے گھر ہی میں ہوئی تھی۔ پندرہ سولہ سال کی لمبے قد اور دبلی پتلی سی، ہنستی آنکھوں والی سونیا بہت جلد ہمارے گھر کے سب افراد سے گھل مل گئی تھی۔ میں نے اپنا پرانا موبائل جب اس کو دیا تو وہ بے حد شکر گزار ہوئی تھی اور میرے ہاتھ چومتے ہوئے اسے چلانے کی ترکیب سیکھنے لگی تھی۔ پھر وہ میری سہیلی بن گئی۔ تمہاری طرح...... اچھی سہیلی...... اب وہ مجھ سے اکثر

موبائل پر بات کرلیا کرتی تھی۔ یہ ان دنوں کی بات ہے۔ جب لوکس رنکن نیا نیا بیس بال کھیلنے لگا تھا۔ وہ رنکن سے محبت کرنے لگی تھی۔ دھیرے دھیرے وہ اس کی محبت میں اس قدر غرق ہوگئی کہ وہ ہر جگہ اور ہر وقت اس کے ساتھ نظر آنے لگی۔ بستی کے تمام لوگ خوش تھے کہ دونوں جب آپس میں شادی کریں گے تو وہ بستی کا ایک مثالی جوڑا ہوگا۔ پھر جب رنکن کو قومی بیس بال کی ٹیم کے لیے نامزد کیا گیا تو اس روز مجھے سونیا کا فون آیا۔ وہ رنکن کی نامزدگی پر بے حد خوش تھی۔ خوشی میں اس سے صحیح طرح گفتگو بھی نہیں ہو پا رہی تھی۔

''تم جانتی ہو نورا...... رنکن قومی ٹیم کے لیے نامزد ہوگیا ہے؟''

''تمہیں مبارک ہو سونیا...... کہو تم دونوں کے معاملات کیسے چل رہے ہیں؟'' میں نے پوچھا۔

''بہت بہتر...... دعا کرو...... ہمیں گاڈ...... نظرِ بد سے بچائے۔ وہ میرا بڑا خیال رکھتا ہے۔ اب ہمارا ارادہ ہے کہ جلد ہی جب کچھ رقم ہمارے ہاتھ لگی تو ہم اس بستی سے باہر نکل جائیں گے اور کاراکاس میں اپنا مکان خرید کر شادی کرلیں گے۔'' اس نے بتایا۔

''خدا کرے ایسا ہی ہو۔'' میں نے جواب دیا۔

''مجھے احساس ہونے لگا تھا کہ سونیا رنکن کی محبت میں بہت آگے جا چکی ہے اور اب کوئی بات یا رکاوٹ اس کے راستے کو نہیں بدل سکے گی۔ ان دنوں ہم اس شہر میں آچکے تھے۔ جب ایک روز میں نے اڑتی اڑتی خبر سنی کہ سونیا قتل ہو چکی ہے اور قتل کے شبہے میں رنکن کو گرفتار کرلیا گیا ہے۔ میں نے فون لگایا تو اس کی بیل خاصی دیر تک بجتی رہی۔ پھر اس کی ماں نے فون اٹھایا اور اس نے رندھی ہوئی آواز میں واقعے کی تفصیل بتائی۔

''تمہیں پتا ہے۔ سونیا رنکن سے کس قدر پیار کرتی تھی۔ وہ ہر وقت اس کا سایہ بنی رہتی تھی۔ رنکن اپنے میچوں کے سلسلے میں جہاں بھی جاتا، سونیا اس کے ساتھ ہوتی تھی۔ کچھ دنوں سے رنکن اس کی محبت سے اکتا چکا تھا۔ جس کا سونیا کو بے حد صدمہ پہنچا تھا۔ اس نے ایک روز روتے ہوئے مجھے بتایا تھا۔

''مام...... رنکن اب مجھ سے کنی کترانے لگا ہے۔ میں جب فون کرتی ہوں تو وہ فون ریسیو نہیں کرتا اور اگر فون اٹھاتا بھی ہے تو ادھر ادھر کی ہانکنے لگتا ہے۔ مجھے محسوس ہو رہا ہے کہ وہ یہ سب دانستہ طور پر کر رہا ہے اور مجھے چھوڑنا چاہتا ہے مام...... اگر اس نے ایسا کیا تو میں مر جاؤں گی۔''

''گھبراؤ نہیں...... اگر محبت سچی ہوئی، تو سب ٹھیک ہو جائے گا۔ محبت میں ایسے مرحلے آتے ہی رہتے ہیں۔'' میں نے اس کو تسلی دی۔

''لیکن مام...... میں یہ سب برداشت نہیں کرسکتی۔'' اس نے روتے ہوئے اپنا سر میرے کندھے پر لگا دیا۔ اس کے بعد وہ ہر وقت پریشان رہنے لگی تھی۔ خاموش خلاؤں میں گھورتی رہتی تھی۔ اس کی یہ حالت دیکھ کر میں خود پریشان تھی۔ اس روز بڑے دنوں کے بعد رنکن نے اسے فون کیا تھا۔ وہ بے حد خوش تھی۔ میں نے پوچھا تو اس نے بتایا۔

''مام...... تم واقعی ٹھیک تھیں۔ وہ آج بڑی معذرت کر رہا تھا۔ اپنے رویے پر معافی مانگ رہا تھا اور اس نے مجھ سے کاراکاس کے ایک ہوٹل میں شام کو ملنے کا کہا ہے۔''

''میں اگر آج گئی تو اس سے سارا حساب نمٹا کر آؤں گی۔ مجھ سے روز روز نہیں مرا جاتا...... شاید میں رات وہیں رہ جاؤں۔'' وہ بہت خوش دکھائی دے رہی تھی۔ اس کے چہرے پر چاہت کی وہی کرنیں پھوٹ رہی تھیں، جو ایسے وقت نوجوان لڑکیوں کے چہروں پر کھلتی ہیں۔

''پھر وہ شام کو یہاں سے چلی گئی اور رات وہیں رہی...... اگلے دن بھی اس کی کوئی خبر نہ آئی۔ دوسرے دن کی دوپہر تھی جب کسی نے مجھے آکر یہ خبر سنائی کہ رات سونیا کو قتل کر دیا گیا ہے اور کاراکاس میں ہوٹل کے ایک کمرے میں اس کی برہنہ لاش ملی ہے۔ لاش کو اسپتال کے سردخانے میں رکھوا دیا گیا ہے اور اس شبہے میں رنکن کو گرفتار کرلیا گیا ہے۔

''میں اپنے شوہر کے ساتھ پولیس اسٹیشن پہنچی تو پتا چلا کہ رات اس کے ساتھ اجتماعی زیادتی کی گئی اور پھر اسے گولی مار کر ہلاک کر دیا گیا۔ اس کے قریب شراب کی کھلی بوتلیں پڑی تھیں۔ رنکن موقعے پر موجود نہ تھا لیکن اسے کہیں نہ کہیں سے پکڑ لیا گیا ہے۔ رنکن بہرحال ابھی تک اس واقعے سے منحرف ہے......'' اس کی ماں نے سسکیاں لیتے ہوئے پوری کہانی میرے گوش گزار دی۔

نورا نے مزید بتایا کہ اس نے یہ کہانی اپنے والد کو سنائی تو انہوں نے افسوس کرتے ہوئے کہا۔

''رنکن سرمایہ داروں کی جس کلاس میں داخل ہونا چاہتا تھا، ہوسکتا ہے وہاں جانے کے لیے اس نے سونیا کو رشوت کے طور پر استعمال کیا ہو...... ہم ابھی تک اور نہ جانے کب تک غلامی کے ان اطوار کے زیرِ اثر رہیں گے۔''

☆☆☆

''1989ء سے پہلے کی بات ہے۔ جب ہم لوگ

اسپین سے آزادی حاصل کر کے بیٹھے تھے کہ امریکا ہماری معیشت اور ہمارے کاروبار پر اپنے پنجے مضبوط کرنے لگا۔ مجھے یاد ہے جب ہم لوگ کھیتوں میں کام کر رہے ہوتے تھے تو ہماری نگرانی گھوڑوں پر سوار ان کے گماشتے کیا کرتے تھے۔ کبھی کبھار یہ لوگ ہاتھوں میں کوڑے لیے پیدل ہی اپنے اپنے کھیتوں میں کام کرنے والے لوگوں کی نگرانی کرتے رہتے تھے۔

''جب تک یہ لوگ گردش کرتے رہتے۔ ہم لوگ خاموشی سے آنکھیں جھکائے کام میں مصروف رہتے تھے۔ جونہی اچانک یا کسی کام سے ہم نظریں اونچی کرتے تو ہماری پٹائی شروع ہو جاتی۔

''ہمارے پرزور اصرار پر اس رات بوڑھی دادی نے کہانی سنانا شروع کی۔ سچی بات ہے کہ ہماری نانیاں اور دادیاں جھوٹی کہانیاں سنا کر ہمیں سچ سکھایا کرتی تھیں......مگر اس رات نہ جانے دادی جان نے سچی باتیں بتانا شروع کر دی تھیں۔ دادی جان بتاتی تھیں۔

''وہ ہم پر بے تحاشا ظلم کرتے تھے اور ہم سر جھکائے یہ سب برداشت کر رہے تھے۔ 1989ء میں کارلوس آندرے پریز کی حکومت آئی تو لوگوں نے سکھ کا سانس لیا مگر برسوں کی بھوک اپنے ذہن سے چپکائے اس کے دور میں معیشت کو اور بھی ابتر بنا کر رکھ دیا۔ امریکا نے بظاہر اپنے ہاتھ کھینچ لیے تھے مگر قریبی پڑوسی ہونے کے سبب یہاں اپنے سارے اختیارات سرمایہ داروں کو سونپ گئے۔ اب سرمایہ دار ہماری زندگیوں کے مالک بن بیٹھے تھے۔ یہاں کی چیزوں اور یہاں کے تمام معاملات پر وہ سانپ کی طرح قابض ہو کر رہ گئے تھے اور یہ سلسلہ آج تک چلا آ رہا ہے۔ سرمایہ دار جو چاہیں کریں، ان سے پوچھنے والا کوئی نہیں ہے۔

''بچو......کہانیاں حقیقت ہوتی ہیں۔ ہم انہیں جھوٹ کا لبادہ پہنا کر ان سے دل بہلاتے ہیں۔ میں نے یہ کہانی آج اس لیے تمہیں حقیقت کے سفاک انداز میں بتائی ہے تاکہ تمہارے ذہنوں پر کندہ ہو کر رہ جائے کہ یہی ہماری تہذیب کی اصل حقیقت ہے اور اس لیے بھی کہ اب تم باشعور ہو چکے ہو اور میری آنکھیں کبھی بھی بند ہو سکتی ہیں۔''

☆☆☆

اپنے بیان حلفی میں لوکس نے بیان دیا تھا۔ ''یہ درست ہے کہ میں نے سونیا کو فون کر کے کارا کاس کے اس ہوٹل میں بلایا تھا۔ محض اس لیے کہ ہمارے درمیان جو غلط فہمیاں پیدا ہو چکی ہیں، ان کو دور کیا جا سکے اور یہ بھی بتانے کے لیے کہ جتنا عرصہ میں نے اسے ٹیلی فون نہیں کیا، اس کی وجہ کسی مافیا کے لوگوں کا مجھے مسلسل یہ دھمکیاں دینا تھیں کہ میں سونیا کا پیچھا چھوڑ دوں کیونکہ سونیا جیسی خوب صورت لڑکی پر ان کا حق زیادہ ہے۔

''اس روز میں سونیا کو کمرے میں چھوڑ کر کسی کام سے ہوٹل کے باہر چلا گیا تھا اور جب میں واپس پلٹا تو میرے کمرے میں لوگوں کا بے تحاشا ہجوم تھا۔ میں نے آگے بڑھ کر جب جاننا چاہا تو مجھے پتا چلا کہ میرے کمرے میں سونیا کی لاش پڑی ہے۔ کسی نامعلوم گروہ نے نہ صرف اسے زیادتی کا نشانہ بنایا تھا بلکہ اس کے جسم کے حساس مقامات پر گولیاں برسا کر انتہائی بھیانک اور متشدد.... انداز میں اسے قتل کر ڈالا تھا۔''

اس حلفی بیان کے باوجود عدالت نے اسے کافی عرصے تک زیر حراست رکھا اور پھر بعد میں اسے نہ جانے کیسے رہا کر دیا گیا۔ اس روز کے اخبار میں جب روز آئینز نے یہ خبر پڑھی تو اسے ایک بار پھر یہ یقین ہو گیا کہ یہ سب یقیناً لوکس کو اس کی شہرت سے خائف لوگوں نے پھنسانے کے لیے کیا تھا۔

ایک بار پھر اس کی محبت دوبارہ سے جاگ پڑی۔ باوجود اس کے کہ نورا نے لوکس رنکن کے کردار کی تصویر اس کے سامنے رکھ دی تھی مگر محبت لوگوں کی باتوں پر اعتبار ہی کب کرتی ہے۔ اس نے اس اخباری خبر کو دوبارہ پڑھا جس کے ذیل میں لکھا تھا کہ رنکن کی رہائی کے بعد ایک بار پھر اسے بیس بال ٹیم کا کپتان بنا دیا گیا ہے اور وہ امریکا میں اس کی چیمپئن شپ کھیلنے کو بہت جلد جا رہا ہے۔

اس نے فوراً اپنا موبائل نکال کر لوکس رنکن کا نمبر ملانا شروع کر دیا مگر ہر بار اس میں سے ایک ہی آواز سنائی دیتی۔

''آپ جس نمبر کو ملا رہے ہیں، وہ مصروف ہے۔ تھوڑی دیر بعد کوشش کریں......!''

مگر اس کا دل مان ہی نہیں رہا تھا لہٰذا وہ وقفے وقفے سے موبائل ملاتی رہی اور آخر اسے کامیابی مل ہی گئی۔ اس بار اس نے نمبر ملایا تو دوسری طرف گھنٹی جانے لگی۔ تھوڑے وقفے کے بعد ادھر سے فون اٹھا لیا گیا۔

''ہیلو...... میں روز بول رہی ہوں۔ روز آئینز فرام سبانیتا......!''

''کہو روز...... میں رنکن بول رہا ہوں۔''

''مبارک ہو رنکن...... کیس سے تمہاری جان چھوٹ گئی۔ یقین کرو میں نے تمہارے لیے بہت دعائیں مانگی

تھیں۔'' روز نے جلدی سے بتایا۔
''میرا ہر چاہنے والا میرے برے دنوں میں میرے لیے دعا کرتا رہا ہے۔ تمہارا شکریہ......'' رنکن نے سپاٹ لہجے میں کہا۔
''تمہاری چیمپئن شپ کب شروع ہو رہی ہے؟'' روز آئینز نے پوچھا۔
''ابھی کچھ دن باقی ہیں......'' اسی لہجے میں جواب دیا۔
''میں پھر فون کروں گی، لگتا ہے ابھی تم اپنے کیس کے حصار سے نہیں نکلے ہو...... یہی ایک دو روز بعد......'' یہ کہہ کر اس نے فون بند کر دیا۔
کہنے کو تو اس نے ایک دو روز کا کہہ دیا مگر یہ ایک دو روز اس کے لیے گزارنا بہت مشکل ہو گئے۔ اس کا جی چاہتا تھا کہ وہ کسی بھی صورت رنکن کے پاس پہنچ جائے اور جی بھر کر اس سے باتیں کرے۔ بالآخر تیسرے روز اس نے ایک بار پھر رنکن کا فون ملایا۔ پہلی ہی گھنٹی پر اس نے فون اٹھالیا۔ اب کی بار اس کی طبیعت دباؤ سے باہر آچکی تھی۔
''میں روز......!''
ابھی اس کے الفاظ باقی تھے کہ رنکن ہنستے ہوئے بولا۔
''روز آئینز...... بلبل کے چہکنے سے پہلے ہی اس کی آواز پہچان لی گئی تھی۔''
''جی...... کیسے ہیں...... میں آپ سے ملنا چاہتی ہوں......'' اس نے جذباتی انداز میں کہا۔
''تم کہاں ہو؟'' آگے سے پوچھا گیا۔
''سارینا اس شہر میں......'' روز آئینز چہکی۔
''خوش قسمتی سے میں بھی یہیں ہوں۔ ایک گھنٹے بعد آجاؤ، میں تمہارے شہر کے فاسٹ فوڈ ''گرین ہٹ'' پر تمہارا منتظر رہوں گا۔''
''اوکے......'' روز آئینز کی آواز خوشی سے تمتما اٹھی۔
پھر اس نے بڑی تیزی سے تیاری کی اور فوراً ٹیکسی کے ذریعے گرین ہٹ پہنچ گئی۔

☆☆☆

گرین ہٹ سارینا اس شہر کا سب سے مہنگا اور جدید فاسٹ فوڈ سینٹر تھا...... اس میں چھوٹے چھوٹے کیبن بنائے گئے تھے۔ بانس کی دیواروں سے بنے ہوئے ان کیبنوں کو سبز رنگ سے رنگا ہوا تھا اور ان کی چھتوں کو ہری کھجور کے بڑے بڑے پتوں سے ڈھانپا گیا تھا۔ لگتا تھا کسی نے بڑے ہی مصورانہ ٹچ دے کر اس کو بنایا تھا۔ وہ جب وہاں پہنچی تو اس کے مین گیٹ پر کھڑے چوکیدار نے جھک کر اسے سلام کیا اور انتہائی مؤدبانہ انداز میں بولا۔
''یس مس......!''
''میں رنکن کی مہمان ہوں۔''
''وہ بیس بال کا مشہور کھلاڑی لوکس رنکن؟'' اس نے پوچھا۔
''جی...... جی...... وہی......'' روز آئینز احساسِ فخر سے کچھ اور تن گئی۔
''دائیں طرف کی چوتھی ٹیبل کیبن نمبر سیون آپ کے لیے مخصوص ہے......'' اس نے بتایا اور روز آئینز بڑی تمکنت کے ساتھ چلتی ہوئی اندر داخل ہو گئی۔ گرین ہٹ کے اندر کا ماحول بھی خاصا رومینٹک تھا۔ جلد ہی وہ اپنے مخصوص کیبن میں پہنچ چکی تھی۔ وہ اندر پہنچی تو ایک چھ فٹ کے مضبوط اعضا والے ہسپانوی خدوخال کے حامل شخص نے اٹھ کر ہاتھ پھیلاتے ہوئے اس کا استقبال کیا اور مسکراتے ہوئے آہستگی سے بولا۔
''لوکس رنکن......!''
''رنکن کی محبت کے نشے میں چور رہنے والی روز آئینز۔'' روز آئینز نے اس کے مضبوط ہاتھوں کو پکڑتے ہوئے جذباتی انداز میں اپنا تعارف کروایا۔
''میری خوش قسمتی کہ تم جیسی ذہین اور خوب صورت لڑکی میرے چاہنے والوں میں سے ہے۔'' رنکن نے محبت کا جواب دیا پھر وہ اس کے سامنے والی نشست پر بیٹھ گئی۔
''مجھے فخر ہے کہ میرے ملک کا ایک آدمی شہرت کی بلندیوں کو چھو رہا ہے اور شہرت کی بلندیوں پر فائز یہ شخص میری چاہتوں کا مرکز ہے۔'' روز آئینز جذباتی ہو رہی تھی۔
''میں تمہیں یہ بتانے والا تھا کہ ہماری چیمپئن شپ دو ہفتے کے لیے ملتوی ہو گئی ہے اور میں دو ہفتے کے لیے فارغ ہوں......'' رنکن نے مطمئن لہجے میں بتایا۔
''کیا اس خوب صورت اور عظیم کھلاڑی کے یہ دو ہفتے میرے نام نہیں ہو سکتے؟'' روز خوشی سے بولی۔
''میرے لیے یہ بہت خوشی کی بات ہو گی کہ میں پیاری اور خوب صورت گڑیا کے ساتھ یہ دو ہفتے گزاروں گا...... میں شہر کے ہوٹل میں ٹھہرا ہوا ہوں۔ تمہیں میرے پاس آنے جانے اور وقت گزارنے کی پوری اجازت ہے۔ میں نے جب تمہیں پہلی بار دیکھا تھا، اسی وقت سے تمہاری موہنی سی صورت میری آنکھوں میں جم کر رہ گئی تھی۔'' رنکن نے اسے چڑھاتے ہوئے کہا۔
''یہی حال تو میرا تھا...... تمہیں کس نے مخبری کی......'' روز نے مسکراتے ہوئے کہا۔

''تمہاری ان خوب صورت آنکھوں نے......'' رنکن نے روز آئینز کی خوبصورت آنکھوں پر اپنی مضبوط اور لمبی انگلی رکھتے ہوئے نشان دہی کی۔

''ارے باتوں میں دھیان ہی نہیں رہا۔ آج میری سماعتوں کے جشن منانے کا دن ہے کہ میں خوب صورت آواز نہ صرف سن رہا ہوں بلکہ ذہانت سے بھری گفتگو کرنے والی فاختہ کے پروں جیسی ملائم وخوب صورت لڑکی میرے سامنے بیٹھی ہے۔'' رنکن نے ٹھہر ٹھہر کر گفتگو کی۔

''کسی بھی لڑکی کو باتوں کے حصار میں لینے کا فن تمہیں خوب آتا ہے۔'' روز بولی اور پھر کھل کر ہنسنے لگی۔

پھر انہوں نے فاسٹ فوڈ منگوایا۔ اس دوران وہ دونوں گفتگو بھی کرتے رہے۔ روز آئینز اب پوری طرح رنکن کی محبت میں گرفتار ہو چکی تھی۔

اور پھر یہ دو ہفتے پارکس، ہوٹلز، تفریحی مقامات اور دریا کنارے ٹھنڈی.... ریت پر گزارتے ہوئے اتنی جلدی گزر گئے کہ دونوں کو اس کا احساس ہی نہ ہو پایا۔ پھر اس روز جب رنکن نے اسے یاد دلایا کہ کل وہ واپس اپنے شہر چلا جائے گا کیونکہ اسے اب امریکا میں بیس بال چیمپئن شپ کے لیے تیاری کرنا ہے تو روز آئینز کی آنکھوں میں بیتے لمحوں کی یادیں آنسو بن کر چھلکنے لگیں۔

''ابھی تو میرا جی نہیں بھرا تھا......'' روز نے روہانسی آواز میں کہا۔

''کچھ ہی روز کی تو دوری ہے۔ شاید دس پندرہ دن یا ایک ماہ...... میں پھر واپس لوٹ آؤں گا۔ اپنی جان کے پاس......'' رنکن نے اس کی آنکھوں میں آئے آنسوؤں کو انگلی کی پور سے صاف کرتے ہوئے کہا۔

''جب میں تم سے نہیں ملی تھی تو میرے لیے دوری کوئی معنی نہیں رکھتی تھی۔ مگر اب میں اپنے پیارے رنکن سے ایک لمحہ بھی دور رہنا گناہ سمجھتی ہوں۔'' اس نے لرزتی کانپتی آواز میں کہا۔

''حوصلہ رکھو۔ میں چیمپئن شپ سے فارغ ہو کر جلد واپس آجاؤں گا۔'' رنکن نے اسے حوصلہ دیتے ہوئے کہا۔

''میں بھی تمہارے ساتھ چلتی ہوں۔'' روز نے تجویز پیش کی۔

''نہیں، یہ ٹھیک نہیں ہے۔ تمہارے والدین کو تشویش ہوگی۔ میں آؤں گا تو پھر ان سے ملاقات کے بعد تمہیں ہمیشہ کے لیے مانگ لوں گا۔ اس وقت تک حوصلہ رکھو۔'' رنکن نے اس کے گال تھپتھپاتے ہوئے کہا اور پھر وہ چلا گیا۔

☆☆☆

امریکا میں ہونے والی بیس بال چیمپئن شپ کبھی کی ختم ہو چکی تھی۔ رنکن کی ٹیم فائنل میں پہنچ کر امریکن ٹیم سے شکست کھا گئی تھی مگر ابھی تک رنکن واپس نہیں آیا تھا۔

روز کو یہ سوچ سوچ کر وحشت ہو رہی تھی کہ رنکن آخر کہاں رہ گیا ہے۔ اس نے کئی بار موبائل پر رنکن کا فون ملانے کی کوشش بھی کی مگر دوسری طرف سے یا تو کوئی جواب موصول نہ ہوتا تھا یا پھر موبائل ہی بند ملتا تھا۔ آخر ایک روز وہ سارینا اس میں بیس کلب کے دفتر میں چلی گئی تا کہ رنکن کا پتا کروایا جا سکے۔ دفتر کے باہر ہی اسے دو نوجوان لڑکے مل گئے۔ اس نے امریکا میں ہونے والی چیمپئن شپ کے بارے میں جب ان سے پوچھا تو دونوں ایک دوسرے کے ہاتھ پر ہاتھ مار کر ہنسنے لگے۔

''کس دیس میں رہتی ہو محترمہ...... چیمپئن شپ کو تو ختم ہوئے بھی ایک ماہ ہو چکا ہے۔'' ان میں سے ایک نے بتایا۔

''مگر ٹیم کے لوگ ابھی تک وہیں ہیں کیا......'' روز نے پوچھا۔

''انہیں بھی اپنے اپنے گھروں میں پہنچے مدت ہو چلی ہے۔ آپ کو کس کی تلاش ہے؟'' دوسرے نے طنزیہ انداز میں پوچھا۔

''وہ...... رنکن......!'' روز نے رکتے ہوئے لڑکھڑاتے لہجے میں پوچھا۔

''ہا...... ہا...... وہ رنکن...... وہ پلے بوائے...... ارے بھولی لڑکی کس آس پر دن بتا رہی ہو۔ اس نے تو وہاں ایک امریکن لڑکی سے شادی کر لی ہے۔'' اسی لڑکے نے قہقہہ لگاتے ہوئے بتایا۔

''کون...... کس نے کر لی شادی؟'' شاید روز کو اپنی سماعت پر یقین نہیں آیا تھا۔

''اسی تمہارے رنکن نے...... کیا نام تھا اس امریکن گوری کا...... ہاں یاد آیا جیکولین...... وہ تو وہاں اپنا ہنی مون منا رہا ہے۔ عنقریب واپسی پر ہمارا کلب اس کی دعوت کر رہا ہے۔ تمہیں بھی آنے کی پیشگی دعوت ہے۔ خود اپنی آنکھوں سے دیکھ لینا...... اس نئے جوڑے کو......'' دوسرے نے وضاحت کرتے ہوئے انتہائی طنز سے اسے بتایا۔

''یہ میرا نمبر لے لو۔ مجھے اطلاع ضرور دینا۔'' روز نے ٹوٹے ہوئے لہجے میں کہا۔

اور وہ ایک بار پھر ناکام ونامراد واپس لوٹ آئی۔ اسے یوں لگا جیسے اس کی انتہائی قیمتی چیز اس سے چھین لی

گئی ہو۔ اداسیوں اور محرومیوں کا موسم اس پر کچھ اس طرح سے اترا کہ اس کا پورا وجود خزاں رسیدہ ہو کر رہ گیا تھا۔ اس نے کلب کے ساتھ مسلسل رابطہ رکھا ہوا تھا کہ کب وہ رنکن کی دعوت کرتے ہیں۔ وہ ایک بار یا پھر شاید آخری بار اس سے ملنا چاہتی تھی اور اپنی دنیا سے اس کا رابطہ تقریباً ختم ہو کر رہ گیا تھا۔ بڑی دیر کے بعد اس نے آج نورا... کا فون سنا تھا۔ اس نے روتے ہوئے اسے بتایا تھا۔

''نورا...... میرا سب کچھ ختم ہو گیا ہے......''

''روز! میں نے تمہیں پہلے ہی منع کیا تھا۔ ہر چمکنے والی چیز سونا نہیں ہوا کرتی... مگر تمہاری ضدی طبیعت نے میری ایک نہ مانی۔ میں نے تمہیں سونیا کے انجام کا بھی بتایا تھا۔ تمہیں اس کے مکروہ کردار کے بارے میں بھی سمجھایا مگر تم اڑی رہیں...... لیکن اب اپنے دل کو سمجھاؤ اور اسے بھول جانے کی کوشش کرو۔'' نورا نے ایک بار پھر اسے سمجھانے اور اس کی ہمت بندھانے کی کوشش کی تو وہ بولی۔

''نورا...... میری زندگی میں اب کوئی چارم نہیں رہا...... میں خود کو سزا دینے کی کوشش میں ہوں۔''

''روز...... تمہیں میری قسم ہے۔ کسی قسم کا کوئی غلط قدم نہ اٹھانا۔ ابھی ہمیں تمہاری بڑی ضرورت ہے۔'' نورا نے التجائی انداز میں کہا۔

پھر روز آئینز نے موبائل بند کر دیا۔ اس روز کے بعد اس نے پھر کبھی نورا کا فون نہیں سنا۔ انہی دنوں ایک بار اس کے موبائل پر نئے نمبر کے ہندسے چمکے۔ اس نے فون آف کر دیا۔ تھوڑی دیر بعد دوبارہ بھی ہندسے چمکنے لگے۔ تو اس نے جھنجلاتے ہوئے موبائل آن کیا۔ دوسری طرف سے ایک انجانی آواز سنائی دی۔

''محترمہ! کیا بات ہے، فون کیوں نہیں اٹھا رہیں؟ میں وہی ہوں، جس نے اس روز تمہیں بتایا تھا کہ ہم رنکن کی دعوت کرنے والے ہیں۔ کل شام اس کی دعوت ہے۔ آپ کا دعوت نامہ کہاں پہنچاؤں...... کیا آپ آنا پسند کریں گی؟'' اس نے تفصیلاً بتایا۔

''ضرور آؤں گی...... دعوت نامہ میں اسی دن باہر گیٹ سے لے لوں گی۔ میرا وہیں انتظار کرنا پلیز......'' اس نے فون بند کر دیا اور مقررہ دن وہ صبح ہی صبح بیس بال کلب کے دفتر میں آ گئی۔

وہ لڑکا گیٹ پر کھڑا اسی کا منتظر تھا۔ اس نے گیٹ پاس اسے دیا اور خود اندر چلا گیا۔ وہ گیٹ پر کھڑے ملازم کو گیٹ پاس دکھاتے ہوئے اندر چلی گئی۔ کچھ ہی دیر بعد فنکشن شروع ہو گیا۔ پہلے چند لوگوں نے رنکن اور جیکولین کی شادی پر اسے مبارک باد دی اور امریکا سے اپنے ملک کے تعلقات کو خوش آئند قرار دیا۔ پھر اس کے بعد کھانا شروع ہو گیا۔ روز آئینز بھی دل گرفتہ ہو کر دعوت میں شریک ہوئی۔

جیکولین انتہائی خوب صورت اور نازک اندام سی لڑکی تھی۔ ایسی حسین کہ ہاتھ لگانے سے میلی ہو جائے...... کھانے کے بعد اچانک جیکولین ایک طرف جانے لگی۔ یہی موقع تھا۔ روز آئینز بھی اسی پھرتی کے ساتھ اس کی طرف بڑھی اور دو چار لمبے قدم اٹھاتی ہوئی اس کے قریب پہنچ گئی۔

''ہائے...... روز آئینز...... میں سانتینا سے ہوں۔ شادی مبارک......'' روز آئینز نے اپنا ہاتھ آگے بڑھایا۔

''میں جیکولین ہوں...... اب جیکولین رنکن......'' جیکولین نے مسکراتے ہوئے اس کا ہاتھ تھام لیا۔

''آپ کہاں سے ہیں؟'' روز نے پوچھا۔

''امریکن......''

اس کی اس بات نے تو گویا روز آئینز کا پارہ چڑھا دیا تھا۔

''دیکھو جیکولین، تم نے ہمارا سب کچھ لوٹ لیا۔ ہماری معیشت...... ہماری دولت...... ہماری شناخت...... سب کچھ...... اور تم نے ہمارے گالوں پر ظلم و استبداد کے اتنے تھپڑ مارے کہ ہمارے گال سرخ ہو کر رہ گئے۔ مگر میں اب یہ ہرگز نہ ہونے دوں گی۔ ہمارا ایک گال سرخ ہے تو میں اپنا دوسرا گال تمہارے ظلم سہنے کے لیے پیش نہیں کروں گی...... اب ہمیں اپنا حق لینا ہوگا۔ کسی بھی صورت......''

وہ اس کی تلخ باتوں کو سن کر نہ صرف حیران ہو گئی بلکہ سہم بھی گئی تھی...... ممکن تھا وہ وہاں سے بھاگ جاتی کہ روز آئینز نے اپنے...... پرس سے پستول نکالا اور اسے گولیوں سے چھلنی کر دیا۔

پے در پے گولیوں کی آواز سن کر سب لوگ ادھر پہنچ گئے اور چیختی چلاتی روز آئینز کو قابو کر لیا گیا۔ رنکن بھی وہاں آ گیا تھا، جسے دیکھ کر ہذیانی انداز میں روز آئینز بولی۔

''ڈرپوک...... بزدل...... تم نے ہر انداز میں ان لٹیروں کے آگے اپنا گال پیش کر دیا تاکہ وہ ظلم و استبداد کے تھپڑوں سے اسے سرخ کر ڈالیں...... بلکہ ایک گال پر تھپڑ کھا کر ہمیشہ دوسرا گال آگے کرتے رہے مگر میں نے اپنا دوسرا گال پیش نہیں کیا...... دیکھ لو...... بزدل رنکن...... دیکھو...... سرخرو کون ہوا...... تم یا میں......'' لوگ اسے گھسیٹ کر پولیس اسٹیشن لے گئے۔ وہ باغی جو ٹھہری تھی۔



بڑا ہاتھ

فاروق انجم

کچھ لوگوں کے خیال میں بڑے قدم اٹھانے سے سفر جلدی طے ہوجاتا ہے مگر انہیں یہ ادراک نہیں ہوتا کہ منزل اگر دور ہو تو انسان سفر مکمل ہونے سے پہلے ہی تھکن سے چُور ہو جاتا ہے... اس طرح کچھ بھی ہاتھ نہیں آتا... اس کا حال بھی کچھ ایسا ہی ہوا جب ایک بڑا ہاتھ مارنے کے خیال سے بے خیالی میں بہت چھوٹا کارنامہ انجام دے ڈالا۔

ہواؤں میں محل بنانے والے ایک کاریگر کی کارکردگی

مسٹر جارج کے پاس ملازمت کرتے مجھے تقریباً بیس دن ہوگئے تھے۔ اس نوکری سے نا صرف میں اُکتا گیا تھا بلکہ مایوس بھی ہوگیا تھا۔ اب مجھے صرف اپنی تنخواہ کا انتظار تھا۔ تنخواہ ملتے ہی میں نے وہاں سے رفوچکر ہونے کا پکا ارادہ کرلیا تھا۔

چھوٹی موٹی چوری کرنا، جیب کاٹنا اور کسی کو دھوکا فریب دے کر اس سے پیسے بٹور لینا میرا پیشہ ہے۔ چھوٹے چھوٹے ہاتھ مارتے ہوئے میں بوریت محسوس کرنے لگا تھا، اس لیے چاہتا تھا کہ کوئی بڑا ہاتھ ماروں تاکہ میرے پاس زیادہ دولت آسکے اور میں آسودگی کے ساتھ چند دن عیش و آرام کے ساتھ گزار سکوں۔ اپنی سوچ کو میں نے عملی جامہ پہنانے کے لیے موٹے تازے شکار کی تلاش شروع کردی تھی۔ اچانک ایک دن ایک اخباری اشتہار پر میری نظر پڑی۔ مسٹر جارج کو اپنے گھر کے لیے ایک ملازم کی ضرورت تھی۔ میں نے سوچا اگر مجھے اس گھر میں ملازمت مل جائے تو میں بڑی آسانی کے ساتھ اس گھر کا صفایا کرسکتا ہوں۔ ان کے بارے میں، میں نے سرسری طور پر کہیں سنا ہوا تھا کہ وہ ایک باحیثیت آدمی

ہیں۔

مسٹر جارج ساٹھ سال کی عمر کے صحت مند شخص تھے۔ ان کی بیوی ڈیڑھ سال قبل فوت ہوگئی تھی۔ اولاد کوئی نہیں تھی اور بیوی کی چھوڑی ہوئی دولت کے وہ اکیلے وارث تھے۔ یہ مزید معلومات ان کے گھر جاتے ہوئے مجھے ٹمی نے بتائی تھیں۔ میں نے اس کی کھٹارا کار میں محض لفٹ لی تھی۔ یونہی مسٹر جارج کا ذکر چھڑا تو وہ بڑبولا ایک دم شروع ہوگیا۔ باتوں باتوں میں اس نے یہ بھی بتادیا کہ مسٹر جارج کے پاس کوئی ملازم نہیں ٹکتا کیونکہ ان کے پاس کام کے مقابلے میں تنخواہ بہت قلیل ملتی تھی۔ مجھے تنخواہ سے کوئی سروکار نہیں تھا میں وہاں ایک واردات کی نیت سے جارہا تھا، اس لیے میں خوش تھا کہ یہ سب باتیں میرے حق میں ہیں۔

مسٹر جارج نے میرا تفصیلی انٹرویو نہیں لیا۔ میرے ذمے گھر کی صفائی اور کھانا پکانے سے لے کر بازار سے سودا سلف لانے تک، سب ہی کام تھے۔ چند روز کے سروے میں، میں نے اندازہ لگالیا کہ مسٹر جارج کے گھر میں کوئی ایسی قیمتی چیز نہیں تھی جسے میں اٹھا کر فی الفور فروخت کرکے کچھ رقم حاصل کرسکتا۔ مگر ٹمی کی بات بھی میرے ذہن میں تھی کہ مسٹر جارج نے اپنی نقدی وغیرہ گھر میں ہی کسی خفیہ جگہ چھپا کر رکھی ہے۔ رہی جائداد وغیرہ تو وہ کہیں چھپانے والی چیز نہیں تھی۔

بوڑھے جارج کو دو شوق تھے۔ ایک یہ کہ وہ کم و بیش ہر وقت مجھے اپنی جوانی کے واقعات سناتے رہتے تھے۔ دوسرا شوق کتاب پڑھنا تھا۔ بلاناغہ وہ سہ پہر کو ہاتھ میں چائے کا کپ لے کر باہر برآمدے میں کرسی پر براجمان ہوکر کوئی نہ کوئی کتاب پڑھتے تھے۔ میں اس دوران گھر کا کونا کونا چھان مارتا مگر مجھے پھوٹی کوڑی ملنے میں بھی کامیابی نہیں ہوسکی تھی۔

مسٹر جارج کے گھر میں چھپی دولت کے بارے میں سراغ لگانے میں مجھے یکسر ناکامی کا منہ دیکھنا پڑا۔ وہ چھوٹا سا گھر تھا۔ فارغ اوقات میں گھر کا چپا چپا چھان لینے میں کوئی دقت پیش نہیں آئی تھی۔ میں مایوس و ناکام، اپنی قلیل تنخواہ کا انتظار کرنے لگا۔ مجھے یہ شک بھی تھا کہ مسٹر جارج مہینا ختم ہوتے ہی اپنی کوئی مجبوری بیان کرکے مجھے تنخواہ سے ہی محروم نہ کردیں۔

مہینا ختم ہونے پر مسٹر جارج نے مجھے اپنے پاس بلایا۔ پہلے میری اور میرے کام کی تعریف کرنے کے ساتھ ساتھ میری شرافت کو بھی اچھے الفاظ میں پذیرائی دی اور پھر مجھے اپنے کمرے میں لے گئے۔

سامنے ایک شیلف دیوار کے ساتھ بنی ہوئی تھی۔ مسٹر جارج نے اسے مخصوص جگہ سے پکڑ کر الماری کی طرح کھولا تو سامنے مجھے لوہے کا سیف دکھائی دیا۔ میں متحیر نگاہوں سے دیکھنے لگا کہ مسٹر جارج نے کیا خفیہ جگہ بنائی ہے۔ پھر مسٹر جارج نے سیف کھولی اور اندر سے لکڑی کا ایک بکس نکالا۔

”میں اپنی قیمتی چیزیں اس میں رکھتا ہوں۔ آج میرے پاس موجود ہر قیمتی چیز اس میں محفوظ ہے۔ کل کوئی زیادہ قیمتی چیز آئے گی تو وہ ان میں سے کسی کی جگہ لے لے گی۔“ مسٹر جارج نے میری طرف دیکھ کر مسکراتے ہوئے کہا۔ پھر جب مسٹر جارج نے لکڑی کا بکس کھولا تو میری آنکھیں حیران رہ گئیں۔ وہ بکس نوٹوں سے بھرا ہوا تھا۔ مسٹر جارج نے کب میری تنخواہ میرے ہاتھ میں رکھی اور کب وہ بکس واپس رکھ کر سیف بند کرکے اس کے آگے پھر شیلف کا پردہ کردیا، مجھے پتا ہی نہ چلا۔ اتنی بڑی رقم میں نے پہلی بار دیکھی تھی۔ مسٹر جارج مجھے اپنے کمرے سے باہر لے آئے اور بولے۔ ”جب میں کسی پر اعتماد کرتا ہوں تو پھر اندھا اعتماد کرتا ہوں اور اگر نہیں کرتا تو پھر سوئی برابر بھی نہیں کرتا۔ تم مجھے اچھے لگے ہو۔“

اس کے بعد اٹھتے بیٹھتے مجھے بس ایک ہی سوچ مضطرب رکھتی تھی کہ وہ بکس کس طرح حاصل کرنا ہے۔ مسٹر جارج باہر کہیں نہیں جاتے تھے۔ اس بکس کو حاصل کرنے کے لیے مسٹر جارج کا کم از کم ایک دو گھنٹے تک گھر سے باہر رہنا ضروری تھا۔ اتنی دیر میں تجوری کا قفل کھولنا میرے لیے مشکل نہیں تھا۔

ایک سہ پہر حسب عادت مسٹر جارج باہر برآمدے میں آرام کرسی پر براجمان کتاب پڑھنے میں منہمک تھے اور میں ان کے قریب ہی فرش پر دیوار سے ٹیک لگائے بیٹھا تھا، میرے ذہن میں اچانک ایک اچھوتا خیال آیا۔ میں نے مسٹر جارج کی طرف دیکھا۔ انہوں نے شیو بنائی ہوئی تھی، پینٹ کے ساتھ نیلی شرٹ پہنی ہوئی تھی۔ پھر میں نے اردگرد کے گھروں کی طرف دیکھا اور اٹھ کر اپنے کمرے میں آگیا۔

میں نے مسٹر جارج کے نام ایک نامعلوم خاتون کی طرف سے خط لکھا جس میں مسٹر جارج کی تعریف کرنے کے ساتھ خاص طور پر ان کی نیلی شرٹ اور گرے رنگ کی پینٹ کی تعریف کی اور لکھا کہ میں آپ کو روز دیکھتی ہوں۔ وہ خط میں نے بازار جاکر کوریئر کے ذریعے مسٹر جارج کو ارسال کردیا۔

دوسرے دن وہ خط جب مسٹر جارج کو ملا تو وہ بند لفافے کو دیکھ کر حیران ہوئے پھر جب لفافہ کھول کر خط پڑھنے لگے تو ان کے چہرے پر ایک خوش گوار تغیر آگیا۔ انہوں نے

ایک نظر میری طرف دیکھا اور خط لے کر اپنے کمرے میں چلے گئے۔ میں نے چھپ کر دیکھا کہ وہ خط کو بار بار پڑھ کر خوش ہو رہے تھے۔

اس سہ پہر مسٹر جارج جب کتاب پڑھنے کے لیے بیٹھے تو ان کا رنگ روپ پہلے سے بھی زیادہ نکلا ہوا تھا۔ میں نے روز انہیں ایک رومان انگیز خط لکھنے کا سلسلہ شروع کر دیا۔ میں ان کے بیٹھنے اور پڑھنے کے انداز کی تعریف کے ساتھ خاص طور پر ان کے کپڑوں کا بھی ذکر کرتا تھا۔ اس سے انہیں پورا یقین ہو گیا تھا کہ کوئی خاتون آس پاس کے کسی گھر سے نا صرف انہیں دیکھتی ہے بلکہ پسند بھی کرتی ہے۔ مسٹر جارج اب خط کے لیے بے چین رہنے لگے تھے اور ہر وقت بنے سنورے رہنے لگے تھے۔

خفیہ سیف سے رقم حاصل کرنے کا میں نے مکمل انتظام کر لیا تھا۔ میں نے انہیں آٹھواں خط لکھا، جس میں ان کے ساتھ ملاقات کی خواہش کرتے ہوئے ایک مقررہ وقت پر ایسے پبلک پارک میں ملاقات کی خواہش ظاہر کی جو اس جگہ سے تقریباً پون گھنٹا کی دوری پر تھا۔ وہاں تک آنا جانا، بیٹھ کر انتظار کرنا، تقریباً تین گھنٹے کا وقت صرف ہو ہی جانا تھا۔ اور یہ مہلت میرے کام کے لیے کافی تھی۔ میں کامیابی کے ساتھ واردات مکمل کر کے لکڑی کے بکس سمیت آسانی سے فرار ہو سکتا تھا۔ وہاں سے فرار ہونے کے لیے میں نے ٹرین کا انتخاب کیا تھا۔ ریلوے اسٹیشن قریب ہی تھا۔ جب تک مسٹر جارج ناکام و نامراد واپس آتے میں اس شہر کو الوداع کہہ چکا ہوتا۔

آٹھویں خط کو مسٹر جارج نے میرے سامنے کھول کر پڑھا اور پھر میری طرف دیکھتے ہوئے بولے۔ ''میرا پیارا دوست مجھے ہر روز خط لکھ رہا ہے۔ اس کے خط میرے لیے دنیا کی ہر شے سے زیادہ قیمتی ہیں۔''

مسٹر جارج اپنے کمرے میں چلے گئے۔ میں نے چھپ کر دیکھا کہ مسٹر جارج ایک عجیب سی سرشاری کے عالم میں وہ خط پڑھ رہے تھے پھر انہوں نے الماری سے وہ لباس نکالا جس کے پہننے کے بارے میں، میں نے ان سے فرمائش کی تھی تاکہ مجھے پارک میں ان کو پہچاننے میں کسی دقت کا سامنا نہ کرنا پڑے اور میں خود بخود ان کے پاس آسکوں۔ مجھے خوشی تھی کہ وہ میری فرمائش پر حرف بہ حرف عمل کرنے کے لیے تیار تھے۔

دوسرے دن انہوں نے وقت سے کافی پہلے تیاری شروع کر دی۔ تیار ہو کر وہ میرے پاس آئے اور بولے۔

''میں ایک ضروری کام سے جا رہا ہوں، دیر ہو سکتی ہے۔'' ان کے ہاتھ میں ان کا سیاہ چرمی بریف کیس موجود تھا۔ انہوں نے گھڑی میں وقت دیکھا اور پھر چلے گئے۔

میں نے دروازہ مقفل کیا اور اپنے اوزار لے کر مسٹر جارج کے کمرے میں چلا گیا۔ میں نے احتیاط سے شیلف کو دیوار سے ہٹایا اور سیف کے تالے پر اپنا ماہرانہ کام شروع کر دیا۔ ذرا سی دیر میں تالا جواب دے گیا۔ میرا چہرہ خوشی سے چمک اٹھا۔ میرے سامنے لکڑی کا بکس موجود تھا۔ میں نے بکس اٹھا کر اسے چوما اور اپنے چرمی بیگ میں رکھ لیا۔ سیف کے اندر ایک دراز مقفل تھی۔ میں نے اسے کھولنے کی کوشش ہی نہیں کی کیونکہ لکڑی کے بکس میں، میں جتنی رقم دیکھ چکا تھا وہ ہی میرے لیے کافی تھی۔ اس رقم سے میں خوش و خرم اور عیش و عشرت سے بھرپور نئی زندگی کی ابتدا کر سکتا تھا۔

میں نے بیگ اپنے کندھے پر لٹکایا اور ریلوے اسٹیشن کی طرف چل پڑا۔ ٹکٹ لیا اور ٹرین میں سوار ہوتے ہوئے میں نے مسکرا کر فاتحانہ انداز میں اس شہر پر آخری بار ایک نظر ڈالی اور دل ہی دل میں کہا۔ ''اے شہر! میں تیرے ایک باسی کو بے وقوف بنا کر لوٹ کر جا رہا ہوں۔''

ٹرین چل پڑی اور مسٹر جارج کا شہر رفتہ رفتہ دور ہوتا چلا گیا۔

تین گھنٹے کی طویل مسافت کے بعد میں ایک دوسرے شہر میں موجود تھا۔ میں سیدھا ایک ہوٹل میں گیا اور اپنے کمرے میں جاتے ہی میں نے دروازہ بند کیا، اپنے بیگ سے لکڑی کا بکس نکال کر اسے کھولا اور یکایک مجھے اپنا دل ڈوبتا ہوا محسوس ہوا۔ میری سانسیں تیز اور بے ترتیب ہو گئیں اور آنکھیں حیرت سے پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔ مسٹر جارج سچ کہتے تھے کہ وہ اپنے اس بکس میں قیمتی چیزیں رکھتے تھے۔ مسٹر جارج کے لیے اب دولت سے زیادہ قیمتی وہ خطوط ہو گئے تھے جو میں نے فرضی خاتون بن کر لکھے تھے، کیونکہ لکڑی کے بکس میں میرے ہاتھ کے لکھے صرف آٹھ خطوط ہی تھے۔

میرے دہانے سے بے اختیار ناکامی کا ایک گہرا سانس آزاد ہو گیا۔ مجھے یکایک ان کا سیاہ چرمی بریف کیس یاد آ گیا جسے وہ بار بار ایک سے دوسرے ہاتھ میں لے رہے تھے۔ شاید وہ خاصا وزنی تھا۔ یقینی طور پر وہ اپنی فرضی محبوبہ کو مرعوب کرنے کی نیت سے اپنی ساری دولت بریف کیس میں سمیٹ کر لے گئے تھے۔ یوں میرے نصیب میں وہ آٹھ خط رہ گئے تھے جو میں نے ہی اپنے ہاتھوں سے لکھے تھے۔





محی الدین نواب

ستائیسویں قسط

اگر کوئی کائنات کے رمز کو سمجھنے کی سعی کرے تو سب سے پہلے اسے انسان کو سمجھنے کی کوشش کرنی چاہیے۔ خاموش صحرا کی ویرانی ہو یا پُرجوش لہروں کی روانی... سمندر کی گہرائی ہو یا آسمان کی بلندی... چاند ستاروں کا حسن ہو یا قوسِ قزح کے رنگ... تہ در تہ زمین کی پرتیں ہوں یا بلند آسمان کے سات پردے... ٹھنڈی ہواؤں کے جھونکے ہوں یا بادوباراں کی طوفانی گرج۔ کبھی ہلکی ہلکی بوندوں کی پھوار کا ترنم اور کبھی بجلی کی چمک، کہیں پھولوں کی مہک، کہیں کانٹوں کی کسک... اللہ تعالیٰ نے یہ سب چیزیں اس کائنات میں جگہ جگہ بکھیر دیں اور... ہر شے کو ایک مقام بھی عطا کیا، مگر... جب انسان کو بنایا تو اس پوری کائنات کو جیسے اس کے اندر کہیں چپکے سے بسا دیا اور یہ بھی عجب کھیل ہے کہیں نام یکساں ہیں مگر تقدیریں الگ اور کہیں چہرے حیران کن حد تک ایک جیسے ہیں مگر ان کی تقدیر کا لکھا کہیں ایک دوسرے سے میل نہیں کھاتا۔ اس داستان کی ماروی وہ نہیں جو سندھ کی دھرتی پر عزت و احترام کی ایک علامت کے طور پر جانی جاتی ہے، اسے یہ بھی پتا نہیں کہ اس کا نام ماروی کس نے اور کیوں رکھا... شاید اس کے بڑوں نے سوچا ہو کہ نام کی یکسانیت سے مقدر کی دیوی اس پر بھی مہربان ہوجائے... جدید ماروی بہت عقیدت کے ساتھ اپنی ہم نام پر رشک کرتی ہے... یہ جانتے ہوئے کہ وہ کبھی اس مقام کے قریب بھی نہیں پھٹک سکے گی... ورق ورق، سطر سطر دلچسپی، تحیرّ اور لطیف جذبوں میں سموئی ہوئی ایک کہانی جس کے ہر موڑ پر کہیں حسن و عشق کا ملن ہے تو کہیں رقابت کی جلن... آج کے زمانے کے اسی چلن میں رنگین و سنگین لمحات کی لمحہ لمحہ روداد کو سمیٹتے، نئے رنگ و آہنگ کا تحیرّ خیز سنگم۔

ایک چہرہ کئی روپ، کبھی چھاؤں کبھی دھوپ، محبت کی عنایتوں، رفاقتوں اور رقابتوں کا ایک دل ربا سلسلہ


READING
Section

گزشتہ اقساط کا خلاصہ

یہ داستان ہے دورِ جدید کی ماروی اور اس کے عاشق مراد علی منگی کی۔ مراد ایک گدھا گاڑی والا ہے جو اپنے والد اور ماروی، چاچا جمرو اور چاچی حنی کے ساتھ اندرون سندھ کے ایک گاؤں میں رہتے تھے، گاؤں کا وڈیرا حشمت جلالی ایک بدنیت انسان تھا جس نے ماروی کا رشتہ دس ہزار نقد کے عوض مانگا تھا، چونکہ ماروی مراد کی منگ تھی اور دونوں بچپن ہی سے ایک دوسرے کو پسند کرتے تھے لہٰذا وہ اس پر راضی نہیں تھی نتیجتاً انہیں گوٹھ چھوڑنا پڑا۔ مراد جو کہ ثانوی تعلیم یافتہ تھا وڈیرا حشمت کی منشی گیری کرتا تھا۔ وڈیرا حشمت جلالی اور اس کے بیٹے روایتی ذہنیت کے مالک تھے اور انہوں نے جائداد بچانے کی خاطر اپنی بیٹی زلیخا کی شادی قرآن سے کردی۔ ماں نے مخالفت کی مگر اس کی ایک نہ چلی۔ زلیخا نے بغاوت کا راستہ اپنایا اور مراد کو مجبور کیا کہ وہ اس کی تنہائیوں کا ساتھی بن جائے۔ مراد تیار نہ ہوا اور ایک رات گزارنے کے بعد اپنے باپ کے ساتھ گاؤں سے غائب ہوگیا۔ گاؤں سے فرار ہو کر یہ دونوں کراچی کے ایک مضافاتی علاقے میمن گوٹھ آگئے جہاں ماروی اپنے چاچا، چاچی کے ساتھ پہلے ہی آچکی تھی۔ یہیں مراد کی ملاقات اتفاقاً محبوب علی چانڈیو سے ہوگئی جو کہ ممبر اسمبلی اور بزنس ٹائیکون، لیکن ہوبہو مراد کا ہم شکل تھا۔ بس دونوں کے درمیان صرف قسمت کا فرق تھا۔ محبوب چانڈیو اپنے ہم شکل کو دیکھ کر حیران ہوا پھر اسے یاد آیا کہ حشمت جلالی جو کہ خود بھی ممبر اسمبلی تھا اس کا ذکر اپنی بیٹی کے قاتل کی حیثیت سے کرچکا تھا۔ اس کے استفسار پر مراد نے اپنی بے گناہی کا اعلان کیا۔ ہوا کچھ یوں تھا کہ مراد کے فرار کے بعد زلیخا نے اپنی ماں کے تعاون سے گاؤں کے ایک اور نوجوان جمال سے شادی کرلی اور خاموشی سے فرار ہوگئی۔ وڈیرے اور اس کے بیٹوں کو پتا چلا تو انہوں نے تلاش شروع کرائی۔ ناکامی پر انہوں نے بے عزتی سے بچنے کے لیے ایک نوکرانی جو کہ زلیخا کے ہی قد کاٹھ کی تھی بربادکر کے قتل کردیا اور اس کا چہرہ تیزاب سے مسخ کرکے اسے اپنی بیٹی ظاہر کرکے الزام مراد پر لگادیا۔ یہاں شہر میں محبوب جب مراد سے ملا تو اس نے مراد کو اپنے پاس رکھ کر بہترین تربیت دینے کا فیصلہ کیا، ارادہ اسے اپنی جگہ رکھ کر خود گوشہ نشین ہونا تھا۔ محبوب کے سرپرست اس کے والد کے زمانے کے معروف جگی تھے جو اس کے کاروباری معاملات کی دیکھ بھال کرتے تھے۔ انہی کے مشورے پر ایک ماڈل سمیرا کو سیکریٹری کے طور پر رکھا گیا۔ مراد سے ملاقات کے دوران ماروی کی جھلک دیکھ کر محبوب اس پر دل و جان سے مرمٹا لیکن یہ ایک پاکیزہ جذبہ تھا جس میں کوئی کھوٹ نہ تھا۔ اس نے اپنی مصنوعات کے لیے بہ طور ماڈل ماروی کو چنا اور مراد کے ذریعے اسے راضی کیا۔ مراد بھی زلیخا کے قاتل کی حیثیت سے گرفتار ہوگیا۔ زلیخا مراد کے بچے کو جنم دے کر دوسرے بچے کی پیدائش کے دوران چل بسی لیکن وڈیرا باپ اور بیٹوں کو خبر نہیں تھی کہ زلیخا کہاں اور کس حال میں ہے۔ ماں رابعہ جانتی تھی لیکن مراد سے نالاں تھی۔ وہ شوہر اور بیٹوں سے بھی ناراض تھی لہٰذا انہیں خبر نہیں کی۔ مراد اس قتل کے مقدمے میں ملوث تھا اور محبوب چانڈیو ماروی کی خاطر اس کے مقدمے کی پیروی کررہا تھا۔ اسی باعث اس کی وڈیرا حشمت سے دشمنی ہوگئی۔ یوں ماروی کے دشمنوں میں اضافہ ہوگیا۔ اسے اغوا کرنے کی کوشش کی گئی جب وہ اپنی سہیلی کی شادی میں شرکت کے لیے گوٹھ گئی، تاہم محبوب چانڈیو اسے بچالایا۔ دوسری جانب جاسوس سیکرٹ ایجنٹ برنارڈ کو رہا کرانے کے لیے اسکاٹ لینڈ سے تین ایجنٹ مرینہ بہرام اور دارا اکبر آئے۔ مرینہ مراد کو ایک نظر دیکھ کر دل ہار گئی۔ مراد کو مرینہ جیلر باپ کی مدد سے جیل سے باہر نکال لائی اور محبوب اس کی جگہ بند ہوگیا۔ باہر نکل کر مراد مرینہ کی نیت بھانپ کر اسے جھانسا دیتے ہوئے اس کے شکنجے سے فرار ہوگیا۔ جبکہ دوسری جانب سمیرا اور جگی صاحب محبوب کو تلاش کرتے پھر رہے تھے۔ مرینہ اپنے باپ کے بل پر بہت شاطرانہ چالیں چل رہی تھی۔ ماروی چاچی اور چاچا مرینہ کے ہاتھ لگ گئے لیکن کسی نہ کسی طرح مراد کو معلوم ہوگیا کہ مرینہ ماروی کو جام تھارو کے چودھری کے پاس لے جارہی ہے لہٰذا مشکلات سے نبردآزما ہوتے ہوئے اس نے ماروی کو اس کے چنگل سے آزاد کرالیا۔ لیکن بدقسمتی سے ماروی کے سر میں چوٹ لگی جس کے باعث اس کی یادداشت چلی گئی۔ مراد شہر پہنچ کر جیل میں محبوب سے ملاقات کرکے اسے رازداری کے ساتھ جیل سے واپس جانے پر آمادہ کرکے خود سلاخوں کے پیچھے بند ہوگیا۔ مرینہ اور مراد میں فساد بڑھتا جارہا تھا۔ مرینہ کے پالتو غنڈے مراد کو کسی نہ کسی طرح جیل سے نکال کرلے گئے۔ باہر نکال کر ان کے درمیان سخت مقابلہ ہوا جس میں قانون کا خطرناک مجرم برنارڈ مراد کے ہاتھوں مارا گیا ہے۔ ماروی کا علاج ہوا مگر ماروی نے محبوب اور مراد دونوں کو نہیں پہچانا۔ مرینہ مراد کو ہندوستان لے آئی تھی۔ مراد مرینہ کی قید سے نکل گیا اور ماسٹر کو بو کے ساتھ مل گیا۔ مرینہ کو پتا چل گیا کہ مراد ماسٹر کے ساتھ ملا ہوا ہے۔ ادھر ماروی کے دوبارہ سر میں چوٹ لگنے سے اس کی یادداشت واپس آگئی۔ مراد مرینہ کے زیراثر آچکا تھا۔ ماروی کو پتا چل گیا اور اس نے مراد کو اپنانے سے انکار کردیا۔ ادھر مرینہ دوبارہ MET آفیسر بن گئی تھی مراد نے سرجری کے ماہر ڈاکٹر ممنی سن سے اپنے چہرے کی پلاسٹک سرجری کروالی۔ ڈاکٹر نے اسے اپنے بچھڑے ہوئے بیٹے ایمان علی کی شکل دے دی۔ وہ ڈاکٹر کے گھر پر ہی رہنے لگا۔ وہاں اس کے ساتھ ایمان کا دوست عبداللہ کبڈی بھی آگیا۔ ماروی کی یادداشت واپس آگئی تھی۔ ادھر مرینہ انڈیا پہنچ گئی تھی۔ مراد نے اسے قابو کرکے اس کی سرجری کروادی اور ایک انجکشن لگوادیا جس سے اس پر پاگل پن کے دورے پڑنے لگے۔ تاہم اس نے ڈائریکٹر جنرل کو اپنے مرینہ ہونے کا ثبوت دے دیا تھا۔ مراد اسرائیل پہنچ گیا تھا۔ وہاں اس کی ملاقات ڈاکٹر ممنی سن کے بیٹے ایمان سے ہوگئی۔ مراد نے ایمان کو اپنی تمام باتیں بتادیں۔ مرینہ بھی اسرائیل پہنچ گئی اور ایمان، مراد بن کر اسے اپنے پیچھے بھٹکانے لگا۔ مراد کو لندن والی فلائٹ میں میکی براؤن مل گیا۔ مراد کے پیچھے میکی براؤن کی بیٹی لگ گئی۔ ادھر مرینہ نے ایمان کو مراد سمجھ کے اس سے ملنا چاہا تاہم ایمان دشمنوں کی فائرنگ سے زخمی ہوکر اسپتال پہنچ گیا اور مرینہ جان گئی کہ یہ مراد نہیں ہے۔ مراد پاکستان گیا اور ماروی کو لے کر لندن آگیا مگر مرینہ سے مراد کے تعلقات کے بارے میں جان کر ماروی اس سے دور ہوگئی اور پاکستان آگئی۔ ادھر مراد دوبارہ اپنا چہرہ تبدیل کرکے انڈیا پہنچ گیا اور میکی براؤن کی بیٹی کے پیچھے لگ گیا اور اسے اغوا کرلیا۔ تاہم بعد میں اسے چھوڑ دیا مگر میڈونا کو مرینہ سے بچانے کے لیے مراد اسے لے کر نکل پڑا لیکن مرینہ نے راستے میں اسے چھاپ لیا۔ ان دونوں

میں مقابلہ ہوا۔ مراد اور مرینہ شدید زخمی ہوئے۔ دونوں علاج کے باعث چلنے پھرنے کے قابل ہو گئے۔ مرینہ اور مراد میں پھر صلح ہو گئی۔ مراد مرینہ سے نکاح پڑھانا چاہتا تھا مگر کوئی نہ کوئی رکاوٹ آرہی تھی۔ ادھر ڈاکٹر ممی سن نے مراد کی نئی شکل جو بنائی تھی، وہ اس کے لیے وبال بن گئی۔ وہ مرینہ سے نکاح پڑھانے کے معاملات طے کرنے گیا تاہم وہاں اسے موجودہ شکل میں دیکھ کر کچھ لوگ اسے اپنا رشتہ دار سمجھنے لگے اور اسے اپنے ساتھ لے گئے۔ وہ مراد کی شادی کرنا چاہتے تھے تاہم وہ شادی نہ ہو سکی۔ ادھر ماروی سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر لندن پہنچ گئی اور محبوب اور ماروی نے اپنے چہرے سرجری کے ذریعے تبدیل کر لیے۔ مراد نے ماروی کو طلاق نامہ بھجوا دیا مگر وہ اس کا دیوانہ تھا اور اسے دوبارہ حاصل کرنا چاہتا تھا۔ اس نے غباروں کے ذریعے ماروی تک اپنا پیغام پہنچانا چاہا اور کئی غباروں میں دو لفافے باندھ کر انہیں اڑا دیا۔ انڈین آرمی نے غباروں کو چیک کر کے انہیں آگے بڑھانے کا منصوبہ بنایا۔ وہ اس کے ذریعے مراد اور ماروی تک پہنچنا چاہتے تھے اب وہ غبارے مغرب کی سمت جارہے تھے۔ ادھر ماسٹر مراد کو ڈھونڈنے انڈیا پہنچ گیا۔ تمام تنظیموں کے سربراہ ماسٹر کی موجودگی پر الرٹ ہو گئے اور وہاں خون کی ہولی کھیلی جانے لگی۔ درگا نے مراد کو وہاں سے بحفاظت نکال لیا تاہم بشریٰ اور مرینہ کی لڑائی میں مرینہ سخت گھائل ہو گئی اور اس کی کمر کی ہڈی ٹوٹ گئی۔ مراد لندن جانے کے لیے جس جہاز میں سوار ہوا اسے ہائی جیک کر لیا گیا... وہ طیارہ ریاست باب النساء میں اترتا تا ہم مراد نے...... جان پر کھیل کے ہائی جیکرز کو زیر کر لیا مراد ملکہ نگارا کا مہمان بن گیا۔ ملکہ نے مراد کی باتوں سے اندازہ لگا لیا کہ وہ مراد ہی ہے۔ مراد نے بھی قبول کر لیا۔ ادھر مرینہ مراد کے غم میں چل بسی۔ مراد نے ملکہ نگارا سے نکاح پڑھوا لیا اور بشریٰ اور بلے کو اپنی سیکرٹ فورس میں شامل کر لیا۔ ماروی کا بھی محبوب سے نکاح ہو گیا۔ محبوب اور ماروی مستقبل کے منصوبے بنارہے تھے مگر نہیں جانتے تھے کہ ان کے نتائج کیا ہوں گے۔

اب آپ مزید واقعات ملاحظہ فرمائیے

ملکہ نگارا خانم بہت مطمئن، بہت آسودہ تھی۔ مراد علی منگی ایسا ہی لائف پارٹنر تھا جیسا وہ چاہتی تھی۔ وہ بھرپور ازدواجی مسرتیں حاصل کر رہی تھی۔

دن رات رنگینیوں میں وقت گزارا نہیں جاتا۔ اس کا ایک مناسب وقت ہوتا ہے لیکن دل لگاؤ پیدا ہو جائے تو دل چاہتا ہے کہ مرد زیادہ وقت اس کی قربت میں گزارے۔

لیکن مراد کی مصروفیات بڑھ گئی تھیں۔ پہلے تو اسے صرف اپنے دشمنوں سے نمٹنا پڑتا تھا۔ اب ریاستی معاملات بھی اسے مصروف رکھنے لگے تھے۔ وہ معاملات یہ تھے کہ ریاست میں درپردہ سازشیں ہو رہی تھیں۔ عوام کو عورت اور نشے کا عادی بنایا جارہا تھا۔

کسی بھی ملک یا ریاست کو کمزور کرنے کے لیے پہلے عوام کو کمزور بنا دینے کی سازشیں کی جاتی ہیں۔ ملکہ نگارا کی حکومت بہ ظاہر بہت مستحکم تھی لیکن اندر ہی اندر کھوکھلی ہوتی جارہی تھی۔

مراد نے بشریٰ اور بلے کے ذریعے لیلیٰ فردوس کی بے حیائی کو اور نشے کے پھیلاؤ کو بے نقاب کیا تھا۔ یہ ثابت کیا تھا کہ لیلیٰ فردوس کی طرح اور کئی عورتیں رازداری سے گناہ کا کھیل کھیل رہی ہیں اور آئندہ یہ بھید کھلنے والا تھا کہ پامیلا جوزف جیسی تھانیدار اور انسپکٹر جنرل آف پولیس جیسے اعلیٰ افسران غیر ملکی دشمن ایجنسیوں کے زرخرید غلام ہیں اور ریاست سے اور ملکہ سے غداری کر رہے ہیں۔

ملکہ نگارا تسلیم کر رہی تھی کہ مراد ریاست کے دشمن عناصر کو بے نقاب کر کے انہیں عبرتناک سزائیں دے رہا ہے۔ مراد کے حکم سے سازش کرنے والے ایک ملک کے سفارت خانے کو بند کر دیا گیا تھا۔ اس کے عملے کو ریاست سے باہر کر دیا گیا تھا اور اس ملک سے تعلق رکھنے والی لیلیٰ فردوس اور رونالڈ کو گولی ماردی گئی تھی۔

ملکہ کو مراد کا حکم چلانا اور اس سے پوچھے بغیر فیصلہ کرنا اور ان فیصلوں پر عمل کرانا اچھا نہیں لگ رہا تھا۔ اس طرح وہ برتر ہو رہا تھا اور وہ اس کے پیچھے ہوتی جارہی تھی۔

آرمی اور پولیس کے تمام افسران اس کے احکامات کی تعمیل کرتے تھے۔ ملکہ نے خود ہی یہ حکم نامہ جاری کیا تھا کہ ریاست کے تمام عہدیداروں کو اور تمام افسران کو مراد علی منگی کے احکامات کی تعمیل کرنی چاہیے اور وہ کر رہے تھے۔

لیکن ملکہ کو اب ایسا لگ رہا تھا کہ وہ حکمران بنتا جارہا ہے۔ اس نے مراد سے شکایت کی۔ ”تم نے ایک بڑے ملک کے سفارت خانے کو بند کرا دیا۔ اس کے عملے کو چوبیس گھنٹے کے اندر ریاست سے چلے جانے کا حکم دیا۔ اتنے بڑے فیصلے میرے حکم سے ہونے چاہئیں۔ میں یہاں کی ملکہ ہوں۔“

مراد نے کہا۔ ”جب میں اپنے دشمنوں سے نمٹتا ہوں تو ان کا برا انجام میرے ہی ہاتھوں سے ہوتا ہے۔ میں اپنے معاملات میں کسی سے مشورہ نہیں لیتا۔ میں نے تم سے پہلے ہی کہہ دیا تھا کہ میری بلیک فورس میرے ماتحت رہ کر کام کرے گی اور میں اپنی فورس کو اپنے طور پر ہینڈل کروں گا۔ اگر تم چاہتی ہو کہ میں اپنی سلامتی کے لیے اپنی ایک پرسنل جاں نثار فورس نہ رکھوں اور تمہارے فروخت

ہو جانے والے آرمی اور پولیس والوں پر بھروسا کروں تو بھر سوری۔ میں تمہارے عہدیداروں اور افسروں پر اندھا اعتماد کر کے اپنی موت کا سامان نہیں کروں گا۔ یہاں سے چلا جاؤں گا۔''

''تم تو بُرا مان گئے۔ میں تمہیں کبھی یہاں سے جانے نہیں دوں گی۔ کیا تمہیں مجھ سے محبت نہیں ہے؟ مجھے چھوڑ کر جانے کی بات کر رہے ہو؟''

''میں تمہیں چھوڑنے کی بات نہیں کر رہا ہوں۔ اپنی سلامتی کے لیے یہاں سے جاؤں گا اور مجھے افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے، تم ایک کھوکھلی ریاست کی حکمران ہو۔ میں نے ایک ماہ کے اندر اچھی طرح سمجھ لیا ہے۔ جنہیں تم وفادار اور جاں نثار سمجھتی آرہی ہو، وہی تمہاری آستین کے سانپ ہیں اور جو واقعی وفادار ہیں، وہ نااہل ہیں۔ وہ چھپے ہوئے دشمنوں کو بے نقاب کرنے اور ان کی سازشوں کو سمجھنے کی صلاحیتیں نہیں رکھتے۔ تم اقتدار کی جس کرسی پر ہو، اس کے پائے بہت کمزور ہیں۔''

''صاف کیوں نہیں کہتے کہ میں نااہل حکمران ہوں۔''

''اب تم بُرا مان رہی ہو۔ ایک عام سی عورت بھی اپنی ذات پر تنقید برداشت نہیں کرتی اور تم تو ملکہ معظمہ ہو۔ تمہاری انا کو فوراً ہی ٹھیس پہنچ رہی ہے۔ ٹھیک ہے۔ میں آئندہ تمہاری اور ریاست کی کسی کمزوری کو زیر بحث نہیں لاؤں گا۔ صرف اپنی بات کہہ رہا ہوں۔ مجھے اپنی سیکرٹ فورس کے ساتھ کام کرنے کی آزادی نہیں دو گی، اسے اپنی انا کا اور حکمرانی کا مسئلہ بناؤ گی تو میں یہاں سے چلا جاؤں گا۔''

''اور یہ تمہارا احمقانہ فیصلہ ہوگا۔ مجھے چھوڑ کر جاتے ہی پھر ایک مجرم مراد علی منگی کہلاؤ گے۔ کسی ملک میں آزادی سے نہیں رہ سکو گے۔ سوچ لو۔''

''تم سوچو۔ یہاں آنے سے پہلے چہرہ بدل کر آزادی سے دشمنوں کو نچا تا رہا ہوں۔ میری فکر نہ کرو۔''

وہ وہاں سے اٹھ کر جانے لگا تو وہ اٹھ کر بولی۔ ''مجھ سے ناراض ہو کر جا رہے ہو؟''

''نہیں۔ قلندر شاہ کو تلاش کرنے جا رہا ہوں۔ رات کو دیر سے آؤں گا۔''

''تو پھر ایسے نہ جاؤ۔ جیسے رخصت ہوا کرتے ہو، اسی طرح محبت سے جاؤ۔''

اس نے قریب آکر اسے بازوؤں میں بھر لیا۔ میاں بیوی میں ناراضگی ہوتی ہے۔ پھر صلح بھی ہو جاتی ہے لیکن ان دونوں کا پیار اور ازدواجی رشتہ سیاسی ہو گیا تھا۔

وہ مانتی تھی کہ مراد جیسا مرد اس کے لیے ضروری ہے لیکن وہ اپنے شاہانہ مزاج سے مجبور تھی۔ مراد کی برتری اب کھٹکنے لگی تھی۔ اس کے جانے کے بعد سوچ رہی تھی کہ اسے ریاست سے باہر نہیں جانے دے گی اور اسے حکمران بن کر اپنے طور پر فیصلے کرنے بھی نہیں دے گی۔ اس پر لگام ڈالنی ہوگی، تب ہی وہ قابو میں رہے گا لیکن لگام کیسے ڈالی جائے؟

اور مراد سوچ رہا تھا۔' وہ مغرور ملکہ میری خاطر زیادہ دنوں تک اپنے غرور کو کچل نہیں سکے گی۔ آج اس کی باتوں سے خطرے کی گھنٹی بجنے لگی ہے اور خطرات چاہے کتنے ہی ہوں اور کیسے ہی جان لیوا کیوں نہ ہوں، مجھے اسی ریاست میں رہ کر ان سے نمٹنا چاہیے اور مجھے یہ تسلیم کرنا چاہیے کہ ریاست سے باہر جا کر میں پھر سے ایک مجرم کہلاؤں گا۔ میری پشت پر ملکہ کی سیاسی قوت نہیں رہے گی۔ مجھے یہاں مستقل رہنے کی پلاننگ کرتے رہنا چاہیے۔'

محل کے باہر آرمی کے افسر اور سپاہیوں نے ایڑیاں بجا کر اسے سیلوٹ کیا۔ اس نے ایک افسر سے پوچھا۔ ''قلندر شاہ کی کیا رپورٹ ہے؟''

''سر! ابھی تک نظروں میں نہیں آرہا ہے۔ گھر گھر کی تلاشی لی گئی ہے۔ پولیس اور آرمی کے افسران کی کوٹھیوں میں گھس کر بھی دیکھا گیا ہے۔''

دوسرے افسر نے کہا۔ ''اب تو یہی سمجھ میں آرہا ہے کہ وہ ریاست میں نہیں ہے۔ سرحد پار چلا گیا ہے۔''

مراد نے کہا۔ ''وہ یہی چاہتا ہے کہ ہم اس کے متعلق یہی رائے قائم کریں۔ حقیقتاً وہ یہاں موجود ہے۔ کوئی بہت بڑی گڑبڑ کرنے کے لیے کہیں چھپا ہوا ہے۔''

وہ فون نکال کر نمبر پنچ کرتے ہوئے ان افسران سے ذرا دور گیا پھر رابطہ ہونے پر بولا۔ ''ہاں بشریٰ! وہ گرفت میں کیوں نہیں آرہا ہے؟''

وہ بولی۔ ''بھائی! ہم نے اعلیٰ عہدیداروں اور اعلیٰ افسروں کے گھروں کی بھی تلاشی لی ہے۔ اس کا سایہ تک نظر نہیں آرہا ہے۔ بلا کہتا ہے زبردست دھوکا دیا جا رہا ہے۔ وہ ضرور کسی معزز اعلیٰ عہدیدار کی پناہ میں ہے۔''

پھر فون پر بلے کی آواز سنائی دی۔ اس نے پوچھا۔ ''مراد! تمہیں یہ مشورہ کس نے دیا تھا کہ پولیس کے اعلیٰ افسران کے گھروں کی بھی تلاشی لی جائے؟''

مراد نے کہا۔ ''مجھے انسپکٹر جنرل آف پولیس نے مشورہ دیا تھا اور کہا تھا کہ پہلے اس کی کوٹھی کی تلاشی لی جائے۔''

بلے نے کہا۔ ''اور میں نے وہاں جاکر تلاشی لی تھی۔ وہاں قلندر شاہ موجود نہیں تھا۔ ہم اس کی طرف سے مطمئن ہوگئے تھے لیکن میں اس کے جھانسے میں آنے والا نہیں ہوں۔''

''کیا وہ قلندر شاہ کو پناہ دے رہا ہے؟''

''کچھ ایسی ہی بات ہے۔ میری سیکرٹ فورس کا ایک جاسوس اس کوٹھی کی نگرانی کر رہا ہے۔ اس نے رپورٹ دی ہے کہ آئی جی آف پولیس کی کوٹھی کے سیکیورٹی گارڈز بدل گئے ہیں۔ ان کا سیکیورٹی افسر ایک غیر ملکی ہے۔ اس ملک سے آئی جی آف پولیس کا ضرور کوئی تعلق ہوگا۔ سوچنے کی بات ہے، اچانک ایسی تبدیلی کیوں ہوئی ہے؟''

''بلے! تم کیا سوچ رہے ہو؟''

وہ بولا۔ ''مجھے صبح اس تبدیلی کا علم ہوا تھا۔ دوپہر کو ہم اس کوٹھی کے ملازم کو اغوا کر کے لے گئے۔ اس کی کنپٹی پر گن رکھ کر سوالات کیے تو اس نے بتایا کہ پچھلی رات تین بجے کوٹھی میں کوئی مہمان آیا ہے۔ وہاں وہ ایک کمرے میں اب بھی رہتا ہے۔''

''یا خدا......! وہ قلندر شاہ ہوگا۔''

''وہی ہے۔ ملازم نے بتایا ہے کہ اس مہمان کے بدن کی کھال ایسی سیاہی مائل ہے جیسے اسے آگ میں پکایا گیا ہو۔''

''پھر تو وہی قلندر شاہ ہے۔ مجھے نگارا خانم نے بتایا تھا کہ پل چرخی جیل میں اس پر کھولتا ہوا گرم پانی اسپرے کیا گیا تھا۔''

''ہم نے اس ملازم کو اپنے اعتماد میں لے کر رہا کر دیا ہے۔ وہ آئی جی پولیس کی کوٹھی میں ہمارا مخبر بن کر رہے گا۔''

بشریٰ نے فون کی طرف جھک کر کہا۔ ''مجھے پورا یقین ہے کہ کوٹھی کا وہ مہمان قلندر شاہ ہے۔ رات کے تین بجے مہمان نہیں آتے، چور آتے ہیں۔''

بلے نے کہا۔ ''میری سیکرٹ فورس نے بڑی رازداری سے کوٹھی کا محاصرہ کیا ہے۔ تم کیا کہتے ہو، ہماری فورس کے جاں نثاروں کو اندر جانا چاہیے؟''

''انتظار کرو۔ ابھی کال کروں گا۔''

وہ فون بند کر کے محل کے اندر آیا۔ نگارا خانم نے پوچھا۔ ''کیا بات ہے، واپس آگئے ہو؟''

''تم سے یہ کہنے کے لیے آیا ہوں کہ جن اعلیٰ افسران پر تکیہ کر رہی ہو، وہی تمہاری حکومت کو کمزور کر رہے ہیں۔ آئی جی آف پولیس نے قلندر شاہ کو اپنی کوٹھی میں چھپا رکھا ہے۔''

وہ بے یقینی سے بولی۔ ''یہ کیا کہہ رہے ہو؟ آئی جی کا تعلق ہمارے شاہی خاندان سے ہے۔ اس کے باپ دادا بھی پولیس ڈیپارٹمنٹ میں اعلیٰ عہدیدار رہ چکے ہیں۔ وہ مجرم کو چھپانے کا جرم نہیں کرے گا۔''

''سانچ کو کیا آنچ؟ ابھی آئی جی سے بولو کہ قلندر شاہ کو کوٹھی سے باہر نکالے۔ ورنہ میری سیکرٹ فورس کوٹھی میں گھس کر اسے گولی مار دے گی۔''

''نہیں مراد! وہاں آئی جی کے بھی درجن بھر مسلح گارڈز ہیں۔ وہاں گولیاں چلیں گی تو آئی جی بھی مارا جائے گا۔ وہ میرا کزن ہے۔ ایک مجرم کی حیثیت سے ظاہر ہوگا تو شاہی خاندان کی توہین ہوگی۔''

''یعنی تم شاہی خاندان کی عزت اور وقار کی خاطر سنگین جرم کرنے والے کو معاف کر دو گی؟''

''معاف نہیں کروں گی۔ یہاں محل میں اسے بلا کر اس کا محاسبہ کروں گی۔ وہ رازداری سے قلندر شاہ کو تمہاری سیکرٹ فورس کے حوالے کرے گا۔ میں آئی جی کو ریاست چھوڑ کر جانے کا حکم دوں گی۔ اس طرح کسی کو معلوم نہیں ہوگا کہ شاہی خاندان کا کوئی فرد مجرم تھا۔''

مراد نے تائید کی۔ ''یہی بہتر ہوگا۔ آئی جی کو یہاں بلاؤ۔''

اس نے آئی جی آف پولیس کو کال کی۔ وہ ملکہ معظمہ کے نمبر پڑھتے ہی بولا۔ ''یس لیولانگ ہر ہائی نس! میں حاضر ہوں۔''

وہ بولی۔ ''تم سے کچھ ضروری باتیں کرنا چاہتی ہوں۔ ابھی محل میں آؤ۔''

''ہر ہائی نس کا حکم سر آنکھوں پر...... ابھی آرہا ہوں۔''

ملکہ نے فون بند کر کے مراد سے کہا۔ ''وہ آرہا ہے۔ تم مائنڈ نہ کرنا۔ یہ ہمارے خاندانی وقار کا مسئلہ ہے۔ میں اس سے تنہائی میں بات کروں گی۔''

''میں مائنڈ نہیں کروں گا۔ وہ آئے گا تو میں چھپ کر باتیں سنوں گا۔''

پھر اس نے فون پر بلے سے کہا۔ ''ابھی آئی جی اپنی کوٹھی سے نکل کر محل میں آئے گا۔ ہر ہائی نس رازداری سے اس کا محاسبہ کریں گی۔ تم اس پر نظر رکھو۔ محل تک اس کا تعاقب کرو۔ بشریٰ اپنی سیکرٹ فورس کے ساتھ وہیں رہے گی اور کوٹھی کا محاصرہ برقرار رکھے گی۔''

اس نے رابطہ ختم کر دیا۔ ادھر آئی جی آف پولیس نے فون پر کسی سے کہا۔ ''مجھے ہر ہائی نس نے اچانک ہی محل میں طلب کیا ہے۔ کوئی گڑبڑ ہے۔ میں خطرہ محسوس کر رہا ہوں۔

قلندر شاہ کو یہاں سے کسی دوسری جگہ پہنچانا ہوگا۔''
اس نے دوسری طرف کی باتیں سن کر کہا۔ ''مسٹر رچرڈسن! اگر قلندر شاہ میری کوٹھی سے برآمد ہوگا تو میری برسوں کی عزت اور شہرت خاک میں مل جائے گی۔ پھر وہ مراد علی منگی مجھے زندہ نہیں چھوڑے گا۔ میں آپ کو اطلاع دے رہا ہوں۔ ابھی قلندر شاہ کو اپنے ایک جونیئر افسر کے بنگلے میں پہنچا رہا ہوں۔''

اس کوٹھی سے کچھ فاصلے پر بشریٰ اور بلّا چھپے ہوئے تھے۔ سیکرٹ فورس کے کئی مسلح جاں نثاروں نے بھی بڑی مہارت سے چھپ کر اس کوٹھی کو گھیر رکھا تھا۔

پھر انہوں نے دیکھا۔ آئی جی کی ایک قیمتی کار گیراج سے باہر آئی۔ قلندر شاہ کوٹھی کے اندرونی حصے سے اس گیراج کے دوسرے دروازے سے آ کر اس کار میں بیٹھ گیا تھا۔ ایک ڈرائیور اسے ڈرائیو کرتا ہوا گیراج سے باہر آ کر کوٹھی کے پورچ میں رک گیا۔ آئی جی آف پولیس کوٹھی کے بیرونی دروازے سے باہر آ کر اس کار کی پچھلی سیٹ پر قلندر شاہ کے ساتھ بیٹھ گیا۔ کلرڈ شیشوں کے باعث وہ باہر والوں کو نظر نہیں آسکتے تھے۔

بڑی کامیابی سے دھوکا دیا جا رہا تھا۔ بشریٰ اور بلّے نے یہی سمجھا کہ آئی جی آف پولیس کوٹھی سے تنہا نکل کر جا رہا ہے اور قلندر شاہ اسی کوٹھی میں چھپا ہوا ہے۔

مراد کی ہدایت کے مطابق بشریٰ اس کوٹھی کی نگرانی کے لیے اپنے جاں نثاروں کے ساتھ وہیں رہ گئی۔ بلّا ایک کار میں آئی جی کا تعاقب کرنے لگا۔ اس اعلیٰ افسر کی کار کے آگے پیچھے مسلح گارڈز اپنی گاڑیوں میں تھے اور وہ تمام گارڈز آئی جی کی طرح کسی مسٹر رچرڈسن کے زر خرید تھے۔

وہ گاڑیاں راستے بدل بدل کر جا رہی تھیں پھر مین روڈ سے مڑ کر ایک اسٹریٹ میں جا کر ایک بنگلے کے احاطے میں داخل ہو کر رک گئیں۔ بلّا فوراً ہی اپنی کار کو گلی کے موڑ پر چھوڑ کر دوڑتا ہوا، چھپتا ہوا ادھر گیا۔ وہ کلرڈ شیشوں والی کار اس بنگلے کے بیرونی دروازے کے سامنے پہنچ کر رک گئی تھی۔ بلّے نے ایک درخت کے موٹے سے تنے کے پیچھے چھپ کر دیکھا۔ اس کلرڈ شیشے والی کار میں آئی جی آف پولیس تنہا تھا۔ بشریٰ اور بلّے نے یہی دیکھا تھا لیکن اب ایک اور شخص اسی کار سے نکل کر اس بنگلے کے اندر چلا گیا تھا۔

اگر بشریٰ وہاں ہوتی تو قلندر شاہ کو پہچان لیتی۔ پھر بھی بلّے نے اسے پہچان لیا۔ قلندر شاہ کا چہرہ اور دونوں ہاتھ لباس سے باہر تھے اور اس کی جلد کا رنگ آگ میں جلے ہوئے گوشت کی طرح سیاہی مائل تھا۔

آئی جی آف پولیس کی گاڑی وہاں سے آگے محل کی طرف جا رہی تھی۔ مسلح گارڈز اسی بنگلے کے احاطے میں رک گئے تھے اور اس کے چاروں طرف پھیلتے جا رہے تھے۔ یہ سمجھ میں آ گیا کہ وہ سب قلندر شاہ کی سیکیورٹی کے لیے وہاں رہیں گے۔ اس نے فون پر بشریٰ سے کہا۔ ''آئی جی آف پولیس بڑی چالیں چل رہا ہے۔ وہ قلندر شاہ کو اپنی کار میں چھپا کر یہاں شاہراہ رومی کی اسٹریٹ چھ میں لایا ہے۔ اس وقت قلندر شاہ بنگلا نمبر آر ٹو ٹوئنٹی ایٹ میں ہے۔ تم اپنے ایک جاں نثار کو وہاں کوٹھی کی نگرانی کے لیے چھوڑو، باقی جاں نثاروں کے ساتھ فوراً یہاں آؤ۔''

پھر اس نے مراد کو کال کی۔ اسے بھی بتایا کہ آئی جی کس طرح چالاکی سے اپنے پتے کھیل رہا ہے۔ وہ قلندر شاہ کو اپنی کوٹھی سے نکال کر اسے بنگلا نمبر 28 اسٹریٹ 6 شاہراہِ رومی میں پہنچا کر محل میں آ رہا ہے اور وہ محل میں آ گیا۔ ملکہ نگارا خانم میٹنگ روم میں بیٹھی ہوئی تھی۔ آئی جی نے اس کے سامنے آ کر ایڑیاں بجا کر اسے سیلوٹ کیا۔ ملکہ نے کہا۔ ''ہم ان لمحات میں شاہی خاندان کے افراد ہیں، میں تمہاری خالہ زاد بہن ہوں۔ اگر تم سے کوئی جرم سرزد ہو رہا ہے تو مجھ سے نہ چھپاؤ۔ اسے ظاہر کرو۔ میں تمہیں معاف کر دوں گی۔ پلیز! مجھ سے جھوٹ نہ بولنا۔''

وہ بولا۔ ''میری خوش نصیب بہن کا اقبال بلند ہو۔ ہم شاہی خاندان کے شریف اور معزز افراد ہیں۔ جرم پر اور غلط کاموں پر تھوکتے ہیں۔ میرے باپ دادا بھی پولیس ڈیپارٹمنٹ میں رہ کر مجرموں کو سزائیں دیتے آئے ہیں۔ میں حیران ہوں کہ میری بہن کو مجھ پر شبہ کیوں ہے؟ آپ میرا کوئی جرم بتائیں، میں ابھی خود کو بے گناہ ثابت کروں گا۔''

نگارا خانم نے کہا۔ ''ایک قابلِ اعتماد رپورٹ کے مطابق تم نے قلندر شاہ کو اپنی کوٹھی میں چھپا رکھا ہے۔''

''او گاڈ! میرے بارے میں ایسی مضحکہ خیز رپورٹ کس نے دی ہے؟ میری معلومات کے مطابق ہز ہائی نس مراد علی منگی نے اپنی ایک پرائیویٹ فورس بنائی ہے۔ پچھلے دنوں اس فورس نے بڑے کارنامے انجام دیے ہیں۔ کیا ہزہائی نس نے میرے خلاف ایسی رپورٹ دی ہے؟''

ملکہ نے کہا۔ ''یہی سمجھو۔''

وہ بولا۔ ''پہلے تو آپ حکم دیں کہ ابھی میری کوٹھی پر چھاپا مارا جائے اور وہاں قلندر شاہ کو تلاش کیا جائے پھر میں آپ کے سامنے ایک حقیقت بیان کروں گا۔''

''وہ حقیقت ابھی بیان کرو۔''

''آپ کے حکم سے عرض کرتا ہوں۔ مجھے رپورٹ مل رہی ہے کہ ہز ہائی نس مراد علی منگی خواتین کی برتری اور حکمرانی کے خلاف عوام میں زہر اگل رہے ہیں۔ ان کی سیکرٹ فورس میں جو لوگ ہیں۔ وہ عوام میں بہت آہستہ آہستہ آپ کے خلاف نفرت پیدا کر رہے ہیں۔ آپ ہز ہائی نس .... کی چال کو سمجھیں۔ وہ آپ کو اقتدار کی کرسی سے ہٹا کر خود حکمران بننا چاہتے ہیں۔''

یہ بات ملکہ نگارا کے دل کو لگ رہی تھی۔ اس کی والدہ مرحومہ نے کہا تھا۔ ''بیٹی! تمہاری دادی جان مجھے جو بنیادی بات سمجھاتی تھیں، وہ میں تمہیں سمجھاتی رہتی ہوں۔ اپنے شوہر پر کبھی اعتماد نہ کرنا اور کبھی حکومت کے اہم معاملات میں اسے شریک نہ کرنا۔''

اور نگارا اپنی والدہ مرحومہ کی نصیحتوں کے خلاف مراد کو سیکرٹ فورس بنا کر اسے ریاست کے داخلی اور خارجی معاملات میں شریک کر کے بہت بڑی غلطی کرتی آ رہی تھی۔

نگارا خانم کے دماغ میں اس وقت یہ باتیں گونج رہی تھیں۔ ایسے وقت مراد نے میٹنگ روم میں آ کر کہا۔ ''تمہارے دماغ میں میرے خلاف جتنا زہر ہے، اسے اُگلتے رہو پھر بھی تمہارا سنگین جرم چھپا نہیں رہے گا۔ میں قلندر شاہ کو تمہارے اندر سے نکالوں گا۔''

وہ بولا۔ ''میں چیلنج کرتا ہوں ابھی میری کوٹھی میں جا کر اسے تلاش کرو۔''

''اب وہ تمہاری کوٹھی میں نہیں ہے۔''

نگارا خانم نے مراد سے کہا۔ ''تم نے تو کہا تھا کہ وہ اسی کوٹھی میں ہے۔''

''ہاں، کہاں تھا لیکن اب آئی جی نے جگہ بدل دی ہے۔ یہاں آنے سے پہلے اسے ایک جونیئر افسر کے بنگلے میں چھپا کر آیا ہے۔''

''یہ جھوٹ ہے۔ میں نے قلندر شاہ کی صورت بھی نہیں دیکھی ہے۔ نہ میں نے کسی کو اپنی کوٹھی میں پناہ دی تھی۔ نہ کسی کو کسی دوسرے بنگلے میں پہنچایا ہے۔''

مراد نے فون پر پہلے سے کہا۔ ''حملہ کرو اور قلندر شاہ کو اور اسے پناہ دینے والے پولیس افسر کو زندہ گرفتار کرو۔''

اس نے فون بند کیا۔ آئی جی نے اپنا فون نکال کر اسے استعمال کرنا چاہا۔ مراد نے کہا۔ ''اسٹاپ...... جب تک قلندر شاہ گرفتار نہیں ہوگا تم کسی کو کال نہیں کرو گے۔''

وہ بولا۔ ''میں اپنی وائف سے بات کروں گا۔''

مراد نے اس کے ہاتھ سے فون لے کر کہا۔ ''میرا حکم اٹل ہے۔ انتظار کرو۔''

آئی جی نے نگارا سے کہا۔ ''ہز ہائی نس! یہ زیادتی ہے۔ کیا میں آپ کی بھابی سے بھی بات نہیں کر سکتا؟''

نگارا نے کہا۔ ''مراد! بات کرنے دو۔ یہ ہمارے سامنے بات کریں گے۔''

مراد نے کہا۔ ''تم باتوں کے پیچھے چھپے ہوئے پیغام کو سمجھ نہیں سکو گی۔''

''یہ بیوی کو بھلا خفیہ پیغام کیوں دیں گے؟''

''اپنی شریک حیات سے پہلے طے کیا ہوگا کہ یہ جو گھریلو یا پیار بھری بات کریں گے، ان کی شریک حیات قلندر شاہ کو فون پر کہہ دیں گی کہ آئی جی صاحب نے ابھی کال کی تھی۔ پھر قلندر شاہ کے لیے یہی پیغام ہوگا کہ خطرہ ہے۔ وہاں سے بھاگو۔''

''یہ فضول باتیں ہیں۔ میری بھابی قلندر شاہ جیسے مجرم سے کبھی بات نہیں کریں گی۔ ابھی تم نے کہا تھا کہ تمہارا حکم اٹل ہے۔ میں کہتی ہوں، میرا حکم اٹل ہے۔ فون میرے بھائی کو دو۔''

''میں تمہارا حکم مان کر اسے فون واپس دوں گا اور یہاں سے چلا جاؤں گا۔''

''کہاں جاؤ گے؟''

''قلندر شاہ کو گرفتار کرنے۔''

''وہاں تمہاری سیکرٹ فورس ہے۔ تم نہیں جاؤ گے۔''

''میرا وہاں جانا ضروری ہے۔''

''میں نے کہا نا، میرا حکم اٹل ہے۔''

مراد نے پہلے ہی کہہ دیا تھا کہ وہ بیوی کا تابعدار بن کر نہیں رہے گا۔ اس وقت اس نے نگارا سے بحث نہیں کی۔ یہ دیکھ رہا تھا کہ آئی جی اس کے خلاف ملکہ بہن کے دماغ میں زہر ٹپکا رہا تھا۔ ملکہ صاحبہ کچھ بدظن ہو رہی تھیں۔

اس نے فون واپس کر دیا۔ آئی جی نے فون لے کر کہا۔ ''ہز ہائی نس! مجھے جانے کی اجازت دیں۔''

مراد نے کہا۔ ''خانم! ابھی اجازت نہ دو۔ یہ باہر جاتے ہی میری سیکرٹ فورس کے خلاف اپنی پولیس فورس کو استعمال کرے گا۔ قلندر شاہ ہمارے ہاتھ سے نکل جائے گا۔''

وہ آئی جی سے بولی۔ ''میں حکم دیتی ہوں۔ تم سیکرٹ فورس کے خلاف کوئی کارروائی نہیں کرو گے، اب جاؤ یہاں سے۔''

وہ چلا گیا۔ مراد نے کہا۔ ''میں نے کہا تھا کہ بیوی کا تابعدار بن کر نہیں رہوں گا لیکن آئی جی کے سامنے تمہارا

وقار اور رعب و دبدبہ قائم رکھنے کے لیے میں نے تمہاری بات مان لی۔ آئندہ مجھے اس طرح کبھی حکم نہ دینا۔''
اس نے پوچھا۔ ''تمہاری سیکرٹ فورس میں کتنے فائٹر اور جاسوس ہیں؟''
''ابھی صرف اٹھارہ ہیں۔''
''اور وہ ریاست کے عوام کو میرے خلاف بھڑکاتے رہتے ہیں؟ یہاں سے ایک عورت کی حکمرانی کو ختم کرنا چاہتے ہیں؟''
''میں خدا سے ڈرتا ہوں۔ تم سے مجھے اب تک کوئی نقصان نہیں پہنچا ہے۔ میں بھی تمہیں نقصان پہنچانے کی حماقت نہیں کر رہا ہوں۔ تم یقین نہیں کروگی، وہ آئی جی میری سیکرٹ فورس کے خلاف زہر اگل کر گیا ہے۔''
''میں نادان نہیں ہوں کہ اس کے بہکانے میں آ جاؤں گی۔ میں آنکھوں سے دیکھ رہی ہوں۔ تم آئی جی کے سامنے مجھے بار بار 'تم' کہہ کر مخاطب کر رہے تھے۔ اب وہ باہر جا کر دوسروں سے بولے گا۔ میری توہین ہوتی رہے گی۔ تم بڑی خاموشی سے، بڑی حکمت عملی سے میرے شاہی وقار کو ٹھیس پہنچا رہے ہو۔''
''نگارا! میں سمجھ گیا ہوں، تم مجھ سے بدظن ہوتی جا رہی ہو۔ بہتر ہے...''
اس نے بات ادھوری چھوڑ دی۔ اذان سنائی دے رہی تھی۔ وہ منہ پھیر کر وضو کرنے چلا گیا۔ نگارا پریشان ہو کر اس خالی دروازے کو دیکھ رہی تھی جہاں سے وہ گزر کر گیا تھا۔ اس کے ذہن میں یہ بات گردش کر رہی تھی کہ اپنے ایک آئیڈیل مرد کے ساتھ قربت کے لمحات گزارنے کے لیے شاہی وقار کو اور ایک ملکہ کی انا کو ٹھیس پہنچا رہی ہے۔
اسے ماں اور دادی کی نصیحتیں یاد آ رہی تھیں۔ اسے محل سے باہر کسی بھی سرکاری اہم شعبے کے عہدیداروں سے ملنے نہ دو۔ جس طرح مرد بیویوں کو چار دیواریوں میں قید کر کے رکھتے ہیں، انہیں باہر کسی سے ملنے کی اجازت نہیں دیتے، اسی طرح اپنے شوہر کو محل سے باہر نہ جانے دو۔ کسی سے ملنے کی اجازت نہ دو۔
اس نے طے کر لیا' مراد کو بے بس اور مجبور بنا کر رکھنا ہوگا۔

☆☆☆

قلندر شاہ پھر ہاتھوں سے نکل گیا تھا۔ بلّے نے یہی دیکھا تھا کہ آئی جی آف پولیس اپنی کار میں قلندر شاہ کو رازداری سے بنگلا نمبر آر ٹوئنٹی ایٹ میں لایا تھا۔ پھر اسے اس بنگلے میں چھوڑ کر چلا گیا تھا۔
بلّے نے ایک درخت کے پیچھے چھپ کر اتنا ہی دیکھا تھا کہ قلندر شاہ اس بنگلے کے اندر گیا تھا۔ یہ چالبازی سمجھ نہ سکا کہ وہ بنگلے کے اندر جا کر پچھلے دروازے سے نکل گیا تھا۔ وہاں اس کے لیے ایک گاڑی اور کھڑی تھی۔ وہ گاڑی اسے کہیں لے گئی تھی۔
بلّا بنگلے کے سامنے تھا۔ بشریٰ اور مراد سے فون پر باتیں کرتا رہا تھا پھر بشریٰ سیکرٹ فورس کے ساتھ وہاں پہنچ گئی تھی۔ انہوں نے اس بنگلے کو چاروں طرف سے گھیر کر سیکیورٹی افسر کو للکارا۔ ''قلندر شاہ کو باہر نکالو۔ اسے ہمارے حوالے کرو۔ ورنہ گولیاں چلیں گی۔ تمہارے اور ہمارے آدمی ناحق مارے جائیں گے۔''
سیکیورٹی افسر نے کہا۔ ''ہم خون خرابا نہیں چاہتے۔ قلندر شاہ اس بنگلے میں نہیں ہے۔ تمہارے دو آدمی اندر جا کر تلاشی لے سکتے ہیں۔''
بشریٰ اس مفرور کی صورت پہچانتی تھی۔ وہ اپنے ایک جاں نثار کے ساتھ اندر گئی۔ اس بنگلے کے اوپر نیچے، اندر باہر اچھی طرح دیکھ لیا۔ پھر باہر آ کر بولی۔ ''بلّے! ہم دھوکا کھا رہے ہیں۔ قلندر شاہ یہاں نہیں ہے۔''
انہوں نے مختلف راستوں پر دوڑ لگائی لیکن دیر ہو چکی تھی۔ بشریٰ نے مراد کو کال کی تو معلوم ہوا کہ فون بند ہے۔ وہ نماز پڑھتے وقت فون کو بند رکھتا تھا۔ بلّے نے کہا۔ ''گھر چلو۔ نماز کا وقت ہو گیا ہے۔''
مراد محل میں تھا۔ خواب گاہ کی بالکونی میں مصلیٰ بچھائے عبادت میں مصروف تھا۔ نماز کے دوران اکثر یہ ہوتا ہے کہ طرح طرح کے خیالات ذہن میں آتے رہتے ہیں۔ ابتدا میں مراد کے دماغ میں بھی خیالات کی یلغار رہتی تھی۔ ایسا کئی ماہ تک ہوتا رہا اور وہ اچانک در آنے والے خیالات سے لڑتا رہا۔
حالات کے مطابق آتے جاتے خیالات سے لڑتے لڑتے اللہ تعالیٰ کی طرف دھیان لگائے رکھنا بہت بڑی عبادت ہے۔ مراد آیتوں کا ترجمہ اور تشریح یاد رکھتا تھا۔ اس طرح عربی زبان سمجھ کر پڑھتا تھا۔ یوں خیالات اسے کم سے کم بھٹکاتے تھے۔
اب وہ نماز پڑھتا تو اس کے آس پاس کی دنیا گم ہو جاتی تھی۔ اس کے قریب ڈھول پیٹا جاتا، تب بھی اسے کچھ سنائی نہیں دیتا تھا۔ مکمل نماز کی ادائیگی تک اس کے پانچوں حواس گم ہو جاتے تھے۔ وہ صرف رب کریم کے نام

سے سانسیں لیتا رہتا تھا۔
عبادت کی ایسی سعادت اللہ تعالیٰ کے برگزیدہ بندوں کو حاصل ہوتی ہے۔ اسی لیے حضرت صلاح الدین اجمیری اس کے پاس آنے لگے تھے۔ اس وقت بھی وہ مراد کے شانہ بشانہ بیٹھے ہوئے عبادت میں مصروف تھے۔ دونوں ہی ساری دنیا سے غافل ہو کر عبودیت کے سمندر میں غرق ہو گئے تھے۔
ملکہ نگارا نے دو گھنٹے بعد بالکونی میں آ کر اسے عبادت میں مصروف دیکھا۔ بابا اجمیری اسے نظر نہیں آ رہے تھے۔ وہ حیرانی سے بولی۔ ''کتنی لمبی نمازیں پڑھ رہے ہو؟ کیا تمام دن سجدے ہی کرتے رہو گے؟''
اس کی آواز مراد کے کانوں تک نہیں پہنچ رہی تھی۔ بابا اجمیری کی معیت میں اس کی عبادت اور مستحکم ہو رہی تھی۔ ملکہ نے کہا۔ ''میں انتظار کر رہی ہوں۔ نماز مختصر کرو اور ڈرائنگ روم میں آ جاؤ۔''
وہ حکم دے کر جانے لگی پھر رک گئی۔ پلٹ کر اسے دیکھا۔ وہ حکم کی تعمیل نہیں کر رہا تھا۔ مصلے پر یوں دوزانو بیٹھا تھا جیسے بیٹھے بیٹھے پتھر ہو گیا ہو۔ نگارا نے حیرانی سے دیکھا۔ وہ بالکل ساکت تھا۔ ٹس سے مس نہیں ہو رہا تھا۔ اسے یوں لگ رہا تھا جیسے وہ نمازی سجدے سے اٹھنے کے بعد مر گیا ہو۔ وہ تیزی سے چلتی ہوئی قریب آئی پھر اس کی طرف جھک کر اسے دیکھا تو آنکھیں کھلی ہوئی تھیں لیکن جھکی ہوئی تھیں۔ وہ آہستہ آہستہ سانسیں لے رہا تھا۔
وہ سیدھی کھڑی ہو کر دل ہی دل میں بولی۔ ''توبہ ہے۔ میں سمجھ رہی تھی، چل بسا ہے۔''
وہ وہاں سے چلتی ہوئی ڈرائنگ روم میں آئی۔ وہاں دس معزز خواتین بیٹھی ہوئی تھیں۔ وہ سب ملکہ معظمہ کی مشیرِ خاص تھیں۔ وہ خواتین کی حکومت کو قائم و دائم رکھنے کے سلسلے میں ملکہ کو دانشمندانہ مشورے دیا کرتی تھیں۔ ان میں سے چھ بزرگ خواتین تھیں۔ ملکہ کی والدہ اور دادی جان کے دورِ حکومت سے مشاورت کے فرائض انجام دیتی آ رہی تھیں۔ باقی چار خواتین جوان تھیں۔ تمام سرکاری شعبوں کی معلومات میں انہیں مہارت حاصل تھی۔
بزرگ خواتین نے ملکہ نگارا کو مشورہ دیا تھا کہ وہ شوہر کو پابندیوں میں رکھے۔ جیسا کہ اس کی والدہ اور دادی کا دستور رہا تھا۔ وہ حکومت کے معاملات میں اپنے شوہروں کو شریک نہیں کرتی تھیں۔ انہیں سخت نگرانی میں محل کے باہر جانے دیتی تھیں۔ وہ اپنے شوہروں کو محل سے باہر کسی مرد سے ملنے کی اجازت نہیں دیتی تھیں۔ یہ اندیشہ رہتا تھا کہ دوسرے مرد ملکہ کے شوہر کو بہکائیں گے تو وہ سازشیں کر کے بغاوت کر کے ملکہ کو اقتدار سے گرا کر خود حکمران بن بیٹھے گا۔
مراد ان کی نظروں میں ناقابلِ اعتماد ہو گیا تھا۔ اس کی طرف سے اندیشے بڑھتے جا رہے تھے۔ وہ سیکرٹ فورس بنا کر ریاستی معاملات پر حاوی ہوتا جا رہا تھا۔ ایک خاتون نے مشورہ دیا تھا کہ ملکہ سیکرٹ فورس کو اپنے شوہر سے چھین لے اور اس فورس کو اپنے ماتحت رکھے۔ شوہر کو محل سے باہر جانے کی اجازت نہ دے۔
ملکہ نے کہا۔ ''میں وہی کروں گی جو میری والدہ اور دادی جان کے اصول رہے ہیں۔ مراد علی منگی جرائم کی دنیا کا بے تاج بادشاہ رہا ہے۔ میری ذرا سی نادانی سے وہ یہاں بھی اپنی بادشاہت قائم کر لے گا۔ میں خواتین کی حکمرانی کو کبھی ختم نہیں ہونے دوں گی۔''
اس نے تمام خواتین کا شکریہ ادا کر کے انہیں جانے کا حکم دیا۔ وہ سب چلی گئیں۔ پھر آرمی کی کمانڈر ان چیف خاتون نے آ کر اسے سیلوٹ کیا۔
نگارا نے کمانڈر ان چیف سے کہا۔ ''سیکرٹ فورس کے سربراہ سلمان اور رمشا کو اپنے ہیڈ کوارٹر میں ابھی طلب کرو۔ ان سے کہو، وہ فورس اب آرمی کے ماتحت رہے گی۔ اگر وہ دونوں ماتحت رہ کر کام کرنے کے لیے راضی نہ ہوں تو انہیں حراست میں لے لو۔''
''میں ابھی جا کر انہیں ہیڈ کوارٹر میں طلب کروں گی۔ سیکرٹ فورس کے تمام جاں نثار ہماری نگرانی میں رہیں گے۔''
ملکہ نے کہا۔ ''رمشا اور سلمان پر کڑی نظر رکھو۔ وہ مراد علی منگی کے تابعدار ہیں۔''
''ہر ہائی نس کا حکم سر آنکھوں پر۔ ان دونوں کو سخت پابندیوں میں رکھا جائے گا۔''
''تم جا سکتی ہو۔''
وہ سیلوٹ کر کے چلی گئی۔ خواب گاہ کی بالکونی میں عبادت اختتام کو پہنچی۔ بابا اجمیری خاموشی سے آئے تھے خاموشی سے چلے گئے۔ وہ پہلے بھی اس کی نمازوں کے دوران میں آتے تھے۔ اس سے کچھ بولتے نہیں تھے۔ مراد بھی انہیں مخاطب نہیں کرتا تھا۔ وہ ڈرائنگ روم میں آیا۔ ملکہ نگارا محل کی سیکیورٹی افسر کو احکامات دے رہی تھی۔ مراد کو دیکھ کر چپ ہو گئی۔ اس نے سیکیورٹی افسر سے کہا۔ ''جاؤ یہاں سے۔''
وہ چلی گئی۔ نگارا نے مراد سے کہا۔ ''انتظار کی حد

ہوتی ہے۔ میں نے آج تک کسی کو اتنی لمبی نمازیں پڑھتے نہیں دیکھا ہے۔''

''آج دیکھا ہے۔ آئندہ بھی دیکھو گی۔''

''تم پانچ وقتوں کے علاوہ تہجد بھی پڑھتے ہو اور کتنی عبادت کرو گے؟ کیا ولی اللہ بننا چاہتے ہو؟''

''اللہ جانتا ہے کہ میں کیا بننے والا ہوں۔ دنیاوی معاملات مجھے بری طرح الجھا دیتے ہیں۔ جیسا کہ جہاز کو ہائی جیک کرنے والوں سے نمٹنا پڑا تھا۔ ایسے وقت میری نماز چھوٹ گئی تھی۔ تب میں قضا ہونے والی نمازیں بعد میں پڑھتا ہوں۔ ابھی میں جانے انجانے میں قضا ہونے والی نمازیں پڑھ رہا تھا۔''

وہ بولی۔ ''اگر تمہاری باہر کی مصروفیات ختم ہو جائیں گی، تم دن رات محل میں رہا کرو گے پھر تمہیں زیادہ سے زیادہ عبادت کرتے رہنے کی سعادت نصیب ہوتی رہے گی۔''

وہ ہنستے ہوئے بولا۔ ''یہ کیا کہہ رہی ہو۔ نہ مصروفیات ختم ہوں گی، نہ میں دن رات محل میں رہ سکوں گا۔''

''میں تمہاری مصروفیات ختم کر رہی ہوں۔ میری والدہ اور دادی جان کے زمانے سے یہ دستور رہا ہے کہ ملکۂ وقت کے شوہر سرکاری معاملات میں مداخلت نہیں کرتے ہیں۔ مجھے اپنی بزرگ خواتین کے زریں اصولوں پر عمل کرنا ہے۔ لہٰذا میں نے فیصلہ کیا ہے کہ تم ریاست کے کسی بھی سرکاری معاملے میں کچھ نہیں بولو گے۔ تمہاری سیکرٹ فورس آئندہ آرمی کے ماتحت رہے گی۔''

مراد صوفے پر ذرا سیدھا ہو کر بیٹھ گیا۔ نگارا نے کہا۔ ''تم محل سے باہر نہیں جاؤ گے۔ میرے ساتھ پیار و محبت سے دن رات یہاں رہو گے۔''

وہ مسکرانے لگا۔ وہ بول رہی تھی۔ ''اس محل میں تمہاری تمام ضرورتیں پوری ہوتی رہیں گی۔ تم کھلی فضا میں گھومنا پھرنا چاہو گے تو تمہارے آگے پیچھے مسلح گارڈز ہوں گے۔ تم باہر کسی بھی مرد سے بات نہیں کرو گے۔''

وہ سن رہا تھا اور مسکرا رہا تھا۔ نگارا نے کہا۔ ''کیا میں لطیفے سنا رہی ہوں؟ کیا تم میرے فیصلوں کو مذاق سمجھ رہے ہو؟''

''میں تمہارے ابنارمل ہونے پر مسکرا رہا ہوں۔ ایسی باتیں کرتی ہوئی بہت پیاری لگ رہی ہو۔''

''اس کا مطلب ہے، تم پابندیوں کو تسلیم کر رہے ہو؟ تمہیں میرے کسی فیصلے پر اعتراض نہیں ہے؟''

''بھئی ہر ہائی نس ملکہ معظمہ کا فیصلہ ہے۔ میری کیا مجال ہے کہ اعتراض کر سکوں۔ یہ بتاؤ میں محل کے باہر جانا چاہوں تو مجھے کیسے روکا جائے گا؟''

''باہر آرمی کے مسلح جوان ہیں۔ وہ تمہیں محل سے باہر نکلنے نہیں دیں گے۔''

''اچھا تو باہر وہ گن اور گولیاں ہیں، جن کا میں پرانا کھلاڑی ہوں۔ جب گولیاں چلیں گی تو تم بہت انجوائے کرو گی۔''

''تم یہاں نہتے رہو گے۔ باہر آرمی کے پچاس جوان ہیں۔ وہ تمہیں گولیوں سے چھلنی کر دیں گے۔ کیا مرنے کے لیے باہر جاؤ گے؟''

''میں نہیں جانتا کہ کیا کروں گا؟ اتنا کہہ دیتا ہوں کہ تم ہوا کو مٹھی میں بند نہیں کر سکو گی۔ انتظار کرو، میں ہوا ہو جاؤں گا۔''

وہ پریشان ہو کر اسے تکنے لگی۔ پھر اس کے پاس آ کر بیٹھ گئی۔ ''مراد! میں نے تمہاری ہسٹری فائل پڑھی ہے۔ آڈیو میں تمہیں سنا ہے۔ ویڈیو میں تمہیں دیکھا ہے۔ تم ناقابلِ شکست ہو۔ میں تمہاری دیوانی ہوں۔ تمہارے بغیر نہیں رہوں گی۔''

وہ اس کی گردن میں بانہیں ڈال کر بولی۔ ''میں اپنے شاہی دستور سے مجبور ہوں۔ مجھے اپنے اصولوں پر عمل کرنا ہوگا، وعدہ کرو مجھے چھوڑ کر نہیں جاؤ گے۔''

''تمہارے فیصلے مجھے یہاں سے جانے پر مجبور کر رہے ہیں اور میں گیا تو پھر گیا۔ سمجھ لو کہ گزرے ہوئے وقت کی طرح واپس نہیں آؤں گا۔''

وہ اس سے الگ ہو کر بولی۔ ''تم ناقابلِ گرفت ہو سکتے ہو لیکن سپر مین نہیں ہو۔ تمہیں معلوم ہونا چاہیے کہ مسلح سپاہی صرف محل کے باہر ہی نہیں ہیں۔ ریاست کے ہر راستے ہر موڑ پر آرمی اور پولیس والے ہوں گے۔ سرحد پار فرار ہونے سے پہلے ہی گولیاں کھا کر حرام موت مرو گے۔''

وہ اس کے بازو کو جھنجوڑ کر بولی۔ ''مجھے چھوڑ کر جاتے ہی مجرم کہلاؤ گے۔ اس ریاست کے باہر تمام ملکوں میں تمہاری جان کے دشمن ہیں۔ کہاں کہاں کب تک چھپتے پھرو گے؟ کیا یہ بہتر نہیں ہے کہ اس محل میں موت سے دور عیش و آرام سے رہو؟''

''موت کبھی نہ کبھی محل میں بھی آئے گی لیکن وہ موت ایک عورت کی غلامی میں آئے گی۔ بابر مراد علی منگی درجنوں کی موت بننے کے بعد ہی مرے گا۔''

وہ اس سے لپٹ کر بولی۔ ''تم کیا کرنے والے ہو؟ کیا ارادے ہیں تمہارے؟ فار گاڈ سیک۔ یہاں عیش و

آرام سے رہو۔ میں خواب گاہ کی تنہائی میں تمہاری کنیز بن جایا کروں گی۔''

''اور خواب گاہ سے باہر مجھے غلام اور قیدی بنا کر رکھو گی۔''

وہ اسے اپنے سے الگ کرتے ہوئے اٹھ کر کھڑا ہو گیا پھر بولا۔''میں ابھی نہیں پھر کبھی مناسب وقت دیکھ کر جاؤں گا۔ یہاں سے نکلنے کی پلاننگ کرتا رہوں گا۔ یہ سن لو کہ جب تک یہاں قیدی بن کر رہوں گا، تب تک تمہیں ہاتھ نہیں لگاؤں گا۔ تم جبراً میرے قریب آکر بھی مجھے حاصل نہیں کرسکو گی۔ تم اپنی ماں اور اپنی دادی کی طرح مجھے قیدی شوہر بنا کر نہیں رکھ سکو گی۔ میں خواب گاہ میں جا رہا ہوں۔ آؤ اور اپنی جوانی کی شراب چھلکاؤ۔ آج سے میں تمہارے کدے کا شرابی نہیں رہا۔ تم میری توبہ نہیں توڑ سکو گی۔''

وہ اس سے منہ پھیر کر چلا گیا۔ محل کے باہر نہیں جاسکتا تھا۔ قیدی بن چکا تھا۔ خواب گاہ میں آگیا۔ فون سے رنگ ٹون سنائی دینے لگی۔ ننھی سی اسکرین پر بلّے کا نام لکھا ہوا تھا۔

اس نے بٹن دبا کر کہا۔''ہاں بولو۔ قلندر شاہ گرفتار ہو گیا؟''

وہ بولا۔''ہم تمام سیکرٹ فورس والے گرفتار ہو گئے ہیں۔''

اس نے حیرانی سے پوچھا۔''کیا کہہ رہے ہو؟''

اس نے کہا۔''قلندر شاہ ہماری سیکرٹ فورس کے پہنچنے سے پہلے ہی بنگلے کے پچھلے دروازے سے فرار ہو گیا تھا۔ ایک گھنٹے بعد مجھ کو اور بشریٰ کو آرمی کے ہیڈ کوارٹر میں طلب کیا گیا اور یہ حکم سنایا گیا کہ آج سے سیکرٹ فورس آرمی کے کنٹرول میں رہے گی۔ مجھ کو اور بشریٰ کو ان کے احکامات کے مطابق کام کرنا ہوگا۔ ورنہ ہمیں اس ریاست سے نکال دیا جائے گا۔ اب تم بولو، ہم کیا کریں؟''

مراد نے کہا۔''ابھی صبر کرو۔ یہاں مجھ پر بھی پابندیاں عائد کی گئی ہیں۔ میں اس محل میں قیدی بن گیا ہوں۔ آزادی سے باہر نہیں نکل سکوں گا۔''

''یعنی ہم آسمان سے گرے اور کھجور میں اٹک گئے۔ ہم جرائم کی دنیا سے نکل جانا چاہتے تھے نا؟ تمہیں ملکہ کی وساطت سے حکمرانی حاصل ہو رہی تھی۔ تم پر سے مجرم ہونے کا الزام مٹ گیا تھا۔ اب کیا ہو رہا ہے؟ واہ ری گردشِ دوراں! ہم پھر اپنی پرانی حیثیت کی طرف لوٹ رہے ہیں۔ بولو اپنا ہاتھ دکھائیں؟''

''ابھی کچھ نہ کرو۔ فی الحال حالات سے سمجھوتا کرو۔ آرمی کے دو افسران ہمارے ہم خیال ہو گئے تھے۔ وہ عورتوں کی حکمرانی ختم کرنا چاہتے تھے۔ ان سے رابطہ رکھو۔''

''ان دو افسروں نے ہی ہمیں ہیڈ کوارٹر میں طلب کیا ہے لیکن در پردہ ہمارے حمایتی ہیں۔''

''ان کی مدد سے اور زیادہ حمایتی پیدا کرتے رہو۔ آرمی میں جتنے مرد ہیں، وہ ہمارے حمایتی بن کر جلد ہی زنانہ حکومت کے خلاف بغاوت کریں گے۔''

''انشاء اللہ یہی ہوگا۔ تم ملکہ نگارا کے تخت کا تختہ کر کے اس ریاست کے حکمران بنو گے۔''

ایک خاتون گارڈ نے دروازہ کھولا۔ ملکہ آرہی تھی۔ مراد نے کہا۔''پھر کسی وقت کال کروں گا۔''

اس نے فون بند کر دیا۔ نگارا نے کہا۔''میں نے کہا تھا محل سے باہر کسی سے رابطہ نہیں رکھو گے۔''

وہ ہاتھ بڑھا کر بولی۔''یہ فون مجھے دو۔''

''تم حد سے زیادہ پابندیاں عائد کر رہی ہو۔ میں تمہیں سمجھا رہا ہوں، فون میرے پاس رہنے دو۔''

وہ بولی۔''سوری، مجھے اپنی بزرگ خواتین کے زریں اصولوں پر عمل کرنا ہے۔''

مراد نے اس کی پھیلی ہوئی ہتھیلی پر فون رکھ دیا۔ نگارا نے وہ فون خاتون گارڈ کو دے کر کہا۔''جاؤ یہاں سے۔''

وہ چلی گئی۔ نگارا نے دروازے کو بند کر کے اس کے قریب آتے ہوئے کہا۔''ہم اس خواب گاہ میں محبت کرنے والے میاں بیوی ہیں۔ آؤ مجھے محبت سے بازوؤں میں جکڑ لو۔''

وہ اس کے بالکل قریب ہو کر بولا۔''میں نے کہا تھا کہ تنہائی میں تمہیں ہاتھ بھی نہیں لگاؤں گا لیکن تم حکم دے رہی ہو تو جکڑنا ہی ہوگا۔''

اس نے نگارا کو بازوؤں میں لے کر سینے سے لگایا تو وہ اپنی جیت پر خوش ہوئی پھر اچانک ہی گھبرانے لگی۔ اس کی سانسیں رکنے لگیں۔ ایک مرد نے پوری مردانگی سے جکڑ لیا تھا۔

وہ زور لگا کر خود کو چھڑانے کی کوشش کرنے لگی۔

''چھوڑو۔ میری سانسیں رک رہی ہیں۔''

وہ زور لگا رہی تھی۔ اس نے چھوڑا تو وہ جھٹکا کھا کر پیچھے کی طرف قالین پر گر پڑی۔ پھر فوراً ہی اٹھتے ہوئے بولی۔''یہ محبت نہیں دشمنی ہے۔''

''ایک قیدی شوہر کی محبت ایسی ہی ہوگی۔''

''میں آخری بار حکم دیتی ہوں۔ مجھ سے پیار کرو۔ دشمنی کرو گے تو کال کوٹھری میں پھنکوا دوں گی۔ مجھے شوہر بدلنے میں دیر نہیں لگے گی۔''

''ملکۂ عالیہ ہو تو میرا پیار حاصل کر کے بتاؤ یا طلاق

لے کر دوسرا کوئی غلام شوہر لے آؤ۔''

''یہ تمہارا آخری فیصلہ ہے؟''

''میرے قریب آؤ۔ دم گھٹنے لگے تو سمجھ لینا کہ آخری فیصلہ کر چکا ہوں۔''

وہ غصے سے پاؤں پٹختی ہوئی دروازے کے پاس گئی پھر اسے کھول کر گارڈز سے بولی۔ ''اسے یہاں سے لے جاؤ۔ باہر آرمی افسر کے حوالے کرو اور ہوشیار رہو۔ یہ بہت خطرناک ہے۔''

پھر اس نے ڈرائنگ روم میں ایک آرمی افسر کو طلب کیا اور اسے حکم دیا۔ ''مراد علی منگی کو ہتھکڑیاں پہنا کر لے جاؤ۔ بدترین مجرموں کو جن کال کوٹھریوں میں رکھا جاتا ہے، وہیں ایک کوٹھری میں اسے ڈال دو۔ اسے بھوکا پیاسا رکھو۔ ہر پچاس گھنٹے بعد اسے آدھی روٹی اور آدھا گلاس پانی دیا کرو۔''

وہ ہنسنے لگا۔ پھر ہنستے ہوئے بولا۔ ''ملکۂ عالیہ کے احکامات کی تعمیل کی جائے گی۔''

وہ غصے سے بولی۔ ''یہ مذاق سمجھ رہا ہے۔ اسے لے جا کر دن رات ٹارچر کرو۔ ایسی اذیتیں دیتے رہو کہ یہ مجھ سے رحم کی بھیک مانگنے لگے اور میرا تابعدار بن کر رہنے پر راضی ہو جائے۔''

''ہر ہائی نس کا حکم سر آنکھوں پر۔ ہم اس پر تشدد کی انتہا کر دیں گے۔''

''اس سے بہت ہوشیار رہو۔ یہ بہت خطرناک ہے۔''

''ہر ہائی نس کی آرمی اس سے بھی زیادہ خطرناک ہے۔ یہ تشدد کی تاب نہ لا کر گڑگڑاتا ہوا آپ کے قدموں میں گرتا پڑتا رحم کی بھیک مانگنے آئے گا۔''

''شاباش جاؤ۔ میں چاہتی ہوں کہ یہ جلد ہی مجھ سے رحم کی بھیک مانگنے لگے۔ اسے لے جاؤ۔''

اس نے حکم کی تعمیل کی۔ اسے ہتھکڑی پہنا کر محل سے باہر لے آیا۔ مراد خاموش تھا۔ حالات سے سمجھوتا کر رہا تھا۔ اسے قیدیوں کو لے جانے والی گاڑی کے پچھلے حصے میں بٹھایا گیا۔ اس کے ساتھ دو افسر اور تین سپاہی بیٹھ گئے۔ وہ سب پوری طرح مسلح تھے۔

اس گاڑی کے آگے پیچھے بھی مسلح سپاہی تھے اور سب ہی مرد تھے۔ یہ اندیشہ تھا کہ مراد کسی وقت بھی خطرہ بن سکتا ہے اس لیے کوئی لیڈی افسر ساتھ نہیں جا رہی تھی۔ گاڑی کے پچھلے حصے کے دروازے کو باہر سے بند کر دیا گیا۔ اگر مراد اچانک ایکشن میں آتا تو گاڑی سے باہر نکل نہ پاتا۔ وہ لوگ ہر پہلو سے محتاط تھے۔

وہ تین گاڑیاں وہاں سے چل پڑیں۔ ملکہ نگارا بالکونی سے دیکھ رہی تھی۔ زیر لب کہہ رہی تھی۔ ''خطرناک اور شہ زور مجرم بھی کہتے ہیں کہ مراد علی منگی کو کوئی توڑ نہیں سکتا اور یہ ٹوٹنے جا رہا ہے۔ اسے ایسی اذیتیں دی جائیں گی کہ صبح تک ٹوٹ پھوٹ کر میرے تلوے چاٹنے آئے گا۔''

وہ گاڑیاں ایک مخصوص رفتار سے جا رہی تھیں۔ منزل تک پہنچنے کی جلدی نہیں تھی۔ وہ ہتھکڑیاں پہنے تن کر بیٹھا تھا۔ آرمی کے دو افسر اور سپاہی کبھی ایک دوسرے کو دیکھ رہے تھے اور کبھی مراد کو بڑی عقیدت سے دیکھنے لگتے تھے۔

ایک افسر نے کہا۔ ''ہم آپ کے فین ہیں۔ آرمی کی کرائم برانچ میں ہم نے آپ کی فائل پڑھی ہے۔''

مراد نے دوسرے افسر کو دیکھا۔ وہ بولا۔ ''میں نے بھی وہ فائل پڑھی ہے۔ آپ غضب کے فائٹر اور شوٹر ہیں۔''

کے بعد دیگرے سپاہیوں نے کہا۔ ''ہم بھی آپ کا ذکر سنتے رہتے ہیں۔ سنا ہے، آپ تاریکی میں بھی صحیح نشانہ لگاتے ہیں۔''

ایک افسر نے ہنستے ہوئے کہا۔ ''ہمارے پاس اسلحہ ہے۔ آپ کے پاس نہیں ہے۔ آپ کے ہاتھوں میں ہتھکڑی ہے اور دروازہ باہر سے لاکڈ ہے۔ پھر بھی ہم سہمے ہوئے ہیں۔''

دوسرے افسر نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ''بائی گاڈ! ہمارا دل اور دماغ چیخ چیخ کر کہہ رہا ہے کہ آپ کال کوٹھری میں پہنچنے سے پہلے کچھ بھی کر گزریں گے۔''

مراد نے ہنستے ہوئے کہا۔ ''میں کوئی سپرمین نہیں ہوں اور نہ ہی کسی طرح کا جادو جانتا ہوں۔ اللہ پر بھروسا کرتا ہوں۔ اگر نکل بھاگنے کا کوئی راستہ نکل آئے یا کوئی بہانہ مل جائے تو پھر رہائی پانے کے لیے جان کی بازی لگا دیتا ہوں۔''

اس وقت گاڑیاں ایک مسجد کے قریب سے گزر رہی تھیں اور عشا کی اذان سنائی دے رہی تھی۔ مراد نے کہا۔ ''میں نماز پڑھوں گا۔ وہ کال کوٹھری یا ٹارچر سیل کتنی دور ہے؟''

افسر نے کہا۔ ''نماز ہم بھی پڑھیں گے۔ ٹارچر سیل کے سامنے ایک مسجد ہے۔ آپ نے ابھی کہا ہے کہ فرار کا بہانہ مل جائے تو جان کی بازی لگا دیں گے۔ دیکھیں کہ نماز کے بہانے راستہ کھلے گا۔''

دوسرے افسر نے کہا۔ ''ہم مسلمان ہیں۔ یہ نہیں چاہیں گے کہ بندھے ہوئے ہاتھوں سے نماز پڑھیں۔ ہم مسجد میں پہنچ کر آپ کی ہتھکڑی کھولیں گے۔''

مراد نے کہا۔ ''میں نماز کو بہانہ بنا کر دھوکا نہیں دوں گا۔''

وہ سرہلا کر بولا۔ ''آپ کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ جو کہتے ہیں وہی کرتے ہیں۔ ہمیں پورا یقین ہے کہ ہم دھوکا نہیں کھائیں گے۔''

گاڑیاں مسجد کے سامنے پہنچ کر رک گئیں۔ وہ تمام مسلح افسران اور سپاہی تعداد میں پچیس تھے۔ وہ سب مسجد کے دروازے پر جوتے اتار کر اندر آئے۔ وہاں ایک سپاہی نے اس کی ہتھکڑی کھول دی۔ پھر سب نے ہی اپنی اپنی بلٹس کی پیٹیاں اتار کر اسلحے کے ساتھ وہیں ایک طرف رکھ دیں اور وضو کرنے لگے۔

مراد بھی وضو کرنے کے بعد نمازیوں کے درمیان آیا۔ وہاں آرمی والوں کے علاوہ تیس عام شہری بھی تھے۔ ایک افسر نے مراد سے کہا۔ ''آپ پہلی صف میں آجائیں۔ ہم آپ کے آس پاس رہ کر نماز پڑھیں گے۔''

مراد نے کہا۔ ''میں ایسی جگہ چاہتا ہوں، جہاں میرے دائیں کوئی نہ ہو۔''

پہلی صف جہاں سے شروع ہوتی ہے، وہاں اسے جگہ دی گئی۔ جب نماز شروع ہوئی اور تکبیر کے بعد اس نے دونوں ہاتھ سینے پر باندھے تو حضرت صلاح الدین اجمیری اس کے دائیں طرف آگئے۔ دونوں نے ایک دوسرے کو نہیں دیکھا۔ اپنے معبود کے آگے خود کو بھولتے چلے گئے۔

نماز دین کا ستون ہے۔ نمازیوں کے اعمال کو مستحکم بناتی ہے اور مراد یہ ابتدا سے دیکھتا آرہا تھا کہ نماز اس کے لیے معجزاتی ہے اور اس کی قوت بنتی جارہی ہے۔

نماز کے آخر میں سب نے دعا کے لیے ہاتھ اٹھائے۔ پیش امام نے بلند آواز میں کہا۔ ''اے رب کریم! ہمیں صراطِ مستقیم پر چلا۔''

سب نے بیک آواز بلند کہا۔ ''آمین......!''

''اے قادرِ مطلق! ہمیں ان راستوں پر چلا، جن پر تو نے انعام رکھا ہے۔ ان راستوں سے بچالے، جن پر تیرا قہر وغضب نازل ہوتا ہے۔''

پھر سب نے کہا۔ ''آمین......!''

''اے پاک پروردگار! ہمیں اس مخلوق سے بچا جو ٹیڑھی پسلی سے پیدا ہوئی ہے۔ اے رب جلیل! مرد کو مرد کی جگہ اور عورت کو عورت کی جگہ پہنچادے۔''

مراد نے حیرانی سے یہ دعا سنی۔ سب کہہ رہے تھے۔ ''آمین......'' گویا وہاں پچاس سے زیادہ جو نمازی تھے، وہ ملکہ نگار خانم کی حکمرانی نہیں چاہتے تھے۔

مسجد میں عورتیں نہیں ہوتیں اور نہ ہی وہاں ملکہ کا کوئی جاسوس تھا۔ اسی لیے وہ کھل کر ملکہ کے شر سے اسی طرح پناہ مانگ رہے تھے جس طرح شیطان مردود کے خلاف اللہ تعالیٰ کی پناہ مانگتے ہیں۔

دعا مانگنے کے بعد آرمی کے ایک افسر نے منبر کے پاس آکر کہا۔ ''مسٹر مراد علی منگی! یہاں تشریف لائیں۔''

وہ اٹھ کر کھڑا ہوگیا پھر افسر کے پاس آیا۔ حضرت صلاح الدین اجمیری بھی اس کے ساتھ وہاں آکر کھڑے ہوگئے۔

افسر نے کہا۔ ''ہم نے ہتھکڑی کھول دی ہے۔ آپ کو گرفتار نہیں کرنا چاہتے اور ملکہ کی حکم عدولی کر کے نافرمان اور باغی کہلانا بھی نہیں چاہتے۔ آپ فرمائیں ہمیں کیا کرنا چاہیے...؟ ...... بہت جلد ایسا وقت آئے گا جب ہم کھل کر بغاوت کریں گے۔ ایک فیصلہ کن جنگ لڑیں گے۔ آگ اور خون کی ہولی کھیلنے کے لیے ہمیں آپ کی ضرورت ہے۔ آپ ماہر جنگ باز ہیں۔ دشمن کی صفوں میں گھسنا انہیں صفحۂ ہستی سے مٹانا اور ان کے محاصرے سے نکل آنا جانتے ہیں۔ ہمیں آپ کی اشد ضرورت ہے۔ آپ فرمائیں، ہم ابھی کس طرح آپ کو سلامتی دے سکتے ہیں؟''

حضرت صلاح الدین اجمیری نے مراد کے سر پر ہاتھ رکھا۔ اسے محسوس ہوا جیسے اس کے اندر نور پھیل رہا ہے۔ اسے آگہی مل رہی ہے۔ اس نے تمام نمازیوں کو دیکھا پھر افسر سے کہا۔ ''تم سب کھلی جنگ لڑنے کی تیاریاں کرو۔ میں اپنے دو ساتھیوں کے ساتھ آج سے گوریلا جنگ لڑوں گا۔ ہیڈ کوارٹر میں میرے دو ساتھی ہیں اور میرے اٹھارہ جاں نثار ہیں۔ وہاں آرمی کے دو افسران ہمارے حمایتی ہیں۔ آپ کوشش کریں کہ وہاں ہمارے ساتھیوں کو زیادہ سے زیادہ آرمی والوں کی حمایت حاصل ہوتی رہے۔ یہاں ابھی مجھے ہتھکڑی پہنا کر کال کوٹھری میں پہنچادیں۔ پھر میں جب چاہوں، مجھے وہاں سے نکلنے دیں۔ میں چپ چاپ دشمنوں سے نمٹ کر کال کوٹھری میں واپس آجایا کروں گا۔''

انہوں نے یہی کیا۔ ان سب نے اپنے ہتھیار اٹھائے۔ بلٹس کی پیٹیاں کمر سے باندھیں۔ مسجد کے باہر آکر جوتے پہنے پھر مراد کو ہتھکڑیاں پہنادیں۔

تب بابا اجمیری کی موجودگی نے کرامات دکھائیں۔ ایک مراد ہتھکڑیاں پہنے آرمی والوں کے ساتھ جانے لگا، دوسرا مراد بابا اجمیری کے ساتھ مسجد کے دروازے پر کھڑا رہا۔ اب وہ بھی بابا صاحب کی طرح کسی کو نظر نہیں آرہا تھا۔

ٹارچر سیل کے تہ خانے میں کال کوٹھری تھی۔ وہاں

آرمی کی لیڈی افسران اور مسلح زنانہ فورس تھی۔ جب کسی مجرم کو ٹارچر کیا جاتا تھا تو لیڈی افسران وہاں موجود رہتی تھیں۔

وہاں کی ایک لیڈی افسر کا نام جلو بی بی تھا۔ وہ بہت ہی سنگدل اور بے رحم تھی۔ اس نے مراد کو ہتھکڑی میں دیکھ کر کہا۔ ”اسے ٹارچر سیل میں لے چلو۔ اسے اس طرح جکڑ دو کہ یہ ہاتھ پاؤں نہ ہلا سکے۔ محل سے حکم موصول ہوا ہے کہ اسے سکون سے نہ رہنے دیا جائے۔ اس پر تشدد کی انتہا کر دی جائے۔“

اسے سیل میں پہنچا کر ایک کرسی پر بٹھا کر اس کے ہاتھوں اور پیروں کو اچھی طرح باندھ دیا گیا۔ جلو بی بی نے حکم دیا۔ ”پہلے اسے بجلی کے جھٹکے پہنچاؤ۔ اسے دماغی طور پر کمزور کرو۔ پھر یہ آئندہ اذیتیں برداشت کرنے کے قابل نہیں رہے گا۔ اسے صبح ہونے تک ہر ہائی نس کے قدموں میں جا کر گرنا ہے۔“

حکم کی تعمیل کی گئی۔ جب اسے الیکٹرک شاک پہنچایا گیا تو اس کے دماغ میں زلزلہ سا آ گیا۔ وہ تکلیف کی شدت سے چیخنے لگا۔ دو تین جھٹکوں کے بعد ہی وہ بے جان سا ہو کر آگے کی طرف ڈھلک گیا۔ اگر بندھا ہوا نہ ہوتا تو کرسی سے نیچے گر جاتا۔

بابا صاحب دوسرے مراد کو آرمی ہیڈ کوارٹر میں پہنچا کر چلے گئے۔ وہاں بشریٰ اور بلے کو ایک دوسرے سے دور الگ کمروں میں رکھا گیا تھا۔ ملکہ نے حکم دیا تھا کہ انہیں سیکرٹ فورس کے ساتھ نہ رکھا جائے۔ وہ مراد علی منگی کے ساتھی ہیں۔ ان سب کو حراست میں رکھا جائے۔ مراد صبح تک گھٹنے نہیں ٹیکے گا تو انہیں بھی ٹارچر سیل میں پہنچا دیا جائے۔

اس وقت رات کے گیارہ بجے تھے۔ بشریٰ ایک چار پائی کے سرے پر بیٹھی پریشانی سے سوچ رہی تھی۔ ”ہیڈ کوارٹر میں ہر جگہ مسلح سپاہی ہیں۔ یہاں سے فرار ہونا ممکن نہیں ہے۔ سنا ہے بھائی کو بھی گرفتار کر لیا گیا ہے۔ یا اللہ! ہم یہاں سے کیسے نکل پائیں گے؟ بس تُو ہی سلامتی دینے والا ہے۔“

ایسے وقت کمرے کا دروازہ کھلا۔ ایک افسر وہاں کھڑا بشریٰ کو دیکھ رہا تھا اور مسکرا رہا تھا۔ پھر وہ دروازہ بند کر کے قریب آتے ہوئے بولا۔ ”اس ریاست میں پابندیاں بہت ہیں۔ من مستی کے لیے کوئی عورت آسانی سے نہیں ملتی ہے۔“

وہ اور قریب آیا تو اچانک ہی پیٹ میں گھونسا لگا۔ وہ تکلیف سے پیٹ پکڑ کر آگے کو جھکنے لگا۔ بشریٰ نے ایک کرارا ہاتھ منہ پر مارا تو وہ جھکتے جھکتے سیدھا ہو کر پیچھے کی طرف گیا۔ بشریٰ نے گھوم کر ایک کک ماری۔ اس کا منہ دوسری طرف گھوم گیا۔

اس نے کہا۔ ”میں بھی من مستی کے لیے بے چین ہو رہی تھی۔ چلو اٹھو، ہم اور انجوائے کریں گے۔“

وہ سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ جس کے پاس مستی کے لیے آیا ہے، وہ زبردست فائٹر ہو گی۔ وہ فوراً ہی اچھل کر کھڑا ہو گیا پھر غصے سے بولا۔ ”میں دھوکے میں مار کھا گیا۔ اب دیکھو میں کس طرح تمہاری ہڈی... پسلی توڑوں گا۔“

وہ اس پر حملہ کرنا چاہتا تھا پھر رک گیا۔ اس نے دروازے کو اندر سے لاک کیا تھا۔ وہ باہر سے کھل نہیں سکتا تھا لیکن اندر سے خودبخود کھل گیا۔ مراد نظر نہیں آ رہا تھا۔ وہ اندر آنے کے بعد دروازے کو کھول کر پھر باہر چلا گیا۔

افسر نے حیرانی سے دروازے کو خودبخود کھلتے ہوئے دیکھا۔ وہ اور قریب سے دیکھنے کے لیے آگے بڑھا تو وہ دروازہ پوری طرح کھل گیا۔ اب وہاں مراد نظر آ رہا تھا۔ وہ اندر آ گیا۔ بشریٰ نے خوش ہو کر کہا۔ ”بھائی......!“

افسر نے حیرانی سے پوچھا۔ ”تمہیں تو گرفتار کر کے ٹارچر سیل میں لے گئے تھے۔ تم یہاں کیسے آ گئے؟“

مراد نے ایک الٹا ہاتھ اس کے منہ پر رسید کیا پھر کہا۔ ”آدھی رات کو میری بہن کے پاس آئے ہو۔ اب یہاں سے زندہ کیسے جاؤ گے؟“

اس نے پھر ایک ہاتھ اس کے منہ پر مارا۔ افسر نے فوراً ہی ریوالور نکال لیا لیکن بوکھلا گیا۔ گولی کسے مارے۔ وہ نظر نہیں آ رہا تھا۔ مراد نے پیچھے سے ایک زور کی لات ماری۔ وہ لڑکھڑاتا ہوا آگے کی طرف جاتا ہوا دروازے سے باہر جا کر گر پڑا۔ ریوالور اس کے ہاتھ سے نکل گیا تھا۔

مراد نے اسے اٹھا کر نشانہ لیا۔ پھر اسے گولی مار دی۔ فائر کی آواز سنتے ہی کئی سپاہی دوڑتے ہوئے آئے۔ وہ ایک فوجی ٹرک کے پیچھے چھپتے ہوئے بولا۔ ”میں نے ملکہ کے خلاف ہتھیار اٹھایا ہے۔ میں اس ریاست سے مغرور عورت کی حکمرانی ختم کروں گا۔ مرد ہو تو میرا ساتھ دو۔ میں ان خواتین سے بھی گزارش کرتا ہوں جو دینی احکامات پر عمل کرتی ہیں اور بڑے ممالک کے ہاتھوں میں کٹھ پتلی بن کر رہنے والی ملکہ سے نجات چاہتی ہیں۔ میں ان کا بھائی ہوں۔ وہ اپنے بھائی کا ساتھ دیں۔“

ابھی کوئی یقین نہیں کر سکتا تھا کہ ایک تنہا شخص ایک مستحکم ریاست کی ملکہ سے ٹکرا کر صبح تک زندہ رہ سکے گا۔ انہوں نے فائرنگ شروع کر دی۔ وہ ٹرک کے پیچھے محفوظ تھا۔

اس کی جوابی فائرنگ سے دو مارے گئے۔ باقی ادھر ادھر چھپنے کے لیے بھاگنے لگے۔ وہ مراد کی فائرنگ سے بچنے لگے۔ مراد ٹرک کے پیچھے سے نکل کر سامنے آگیا لیکن آنکھوں والے نابینا ہوگئے۔ وہ کسی کو نظر نہیں آرہا تھا۔

کئی سپاہی دوسری سمت سے دوڑتے ہوئے فائر کرتے ہوئے آئے پھر رک گئے۔ ایک نے چیخ کر کہا۔ ''وہ ٹرک کے پیچھے نہیں ہے۔''

وہ ایک دیوار کے پیچھے آگئے۔ وہاں دو سپاہی چھپے ہوئے تھے۔ دھیمی آواز میں بول رہے تھے۔ ایک کہہ رہا تھا۔ ''میجر محمود نے کہا ہے کہ مراد پر گولی نہ چلائیں۔ غلط نشانہ لیتے رہیں۔ کمانڈران چیف کو یہی معلوم ہونا چاہیے کہ ہم مراد کو مار گرانے کی کوشش کررہے ہیں۔''

اس نے خود کو ظاہر کرتے ہوئے کہا۔ ''ہیلو۔''

انہوں نے چونک کر پلٹ کر پیچھے دیکھا۔ مراد نے مصافحے کے لیے ہاتھ بڑھایا۔ دونوں نے فوراً ہی مصافحہ کیا۔ اس نے پوچھا۔ ''میں میجر محمود سے ملنا چاہتا ہوں۔ وہ کہاں ہیں؟''

ایک نے سامنے والی عمارت کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ''وہ وہاں فرسٹ فلور میں دوسرے افسران کے ساتھ بیٹھے ہیں۔ سنا ہے ہماری کمانڈران چیف یہاں آرہی ہیں۔''

وہ وہاں سے دوڑتا ہوا ان سپاہیوں سے دور دیوار کی دوسری طرف جاکر نظروں سے اوجھل ہوگیا۔ فرسٹ فلور کے ایک بڑے سے کمرے میں میجر محمود کے ساتھ دو مرد اور دو لیڈیز افسران بیٹھے ہوئے تھے۔ اس موضوع پر باتیں ہورہی تھیں کہ ملکہ اور مراد کے درمیان ٹھن گئی ہے۔ ملکہ نے اسے ٹارچ سیل میں لے جانے کا حکم دیا تھا۔ نہ جانے وہ کس طرح ان کی گرفت سے نکل کر یہاں آگیا ہے۔

ایک افسر نے کہا۔ ''ملکۂ عالیہ کو اندازہ نہیں ہے کہ وہ شخص خطرناک بھی ہے اور ناقابلِ گرفت بھی ہے۔ دیکھ لیں کہ گرفت سے نکل کر یہاں آگیا ہے۔''

ایک خاتون افسر نے کہا۔ ''وہ اپنے دو ساتھیوں کی رہائی کے لیے ادھر آیا ہے۔ ہم ان دونوں کو گن پوائنٹ پر رکھ کر اسے ہتھیار پھینکنے پر مجبور کرسکتے ہیں۔''

دوسری خاتون افسر نے کہا۔ ''وہ مجبور نہیں ہوگا۔ اگر اس کے ساتھیوں کو گولی ماری گئی تو وہ پورے آرمی ہیڈ کوارٹر میں قیامت برپا کردے گا۔''

پہلی خاتون افسر نے ناگواری سے کہا۔ ''شائستہ! کیا آرمی ہیڈ کوارٹر کھلونا ہے کہ ایک آدمی ہم سب کو توڑ پھوڑ کر رکھ دے گا اور ہم منہ دیکھتے رہ جائیں گے۔''

شائستہ نے کہا۔ ''وہ اپنی ذات میں ایک پوری فوج ہے انجلی! تمہیں فرصت ملے تو اس کی فائل اٹھا کر پڑھو۔ معلوم ہوجائے گا کہ وہ ہتھیاروں کا کیسا زبردست کھلاڑی ہے۔''

میجر محمود نے کہا۔ ''انجلی! یہ تو ہمارے سامنے کی بات ہے۔ اس نے زمین اور آسمان کے درمیان نہتا ہونے کے باوجود چھ ہائی جیکرز کو ان کے برے انجام تک پہنچایا تھا۔''

انجلی نے کہا۔ ''وہ چھ تھے اور یہاں چالیس ہزار فوجی ہیں۔ ابھی تھوڑی دیر میں اسے گولیوں سے چھلنی کردیں گے۔''

فون کی رنگ ٹون سنائی دی۔ میجر نے بٹن دبا کر اسے کان سے لگایا۔ دوسری طرف سے کہا گیا۔ ''سر! کیپٹن فردوس سمیت ہمارے چھ فوجی مارے گئے ہیں۔ اسے تلاش کیا جارہا ہے۔ پتا نہیں وہ کہاں چھپ گیا ہے یا فرار ہونے میں کامیاب ہوگیا ہے۔''

میجر نے کہا۔ ''وہ انسان ہے۔ کوئی جن بھوت نہیں ہے کہ غائب ہوجائے گا۔ وہ ہیڈ کوارٹر سے باہر نہیں جاسکے گا۔ مجھے فون کرنے میں وقت ضائع نہ کرو۔ اسے تلاش کرو۔''

اس نے فون بند کردیا۔ کیپٹن انجلی نے اپنی جگہ سے اٹھتے ہوئے کہا۔ ''میں اسے چوہے کے بل سے نکالوں گی۔ ہمارے سپاہی اس کے دونوں ساتھیوں کو نشانے پر رکھ کر اسے سامنے آنے پر مجبور کردیں گے۔''

وہ تیزی سے چلتی ہوئی دروازہ کھول کر باہر جانا چاہتی تھی۔ دروازہ کھولتے ہی ٹھائیں کی آواز کے ساتھ ایک گولی آکر اس کی پیشانی میں لگی۔ وہ ایک جھٹکے سے پیچھے آکر گری تو پھر اٹھ نہ سکی۔ خون آلود پیشانی میں سوراخ ہوگیا تھا اور دیدے پھیل کر ساکت ہوگئے تھے۔

تمام افسران اچھل کر کھڑے ہوگئے۔ اپنی اپنی گن کو مضبوطی سے تھام کر صوفوں اور الماری کے پیچھے چھپنے لگے۔ باہر سے مراد کی آواز سنائی دی۔ ''میں اندر نہیں آؤں گا اور تم میں سے کوئی باہر نکل کر میرے ساتھیوں کے پاس نہیں جاسکے گا۔ یہ لکھ لو کہ ان دونوں کے بدن پر ہلکی سی خراش بھی آئے گی تو میں ایک بھی آرمی افسر کو زندہ نہیں چھوڑوں گا۔''

میجر محمود نے کہا۔ ''ہم وعدہ کرتے ہیں تمہارے ساتھیوں کو نقصان نہیں پہنچے گا۔''

مراد نے کہا۔ ''ان دونوں کو اسلحہ دے کر ابھی رہا کیا جائے۔ وہ اس ریاست میں آزادی سے رہیں گے اور میری سیکرٹ فورس کے اٹھارہ جاں نثاروں پر بھی کسی طرح کی

پابندی عائد نہ کی جائے۔''

میجر نے کہا۔ ''میں ابھی سی ان سی سے بات کر کے ان کی رہائی کا حکم دوں گا۔''

وہ فون پر سی ان سی سے رابطہ کرنے لگا۔ مراد نے آنکھیں بند کر کے زیر لب کہا۔ ''بابا صاحب! مجھے سی ان سی کے پاس پہنچادیں۔''

یہ کہہ کر اس نے آنکھیں کھولیں تو خود کو لیڈی سی ان سی کے وسیع و عریض بیڈ روم میں پایا۔ وہ محترمہ ایک صوفے پر بیٹھی ملکہ نگارا سے بول رہی تھی۔ ''ہر ہائی نس! آپ فرماتی ہیں کہ وہ ٹارچر سیل میں ہے۔ وہاں اسے ٹارچر کیا جارہا ہے۔ جب کہ وہ یہاں ہے۔ ہمارے افسران اور سپاہی اسے آنکھوں سے دیکھ رہے ہیں۔ اس وحشی درندے سے فائرنگ کا تبادلہ ہورہا ہے۔ اب تک کی معلومات کے مطابق ہمارے افسر اور سپاہی مارے جارہے ہیں۔''

ملکہ نے کہا۔ ''میں نہیں مانتی۔ ایک شخص بیک وقت دو جگہ موجود نہیں رہ سکتا۔ اگر وہ وہاں ہے تو اس سے کہو' مجھ سے بات کرے۔ ابھی وہاں جاؤ' میں انتظار کررہی ہوں۔''

ملکہ سے رابطہ ختم ہوتے ہی رنگ ٹون ابھرنے لگی۔ وہ بٹن دبا کر اسے کان سے لگا کر بولی۔ ''یس میجر! کیا رپورٹ ہے؟''

وہ بولا۔ ''میڈم! باہر چھ فوجی مارے گئے ہیں۔ یہاں سامنے کیپٹن انجلی کو گولی لگی ہے۔ ناؤشی از نو مور۔ ہم چار افسران ایک کمرے میں قید ہوگئے ہیں۔ باہر مراد علی منگی موجود ہے، ہم میں سے جو باہر نکلے گا، وہ مارا جائے گا۔ ہماری سلامتی اسی میں ہے کہ ہم اس کے مطالبات مان لیں۔''

''اس کے مطالبات کیا ہیں؟''

''وہ کہتا ہے، سیکرٹ فورس کو آرمی کا پابند نہ بنایا جائے۔ ان سب کو اسلحے کے ساتھ رہا کردیا جائے۔''

''وہ بکواس کرتا ہے۔ سیکرٹ فورس کو آزاد چھوڑا جائے گا تو وہ اور زیادہ طاقتور ہوجائے گا۔ اس سے بولو، وہ ہر ہائی نس ....سے بات کرے اور اپنے مطالبات پیش کرے۔ میں انتظار کررہی ہوں۔ مجھے بتاتے رہو، وہاں کیا ہورہا ہے؟''

اس نے فون بند کردیا۔ مراد پیچھے کھڑا ہوا تھا۔ وہ آرام سے چلتا ہوا سامنے آیا تو وہ شدید حیرانی سے اچھل کر کھڑی ہوگئی۔ بڑی ہی پھرتیلی تھی۔ اس نے پلک جھپکتے ہی سینٹر ٹیبل پر رکھی ہوئی گن کو اٹھالیا۔ پھرتیلا وہ بھی تھا۔ اس نے گن کو لات ماری تو وہ ہاتھ آنے سے پہلے ہی دور چلی گئی۔

وہ تربیت یافتہ فائٹر تھی۔ اس نے اپنی گن کی طرف چھلانگ لگائی پھر اسے گرفت میں لے کر فرش پر لڑھکتی ہوئی ایک جگہ رک کر گولی چلادی۔ وہ پکی نشانہ باز تھی لیکن وہ نشانے پر نہیں تھا۔

اس نے تعجب سے فرش پر بیٹھتے ہوئے ادھر ادھر دیکھا۔ پھر اٹھ کر کھڑی ہوئی تو مراد نے پیچھے سے گردن دبوچ لی۔ وہ دائیں بائیں جھٹکے دے کر گردن چھڑانے کی کوشش کرنے لگی، وہ جیسے آہنی شکنجے میں آگئی تھی۔ پیچھے کی طرف گھوم بھی نہیں سکتی تھی۔

اس نے ہاتھ اٹھا کر ریوالور کا رخ اس کی طرف کیا۔ وہ گولی چلانا چاہتی تھی۔ مراد نے دوسرے ہاتھ سے اس کی کلائی پکڑ لی۔ ایسی آہنی گرفت تھی کہ کلائی کی ہڈی جیسے ٹوٹنے ہی والی تھی۔ اس کے ہاتھ سے ریوالور چھوٹ گیا۔ پھر پیچھے سے ایک لات پڑی تو وہ آگے کی طرف لڑکھڑاتی ہوئی فرش پر گر پڑی۔

وہ غصے سے تلملا رہی تھی۔ فوراً ہی اٹھ کر حملہ کرنا چاہتی تھی۔ پھر یکلخت ٹھٹک گئی۔ اس کا ریوالور مراد کے ہاتھ میں تھا۔ وہ ہانپتی ہوئی بولی۔ ''حرام موت مروگے۔ باہر درجنوں گارڈز ہیں۔ گولی چلاؤ گے تو سب ہی دوڑتے ہوئے آئیں گے۔ وہ تمہیں زندہ جانے نہیں دیں گے۔''

''تمہارے درجنوں گارڈز نے مجھے آنے سے نہیں روکا، جانے سے بھی نہیں روکیں گے۔''

وہ حیرانی سے بولی۔ ''مائی گاڈ! تم اندر کیسے آگئے؟''

''یہ مت پوچھو۔ مجھے باہر جاتے ہوئے دیکھنے کے لیے زندہ نہیں رہوگی۔''

وہ پریشان ہوکر بولی۔ ''ہر ہائی نس سے بات کرو۔ اپنے مطالبات منوالو۔ جھگڑا ختم ہوجائے گا۔''

''میں تمہاری ملکہ سے بات کرنا اپنی توہین سمجھتا ہوں۔ تم بات کرو۔''

اس نے فون اٹھا کر نمبر پنچ کیے۔ اسے کان سے لگایا پھر رابطہ ہوتے ہی کہا۔ ''ہر ہائی نس! مراد علی منگی ہماری گرفت سے ہماری طاقت سے باہر ہے۔ ابھی اس کے ہاتھ میں گن ہے اور میں اس کے نشانے پر ہوں۔''

ملکہ نے چونک کر پوچھا۔ ''کیا وہ تمہارے سامنے ہے؟ فون اسے دو۔ میں بات کروں گی۔''

''یہ آپ سے بات کرنا نہیں چاہتا...... اس کے مطالبات پورے نہ کیے گئے تو یہ ابھی مجھے مار ڈالے گا۔''

نگارا یہ سن کر اپنی توہین کے احساس سے جھنجلا گئی کہ وہ ملکہ معظمہ سے بات نہیں کرنا چاہتا ہے۔ وہ غصے سے تلملا کر

بولی۔ ''تم فوج کی کمانڈر ان چیف ہو اور ایک شخص تمہاری موت بن رہا ہے۔ تمہارے بنگلے کے چاروں طرف مسلح گارڈز ہوتے ہیں۔ وہ کہاں مر گئے؟ کیا سب ہی نے چوڑیاں پہن لی ہیں؟ آج معلوم ہو رہا ہے کہ میں نے ایک ممی کو اپنی آرمی کی کمانڈ سونپی تھی۔ لعنت ہے تم پر۔ میں تم سے یہ عہدہ چھین رہی ہوں۔''

''ہر ہائی نس! یہ عہدہ چھین کر کیا کریں گی جبکہ میں زندہ ہی نہیں رہوں گی۔ یہ مجھے مار ڈالے گا۔ آپ میری پندرہ برس کی خدمات پر میرے کارناموں پر تھوک رہی ہیں۔ ذرا اپنے گریبان میں جھانک کر دیکھیں۔ آپ ایک مرد کو اپنے قابو میں نہ رکھ سکیں۔ وہ آپ پر تھوک کر چلا آیا ہے۔''

''یو شٹ اپ۔ ذلیل کمینی! میں تیرے لیے سزائے موت کا حکم دیتی ہوں۔ میں میجر محمود کو سی ان سی بنا رہی ہوں۔ وہ آکر تجھے گولی مارے گا۔''

اس نے گالیاں دیتے ہوئے فون کو بند کر دیا۔ مراد نے مسکرا کر پوچھا۔ ''اچھا تو تم سی ان سی نہیں رہیں۔ تمہاری اونچی حیثیت، تمہارا رعب اور دبدبہ دیکھتے ہی دیکھتے مٹی ہو گیا ہے۔''

وہ بولی۔ ''کوئی فرق نہیں پڑے گا۔ ملکہ نے میرے لیے سزائے موت کا حکم سنایا ہے۔ ابھی یا تو تم گولی مارو گے یا میجر محمود میری جگہ سی ان سی بننے کے [illegible] یہاں آکر مجھے گولی مارے گا۔ بعض لوگوں کو برسوں کی خدمات اور وفاداری کا یہی صلہ ملتا ہے۔''

مراد [illegible]۔ ''بہت عرصے بعد اصلاح ہو رہی ہے۔ کسی عورت کو سی ان سی بنا کر فوج کی باگ ڈور اس کے ہاتھ میں نہیں دینی چاہیے لیکن نگارا کو اور اس کی والدہ اور دادی کو یہ خوف رہتا تھا کہ فوج کی لگام کسی مرد کو دیں گی تو وہ ان کی حکومت کا تختہ الٹ دے گا۔''

فون کی رنگ ٹون سنائی دی۔ سابقہ سی ان سی راحیلہ نے فون اٹینڈ کیا۔ دوسری طرف سے میجر محمود نے کہا۔ ''ملکہ نے حکم دیا ہے کہ تم ہیڈ کوارٹر میں آکر اپنے عہدے کا چارج مجھے دو۔''

وہ بولی۔ ''اور تم اس کے بعد مجھے گولی مار دو گے۔''

''ملکہ نے یہی حکم دیا ہے۔ میں ایسے وقت تم سے پوچھتا ہوں۔ ہر ہائی نس کے متعلق اب تمہاری رائے کیا ہے؟''

''آئی ہیٹ ہر۔ اگر وہ میرے سامنے ہوتی تو مرنے سے پہلے اس کے منہ پر تھوک دیتی۔''

میجر نے کہا۔ ''میڈم راحیلہ! میں تمہیں گولی نہیں ماروں گا۔''

''کوئی فرق نہیں پڑے گا۔ یہاں میرے سامنے مراد علی منگی کھڑا ہے۔ یہ مجھے گولی مارنے والا ہے۔''

مراد نے کہا۔ ''اب تم سی ان سی نہیں رہیں۔ میرے مطالبات پورے کرنے کے اختیارات اب تمہارے پاس نہیں رہے اس لیے میں تمہیں گولی نہیں ماروں گا۔ مجھے میجر سے بات کرنے دو۔''

اس نے ہاتھ بڑھایا۔ میڈم راحیلہ نے اسے فون دیا۔ وہ اسے کان سے لگا کر بولا۔ ''ہیلو میجر! میں مراد علی منگی بول رہا ہوں۔''

وہ خوش ہو کر بولا۔ ''آئی سیلوٹ یو سر! میں آپ سے بہت سی باتیں کرنا چاہتا ہوں۔''

مراد نے کہا۔ ''تمہاری باتوں کا لبِ لباب یہ ہے کہ تم ملکہ کو اقتدار سے گرانا چاہتے ہو۔''

وہ حیرانی سے بولا۔ ''او گاڈ! آپ کیسے جانتے ہیں؟ سر! مجھے آپ کی بہت ضرورت ہے۔''

''میں تم سب کے ساتھ رہوں گا۔ فی الحال رازداری سے اپنے حمایتی پیدا کرتے رہو۔ میں میڈم راحیلہ سے کہتا ہوں کہ ملکہ سے نفرت ہے تو ہمارا ساتھ دے۔ آرمی کی اہم خواتین کی رائے ہمارے حق میں ہموار کرتی رہے۔''

راحیلہ نے کہا۔ ''انشاء اللہ۔ اب میں یہی کروں گی۔ میجر سے کہوں گی کہ آپ کی سیکرٹ فورس کو پہلے کی طرح آزادی دی جائے۔ رمشا اور سلمان کے لیے حفاظتی انتظامات کیے جائیں۔''

میجر نے فون پر کہا۔ ''میں میڈم کی باتیں سن رہا ہوں۔ ہم ملکہ کے حکم کے خلاف سیکرٹ فورس کو زیادہ سے زیادہ سہولتیں دیں گے اور یہ ظاہر کریں گے کہ مراد علی منگی نے ہمیں مجبور کر دیا ہے۔ یہ ثبوت پیش کریں گے کہ اس کے ہاتھوں کئی افسران اور سپاہیوں کی موت نے سب ہی کو دہلا دیا ہے۔ ہم اس کی مخالفت مول لے کر اپنی موت کو دعوت نہیں دیں گے۔''

ملکہ جاگ رہی تھی۔ اس کی نیند اُڑ گئی تھی۔ یہ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ مراد ایک سے دو کیسے ہو گیا ہے۔ پھر آدھی رات کو خبر ملی کہ ٹارچ سیل میں اذیتیں برداشت کرنے والا مراد اچانک کہیں گم ہو گیا ہے۔ وہ سوچ رہی تھی کہ دو مراد ہو ہی نہیں سکتے۔ ہیڈ کوارٹر میں آرمی کے افسران سے نمٹنے والا ایک ہی مراد ہے۔ وہ ٹارچ سیل سے فرار ہو کر وہاں پہنچا ہے اور وہ گرفت میں نہیں آ رہا ہے۔ آخری رپورٹ کے مطابق

درجنوں فوجی ایک ہی رات میں مارے گئے تھے۔
وہ خواب گاہ میں جاگ رہی تھی۔ اچانک ہی اس کی آنکھیں بند ہونے لگیں پھر دیکھتے ہی دیکھتے وہ گہری نیند میں ڈوب گئی۔ ایسے وقت مراد محل کی بالکونی میں آکر مصلیٰ بچھا کر نماز کے لیے کھڑا ہوگیا۔ اسی وقت ان کے درمیان بابا اجمیری آگئے۔ رات کے دو بجے تھے۔ چونکہ وہ جاگتے رہے تھے، اس لیے وہ تہجد کی نماز نہیں تھی۔ وہ نمازِ شکرانہ ادا کررہے تھے اور حضرت صلاح الدین اجمیری تو ہمیشہ نمازِ شکرانہ ادا کرتے ہی رہتے تھے۔
نماز کے بعد انہوں نے دعائیں مانگیں پھر خاموش ہوگئے۔ وہ تینوں دو زانو بیٹھے تھے۔ تینوں کے سر جھکے ہوئے تھے۔ کچھ دیر بعد بابا اجمیری نے کہا۔ ”ہر مشکل کے بعد آسانی ہے اور ہر آسانی کے بعد مشکل ہے۔ انسانی زندگی میں یہ سلسلہ ازل سے ہے اور ابد تک رہے گا۔ ربّ کریم تمہارے لیے آسانیاں پیدا کررہا ہے۔ یہ آسانیاں صرف بیس دنوں کے لیے ہوں گی۔ تم جب چاہو گے، نادیدہ ہوکر دنیا کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک چشم زدن میں پہنچ جایا کروگے۔ یہ روحانی صلاحیت عارضی ہوگی۔ پھر آسانی کے بعد مشکل پیش آئے گی۔ ٹھیک آج سے بیس دنوں کے بعد یہ صلاحیت ختم ہوجائے گی۔ آج آسانی کل مشکل...“
یہ کہتے ہی وہ نظروں سے اوجھل ہوگئے۔ وہ دوسرا مراد ہم زاد تھا۔ دنیا کا ہر انسان دہری شخصیت کا حامل ہوتا ہے۔ وہ پازیٹو بھی ہوتا ہے اور نیگیٹو بھی۔ وہ خیر بھی ہوتا ہے اور شر بھی۔ جب وہ غلطی یا گناہ کرتا ہے تو ضمیر اسے ڈانٹ پھٹکار کر راہِ راست پر لے آتا ہے۔ مراد کا وہ ہم زاد کچھ ایسا ہی تھا۔
ہم زاد نے مراد سے کہا۔ ”یہ تمہاری خواب گاہ ہے۔ مجھے یہاں نہیں رہنا چاہیے۔ میں جارہا ہوں۔ تم دیکھو کیا میں نادیدہ ہورہا ہوں؟“
اس نے آنکھیں بند کرکے دل میں کہا۔ ”یابابا اجمیری!“
مراد نے پلک جھپکاتے ہوئے کہا۔ ”تم نظر نہیں آرہے ہو۔ جاؤ مجھے جب ضرورت ہوگی، تمہارے پاس پہنچ جاؤں گا۔“
وہ نظر نہیں آرہا تھا۔ اس کی آواز سنائی دی۔ ”اور جب مجھے ضرورت ہوگی تو میں تمہارے پاس آجایا کروں گا۔ خدا حافظ۔“
وہ چلا گیا۔ مراد نے سر گھما کر دیکھا۔ وہ مغرور ملکہ بیڈ چھوڑ کر فرش پر سو رہی تھی۔ یہ بابا صاحب کا کمال تھا۔ اسے گہری نیند سلا کر چلے گئے تھے۔
مراد نے وہاں آکر بیڈ کے سرے پر بیٹھ کر فون پر بشریٰ اور بلّے کی خیریت معلوم کی۔ آرمی والے ان پر مہربان ہوگئے تھے۔ وہ دونوں ہیڈ کوارٹر سے نکل کر اپنی رہائش گاہ میں آگئے تھے۔
مراد نے کہا۔ ”میں کل کسی وقت ملنے آؤں گا۔ ابھی نیند پوری کرو۔ میں بھی سونے جارہا ہوں۔“
وہ فون پر بولنے کے دوران میں نادیدہ ہوگیا تھا۔ چپ چاپ ان دونوں کے پاس پہنچ کر ان کی خیریت سے مطمئن ہوکر اپنی خواب گاہ میں آگیا تھا۔
بشریٰ اور بلّا اس کے قابلِ اعتماد راز دار ساتھی تھے۔ وہ دوسرے دن انہیں اپنی روحانی صلاحیت کے متعلق بتانے والا تھا۔ وہ رابطہ ختم کرکے شاہانہ طرز کے آرام دہ بیڈ پر ہاتھ پاؤں پھیلا کر سو گیا۔ وہ ملکہ معظمہ فرش پر گہری نیند میں ڈوبی ہوئی تھی۔

☆☆☆

یہ کسی کی سمجھ میں نہیں آیا کہ وہ ٹارچر سیل سے کیسے فرار ہوگیا تھا؟
اب ہم زاد وہاں موجود تھا لیکن کسی کو نظر نہیں آرہا تھا۔ وہ نادیدہ ہوکر کچھ تماشے کرنا چاہتا تھا۔ آرمی کے وہ افسران اور سپاہی جو اس کے حمایتی تھے، وہ اس کے جانے سے مطمئن ہوگئے تھے۔ محض دکھاوے کے لیے اسے تلاش کررہے تھے۔
ٹارچر سیل کی افسرِ اعلیٰ جلّو بی بی کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ وہ بندھے ہوئے تاروں کے اندر سے کیسے نکل بھاگا ہے اور وہ فرار ہوتے وقت کسی کی نظروں میں نہیں آیا تھا۔
وہ اپنے رہائشی کوارٹر میں آکر سنجیدگی سے سوچ رہی تھی۔ ’وہ کسی طرح کی جادوئی قوت رکھتا ہے۔ تب ہی آسانی سے نکل بھاگا ہے۔ کمبخت نے مجھے تھکا مارا ہے۔ میں نے اسے ناقابلِ برداشت اذیتیں دی تھیں لیکن اس پر خاطر خواہ اثر نہیں ہوا تھا۔ الیکٹرک شاک پہنچانے کے بعد وہ ایک ذرا نڈھال سا ہوا تھا۔ پھر کرسی پر تن کر بیٹھ گیا تھا۔ بے شک وہ فولاد سے بنا ہوا ہوگا لیکن میرے شکنجے میں صبح تک رہتا تو اس فولاد کو موم کی طرح پگھلا دیتی۔‘
وہ اپنی کرسی سے اٹھ کر فریج کے پاس آئی اور ٹھنڈے پانی کی بوتل نکالی۔ اسے کھول کر اپنا منہ کھولا پھر بوتل کو ذرا اوپر اٹھا کر پانی کو حلق تک پہنچانا چاہا۔ ایسے وقت

ہم زاد نے بوتل کو ذرا ادھر سے ادھر کر دیا۔ پانی اس کے چہرے اور لباس پر گرنے لگا۔

اس نے بوتل کو تعجب سے دیکھا پھر اسے دونوں ہاتھوں سے اچھی طرح پکڑ لیا۔ اس کے بعد منہ کھول کر پینا چاہا تو مراد نے بوتل کے منہ کو ذرا سا جھکا دیا۔ پانی پھر اس کے لباس کو بھگونے لگا۔

اس نے پریشان ہو کر بوتل کو دیکھا۔ اس بار اس نے بہت مضبوطی سے بوتل کو پکڑ کر پینا چاہا۔ مراد نے بوتل کے پچھلے حصے پر زور کا ہاتھ مارا تو وہ اس کے چہرے سے یوں ٹکرائی جیسے پتھر آ کر لگا ہو۔ تکلیف کے باعث اس کے حلق سے کراہ نکلی۔

اس نے گھبرا کر بوتل کو ایک طرف پھینک دیا۔ حیرانی اور پریشانی سے سوچنے لگی۔ 'ایسا کیوں ہو رہا ہے؟'

وہ قیدیوں کو اذیتیں دینے کی ماہر تھی۔ اس نے مراد کو بجلی کے جھٹکے پہنچائے تھے۔ ہم زاد بھی مراد ہی تھا۔ مراد کی تکلیف اس کی اپنی تکلیف تھی۔ اس نے جلو بی بی کی گردن کو دبوچ کر اسے رگیدتے ہوئے سامنے کی دیوار سے ٹکرا دیا۔ اس کی آنکھوں کے سامنے تارے ناچنے لگے۔ وہ منہ کھول کر چیخنا چاہتی تھی۔ مراد نے اس کے منہ میں رومال ٹھونس دیا۔ پھر اس کے سر کو بری طرح دیوار سے ٹکرا دیا۔ وہ چکرا کر فرش پر گر پڑی۔

اس نے ڈوبتی ہوئی بینائی سے دیکھا۔ سامنے مراد کھڑا ہوا کہہ رہا تھا۔ ''تیری فطرت میں ظلم اور جبر ہے۔ تو دوسروں کو اذیتیں پہنچا کر شیطانی مسرتیں حاصل کرتی ہے۔ میرے پاس وقت نہیں ہے ورنہ تجھے اذیتیں دے دے کر مارتا۔ جا آرام سے چلی جا۔''

اس نے اسی کی گن سے ایک گولی ٹھونک دی۔ وہ ایک ذرا تڑپ کر ہمیشہ کے لیے ساکت ہو گئی۔ ہم زاد نے اس کی الماری کھول کر دیکھی۔ وہاں مختلف ساخت کے ریوالور اور ایک شاٹ گن رکھی ہوئی تھی۔ بلٹس کے کئی میگزین رکھے ہوئے تھے۔ اس نے ایک بیگ میں دو ریوالور ایک شاٹ گن اور کئی میگزین رکھے پھر اس مکان سے باہر آ گیا۔ باہر جلو بی بی کی کار کھڑی ہوئی تھی۔ وہ اس کی اسٹیئرنگ سیٹ پر بیٹھ کر اسے اسٹارٹ کر کے ایک سمت جانے لگا۔

آئی جی آف پولیس اور قلندر شاہ اپنے ذرائع سے یہ معلوم کر رہے تھے کہ ملکہ مراد سے بدظن ہو گئی ہے۔ اسے آرمی کے حوالے کر دیا ہے اور اسے ٹارچر سیل میں پہنچا دیا گیا ہے۔

آئی جی کو اپنے ٹھوس ذرائع سے جو معلومات حاصل ہو رہی تھیں، وہ معلومات فون کے ذریعے قلندر شاہ تک پہنچا رہا تھا۔ وہ دونوں خوش تھے۔ ان کا بہت بڑا دشمن ملکہ کی زندگی سے نکل کر پھر مجرم کہلانے والا تھا۔

پھر خبر ملی کہ وہ ٹارچر سیل سے فرار ہو گیا ہے۔ اس نے آرمی ہیڈ کوارٹر میں کئی افسروں اور سپاہیوں کو ہلاک کیا ہے۔ اپنی سیکرٹ فورس کو رہائی دلا رہا ہے۔ گویا کہ ملکہ نگارا خانم اور اس کی آرمی کے خلاف جنگ کا آغاز کر چکا ہے۔

قلندر شاہ متاثر ہو کر' مرعوب ہو کر سوچ رہا تھا۔' یہ مراد علی منگی سر پھرا ہے۔ ضدی اور دھن کا پکا ہے۔ مجھے بہت محتاط رہ کر پوری طرح روپوش رہ کر اسے گولی مارنا ہوگی۔ اگر اس سے سامنا ہوگا اور وہ مجھے پہچان لے گا تو میری شامت آ جائے گی۔ پھر میں جان بچانے کے لیے چھپ نہیں سکوں گا۔'

آئی جی آف پولیس کی بھی نیند حرام ہو گئی تھی۔ وہ جاگ رہا تھا۔ ہم زاد نے اس کے بیڈ روم میں پہنچ کر دیکھا۔ رات کے دو بج گئے تھے اور وہ جاگ رہا تھا۔ اس کے قریب ایک ٹیلیفون اور ایک موبائل فون رکھا ہوا تھا۔ وقفے وقفے سے کوئی نہ کوئی فون چیخ رہا تھا اور اسے خبریں پہنچا رہا تھا کہ محل میں' ٹارچر سیل میں اور آرمی ہیڈ کوارٹر میں کیا ہو رہا ہے؟ اور جو بھی ہو رہا ہے، اس کے نتیجے میں مراد کسی کے ہاتھ نہیں آ رہا ہے۔

کئی ممالک کے سفارت خانوں اور خفیہ ایجنسیوں کے لیے یہ نئی اور چونکا دینے والی بات تھی کہ ملکہ اور مراد کے درمیان پھوٹ پڑ گئی ہے اور مراد ملکہ کے عتاب سے بچنے کے لیے ون مین آرمی کے طور پر جنگ لڑ رہا ہے۔

کسی کو یہ توقع نہیں تھی کہ مراد اتنی جلدی پھر مجرم کہلانے کے مقام پر واپس آ جائے گا۔ بڑے ممالک ملکہ سے' آرمی کی سی ان سی سے اور آئی جی آف پولیس سے رابطے کر رہے تھے اور صورتِ حال معلوم کر رہے تھے۔ انہیں یہی جواب مل رہا تھا کہ مراد پانی میں رہ کر مگر مچھ سے بیر کر رہا ہے۔ جواب دینے والے یقین سے کہہ رہے تھے۔'' آخر وہ تنہا پوری آرمی سے اور پورے پولیس ڈیپارٹمنٹ سے کب تک لڑے گا۔ صبح ہونے سے پہلے مارا جائے گا۔''

آئی جی اس وقت ایک ملک کے وزیر خارجہ سے یہی کہہ رہا تھا۔'' وہ ملکہ کا مجازی خدا بننے والا صبح ہونے سے پہلے اس ریاست سے اور اس دنیا سے نابود ہو جائے گا۔ اس

کی موت اسے ہماری ریاست میں لائی ہے۔''

اسی وقت مراد نے اس کے منہ پر ایک گک ماری۔ وہ چیختا ہوا پیچھے کی طرف گرا۔ فون اس کے ہاتھ سے چھوٹ گیا۔ وہ فوراً اٹھ کر ادھر ادھر دیکھنے لگا۔ حیرت اور بدحواسی سے اس کا منہ کھل گیا تھا۔ وہ اپنے منہ پر ہاتھ رکھ کر سوچ رہا تھا۔ 'یہ ابھی کیا ہوا تھا؟ میرے منہ پر کوئی چیز آ کر لگی تھی۔'

وہ حیرانی اور پریشانی سے چاروں طرف گھوم کر دیکھنے لگا۔ کوئی نظر نہیں آ رہا تھا۔ پھر وہ خوف سے اُچھل پڑا۔ ڈرنے کی بات نہیں تھی۔ اس کے فون سے رنگ ٹون چیخ رہی تھی۔

ہم زاد نے اس کے نمبر چیخ کیے تھے۔ اس نے فون کو اٹھا کر انجانے نمبر پڑھے۔ پھر بٹن کو دبا کر اسے کان سے لگا دیا۔ ہم زاد نے پوچھا۔ ''قلندر شاہ کہاں ہے؟''

اس نے سخت لہجے میں پوچھا۔ ''کون ہو تم؟''

وہ اس کے سر پر ایک چپت لگاتے ہوئے بولا۔ ''اُلّو کے پٹھے جواب دے۔''

وہ اچھل کر کھڑا ہو گیا۔ چاروں طرف گھوم کر دیکھنے لگا۔ وہ دو بار مار کھا چکا تھا اور مارنے والا نظر نہیں آ رہا تھا۔

وہ جن بھوت کو نہیں مانتا تھا لیکن خوف طاری ہو گیا تھا، اس نے خلا میں تکتے ہوئے پوچھا۔ ''کک...... کون ہو تم؟''

مراد نے کہا۔ ''تمہارا باپ ہوں۔ ابھی تازہ بہ تازہ عالمِ ارواح سے آیا ہوں۔''

وہ فون کو دیکھ کر بولا۔ ''کیا تم وہی ہو جو یہاں میرے کمرے میں ہے؟''

وہ پھر سر پر ہاتھ مار کر بولا۔ ''ہاں، فوراً جواب دے۔''

وہ اپنا سر سہلاتے ہوئے بولا۔ ''فار گاڈ سیک! مجھے بتاؤ تم کون ہو؟ نظر کیوں نہیں آ رہے ہو؟''

''جواب دو گے تو نظر آؤں گا۔ ورنہ لات جوتے کھاتے رہو گے۔''

اس کے منہ پر ایک اور گھونسا پڑا۔ وہ پیچھے جا کر ایک صوفے سے ٹکرا کر فرش پر گر پڑا۔ پھر اٹھنے سے پہلے ہی منہ پر ایک ٹھوکر لگی۔ وہ پھر چاروں شانے چت ہو گیا۔

اب اسے یقین ہو گیا کہ کوئی جن یا بھوت ہے۔ یا نہ سمجھ میں آنے والی کوئی غیبی طاقت ہے۔ وہ اپنا ایک کان پکڑتے ہوئے بولا۔ ''مجھے معاف کر دو۔ مجھ سے دشمنی نہ کرو۔ میرے باپ میرے دادا......! یہ تو بتاؤ کون ہو؟''

مراد نے اس کے سر کے بالوں کو مٹھی میں جکڑ کر ایک جھٹکا دیا۔ وہ اٹھ کر سیدھا کھڑا ہو گیا۔ پیٹ میں ایک گھونسا مارا تو وہ جھک گیا۔ منہ پر ایک لات ماری تو پھر سیدھا ہو گیا۔ پھر تو لاتوں اور گھونسوں کی بارش ہونے لگی۔ وہ مار کھا رہا تھا اور چیخ رہا تھا۔

پھر وہ بے جان سا ہو کر ایک صوفے پر آ کر اوندھے منہ گر پڑا۔ مراد نے اسے دونوں ہاتھوں سے پکڑ کر اٹھایا۔ اسے اپنے سر سے بلند کیا پھر فرش پر دے مارا۔ وہ چیختا ہوا بے آب مچھلی کی طرح پھڑ پھڑانے لگا۔

دوڑتے ہوئے قدموں کی آوازیں آ رہی تھیں۔ کئی مسلح گارڈز نے کمرے میں آ کر دیکھا پھر اس کے قریب آ کر انہوں نے جھک کر اسے فرش پر سے اٹھایا۔ بیڈ پر لا کر لٹا دیا۔ اس کا سر چکرا رہا تھا۔ آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھا گیا تھا۔

ہم زاد نے اس کے کان میں سرگوشی کی۔ ''جواب دے۔''

وہ خوف سے تھر تھر کانپنے لگا۔ اٹک اٹک کر بولنے لگا۔ ''وہ......وہ شاہ اسٹریٹ کے بنگلا نمبر ون زیرو میں ہے۔''

ایک گارڈ نے دوسرے گارڈ سے کہا۔ ''صاحب کو قلندر شاہ کی فکر ہے۔''

دوسرے گارڈ نے آئی جی کی طرف جھکتے ہوئے کہا۔ ''سر! آپ فکر نہ کریں۔ قلندر شاہ اس بنگلے میں محفوظ رہے گا۔ وہاں ہمارے سیکیورٹی افسر اس کا بہت خیال رکھتے ہیں۔''

آئی جی کی آنکھیں بند ہو گئی تھیں۔ گارڈز پوچھنا چاہتے تھے کہ اس کے ساتھ کیا ہو رہا ہے؟ لیکن وہ ساکت پڑا ہوا تھا۔ اس پر بے ہوشی طاری ہو گئی تھی۔

☆☆☆

قلندر شاہ پہلی بار رات دو بجے تک جاگ رہا تھا۔ فون کے ذریعے ملنے والی خبریں اس کی نیند اڑا رہی تھیں۔ اسے معلوم ہو رہا تھا کہ وہ زنجیریں توڑ کر ٹارچر سیل سے نکل بھاگا ہے اور آرمی ہیڈ کوارٹر میں لاشیں گرا رہا ہے۔

وہ خبریں سن رہا تھا اور ٹھہر ٹھہر کر پی رہا تھا۔ کسی طرح کا خوف ہو تو نشے میں ہوا ہو جاتا ہے۔

ایک لطیفہ ہے کہ ایک چوہا شراب کے مٹکے میں گر پڑا تھا۔ جب ڈبکیاں لگاتا ہوا باہر آیا تو نشے میں بدمست ہو رہا تھا۔ اس نے خم ٹھونک کر بلی کو للکارا۔ ''Where is the cat''

قلندر شاہ کو بھی اتنا نشہ ہو گیا تھا کہ وہ بنگلے کے باہر جا کر مراد کو للکار سکتا تھا۔

بنگلے کے آگے پیچھے دو دو گارڈز تھے۔ سیکیورٹی افسر کیبن میں سو رہا تھا۔ فائرنگ کی آوازیں سنتے ہی ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھا۔ اس نے ایک گارڈ کو آواز دی۔ اسے کوئی جواب

نہیں ملا۔ وہ اپنی گن سنبھالتا ہوا کیبن کے دروازے پر آیا تو یکلخت ٹھٹک گیا۔ سامنے ایک گارڈ کی لاش پڑی ہوئی تھی۔ اس نے فوراً ہی کیبن کے اندر ہو کر دروازے کی آڑ سے دور تک دیکھا۔ دور گلاب کے پودوں کے پاس دوسرے گارڈ کی لاش پڑی ہوئی تھی۔

قلندر شاہ نے بھی فائرنگ کی آوازیں سنی تھیں۔ اس پر نشہ حاوی ہو رہا تھا لیکن فائرنگ کی آواز سے کانوں میں خطرے کی گھنٹی بجنے لگی۔ اس نے فون پر سیکیورٹی افسر کے نمبر پنچ کیے۔ رابطہ ہوتے ہی افسر نے کہا۔ ''سر! خطرہ ہے۔ کسی نے ہمارے دو گارڈز کو ہلاک کر دیا ہے۔ آپ ہوشیار رہیں۔''

اسی وقت بنگلے کے پیچھے سے گولی چلنے کی آواز سنائی دی۔ وہاں دو گارڈز تھے۔ دوسرا گارڈ ادھر سے دوڑتا آ رہا تھا۔ چیختا ہوا کہہ رہا تھا۔ ''سر! م...... م...... مراد......''

وہ آگے نہ بول سکا۔ فائرنگ کی گونجتی ہوئی آواز کے ساتھ اچھل کر زمین پر گرا۔ پھر تڑپ تڑپ کر بے حس و حرکت ہو گیا۔

سیکیورٹی افسر نے فون پر چیخ کر کہا۔ ''سر! مراد یہاں پہنچ گیا ہے۔ ہمارے چاروں گارڈز اس کا نشانہ بن گئے ہیں۔ آپ دروازے کھڑکیاں اندر سے بند کر لیں۔ وہ ادھر بنگلے کے سامنے آئے گا تو میں اسے اندر آپ کے پاس پہنچنے نہیں دوں گا۔ گولی سے اڑا دوں گا۔''

وہ فون بند کرتے ہی کیبن سے نکل کر بھاگتا ہوا احاطے کے باہر آیا۔ وہاں اس کی موٹر سائیکل کھڑی تھی۔ اس نے فوراً ہی سوار ہو کر ایک کک ماری۔ وہ اسٹارٹ ہوئی تو اسے تیزی سے دوڑاتا ہوا وہاں سے دور ہوتا چلا گیا۔ جان ہے تو جہان ہے۔ ایک بدمعاش قلندر شاہ کے لیے وہ اپنی زندگی داؤ پر نہیں لگا سکتا تھا۔

قلندر شاہ نے بنگلے کے آگے پیچھے گولیاں چلنے کی آوازیں سنی تھیں۔ پھر فون پر مراد کا نام سنتے ہی نشہ ہرن ہو گیا تھا۔ اس نے دروازوں اور کھڑکیوں کو اندر سے بند کر لیا۔ حواس میں رہنے کے باوجود نشے کی زیادتی سے سر گھوم رہا تھا۔

وہ فریج سے لیمن جوس کی ایک بوتل نکال کر اسے پینے لگا۔ کھٹا مشروب نشے کو کم سے کم کر دیتا ہے۔ اسے ہوش میں رہنا تھا۔ وہ سوچ بھی نہیں سکتا تھا کہ مراد اس کے اتنے قریب پہنچ جائے گا۔

وہ پینے کے بعد ہانپتا ہوا صوفے پر آ کر بیٹھ گیا۔ سینٹر ٹیبل پر دو بھرے ہوئے ریوالور رکھے ہوئے تھے۔ چار بھرے ہوئے میگزین بھی تھے۔ وہ گھنٹوں مراد کا مقابلہ کر سکتا تھا۔

پھر وہ یکبارگی خوف سے اچھل پڑا۔ ٹیلیفون کی گھنٹی بج رہی تھی۔ اس نے دھڑکتے ہوئے سینے پر ہاتھ رکھ کر اطمینان کی سانس لی۔ ٹیلیفون دور رکھا ہوا تھا۔ گھنٹی بج رہی تھی۔ وہ وہاں سے اٹھ کر فون کے پاس آیا پھر ریسیور کو اٹھا کر کان سے لگایا تو لائن کٹ گئی، فون گونگا ہو گیا۔

وہ ریسیور کو کریڈل پر رکھ کر واپس اپنی جگہ آتے آتے ٹھٹک گیا۔ سینٹر ٹیبل پر رکھے ہوئے دونوں ریوالور غائب ہو گئے تھے۔ اس کا منہ حیرت سے کھل گیا۔

وہ سینٹر ٹیبل کے نیچے اور آس پاس دیکھنے لگا۔ پھر دونوں ہاتھوں سے سر پکڑ کر صوفے پر بیٹھ گیا۔ ذہن میں یہ بات آ رہی تھی کہ نشے کی زیادتی کے باعث وہ ریوالور کو کسی دوسری جگہ رکھ کر بھول گیا تھا۔

پھر اس نے چونک کر دروازے کی طرف دیکھا۔ وہ اندر سے لاکڈ تھا۔ اب اَن لاکڈ ہو گیا تھا اور آہستہ آہستہ کھل رہا تھا۔ وہ مارے خوف کے اچھل کر کھڑا ہو گیا۔ کھلے ہوئے دروازے پر مراد علی منگی کھڑا ہوا تھا۔ اس کے اپنے دونوں ریوالور مراد کے دونوں ہاتھوں میں تھے۔

ہمزاد کمرے میں آ کر بولا۔ ''اچھا تو تم ہو قلندر شاہ؟ میں نے رائفل شوٹنگ کے ایک مقابلے میں تمہیں دیکھا تھا۔ بعد میں سنا کہ تم دو بار مجھ پر قاتلانہ حملہ کر چکے ہو۔ اب کیا ارادہ ہے؟ میں تمہارے روبرو بالکل قریب آ گیا ہوں۔ اتنے قریب سے نشانہ نہیں چوکے گا۔''

وہ بڑی بے بسی سے اپنے دونوں ریوالوروں کو دیکھ رہا تھا۔ ہمزاد نے ایک ریوالور کو اس کے قدموں میں پھینکا۔ اس نے جھجکتے ہوئے آہستہ آہستہ جھک کر اسے اٹھا لیا۔

ہمزاد نے کہا۔ ''اب ایک تمہارے پاس ہے، ایک میرے پاس۔ دونوں طرف سے گولیاں چلیں گی۔ دونوں مریں گے۔''

اس نے انتظار نہیں کیا۔ مراد کے فائر کرنے سے پہلے ہی اس نے ٹریگر کو دبایا۔ ایک بار نہیں، دو بار کھٹ کھٹ کی آواز ابھری۔ فائر کی آواز نہیں گونجی۔ وہ ریوالور خالی تھا۔

ہمزاد نے کہا۔ ''اوہو۔ میں نے بھولے سے خالی ریوالور تمہیں دیا ہے۔ یہ لو، اس کا میگزین بھرا ہوا ہے۔''

اس نے دوسرا ریوالور اس کے قدموں میں پھینکا۔ وہ پھر اُلّو نہیں بننا چاہتا تھا۔ اس نے جھک کر اسے نہیں اٹھایا۔ مراد نے کہا۔ ''چلو وہ بھی خالی ہے اور ہم دونوں بھی

ہتھیار سے خالی ہیں۔ کم آن...... مجھ سے فائٹ کرو اور یہاں سے بھاگنے کا راستہ بناؤ۔''

قلندر شاہ نے اچانک ہی اس پر چھلانگ لگائی پھر فرش پر اوندھے منہ گرنے کے بعد معلوم ہوا کہ مراد وہاں نہیں ہے۔ اس نے فوراً ہی اٹھ کر پیچھے پلٹ کر دیکھا۔ وہ دوسرے ریوالور کے پاس کھڑا ہوا تھا۔

اس نے اسے اٹھاتے ہوئے کہا۔ ''تم نے اسے خالی سمجھ کر چھوڑ دیا تھا۔ مجھ پر گولی چلانے کا سنہری موقع گنوا دیا۔ یہ دیکھو۔''

اس نے ٹریگر کو دبایا تو فائر کی گونجتی ہوئی آواز کے ساتھ گولی اس کے ایک گھٹنے کو توڑتی ہوئی گزر گئی۔ اس نے تکلیف سے کراہتے ہوئے اپنے گھٹنے کو تھام لیا۔ دوسری گولی نے دوسرے گھٹنے کو توڑ دیا۔ وہ دھپ سے فرش پر گر پڑا۔ ہم زاد نے قریب آکر اور دو دو گولیاں اس کے دونوں پیروں میں ماریں۔ وہ چیخیں مارتا ہوا فرش پر تڑپنے لگا۔ اس نے کہا۔ ''تم چلنے پھرنے کے قابل نہیں رہو گے۔ علاج کے بعد بھی لنگڑاتے رہو گے۔ میں تمہیں جان سے نہیں ماروں گا۔ تم اپاہج بن کر زندگی گزارو گے۔''

پھر اس نے اس کے دونوں بازوؤں میں گولیاں اتارتے ہوئے کہا۔ ''بہت زبردست شوٹر ہو۔ آئندہ اسلحہ پکڑنے اور چلانے کے قابل نہیں رہو گے۔ میرے جانے کے بعد اپنے حمایتیوں کو بلاؤ وہ تمہاری مدد کے لیے نہیں آئیں گے۔ یہ خوف طاری رہے گا کہ میں تمہارے پاس کہیں چھپا ہوا ہوں۔ کوئی تمہارے لیے جان کی بازی لگانے نہیں آئے گا۔''

وہ اس کے پاس موبائل فون پھینک کر چلا گیا۔ وہ پل چرخی جیل کی جان لیوا اذیتیں برداشت کرنے والا بڑا ہی سخت جان تھا۔ اتنی گولیاں کھانے کے بعد بھی وہ تکلیف کی شدت سے بے ہوش نہیں ہوا تھا۔ صرف کراہ رہا تھا۔ اس نے فون پر سیکیورٹی افسر کو مخاطب کیا اور کہا۔ ''فوراً آؤ۔ اس نے مجھے گولیوں سے چھلنی کر دیا ہے۔ مجھے اسپتال پہنچاؤ۔''

وہ بولا۔ ''اب وہ میری تاک میں چھپا ہوا ہوگا۔ سوری سر! میں حرام موت مرنے نہیں آؤں گا۔''

اس نے فون بند کر دیا۔ اس نے جھنجلا کر آئی جی سے رابطہ کیا۔ ایک سیکیورٹی گارڈ نے فون پر کہا۔ ''پتا نہیں صاحب کو کس قسم کا دورہ پڑا تھا۔ وہ بے ہوش ہو گئے تھے۔ ڈاکٹر نے آکر ان کے زخموں کی مرہم پٹی کی ہے۔ وہ ابھی گہری نیند میں ہیں۔''

وہ بولا۔ ''تم یہاں آؤ۔ مراد نے مجھے گولیاں ماری ہیں، مجھے فوراً اسپتال پہنچاؤ۔ میں فرش پر پڑا ہوں۔ یہاں سے اٹھنے کے قابل نہیں ہوں۔''

''سوری سر! ہم ڈیوٹی چھوڑ کر نہیں آسکیں گے۔ یہاں صاحب کو ہماری ضرورت ہے۔ آپ کسی اور کو طلب کریں۔''

وہاں سے بھی فون بند ہو گیا۔ قلندر شاہ مایوسی سے

کراہنے لگا۔ وہ جلد سے جلد طبی امداد کے لیے تڑپ رہا تھا۔ اس نے ایک ملک کے اعلیٰ عہدیدار کو فون کیا۔ اسے اپنے حالات بتائے پھر التجا کی۔ ”پلیز! آپ اپنے سفارت خانے میں سفیر یا اس کے سیکریٹری سے بولیں مجھے اپنے ملازموں کے ذریعے اسپتال پہنچائیں۔“

اعلیٰ عہدیدار نے پوچھا۔ ”یہ کیسے یقین کیا جائے کہ مراد تمہیں زخمی کر کے چلا گیا ہے؟ تم کہتے ہو، اس نے تمہارے ہاتھوں اور پیروں میں آٹھ گولیاں ماری ہیں۔ تعجب ہے اس نے تمہاری جان کیوں نہیں لی؟ وہ بہت مکار ہے۔ وہ چاہتا ہے کہ تمہیں طبی امداد پہنچانے کے لیے ہمارے آدمی وہاں آئیں۔ وہ تاک میں ہوگا۔ اتنی سی عقل ہمیں بھی ہے۔ وہ وہاں آنے والوں کو گولیوں سے بھون کر رکھ دے گا۔“

وہ بولا۔ ”سر! آپ بھی وہی کہہ رہے ہیں جو دوسرے کہہ چکے ہیں۔ کیا آپ مجھے علاج کے بغیر مرنے کے لیے چھوڑ دیں گے؟ کیا میری خدمات کا یہی صلہ ہے؟“

”آل رائٹ۔ ابھی میرے دو جاسوس آرہے ہیں۔“

رابطہ ختم ہوگیا۔ وہ انتظار کرنے لگا۔ تکلیف کی شدت سے بے ہوشی طاری ہو رہی تھی۔ وقت گزر رہا تھا اور کوئی نہیں آرہا تھا۔ وہ انتظار ہی کیا جو ختم ہو جائے؟

اس کی آنکھیں آہستہ آہستہ بند ہوگئیں۔ کئی گھنٹے گزر گئے۔ پھر دو شخص بہت ہی محتاط انداز میں وہاں آئے۔ انہوں نے اس کے زخموں کا معائنہ کیا۔ ایک نے کہا۔ ”چار گولیاں اندر رہ گئی ہیں۔ اگر یہ بچ جائے گا، تب بھی چلنے پھرنے کے قابل نہیں رہے گا۔“

دوسرے نے کہا۔ ”باس نے حکم دیا ہے کہ اسے ختم کردیں۔ اس کی حالت بہت ہی نازک ہے۔ ہم آئندہ اسے مراد سے کب تک چھپاتے رہیں گے۔“

”یہ ختم ہو جائے گا تو مراد کو ہماری طرف آنے کا کوئی راستہ نہیں ملے گا۔“

دونوں نے اس کے سینے اور سر کا نشانہ لیا پھر تڑاتڑ گولیاں چلائیں۔ بے ہوشی کی حالت میں اس کا جسم لرز کر سرد پڑ گیا۔ دوسروں کی موت بننے والوں کو بھی ایک دن اپنی موت کا مزہ چکھنا پڑتا ہے۔

☆☆☆

مراد صبح اذان سے پہلے ہی اٹھ کر بیٹھ گیا۔ اس نے شاہی بیڈ کی بلندی سے ملکہ معظمہ کو دیکھا۔ وہ فرش کی پستی میں بے خبر سو رہی تھی۔ وہ بیڈ سے اتر گیا۔ خواب گاہ کے ایک پورشن میں بڑے خوبصورت وارڈ روب تھے۔ ان میں ملکہ کے نہایت قیمتی ملبوسات تھے۔ اس نے الماری کے دوسرے حصے کو کھول کر اپنا ایک جوڑا پہننے کے لیے نکالا پھر اسے لے کر باتھ روم میں چلا گیا۔

وہ فرش پر غافل پڑی ہوئی تھی۔ مراد سے بدترین اختلافات تھے لیکن اس نے خلع نہیں لیا تھا۔ اسے یقین تھا کہ وہ ٹارچر سیل سے معافیاں مانگتا ہوا اس کے قدموں میں آئے گا اور اس کے دل کا بھی معاملہ تھا۔ ایسے بھرپور مرد کو چھوڑنا نہیں چاہتی تھی۔ وہ پچھلی رات جب تک جاگتی رہی تھی، اس کا انتظار کرتی رہی تھی لیکن دل توڑنے والی خبریں موصول ہوتی رہی تھیں۔ وہ حیران تھی۔ کانوں سے سن کر بھی یقین نہیں ہو رہا تھا کہ وہ زنجیریں توڑ کر آزاد ہو گیا ہے۔

وہ بالکونی میں آکر نماز کے لیے کھڑا ہوا تو اس کے دائیں طرف بابا اجمیری آگئے۔ اس کے ساتھ نمازیں پڑھنے لگے۔ وہ مراد سے بھی کبھی ضرورتاً بولتے تھے۔ اکثر خاموش ہی رہتے تھے لیکن نماز کے دوران میں اس کے... ہم سفر بن جاتے تھے۔ ان کی رفاقت سے ہی اسے روحانی قوت حاصل ہوئی تھی۔

ایک معجزہ ہوا تھا کہ وہ ایک سے دو ہو گیا تھا۔ اس وقت وہ دوسرا ایک مسجد میں نماز پڑھ رہا تھا اور اس کے دائیں طرف بھی بابا اجمیری عبادت میں مصروف تھے۔

وہ اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کر رہا تھا۔ اسے روحانی قوت حاصل ہوئی تھی۔ وہ جب چاہتا تھا' دشمنوں کی نظروں سے اوجھل ہو سکتا تھا۔ ریاست کے اندر اور باہر دنیا کے آخری سرے تک اس کے دشمن تھے۔ وہ ان کے درمیان روحانی آنکھ مچولی کھیلتے ہوئے زندہ رہ سکتا تھا۔

بابا اجمیری نماز کے بعد حسب معمول دونوں مراد سے دور چلے گئے۔ اس نے مصلے کو تہ کر کے ایک طرف رکھ دیا۔ جرابیں اور جوتے پہن کر وہاں سے چلا گیا۔

اس کے جاتے ہی نگارا کی آنکھ کھل گئی۔ فوراً ہی فرش کی سختی محسوس ہوئی تو حیرت سے اور آنکھیں کھل گئیں.... وہ ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھی۔ اس نے ایک طرف اپنے آرام دہ بیڈ کو دیکھا پھر چیخ پڑی۔ ”نہیں...... میں یہاں کیسے آگئی۔“

وہ اٹھ کر کھڑی ہوگئی۔ تیزی سے چلتی ہوئی بیڈ کے پاس آئی۔ اسے چھو کر فرش کو دیکھا۔ زیر لب بڑبڑانے لگی۔

''یہ...... یہ کیسے ہوسکتا ہے۔ میں بیڈ پر سو رہی تھی۔ نیچے کیسے چلی گئی؟ کیا میں نے نیند میں چل کر جگہ بدلی ہے؟ لیکن میں ملکہ ہوں۔ خواب میں بھی بلندی پر پرواز کرتی ہوں۔ نیند میں بھی نیچے نہیں گر سکتی پھر کیسے گر گئی؟''

اس نے دونوں ہاتھوں سے سر کو تھام لیا۔ بلندی سے پستی میں جانے والی بات سمجھ میں نہیں آسکتی تھی۔ وہ شاور لینے ٹھنڈے پانی میں بھیگ کر دماغ کو ٹھنڈا کرنے کے لیے وارڈروب کے پاس آئی تو وہ الماری کھلی ہوئی تھی جس میں مراد کے کپڑے رکھے ہوئے تھے۔

وہ الماری کے باہر اپنے اتارے ہوئے کپڑے چھوڑ کر گیا تھا۔ اس کی اترن دیکھتے ہی نگارا کے دماغ کو جھٹکا سا لگا۔ پچھلے روز وہ محل سے گرفتار ہو کر گیا تھا تو وہی اترن اس کے بدن پر تھی۔

اس نے اور قریب آکر اسے اٹھا کر دیکھا، دل تیزی سے دھڑک رہا تھا۔ ان لمحات میں اس کی طرف کھنچی جا رہی تھی۔ وہ اترن کو سینے سے لگا کر دوڑتی ہوئی بیڈ کے پاس آئی۔ خواب گاہ بہت وسیع وعریض تھی۔ وہاں سونے کے لیے، بیٹھنے کے لیے، سنگھار کرنے اور لباس بدلنے کے لیے الگ الگ پورشن تھے۔ وہ دوڑتی ہوئی ایک ایک پارٹیشن کے پیچھے جا کر اسے ڈھونڈنے لگی۔

اس کا دماغ کہہ رہا تھا کہ وہ وہاں آیا تھا۔ اس نے رات گزاری تھی۔ صبح اٹھ کر غسل کیا تھا۔ لباس تبدیل کیا تھا اور اس کے لیے اترن چھوڑ کر چلا گیا تھا۔

اس نے لیڈی سیکیورٹی افسر کو بلا کر پوچھا۔ ''مراد یہاں کب آیا تھا؟ مجھے اطلاع کیوں نہیں دی گئی؟''

وہ بولی۔ ''وہ یہاں نہیں آیا تھا اور بھلا کیسے آسکتا تھا۔ وہ مفرور ہے۔ قانون کو مطلوب ہے۔ بھاگتا پھر رہا ہے۔ یہاں آتا تو ہم اسے گرفتار کر لیتے۔''

''وہ آیا تھا۔'' نگارا نے غصے سے کہا۔ ''یہ اس کی اترن ہے۔ وہ لباس بدل کر گیا ہے۔ تم سب گہری نیند سوتی رہی تھیں۔ اس محل کے اندر چالیس گارڈز اور پندرہ کنیزیں ہیں۔ باہر آرمی کے مسلح سپاہی ہیں۔ جاؤ معلوم کرو۔ وہ اتنے لوگوں کی موجودگی میں کیسے آکر چلا گیا؟ کسی نے تو اسے دیکھا ہوگا۔''

وہ سیکیورٹی افسر ایسی نہ سمجھ میں آنے والی بات کو سمجھنے چلی گئی۔ نگارا نے ٹارچر سیل کے انچارج سے فون پر پوچھا۔ ''وہ تمہاری حراست میں تھا۔ وہاں سے کیسے فرار ہو گیا؟''

انچارج نے کہا۔ ''وہ جلّو بی بی کی کسٹڈی میں تھا۔ وہی جواب دے سکتی تھی لیکن مراد نے اسے ہلاک کر دیا ہے۔''

وہ غصے سے بولی۔ ''تم سب حرام خور ہو۔ ایک نہتے شخص کو اپنے شکنجے میں نہ رکھ سکے۔ وہاں جتنے ذمے دار افسران ہیں، میں ان سب کو ڈسچارج کرتی ہوں۔ ان سب کی وردیاں اتارو۔ انہیں اس ڈیپارٹمنٹ سے باہر کرو۔''

اس نے حکم دے کر فون کو آف کیا۔ اتنا غصہ دکھانے کے بعد بھی یہ معلوم نہ ہوسکا کہ وہ ٹارچر سیل سے کس طرح فرار ہوا تھا؟ کیا فرار ہوتے وقت درجنوں سپاہیوں کو نظر نہیں آیا تھا؟

پھر خیال آیا کہ وہاں محل میں بھی وہ آتے جاتے وقت کسی کو نظر نہیں آیا تھا۔ پھر یہ سوچ کر غصہ آنے لگا کہ وہ پچھلی رات اس کی خواب گاہ میں آیا تھا۔ اسے نیچے پھینک کر اس کے بیڈ پر سوتا رہا تھا۔ اس نے اپنی آغوش میں لے کر اسے نہیں سلایا تھا۔ اس سے سخت نفرت کرنے لگا ہے۔

وہ غصے سے پیچ وتاب کھا رہی تھی۔ اسے بدترین سزائیں دینا چاہتی تھی اور یہ بھی ارمان تھے کہ وہ پھر خواب گاہ کے بیڈ پر آجائے، اسے فرش پر سے اٹھا کر سینے سے لگا لے۔

اس نے میجر محمود کو فون پر مخاطب کیا۔ وہ بولا۔ ''کل رات دو بجے تک مراد سے کاؤنٹر فائرنگ ہوتی رہی۔ ہمارے تین افسران اور سات سپاہی مارے گئے ہیں۔''

وہ ناگواری سے بولی۔ ''کیا آرمی میں بزدل اور بیمار افسران اور سپاہی ہیں...... ایک تنہا شخص کو گولی نہیں مار سکتے؟''

''ایسی بات نہیں ہے۔ مراد کو چشم زدن میں گولیوں سے چھلنی کیا جاسکتا ہے لیکن آرمی کے بیشتر افسران اور سپاہی مراد کے حمایتی ہیں۔ انہوں نے فائرنگ کے دوران میں مراد پر گولیاں نہیں چلائیں۔ وہ ہوائی فائر کرتے رہے۔''

وہ پریشان ہو کر بولی۔ ''یہ کیا کہہ رہے ہو؟ کیا آرمی کے کچھ لوگ میرے خلاف مراد کا ساتھ دے رہے ہیں؟''

''جی ہاں۔ یہ صحیح طور پر معلوم نہیں کیا جاسکتا کہ افسران اور سپاہی کتنی تعداد میں آپ کے خلاف ہیں۔ اگر انکوائری کی جائے گی، انہیں چھیڑا جائے گا تو بغاوت پھیل جائے گی۔ فوج کے حساس شعبے ان کے ہاتھوں میں ہیں۔ آپ اپنے موجودہ حالات پر غور فرمائیں۔''

پھر اس نے ہچکچاتے ہوئے کہا۔ ''اگر آپ اجازت دیں تو میں ایک مشورہ دوں۔''

''اجازت ہے۔ بولو؟''

''خواتین کی جوحمایت آپ کو حاصل ہے، وہ کمزور پڑ رہی ہے۔ ستر فیصد خواتین اپنے شوہروں اور اپنے باپ بھائیوں کی کمتری اور غلامی نہیں چاہتیں۔ مرد برتر رہے اور حواس پر چھا جائے تو عورتوں کو فطری مسرتیں حاصل ہوتی ہیں۔ مجھ ناچیز کا مشورہ ہے کہ آپ مراد جیسے مرد میدان سے سمجھوتا کرلیں۔ وہ دلیر بھی ہے اور حاضر دماغ بھی ہے۔ آپ کی ریاست کو اور آرمی کو کمزور نہیں ہونے دے گا۔''

وہ بولی۔''شاہی خاندان ہم سے ہے اور ہم شاہی خاندان سے ہیں۔ ہم اپنے خاندانی زریں اصولوں کے مطابق اپنے شوہر کے آگے نہیں جھکتے۔ اگر مراد جھکنے آئے گا تو میں کھلے دل سے اسے خوش آمدید کہوں گی۔''

''آپ نے اس کی فائل پڑھی ہوگی اور کل رات کی طوفانی کارکردگی بھی دیکھ رہی ہیں۔ وہ جھکنے والا نہیں ہے۔ اس نے ٹارچر سیل کی جلّو بی بی کو اور آرمی کے سات افسران اور سپاہیوں کو موت کے گھاٹ اتارا ہے۔ قلندر شاہ کو بھی جہنم میں پہنچا دیا ہے۔ اس کی حفاظت کرنے والے چار گارڈز بھی مارے گئے ہیں۔ اس نے آئی جی آف پولیس کو دماغی مریض بنا دیا ہے۔ ماشاء اللہ آپ ذہین ہیں۔ ذہانت سے سوچیں۔ کیا ایسے طوفان کو کوئی روک سکتا ہے؟''

''ہر ہائی نس! ویری ویری سوری۔ ہم نے آپ کے خلاف ممکنہ بغاوت کو روکنے کے لیے مراد سے سمجھوتا کیا ہے۔ اب یہ آپ کی صوابدید پر ہے کہ آپ کو کیا کرنا چاہیے؟''

نگارا نے فون بند کر دیا۔ سوچ میں پڑ گئی کہ پتا نہیں کتنے فیصد آرمی باغی ہورہی ہے۔ اگر بغاوت اور پھیلے گی تو کیا ہوگا؟

وہ سوچ رہی تھی۔'مراد قسمت کا دھنی ہے۔ کسی بھی ملک کی بنیادی قوت فوج ہے اور شاید آدھی فوج مراد کی حامی ہے۔ ...... جانے کتنے برسوں سے حالات میرے خلاف پکتے آرہے تھے۔ اب مراد کے آتے ہی ظاہر ہورہے ہیں۔ مجھے چیلنج کر رہے ہیں۔ اگر میں نے سیاسی حکمت عملی سے کام نہ لیا تو ریاست پر میری گرفت اور زیادہ کمزور ہوتی چلی جائے گی۔'مراد گلے میں ہڈی کی طرح اٹک گیا تھا۔ اب بھی امید تھی کہ آرمی اور پولیس والے اسے گرفتار کر کے ملکہ کے قدموں میں لے آئیں گے یا اسے گولی ماردیں گے۔ مار ہی دیں تو اچھا ہے۔ اس کی یاد بہت آئے گی لیکن وہ عذاب بن کر تو نہیں رہے گا۔

ایک بڑے ملک کے اعلیٰ حاکم نے اسے فون پر مخاطب کیا اور کہا۔''ہم ہر ہائی نس کا سکون قلب اور سلامتی چاہتے ہیں۔ خبریں موصول ہورہی ہیں کہ مراد علی منگی پھر اپنی اوقات پر آگیا ہے اور آپ کو نقصان پہنچا رہا ہے۔''

وہ بولی۔''جی ہاں۔ وہ میرے احکامات ماننے سے انکار کر رہا تھا۔ میں اسے سزائیں دینا چاہتی تھی لیکن وہ زنجیریں توڑ کر فرار ہوگیا ہے۔

وہ پہلے اس کے متعلق سنتی رہی تھی۔ اب آنکھوں سے دیکھ رہی ہوں۔ وہ ہوا کے مانند ہے۔ بہت ہی سنگدل اور بے رحم ہے۔ اس نے ایک ہی رات میں آرمی اور پولیس کے درجنوں افسروں اور سپاہیوں کو بڑی درندگی سے مار ڈالا ہے۔''

''آپ مائنڈ نہ کریں۔ آپ کی آرمی کمزور ہے یا مراد نے آرمی کو اپنے مقاصد کے لیے ہموار کرلیا ہے۔ ورنہ یہ تو ہو نہیں سکتا کہ ایک تنہا شخص ہیڈ کوارٹر میں گھس کر افسران اور سپاہیوں کو قتل کرے اور زندہ سلامت واپس آجائے۔''

''ہاں، آرمی کے کچھ افسران اور سپاہی اس کے حمایتی بن گئے ہیں۔ انہوں نے کل رات اس کی مدد کی تھی۔''

''اور آئندہ بھی کریں گے۔ جس ریاست کی آرمی کے اندر بغاوت پھوٹ پڑے وہ ریاست کمزور ہوجاتی ہے۔ وہاں انقلاب آتا ہے اور حکمران اقتدار سے محروم ہوجاتے ہیں۔''

''مراد نے مجھے انہی اندیشوں میں مبتلا کر دیا ہے۔ آرمی نے میری لاعلمی میں ایک بڑا فیصلہ کر کے مراد کی سیکرٹ فورس کو آزاد کر دیا ہے۔ میری اہمیت ختم ہورہی ہے۔ یہ آئندہ بھی میری اجازت کے بغیر بڑے بڑے فیصلے کریں گے۔''

''میں آپ کو نیک مشورہ دیتا ہوں۔ جتنی جلدی ہوسکے اپنی کمزور ہونے والی عسکری قوت کو بحال کریں۔''

''فوجی قوت کیسے بحال کروں؟ ایک ہی رات میں انکشاف ہوگیا ہے کہ فوج کے اعلیٰ افسران ایک عورت کی حکمرانی ختم کرنے کے لیے مراد کا ساتھ دے رہے ہیں۔''

''آپ ہماری خدمات حاصل کریں۔ ہم آپ کو برے وقت میں تنہا نہیں چھوڑیں گے۔ ہمارے ملک کی فوج آپ کی فوج ہے، ہم سے ڈیل کریں۔ کل ہی ہماری فوج فضائی اور خشکی کے راستے آپ کی سلامتی کے لیے وہاں پہنچ جائے گی۔''

''آپ بہت بڑی آفر دے رہے ہیں۔ میں سوچ سمجھ کر جواب دوں گی۔''

''آپ کے سامنے وقت بہت کم ہے اور خطرات

بڑھتے جا رہے ہیں۔ اس سے پہلے کہ مراد بغاوت کی آگ بھڑکا کر آپ کے محل میں گھس آئے، آپ اس نامراد کو ہماری فوج کے حوالے کر دیں۔ ہماری آرمی کے سامنے اس کی دال نہیں گلے گی۔ اسے چیونٹی کی طرح مسل دیا جائے گا۔''

''میں کسی وقت کال کروں گی۔''

وہ رابطہ ختم کر کے اور زیادہ پریشان ہوگئی۔ ایک بڑے ملک کی فوج ریاست میں آ کر بے شک آرمی کی بغاوت کو کچل دیتی اور مراد کو بھی موت کے گھاٹ اتار دیتی لیکن پھر کیا ہوتا؟......

پھر وہ فوج واپس نہ جاتی۔ ملکہ کو اس بڑے ملک کی آرمی کے زیر اثر رہنا پڑتا۔ اب ملکہ کو فیصلہ کرنا تھا کہ وہ مجازی خدا کے زیر اثر رہے گی یا ایک غیر ملک کے ماتحت ہو کر نمائشی ملکہ کہلائے؟

☆☆☆

مراد کو دیکھتے ہی بشریٰ خوشی سے چیخ پڑی۔ مراد نے پاس آ کر اس کے چہرے کو دونوں ہاتھوں میں لے کر پیشانی کو چوما۔ پھر بلے کو گلے سے لگایا۔

بلے نے کہا۔ ''اچھا ہوا تم آ گئے۔ یہ بلی مجھ سے جھگڑا کر رہی تھی۔ یہ کہتی ہے' ہمارے جاں نثاروں کو ہمارے آس پاس رہائش اختیار کرنا چاہیے۔''

مراد نے کہا۔ ''بشریٰ! یہ مناسب نہیں ہے۔ بلے کی حکمت عملی کو سمجھو۔ اگر تمام جاں نثار تمہارے قریب رہیں گے تو دشمن کسی وقت بھی تم سب کو ایک ساتھ نرغے میں لے لیں گے۔ پھر ان کا محاصرہ توڑنا مشکل ہو جائے گا۔''

بشریٰ نے کہا۔ ''بھائی! آپ ہمارے ساتھ رہیں گے؟''

بلے نے کہا۔ ''پھر احمقانہ بات کر رہی ہو۔ ہم سب کو ایک دوسرے سے دور رہنا چاہیے۔''

مراد نے کہا۔ ''صرف مجھے دور نہیں رہنا ہے، جب تک حالات ہمارے موافق نہ ہوں، تم میاں بیوی کو بھی ایک دوسرے سے الگ ہو جانا ہے۔ بلا دور سے تمہاری نگرانی کرتا رہے گا۔''

وہ بولی۔ ''یہ تو بے لگام ہو جائے گا۔ یہ مجھ سے دور جاتا ہے تو فون کرنا بھی بھول جاتا ہے۔''

''مراد! یہ پکی جھوٹی ہے۔ ایک تو ہم کبھی ایک دوسرے سے دور نہیں ہوئے۔ اگر میں دس بارہ گھنٹے بھی دور رہتا ہوں تو فون سے ضرور رابطہ رکھتا ہوں۔ اے چل اٹھ! بھائی کے لیے کچھ کھانے پینے کو لا۔ ہمارا پیچھا چھوڑ۔ ہمیں ضروری باتیں کرنے دے۔''

''دیکھو بھائی! یہ مجھ سے پیچھا چھڑانے کی بات کر رہا ہے؟''

مراد نے ہنستے ہوئے کہا۔ ''یہ تمہیں چھوڑ کر نہیں جائے گا۔ میں پکڑ کر رکھوں گا۔ میں نے ناشتا نہیں کیا ہے، جاؤ جلدی سے کچھ لے آؤ۔''

وہ چلی گئی۔ بلے نے کہا۔ ''تم نے ملکہ پر اور آرمی کے افسران پر دہشت طاری کر دی ہے۔ سیکرٹ فورس کو بے جا پابندیوں سے نجات دلائی ہے۔ میں تو کل رات ایک کمرے میں قیدی بنا ہوا تھا۔ تم نے اکیلے کیسے فائٹ کی ہے؟ میرے یار! تم نے ناممکن کو ممکن بنا دیا ہے۔''

وہ مسکرا رہا تھا۔ بلا کہہ رہا تھا۔ ''پلیز مجھے بتاؤ۔ اکیلے کس طرح چھپتے رہے اور گولیوں کا جواب گولیوں سے دیتے رہے؟''

''میں ابھی بتاؤں گا۔ بشریٰ کو آنے دو۔ ویسے آرمی کے کئی افسران اور سپاہی ملکہ نگارا کی حکمرانی سے ناخوش ہیں۔ اس لیے میرا ساتھ دے رہے تھے۔ اللہ نے چاہا تو آئندہ بھی ان کا تعاون حاصل ہوتا رہے گا۔''

اس نے تشویش ظاہر کی۔ ''لیکن ملکہ کے حامی خاصی تعداد میں ہیں۔ وہ ملکہ کے حکم سے ہمیں پھر گرفتار کرنا چاہیں گے یا ہماری جان لینا چاہیں گے۔''

''ہاں۔ ان سے ہوشیار رہنا ہے اور جو ہم پر قاتلانہ حملہ کریں، انہیں زندہ نہیں چھوڑنا ہے۔''

بشریٰ ایک ٹرے میں سلائس، مکھن اور ہاف فرائی انڈے لے آئی۔ اس نے کھانا شروع کرتے ہوئے دونوں کو دیکھا پھر پوچھا۔ ''ساتھ نہیں دو گے؟''

وہ بولی۔ ''ہم ناشتا کر چکے ہیں۔ ویسے آپ کے ساتھ چائے پئیں گے۔''

بلے نے کہا۔ ''تم میری ایک بات کا جواب دینے کے لیے بشریٰ کا انتظار کر رہے تھے؟''

وہ 'ہوں' کہہ کر ذرا خاموش رہا۔ لقمہ چباتا رہا پھر بولا۔ ''ایک اہم راز ہے۔ یہ راز کسی کو معلوم نہیں ہونا چاہیے۔ تم دونوں میری رگ جاں سے بھی زیادہ قریب رہتے ہو۔ میری کوئی بات تم دونوں سے چھپی نہیں رہے گی۔''

وہ ایک گھونٹ پانی پی کر بولا۔ ''اللہ تعالیٰ جل جلالہٗ و جل شانہٗ۔ وہ میرا پاک پروردگار' میرا مالک و مختار مجھ پر بہت مہربان ہے۔ وہ معبود مجھے ایسا غیر معمولی انعام دے رہا ہے' جو میرے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا۔''

اس نے بتایا۔ ''حضرت صلاح الدین اجمیری پانچوں

وقت کی نمازیں میرے ساتھ ادا کرتے ہیں۔ ایسے وقت وہ کسی کو نظر نہیں آتے اور اب میں بھی کسی کو نظر نہیں آتا ہوں۔''

دونوں نے اسے سوالیہ نظروں سے دیکھا اس نے کہا۔ ''وہ ربّ کریم مجھے عبادت کا صلہ دے رہا ہے۔ مجھے دو کرامات حاصل ہوئی ہیں۔''

انہوں نے پھر اسے سوالیہ نظروں سے دیکھا۔ بشریٰ نے کہا۔ ''بھائی! آپ کی باتیں سمجھ میں نہیں آرہی ہیں۔''

اس نے کہا۔ ''تم دونوں آنکھیں بند کرو۔''

انہوں نے آنکھیں بند کیں۔ بشریٰ نے پوچھا۔ ''آپ آنکھیں کیوں بند کرا رہے ہیں؟''

مراد نے کہا۔ ''اب آنکھیں کھولو۔''

انہوں نے آنکھیں کھول دیں پھر حیران رہ گئے۔ وہ نظر نہیں آرہا تھا۔ ابھی سامنے بیٹھا ناشتا کر رہا تھا۔ باتیں کر رہا تھا۔ اب اچانک گم ہوگیا تھا۔

بشریٰ نے حیرانی سے پوچھا۔ ''بھائی! آپ کہاں ہیں؟''

اسے اپنے پیچھے آواز سنائی دی۔ ''میں یہاں ہوں۔''

دونوں نے پلٹ کر دیکھا۔ وہ نظر آرہا تھا۔ وہاں سے چلتا ہوا پھر ناشتا کرنے اپنی جگہ آکر بیٹھ گیا۔ بلّے نے کہا۔ ''تم غائب نہیں ہوئے تھے۔ جیسے ہی ہم نے آنکھیں بند کیں، تم ہمارے پیچھے آکر چھپ گئے۔''

مراد اٹھ کر دوسرے کمرے کا دروازہ کھول کر اندر گیا پھر وہاں سے بولا۔ ''میں یہاں نہیں ہوں۔''

وہ دونوں اٹھ کر اس کمرے میں آئے۔ وہ نظر نہیں آرہا تھا۔ وہ اسے بیڈ کے نیچے الماری کے پیچھے ڈھونڈنے لگے۔ پھر آواز آئی۔ ''میں یہاں ہوں۔''

وہ دونوں ڈرائنگ روم میں واپس آئے۔ وہاں بھی وہ نظر نہیں آیا۔ اچانک بلّے نے دیکھا۔ بشریٰ کے شانوں پر رکھا ہوا دوپٹا آپ ہی آپ اٹھ کر اس کے سر کو ڈھانپ رہا تھا۔ پھر اس کی آواز سنائی دی۔ ''میری بہن! سر پر آنچل رکھا کرو۔''

وہ شدید حیرانی سے آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھ رہے تھے۔ بشریٰ نے خوش ہو کر کہا۔ ''یہ تو کمال ہوگیا مگر یہ کیسے ہو رہا ہے؟ آپ نظر کیوں نہیں آرہے ہیں؟''

بلّے نے کہا۔ ''مراد! کیا یہ جادو ہے؟''

اس کی آواز سنائی دی۔ ''جادو پر لعنت ہے۔ میرے ربّ نے مجھے یہ انعام دیا ہے۔ میں اس روحانی قوت سے جب چاہتا ہوں جہاں چاہتا ہوں، نظروں سے اوجھل ہو جاتا ہوں۔ اب تو سمجھ گئے ہو گے، کل رات میں نے اسی طرح کبھی چھپ کر کبھی نظر آکر دشمنوں کا مقابلہ کیا تھا۔''

بشریٰ نے خوش ہو کر اپنے سینے پر ہاتھ رکھ کر کہا۔ ''بے شک اللہ تعالیٰ قادرِ مطلق ہے۔ اب تو آپ ساری دنیا کے شر پسندوں سے تنہا مقابلہ کرسکیں گے۔''

بلّے نے کہا۔ ''میرا یار پہلے بھی تنہا سب سے لڑتا آیا ہے۔ پہلے بھی ایک سے کبھی دو چار سے مقابلہ کرتا تھا۔ اب اکیلا پوری فوج کو مار بھگائے گا۔''

''میں کسی بھی مہم میں تم دونوں کے ساتھ رہوں گا اور کسی کو نظر نہیں آؤں گا۔ یہاں تمام دشمنوں کے پاس جا کر ان کی رازداری سے ہونے والی باتیں سنا کروں گا۔ یہاں جتنے ممالک کے سفارت خانے ہیں، وہاں کی خفیہ سازشوں کو معلوم کرسکوں گا۔''

پھر اس نے کہا۔ ''لیکن میری یہ قوت عارضی ہے۔ آج سے بیس دنوں کے بعد یہ روحانی صلاحیت ختم ہو جائے گی۔''

وہ بولی۔ ''بھائی یہ تو مایوس کرنے والی بات ہے۔''

''میری بہن! مایوسی کفر ہے۔ اللہ تعالیٰ کا شکر ادا کرو۔ ہمیں بیس دنوں کے اندر تمام دشمنوں سے اپنی طاقت کا لوہا منوانا ہے اور بہت سے پیچیدہ مراحل سے گزرنا ہے۔''

بلّے نے کہا۔ ''اللہ تمہارے ساتھ ہے۔ اس مختصری مدت میں تم ایک ایک چیلنج سے نمٹ سکو گے۔''

بشریٰ نے پوچھا۔ ''بھائی! ابھی آپ نے کہا تھا کہ اللہ تعالیٰ جل جلالہُ وجل شانہُ نے آپ کو دو کرامات ادا کی ہیں؟''

بلّے نے پوچھا۔ ''وہ دوسری کیا ہے؟''

سینٹر ٹیبل پر سے پانی کا گلاس آپ ہی آپ اٹھا پھر فضا میں ذرا بلند ہوگیا۔ لقمے جہاں جا کر گم ہو جاتے تھے وہیں اس گلاس سے پانی کم ہونے لگا۔ صاف پتا چل رہا تھا کہ وہ پانی پی رہا ہے۔ پھر وہ گلاس میز پر اپنی جگہ واپس آگیا۔ اس کی آواز سنائی دی۔ ''میں ایک نہیں دو ہوں۔''

وہ ذرا چپ ہوا۔ وہ دونوں اس خالی جگہ کو دیکھ رہے تھے جہاں وہ بیٹھا ہوا تھا۔ اس نے کہا۔ ''میرے علاوہ ایک اور مراد ہے اور وہ میں ہی ہوں۔''

انہوں نے بے یقینی سے خالی جگہ کو دیکھا۔ بلّے نے حیرانی سے پوچھا۔ ''تم ایک نہیں دو ہو؟ یعنی دو مراد ہیں۔ کیا پلاسٹک سرجری کے ذریعے کسی کو اپنا ہم شکل بنایا ہے؟''

''نہیں پلاسٹک سرجری کا کوئی کمال نہیں ہے۔ وہ دوسرا سچ مچ مراد علی منگی ہے۔ میرا ہم زاد ہے۔''

بشریٰ نے کہا۔ ''آپ یہ کہہ رہے ہیں کہ میرا ایک اور

بھائی ہے۔ یا اللہ! یقین نہیں آرہا ہے۔ وہ کہاں ہیں؟''

''وہ اس وقت محل میں ہے۔ نگارا کے قریب رہ کر اس کی خفیہ مصروفیات کو دیکھ رہا ہے۔ کل رات اس نے نادیدہ ہوکر بڑے تماشے کیے تھے۔ اس نے آئی جی کی پناہ میں چھپنے والے قلندر شاہ کو موت کے گھاٹ اُتار دیا ہے۔ میرے ہم زاد نے تھوڑی دیر پہلے مجھے بتایا ہے کہ ایک بڑے ملک کی فوج ملکہ کی مدد کرنے کے لیے یہاں آنا چاہتی ہے۔ ملکہ کشمکش میں ہے۔ اپنی مشیر خواتین سے مشورے کررہی ہے۔''

بلّے نے کہا۔''ملکہ کو اپنی آرمی پر اعتماد نہیں رہا ہے۔ وہ بیرونی امداد حاصل کرنے والی ہے۔''

مراد نے کہا۔''وہ نادان نہیں ہے۔ اس کی مشاورت کمیٹی کہہ رہی ہے کہ غیرملکی فوج یہاں آکر ریاست پر قبضہ کرلے گی۔ اسے کسی بھی ملک کے زیرِاثر نہیں آنا چاہیے۔''

''پھر تو یہی راستہ رہ گیا ہے کہ وہ اپنی آرمی کے دباؤ میں آجائے یا پھر تم سے سمجھوتا کرے۔''

اس نے ناشتے سے فارغ ہوکر چائے پیتے ہوئے کہا۔''اس کی ماں اور دادی کے دورِحکومت سے یہ دستور رہا ہے کہ شوہر کو اپنے دباؤ میں رکھو۔ اسے ریاست کے کسی معاملے میں شریک نہ کرو اور نہ ہی محل کے باہر دوسرے مرد حضرات سے ملنے دو۔ اگر اسے آزادی دی جائے گی تو وہ آرمی اور پولیس کو اپنے مقاصد کے لیے ہموار کرکے ملکہ سے اقتدار چھین لے گا اور خود حکمران بن بیٹھے گا۔''

بشریٰ نے پوچھا۔''بھائی! کیا آپ ایسا کریں گے؟''

بلّے نے کہا۔''میں تمہارے سوال کا جواب دیتا ہوں۔ مراد نے ملکہ سے شادی کرکے دانشمندی کا ثبوت دیا ہے۔ شاہی خاندان کا فرد بن کر ایک مجرم ہونے کے الزامات کو ختم کردیا ہے۔ آئندہ مراد کے سامنے دو ہی راستے ہیں۔ ایک یہ کہ شاہی خاندان سے نکل کر اس ریاست سے باہر جاکر پھر مجرم نہ کہلائے۔ دوسرا راستہ یہ ہے کہ ملکہ مراد سے سمجھوتا نہ کرے تو یہ آرمی اور پولیس کی بھاری تعداد میں حمایت حاصل کرکے ملکہ کو اقتدار سے ہٹا کر خود حکمران بن جائے۔ کیوں مراد! کیا ایسا نہیں ہونا چاہیے؟''

''تم درست کہہ رہے ہو۔ ہم تینوں اس ریاست میں آکر گویا ایک پنجرے میں پھنس گئے ہیں۔ ہم اپنی آزادی اور خودمختاری قائم رکھیں گے اور حکمران بن کر رہیں گے تو پھر یہ ریاست ہمارے لیے پنجرہ نہیں رہے گی۔ ہم عزت اور وقار سے جئیں گے۔''

بشریٰ نے بڑے عزم سے کہا۔''اللہ تعالیٰ ہماری نیک نیتی کو سمجھ رہا ہے اور جلد ہی دین اسلام کے مطابق یہاں صحیح حکومت قائم کریں گے۔''

مراد نے کہا۔''میں آرمی کے اعلیٰ افسران کی طرف جارہا ہوں۔ چپ چاپ ان کی باتیں سنتا رہوں گا اور ان کے ڈھکے چھپے ارادوں کو سمجھتا رہوں گا۔ تم دونوں اپنے جاں نثاروں کے ساتھ مختلف سرکاری شعبوں میں جاتے آتے رہو۔ اعلیٰ عہدیداروں کو اپنی حمایت کے لیے آمادہ کرتے رہو۔ کوئی بھی رکاوٹ یا دشواری ہو تو فوراً مجھے کال کرو۔ میں چشم زدن میں تمہارے پاس آجاؤں گا۔''

بلّے نے پوچھا۔''کیا دوسرا مراد محل میں رہے گا؟''

مراد نے کہا۔''اب وہ تمام ممالک کے سفارت خانوں میں جاکر وہاں کی خفیہ سازشوں کی تہ تک پہنچے گا۔''

وہ ان سے رخصت ہوکر میجر محمود کے بنگلے میں آگیا۔ وہاں فوج کے چھ اعلیٰ افسران بیٹھے ہوئے تھے۔ ان میں آرمی انٹیلی جنس کے افسران بھی تھے۔ پچھلی رات ملکہ کے حکم کے مطابق میجر محمود کمانڈر ان چیف بن گیا تھا۔ وہاں سب ہی اسے مبارک باد دے رہے تھے۔

وہ چھ افسران ملکہ کی حکومت کا تختہ الٹنا چاہتے تھے۔ وہاں ان کی خفیہ میٹنگ ہورہی تھی۔ ایک اعلیٰ افسر نے کہا۔ ''ہم ایک عرصے سے ملکہ کے خلاف پلاننگ کررہے ہیں۔ فوج کے حساس شعبے کے عہدیدار ہمارے حامی ہوگئے ہیں۔ ادھر مراد علی منگی نے کھل کر بغاوت کردی ہے۔ ہمارے لیے یہ سنہری موقع ہے۔ وہ خطرناک شخص ملکہ سے اور محل سے دور ہوگیا ہے۔ ہم نگارا خانم کو اقتدار سے محروم کرکے فوجی حکومت قائم کرسکتے ہیں۔''

میجر محمود نے کہا۔''مراد کے باغی ہونے کی اہم وجہ ہوگی۔ بادشاہ بننے کی خواہش سب ہی کو ہوتی ہے۔ وہ بھی اپنے دامن سے ایک مجرم کا داغ دھونے کے بعد بادشاہ سلامت کہلانا چاہتا ہوگا۔''

ایک اعلیٰ افسر نے کہا۔''ایک مجرم نہ سیاسی چالوں کو سمجھتا ہے اور نہ ہی حکمران بن سکتا ہے۔ وہ اپنی فطرت کے مطابق صرف شوٹر اور فائٹر بن کر رہ سکتا ہے۔''

ایک افسر نے کہا۔''کل رات کاؤنٹر فائرنگ میں ہمارے افسران اور کئی سپاہی مارے گئے۔ اسے ہلکی سی خراش تک نہیں آئی اور وہ اپنے مطالبات منوا کر زندہ سلامت واپس چلا گیا۔''

سی ان سی محمود اکبر نے کہا۔''وہ ناقابلِ شکست اور

ناقابلِ گرفت کہلاتا ہے لیکن وہ کوئی جن یا سپر مین نہیں ہے۔ کل رات ہم نے اسے چھوٹ دی تھی۔ ہمارے سپاہیوں نے اس پر گولیاں نہیں چلائیں اس لیے وہ سلامتی سے واپس چلا گیا۔''

وہ کرسی کی پشت سے ٹیک لگا کر بولا۔''اگر وہ بادشاہ بننے کا خواب دیکھے گا تو اسے گولیوں سے چھلنی کر دیا جائے گا۔''

ایک نے پوچھا۔''تو پھر آج ہی فوجی آپریشن کیا جائے؟''

سی ان سی نے کہا۔''آج نماز مغرب سے پہلے تمام حساس اداروں پر اپنی گرفت مضبوط کی جائے۔ پھر محل کو چاروں طرف سے گھیر لیا جائے۔ محل کے اندر جتنی مسلح لیڈیز گارڈز ہیں، انہیں سلامتی دینے کا وعدہ کر کے حکم دیا جائے کہ وہ ہتھیار پھینک کر محل سے باہر آجائیں۔ وہاں ملکہ نگارا تنہا رہ جائے گی۔ ہم اسے حراست میں لے لیں گے۔''

ایک افسر نے کہا۔''ایسے وقت مراد کی سیکرٹ فورس پرابلم بن سکتی ہے۔ اس پوری فورس کو پھر ہیڈ کوارٹر میں لا کر رمشا اور سلمان (بشریٰ اور بلے) کو حراست میں رکھنا چاہیے۔''

دوسرے افسر نے کہا۔''رمشا اور سلمان کے علاوہ ان کے اٹھارہ شوٹرز ہیں اور ان کے پاس صرف ریوالور اور پستول ہیں۔ ہم انہیں سر اٹھاتے ہی کچل ڈالیں گے۔''

سی ان سی نے کہا۔''آپ حضرات یہ نہ بھولیں کہ مراد علی منگی ہر ملک کے لیے، ہر خطرناک تنظیم کے لیے عذاب بنتا رہا ہے۔ وہ توقع کے خلاف ہمارے لیے مصیبت بن سکتا ہے۔ دانشمندی یہ ہوگی کہ اسے اُلّو بنایا جائے۔ اس سے وعدہ کیا جائے کہ ملکہ کو اقتدار سے محروم کر کے اسے یہاں کا بادشاہ بنایا جائے گا۔ پھر جب آپریشن کے دوران وہ ہمارے ساتھ رہے گا تو اسے ایک ہی گولی میں اوپر پہنچا دیا جائے گا۔''

سب نے اس پلاننگ کی تائید کی۔ سی ان سی محمود اکبر نے اپنا فون اٹھا کر کہا۔''مراد کا کونٹیکٹ نمبر نہیں ہے۔ رمشا سے اور سلمان سے رابطہ کرتا ہوں۔ مراد سے براہِ راست گفتگو کرنے کے لیے اسے یہاں بلایا جائے گا۔''

مراد نے بشریٰ اور بلے کے پاس آ کر کہا۔''ابھی سی ان سی کی کال آرہی ہے۔ بشریٰ! تم اپنے فون کا سوئچ آف رکھو۔''

اسی وقت بلے کے فون سے رنگ ٹون ابھرنے لگی۔ مراد نے کہا۔''اسے چیخنے دو۔ وہ دوسری بار کال کرے تو اٹینڈ کرو۔ وہ تم سے میرا اسپل نمبر مانگے گا۔ جو سم میں استعمال نہیں کر رہا ہوں، وہ نمبر اسے دے دینا۔ تمہیں گفتگو کے لیے بلائے تو ہرگز نہ جانا۔ تمہیں آج شام تک اپنے جاں نثاروں کے ساتھ چھپے رہنا ہے۔''

بشریٰ نے پوچھا۔''بھائی! گڑبڑ کیا ہو رہی ہے؟''

''میں تھوڑی دیر بعد بتاؤں گا۔ رنگ ٹون بند ہوگئی ہے وہ پھر کال کرے گا اور تم اس سے بات کرو گے۔ دشمنوں کو شام تک کسی طرح ٹالنا ہے۔''

پھر رنگ ٹون ابھرنے لگی۔ وہ کال اٹینڈ کرتے ہوئے بولا۔''سوری سر! میں ٹوائلٹ میں تھا۔''

سی ان سی نے کہا۔''میں مراد سے بات کرنا چاہتا ہوں۔ اس کا نمبر کیا ہے، بتاؤ؟''

''میں ایک نمبر بتا رہا ہوں...... لیکن جب وہ ہم سے ضروری بات کرنا چاہتا ہے، تب ہی یہ سم استعمال کرتا ہے۔''

بلے نے وہ نمبر بتائے۔ سی ان سی نے کہا۔''ہم تم سے بھی ضروری باتیں کرنا چاہتے ہیں۔ تم اپنی شریکِ حیات کے ساتھ ابھی یہاں آؤ۔''

وہ بولا۔''آپ کا حکم سر آنکھوں پر۔ ابھی رمشا کو اسپتال سے لایا ہوں۔ ڈاکٹر نے بیڈ ریسٹ کے لیے کہا ہے۔ میں ایک گھنٹے بعد تنہا آسکوں گا۔''

''ٹھیک ہے۔ تنہا ہی آجاؤ۔''

رابطہ ختم ہوگیا۔ مراد نے کہا۔''تمام جاں نثاروں کو کال کرو۔ انہیں شہر سے دور فاریسٹ زون نمبر ٹو میں فوراً حاضر ہونے کو کہو۔ ہم دونوں مراد وہاں آئیں گے لیکن صرف تمہیں اور بشریٰ کو دکھائی دیں گے۔''

اس کے بعد مراد نے سب کی نظروں سے اوجھل ہو کر آرمی ہیڈ کوارٹر سے لاتعداد اسلحہ نکال کر اپنی مطلوبہ جگہ پر ذخیرہ کر لیا تھا۔ سی ان سی نے مراد سے رابطہ کرنا چاہا تو معلوم ہوا کہ وہ اس نمبر کی سم استعمال نہیں کر رہا ہے۔ اس نے ناگواری سے کہا۔''یہ مجرمانہ زندگی گزارنے والا خود کو پراسرار بنا لیتا ہے۔ آخر کہاں گیا ہوگا۔ ملکہ اور محل سے دور نہیں جائے گا۔''

اس نے سپاہیوں کو حکم دیا کہ وہ مراد کو تلاش کریں اور رمشا اور سلمان کو گرفتار کر کے لے آئیں۔ اس نے سوچ لیا تھا کہ مراد سے سمجھوتا کرے گا تو وہ سی ان سی کو بادشاہ تسلیم نہیں کرے گا۔ اسے بادشاہ بنانے کا سبز باغ دکھا کر ہی دھوکے سے ہلاک کرنا ہوگا۔ سیدھی انگلی سے گھی نہیں نکلے گا۔

دونوں مراد چاہتے تو نادیدہ رہ کر سی ان سی محمود اکبر کے ساتھ تمام دشمن افسران کو گولیوں سے اڑا دیتے لیکن وہ چاہتے تھے کہ نگارا خانم پر مصیبتوں کے پہاڑ ٹوٹ پڑیں۔

کوئی اس کا حامی اور مددگار نہ ہو۔ تب ہی وہ مراد کی قدر و قیمت کو تسلیم کرے گی۔

سی ان سی کو اطلاع ملی کہ بشریٰ اور بلاّ اپنی رہائش گاہ کے دروازے اور کھڑکیاں کھلی چھوڑ کر کہیں چلے گئے ہیں۔ انہیں تلاش کیا جارہا ہے۔ سیکرٹ فورس کے وہ اٹھارہ شوٹر اور فائٹرز بھی نظر نہیں آرہے تھے۔

سی ان سی نے غصے سے کہا۔ ''وہ سب کہیں چھپ گئے ہیں۔ وہ اتنی تعداد میں یہاں سے فرار ہو کر بارڈر پار نہیں کرسکیں گے، انہیں یہیں تلاش کرو۔ ان میں سے کوئی بھی نظر آئے تو اسے گرفتار نہ کرو، فوراً گولی ماردو۔''

وہ سب فاریسٹ زون ٹو کے اس سایہ دار درخت کے پاس پہنچ گئے جہاں مراد نے اسلحہ ذخیرہ کیا تھا۔ وہاں ضرورت سے زیادہ اسلحہ دیکھ کر خوش ہو گئے تھے، انہیں اٹھا کر چیک کررہے تھے۔

مراد نے بشریٰ اور بلے کے پاس آکر نادیدہ ہو کر کہا۔ ''تمام جاں نثاروں کو بتادو کہ آج شام کے بعد آرمی سے فیصلہ کن جنگ ہوگی۔ تم لوگوں کے پاس کسی بھی ہتھیار کی کمی نہیں ہوگی۔ اب یہ سنو کہ قصہ کیا ہے؟''

اس نے بتایا کہ آج شام سے پہلے ہی فوج محل کا محاصرہ کرنے والی ہے۔ ''تم لوگ محل کے اطراف کے تمام علاقے اچھی طرح دیکھ چکے ہو۔ تمہیں ہتھیاروں کو چھپا کر خود چھپتے ہوئے ان علاقوں میں پہنچنا ہے۔ محاصرہ کرنے والی آرمی کے پیچھے رہ کر اپنا محاذ بنانا ہے۔ وہاں تک پہنچنے کا طریقہ کار یہ ہوگا کہ ایک جاں نثار آگے جائے گا۔ دو جاں نثار اس سے دور رہ کر اس کی نگرانی کرتے رہیں۔ اگر پولیس یا آرمی والے ایک جاں نثار کو روکیں گے تو پیچھے آنے والے دونوں ساتھی ان پر فائر کھول دیں گے۔ چیکنگ کرنے والے سپاہی چار یا چھ سے زیادہ نہیں ہوتے۔ وہ اچانک چھپ کر فائر کرنے والوں کا مقابلہ نہیں کرسکیں گے۔ وہ مارے جائیں گے یا بھاگ جائیں گے۔ تم سب اسی طرح تین تین ساتھیوں کا گروپ بنا کر محل کے اطراف پہنچو گے۔''

بشریٰ اور بلاّ اس سلسلے میں کئی سوالات کرنے لگے۔ مراد انہیں جواب دیتے ہوئے جنگ کے آغاز سے اختتام تک کی تمام باتیں سمجھانے لگا۔ اس نے یقین دلایا کہ ان میں سے جو جاں نثار مصیبت کے وقت اسے فون پر کال کرے گا، وہ اس کی مدد کے لیے پہنچ جایا کرے گا۔

اس وقت دوسرا مراد سی ان سی اور اس کے حواری افسروں کے قریب تھا۔ ان کی معروفیات کو دیکھ رہا تھا اور ان کی بدلتی ہوئی پلاننگ کو سمجھ رہا تھا۔

☆☆☆

ملکہ نگارا کو جاسوسی کرنے والی خواتین اطلاع دے رہی تھیں کہ ان کے مختلف شعبوں میں مرد حضرات کے تیور بدل رہے ہیں۔ دوپہر کو اطلاع ملی کہ آرمی نے انٹیلی جنس ڈیپارٹمنٹ کو اپنے کنٹرول میں لے لیا ہے اور اعلیٰ عہدوں پر کام کرنے والی تمام خواتین کو وہاں سے نکال دیا ہے۔

ایک گھنٹے بعد معلوم ہوا کہ محل کے ٹیلیفون اور بجلی کی سپلائی لائن کاٹ دی گئی ہے۔ اس نے فون پر چیخ کر سی ان سی سے کہا۔ ''مسٹر محمود! میں نے تمہیں کمانڈر ان چیف بنایا ہے۔ کیا تمہیں خبر ہے کہ میرے خلاف کیا ہورہا ہے؟''

اس نے کہا۔ ''مجھے کیسے معلوم نہیں ہوگا جبکہ میرے ہی حکم سے یہ تماشے ہورہے ہیں۔ ذرا چھت پر جا کر دیکھیں فوج محل کا محاصرہ کررہی ہے۔''

وہ اپنی کئی گارڈز کے ساتھ تیزی سے سیڑھیاں چڑھتی ہوئی چھت پر آئی۔ پھر حیرانی اور پریشانی سے چھت پر چاروں طرف ادھر ادھر جاتے ہوئے دیکھنے لگی۔ ہزاروں کی تعداد میں فوجی وہاں موجود تھے۔ ان کے پاس راکٹ لانچرز، مشین گنیں، کلاشن کوف اور جدید ساخت کی رائفلیں تھیں۔

نگارا خانم کا سر چکرانے لگا۔ کسی بھی ملک یا ریاست کی قوت اس کی فوج ہوتی ہے۔ وہی قوت اسے زیر کرنے آئی تھی۔ ملکہ کی اپنی کوئی طاقت نہیں تھی۔ کوئی اس کی مدد کو آنے والا نہیں تھا۔

وہ سر جھکا کر چھت سے اتر کر اپنی خواب گاہ میں آئی۔ ان لمحات میں مراد یاد آیا۔ وہ سوچنے لگی۔ 'اس نے تنہا چھ ہائی جیکرز کا مقابلہ کیا تھا اور انہیں برے انجام تک پہنچایا تھا۔ وہ بہت جی دار ہے۔ زبردست فائٹر ہے۔'

اس نے بیڈ کے سرے پر بیٹھ کر زیر لب کہا۔ ''اونہہ۔ وہ چھ ہائی جیکرز پر حاوی ہو گیا تھا۔ یہاں فوجی ہزاروں کی تعداد میں ہیں۔ یہاں اس کی شہ زوری ہوا ہو جائے گی۔ فوج اسے جوتوں تلے کچل کر رکھ دے گی۔''

فون کی رنگ ٹون نے اسے چونکا دیا۔ ننھی سی اسکرین نے بتایا کہ اسی بڑے ملک کا اعلیٰ عہدیدار اسے کال کررہا ہے جس نے اسے فوجی امداد کی پیشکش کی تھی۔

اس نے بٹن دبا کر اسے کان سے لگایا پھر کہا۔ ''ہیلو...... میں ابھی بہت اپ سیٹ ہوں۔ بات نہیں کرسکوں گی۔''

''صرف دو باتیں سن لیں۔ پانی سر سے گزر رہا ہے

اور آپ ڈوب جانے کی غلطی کر رہی ہیں۔ آپ کی ریاست کی آرمی ٹی وی اور ریڈیو کے ذریعے ساری دنیا سے کہہ رہی ہے کہ فوج نے محل کا محاصرہ کیا ہے اور تمام حساس اداروں پر اس کا کنٹرول ہے۔ ہر ہائی نس آپ کب تک محل میں قید رہیں گی۔ فوج دعویٰ کر رہی ہے کہ وہ چند گھنٹوں میں محل کے اندر گھس کر آپ کو حراست میں لے لے گی۔ ہم نہیں چاہتے کہ آئندہ وہ فوجی حکمران دوسری سپر پاور کی جھولی میں چلا جائے۔ اس سے پہلے ہی ہماری بھاری فوج ریاست کی مغربی اور جنوبی سرحدوں میں پہنچ رہی ہے۔ ہم تمہاری آرمی کو وہاں حکمران بن کر نہیں رہنے دیں گے۔ تاریخ کہتی ہے کہ عورتوں نے حکمرانی تو کی ہے۔ لیکن جلد ہی کسی سازش کے تحت ماری گئی ہیں یا اپنی کم عقلی کے باعث اقتدار سے محروم ہوتی رہی ہیں۔ آپ تسلیم کریں کہ عقل سے پیدل ہیں۔ اگر آپ کے ساتھ مراد علی منگی ہوتا تو فوج اتنی آسانی سے محاصرہ کرنے نہیں آتی۔ وہ ضدی، سر پھرا سورما آپ کی سلامتی کے لیے جان کی بازی لگا دیتا لیکن آپ نے اسے دشمن بنا کر اپنے پیروں پر کلہاڑی ماری ہے۔ بہر حال اپنی آرمی کو اقتدار میں آنے دو۔ اس کے بعد ہم آ رہے ہیں لیکن افسوس اس وقت تک وہ تمہیں زندہ نہیں رہنے دیں گے...... سوسیڈ نگارا خانم! اب تم ہر ہائی نس نہیں رہیں۔''

اس نے فون بند کر دیا۔ اسے ایک طرف پھینک کر دونوں ہاتھوں سے منہ ڈھانپ کر رونے لگی۔ ایسے ہی وقت اس نے دوبارہ اللہ اکبر کی آواز سنی۔ سر گھما کر بالکونی کی طرف دیکھا تو شدید حیرانی سے اچھل کر کھڑی ہو گئی۔ وہ عصر کی نماز ادا کر رہا تھا۔

اس کے دائیں طرف حضرت صلاح الدین اجمیری تھے۔ اسے صرف مراد نظر آ رہا تھا۔ ان لمحات میں سپر پاور کے اعلیٰ عہدیدار کی باتیں یاد آئیں۔ ابھی اس نے فون پر کہا تھا۔ ''اگر تمہارے ساتھ مراد علی منگی ہوتا تو فوج اتنی آسانی سے تمہارا محاصرہ کرنے نہیں آتی۔ وہ ضدی، سر پھرا سورما تمہاری سلامتی کے لیے جان کی بازی لگا دیتا۔''

وہ فوراً ہی تیزی سے چلتی ہوئی واش روم میں آئی۔ وہاں جلدی جلدی وضو کیا۔ پھر دوڑتی ہوئی بالکونی میں آ کر ایک مصلیٰ بچھا کر نماز کے لیے کھڑی ہو گئی۔ اس کے دماغ میں سب سے پہلے یہی بات آئی کہ وہ اس نمازی کو نماز پڑھ کر ہی جیت سکے گی۔ ہر چہار طرف سے دشمنوں کی یلغار تھی اور سلامتی کے لیے آگے صرف نماز تھی اور اس کی کشتی کو کنارے لگانے والا وہی ایک ناخدا تھا جو اس کا مجازی خدا بھی تھا۔

قرآن مجید کی آیتیں یاد کرنے کے بعد اس طرح دماغ میں نقش ہو جاتی ہیں کہ بعد میں توجہ سے پڑھو یا نہ پڑھو بندہ خیالات کے ہجوم میں گم ہو کر بھی صحیح پڑھتا چلا جاتا ہے۔ وہ نماز کی نیت کر کے دونوں ہاتھ سینے پر باندھ کر پڑھ رہی تھی لیکن دماغی طور پر حاضر نہیں تھی۔ پڑھتی جا رہی تھی اور سوچتی جا رہی تھی۔ نماز کا طریقہ اور آیتیں دینی فطرت کے مطابق آپ ہی آپ جاری تھیں۔

اس کا دماغ چیخ چیخ کر کہہ رہا تھا کہ ہزاروں فوجیوں کے مقابلے میں مراد ایک تنکا ہی سہی لیکن ایسے وقت جبکہ کوئی یار و مددگار نہیں تھا، مراد ہی تنکے کا سہارا تھا۔ اور بے شک و شبہ وہ ایسا ہی سر پھرا سورما تھا کہ اس کے لیے لڑتے لڑتے جان دے دیتا۔

آہ......! اس نے ایسے مرد سے دشمنی کر کے سچ مچ اپنے پیروں پر کلہاڑی ماری ہے۔ یہ پتا ہی نہ چلا کہ سوچتے سوچتے نماز کیسے ہو گئی۔ اس نے سجدے سے سر اٹھا کر چور نظروں سے سامنے دیکھا تو مراد نہیں تھا۔

کلیجا دھک سے رہ گیا۔ کیا وہ چلا گیا ہے؟

اس کے اندر کھلبلی سی تھی۔ اس نے جلدی جلدی التحیات پڑھی۔ پھر سلام پھیرنے کے لیے دائیں طرف سر گھمایا تو وہ نظر آ گیا۔ اس سے دور ایک صوفے پر بیٹھا ہوا تھا۔

ایک تازہ ہوا کا جھونکا اس کے دل سے گزر گیا۔ اس نے بڑے اطمینان سے دعا کے لیے ہاتھ اٹھائے۔ ''اے میرے اللہ! اے میرے معبود! مجھے دشمنوں کے شکنجے سے نکال دے۔ موجودہ حالات میں یہ مراد علی منگی ہی نجات دہندہ بن سکتا ہے، اگر تو چاہے...... لاحول ولا قوۃ الا باللہ۔ صرف اللہ تعالیٰ ہی حالات کو بدلنے کی قوت رکھتا ہے۔ یا اللہ مراد کو وسیلہ بنا کر میرے حالات کو بہتر بنا دے۔''

وہ اور بہت ساری دعائیں مانگنا چاہتی تھی لیکن یہ اندیشہ تھا کہ وہ چلا نہ جائے۔ وہ کلمہ پڑھتی ہوئی منہ پر ہاتھ پھیر کر مصلے سے اٹھ گئی پھر تیزی سے چلتی ہوئی اس کے پاس آ کر رک گئی۔ اسے دیکھنے لگی۔

وہ سر اٹھا کر بولا۔ ''میں ملکۂ عالیہ کی تعظیم کے لیے کھڑا نہیں ہو سکتا۔ لہٰذا غصہ دکھاؤ اور مجھے یہاں سے جانے کا حکم دو۔''

وہ سر جھکا کر اس کے سامنے ایک صوفے پر بیٹھ گئی پھر بولی۔ ''میں ملکہ نہیں رہی۔ تھوڑی دیر بعد مجھے گولی ماردی جائے گی۔''

"تم تو اسی دن مرگئی تھیں جس دن میرے ہاتھوں میں ہتھکڑی پہنا کر مجھے ٹارچر سیل میں بھیج دیا تھا۔"

"مجھ سے بڑی بھول ہوئی۔ میں نے تمہیں نہیں، اپنے آپ کو نقصان پہنچایا ہے۔ بہت بڑا نقصان۔ ابھی جان سے جانے والی ہوں۔ یا خدا...... ! ایسے وقت تم یہاں کیسے آگئے؟ اور...... اور محل سے باہر کیسے جاسکو گے؟"

"تم میری شریک حیات ہو۔ میں بے غیرت نہیں ہوں۔ ایسے حالات میں تمہیں تنہا چھوڑ کر نہیں جاؤں گا۔"

نگارا نے بڑی محبت سے اسے دیکھا، پھر کہا۔ "میں شرمندہ ہوں۔ میں نے تمہاری قدر نہیں کی۔"

"یہ عارضی پچھتاوا ہے۔ دکھاوے کی شرمندگی ہے۔ ابھی تمہیں آرمی کی طاقت اور حکمرانی واپس مل جائے تو پھر شوہر پر حکومت کرنے لگو گی۔"

"میں توبہ کرتی ہوں۔ پھر ایسی غلطی نہیں کروں گی۔"

"عورت کی توبہ پر یقین کرنے والے مرد ساری عمر توبہ توبہ کرتے رہتے ہیں۔ میں اللہ تعالیٰ سے دعا مانگتا ہوں کہ باغی فوج شکست کھا کر ہتھیار ڈال دے۔ ہمیں فتح حاصل ہو۔ اس کے بعد تم ملکہ نہیں رہو گی۔ میں ریاست کا حکمران بن جاؤں گا۔"

وہ اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ وہ فوراً ہی اس کے قریب آکر بولی۔ "پلیز ایسی باتیں نہ کرو۔ میں تمہیں پس پردہ حکومت کرنے دوں گی لیکن دنیا والوں کے سامنے میں ہی ملکہ بن کر رہوں گی۔"

وہ بولا۔ "کبھی نہیں۔ تم صرف شریک حیات ہو۔ محل کی چار دیواری میں رہو گی۔ ریاست کے معاملات میں کبھی نہیں بولو گی۔"

وہ اس کی گردن میں بانہیں ڈال کر بولی۔ "میں بولوں گی۔ ہم دونوں مل کر حکومت کریں گے۔"

وہ اس کی بانہوں کو اپنی گردن سے الگ کرکے دھکا دیتے ہوئے بولا۔ "میں عورت کو عورت ہی بنا کر رکھوں گا۔"

وہ دھکا کھا کر پیچھے گرتے گرتے سنبھل گئی۔ ان لمحات میں بھول گئی کہ دشمنوں کے نرغے میں ہے۔ اپنی توہین کے احساس سے دماغ گرم ہو گیا۔ چیخ کر بولی۔ "یو نان سینس! تم نے مجھے دھکا دیا ہے۔ تمہاری اوقات کیا ہے؟ میں پھر تمہیں ٹارچر سیل میں......"

وہ بولتے بولتے رک گئی۔ یکلخت یاد آگیا کہ وہ ملکہ نہیں رہی ہے۔ فوجیوں نے اسے محل میں قیدی بنا دیا ہے۔ وہ پاؤں پٹخ کر بولی۔ "اتنی دیر سے اُلّو بنا رہے ہو۔ خواب دکھا رہے ہو کہ فوج نے ہتھیار ڈال دیے ہیں اور تم حکمران بن گئے ہو۔"

وہ ایک طرف تھوکتے ہوئے بولی۔ "تھو ہے تم پر۔ اپنی اوقات مت بھولو۔ تمہارا باپ بھی کبھی حکمران نہیں بن سکے گا۔"

مراد نے ایک زور کا طمانچہ رسید کیا۔ وہ لڑکھڑا کر دوسری طرف گھوم گئی۔ پھر تیزی سے بھاگتی ہوئی دروازے کے پاس آکر اسے کھول دیا۔ باہر مسلح لیڈیز گارڈز کھڑی ہوئی تھیں۔ اس نے چیخ کر حکم دیا۔ "اندر جاؤ۔ اسے بھاگنے نہ دو۔ اسے گولی مار دو۔"

چھ گارڈز دوڑتی ہوئی اندر آئیں۔ وہ بھی ان کے پیچھے آئی۔ وہ وہاں نہیں تھا۔ سیکیورٹی افسر نے پوچھا۔ "آپ کسے گولی مارنے کو کہہ رہی ہیں؟ یہاں تو کوئی نہیں ہے۔"

"وہ ہے۔ واش روم اور دوسرے تمام پورشن میں دیکھو اور دیکھتے ہی اسے حملہ کرنے کا موقع نہ دو۔ گولی مار دو۔"

وہ تمام گارڈز اس وسیع وعریض خواب گاہ میں ادھر سے ادھر دوڑنے لگیں۔ وہ ایک جگہ بیٹھا ہوا تھا۔ اب نگارا کو بھی نظر نہیں آرہا تھا۔ ایک گارڈ نے کہا۔ "وہ یہاں بالکونی سے فرار ہوا ہے۔"

بالکونی سے دور تک ہرا بھرا گارڈن نظر آرہا تھا اور احاطے کی اونچی دیوار کے دوسری طرف فوج مستعد کھڑی ہوئی تھی۔ اپنے کمانڈر ان چیف کے احکامات کی منتظر تھی۔

نگارا نے دل میں کہا۔ "اچھا ہے۔ یہ دشمن محل میں آجائیں۔ مجھے مار ڈالیں لیکن مرنے سے پہلے اسے مار ڈالوں گی۔ اس نے مجھ پر ہاتھ اٹھایا ہے۔ اس کی اوقات ہی کیا ہے؟ میں اسے زندہ نہیں چھوڑوں گی۔"

تمام گارڈز ناکام ہو کر باہر چلی گئیں۔ وہ اچانک بالکونی میں نظر آیا۔ یہی سمجھ میں آیا کہ جہاں سے فرار ہوا تھا، وہیں سے واپس آگیا ہے۔ وہ اسے دیکھتے ہی پیچھے ہٹتے ہوئے دور جاتے ہوئے بولی۔ "میں کمانڈر ان چیف سے اپنی آخری خواہش بیان کروں گی۔ اس سے کہوں گی کہ مجھے گولی مارنے سے پہلے تمہیں میری آنکھوں کے سامنے کتے کی موت مارے۔"

وہ گہری سنجیدگی سے بولا۔ "میں تمہارے جیسی مغرور اور بد دماغ عورت کو طلاق دیتا ہوں۔ میں تمہیں طلاق دیتا ہوں۔ میں تمہیں طلاق دیتا ہوں۔"

وہ دوڑتی ہوئی باہر جانے کے لیے دروازے تک گئی۔ اسے کھولنے سے پہلے بولی۔ "تم کیا طلاق دو گے؟ دو

کوڑی کے مجرم! میں تم پر تھوکتی ہوں۔''

پھر اس نے دروازے کو باہر سے بند کر دیا تاکہ وہ پٹائی کرنے نہ آئے۔ اس نے گارڈز سے کہا۔ ''وہ بالکونی سے واپس آ گیا ہے۔ جاؤ اسے زندہ نہ چھوڑو۔''

وہ سب دروازہ کھول کر اندر چلی گئیں۔ مراد پھر نظر آنے والا نہیں تھا۔ نگارا نے میٹنگ روم میں آ کر سپر پاور کے اعلیٰ عہدیدار کو فون پر مخاطب کیا۔ وہ بولا۔ ''ہم ٹی وی چینل سے ریڈیو اور اپنے سراغ رسانوں سے معلوم کر رہے ہیں۔ آرمی وہاں کے وقت کے مطابق سات بجے محل میں داخل ہوگی۔''

وہ بولی۔ ''ہاں، وہ نام کے مسلمان ہیں۔ مغرب کی نماز پڑھنے کے بعد مجھ پر ظلم کرنے آئیں گے۔ میں تم سے سمجھوتا کرنا چاہتی ہوں۔ کیا آپ یہاں کی آرمی سے کوئی سمجھوتا کر کے مجھے جان کی امان دے سکتے ہیں۔''

وہ خوش ہو کر بولا۔ ''یو آر انٹیلی جنٹ۔ میں ابھی سی ان سی محمود اکبر سے بات کروں گا۔''

''لیکن آپ تو ریاست پر فوج کشی کرنے والے ہیں۔ آپ کی فوج ریاست کی سرحد پر پہنچ رہی ہے۔ سی ان سی آپ جیسے دشمن سے سمجھوتا نہیں کرے گا۔''

''وہ ضرور کرے گا۔ میں اس سے کہوں گا کہ ملکہ کو گولی نہ مارے۔ عزت و احترام سے ہمارے حوالے کر دے۔ ہم جنگ نہیں کریں گے۔ ہماری فوج سرحد سے واپس چلی جائے گی۔ فکر نہ کریں۔ میں ابھی اس سے سمجھوتا کروں گا۔''

''آپ کی فوج واپس جائے گی تو میں یہاں کی ملکہ بن کر نہیں رہ سکوں گی۔''

''ہم سیاسی چالیں جانتے ہیں۔ ہم آپ کی حکومت آپ کو واپس دلانے کے لیے ریاست پر حملہ کریں گے۔ یہ یاد رکھیں کہ آپ بدستور ملکہ رہیں گی لیکن ہماری پالیسیوں کے مطابق حکومت کرتی رہیں گی۔''

وہ بولی۔ ''مجھے منظور ہے۔''

رابطہ ختم ہو گیا۔ اس نے فون کو مٹھی میں جکڑ لیا۔ جیسے مراد کی گردن مٹھی میں آ گئی ہو۔ اس نے طمانچہ مارا تھا۔ یہ توہین اس سے برداشت نہیں ہو رہی تھی۔ آئندہ اس سے انتقام لینے کے لیے زندہ رہنا ضروری تھا اور وہ محض مراد کو کچلنے کے لیے سپر پاور سے سمجھوتا کر رہی تھی۔ اپنی انا اور خود داری کو اپنی قوم کو اور اپنے وطن کو داؤ پر لگا رہی تھی۔

محل کے چاروں طرف سو گز کی دوری پر امیر و کبیر لوگوں کی کوٹھیاں تھیں۔ آرمی نے دوپہر سے پہلے ہی انہیں حکم دیا تھا کہ وہ چوبیس گھنٹے کے لیے اپنی کوٹھیوں کو مقفل کر کے اپنی فیملی کے ساتھ دوسرے علاقے میں چلے جائیں۔ شام کے بعد وہ علاقہ میدانِ جنگ بننے والا ہے۔

وہ لوگ اپنی بیویوں اور بچوں کو لے کر کوٹھیوں کو مقفل کر کے چلے گئے تھے۔ عصر سے پہلے ہی بشریٰ بلا اور سیکرٹ فورس کے مسلح جوان ان کوٹھیوں کے تالے توڑ کر اندر آ کر اپنے بھاری ہتھیاروں کے ساتھ چھپ گئے تھے۔ ان کوٹھیوں کی چھتوں سے اور بالکونیوں سے محل کے اطراف محاصرہ کرنے والے فوجی صاف نظر آ رہے تھے اور سیکرٹ فورس کے پاس ایسے ہتھیار آ گئے تھے جو دو سو گز کی دوری تک اپنے ٹارگٹ کو فنا کر سکتے تھے۔

مغرب کی اذان ہوئی تو محل کے باہر حملہ کرنے والے اور محل کے اندر حملے کی زد میں آنے والے سب ہی اپنے رب کے آگے سجدہ کرنے کے لیے قبلہ رو ہو گئے۔

نماز کے بعد سب نے ہاتھ اٹھا کر اپنی سلامتی اور بقا کے لیے دعائیں مانگیں۔ اللہ تعالیٰ اپنے آگے سجدہ کرنے والوں کی نیتوں کو سمجھتا ہے۔ وہی جانتا تھا کہ اس جنگ کا انجام کیا ہوگا؟

پھر جنگ کا آغاز ہوا۔ کمانڈر کے حکم سے محل کے چاروں طرف مستعد رہنے والے ہزاروں سپاہیوں نے نوے ڈگری پر ہوائی فائرنگ کی۔ بیک وقت ہزاروں گولیاں آسمان کی طرف جاتی ہوئی شور مچاتی رہیں۔ فائرنگ کی ایسی دہشت ناک دل ہلا دینے والی آوازیں تھیں کہ دور دور کی بستیوں سے عورتیں بچے اور بوڑھے گھروں سے نکل کر بھاگنے لگے۔ تقریباً بیس سیکنڈ تک گولیاں چلتی رہیں پھر خاموشی چھا گئی۔ ملکہ اور اس کے حمایتی فوجیوں کے لیے یہ وارننگ تھی کہ ان میں سے کوئی نہیں بچے گا۔ کوئی مقابلہ نہیں کر سکے گا۔

پھر ایک افسر نے میگا فون کے ذریعے کہا۔ ''ملکہ نگارا خانم......! تمہیں حکم دیا جا رہا ہے کہ اپنے تمام مسلح گارڈز کو اور سپاہیوں کو محل سے باہر کر دو۔ اگر وہ باہر آ کر ہتھیار پھینک دیں گے تو انہیں ہلاک نہیں کیا جائے گا۔ صرف قیدی بنایا جائے گا۔ محل کے اندر صرف ملکہ رہیں گی۔ ہمارے سی ان سی اور چند افسران اندر جا کر ملکہ سے کچھ اہم معاملات طے کریں گے۔ پھر معاملات طے ہونے کے بعد ملکہ کو گرفتار نہیں کیا جائے گا۔ ہماری کوشش یہی ہوگی کہ ایک بھی گولی نہ چلے۔ آپ کو بھی سمجھنا چاہیے کہ کوئی مارا نہ جائے۔ امن و

امان سے اقتدار منتقل ہوجائے اور فوجی حکومت قائم ہوجائے۔''

دونوں مراد محل کے اندر تھے۔ چپ چاپ تماشا دیکھ رہے تھے۔ نگارا خانم تمام مسلح گارڈز اور سپاہیوں کو حکم دے رہی تھی کہ وہ محل سے باہر جائیں اور صدر دروازے سے نکلتے وقت ان کے سامنے ہتھیار پھینکتے جائیں۔ ان سب کو جان کی امان مل رہی ہے۔ انہیں بعد میں قید سے رہا کرالیا جائے گا۔

لیڈیز کانسٹیبل اور گارڈز زیادہ تھیں۔ وہ سب صدر دروازے پر ہتھیار پھینکتی ہوئی باہر جانے لگیں۔ نگارا اپنا تمام ضروری سامان پیک کررہی تھی۔ سی ان سی محمود اکبر اور سپر پاور کے درمیان سمجھوتا ہوگیا تھا۔ طے شدہ شیڈول کے مطابق دو گھنٹے کے اندر ایک چھوٹا طیارہ آنے والا تھا۔ نگارا ائرپورٹ جاکر اس طیارے میں بیٹھ کر جرمنی کے شہر فرینکفرٹ جانے والی تھی۔

مراد نے فون پر اسے مخاطب کیا۔ وہ نفرت سے اور بڑے غرور سے بولی۔ ''آئی ہیٹ یو۔ میں یہاں سے جارہی ہوں۔ جلد ہی تمہاری موت بن کر آنے والی ہوں۔''

وہ سرد لہجے میں بولا۔ ''تم محل سے باہر نہیں جاسکوگی۔''

وہ قہقہہ لگاتے ہوئے ادھر سے ادھر جاتے ہوئے بولی۔ ''میں ہوں ہر ہائی نس نگارا خانم۔ تم کیا جانو کہ میں نے اپنی طرف آنے والی موت کا رخ کس طرح پھیر دیا ہے۔''

''بے شک تمہیں جینا ہے اور دیکھنا ہے کہ نئی زندگی تمہیں کیسے جوتے مارنے والی ہے۔''

''اونہہ! میں تم سے بات کرنا بھی اپنی توہین سمجھتی ہوں۔''

''فون بند کرنے سے پہلے اچھی طرح سن لو۔ میں اسی محل میں موجود ہوں۔ یہاں تمہارے پاس کوئی نہیں آسکے گا۔ جو بھی آئے گا، اس کی شامت آجائے گی۔''

وہ فون بند کرکے سوچ میں پڑگئی۔ مراد کا چیلنج دماغ میں چبھ رہا تھا۔ اس نے کہا تھا' وہ محل سے باہر نہیں جاسکے گی اور یہ بھی کہا تھا کہ وہ محل کے اندر ہے۔ جو بھی نگارا کے پاس آئے گا، اس کی شامت آجائے گی۔

رنگ ٹون نے پھر اسے مخاطب کیا۔ سی ان سی کال کررہا تھا۔ اس نے کہا۔ ''ہم ملاقات کے لیے آرہے ہیں۔ ہم سے پہلے دس سپاہی محل کے اندر آکر تلاشی لیں گے۔ وہاں کوئی چھپ کر رہ سکتا ہے۔ پہلے ہم اطمینان حاصل کریں گے۔''

وہ بولی۔ ''مسٹر محمود اکبر! مجھے یہ شبہ ہے کہ مراد یہاں کہیں چھپا ہوا ہے۔''

وہ چونک کر بولا۔ ''او گاڈ! وہ محل کے اندر کیسے آیا؟ کیا آپ نے اسے محل میں دیکھا تھا؟''

''وہ صبح بالکونی کے راستے چھپ کر آیا تھا، پھر اچانک غائب ہوگیا تھا۔ میں سمجھ رہی تھی وہ بالکونی کے راستے چلا گیا ہے لیکن ابھی اس نے فون پر کہا ہے کہ یہاں محل کے اندر ہے۔ میرے پاس جو بھی آئے گا، اس کی شامت آجائے گی۔''

اس نے حقارت سے کہا۔ ''وہ بیوقوف اپنی مٹھی بھر سیکرٹ فورس کے بل پر آرمی کو چیلنج کررہا ہے۔ ٹھیک ہے' وہ محل میں ہے تو...... اس کی حرام موت اسی جگہ لکھی گئی ہے۔ فکر نہ کریں۔ ابھی ہمارے سپاہی آرہے ہیں۔''

تھوڑی دیر بعد ہی درجنوں مسلح سپاہی محل کے اندر آئے اور وہاں کے مختلف حصوں میں جاکر اسے تلاش کرنے لگے۔ ملکہ کی خواب گاہ میں بھی آکر وہاں کا ایک ایک گوشہ دیکھنے لگے۔ وہ دونوں مراد ان کے درمیان ٹہل رہے تھے۔

پھر وہ نگارا سے کچھ فاصلے پر آکر بیٹھ گئے۔ وہ کوئی ایسی حرکت نہیں کرنا چاہتے تھے جس سے یہ تاثر پیدا ہوتا کہ وہ کرامات دکھا رہے ہیں اور حضرت صلاح الدین اجمیری کے وسیلے سے انہیں روحانی قوتیں حاصل ہورہی ہیں۔ وہ ایسی روحانی صلاحیت کو ہمیشہ راز میں رکھنا چاہتے تھے۔

ایک افسر نے باہر جاکر سی ان سی سے کہا۔ ''محل کے کونے کونے میں دیکھا گیا ہے۔ مراد علی منگی نہیں ہے۔''

سی ان سی محمود اکبر چار ماتحت افسران کے ساتھ محل کے ڈرائنگ روم میں آیا۔ وہاں نگارا نے ایک ملکہ کی شان سے ان کا استقبال کیا۔ انہیں خوش آمدید کہا۔ حالات بدل گئے تھے۔ آرمی کے وہ افسران دشمن بن کر نہیں آئے تھے۔

سی ان سی نے نگارا سے کہا۔ ''ہم نے آپ سے دوستی اور سمجھوتا نہیں کیا ہے۔ چونکہ ہمیں یہاں حکومت کرنی ہے اور ہم سپر پاور کو ناراض نہیں کرسکتے تھے اس لیے آپ کو یہاں سے جانے کی اجازت دے رہے ہیں۔''

دوسرے افسر نے کہا۔ ''ابھی ایک گاڑی آپ کو یہاں سے لے جائے گی اور ائرپورٹ پہنچادے گی۔ وہاں آپ وی آئی پی روم میں......''

وہ چپ ہوگیا۔ رنگ ٹون پکار رہی تھی۔ سی ان سی نے بٹن دبا کر فون کو کان سے لگایا۔ دوسری طرف سے آواز سنائی دی۔ ''میں ہوں مراد علی منگی......''

یکلخت سی ان سی کے اعصاب میں کھنچاؤ پیدا ہوا۔ وہ سخت لہجے میں بولا۔ ''تم...... تم بہروپیے، مجرم، قاتل، شوٹر کب تک چھپتے رہو گے۔ تم ہماری ریاست میں مرنے کے لیے آئے ہو۔''

دونوں مراد ان سے کچھ فاصلے پر کھڑے ہوئے تھے۔ ان میں سے ایک فون پر بول رہا تھا۔ ''میں آرمی کے ہزاروں سپاہیوں کو موت سے بچانے آیا ہوں۔ ناحق جنگ لڑی جائے گی۔ ناحق خون بہے گا۔ اس لیے ہماری تمہاری تقدیر کا فیصلہ ابھی اسی محل کے اندر ہوگا۔ تمہارے ساتھ چار افسر ہیں۔ تم پانچوں اس محل سے باہر نہیں جاؤ گے۔ نگارا کے ساتھ قیدی بن کر رہو گے۔''

وہ طنزیہ انداز میں بولا۔ ''اچھا تو تم ہمیں یہاں قیدی بناؤ گے۔ پہلے سامنے تو آؤ۔ اپنی صورت تو دکھاؤ۔''

''دکھا رہا ہوں۔ اپنی دائیں طرف کھڑکی کو دیکھو۔''

اس نے فوراً ہی دائیں طرف گھومتے ہوئے دیکھا۔ مراد کھڑکی کے باہر کان سے فون لگائے اسے دیکھتا ہوا ایک طرف جاتا ہوا نظروں سے اوجھل ہوگیا۔ وہ دروازے کی طرف دوڑتا ہوا چیخنے لگا۔ ''اسے پکڑو۔ وہ کھڑکی کے پاس ہے۔ اسے دیکھتے ہی گولی مار دو۔''

وہ اور دوسرے افسر دوڑتے ہوئے دروازے سے باہر آئے۔ کئی سپاہی دوسری طرف سے دوڑتے ہوئے آرہے تھے۔ وہ کھڑکی کے پاس نہیں تھا۔ سی ان سی نے سپاہیوں سے کہا۔ ''وہ وہیں تھا۔ تم سب کہاں مر گئے تھے؟ دیکھو وہ کوریڈور سے دوسری طرف گیا ہوگا۔ کسی کمرے میں چھپ گیا ہوگا۔''

پھر محل میں سپاہیوں کی بھگدڑ شروع ہوگئی۔ ایک افسر نے دو سپاہیوں کو حکم دیا۔ ''نگارا خانم کا سامان باہر لے جا کر گاڑی میں رکھو۔ ہم آرہے ہیں۔''

اس کا سامان بہت زیادہ تھا کیونکہ وہ دوسرے ملک میں نامعلوم مدت کے لیے جارہی تھی۔ چار سپاہی سامان اٹھائے محل کے مختلف حصوں سے گزرتے ہوئے باہر جانا چاہتے تھے۔ وہ صدر دروازے کے قریب آئے تو اچانک ہی تڑاتڑ گولیاں چلنے لگیں۔

سامان لے جانے والوں کے پیروں کو نشانہ بنایا گیا تھا۔ وہ سامان سمیت گر پڑے۔ اس کے بعد وہ چاروں چلنے اور صدر دروازہ کھولنے کے قابل نہیں رہے تھے۔

کئی سپاہی دوڑتے ہوئے ادھر آئے لیکن ان زخمیوں کے قریب نہیں گئے۔ پہلے یہ معلوم کرنا چاہتے تھے کہ گولیاں چلانے والے کہاں چھپے ہیں؟

وہ پانچوں افسر بھی وہاں آکر چھپ گئے تھے۔ سپاہیوں سے کہہ رہے تھے۔ ''اسے ڈھونڈو۔ اس نے کہاں سے چھپ کر گولیاں چلائی ہیں۔''

فون سے رنگ ٹون ابھرنے لگی۔ سی ان سی نے اسکرین پر نمبر پڑھ کر معلوم کرلیا کہ مراد کال کررہا ہے۔ اس نے بٹن دبا کر اسے کان سے لگایا۔ وہی تھا۔ وہ کہہ رہا تھا۔ ''میں نے وارننگ دی تھی کہ نگارا خانم اور تم پانچ افسران باہر نہیں جاؤ گے۔ نگارا کا سامان بھی نہیں جائے گا۔''

وہ دہاڑتے ہوئے بولا۔ ''تم بھی باہر نہیں جاسکو گے۔ فوج تمہیں گولیوں سے چھلنی کردے گی اور یہاں ہم تمہیں زندہ نہیں چھوڑیں گے۔ بولو کب تک لڑو گے؟''

''جب تک فوج یہاں سے نہیں جائے گی۔ صدر دروازے کی طرف جانے والے مارے جائیں گے۔ چار سپاہیوں کی حالت زار دیکھنے کے بعد تمہارا باپ بھی دروازے کی طرف نہیں جائے گا۔ ان سپاہیوں پر رحم کھاؤ۔ انہیں حکم دو کہ نگارا کا سامان اور ہتھیار چھوڑ کر خالی ہاتھ طبی امداد کے لیے جائیں۔ تمہارا جو بھی سپاہی خالی ہاتھ یہاں سے جائے گا، میں اس پر گولی نہیں چلاؤں گا۔ میں کہہ چکا ہوں، صرف نگارا اور تم پانچ افسران یہاں قیدی بن کر رہو گے۔''

سی ان سی اور وہ چار افسران ایک دوسرے کو بے بسی سے دیکھ رہے تھے۔ انہیں یقین ہوگیا تھا کہ وہ باہر جانے کی جرأت نہیں کرسکیں گے۔ اس نے چاروں سپاہیوں سے کہا۔ ''تم سامان اور ہتھیار یہاں چھوڑ کر جاؤ گے تو تم پر گولیاں نہیں چلائی جائیں گی۔ فوراً فرسٹ ایڈ کے لیے جاؤ۔''

وہ چاروں یہ سنتے ہی سب کچھ چھوڑ کر لنگڑاتے ہوئے صدر دروازہ کھول کر باہر چلے گئے۔ باہر سے کوئی اندر آنے کی ہمت نہیں کررہا تھا۔ وہ فون کے ذریعے پوچھ رہے تھے کہ محل میں گولیاں کیوں چل رہی ہیں؟ کیا ہمیں اندر آنا چاہیے۔

ایک افسر فون پر انہیں اندر آنے سے منع کررہا تھا اور وہاں کے حالات بتا رہا تھا۔ محل میں جتنے سپاہی تھے، وہ سب صدر دروازے کی طرف آگئے لیکن دروازے سے بہت دور رہ کر ادھر ادھر چھپے ہوئے تھے۔ انتظار کررہے تھے کہ مراد کی ذرا سی بھی آہٹ ملے گی تو فائرنگ شروع کردیں گے۔

ایسے وقت بجلی چلی گئی۔ پنکھے بند ہوگئے۔ گھپ اندھیرا چھا گیا۔ مراد نے فون پر کہا۔ ''میں نے مین سوئچ آف کردیا ہے جو اسے آن کرنے جائے گا، وہ مارا جائے

گا۔ یہ نہ سمجھنا کہ میں یہاں اکیلا ہوں۔ میری سیکرٹ فورس کے جاں نثار بھی ہیں۔ تم میں سے کوئی اندھیرے میں انہیں دیکھ نہیں سکے گا۔''

وہ بری طرح پنجرے میں پھنس گئے تھے۔ دھیمی آواز میں ایک دوسرے سے بول رہے تھے۔ ''کیا تاریکی سے فائدہ اٹھا کر چپ چاپ فرش پر رینگتے ہوئے باہر جا سکتے ہیں؟''

یہ خطرہ مول لینے کی بات تھی۔ اگر مراد اور اس کے ساتھی تاریکی کے باوجود انہیں باہر جاتے ہوئے دیکھ لیتے تو زندہ نہ چھوڑتے۔

سی ان سی نے کہا۔ ''مراد! سمجھوتا کرو۔''

وہ بولا۔ ''یہ میں نے پہلے ہی کہا تھا۔ اقتدار حاصل کرنے کی خاطر سپاہیوں کو مرنے کے لیے آگے نہ بڑھاؤ۔ سمجھوتا اس طرح ہوگا کہ ابھی فوج کو بیرک میں واپس جانے کا حکم دو گے۔''

سی ان سی نے کہا۔ ''نہیں۔ سمجھوتا اس طرح ہوگا کہ ہم جو حکومت قائم کریں گے، اس میں تمہارا بھی حصہ ہوگا۔''

''میں یہاں کا تنہا خود مختار حکمران بننے والا ہوں۔ تم فوجی ہو۔ تمہیں فوجی ہی رہنا چاہیے لیکن میں تم پانچوں کو فوج میں بھی نہیں رہنے دوں گا۔ اس ریاست سے باہر کردوں گا۔''

''بکواس مت کرو۔ اگر ہم ضد میں آگئے تو آخری سانس تک تم سے لڑتے رہیں گے۔''

''تو پھر یہاں روشنی اور ہوا کے بغیر بھوکے پیاسے لڑتے رہو۔ اگر کوئی کچن کی طرف جائے گا تو مارا جائے گا۔''

''تو پھر انتظار کرو۔ صبح ہوتے ہی ہم دن کی روشنی میں تم سے نمٹ لیں گے۔''

ایسے وقت دوسرا مراد ان کے پیچھے آگیا تھا۔ گہری تاریکی میں ہاتھ کو ہاتھ سجھائی نہیں دے رہا تھا لیکن وہ تو اندھیرے میں آواز کی سمت سچا نشانہ لیتا تھا۔ دو افسران دھیمی آواز میں ایک دوسرے سے کچھ بول رہے تھے۔

اس نے تڑاتڑ گولیاں چلائیں۔ دونوں کے حلق سے آخری چیخیں نکلیں۔ باقی زمین پر لیٹ کر فائر کرنے والے کی سمت اندھا دھند فائر کرنے لگے۔ وہ بھی دو افسران کو ہلاک کرتے ہی فرش پر لیٹ کر لڑھکتا ہوا شوٹنگ رینج سے دور نکل کر پھر وہاں سے اٹھ کر دوسری طرف چلا گیا تھا۔

دوسرے مراد نے فون پر کہا۔ ''تم دن کی روشنی کا انتظار کر رہے ہو۔ حساب کرو، تمہارے کتنے ساتھی افسر مارے گئے ہیں؟ کیا تم لوگ اس رات کی صبح دیکھ سکو گے؟''

انہیں چپ لگ گئی تھی۔ دو افسروں کی موت نے اس کے حوصلے کو پست کر دیا تھا۔ اسے مراد کا طریقہ کار سمجھ میں آرہا تھا۔ وہ کسی سپاہی کو نقصان نہیں پہنچا رہا تھا۔ صرف پانچ افسروں سے دشمنی کر رہا تھا۔ ان میں سے دو کم ہوگئے تھے اور اس کی جنگی مہارت سمجھا رہی تھی کہ باقی تین بھی صبح تک اٹھ جائیں گے۔

وہ تینوں دو لاشوں کے پاس فرش پر لیٹے ہوئے تھے۔ وہاں خطرہ تھا۔ وہ پھر گولیاں چلا سکتا تھا۔ وہ چاروں ہاتھ پاؤں سے رینگتے ہوئے جگہ بدلنے لگے۔ اندھیرے میں وہاں رکھے ہوئے صوفوں سے اور الماریوں سے ٹکراتے ہوئے دور جانے لگے۔

وہ سوچ بھی نہیں سکتے تھے کہ وہ ہتھیاروں کا کھلاڑی اگلے لمحے میں کیا کرنے والا ہے؟ جو نہیں سوچا تھا، وہ ہوا۔ اچانک ہی ایک مراد نے مین سوئچ کو آن کیا۔ دوسرا مراد ان سے کچھ فاصلے پر تھا جیسے ہی وہ نظر آئے، اس نے بڑی پھرتی سے دو گولیاں چلائیں۔ ادھر دوسرے مراد نے دو فائر کی آواز سنتے ہی پھر مین سوئچ کو آف کردیا۔ پھر گہری تاریکی چھاگئی۔

سی ان سی نے اپنی آنکھوں سے دو ساتھی افسروں کو گولیاں کھاتے ہوئے اور پھڑ پھڑاتے ہوئے دیکھا تھا۔ پھر تاریکی ہوتے ہی وہ چیخ پڑا۔ ''بس ہتھیار ڈال رہا ہوں۔ مراد اور گولی نہ چلاؤ۔ فار گاڈ سیک، مجھے تمہارے مطالبات منظور ہیں۔''

مراد جواب دے کر اپنی آواز کی سمت بتانے کی غلطی نہیں کر سکتا تھا۔ اس نے دور جا کر اسے کال کی۔ فون پر کہا۔ ''اپنے ہتھیار پھینکو۔ سپاہیوں کو حکم دو کہ وہ دروازہ کھول کر باہر چلے جائیں۔ اگر کوئی باہر سے اندر آئے گا تو اسی وقت تمہیں گولی مار کر جہنم میں پہنچا دوں گا۔''

وہ سپاہیوں کو حکم دینے لگا کہ وہ سب محل سے باہر چلے جائیں اور باہر سے کسی کو اندر نہ آنے دیں۔ مراد نے کہا۔ ''ایک سپاہی سے بولو ہتھکڑیاں لے کر یہاں آئے۔''

اس کے حکم کے مطابق ایک سپاہی ہتھکڑیاں لا کر موبائل فون کی ٹارچ کی روشنی میں سی ان سی کے سامنے رکھ کر چلا گیا۔ محل سپاہیوں سے خالی ہوگیا۔ وہاں صرف دو قیدی رہ گئے سی ان سی اور نگارا خانم۔ وہ دونوں سمندر تھے۔ اب جھاگ بن کر رہ گئے تھے۔

مراد نے سی ان سی کو ہتھکڑی پہناتے ہوئے کہا۔ ''تم دونوں کو یہ غرور تھا کہ ایک تنہا آدمی کو کچل دو گے۔ دیکھو میں تنہا ہوں اور تمہارے پیچھے پوری فوج ہے۔ عبرت حاصل کرو۔''

سی ان سی نے کہا۔ ”بے شک تم نے ناممکن کو ممکن کر دکھایا ہے۔ تنہا ہو کر پوری فوج کو ہتھیار ڈالنے پر مجبور کر رہے ہو۔ میں وعدہ کرتا ہوں، پوری فوج کے ساتھ بیرک میں واپس چلا جاؤں گا۔ پہلے کی طرح اپنے فرائض انجام دوں گا۔“

نگارا کا سر جھکا ہوا تھا۔ اس نے کہا۔ ”میں نے تمہارے جیسے دلیر جوان کی قدر نہیں کی۔ میں ساری زندگی پچھتاتی رہوں گی۔ پلیز مجھے معاف کر دو۔“

اس نے کہا۔ ”مجھے کیا کرنا ہے، وہ آگے معلوم ہوتا رہے گا۔ رات کے گیارہ بج رہے ہیں۔ پہلے میں نماز پڑھوں گا۔ فون پر اپنے ماتحت افسروں سے کہو وہ بھی نمازیں پڑھیں۔ اس کے بعد اس ریاست کی تقدیر کا فیصلہ سنایا جائے گا۔“

سی ان سی نے فون پر اپنے ماتحتوں سے یہی بات کی۔ مراد نے اسے کمرے میں لے جا کر اس کی ہتھکڑیاں کھولیں پھر کہا۔ ”آزادی سے نماز پڑھو۔ وہ معبود وہ پاک پروردگار ہم سب کی قسمت کے فیصلے کرنے والا ہے۔“

اس نے کمرے کے دروازے کو باہر سے بند کر دیا۔ نگارا کو بھی دوسرے کمرے میں بند کر کے نماز پڑھنے کی ہدایت کی پھر ایک اور کمرے میں دونوں مراد اپنے درمیان فاصلہ رکھ کر نماز کے لیے کھڑے ہوئے تو حضرت صلاح الدین اجمیری آ کر عبادت میں شریک ہو گئے۔ جل جلالہٗ و جل شانہٗ وہی معبود ہے۔ وہی رب عظیم ہے۔ بڑا جلال والا ہے۔ بڑی شان والا ہے۔

جب وہ معبود کسی کو کمزور بناتا ہے تو اس میں ہاتھ پاؤں ہلانے کی بھی سکت نہیں رہ جاتی۔ جب وہ قوت عطا فرماتا ہے تو بندہ گدھا گاڑی سے اچھل کر تختِ حکمرانی پر آ جاتا ہے۔

دونوں مراد بابا اجمیری کے دائیں بائیں نماز ادا کر رہے تھے۔ اللہ تعالیٰ بابا اجمیری کے وسیلے سے اور نماز کے وقت ان کی موجودگی سے مراد کو نادیدہ ہونے، پھر نظر آ جانے کی کرامات سے نواز رہا تھا۔ دنیا کے ہر فرعون کو زیر کرنے کے لیے ایک عصائے موسیٰ لازمی ہو جاتا ہے۔

نماز یا تو اللہ تعالیٰ کے خوف سے پڑھی جاتی۔ یا رب کریم کے احسانات کا ممنون و شکر گزار ہو کر پڑھی جاتی ہے یا پھر سر پر تلوار لٹکی ہو تو بندہ خدا کو پکارتا ہے۔

نگارا خدا کو نہیں سپر پاور کو پکار رہی تھی۔ وہ فون پر اسے تسلیاں دے رہا تھا کہ مراد علی منگی سے بھی سودا کر کے اسے زندہ سلامت رکھا جائے گا اور اسے کسی دوسرے ملک میں پناہ لینے کے لیے وہاں سے لایا جائے گا۔

سی ان سی محمود اکبر نے بھی نماز نہیں پڑھی۔ وہ اس کمرے میں بھٹک رہا تھا۔ فرار ہونے کا راستہ ڈھونڈ رہا تھا۔ اس کے ذہن میں یہ بات تھی کہ ابھی مراد اور اس کے ساتھی عبادت میں مصروف ہوں گے۔ اسے فرار ہونے سے روکنے والا کوئی نہ ہوگا۔ دروازہ کھل جائے، کھڑکی ٹوٹ جائے۔ دیوار سے گزرنے کے لیے شگاف پڑ جائے۔ کچھ ہو جائے کہ وہ وہاں سے نکل بھاگے لیکن تخریبی ذہن رکھنے والوں کے ساتھ کبھی کوئی معجزہ نہیں ہوتا۔

مراد نے دروازہ کھول کر پھر اسے ہتھکڑی پہنا دی پھر دونوں قیدیوں کو لے کر بالکونی میں آ گیا۔ محل کے احاطے کے باہر دائیں سے لے کر بائیں تک مسلح فوجی نظر آ رہے تھے۔ ان کے پاس عام اسلحے کے علاوہ کلاشن کوف، مشین گنیں اور راکٹ لانچرز تھے۔ کمانڈر یا جنرل کا حکم ملتے ہی حملہ کرنے والے تھے۔

وہ جو ہر ہائی نس ملکہ کہلاتی تھی، ایک قیدی کی حیثیت سے پوری فوج کے سامنے اپنی ذلت محسوس کر رہی تھی۔

تمام فوجی اپنے کمانڈر کو ہتھکڑیوں میں دیکھ کر مراد کے خلاف بولنے لگے۔ اس کی آزادی کا مطالبہ کرنے لگے۔ مراد نے میگا فون کے ذریعے کہا۔ ”خاموش ہو جاؤ۔ اپنی ریاست کی اور سرحدوں کی رکھوالی کرنے والو......! اپنے فرائض ادا کرنے کے لیے بیرک میں جاؤ۔ فوجی حکومت کے خواب دیکھنا چھوڑ دو۔“

ایک مشین گن کے پاس کھڑے ہوئے جنرل نے کہا۔ ”ہم اپنی ریاست پر عورتوں کی حکمرانی نہیں چاہتے۔ یہاں فوجی حکومت قائم ہو کر رہے گی۔“

مراد نے پوچھا۔ ”کیا تم لوگ اپنے کمانڈر ان چیف کی سلامتی نہیں چاہو گے؟ اگر بیرک میں واپس جاؤ گے تو میں اسے زندہ سلامت رہنے دوں گا۔“

فوجی جنرل نے کہا۔ ”شکست کھانے والا، ہتھکڑیاں پہننے والا سپاہی اب ہمارا کمانڈر نہیں رہا ہے۔ اسے گولی مار دو۔ اب میں فوج کو کمانڈ کر رہا ہوں۔ اگر اپنی سلامتی چاہتے ہو تو ہتھیار پھینک کر باہر آ جاؤ۔“

سی ان سی محمود اکبر پریشان ہو کر یہ باتیں سن رہا تھا۔ ایسے ہی وقت ایک گولی آ کر لگی۔ مراد نگارا کا بازو پکڑ کر کھینچتا ہوا شوٹنگ رینج سے دور ہو گیا۔ محمود اکبر گولی کھا کر گرتے گرتے بالکونی کی ریلنگ پر جھک گیا۔ پھر اور دو گولیاں آ کر اسے

لگیں۔ وہ بے جان ہوکر بالکونی کے باہر گارڈن میں چلا گیا۔
جنرل میگا فون کے ذریعے کہہ رہا تھا۔ ''مراد علی منگی! تو نے دیکھ لیا۔ جسے یرغمال بنا کر ہمارے ہتھیار گرانا چاہتا تھا، اسے ہم نے ہی ختم کردیا ہے۔ اب چال چلنے کے لیے تیرے پاس کوئی ترپ کا پتا نہیں ہے۔ ناقابل شکست کہلانے والے سورما! تو اپنے ہی پنجرے میں پھنس گیا ہے۔ ہم پندرہ منٹ کی مہلت دیتے ہیں۔ ہتھیار پھینک کر نگارا کے ساتھ باہر آجا۔ یہاں تجھے آسان موت ملے گی۔ پندرہ منٹ کے بعد حملہ شروع ہوگا۔ دیکھتے ہی دیکھتے یہ محل کھنڈر ہوجائے گا اور یہ کھنڈر بدنام زمانہ مراد علی منگی کا مقبرہ کہلائے گا۔ ارے او دو کوڑی کے مجرم ...... ! گھڑی دیکھ۔ ہم نے اپنی اسٹاپ واچ کو آن کردیا ہے۔''
مراد نے فون پر کہا۔ ''بلے! ٹھیک پانچ منٹ کے بعد حملہ کرو۔ تمام جاں نثاروں کی گھڑیوں سے وقت ملاؤ۔ تم سب ایک ہی وقت میں زلزلہ بن جاؤ۔ انہیں سنبھلنے نہ دو۔''
وہ فون بند کرکے نگارا سے بولا۔ ''کسی کمرے میں جاکر بیٹھ جاؤ۔''
یہ کہتے ہی وہ دوڑتا ہوا ایک کوریڈور میں مڑ کر اس کی نظروں سے اوجھل ہوکر دوسرے مراد کے پاس آگیا۔ وہ دونوں محل سے باہر آکر فوج کو کمانڈ کرنے والے جنرل کے پاس پہنچ کر ایک جگہ آرام سے بیٹھ گئے۔
ایک ماتحت افسر اس سے کہہ رہا تھا۔ ''سر! اب تک یہی سنا ہے کہ وہ کسی کی گرفت میں نہیں آتا ہے۔ کتنے ہی مضبوط شکنجے میں ہو بڑی چالاکی سے نکل جاتا ہے۔''
جنرل نے کہا۔ ''یہاں کوئی چالاکی کام نہیں آئے گی۔ محل کو چاروں طرف سے گھیر لیا گیا ہے اور ہم جانتے ہیں کہ محل کے اندر کوئی چور راستہ، تہ خانہ یا سرنگ نہیں ہے۔''
وہ دونوں وہاں سے اٹھ کر احاطے کے آہنی گیٹ کے پیچھے آگئے۔ چند سیکنڈ کے بعد وہاں زبردست دھماکا ہوا جہاں فوجی راکٹ لانچر لیے کھڑے ہوئے تھے۔ پہلے وہاں موجود دور مار ہتھیاروں کو ضائع کرنا تھا۔ تمام فوجی ادھر سے بھاگنے لگے۔ وہ سب دوسری طرف گھوم گئے کیونکہ کہیں پیچھے سے حملہ ہوا تھا۔
انہیں سمجھنے میں ذرا دیر لگی کہ حملہ کہاں سے ہوا تھا۔ پہلے حملے کے بعد ہی دوسرا حملہ ہوا۔ بلے اور جاں نثار ادھر حملے کررہے تھے، جدھر راکٹ لانچر رکھے ہوئے تھے تاکہ وہ جواباً کوٹھیوں کی طرف دور مار ہتھیار استعمال نہ کرسکیں۔
وہ ایک لمحے کی دیر نہیں کررہے تھے۔ مسلسل چار حملے کرنے کے بعد وہ سب دوڑتے ہوئے ان کوٹھیوں سے نکل گئے...... وہ جانتے تھے کہ باقی راکٹ لانچر جو دشمنوں کے پاس رہ گئے ہیں ان سے حملے کیے جائیں گے۔ اس وقت تمام فوجی فائر کرتے ہوئے مختلف کوٹھیوں کی طرف بڑھ رہے تھے۔
ایسے ہی وقت دونوں مراد نے ان کے پیچھے فائر کیے کئی سپاہی گولیاں کھا کر گرے۔ ان میں سے کئی پلٹ کر پیچھے دیکھنے لگے۔ یہ مات کھانے والی یا میدان چھوڑ کر بھاگنے والی بات تھی۔ کیونکہ خلافِ توقع سامنے سے اور پیچھے سے حملے ہونے لگے تھے۔ وہ فوج دو طرفہ حملوں کے درمیان آگئی تھی۔
یہ حیران کرنے اور پریشان کرنے والی بات تھی کہ پیچھے سے حملہ کرنے والے نظر نہیں آرہے تھے۔
رات کی نیم تاریکی میں کانٹے کا مقابلہ ہورہا تھا۔ فوجی سامنے والوں سے مقابلہ کررہے تھے۔ وہ دونوں تمام افسران کو نشانہ بنارہے تھے۔ پھر اس جنرل کو بھی جہنم میں پہنچادیا جو پوری فوج کا کمانڈر بنا ہوا تھا۔
پھر تو فوج کی کمر ٹوٹ گئی۔ کوئی ایک افسر بھی ان کی راہنمائی کے لیے نہیں رہا تھا۔ اچانک ان سب نے فائرنگ روک دی۔ ایک سپاہی نے میگا فون کے ذریعے چیخ کر کہا۔ ''سیز فائر۔ ہم سرینڈر کررہے ہیں۔ میرے ساتھیو! حرام موت نہ مرو۔ سلامتی اسی میں ہے۔ ہتھیار پھینک دو۔''
وہ ہتھیار پھینکنے لگے، بے شمار سپاہی مارے گئے تھے۔ ادھر بھی چار جاں نثار زخمی ہوئے تھے اور تین شہید ہوگئے تھے۔ بشریٰ بھی زخمی ہوئی تھی۔ دونوں مراد ان کے پاس پہنچ گئے تھے۔
وہ دونوں فوری طور پر ایک اسپتال کے اندر پہنچ گئے۔ انہوں نے زخمیوں کو ایک ایک بیڈ پر لٹایا۔ مراد نے ڈاکٹر کے پاس آکر کہا۔ ''فوراً اٹھو اور زخمیوں کو اٹینڈ کرو۔'' وہ مراد کو یعنی ملکہ کے شوہر کو دیکھتے ہی اٹھ کر کھڑا ہوگیا تھا۔ اس کے ساتھ چلتا ہوا بشریٰ کے پاس آیا۔ اس کے بازو میں گولی لگی تھی۔ وہ اندر پیوست نہیں ہوئی تھی۔ بازو کے گوشت کو ادھیڑتی ہوئی گزر گئی تھی۔
ایک نرس اور کمپاؤنڈر اس کی مرہم پٹی کرنے لگے۔ جاں نثار کی پسلی میں ایک گولی گھس گئی تھی۔ وہ تکلیف کی شدت سے بے ہوش ہوگیا تھا۔ ڈاکٹر نے کہا۔ ''سر! آپریشن کے ذریعے گولی نکالنی ہوگی۔ میں سرجن نہیں ہوں۔ ڈاکٹر صمد میرے کال کرنے سے نیند سے اٹھ کر نہیں

آئے گا۔ آپ اسے کال کریں۔''

''او کے تم پتا اور نمبر بتاؤ میں دیکھتا ہوں۔'' مراد نے کہا۔

وہ تیزی سے چلتا ہوا باہر چلا گیا۔ تمام زخمی جاں نثار بھی اسپتال آ گئے تھے۔ وہ سب بری طرح زخمی تھے۔ ایک ہی سرجن بیک وقت ان کا آپریشن نہیں کر سکتا تھا۔

ان دونوں نے مزید سرجنز کو بھی اسپتال آنے پر مجبور کر دیا۔ بلاّ اور دیگر جاں نثاروں کو وہاں بلایا گیا۔ ان سے کہا گیا کہ وہ اسپتال کے اندر باہر مستعد رہیں۔ مخالفین وہاں آ کر پرابلم بن سکتے ہیں۔

وہ دونوں مصروف ہو گئے تھے۔ انہیں ہتھیار ڈالنے والے سپاہیوں پر بھی توجہ دینی تھی۔ وہ شکست کھانے اور بیرکوں میں واپس جانے کے بعد پھر دشمنوں کے بہکانے اور بھڑکانے میں آ سکتے تھے۔ پولیس ڈیپارٹمنٹ پر بھی کڑی نظر رکھنی تھی۔ وہ غیر ملکی خفیہ ایجنسیوں کے ساتھ مل کر مراد کے خلاف عوام میں بے اعتمادی پیدا کرنے کی مہم چلا سکتے تھے۔

سپر پاور اور دوسرے بڑے ممالک ریاست میں خانہ جنگی سے فائدہ اٹھا کر وہاں اپنی فوجیں اتار سکتے تھے لیکن وہ سیاسی مہارت سے کام لے رہے تھے۔ سیاست میں ڈوبتے سورج کو کوئی نہیں پوچھتا۔ چڑھتے سورج کا استقبال کیا جاتا ہے۔

وہ تمام ممالک ٹیلیفون کے ذریعے مراد علی منگی کو آئندہ حکمران بننے کی مبارک باد دے رہے تھے۔ پچھلی شام سپر پاور کا ایک فورسیٹر ہوائی جہاز ملکہ نگارا خانم کو لینے آیا تھا۔ وہ اب تک ایک رن وے پر کھڑا ہوا تھا۔ دو جاں نثار وہاں کے حالات سے باخبر رہنے کے لیے محل میں موجود تھے۔ مراد نے ان کے پاس آ کر نگارا کو بلا کر کہا۔ ''تم آزاد ہو۔ ایک جہاز رن وے پر موجود ہے۔ تم جا سکتی ہو۔''

اس کا سامان ایک گاڑی میں پہنچا دیا گیا۔ مراد نے کہا۔ ''تمہارے آگے پیچھے سیکیورٹی نہیں ہوگی۔ خود ہی گاڑی ڈرائیو کر کے ائرپورٹ جاؤ۔''

وہ اپنی خیر منا رہی تھی۔ کسی سیکیورٹی کے بغیر فوراً ہی گاڑی ڈرائیو کرتی ہوئی وہاں سے چلی گئی۔ اس نے جاں نثاروں سے کہا۔ ''اسپتال جاؤ، اس محل کو چھوڑ دو۔ فی الحال ان لیڈیز سیکیورٹی گارڈز کو یہاں رہنے دو۔ جنہوں نے جان کی امان پانے کے لیے فوج کے سامنے ہتھیار ڈال دیے تھے۔ ان عورتوں کو مسلح نہیں رہنا چاہیے اور محل کے اندر ایک بھی اسلحہ نہ رہنے دو۔''

ہم زاد فوجیوں کے درمیان کئی بیرکوں میں پہنچ رہا تھا۔ ان کی باتیں سن رہا تھا۔ وہ سب مراد سے مرعوب تھے اور یہ سب ہی کہہ رہے تھے کہ اگر وہ فولادی انسان حکمران بنے گا تو اس کے وفادار بن کر رہیں گے۔

بلا آئی جی آف پولیس کو ایک چوراہے پر لے آیا تھا۔ وہاں جاں نثاروں نے اسے الٹا لٹکا دیا تھا اور ایک بڑے سے سیاہ بورڈ پر واضح الفاظ میں لکھا تھا۔ ''جو مراد علی منگی کی مخالفت کرے گا، اس کا یہی انجام ہوگا۔ دن کے ٹھیک بارہ بجے اسے گولی ماردی جائے گی۔ وارننگ دی جاتی ہے، کوئی اس مردود کے قریب نہ آئے۔''

آرمی ہیڈ کوارٹر کے ایک کمرے میں چار سپاہی اور دو مختلف ممالک کی خفیہ ایجنسی سے تعلق رکھنے والے انگریز بیٹھے باتیں کررہے تھے۔ اب آرمی میں کوئی چھوٹا بڑا افسر زندہ نہیں رہا تھا۔ وہ دونوں ایجنٹ ان سپاہیوں سے کہہ رہے تھے کہ وہ فوج کی کمان سنبھال لیں، سی ان سی اور فوج کے جنرل بن جائیں۔

ایک ایجنٹ نے کہا۔ ''مراد سے خوف زدہ نہ ہو۔ ہمارے ملک کی آرمی تمہاری پشت پناہی کرے گی۔ یہاں آکر تمہارے لیے مراد سے لڑے گی اور اسے کچل کر رکھ دے گی۔''

ایک سپاہی نے کہا۔ ''ہم نے فوج کے جنرل اور کمانڈر اِن چیف کا انجام دیکھا ہے اور عبرت حاصل کررہے ہیں۔''

دوسرے سپاہی نے کہا۔ ''مراد ایک ہے لیکن اپنی ذات میں پوری ایک فوج ہے۔ اب وہ ہمارا ہیرو ہے۔''

تیسرے نے کہا۔ ''اس نے عورتوں کی حکومت سے نجات دلائی ہے۔ فوجی حکومت معاشی اور اقتصادی ترقی کو پیچھے دھکیل دیتی ہے۔ مراد نے حکمران بننے والے فوجیوں کی ہلاکت کو عبرت کا نشان بنا دیا ہے۔''

چوتھے سپاہی نے کہا۔ ''اور ہم مراد کے خلاف سازش کیوں کریں؟ وہ ہمارا مسلمان بھائی ہے اور تم عیسائی اور یہودی تو ازل سے اسلام کے دشمن ہو۔ چلو اٹھو۔ جاؤ، یہاں سے۔''

مراد دروازے کے باہر کھڑا سن رہا تھا۔ وہ دروازہ کھول کر اندر آیا تو سب ہی نے چونک کر اسے دیکھا۔ چاروں سپاہیوں نے فوجی انداز میں اسے سیلیوٹ کیا۔ اس نے کہا۔ ''یہ دونوں تمہیں نہ بہکا سکے لیکن دوسرے سپاہیوں کے پاس جاکر ایسی ہی آگ لگانا چاہیں گے انہیں ہتھکڑیاں پہنا کر روی

شاہراہ کے چوک پر لے جاؤ۔ وہاں انہیں لٹکا دو۔''

انہوں نے اس کی ہدایت کو حکم مان کر تعمیل کیا۔ انہیں ہتھکڑیاں پہنا کر ایک چوک پر لا کر الٹا لٹکا دیا۔

وہ دونوں غیر ملکی ایجنٹ اپنے اپنے سفارت خانے میں بظاہر ملازم تھے۔ ان کے سفیروں نے احتجاج کیا۔ فون پر کہا۔ ''ان پر ناحق سازشی ہونے کا الزام لگایا گیا ہے۔ ان کے خلاف پہلے ثبوت پیش کیا جائے پھر انہیں سزائے موت دی جائے۔''

مراد نے کہا۔ ''میں خود مدعی ہوں، خود گواہ ہوں اور خود منصف ہوں۔ میرا فیصلہ منظور نہیں ہے تو اپنا سفارت خانہ سمیٹ کر یہاں سے چلے جاؤ۔''

دوسرے دن تمام شہری الٹے لٹکے ہوئے لوگوں کو دیکھتے ہوئے گزر رہے تھے اور یہ لکھا ہوا پڑھ رہے تھے کہ جو مراد علی منگی کی مخالفت کرے گا، اس کا یہی انجام ہوگا۔

دن کے بارہ بجے ان تینوں کو گولی ماردی گئی۔ وہ سزائے موت پانے والے جن ملکوں سے تعلق رکھتے تھے، ان ملکوں کے حکمران غصہ دکھا رہے تھے اور چیلنج کررہے تھے کہ مراد علی منگی کو اس ریاست کا حکمران بننے نہیں دیں گے۔

بلا اور تمام جاں نثار ریاست کے تمام اہم اداروں کو اپنے کنٹرول میں لے رہے تھے۔ آرمی کے بھی اسّی فیصد سپاہی مراد سے وفاداری کی قسمیں کھا رہے تھے۔ وہ بھی مراد سے مخالفت کرنے والوں کو سزائے موت دے رہے تھے۔

اخبارات کے ضمیمے شائع ہورہے تھے۔ ٹی وی اور ریڈیو کے ذریعے اعلان کیا جارہا تھا کہ ہز ہائی نس مراد علی منگی بعد نمازِ مغرب ریاست کے عوام کو مخاطب کریں گے۔

دو سپر پاورز کے لیے اور دیگر بڑے ممالک کے لیے وہ ریاست جغرافیائی اور سیاسی اعتبار سے بہت اہم تھی۔ اگر ایک سپر پاور اور اس کے حمایتی ممالک مراد سے دوستی نہ کرتے تو وہ دوسری سپر پاور کو دوست بنا لیتا۔ اس وقت مراد علی منگی سب ہی کے گلے میں ہڈی کی طرح اٹکا ہوا تھا۔ نہ وہ اسے اگلنا چاہتے تھے نہ نگلنا چاہتے تھے۔

اس نے شام تک آرمی، پولیس اور انٹیلی جنس کے شعبوں میں اعتماد حاصل کرلیا تھا۔ سب ہی دل و جان سے بلے کو اور تمام جاں نثاروں کو یقین دلا رہے تھے کہ وہ اپنے نئے حاکم اعلیٰ مراد علی منگی کے وفادار رہیں گے۔

مراد نے حضرت صلاح الدین اجمیری کے ساتھ نمازِ مغرب ادا کی پھر مراد اپنی ریاست کے ٹی وی چینل کے ذریعے تمام دنیا کے سامنے آگیا۔ اس نے کلام پاک کی

ایک آیت کی تلاوت کی پھر کہا۔ ”تمام قوتیں اور تمام قدرتیں اللہ تعالیٰ کی ہیں اور اللہ تعالیٰ پر ہی ختم ہیں... کوئی ذی روح یہ دعویٰ نہیں کرسکتا کہ وہ قوی ہے اور ناقابلِ شکست ہے۔ اس دنیا میں سب ہی کو شکست سے دوچار ہونا ہے۔ کسی دن میں بھی اپنی حکمرانی سمیت مٹی میں مل جاؤں گا۔ اللہ تعالیٰ ہم سب کو صراطِ مستقیم پر چلنے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین۔ اس ریاست سے ایک دورِ حکومت گیا۔ یہ نیا دور شروع ہو رہا ہے۔ میں اس ریاست سے باب النساء کا نام ختم کررہا ہوں۔ آج سے میری اور آپ کی اس ریاست کا نام ہوگا...... ارضِ اسلام۔“

ریاست کے لوگ اپنے اپنے ٹی وی کے سامنے تھے۔ وہ نعرے لگانے لگے۔ ارضِ اسلام زندہ باد۔ ارضِ اسلام پائندہ باد۔

اس نے کہا۔ ”حضرت صلاح الدین اجمیری میرے مرشد اور راہنمائے کامل ہیں۔ میں ان کے مقدس سائے میں ریاست کا ایک ادنیٰ خادم بن کر یہاں کی تمام ذمے داریاں سنبھالوں گا۔ میں اپنے عوام کا شکر گزار ہوں۔ وہ مجھ پر کامل اعتماد کرتے ہوئے مجھے ریاست کا حکمران تسلیم کررہے ہیں۔ میں واضح الفاظ میں کہہ دوں کہ جو مجھ پر اعتماد نہیں کررہے ہیں اور خفیہ طور پر میرے خلاف سازشیں کررہے ہیں، ان کی زندگی مختصر ہوگئی ہے۔ ایسے لوگ آئے دن شہر کے چوک میں الٹے لٹکائے جائیں گے۔ انہیں عوام کے سامنے گولی ماری جائے گی۔ میں تمام ممالک کے سفارت خانوں کے عملے کو پہلی اور آخری بار سمجھاتا ہوں کہ وہ رازداری سے تخریبی کارروائیاں کرنے والوں کی پرورش نہ کریں۔ آئندہ جس سفارت خانے سے تعلق رکھنے والے مجرم پکڑے جائیں گے، میں ان مجرموں کے ساتھ اس سفارت خانے کے سفیر اور اس کے سیکریٹری کو بھی گولیوں سے اڑا دوں گا۔ جس ملک کو میرا یہ سخت رویہ منظور نہیں ہے، وہ اپنا سفارت خانہ یہاں سے لے جائے۔ دنیا کے کئی ممالک مجھے مبارک باد دے رہے ہیں اور میری حکومت سے بہتر معاملات رکھنا چاہتے ہیں۔ ان تمام ممالک کے حکمرانوں سے گزارش ہے کہ وہ اپنے نمائندے بھیج کر مجھ سے معاملات طے کریں۔ جن سے دوستی ہوگی، ان حکمرانوں کو میں اپنی ریاست میں آنے کی دعوت دوں گا۔ انہیں خوش آمدید کہوں گا۔“

دنیا کے تمام ممالک کے حکمران اور سیاسی راہنما ٹی وی کے سامنے بیٹھے مراد کو دیکھ رہے تھے۔ جرائم کی دنیا سے تعلق رکھنے والے خطرناک لوگ اس کی باتیں سن رہے تھے اور کہہ رہے تھے۔ ”یہ جرائم کا زبردست کھلاڑی ہے۔ اس نے ملکہ سے شادی کرکے وہاں اپنے قدم جما کر اس حکمران عورت کو لات مار کر نکال دیا ہے۔ بہت ہی چالباز ہے۔ اب بلاشرکت غیرے صحیح معنوں میں ایک ریاست کا بادشاہ بن گیا ہے۔“

”سنا ہے اس نے وہاں کی پوری فوج سے تنہا جنگ لڑی ہے۔ یہ کیسے ہوسکتا ہے؟ عقل اسے تسلیم نہیں کررہی ہے۔“

”عقل تسلیم نہ کرے، اس نے ناممکن کو ممکن کردکھایا ہے۔“

ایک سپر پاور کی فوج ریاست کی مغربی اور جنوبی سرحدوں پر دو روز پہلے ہی آگئی تھی۔ بڑے ممالک اسی سپر پاور کے اتحادی تھے۔ ان کی فوجیں بھی بھاری اسلحہ اور گولہ بارود کے ساتھ وہاں آرہی تھیں۔ ریاست پر ہوائی حملے کی تیاریاں ہورہی تھیں۔

یہ خیال تھا کہ خانہ جنگی کے باعث ریاست کی آرمی کے تمام بڑے مارے گئے ہیں۔ وہ آرمی اب کھوکھلی اور کمزور ہوگئی ہے۔ اگر سپر پاور اور اس کے اتحادی منظم حملے کریں گے اور فضائی حملے بھی کیے جائیں گے تو وہ آرمی ہتھیار ڈال دے گی پھر مراد کو وہاں سے بھاگنے کا راستہ نہیں ملے گا۔

ریاست کی کمزور آرمی کو دیکھتے ہوئے انہیں فوراً ہی حملہ کرنا چاہیے تھا لیکن مراد نے پہلے تو تنہا چھ ہائی جیکرز کو زمین اور آسمان کے درمیان شکست دی تھی۔ اس کے بعد پوری آرمی سے تنہا جنگ کرکے دہشت طاری کردی تھی۔ سپر پاور اور اس کے اتحادی اسے تر نوالہ نہیں سمجھ رہے تھے۔ حملہ کرنے سے پہلے خوب سوچ رہے تھے، سمجھ رہے تھے۔

مراد نے سپر پاور کے سفارت خانے کے ذریعے وارننگ دی تھی کہ وہ بارہ گھنٹے کے اندر اپنی فوجیں سرحدوں سے ہٹالیں۔ ورنہ بری طرح پچھتائیں گے۔

اس نے بارہ گھنٹے کی مہلت اس لیے دی تھی کہ اسے اور اس کی سیکرٹ فورس کو دو راتوں سے سونا اور آرام کرنا نصیب نہیں ہوا تھا۔ وہ اچھی نیند لے کر تازہ دم ہونا چاہتے تھے۔ ادھر وہ انتظار میں تھے کہ دیکھیں، مراد بارہ گھنٹے بعد کیا بگاڑ لے گا۔ اچھا ہے اگر وہ پہلے حملہ کرے گا تو انہیں جوابی حملے کا معقول جواز مل جائے گا۔ بہرحال بارہ گھنٹے تک راوی چین و آرام لکھ رہا تھا۔

☆☆☆

وہ بارہ گھنٹے گزرنے تک ماروی اور محبوب کا ذکر ہوجائے کیونکہ مراد کے جتنے بھی دشمن ہیں ان کا رُخ ماروی

اور مراد کی طرف ہونے والا ہے۔
وہ دونوں اگرچہ آرام سے تھے لیکن آرام ذرا حرام بھی ہو رہا تھا۔ زندگی میں چھاؤں ملتی ہے تو دھوپ بھی ملتی ہے۔ سمیرا ان کے لیے پرابلم بن رہی تھی۔ وہ اپنے جائز حقوق کا مطالبہ کر رہی تھی۔
مطالبہ یہ تھا کہ وہ ماروی کو جتنا وقت دیتا ہے، اتنے ہی دن اور اتنی ہی راتیں اسے بھی دے۔ انصاف سے دیکھا جائے تو یہ اس کا جائز مطالبہ تھا۔ ''تم نے وعدہ کیا تھا کہ میں کبھی ماروی کو اپنی دلہن بناؤں گا تو تم اعتراض نہیں کروگی۔ اس سوکن کو فراخ دلی سے قبول کروگی۔''
وہ بولی۔ ''میں ماروی پر اعتراض نہیں کر رہی ہوں۔ شوہر جب دوسری شادی کرتا ہے تو دل پر پتھر رکھ کر سوکن کو قبول کرنا پڑتا ہے۔ میں قبول کر رہی ہوں۔ آپ سے صرف اپنے جائز حقوق مانگ رہی ہوں۔''
''تمہارا یہ مطالبہ میرے لیے مسئلہ بن گیا ہے۔ میں جہاں بھی ہوں، وہاں ماروی کو تنہا چھوڑ کر تمہارے ساتھ دن رات نہیں گزار سکوں گا۔ یہ وعدہ کرتا ہوں کہ ہر ماہ تین یا چار دنوں کے لیے تمہارے پاس آجایا کروں گا۔''
''میں خوب سمجھتی ہوں۔ آپ تین چار دن مجھے خیرات کے طور پر دینے آئیں گے۔ کوئی بات نہیں۔ آپ آئیں تو سہی۔ پلیز مجھے بتائیں کب آ رہے ہیں؟''
''میں کل کسی وقت بتاؤں گا۔''
اس نے فون بند کردیا۔ ماروی بزنس میتھڈ کی کتاب پڑھ رہی تھی اور سوکن سے ہونے والی باتیں بھی سن رہی تھی۔ اس نے کتاب کو بند کرتے ہوئے کہا۔ ''میں بھی خود غرض ہو کر سوچتی ہوں کہ آپ اسے طلاق دے دیں۔ اس طرح دوطرفہ الجھنوں سے نجات ملے گی لیکن یہ سراسر ظلم ہوگا۔''
''اگر ظلم نہیں کیا تو دو کشتیوں پر پاؤں رکھ کر کب تک کتنی دور تک جاسکوں گا۔ پانی میں ڈوب کے مرجاؤں گا۔''
''مریں آپ کے دشمن۔ یہ جواب دیں کہ سمیرا کو طلاق دینے کا کیا جواز ہے۔ کیا اس کی محنت اور دیانت داری کو بھول رہے ہیں۔ وہ آپ کی غیر موجودگی میں اربوں روپے کے کاروبار کو سنبھال رہی ہے۔ کیا آپ اسے محنت اور وفاداری کے صلے میں طلاق دیں گے؟''
اس نے دونوں ہاتھوں سے سر کو تھام لیا۔ ماروی اس کے پاس آکر بیٹھ گئی۔ اس کے سر کے بالوں میں انگلیاں پھیرتے ہوئے بولی۔ ''آپ پریشان نہ ہوں۔ آپ کے دل میں خوفِ خدا ہے۔ آپ سمیرا پر ظلم نہیں کریں گے۔ آپ کل یا پرسوں وہاں جائیں۔ صرف سمیرا کو ہی نہیں، آپ کے پھیلے ہوئے کاروبار کو بھی آپ کی ضرورت ہے۔''
وہ اسے آغوش میں لے کر بولا۔ ''پہلے میں کاروبار کو اہمیت نہیں دیتا تھا۔ تمہارے پیچھے اپنے بزنس سے غافل ہو گیا تھا۔ اب تمہیں عیش و آرام سے رکھنے کے لیے تمہیں بزنس فیلڈ میں دوسری سمیرا بنانے کے لیے کراچی جانا ہوگا۔ کسی بھی طرح اپنے کاروبار کو سنبھالنا ہی ہوگا۔''
''یہی میں چاہتی ہوں۔ آپ کم از کم ایک ماہ کے لیے ضرور جائیں۔ کاروبار پر بھرپور توجہ دیں۔ میں یہاں انیس عالم کی فیملی میں بہت محفوظ ہوں۔ میرے اکاؤنٹ میں دس لاکھ پاؤنڈز ہیں۔ میری تعلیم کے لیے گورنس اور ٹیچرز آتے ہیں۔ آپ مجھے ایک فرم میں جاب دلانے والے ہیں تاکہ بزنس کا عملی تجربہ حاصل ہوتا رہے۔ میں آپ کی غیر موجودگی میں بہت مصروف رہوں گی۔''
وہ اس کے بازوؤں سے نکل کر بولی۔ ''آپ میری فکر نہ کریں، مجھے دن رات یہاں مصروف رہنے دیں۔ اللہ نے چاہا تو دو ہی برسوں میں آپ کے بزنس کو سنبھالنے کے قابل ہو جاؤں گی۔ آپ مجھ پر فخر کریں گے۔''
''بے شک تم بڑی لگن سے محنت کر رہی ہو۔ مجھے یقین ہے تم ایک آدھ برس میں ہی بزنس کے معاملات میں میری دستِ راست بن جاؤ گی۔''
''انشاء اللہ یہی ہوگا۔ میں آپ کی توقعات پر پوری اتروں گی۔ آپ کی دستِ راست بننے کے لیے ہر ماہ آپ سے پندرہ بیس دن دور رہوں گی۔ پلیز آپ الجھنوں سے نکلیں اور کاروبار پر توجہ دیں۔ آپ سمیرا کو ہر ماہ پندرہ دن دیا کریں گے تو وہ خوش ہو جائے گی۔ آپ انصاف پسند کہلائیں گے۔''
محبوب نے اسی وقت ائرویز ایجنسی کو فون کیا اور پوچھا۔ ''کیا کراچی جانے کے لیے کل کسی فلائٹ میں سیٹ مل سکتی ہے؟''
دوسری طرف سے جواب ملا۔ ''پرسوں صبح چھ بجے کی فلائٹ میں مل جائے گی۔''
محبوب نے کہا۔ ''میں ابھی آن لائن پیمنٹ کر رہا ہوں۔ وہ سیٹ میرے لیے کنفرم کردیں۔''
اس نے فون بند کر کے ماروی کو اپنی طرف کھینچ لیا۔ اسے آغوش میں بھر کر بولا۔ ''میری جان! تم اتنے دنوں کی جدائی برداشت کروگی تو میں بھی کروں گا۔ تم اپنی آرزوؤں

اور ارمانوں پر جبر کروگی تو میں بھی یہی کروں گا۔ یہ صرف برس ڈیڑھ برس کی بات ہوگی۔ پھر تم مسز ماروی محبوب بن کر کراچی جاؤ گی۔ میرے بزنس کے معاملات میں سمیرا سے کسی طرح کمتر نہیں رہو گی۔"

وہ اس کے چہرے پر جھک گیا۔ ماروی اس کے چہرے کو چھو رہی تھی۔ چہرہ پھر بدل گیا تھا۔ محبوب اپنا پیدائشی چہرہ واپس لے آیا تھا۔ وہ اور مراد ہم شکل تھے۔

ایسے وقت ماروی کے اندر ہلچل سی مچی رہتی تھی۔ ایک ہی سوال چیختا تھا کہ وہ کس کی آغوش میں ہے؟ وہ محبوب کے بازوؤں میں ہے یا مراد اسے سمیٹ رہا ہے؟

☆☆☆

مراد نے رات کے نو بجے دشمنوں کو وارننگ دی تھی کہ وہ بارہ گھنٹے کے اندر اس کی سرحد سے اپنی آرمی کو ہٹا لیں۔ واپس چلے جائیں ورنہ بہت پچھتائیں گے۔ اس حساب سے صبح نو بجے بارہ گھنٹے پورے ہونے والے تھے۔

مراد کو بھی نیند آگئی۔ پھر ٹھیک دو بجے بیدار ہو کر حضرت صلاح الدین اجمیری کے ساتھ تہجد کی نماز ادا کی۔ ان کے ساتھ عبادت کرتے وقت اسے عجیب طرح کی روحانی مسرتیں حاصل ہوتی تھیں۔

عبادت کے بعد دونوں مراد محل کے ایک حصے میں آئے۔ وہاں سے دو بڑے تھیلے اٹھا کر پلک جھپکتے ہی اپنی ریاست کی سرحد پر پہنچ گئے۔ نیم تاریکی میں دور تک خیمے دکھائی دے رہے تھے۔ درجنوں سپاہی پہرا دینے کے لیے جاگ رہے تھے۔ انہوں نے سرحدی تار کانٹوں کو ہٹا دیا تھا۔ تاکہ کسی وقت بھی کسی رکاوٹ کے بغیر حملہ کرتے ہوئے سرحد کے اندر داخل ہو سکیں۔

وہ دونوں ان پہرا دینے والوں کے سامنے سے گزرنے لگے۔ وہ جاگ رہے تھے۔ ان کی آنکھیں کھلی ہوئی تھیں لیکن انہیں دیکھنے سے معذور ہو گئی تھیں۔ وہ دونوں خیموں کو قریب سے دیکھتے جا رہے تھے۔ ایک ایک خیمے میں چار چار سپاہی اپنے ہتھیاروں کو پاس رکھے ہوئے سو رہے تھے۔

ان دونوں کے بیگ میں ٹائم بم رکھے ہوئے تھے۔ جن خیموں میں سپاہی مشین گنوں اور راکٹ لانچروں کو قریب رکھے سو رہے تھے، انہوں نے وہاں ٹائم بموں میں پندرہ منٹ کا بلاسٹنگ ٹائم مقرر کر کے رکھ دیا۔

فوجیوں نے چار بڑے خیموں کو گولہ بارود اور اسلحے کا گودام بنایا تھا۔ وہ وہاں بھی ٹائم بم رکھ کر دو مشین گنیں اٹھا کر اپنی سرحد میں واپس آگئے۔

پندرہ منٹ گزرنے میں دیر نہیں لگی۔ یکبارگی کان پھاڑ دینے والے دھماکے ہوئے۔ اس لیے زمین ایسے لرز گئی تھی جیسے زلزلہ آگیا ہو۔

بے شمار سپاہیوں کے چیتھڑے اڑ گئے تھے۔ زخمی ہونے والوں کی چیخیں سنائی دے رہی تھیں۔ خیموں سے آگ کے شعلے لپک رہے تھے۔ سپاہی ادھر ادھر بھاگ رہے تھے۔ حملہ کرنے والے دشمن دکھائی نہیں دے رہے تھے۔ پہلے نیم تاریکی تھی۔ اب خیموں سے بھڑکتے شعلوں کی روشنی میں دور تک دکھائی دے رہا تھا۔

لیکن روشنی میں سب اپنے ہی تھے۔ حملہ کرنے والے نظر نہیں آرہے تھے۔ کچھ ایسے بوکھلائے ہوئے سپاہی تھے جو ریاست کی سرحد پار کر کے اندر آرہے تھے۔ ایسے وقت مراد اور ہم زاد نے مشین گنوں سے پہلا برسٹ مارا۔ مشین کی تڑاتڑ نے آنے والوں کو سنبھلنے نہیں دیا۔ گولیاں کھانے والے مرتے گئے۔ باقی واپس بھاگنے لگے۔ ان کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ کہاں جائیں۔ آخر وہ ہتھیار پھینک کر زمین پر لیٹ گئے۔ چھ ہزار سپاہی تھے۔ تقریباً ڈھائی ہزار مارے گئے۔ دو ہزار سے زیادہ زخمی ہوئے۔ ہزار یا ڈیڑھ ہزار وہاں سے بھاگنے میں کامیاب ہو گئے۔

سپر پاور کو اور اس کے اتحادیوں کو وہاں کی ہولناک تباہی اور ہزاروں فوجیوں کی ہلاکت کی خبریں مل رہی ہوں گی۔ اب وہ جھنجلا کر ہوائی حملے کرنا چاہیں گے۔ وہ سوچ رہے ہوں گے کہ مراد زمینی جنگ لڑ سکتا ہے۔ وہ ہوائی حملوں کو روک نہیں سکے گا۔ مراد خوب سمجھتا تھا کہ آگے کیا ہونے والا ہے؟

وہ ہم زاد کے ساتھ چشم زدن میں اتحادیوں کے اس ائربیس میں پہنچ گیا جہاں چار طیارے ہوائی حملے کے لیے تیار کھڑے تھے۔ وہاں آرمی کا سخت پہرا تھا۔ کوئی پہرا کوئی فولادی دیوار انہیں روک نہیں سکتی تھی۔ وہ ان چاروں جہازوں میں گھس کر وہاں ٹائم بم چھپا کر باہر آگئے۔

فون کی وائبریشن نے مراد کو متوجہ کیا۔ ایک نیا انجانا نمبر تھا۔ اس نے بٹن کو دبا کر اسے کان سے لگایا۔ دوسری طرف سے آواز آئی۔ "میں کمانڈر ان چیف بول رہا ہوں۔ کیا تم مراد ہو؟"

"ہاں مراد ہوں لیکن غصہ نہ دکھانا۔ میں نے پہلے ہی کہہ دیا تھا کہ تمہاری فوج میری سرحد سے نہیں جائے گی تو انجام کار انگاروں پر لوٹو گے۔ پچھتاتے رہو گے۔"

''تم نے فوج کو واپس جانے کے لیے بارہ گھنٹے کا ٹائم دیا تھا لیکن دھوکے باز ہو۔ مقررہ وقت سے پہلے ہی حملہ کر دیا۔''

''بارہ گھنٹے بعد بھی یہی ہوتا، جو ہو چکا ہے۔ سپاہیوں کو واپس جانے کے لیے سامان سمیٹنا چاہیے تھا لیکن وہ سب خواب خرگوش میں تھے۔ واپس جانے کا ارادہ نہیں تھا۔ ان کی آرام طلبی بتا رہی تھی کہ وہ تازہ دم ہو کر صبح حملہ کرنے والے ہیں۔''

''تم کیا سمجھتے ہو، ہم پیچھے ہٹ جائیں گے؟ ابھی تمہیں معلوم ہوگا کہ تمہارے لیے زمین پر جنگ لڑنا آسان تھا۔ اب فضائی حملے ہوں گے تو دیکھتے ہی دیکھتے اپنی پوری ریاست کے ساتھ نیست و نابود ہو جاؤ گے۔''

وہ لڑاکا طیارے رن وے پر دوڑتے ہوئے فضا میں بلند ہو گئے تھے۔ مراد نے کہا۔ ''دوربین آنکھوں سے لگاؤ اور اپنے اڑتے ہوئے پرندوں کو دیکھو۔''

اس کی بات ختم ہوتے ہی دور پرواز کرنے والا ایک طیارہ اچانک دھماکے سے ٹکڑے ہو کر فضا میں بکھر گیا۔ دوسرے تیسرے اور چوتھے طیاروں کو بھی تباہ ہونے میں دیر نہیں لگی۔ یہ ایسی لرزا دینے والی تباہی اور شکست تھی کہ فون بند ہو گیا۔

وہ دونوں کمانڈر ان چیف کے ڈرائنگ روم میں پہنچ گئے۔ وہ تین ماتحت افسروں کے ساتھ دوڑتا ہوا اپنے بنگلے کے برآمدے میں آیا۔ وہاں کئی مسلح سپاہی الرٹ کھڑے ہوئے تھے۔ اطلاع مل رہی تھی کہ چاروں لڑاکا طیارے فضا میں تباہ ہو گئے ہیں۔

سی ان سی چیخ رہا تھا۔ ''یہ کیسے ہو سکتا ہے۔ وہ طیارے اس ریاست سے سیکڑوں میل دور تھے۔ یہاں سے پرواز کرتے ہی کیسے تباہ ہو گئے۔ کیا پرواز سے پہلے ان طیاروں کو اچھی طرح چیک نہیں کیا گیا تھا؟''

وہ برآمدے میں پاؤں پٹختا ہوا ادھر سے ادھر گیا پھر بولا۔ ''دشمنوں نے طیاروں میں بم رکھ دیا تھا لیکن کیسے رکھا؟ ہمارا ہی کوئی افسر یا سپاہی مراد کا آلہ کار ہے۔ یہاں اس کے لیے کام کر رہا ہے۔ اسی نے...... ہاں اسی نے......''

ماتحت افسر نے کہا۔ ''کیا ہم یہ سمجھیں کہ مراد ہماری آرمی کے اندر پہنچا ہوا ہے۔ وہ ریاست یہاں سے دو ہزار کلومیٹر دور ہے۔ مراد کا نیٹ ورک کتنا مضبوط اور فعال ہے کہ وہ وہاں سے اپنے آلہ کاروں کو یہاں گائڈ کر رہا ہے اور وہ آلہ کار صحیح وقت پر صحیح کارکردگی دکھا رہے ہیں۔''

دوسرے افسر نے کہا۔ ''ریاست کی فوج خانہ جنگی کے باعث کمزور اور کھوکھلی ہو گئی تھی۔ پھر اس نے رات تین بجے کیسے منظم حملہ کیا تھا؟ ہمارے ہزاروں سپاہی مارے گئے۔ ہزاروں زخمی ہوئے ہیں۔ جو زندہ بچے وہ تمام اسلحہ چھوڑ کر بھاگ آئے، ریاست کی آرمی سے مقابلہ نہ کر سکے۔''

کمانڈر نے پریشان ہو کر کہا۔ ''سمجھ میں نہیں آ رہا ہے۔ وہ جرائم کی دنیا سے آنے والا بازی گر اب سیاسی اور عسکری محاذ پر دہلا رہا ہے۔ ہم نے صرف دو گھنٹے کے اندر ہزاروں سپاہیوں کے علاوہ کروڑوں ڈالرز کا نقصان اٹھایا ہے۔''

وہ سوچتا ہوا پھر ڈرائنگ روم میں واپس آیا۔ ایک ماتحت افسر نے کہا۔ ''کل رات اس نے اور اس کی سیکرٹ فورس نے تباہی مچائی تھی۔ خفیہ فورس میں جو شوٹر اور فائٹر ہیں، وہ بھی مراد کی طرح بہت ہی شارپ ہیں۔''

دوسرے افسر نے کہا۔ ''یہ دیکھیں کہ اس کا نیٹ ورک یہاں تک پھیلا ہوا ہے۔ ہمارے دوسرے اتحادی ملکوں میں بھی اس کے آلہ کار موجود ہوں گے۔ پہلے معلوم کرنا ہوگا کہ اس کی انڈر گراؤنڈ قوت کتنی ہے اور کہاں تک ہے؟''

کمانڈر نے سر ہلا کر کہا۔ ''ہاں...... وہ چھپا رستم ہے۔ پتا نہیں کس طرح جنگ لڑ رہا ہے؟''

اس کے فون سے رنگ ٹون ابھری۔ حاکم اعلیٰ اسے کال کر رہا تھا۔ اس نے کال اٹینڈ کرتے ہوئے کہا۔ ''سر! ہم بہت بری طرح شکست کھا چکے ہیں۔ وہ جرائم کی دنیا کا پروردہ ہے۔ اس نے بہت مضبوط نیٹ ورک قائم کیا ہے۔''

وہ حاکم اعلیٰ کو بتانے لگا کہ ایک ہی رات میں وہ کتنا زبردست نقصان اٹھا چکے ہیں۔ کسی دوسرے ملک کو اتنا نقصان پہنچتا تو اس ملک کی کمر ہی ٹوٹ جاتی۔ آئندہ مراد علی منگی کی طاقت کا صحیح اندازہ کرنے کے بعد اس پر حملہ کیا جائے گا۔

حاکم اعلیٰ نے کہا۔ ''بس کرو۔ تم نے فوجی قوت کو آزما کر صرف جانی اور مالی نقصان نہیں اٹھایا ہے، اس چھوٹی سی ریاست کے مقابلے میں سپر پاور کو شرمندہ بھی کیا ہے۔ آئندہ سیاسی حکمت عملی سے کام لیا جائے۔ ہم اس سے دوستی کریں گے۔ سمجھوتے کریں گے۔ سفارتی سطح پر تعلقات قائم کر کے اس کی حکمرانی کا تختہ کر دیں گے۔''

ان دونوں نے سپر پاور کے غبارے سے تھوڑی سی ہوا نکال دی تھی۔ وہ مان گئے تھے کہ مراد سے جنگ لڑنے میں نقصان ہے۔ وہ آئندہ سیاسی چالیں چلنے والے

تھے۔ مراد خوب سمجھتا تھا۔ ان کی سیاسی چالیں یہ ہوں گی کہ وہ بہ ظاہر دوستی اور محبت سے رہیں گے۔ ریاست کے لوگوں کو بڑی بڑی نوکریوں کا لالچ دے کر اپنے ملکوں میں بلائیں گے اور ان کا برین واش کر کے اپنا ہم خیال بنائیں گے۔ پھر ریاست میں بڑے بڑے پروجیکٹ کی تکمیل کے لیے اپنے انجینئروں، ڈاکٹروں کو اور مختلف شعبوں کے ہنر مند کاریگروں کو یہاں میں بھیجیں گے۔ وہ لوگ وہاں آ کر اندر ہی اندر مراد کی حکومت کی جڑیں کاٹیں گے۔

وہ دونوں مراد ریاست میں آئے تو صبح ہو چکی تھی۔ انہوں نے فون کے ذریعے فوج کے سپاہیوں سے کہا۔ ''جنوبی مغربی سرحدوں میں بے شمار اسلحہ پڑا ہے۔ وہ سب اٹھا کر لے آؤ۔''

پچھلی رات شہریوں نے بہت دور فائرنگ اور دھماکوں کی آوازیں سنی تھیں۔ سپاہیوں نے وہاں جا کر دشمنوں کی بے شمار لاشیں دیکھیں۔ حیران رہ گئے کہ یہ جنگ کس نے اور کیسے لڑی تھی؟ اور کب لڑی تھی؟

انہوں نے فون پر مراد سے پوچھا۔ اس نے جواب دیا۔ ''میری سیکرٹ فورس نے دشمنوں کا مقابلہ کیا تھا۔ یہ یاد رکھو، میں آرمی کے بغیر بھی بڑی طاقتوں کو شکست دے سکتا ہوں۔ اس لیے کبھی میرے خلاف بغاوت کرنے کی حماقت نہ کرنا۔''

وہ پہلے ہی اس سے مرعوب تھے۔ اب دور تک پڑی ہوئی لاشیں اور جلے ہوئے خیمے دیکھ کر توبہ کر رہے تھے کہ کبھی مراد کے خلاف کسی کی سازشوں میں شریک نہیں ہوں گے۔ اس کی کارکردگی اور کارنامے ایسے تھے کہ اس کے تابعداروں اور جاں نثاروں کی تعداد میں اضافہ ہو رہا تھا۔ سیکرٹ فورس بہت مضبوط ہوتی جا رہی تھی۔

دوسرے دن سپر پاور کے اعلیٰ حاکم کے سیکریٹری نے مراد سے فون پر کہا۔ ''میں دوستی اور خیر سگالی کے نیک ارادے سے آیا ہوں۔ آپ سے اہم گفتگو کرنا چاہتا ہوں۔''

مراد نے آواز بدل کر کہا۔ ''میں ہز ہائی نس مراد علی منگی کا پرسنل اسسٹنٹ ہوں۔ صاحب تم سے نہیں، اپنے برابر کے لوگوں سے بات کریں گے۔''

وہ جلدی سے بولا۔ ''جی ہاں۔ ہمارے حاکم اعلیٰ ہز ہائی نس سے اسکائپ کے ذریعے گفتگو کرنا چاہتے ہیں۔''

دس منٹ کے بعد ہی وہ ایک بڑی سی ٹی وی اسکرین پر ایک دوسرے کو آمنے سامنے دیکھ رہے تھے۔ مراد اپنے محل میں ایک تخت طاؤس جیسی شاہانہ کرسی پر بیٹھا ہوا تھا۔

سپر پاور کا حاکم اعلیٰ بھی ایک والیِ ریاست کے دباؤ میں رہ کر مذاکرات نہیں کرنا چاہتا تھا۔ اس لیے اپنی کرسی پر جلی ہوئی رسی کی طرح تن کر بیٹھا تھا۔

اس نے کہا۔ ''ہز ہائی نس مراد علی منگی! آپ پہلے کیا تھے اور کیا سے کیا ہو گئے ہیں۔''

مراد نے کہا۔ ''پہلے اور اب میں کوئی فرق نہیں ہے۔ میں پہلے بھی دشمنوں کے بارہ بجاتا تھا، اب بھی آئینہ دیکھیں۔ منہ پر بارہ بج رہے ہیں۔''

وہ ناگواری سے بولا۔ ''آپ کی یہ طنزیہ باتیں آدابِ گفتگو کے خلاف ہیں۔''

''پہلے آپ نے طعنہ دیا ہے کہ میں ایک معمولی انسان تھا اب غیر معمولی ہو گیا ہوں۔ اسے اور صاف الفاظ میں یوں کہنا چاہیے کہ پہلے میں ایک چھوٹا سا چابک تھا آج ڈنڈا بن گیا ہوں۔ بڑی طاقتوں کو جھکانے کے لیے مضبوط سے مضبوط تر بننا ہی پڑتا ہے۔ کل رات میری سرحد پر جو ڈنڈا پڑا ہے وہ آپ کو برداشت نہیں ہو رہا ہے۔ وہ چار طیارے فضا میں تباہ نہ ہوتے تو میری ریاست میں تباہی مچا دیتے۔ پھر تم فاتح بن کر فرعون بن کر مجھ سے بات کرنا بھی گوارا نہ کرتے لیکن اب مجبور ہو کر میرے پاس سمجھوتا کرنے آئے ہو۔''

''میں تمہاری طرح ہزاروں انسانوں کا لہو بہانا نہیں چاہتا۔ لہٰذا امن و امان کے لیے سمجھوتا کرنا چاہتا ہوں۔''

مراد نے کہا۔ ''ابھی میری فوج جارحانہ کارروائی کے لیے آپ کی سرحد پر جائے گی تو آپ بھی ہزاروں سپاہیوں کا لہو بہائیں گے۔ اس وقت آپ جائز ہوں گے۔ فی الحال میں جائز ہوں۔''

اسے ایسے جوابات مل رہے تھے جو سپر پاور کی عظمت اور شان و شوکت کے خلاف تھے۔ وہ اپنی کرسی پر پہلو بدلتے ہوئے بولا۔ ''اگر ہم نے تمام سفارتی تعلقات تم سے ختم کر دیے تو جانتے ہو کیا ہوگا؟''

وہ بہت ہی ٹھنڈے لہجے میں بولا۔ ''میں جمہوریہ چین سے دوستی کر رہا ہوں۔''

حاکم اعلیٰ کے دماغ کو جھٹکا سا لگا۔ وہ کرسی پر سیدھا ہو کر بیٹھ گیا پھر بولا۔ ''میں تم سے سفارتی تعلقات توڑنے کی بات نہیں کر رہا ہوں۔ ہم پچھلے پچاس برسوں سے اس ریاست کے بہترین دوست رہے ہیں اور ہر برے وقت میں کام آتے رہے ہیں۔''

''میرے برے وقت میں صرف میرا اللہ ہی کام آتا

ہے۔ میں نے تمام ممالک کے سفارت خانوں کو یہاں سے جانے کا حکم دیا ہے۔ پہلے میں اپنی ریاست کے معاملات کو کسی بیرونی امداد کے بغیر درست کروں گا۔ یہاں کے معاشی اور اقتصادی حالات کو مستحکم کروں گا۔ اپنی حکومت کی جڑیں مضبوط کروں گا۔ اس کے بعد بیرونی ممالک سے باہمی تعاون کی باتیں کروں گا۔''

حاکم اعلیٰ نے کہا۔ ''ریاست باب النساء زرعی ملک نہیں ہے۔ آپ کو اناج درآمد کرنے کے لیے ہمارے جیسے ممالک سے لین دین کے معاملات طے کرنے ہوں گے۔''

وہ بولا۔ ''میں نے یہاں سے اپنی پہلی تقریر میں ساری دنیا سے کہہ دیا تھا کہ اس ریاست کا نام باب النساء نہیں، ارضِ اسلام ہے۔ لہٰذا آپ ہماری ریاست کا نام یاد رکھیں۔ فی الحال ارضِ اسلام میں اناج کی فراوانی ہے۔ ہم آئندہ اناج درآمد کرنے کے لیے چین سے معاہدہ کریں گے۔ یہ لکھ لیں کہ آپ ارضِ اسلام کے لیے سپر پاور نہیں ہیں۔ سپر پاور صرف ہمارا واحد و لاشریک اللہ تعالیٰ ہے۔''

حاکم اعلیٰ نے غصے سے پیچ و تاب کھاتے ہوئے اسکائپ کو آف کر دیا۔ وہ کرسی سے اچھل کر کھڑا ہو گیا تھا۔ پیپر ویٹ اٹھا کر ٹی وی اسکرین پر مارتے ہوئے بولا۔ ''ہم اپنی سطح سے نیچے گر رہے ہیں۔ وہ گدھا گاڑی والا منہ لگانے کے قابل نہیں ہے۔ جتنی جلدی ہو سکے اسے کچل دینا ہو گا۔ ورنہ وہ پریس میڈیا اور الیکٹرونک میڈیا کے ذریعے ہماری توہین کرتا رہے گا۔ ہم ساری دنیا میں اپنی طاقت کا لوہا منوا رہے ہیں اگر اسے روکا نہ گیا، اسے جہنم میں پہنچایا نہ گیا تو ہم سپر پاور بن کر نہیں رہ سکیں گے۔''

وہاں اس کے کئی معتمدِ خاص اور دور کی کوڑیاں لانے والے مشیر بیٹھے ہوئے تھے۔ ایک مشیرِ اعلیٰ نے کہا۔ ''اگر آپ غصے سے تلملاتے رہیں گے، چیزیں توڑتے پھوڑتے رہیں گے تو مراد وہاں ہنستا رہے گا۔ پلیز آرام سے بیٹھ جائیں۔''

وہ غصے سے بولا۔ ''کیا آپ لوگوں کو توہین کا احساس نہیں ہو رہا ہے؟ وہ ریاست کا حکمران بنتے ہی ہمیں نیچے گرا رہا ہے۔''

''کسی کے گرانے سے ہم نہیں گریں گے۔ ہم سپر پاور ہیں۔ نہ ٹوٹنے والے ہیں نہ جھکنے والے ہیں۔ آپ آرام سے بیٹھیں۔''

اس کا غصہ کم نہیں ہو رہا تھا۔ وہ ناگواری سے ان کے قریب ایک صوفے پر بیٹھ گیا۔ ایک معتمدِ خاص نے کہا۔

''جرائم کی دنیا سے آنے والے نے پہلی بار سیاسی اور عسکری شطرنج کی بساط بچھائی ہے۔ ابھی ہمارے پیدل مہرے مارے گئے ہیں۔ ابھی چالیں چلنے کے لیے بے شمار مہرے ہماری بساط پر ہیں۔ وہ جلد ہی مراد کو شہ مات دیں گے۔''

حاکم اعلیٰ نے پوچھا۔ ''کیسے دیں گے؟ ہماری بساط میں کون سے مہرے اسے شہ مات دیں گے؟''

اس نے کہا۔ ''دو اہم مہرے ہیں۔ ماروی اور محبوب علی چانڈیو۔''

حاکم اعلیٰ صوفے پر بیٹھے بیٹھے سیدھا ہو گیا پھر بولا۔ ''مجھے رپورٹ ملی تھی کہ مراد کا ہم شکل لندن میں دیکھا گیا ہے۔''

ایک اور معتمدِ خاص نے کہا۔ ''تازہ ترین اطلاع یہ ہے کہ وہ کچھ دیر پہلے ائرپورٹ پر دیکھا گیا ہے۔ وہ پی آئی اے کی فلائٹ سے کراچی جا رہا ہے۔''

''پھر تو اس کے ساتھ ماروی بھی ہو گی۔''

''نہیں، وہ تنہا تھا۔''

''ماروی کو بھی لندن میں ہونا چاہیے۔ وہی مراد کی بہت بڑی کمزوری ہے۔ اسے وہاں تلاش کیا جا سکتا ہے۔''

''تلاش کرنے کی کیا ضرورت ہے؟ محبوب کو ٹریپ کیا جائے، اسے ٹارچر کیا جائے تو وہ اگل دے گا کہ وہ جانِ مراد جانِ محبوب کہاں چھپی ہوئی ہے؟''

''میرا مشورہ ہے، محبوب کو بڑی رازداری سے ٹریپ کیا جائے۔ جب تک ماروی ہمارے شکنجے میں نہ آئے، تب تک مراد کو خبر نہ ہو۔ وہ ہمارے ان اقدامات سے بالکل بے خبر رہے۔''

ایک نے گھڑی دیکھتے ہوئے کہا۔ ''ہم لیٹ ہو گئے ہیں۔ محبوب لندن سے جا چکا ہے۔ وہ کراچی پہنچنے والا ہے۔''

ایک مشیر نے کہا۔ ''جلدی نہ کی جائے۔ اسے کراچی پہنچنے دیں، انٹرپول اور سی آئی اے کی خدمات حاصل کی جائیں۔''

وہ سب اپنے اپنے فون پر نمبر پنچ کرنے لگے۔ ان میں سے کوئی انٹرپول کے زونل آفیسر کو کال کر رہا تھا کوئی سی آئی اے کے ڈائریکٹر سے بول رہا تھا اور کوئی سیکرٹ ایجنسی کی خدمات حاصل کر رہا تھا۔

حیرت انگیز واقعات، سحر انگیز لمحات اور سنسنی خیز گردشِ ایام کی دلچسپ داستان کا مزید احوال اگلے ماہ ملاحظہ فرمائیں

فرسٹ ڈلیوری

نوشابہ صدیقی

جیسے کوئی نیا کھیل ہو یا نئی دریافت وایجاد... ہر انسان کو متوجہ ضرور کرتی ہے...؛ اسی طرح ہر نیا تعلق انسان کو اندر سے مسرور کردیتا ہے۔ اسے بھی اس نئے رشتے میں بندھنے کی خوشی تھی مگر افسوس کہ یہ رشتہ اسے کچھ راس نہ آیا مگر اس رشتے کا احساس اسے بہت دور سفر پر لے گیا جہاں اس کی جستجو کا اختتام ہوگیا۔

محبتوں کے رشتوں میں گندھے ایک خوب صورت تعلق کا احساس

وہ کون تھا جس نے کہا تھا کہ پہلی نظر میں پیار ہو ہی نہیں سکتا۔

مجھے تو اس بچی سے پہلی نظر میں ہی پیار ہوگیا تھا۔ جب وہ دوڑتی ہوئی میرے پاس آئی۔ مجھے دیکھا۔ مسکرائی اور پاپا کہہ کر میرے گلے میں بانہیں ڈال دیں۔

میں ذرا سی دیر کے لیے تو حیران رہ گیا تھا پھر میں نے بھی بیٹا کہہ کر اسے اپنے سینے سے لگالیا۔

اس کا بھائی جو اس سے کچھ فاصلے پر کھڑا تھا، دوڑتا ہوا ہمارے پاس آگیا۔ وہ شاید اس بچی سے تین چار سال بڑا ہوگا۔ ”انکل۔ اس نے آپ کو اپنا بابا سمجھا ہے۔“

”ہاں تو کیا ہوا...... میں تم دونوں کا انکل ہوں بیٹا۔“

اس وقت میں شیخ فرید زنانہ اسپتال کے سامنے بیٹھا ہوا

تھا۔ آج میری بیٹی عارفہ کے یہاں فرسٹ ڈیلیوری ہونے والی تھی۔

فرسٹ ڈیلیوری، میرے خدا۔ کیسی بھیانک اور کربناک یادیں اس فرسٹ ڈیلیوری سے وابستہ تھیں۔ اس فرسٹ ڈیلیوری میں میری بیوی اور عارفہ کی ماں کی موت واقع ہوئی تھی۔ وہ عارفہ کو جنم دے کر مرگئی تھی۔ پھر میں نے عارفہ کو باپ کے ساتھ ساتھ ماں بن کر بھی پالا تھا۔

رشتہ داروں نے دوسری شادی کے لیے بہت زور دیا لیکن میں اپنی پیاری سی عارفہ کو سوتیلی ماں کے ہاتھوں میں نہیں دینا چاہتا تھا۔

میری عمر اس وقت اٹھائیس تیس برس سے زیادہ نہیں تھی لیکن میں .... اپنی سوتیلی ماں کی نفرتیں اور اس کے مزاج کی سختیاں دیکھ چکا تھا۔ اس لیے عارفہ کے لیے مجھے دوسری شادی نہیں کرنی تھی۔ جس طرح میں نے اپنا بچپن گزارا تھا۔ میں نہیں چاہتا تھا کہ میری عارفہ بھی اسی عذاب سے گزرے۔

وہ بچی ابھی تک میرے سینے سے لگی ہوئی تھی۔ میں نے دھیرے سے کہا۔ ''عارفہ۔''

''اس کا نام صوفیہ ہے۔'' اس کے بھائی نے فوراً بتایا۔

''پاپا۔'' صوفیہ نے میری طرف دیکھتے ہوئے دوبارہ کہا۔

اس بچی کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے مجھے اپنی عارفہ یاد آگئی۔ وہی بھوری کتھئی رنگ والی آنکھیں، ویسے ہی گلاب کی سی پنکھڑیوں جیسے گلابی ہونٹ، چھوٹی سی ناک اور دودھ جیسے سفید دانت۔

اس عمر کی عارفہ بالکل اس بچی ہی جیسی تھی۔ شاید اس عمر میں عارفہ ہو یا صوفیہ سب ایک ہی جیسی نظر آتی ہیں۔

وارڈ کی طرف سے ایک آدمی آتا ہوا دکھائی دیا۔

اس بچی کا بھائی جو میرے پاس کھڑا تھا۔ اس نے اس آدمی کو دیکھتے ہی آواز لگائی۔ ''پاپا'' اور اس کی طرف چلا گیا۔ ''دیکھیں نا پاپا۔ صوفیہ انکل کو تنگ کررہی ہے۔''

صوفیہ بھی اپنے باپ کو دیکھ کر اس کی طرف دوڑی لیکن گرپڑی۔ اس آدمی نے جلدی سے اسے گود میں اٹھالیا۔

میں نے اس آدمی کو غور سے دیکھا۔ مجھ میں اور اس میں بہت فرق تھا۔ عمروں میں اور قدوقامت میں...... صرف ایک چیز مشترک تھی اور وہ تھی عینک۔

وہ میرے پاس آکر بیٹھ گیا۔ اس کے ہونٹوں پر ایک نرم سی مسکراہٹ تھی۔ ''یہ صوفیہ ہر عینک والے کو تنگ کرتی ہے۔ بہت ہی پریشان کردیا ہوگا۔''

''نہیں تو...... یہ تو مجھے اپنی بیٹی عارفہ جیسی لگی ہے۔''

''میرا نام انور ہے۔'' اس نے بتایا۔ پھر لڑکے کی طرف اشارہ کیا۔ ''اس کا نام اکبر ہے اور یہ۔'' اس نے بچی کے بالوں پر ہاتھ پھیرا۔ ''یہ صوفیہ ہے۔''

''ہاں یہ تو معلوم ہوچکا ہے مجھے۔''

''اس کی والدہ کی تیسری ڈیلیوری تھی۔ بیٹا ہوا ہے۔ میں نے اس کا نام اختر رکھا ہے۔ ہمیں کل تک چھٹی مل جائے گی۔''

''میری بیٹی ساتویں وارڈ میں ہے۔'' میں نے بتایا۔ ''اس کے یہاں ڈیلیوری ہونے والی ہے۔ پہلی ڈیلیوری اور میرا دل بیٹھا جارہا ہے۔''

''وہ کیوں؟'' انور نے پوچھا۔

''ایک بے نام سا دھڑکا۔ ایک خوف۔ میری بیوی بھی فرسٹ ڈیلیوری کے دوران چل بسی تھی۔'' میری آنکھوں میں آنسو آگئے تھے۔

''ارے نہیں۔'' اس نے میرے شانے پر تھپکی دی۔ ''اللہ سائیں خیر کرے گا۔''

''میرا داماد شہاب دوا لینے گیا ہے۔'' میں نے بتایا۔ ''وہ بھی بے حد نروس ہورہا ہے لیکن میں بہت گھبرا رہا ہوں، کیونکہ میں اپنی بیوی کی موت کا دکھ برداشت کرچکا ہوں۔ اس دنیا میں عارفہ کے سوا میرا کوئی نہیں ہے۔''

مجھے خود حیرت ہورہی تھی کہ میں ایک اجنبی سے یہ سب کیوں بولے چلا جارہا ہوں، شاید اس کی وجہ زبردست ذہنی دباؤ تھا۔ انسان جب اندر سے ٹوٹنے لگتا ہے تو کسی نہ کسی کو اپنی داستان سنا کر اپنے دل کا بوجھ ہلکا کرلینا چاہتا ہے۔

انور نے دوبارہ میرے شانے پر تھپکی دی۔ ''پریشان مت ہو۔ فرسٹ ڈیلیوری خطرناک نہیں ہوتی، جتنا تم سمجھ رہے ہو۔ یہاں کی ڈاکٹرز بہت ہوشیار ہیں۔ وہ سب سنبھال لیں گی۔ اچھا اب میں چلتا ہوں۔''

جب وہ جانے لگا تو میں نے صوفیہ کو پیار کرنے کی کوشش کی وہ رونے لگی۔ اب وہ اپنے باپ اور عینک والے اجنبی شخص میں تمیز کرسکتی تھی۔

شہاب ابھی تک دوا لے کر واپس نہیں آیا تھا۔ خدا جانے اب اسے اتنی دیر کیوں ہورہی تھی۔ میں نے دیوار کے ساتھ ساتھ لگے ہوئے پھولوں کے پودوں کی طرف دیکھا۔

اسپتال والوں نے ماحول کی خوب صورتی کے لیے ہر طرف پھول لگا دیے تھے۔ ہر قسم کے پھول تھے، رنگ برنگے، اپنی اپنی نزاکتوں اور خوب صورتیوں کے ساتھ۔ ان ہی کے درمیان مجھے گلاب کا پودا بھی نظر آگیا۔

صرف ایک پودا۔ گلاب سے کتنا پیار تھا عارفہ کو۔
ہر روز گلاب کے دو پھول ڈنڈی کے ساتھ توڑ کر انہیں شیشے کی ایک بوتل میں سجا کر مختلف زاویوں سے دیکھا کرتی۔ وہ ایک آرٹسٹ بھی تھی۔ اس نے ایک بار گلاب کی پینٹنگ بھی بنائی تھی۔ اس تصویر میں شبنم کی نازک بوندیں گلاب کے نازک پتوں پر لرز رہی تھیں۔ عارفہ کی یہ تصویر بہت پسند کی گئی تھی۔ اس نے جب اپنی یہ تصویر نمائش میں رکھی تو اس پینٹنگ کو پہلا انعام ملا تھا۔
پھر وہ پینٹنگ ایک کتاب ''عکس در عکس'' میں عارفہ کی پورٹریٹ کے ساتھ شائع ہوئی تھی پھر اچانک مجھے کچھ یاد آ گیا۔ میں خوف زدہ ہو گیا۔
گلاب...... گلاب کے پھول نے مجھے عارفہ کی ایک بات یاد دلا دی تھی۔ اس نے کہا تھا۔ ''بابا۔ اگر میں مر جاؤں تو میرے جنازے اور میری قبر پر گلاب کے اتنے پھول رکھنا کہ پوری قبر پھولوں سے ڈھک جائے۔''
میں نے ایک گہری سانس لے کر گلاب کی طرف سے اپنی نگاہیں ہٹا لیں۔ اسی لمحے سامنے پارکنگ میں شہاب کی کار آ کر رکی۔ وہ دوا لے کر واپس آ گیا تھا۔ اس نے کار سے دوا کا بیگ اٹھایا اور میرے پاس آ گیا۔ ''پاپا آپ یہاں بیٹھے ہیں۔''
''ہاں بیٹا۔'' میں لرزتی ہوئی آواز میں بولا۔ ''تمہارا انتظار کر رہا تھا۔''
''چلیں کمرے میں چلتے ہیں۔''
کوریڈور سے گزرتے ہوئے جب روم نمبر پانچ کے سامنے سے گزرے تو اچانک دروازہ کھلا اور صوفیہ باہر آ گئی۔
میں نے جھک کر اپنی باہیں پھیلا دیں۔ ''عارفہ۔'' میں نہ جانے کیوں اسے پھر عارفہ پکار اٹھا تھا۔ اس نے ایک نظر میری طرف دیکھا۔ آہستہ سے میرے قریب آئی۔ پھر اچانک مڑ کر اپنے کمرے میں واپس چلی گئی۔
میرا دل دھک سے رہ گیا۔ کیا جس طرح یہ مجھ سے دور ہوئی ہے، کیا اسی طرح میری عارفہ بھی ہو جائے گی۔ خدایا خیر کرنا۔ اس بچی صوفیہ کا اس طرح چلے جانا کس بات کی علامت تھا۔ کیوں۔ وہ کیوں چلی گئی؟
''پاپا۔ کیا ہو گیا۔'' شہاب کی آواز نے مجھے چونکا دیا۔ ''آپ جائیں۔ میں ڈاکٹر کے پاس جا رہا ہوں۔''
میں دروازہ کھول کر کمرے میں داخل ہوا۔ سامنے بستر پر عارفہ لیٹی ہوئی تھی۔ اس کے گلابی چہرے پر جیسے ہلدی مل دی گئی تھی۔ پورا چہرہ زرد ہو رہا تھا اور اس کی

جدید کنٹرنیل

☆ کسی کے گھر جانے سے پہلے لائٹ کی ٹائمنگ معلوم کر لیں۔
☆ وقت کی پابندی واپڈا والوں سے سیکھو۔
☆ اچھا مہمان وہ ہے جو اپنا ہاتھ کا پنکھا اپنے ساتھ لائے۔
☆ اگر کسی سے دوستی کرو تو دیکھ لو اس کے پاس جنریٹر یا یو پی ایس ہے؟
☆ عظیم ہے وہ دوست جو آپ کو چار جنگ لائٹ اور چار جنگ پنکھا گفٹ کرے۔
☆ کسی کا اخلاق دیکھنا ہو تو پنکھا اپنی طرف کر کے دیکھو۔

مرسلہ۔ رضوان تنولی کریڑوی، اورنگی ٹاؤن کراچی

آنکھوں کی چمک مدھم ہو گئی تھی۔ مجھے دیکھ کر اس کے ہونٹوں پر ایک ہلکی سی مسکراہٹ آ گئی تھی۔
میں نے آگے بڑھ کر اس کے سر پر ہاتھ رکھ دیا۔ وہ دھیرے سے بولی۔ ''بابا۔ مجھے تنہا چھوڑ کر مت جانا۔ مجھے اکیلے پن سے بہت ڈر لگتا ہے۔''
''نہیں بیٹا۔ میں تمہارے پاس ہوں۔'' میں نے اس کا ہاتھ تھام لیا۔ ''میں کہیں نہیں جاؤں گا۔''
''شہاب کہاں ہے بابا؟'' اس نے پوچھا۔
''وہ دوائیں لے کر ڈاکٹر کے پاس گیا ہے۔'' میں نے بتایا۔ ''آتا ہی ہوگا۔''
عارفہ میری آنکھوں میں دیکھتی رہی۔ پھر آہستہ سے بولی ''بابا۔ میرا بچنا محال ہے، کمزوری بہت بڑھ گئی ہے۔ سہارے کے بغیر اٹھ نہیں سکتی۔''
''نہیں بیٹا۔ ایسی کوئی بات نہیں ہے۔'' میں نے اس کے بالوں میں انگلیاں پھیریں۔ ''تم بالکل ٹھیک ہو جاؤ گی۔ تم تو ایک بہادر بچی ہو۔ تمہیں یاد ہے۔ تم ایک بار درخت سے گر پڑی تھیں۔ تمہارے ہاتھ میں فریکچر ہو گیا تھا۔ پھر بھی تم ہنستی رہی تھیں۔''
''ہاں بابا یاد ہے، لیکن وہ بات اور تھی۔ یہ بات کچھ اور ہے۔''
''بیٹا۔ تم کو تو خود معلوم ہے کہ یہ اسپتال کتنا اچھا ہے۔

یہاں کا پورا اسٹاف تربیت یافتہ ہے۔ جب تم پیدا ہو رہی تھیں۔ اس وقت کی بات اور تھی۔ اب تو اچھی اچھی مشینیں آ گئی ہیں۔ جو خراب سے خراب کنڈیشن کو بھی سنبھال لیتی ہیں۔ تم کیوں فکر کرتی ہو۔ پھر آج کے دور میں دوائیں کیسی کیسی ہیں۔"

"لیکن بابا۔ مجھے ماں کی فرسٹ ڈیلیوری یاد آتی ہے۔"

"پاگل ہو تم۔ یہ تو سوچو۔ تمہاری ڈیلیوری ایک ان ٹرینڈ دائی کے ہاتھوں ہوئی تھی اور یہ تو پورا ماڈرن اسپتال ہے۔ میں نے ڈاکٹر نادرہ سے بات کی تھی۔ اس کا کہنا ہے کہ گھبرانے والی تو کوئی بات ہی نہیں ہے۔ تھوڑی کمزوری ضرور ہے لیکن سب ٹھیک ہو جائے گا۔"

اس دوران شہاب بھی کمرے میں آ گیا تھا۔

اس کو دیکھ کر عارفہ کی آنکھوں میں چمک آ گئی تھی۔ شہاب نے مجھے اشارہ کیا اور میں کسی بہانے عارفہ کو چھوڑ کر شہاب کے ساتھ کمرے سے باہر آ گیا۔ میرا دل پھر زور زور سے دھڑکنے لگا۔ خدا خیر کرے، شہاب مجھے کیا بتانا چاہ رہا تھا۔

"کیا ہوا بیٹا۔" میں نے ہونٹوں پر زبان پھیرتے ہوئے پوچھا۔

"چاچا۔ ڈاکٹر نادرہ نے بتایا ہے کہ عارفہ کا کیس بہت پیچیدہ ہو گیا ہے۔" اس نے کہا۔ "ایک تو وہ خود بہت کمزور ہے اور بچہ بھی کمزور لگ رہا ہے۔ الٹرا ساؤنڈ میں بچہ صحیح پوزیشن میں نظر نہیں آ رہا ہے۔ پھر بھی اس نے دلاسا دیا ہے کہ ان لوگوں کی طرف سے پوری کوشش کی جائے گی اور پاپا ان سب کے باوجود میں یہ کہتا ہوں کہ معاملہ اتنا سیریس نہیں ہے جتنا ہم سمجھ رہے ہیں۔ خدا نے چاہا تو سب ٹھیک ہو جائے گا۔ آپ پریشان نہ ہوں۔ سب اللہ پر چھوڑ دیں۔"

شہاب کی یہ بات بہت اچھی تھی کہ اسے تسلی دینے کا سلیقہ آتا تھا۔ اس کے لیے وہ بہت مناسب الفاظ کا انتخاب کیا کرتا جبکہ میں کمزور دل کا انسان ہوں۔ جب ایسی کوئی بات ہو تو مجھ سے کچھ بولا نہیں جاتا۔ میں اپنے آپ کو مریض سے زیادہ کمزور سمجھنے لگتا ہوں۔

کسی بھی بات کا تاریک پہلو تو فوراً سامنے آ جاتا ہے لیکن روشن پہلو کو دیکھنے کے لیے کسی اور کی آنکھوں اور حوصلے کی ضرورت پڑتی ہے۔

پھر ایک خیال آیا کہ شاید ڈاکٹر نادرہ نے اسے اور بہت کچھ بتا دیا ہے اور وہ میرا دل رکھنے کے لیے اچھی باتیں کر رہا ہے۔ اسے بہت کچھ معلوم ہے اور وہ اپنا دکھ اور خوف چھپا کر مجھے تسلیاں دے رہا ہے۔ جب اس نے اتنا بتا دیا تھا کہ عارفہ بہت کمزور ہے۔ بچہ بہت کمزور ہے اور اس کی پوزیشن بھی ٹھیک نہیں ہے تو پھر کیا رہ گیا تھا۔

اسی وقت دو نرسیں تیزی سے آئیں اور کمرے میں چلی گئیں۔ اب تو میرا دل ڈوبنے لگا تھا۔

"جائیں پاپا۔ آپ جا کر لان میں بیٹھیں۔" شہاب نے کہا۔

میں جانا تو نہیں چاہتا تھا لیکن مجھ سے کھڑا نہیں ہوا جا رہا تھا۔ میں لڑکھڑاتے قدموں سے باہر لان میں آ کر بیٹھ گیا۔

لیکن بے چینی اتنی تھی کہ مجھ سے باہر بیٹھا نہیں گیا۔ میں واپس آ گیا۔ عارفہ کو لیبر روم میں لے جایا گیا تھا۔

میں بھی تیزی سے لیبر روم کی طرف لپکا۔

شہاب باہر کرسی پر بیٹھا تھا۔ وہ مجھے دیکھ کر کھڑا ہو گیا۔ "دعا کریں پاپا۔ اس کو لے کر گئے ہیں۔"

میں نڈھال سا ہو کر کرسی پر بیٹھ گیا۔

کیوں یہ بے پناہ خاموشی، میں نے آنکھیں بند کر لیں۔ اب میرے سامنے عارفہ کا بچپن تھا۔ میں نے باپ کے ساتھ ساتھ ماں بن کر اس کی پرورش کی تھی۔ اس لیے اس کی ہر ادا یاد تھی۔ اس کا ہر انداز میری نگاہوں کے سامنے تھا۔

اس کا چلنا پھرنا، اس کی معصومانہ باتیں۔ کسی کی آہٹ نے مجھے چونکا دیا۔ میں نے آنکھیں کھولیں۔ میرے خدا شہاب وہاں نہیں تھا۔ نہ جانے وہ کہاں چلا گیا تھا۔ کیوں چلا گیا تھا۔ شاید کوئی اسے بلا کر لے گیا تھا۔ کیا ڈاکٹر نادرہ اسے لے گئی تھی۔

میرے ماتھے پر پسینا آ گیا۔ ایسا لگتا تھا جیسے ابھی بے ہوش ہو کر گر پڑوں گا اور اسی وقت شہاب ایک طرف سے نمودار ہوا۔ اس کے ہونٹوں پر مسکراہٹ تھی۔

"مبارک ہو پاپا۔" وہ آ کر میرے گلے سے لگ گیا۔ "بیٹا ہوا ہے اور وہ بھی بغیر کسی پریشانی کے۔ عارفہ اور بچہ دونوں بالکل ٹھیک ہیں۔"

میرے خدا۔ احساس تشکر سے میری آنکھوں میں آنسو آ گئے۔

اس وقت نہ جانے کہاں سے وہ بچی صوفیہ میرے پاس آ گئی۔ وہ میری ٹانگوں سے لپٹ گئی تھی، میں نے پیار سے اسے اٹھا لیا تھا۔

میری عارفہ میرے پاس لوٹ آئی تھی۔



اگرچہ اس کا پرائیویٹ آفس بڑا آرام دہ اور ائیر کنڈیشنڈ تھا لیکن اس سہ پہر کو جیسے ہی میسن نے ایک مخصوص فون کا جواب دے کر ریسیور کریڈل پر رکھا، اس کی پیشانی پر پسینے کے قطرے نمایاں ہوتے جارہے تھے اور اس کی وجہ یہ تھی کہ وہ فون ہربرٹ ڈینی سن کا تھا جو کہ دارالحکومت میں واقع اسٹیٹ بینکنگ ایگزامنر آفس کا انچارج تھا۔

”کیسے مزاج ہیں میسن؟“ اس نے پوچھا۔ ”سب کچھ ٹھیک ٹھاک ہے؟“

”بے شک جناب۔“ میسن نے تھوک نگلتے ہوئے حتیٰ الامکان پُرسکون لہجے میں جواب دیا۔ ”کام بہت اچھی طرح چل رہا ہے۔“

”مجھے یہ سن کر خوشی ہوئی۔“ ہربرٹ بولا۔ ”میں جانتا ہوں کہ اس دفتر سے کوئی پیشگی اطلاع دینا معمول کے سراسر خلاف ہے لیکن صورتِ حال یہ ہے کہ ہم لوگ اپنے مقررہ شیڈول سے بہت پیچھے ہیں اور مجھے جلد از جلد ہر جگہ کا معائنہ مکمل کرنا ہے۔ اسی لیے میں نے سوچا کہ تمہیں پہلے سے فون کر کے بتادوں۔ ہمارے دفتر کے دو نمائندے حسابات کی جانچ پڑتال کرنے کل صبح یا زیادہ سے زیادہ پرسوں تک تمہارے پاس پہنچ جائیں گے۔ میں ممنون ہوں گا اگر تم اپنے حسابات پہلے سے تیار رکھو اور انہیں ہر قسم کی سہولت بہم پہنچانے کی کوشش کروتا کہ وہ کم سے کم وقت میں بلکہ ممکن ہو تو اسی دن اپنا کام ختم کرلیں......کیا تم یہ کرسکتے ہو؟“

میسن کی کنپٹیاں گرم ہونے لگی تھیں۔ اسے اپنے ماتھے پر پسینے کی بوندیں ابھرتی محسوس ہو رہی تھیں پھر بھی

مستعدی

اثر نعمانی

اکثر اداروں میں نچلے درجے کا اسٹاف زیادہ اہمیت کا حامل نہیں ہوتا... مگر صلاحیت اور خلوص کو درجوں کا محتاج نہیں کیا جاسکتا۔ اس نے بھی اپنے نپے تلے فرائض کی دیوار ڈھاتے ہوئے اپنی وفاداری کا جو رنگ جمایا اس نے چھوٹے بڑے تمام افسران کے ہوش اڑادیے۔

اختیارات کے دائرے میں قید ایک چھوٹے ملازم کی بڑی مستعدی



اس نے بڑی کوشش سے اپنے آپ کو سنبھالتے ہوئے جواب دیا۔

''ضرور، ضرور مسٹر ہربرٹ۔''

''کوئی مشکل تو نہیں ہوگی؟''

''بالکل نہیں۔''

''بہت خوب! میں تمہارے تعاون کا ممنون ہوں۔''

میسن نے شکریہ ادا کر کے ریسیور رکھ دیا لیکن شکریہ ادا کرنے کے باوجود وہ شکر گزاری کے موڈ میں نہیں تھا اور اس کی وجہ یہ تھی کہ ساحلی علاقے کے اس چھوٹے سے شہر سی وسٹا میں جو مرچنٹ ٹرسٹ فنڈ اس کی تحویل میں تھا، اس میں مجموعی طور پر پانچ ہزار ڈالرز کی کمی واقع ہو چکی تھی اور اس کمی کا ذمے دار وہ خود یعنی...... بینک کا منیجر تھا۔ ابتدا میں بات بہت سادہ سی تھی۔ اس نے کاروبار میں لگائے ہوئے اپنے سرمائے کے خسارے کو پورا کرنے کے لیے خود ہی بینک سے چند سو ڈالرز نکال لیے تھے۔ یہ سوچ کر کہ نقصان پورا ہونے پر وہ یہ رقم واپس کر دے گا لیکن یہ نقصانات بڑھتے ہی چلے گئے اور قرض لی ہوئی رقم واپس نہ کی جا سکی۔ نتیجے میں اس نے اپنے مزید نقصان کو پورا کرنے کے لیے مزید رقم نکالی اور اس طرح یہ رقم بڑھتی چلی گئی۔ یہاں تک کہ اب تک وہ پانچ ہزار کا مقروض ہو چکا تھا اور اب کل یا پرسوں بینک کے حسابات کی جانچ پڑتال کرنے والے آرہے تھے۔

میسن اپنی کرسی کی پشت گاہ سے ٹیک لگا کر گہری سوچ میں گم ہو گیا۔ یہاں تک کہ جب اس کی سیکریٹری مس فارسٹ سہ پہر کی ڈاک لیے اس کے آفس میں داخل ہوئی تو اس نے شاید اسے دیکھا تک نہیں۔ مس فارسٹ خوش اطوار، خوش مزاج اور خوش اخلاق واقع ہوئی تھی۔ وہ ایک خوش گوار تبسم ہونٹوں پر لیے اندر آئی لیکن جب اس نے میسن کو اس کھوئی ہوئی کیفیت میں دیکھا تو اس کی مسکراہٹ خود بخود غائب ہو گئی۔

''مسٹر میسن!'' اس نے چونکتے ہوئے کہا۔ ''تمہاری طبیعت تو ٹھیک ہے؟''

میسن نے ٹٹولتے ہوئے اپنی میز کی دراز کھولی اور اس میں سے گولیوں کا ایک پیکٹ نکالا۔

''کچھ بدہضمی کی شکایت محسوس ہوتی ہے۔'' اس نے جواب دیا۔ ''تمہیں فکرمند ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔''

مس فارسٹ واپس چلی گئی۔ میسن نے ایک گولی منہ میں ڈالی پھر دوسری پھر تیسری...... اسے کچھ نہ کچھ تو کرنا ہی پڑے گا۔ وہ سوچ رہا تھا۔ اس کی ملازمت کا پورا مستقبل خطرے میں تھا اور غبن کے الزام میں جو قانونی کارروائی کی جائے گی وہ الگ۔ اسی لمحے دفتر میں ایک اور فرد داخل ہوا۔ یہ ایک کلرک تھا، ہاروے جو کھڑکی پر بینک کے اکاؤنٹ ہولڈروں کو چیک کی رقوم تقسیم کرنے کا ذمے دار تھا۔ ہاروے بہت محنتی اور با اصول نوجوان تھا اور چونکہ نیا نیا ملازم ہوا تھا اس لیے اپنی اچھی کارکردگی دکھانے کا کوئی موقع ہاتھ سے جانے نہیں دیتا تھا۔

''کیا میں آپ کے قیمتی وقت کے چند لمحات لے سکتا ہوں جناب؟''

میسن کے ہونٹوں سے ایک بے آواز کراہ نکلی۔ اس کا دل اس وقت کسی سے بات کرنے کو نہیں چاہ رہا تھا مگر یہ بینک کے اوقات کار تھے اور وہ بینک کا منیجر تھا۔ اسے اپنے متعلقہ فرائض پر توجہ دینی ہی تھی۔ اس نے ایک گہری سانس لی اور ہاروے کی طرف دیکھا۔

''کیا بات ہے ہاروے؟'' اس نے سوال کیا۔

''ممکن ہے میں اپنے فرائض سے تجاوز کر رہا ہوں۔'' ہاروے نے ہچکچاتے ہوئے جواب دیا۔ ''لیکن میں نے محسوس کیا کہ یہ بات آپ کے علم میں آجائے تو بہتر ہے......''

''ہاں، ہاں کہو کیا بات ہے؟''

''وہ...... وہ مس ہیریٹ ہیں نا۔'' ہاروے نے بتایا۔ ''وہ ابھی آئی ہیں اور اپنے اکاؤنٹ سے پانچ ہزار ڈالرز نکلوانا چاہتی ہیں۔ اس طرح ان کے حساب میں صرف دو ہزار ڈالرز رہ جائیں گے۔''

میسن نے پلکیں جھپکائیں۔ ہاروے نے جس خاتون کا نام لیا تھا، وہ سی وسٹا کی غالباً سب سے معمر خاتون تھی جس نے تمام عمر شادی نہیں کی تھی اور اسکول کی استانی کی ملازمت سے ریٹائر ہو کر اب ایک پارٹ ٹائم لائبریرین کی حیثیت سے کام کر رہی تھی۔ ان حالات میں ظاہر ہے کہ اس کی آمدنی بہت محدود تھی۔

''کیا وہ اس رقم کا کیش چیک مانگ رہی ہیں؟'' میسن نے پوچھا۔

''نہیں جناب! وہ نقد رقم چاہتی ہیں اور وہ بھی بڑے بڑے نوٹوں کی صورت میں۔'' ہاروے نے جواب دیا۔ ''میں نے سوچا ممکن ہے آپ ان سے بات کرنا چاہیں۔''

''کیا وہ فکرمند، کچھ پریشان اور چڑچڑی معلوم ہوتی ہیں؟''

''بالکل نہیں جناب۔''

میسن نے چند لمحے غور کیا۔ اصولاً مس ہیریٹ کے

ذاتی معاملات سے بینک کا کوئی تعلق نہیں تھا لیکن دوسری جانب آدمی جب بوڑھا ہو جاتا ہے تو اس کی ذہنی استعداد اور قوتِ فیصلہ کچھ زیادہ قابلِ اعتماد نہیں رہتے۔ یہ ممکن تھا کہ مس ہیریٹ اتنی رقم کسی سے صلاح و مشورہ کیے بغیر کسی کاروبار میں لگانا چاہتی ہوں جس میں فائدے سے زیادہ خسارے کا امکان ہو۔ میسن نے فوری طور پر ایک فیصلہ کیا۔

''تم نے مجھے اطلاع دے کر بہت اچھا کیا۔'' اس نے ہاروے سے کہا۔

''میری کوشش تو یہی ہوتی ہے جناب کہ زیادہ سے زیادہ بینک اور اس کے اکاؤنٹ ہولڈروں کے مفاد میں کام کرسکوں۔''

''ٹھیک ہے، تم مس ہیریٹ سے کہو کہ میں ان سے چند منٹ کے لیے گفتگو کرنا چاہتا ہوں۔''

اور ہاروے کی درخواست کے جواب میں مس ہیریٹ فوراً ہی میسن کے آفس میں داخل ہوئی۔ موٹے شیشوں کا چشمہ لگائے وہ میسن کے بالمقابل ایک کرسی پر بیٹھ گئی۔

''میرا خیال ہے کہ تم اس رقم کے بارے میں بات کرنا چاہتے ہو جو میں اپنے اکاؤنٹ سے نکال رہی ہوں۔'' اس نے کہا۔

''یہی بات ہے مس ہیریٹ۔'' میسن نے اعتراف کیا۔ ''مجھے بتایا گیا ہے کہ تم اپنے سیونگ اکاؤنٹ کی تقریباً تمام رقم نکال رہی ہو۔ قدرتی طور پر مجھے...... میرا مطلب ہے کہ بینک کو تمہارے مفاد سے دلچسپی ہے اور اس سلسلے میں تشویش بھی کہ......''

''تمہیں اس کی قطعاً کوئی ضرورت نہیں ہے۔'' مس ہیریٹ نے بات کاٹتے ہوئے کہا۔ ''میری پنشن اور سوشل سیکیورٹی فنڈ سے ملنے والی رقم میری ضروریات کے لیے بہت کافی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ میرا پس انداز سرمایہ بینک میں پڑے ہونے کے علاوہ اور کس مصرف میں آرہا ہے اور مجھے اس سود کی بھی کوئی ضرورت نہیں ہے جو اس رقم پر ملتا ہے۔''

''بے شک، بے شک۔'' میسن نے جلدی سے کہا۔ ''بینک کی دلچسپی سے میرا مطلب یہ تھا کہ کہیں تمہیں کسی طرح مجبور کرکے یا کسی فریب دہی سے تو کوئی شخص یہ رقم نکلوانے پر مجبور نہیں کررہا ہے۔''

''ایسی کوئی بات نہیں۔'' مس ہیریٹ نے کچھ ناگواری سے جواب دیا پھر شاید اسے فوراً ہی اپنے لہجے کی سختی کا احساس ہوا تو وہ قدرے مسکراتے ہوئے بولی۔ ''میں تمہاری توجہ کی ممنون ہوں لیکن حقیقت میں یہ بالکل غیر ضروری ہے۔ بات دراصل یوں ہے کہ میں یہ رقم اپنے بھتیجے راجر کو دے رہی ہوں۔ اسے ایک منافع بخش کاروبار میں لگانے کے لیے نقد رقم کی فوری ضرورت ہے۔''

میسن چونک گیا۔ اگرچہ راجر آج کل اس علاقے میں رہائش پذیر نہیں تھا لیکن سی وسٹا میں اس کی ذات کچھ ایسی غیر معروف بھی نہیں تھی۔ نوجوان راجر کی شہرت کچھ اچھی نہیں تھی۔ وہ ایک ابن الوقت اور موقع پرست آدمی تھا اور اس کے بارے میں عام افواہیں یہی تھیں کہ وہ ہر جائز اور ناجائز طریقے سے دولت حاصل کرنے کے کسی موقع کو ہاتھ سے جانے نہیں دیتا۔

''میں سمجھتی ہوں کہ تم کیا سوچ رہے ہو۔'' مس ہیریٹ نے کہا۔ ''لیکن تم غلطی پر ہو۔ راجر نے اب اپنے آپ کو سنبھال لیا ہے اور اس نے مجھ سے وعدہ کیا ہے کہ وہ آئندہ جائز ذرائع سے محنت کرکے ترقی کرنے کی کوشش کرے گا۔''

''میں معذرت خواہ ہوں۔'' میسن نے دبے لہجے میں کہا۔ ''لیکن اس بات پر یقین نہیں آتا۔''

''ممکن ہے تمہیں نہ آتا ہو لیکن یہ سچ ہے۔''

''اور وہ کاروبار کیا ہے جس میں راجر سرمایہ لگانا چاہتا ہے؟'' میسن نے دوسرے پہلو سے بات کی۔

''مجھے ٹھیک سے معلوم نہیں لیکن غالباً اس کا تعلق کسی ایسے کارخانے سے ہے جو سورج کی حرارت سے فائدہ اٹھانے والے آلات بنانا چاہتا ہے۔ راجر اس معاملے میں بہت پُرجوش معلوم ہوتا ہے۔''

''مس ہیریٹ! تمہارے بینک منیجر کی حیثیت سے میں صرف اتنا ہی کہہ سکتا ہوں کہ جو کچھ تم کررہی ہو، وہ بلاشبہ تمہارا ذاتی معاملہ ہے لیکن میرے خیال میں یہ ایک غلط اقدام ہوگا۔''

''تمہاری جانب سے مجھے اسی مشورے کی توقع تھی اور میں اس کے لیے شکریہ بھی ادا کرتی ہوں لیکن اب مہربانی کرکے تم میرا چیک کیش کرنے کی ہدایت دے دو۔''

میسن نے اب بھی اپنی کوشش ترک نہیں کی اور مس ہیریٹ کو ایک دوسرے پہلو کی طرف متوجہ کیا۔

''اس بات سے قطع نظر کہ تم اس رقم کا کیا کرتی ہو، یہ بات بھی خطرے سے خالی نہیں کہ تم یہ رقم نقد چاہتی ہو۔ جیسا کہ تمہیں پتا ہوگا کہ سی وسٹا میں آج کل چوریوں کی وارداتیں کچھ بڑھ گئی ہیں۔''

''مجھے اس بارے میں کوئی فکر نہیں ہے۔'' مس

ہیریٹ نے جواب دیا۔ ''رقم میرے پاس صرف آج رات تک رہے گی۔ راجر نے آج صبح فون کیا تھا۔ وہ آج کام کے بعد شہر سے روانہ ہوگا اور رقم لے جائے گا۔'' وہ اپنی کرسی سے کھڑی ہوگئی۔

''تم سے باتیں کرکے خوشی ہوئی مسٹر میسن۔'' اس نے کہا۔ ''میں ایک مرتبہ پھر تمہاری ہمدردی کا شکریہ ادا کرتی ہوں۔''

میسن خود بوڑھی خاتون کو ہاروے کے پاس لے گیا اور اسے ہدایت کردی کہ وہ چیک کیش کردے پھر اپنے دفتر میں واپس آکر وہ کرسی پر ڈھیر ہوگیا۔ یہ پورا معاملہ ہی احمقانہ تھا۔ اسے یقین تھا کہ مس ہیریٹ اپنا پس انداز کیا ہوا سرمایہ ضائع کرنے پر تلی ہوئی ہے۔ تھوڑی بہت بھی نہیں، پوری پانچ ہزار ڈالرز کی رقم اور وہ اسے یوں......

اچانک وہ سیدھا ہوکر بیٹھ گیا۔ اس کی مٹھیاں بھنچ گئیں۔ ''ذرا ٹھہرو۔'' اس نے اپنے آپ سے کہا۔ اس معاملے کے ایک دوسرے بالکل مختلف پہلو پر تو اس کی سوچ پہنچی ہی نہیں تھی۔

☆☆☆

مس ہیریٹ قصبے کے آخری سرے پر ایک چھوٹے سے سفید بنگلے میں رہتی تھی۔ ابھی یہ علاقہ بہت کم آباد ہوا تھا جس کا مطلب تھا کہ رات کی تاریکی چھانے کے بعد دیکھ لیے جانے کے امکانات بہت ہی کم تھے چنانچہ شام ہونے سے کچھ پہلے میسن اپنی کار میں وہاں پہنچ گیا اور بنگلے سے تقریباً ایک بلاک کے فاصلے پر ایک درخت کی آڑ میں کار کھڑی کرکے انتظار کرنے لگا۔ اس بات کا قوی امکان تھا کہ راجر کافی رات ہونے سے پہلے نہیں پہنچ سکے گا۔ مس ہیریٹ نے اس کی آمد کا ذکر کرتے ہوئے آج رات کے الفاظ استعمال کیے تھے نہ کہ آج شام...... پھر اس نے مزید کہا تھا کہ وہ کام کے اوقات کے بعد شہر سے اپنی کار میں روانہ ہوگا اور سی وسٹا پہنچنے میں اسے کم و بیش دو گھنٹے لگیں گے۔ اس سے بھی یہی ثابت ہوتا تھا کہ وہ رات کو آئے گا۔

میسن بار بار اپنی کار کی سیٹ پر پہلو بدل رہا تھا۔ وہ کچھ ایسا مضبوط اور طاقت ور آدمی نہیں تھا چنانچہ ایک طرف اسے اپنی جسمانی کمزوری اور دوسری جانب اپنے ضمیر کی خلش کا احساس بے چین کررہا تھا۔ اس نے اپنی زندگی میں کبھی کوئی اس طرح کی حرکت نہیں کی تھی لیکن مشکل یہ تھی کہ وہ اس سنہری موقع کو نظرانداز بھی نہیں کرسکتا تھا۔ اسے اتفاق کہا جائے یا تقدیر یا کچھ اور لیکن امرواقعہ یہ تھا کہ عنقریب راجر اپنی پھوپی کے مکان سے نقد رقم لے کر رخصت ہونے والا تھا۔ ٹھیک اتنی ہی رقم جتنی رقم کی میسن کو ضرورت تھی۔ مزید یہ کہ خود مس ہیریٹ کا مستقبل اس کے اس اقدام کے نتیجے میں کسی طرح متاثر نہیں ہوتا تھا۔ اس نے خود کہا تھا کہ یہ رقم اس کی ضروریات سے فاضل ہے اور جہاں تک نوجوان راجر کا تعلق تھا تو اس کی ذات اس قابل نہیں تھی کہ اس کی فکر میں پریشان ہوا جاتا۔

میسن نے ایک بار پھر پہلو بدلتے ہوئے اپنی گود میں رکھے ہوئے اس موزے کو چھوا جس میں اس نے گیلی ریت بھر رکھی تھی۔ اسے ابھی کافی دیر انتظار کرنا تھا۔

مگر پھر جب اس نے تھوڑی ہی دیر کے بعد ایک پیلے رنگ کی واکس ویگن کو اپنی کار کے پاس سے گزر کر مس ہیریٹ کے بنگلے کے سامنے رکتے دیکھا تو وہ چونک کر منہ ہی منہ میں بڑبڑائے بغیر نہیں رہ سکا۔ نہیں، یہ راجر نہیں ہوسکتا۔ وہ اتنی جلدی نہیں آسکتا۔ اسے اتنی جلدی نہیں آنا چاہیے مگر ہرچند میسن اسے کئی برس کے بعد دیکھ رہا تھا۔ اس میں کوئی شک وشبہ نہیں تھا کہ وہ راجر ہی ہے۔ اب وہ پہلے سے موٹا ہوگیا تھا۔ بال بھی زیادہ فیشن ایبل طریقے پر ترشوا رکھے تھے لیکن تھا وہ راجر ہی۔ وہ کار سے ایک بریف کیس بغل میں دبائے اترا اور بنگلے میں داخل ہوگیا۔

میسن سوچنے لگا، یہ قطعی ممکن تھا کہ راجر اپنی پھوپی سے رقم وصول کرنے کے بعد وہاں ٹھہرنا بےکار سمجھے اور اس وقت جبکہ ابھی شام بھی پوری طرح نہیں ہوئی تھی، اس پر حملہ کرنا خطرے سے خالی نہیں تھا۔ خواہ وہ اس پر پیچھے سے حملہ کرنے اور اسے اپنی صورت دیکھنے کا موقع دیے بغیر بریف کیس چھیننے میں... کامیاب ہوجائے تب بھی اندیشہ تھا کہ پڑوس کے گھر سے کوئی شخص اسے حملہ کرتے ہوئے دیکھ لے اور شور مچادے۔

میسن انتہائی مایوس اور دل گرفتہ ہوگیا۔ اب اس کی کامیابی کی واحد صورت یہ تھی کہ راجر، مس ہیریٹ سے باتیں کرنے میں اتنی دیر لگادے کہ شام ہوجائے لیکن اس کی یہ توقع بھی پوری نہیں ہوئی کیونکہ راجر صرف پندرہ منٹ کے بعد اس عالم میں کہ اس کی باچھیں کھلی پڑ رہی تھیں، بنگلے سے باہر نکلا اور بریف کیس کو بڑی احتیاط کے ساتھ اپنی کار میں رکھ کر چل دیا۔ اب میسن کے لیے اس کے تعاقب کے سوا کوئی چارہ نہیں تھا مگر اسے رقم حاصل کرلینے کی کوئی توقع باقی نہ رہ گئی تھی پھر بھی غیر ارادی طور پر وہ اس کے پیچھے چل پڑا۔ وہ سوچ رہا تھا کہ اس کا تمام منصوبہ ہی بےکار اور ناممکن العمل تھا۔

اور تب پھر بالکل معجزانہ طور پر کیونکہ بہ ظاہر اس بات کی کوئی بعید ترین توقع بھی نہیں تھی، میسن نے راجر کو سی وسٹا سے باہر نکلنے کے بعد ایک کاک ٹیل لاؤنج کے پارکنگ لاٹ پر کار روکتے دیکھا اور میسن کا دل بلیوں اچھلنے لگا۔ کیا یہ ممکن ہو سکتا ہے...... یقیناً ہو سکتا ہے۔ راجر دارالحکومت واپس جانے سے پہلے شراب پی کر اپنی کامیابی کی مسرت کو دو آتشہ کرنا چاہتا تھا۔ راجر کار سے اترا اور بریف کیس اپنے ہاتھ میں سنبھالتے ہوئے اندر چلا گیا۔

اس کے نصف گھنٹے بعد جب نوجوان راجر باہر نکلا تو چاروں طرف اندھیرا پھیل چکا تھا۔ میسن نے بڑی پھرتی سے ریت سے بھرے ہوئے موزے کو گھما کر اس کی بائیں کنپٹی پر وار کیا اور جب راجر بے ہوش ہو کر زمین پر گر رہا تھا تو اس کے ہاتھ سے بریف کیس چھین کر رہا ہو گیا۔

اگلے دن صبح میسن بہت خوش و خرم تھا۔ اس نے بڑے شوق اور پوری بھوک کے ساتھ ناشتا کیا۔ لباس تبدیل کرتے ہوئے وہ گنگناتا بھی جا رہا تھا اور روزانہ کے معمول کے خلاف وہ نصف گھنٹا پہلے ہی بینک چل دیا۔ یہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ نصف گھنٹے کی یہ مہلت اسے رقم کو بینک والٹ کی نقدی والی ایک خاص دراز میں رکھنے کے لیے درکار تھی اور اس طرح کہ کوئی اسے دیکھ نہ سکے۔

لیکن وہ اپنا مقصد نہ صرف یہ کہ فوری طور پر حاصل نہیں کر سکا بلکہ اس طرح بھی نہیں کر سکا جس طرح اس نے سوچا تھا۔ جب وہ بینک پہنچا تو اس نے ایک غیر متوقع ملاقاتی کو اپنا منتظر پایا اور یہ شخص سی وسٹا کا شیرف ڈالٹن تھا۔ میسن قریب پہنچا تو شیرف معذرت خواہانہ انداز میں مسکرایا۔

''گڈ مارننگ، مسٹر میسن۔'' اس نے کہا۔ ''میں بہت جلدی آ گیا ہوں لیکن میں چاہتا تھا کہ اس سے پہلے کہ تم بینک کے کاموں میں مصروف ہو، مجھے تم سے کچھ دیر اطمینان سے گفتگو کرنے کا موقع مل جائے۔''

کسی نامعلوم اور مبہم خوف سے میسن کے رونگٹے کھڑے ہو گئے لیکن اس نے فوراً ہی خود پر قابو پا لیا۔ شیرف کا طرزِ عمل دوستانہ تھا اور وہ اب بھی مسکرا رہا تھا۔ اس کے علاوہ میسن کے خیال میں ڈالٹن اتنا ہوشیار اور ذہین بھی نہیں تھا کہ اتنی جلدی معاملے کی تہ تک پہنچ جاتا چنانچہ اس نے خود بھی ایک جبریہ مسکراہٹ ہونٹوں پر لاتے ہوئے شیرف کا استقبال کیا اور اسے ساتھ لے کر اپنے پرائیویٹ آفس میں داخل ہوا۔ اس نے ڈالٹن کو ملاقاتیوں کی کرسیوں میں سے ایک کرسی پر بیٹھنے کا اشارہ کیا اور بریف کیس کو احتیاط سے ایک فائلنگ کی الماری کے اوپر رکھتے ہوئے خود بھی اپنی کرسی سنبھال لی۔

''کیا مسئلہ ہے ڈالٹن؟'' اس نے سرسری لہجے میں پوچھا۔

''میں راجر کے سلسلے میں آیا تھا۔'' ڈالٹن نے اطمینان سے کرسی پر پھیلتے ہوئے جواب دیا۔ ''اسے تو تم جانتے ہی ہو گے، وہی مس ہیریٹ کا بھتیجا۔''

''تمہارا مطلب ہے کہ وہ پھر قصبے میں واپس آ گیا ہے؟'' میسن نے پیشانی پر بل ڈالتے ہوئے کہا۔

''بات اس سے بھی کچھ زیادہ ہے۔'' ڈالٹن نے بتایا۔ ''کل رات گئے اس نے مجھے آ کر پریشان کیا۔ اس کا بیان ہے کہ سام گورڈن کی ایک کاک ٹیل لاؤنج کے پارکنگ لاٹ پر کسی نے اسے کنپٹی پر ضرب مار کر بے ہوش کر دیا اور اس کے پانچ ہزار ڈالرز چرا لیے۔''

''پانچ ہزار ڈالرز۔'' میسن کی پیشانی کے بل کچھ اور گہرے ہو گئے۔

''ہاں اور راجر قسم کھاتا ہے کہ یہ رقم اس کی پھوپی نے اسے کسی خاص کاروبار میں لگانے کے لیے دی تھی۔ میں نے مس ہیریٹ سے دریافت کیا تو اس نے اپنے بھتیجے کے دعوے کی تائید کی۔''

شیرف نے غیر یقینی انداز میں ہچکچاتے ہوئے ایک لمحے کا توقف کیا۔

''تم راجر کے بارے میں جانتے ہی ہو کہ وہ کس قسم کا نوجوان ہے۔'' آخر اس نے کہا۔ ''اگر وہ پھر کسی مصیبت میں پھنس گیا ہے اور خود کو اس پریشانی سے نکالنے کے لیے یہ داستان تراش رہا ہے تو یقینی بات ہے کہ اس کی پھوپی اس کے بیان کی تردید نہیں کرے گی۔ یہی وجہ ہے کہ میں نے تم سے ملنا ضروری سمجھا۔ کیا تمہیں معلوم ہے کہ مس ہیریٹ نے حال ہی میں بینک سے کوئی بڑی رقم نکالی ہے یا قرض لی ہے؟'' اب میسن کچھ زیادہ مطمئن اور پُرسکون ہو چلا تھا۔

''حقیقت تو یہ ہے کہ اس نے کل سہ پہر ہی اپنے اکاؤنٹ سے ٹھیک پانچ ہزار ڈالرز نکالے ہیں۔'' اس نے جواب دیا۔

''اور تم نے اسے اس بارے میں کچھ مشورہ بھی نہیں دیا کہ وہ اتنی بڑی رقم نہ نکالے؟''

''بلاشبہ میں نے اسے سمجھانے کی کوشش کی تھی۔'' میسن نے کہا۔ ''جیسے ہی مجھے پتا چلا کہ وہ اتنی بڑی رقم نکلوا رہی ہے، میں نے اسے اپنے آفس میں بلا کر بات کی لیکن......'' اس نے مایوسی کے عالم میں ہاتھ

پھیلا دیے۔ ''لیکن جب وہ اپنے ارادے پر مصر رہی تو میں اسے کس طرح روک سکتا تھا۔''

شیرف نے اس طرح سر ہلایا جیسے وہ میسن کی بات اچھی طرح سمجھ رہا ہے۔

''ویسے یہ ممکن ہے کہ راجر پر کسی نے واقعی حملہ کر کے اس سے وہ رقم چھین لی ہو۔'' وہ بولا۔ ''ہمارے قصبے میں اس طرح کی وارداتیں ہو چکی ہیں۔''

''ہاں، یہ تو ہے۔''

ڈالٹن کے اندازِ نشست سے اس بات کا کوئی اظہار نہیں ہو رہا تھا کہ وہ جلد ہی رخصت ہونے کا کوئی ارادہ رکھتا ہے۔ دوسری طرف میسن ایک مرتبہ پھر مضطرب ہونے لگا تھا۔ دفتر کے باہر سے اس قسم کی آوازیں آنے لگی تھیں جن سے ظاہر تھا کہ بینک کا عملہ رفتہ رفتہ آ رہا ہے اور روز مرہ کا کام شروع ہونے ہی والا ہے۔ اس نے دزدیدہ نظروں سے بریف کیس کی طرف دیکھا اور ایک گہری سانس لی۔ وہ بریف کیس کو زیادہ دیر تک فائلنگ الماری پر چھوڑنے کی ہمت نہیں کر سکتا تھا۔ اس کے لیے دو ہی صورتیں تھیں یا تو وہ والٹ کی مخصوص دراز میں رقم پہنچا دے یا پھر ان کلرکوں کے حوالے کر دے جو لوگوں کے چیک کیش کرتے ہیں۔ پہلے کام کا موقع اب نہیں رہا تھا اور دوسرا قدم اٹھانے کے لیے ہمت درکار تھی اور اس نے فیصلہ کر لیا۔

''ایک منٹ کے لیے معاف کرنا۔'' وہ زیرِ لب بڑبڑاتے ہوئے کرسی سے اٹھا۔

اس نے فائلنگ الماری سے بریف کیس اٹھایا، اسے کھولا رقم نکالی اور اپنے آفس سے باہر نکل گیا۔ وہ سیدھا ہاروے کے پاس پہنچا جو اسے دیکھتے ہی کھڑا ہو گیا۔

''یس سر۔'' اس نے مستعدی سے کہا۔

''میں نے فیصلہ کیا ہے کہ تمام کھڑکیوں پر مزید کیش پہنچا دیا جائے۔'' میسن نے کہا۔ ''تاکہ جب پبلک کا ہجوم ہو تو وہ لوگ نقد رقم کی کمی محسوس نہ کریں۔''

اس نے ہاتھ میں پکڑی ہوئی رقم ہاروے کی طرف بڑھا دی۔

''یہ رقم تمام کلرکوں میں مناسب طور پر تقسیم کر دو۔'' اس نے کہا اور اپنے دفتر میں واپس پہنچ گیا۔ ڈالٹن اب بھی اسی اطمینان سے کرسی پر بیٹھا تھا۔

''ہاں ڈالٹن! تمہیں کچھ اور کہنا ہے؟''

''مجھے افسوس ہے کہ میں نے تمہارا خاصا وقت لے لیا۔'' ڈالٹن کرسی سے اٹھتے ہوئے بولا۔ ''لیکن اس عجیب واردات نے مجھے الجھا دیا ہے۔ میں اپنے ذہن سے یہ خیال نہیں نکال سکتا کہ......''

اس کی بات نامکمل رہ گئی کیونکہ ٹھیک اسی لمحے ہاروے آفس میں داخل ہوا۔ اس کے چہرے پر ایک عجیب سا تاثر تھا اور اس کے ہاتھوں میں ابھی تک وہ نوٹ دبے ہوئے تھے جو میسن نے اسے دیے تھے۔

''کیا بات ہے ہاروے؟'' میسن نے اسے گھور کر دیکھا۔

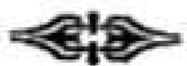
''میں ان نوٹوں کے بارے میں کچھ کہنے آیا ہوں جناب۔'' ہاروے نے جواب دیا۔ ''میری عقل میں کچھ نہیں آ رہا کیونکہ یہ وہی نوٹ ہیں جو کل میں نے مس ہیریٹ کو دیے تھے۔'' وہ ایک لمحے کے لیے ہچکچایا۔ ''میرا خیال تھا کہ آپ کے سمجھانے بجھانے کے باوجود مس ہیریٹ کیش نکالنے سے باز نہیں آئیں گی چنانچہ جس وقت وہ آپ کے پاس دفتر میں گفتگو کر رہی تھیں، میں نے اس موقع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے ان تمام نوٹوں کے نمبر نوٹ کر لیے۔ میں نے سوچا کہ ان حالات میں میری یہ احتیاط ہر اعتبار سے مناسب ہے پھر چونکہ نوٹ بڑے تھے اس لیے مجھے کچھ زیادہ زحمت بھی نہیں ہوئی تھی۔'' اس نے آگے بڑھ کر وہ نوٹ میسن کی میز پر پھیلا دیے۔

''آپ تو جانتے ہی ہیں کہ میں ہر طرح بینک اور اس کے اکاؤنٹ ہولڈروں کے مفاد کا خیال رکھنے کی کوشش کرتا ہوں۔''

اور افسوس کہ میسن کو بہت تاخیر سے اپنے کلرک کی اس مستعدی کا خیال آیا جبکہ شیرف ڈالٹن کو ممکن ہے اس وقت بھی یہ احساس نہ ہوا ہو لیکن اس کی آنکھوں میں دفعتاً بڑھتی ہوئی چمک اور میسن پر پڑنے والی نگاہ اس بات کی غمازی کرنے کے لیے کافی تھی کہ میسن نے اس کی ذہانت اور ہوشیاری کے بارے میں جو اندازہ لگایا تھا وہ قطعاً درست نہیں تھا اور یہ بات اس کی عقل میں آنے کے لیے کچھ زیادہ موٹی نہیں تھی کہ وہ نوٹ میسن کے پاس کہاں سے آئے ہوں گے۔

مرے پر سو درّے، ستم بالائے ستم یہ ہوا کہ ٹھیک اسی لمحے سیکریٹری مس فارسٹ نے ہمیشہ کی طرح مسکراتے ہونٹوں اور چہکتے ہوئے لہجے میں دروازے سے جھانکتے ہوئے اطلاع دی۔

''مسٹر میسن! حسابات کی جانچ پڑتال کرنے والے آگئے ہیں۔''



سلطان باہو علیہ الرحمۃ اللہ

ضیا تسنیم بلگرامی

کہتے ہیں کہ دولت تلاش کرنے والے لوگ اپنے باہر کے ماحول میں جستجو رکھتے ہیں جبکہ رشتوں کا احساس ڈھونڈنے والے اپنے اندر کی دنیا میں سفر کرتے ہیں۔ سلطان باہو کا شمار بھی انہی لوگوں میں ہوتا ہے جنھوں نے اپنے ہونے کا احساس اور وجہ پانے کی جستجو میں اپنے معبود برحق کی رضا کو پالیا۔ اگرچہ یہ سفر آسان نہ تھا مگر جنہیں اللہ تعالیٰ اپنی محبتوں اور عنایتوں کے لیے چن لیتا ہے ان کے لیے ہر مشکل کو آسان بھی کردیتا ہے۔ لہٰذا آپ کے لیے بھی ہر مشکل راحت میں بدلتی گئی اور دنیا حیران ہوتی گئی۔

شکم مادر میں ہی ولایت سے سرفراز ہونے والے

ولی کا قصہ



برصغیر میں دریائے اٹک کے کنارے کالا باغ میں آباد ہونے والے اعوان خاندان کے کچھ لوگ پنڈ دادن خان اور احمد آباد میں مقامی کافروں سے معرکہ آرا ہوئے اور انہیں شکستیں بھی دیں اور حلقہ بگوش اسلام بھی کیا۔ یہاں تک کہ مغل فرماں روا شاہجہاں کا زمانہ آیا تو اس دین دار بادشاہ نے ان کی بڑی عزت کی اور انہیں مناصب اور عہدے دے کر شادماں وخوشحال کردیا۔

اعوان خاندان کے ایک بزرگ بازید محمد، شاہجہاں کے منصب داروں میں ایک نمایاں مقام رکھتے تھے۔ بازید محمد کی نیکی اور علمیت کا بڑا شہرہ تھا۔ یہ حافظ قرآن ہونے کے ساتھ ساتھ منبع شریعت فقیہہ اور عالم بھی تھے۔ انہوں نے اپنے خاندان ہی کی ایک دین دار خاتون بی بی راستی سے شادی کرلی۔ بادشاہ نے انہیں کوہستان کا منصب دار بنا دیا۔ یہ کچھ عرصہ یہاں رہے پھر ملتان بھیج دیے گئے۔ ملتان میں ان کا دل لگ گیا۔ بادشاہ نے ایک بار پھر انہیں کوہستان بھیجنا چاہا مگر انہوں نے انکار کر دیا۔ بادشاہ ان سے بے حد خوش تھا۔ چنانچہ بادشاہ نے انہیں شورکوٹ ضلع جھنگ میں ایک سالم گاؤں قہرگان اور پچاس بیگھہ زمین چند آباد کنوئیں بطور انعام دیے اور آخرکار بازید محمد نے یہیں سکونت اختیار کرلی۔

شورکوٹ میں آئے ہوئے انہیں زیادہ دن نہیں گزرے تھے کہ ان کے گھر میں ایک لڑکا پیدا ہوا۔ یہ 1039ھ کا ذکر ہے۔ ماں نے اپنے بیٹے کا نام معلوم نہیں کیوں سلطان محمد باہو رکھ دیا۔ ولادت کے کچھ دنوں بعد بازید محمد کا انتقال ہوگیا اور سلطان محمد باہو کی ساری ذمے داری بی بی راستی پر آن پڑی۔

رمضان شریف کا مہینا آیا تو انہوں نے روزے رکھنے شروع کر دیے۔ انہیں اپنے بچے کا بڑا خیال تھا۔ انہیں معلوم تھا کہ اگر وہ روزے رکھیں گی تو دودھ کم ہوجائے گا اور ان کا بیٹا بھوکا رہے گا مگر انہیں یہ دیکھ کر بڑی حیرت ہوئی کہ شیرخوار سلطان محمد باہو دن میں دودھ نہیں پیتا لیکن افطار کے وقت ضرور پیتا ہے۔ بی بی راستی کئی دن تک یہ تبدیلی محسوس کرتی رہیں اور اس نتیجے پر پہنچیں کہ ان کا بیٹا مادرزاد ولی ہے جو ایام شیرخوراگی میں بھی روزے رکھ رہا ہے۔

جب سلطان باہو نے ہوش سنبھالا تو انہیں پڑھنے بٹھا دیا گیا۔ ماں نے ان پر غیرمعمولی توجہ دی اور لائق ترین اساتذہ کی نگرانی میں دے دیا۔ بہت جلد سلطان باہو کا شمار عالموں میں ہونے لگا۔ والدہ نے اپنے بیٹے میں ایک خاص بات یہ محسوس کی کہ یہ گھنٹوں مست و مستغرق بیٹھے رہتے اور کسی بات کا ہوش نہ رہتا۔ ماں اپنے بیٹے کی اس کیفیت کو بغور محسوس کررہی تھیں۔ رات کو بیٹا ان کے قریب ہی سوتا تھا۔ ماں دیکھتیں کہ سلطان باہو بہ ظاہر تو سو رہے ہیں مگر ذرا سی بھی آہٹ پر چونک کر دیکھنے لگتے۔

سلطان باہو عشا کی نماز پڑھ کر وظیفہ پڑھنے لگے۔ اس مشغلے میں ان کی آنکھ لگ گئی۔ انہوں نے عالم رویا میں دیکھا۔ ایک بزرگ ان کے پاس آئے اور کہا۔ ''باہو! یہاں کیا کر رہا ہے، میرے ساتھ چل۔''

سلطان باہو نے پوچھا۔ ''کہاں؟''

جواب ملا۔ ''وہاں جہاں کی لوگ آرزو کرتے ہیں مگر نہیں پہنچ پاتے۔''

باہو نے پھر سوال کیا۔ ''آخر کہاں؟''

پھر جواب ملا۔ ''اگر تجھ سے یہ پوچھا جائے کہ تیرے دل میں سب سے زیادہ کس کی چاہ ہے اور تو کس کا دیدار کرنا چاہتا ہے تو کیا جواب دے گا؟''

سلطان باہو نے جواب دیا۔ ''آپ کے سوال کا ایک ہی جواب ہے۔ میں عاشق صادق ہوں اور میری سب سے بڑی خواہش یہ ہے کہ مجھے رسول مقبول ﷺ کا دیدار میسر آجائے۔ اس کے علاوہ اور کچھ نہیں چاہتا۔''

ان بزرگ نے فرمایا۔ ''اس وقت میں تجھ کو وہیں لے جانا چاہتا ہوں۔ بس اب دیر نہ کر۔ اٹھ اور میرے ساتھ ہولے۔ تیری تمنا اسی وقت پوری ہوجائے گی۔''

سلطان باہو کے پورے وجود پر ایک نشہ سا طاری ہوگیا۔ وہ ان بزرگ کے ساتھ ہولیے اور ان کے پیچھے پیچھے یوں چلنے لگے کہ پاؤں رکھتے کہیں تھے اور پڑتے کہیں تھے۔ انہیں یقین نہیں آرہا تھا کہ ان کے کانوں نے جو کچھ سنا ہے، وہ سچ ہے۔

کچھ دیر بعد وہ بزرگ سلطان باہو کو ایک ایسے دربار میں لے گئے جہاں ایک ہجوم پھیلا ہوا تھا اور اس ہجوم میں جو نورانی شکل موجود تھی، ان کے چہرے کا جاہ وجلال اور باوقار جمال سلطان باہو کو مرعوب کرنے لگا۔ انہوں نے اس نورانی پیکر کو دیکھنے کی کوشش کی مگر ناکام رہے۔

ان بزرگ نے سلطان باہو کو حکم دیا۔ ''باہو! یہ دربار نبوی ﷺ ہے۔ مؤدب ایک طرف کھڑا ہوجا اور انتظار کر کہ تیری بابت کیا حکم ہوتا ہے۔ کچھ کہنے سننے کی ضرورت نہیں۔''

سلطان باھو دہشت زدہ ہو رہے تھے۔ اٹک اٹک کر پوچھا۔ ”حضرت! میرا دل زور زور سے دھڑک رہا ہے اور مجھے کچھ پتا نہیں کہ میرا کیا حشر ہونے والا ہے۔“

بزرگ نے فرمایا۔ ”اپنے حواس پر قابو رکھ۔ یہاں سے جو کچھ تجھے ملنے والا ہے، اس سے تُو ایک بلند مرتبہ حاصل کرلے گا۔“

سلطان باھو ایک طرف مؤدب کھڑے ہوگئے۔ کچھ دیر بعد دربار نبوی ﷺ سے اعلان ہوا۔ ”سلطان باھو کو بلایا جائے اور اس سے پوچھا جائے کہ وہ یہاں کیوں آیا ہے اور کیا چاہتا ہے؟“

سلطان باھو کی گھگی بندھ گئی تھی۔ ہکلا ہکلا کر جواب دیا۔ ”ایک غلام اپنے آقا سے کیا چاہتا ہے؟ اب میں اپنی زبان سے کیا عرض کروں۔“

دربارِ نبوی ﷺ سے ارشاد ہوا۔ ”تُو جو کچھ چاہتا ہے، عطا ہوا... تو اپنی ماں کا شکر گزار ہو جس نے تیرا نام باھو رکھ دیا۔ یاھو اور باھو میں صرف ایک نقطے کا فرق ہے۔“

سلطان باھو کو اپنے جسم میں اور روح میں ایک چمک اور ایک لہر سی محسوس ہوئی۔ خوف زدہ لہجے میں پوچھا۔ ”کیا میں اپنی مراد کو پہنچ گیا؟ کیا میں نے جو چاہا تھا اسے پالیا؟“

جواب ملا۔ ”اب تو واپس جاسکتا ہے۔ میں نے تجھے بیعت کیا۔ تیرا مرتبہ بلند کیا۔“

سلطان باھو پر وجدانی... کیفیت طاری ہوگئی۔ وہ بے ہوش ہوکر گر گئے۔ کتنی دیر بے ہوش رہے، انہیں کچھ پتا نہ تھا لیکن جب ہوش آیا تو وہ اپنے بستر پر پڑے تھے اور ماں ان پر جھکی ہوئی پوچھ رہی تھیں۔ ”باھو! ہوش میں آ...... سچ بتا یہ خوشبو کہاں سے آرہی ہے؟“

سلطان باھو کو اپنی ماں کی آواز صاف نہیں سنائی دے رہی تھی۔ بہ مشکل آنکھیں کھول کر اپنے ماحول کا جائزہ لینے لگے۔ ماں سے پوچھا۔ ”ماں! میں کہاں ہوں؟“

ماں نے جواب دیا۔ ”اپنے بستر پر...... میرے پاس، میرے اپنے کمرے میں۔“

سلطان باھو نے زور سے سانس... کھینچی، پوچھا۔ ”ماں! کیا وہ خوشبو جو میں محسوس کررہا ہوں، میری ناک سونگھ رہی ہے، آپ بھی محسوس کررہی ہیں...... آپ بھی سونگھ رہی ہیں؟“

ماں نے جواب دیا۔ ”ہاں میرے لعل، وہ خوشبو میں بھی محسوس کررہی ہوں، میں بھی سونگھ رہی ہوں۔ یہ عجیب سی خوشبو میں نے اپنی زندگی میں آج تک نہیں سونگھی۔“

سلطان باھو پھوٹ پھوٹ کر رونے لگے، بولے۔ ”ماں! یہ کیا ہوگیا...... ابھی ابھی میں رسول اللہ ﷺ کے دربار میں تھا۔ میں نے ان کے ہاتھ پر بیعت کی اور بے ہوش ہوگیا۔ آہ! میں اتنی جلدی کیوں بے ہوش ہوگیا۔ میں رسول اللہ ﷺ کے دربار میں تادیر کیوں نہیں رہا؟“

ماں نے سانس زور سے.... کھینچی اور جواب دیا۔ ”یہ عجیب خوشبو ہمیں یہ بتارہی ہے کہ جس دربار کا تو ذکر کررہا ہے، وہ یہیں موجود ہے پھر جدائی کیا معنی؟“

سلطان باھو نے کہا۔ ”نہیں ماں! ایسی بات نہیں ہے۔ وہ دربار یہاں نہیں ہے بلکہ یہ خوشبو جو ہم دونوں سونگھ رہے ہیں، اس دربار سے اپنے ساتھ لایا ہوں۔“

ماں نے اپنے بیٹے کی پیشانی چوم لی، بولیں۔ ”بے شک، میں تیرے جواب سے مطمئن ہوں۔ بخدا اس دربار سے آنے والے بھی اسی طرح معطر ہوجاتے ہیں۔ میں کتنی نادان اور کم عقل ہوں جو یہ کہہ بیٹھی کہ وہ مقدس اور معطر دربار یہیں موجود ہے۔“

سلطان باھو افسردہ اور ملول ہوکر بیٹھ گئے۔ ماں کو بھی بے حد ملال تھا۔ کئی دن بعد سلطان باھو نے ایک بار پھر رسول مقبول ﷺ کو خواب میں دیکھا اور درخواست کی کہ یارسول اللہ ﷺ میری روحانی تربیت کون کرے گا؟

جواب ملا۔ ”میں نے تجھ کو محی الدین عبدالقادر جیلانیؒ کے سپرد کیا۔“ اس کے بعد سلطان باھو کا ہاتھ حضرت عبدالقادر جیلانیؒ کے ہاتھ میں دے دیا۔

ایک بار پھر سلطان باھو کی خواب گاہ خوشبو سے معطر ہوگئی۔ یہ خوشبو ماں نے بھی محسوس کی اور انہیں اب اس کا شدت

سے یقین ہوگیا کہ ان کا بیٹا سلطان باہو آئندہ ایک بلند پایہ انسان ثابت ہوگا۔ انہوں نے بیٹے کو حکم دیا۔ ''اب تجھ کو کسی ولیِ کامل کی بیعت اختیار کرلینی چاہیے۔''

سلطان باہو نے عرض کیا۔ ''کیا رسول مقبول ﷺ اور شیخ عبدالقادر جیلانیؒ کے بعد بھی کسی کی بیعت ضروری ہے؟''

ماں نے جواب دیا۔ ''بیٹے باہو! یہ دنیا ہے عالم اسباب۔ یہاں باطنی اور بشری معاملات کوئی نہیں جانتا۔ دنیا ظاہری اسباب پر نظر رکھتی ہے۔ اس لیے تیرا ولی کامل سے بیعت کرنا ضروری ہے۔''

سلطان باہو ماں کے استدلال کے آگے مجبور اور بے بس ہوگئے، بولے۔''آپ کا ارشاد بجا، میں کسی ولیِ کامل کو ضرور تلاش کروں گا۔'' پھر کچھ سوچ کر عرض کیا۔ ''اور جہاں تک میری ناقص عقل کام کررہی ہے، مجھے ولیِ کامل کی تلاش میں کہیں جانا نہیں پڑے گا۔ وہ تو میرے سامنے ہی موجود ہے۔''

ماں نے پوچھا۔ ''یعنی تو کیا کہنا چاہتا ہے؟''

سلطان باہو نے جواب دیا۔ ''میں آپ کو ولی کامل سمجھتا ہوں کیوں نہ آپ ہی سے بیعت ہوجاؤں۔''

ماں نے کہا۔ ''بیٹے! بات یہ ہے کہ عورتوں کو یہ اجازت نہیں دی گئی کہ وہ کسی کو بیعت کریں۔ اس لیے میں مجبور ہوں۔''

سلطان باہو نے مایوسی سے عرض کیا۔ ''ماں! آپ ہی فرمائیں کہ پھر میں مرشد کو کہاں تلاش کروں؟''

ماں نے جواب دیا۔ ''مشرق کی طرف، بس اس طرف چلے جاؤ۔ اللہ نے چاہا تو تم اپنے مقصد میں کامیاب ہوجاؤ گے۔''

سلطان باہو نے اسی وقت گھر چھوڑ دیا اور مشرق کی طرف روانہ ہوگئے۔ یہ جہاں سے بھی گزرتے لوگوں سے یہی پوچھتے کہ اس نواح میں کوئی ایسا بزرگ ہے جو انسانوں کی ظاہری اور باطنی راہنمائی کرسکے اور ہر جگہ سے یہی جواب ملتا۔ ''ہاں، ایک شخص ہے بس ایک شخص...... شاہ حبیب اللہ صاحب۔''

سلطان باہو پوچھتے۔ ''وہ کہاں ہیں؟ ان سے کہاں ملاقات ہوسکتی ہے؟''

ہر جگہ سے ایک ہی جواب ملتا۔ ''دہلی سے پہلے کسی بھی قصبے میں ان سے ملاقات ہوسکتی ہے کیونکہ وہ تبلیغ دین کے لیے دوروں پر رہتے ہیں۔''

چنانچہ ایک جگہ سلطان باہو کی ملاقات شاہ حبیب اللہ سے ہوگئی۔ یہ شاہ صاحب سے بہت متاثر ہوئے اور ان کی خدمت میں عرض کیا۔ ''حضرت! مجھے میری ماں نے آپ کے پاس بھیجا ہے۔ کیا آپ مجھے اپنی صحبت میں رہنے کی اجازت مرحمت فرمائیں گے؟''

شاہ حبیب اللہ نے پوچھا۔ ''میں کس طرح یقین کروں کہ تم جو کچھ کہہ رہے ہو، اس میں جذبۂ صادق بھی کارفرما ہے۔''

سلطان باہو نے جواب دیا۔ ''حضرت! میں جھوٹ نہیں بولتا۔ آپ جس طرح چاہیں، میں یقین دلانے کو تیار ہوں۔''

شاہ حبیب اللہ نے پوچھا۔ ''شورکوٹ میں تیری جاگیر ہے یا نہیں؟''

سلطان باہو نے جواب دیا۔ ''ہے کیوں نہیں مگر اس سے آپ کا مطلب؟''

شاہ حبیب اللہ نے کہا۔ ''اس سے میرا مطلب یہ ہے کہ جو جاگیردار ہو جس کے پاس زمینیں ہوں، جائداد ہو، اس کے پاس دنیا کے بکھیڑوں کی کوئی کمی نہیں اور جو دنیا کے بکھیڑوں میں پھنسا ہو وہ اللہ سے کیا لو لگائے گا۔''

سلطان باہو سناٹے میں آگئے کہ یہ کس آزمائش میں ڈال دیا۔

شاہ حبیب اللہ نے متردد دیکھا تو مسکرا کر فرمایا۔ ''خاموش کیوں ہوگیا...... کیا سوچنے لگا؟ دنیا کا بکھیڑا ایسی ہی چیز ہے جو انسان کو سوچ میں ڈال دیتا ہے۔ تو بھی کیا کرے، مجبور ہے۔''

سلطان باہو نے جواب دیا۔ ''یہ بات نہیں ہے۔ میں نے جب یہ فیصلہ کرلیا ہے کہ علائقِ دنیا سے پیچھا چھڑانا ہے تو پھر فکر کس بات کی۔ آپ مجھ کو موقع دیجیے، میں آج ہی شورکوٹ واپس جارہا ہوں۔ دوبارہ جب حاضری دوں گا تو میں دنیا کے بکھیڑوں سے نجات حاصل کرچکا ہوں گا۔''

شاہ حبیب اللہ نے کہا۔ ''بہتر ہے، میں تیرا انتظار کروں گا۔''

سلطان باہو اسی دن شورکوٹ واپس چلے گئے۔ ماں نے واپس آتا ہوا دیکھا تو پوچھا۔ ''کہو بیٹے کیا خبر لائے؟ کام بنایا

نہیں؟ مرشد ملا یا نہیں؟''

سلطان باہو نے جواب دیا۔ ''ہاں، میں نے مرشد کو پالیا ہے۔''

ماں نے کہا۔ ''نہیں، ایسی بات نہیں ہے۔ مرشد ابھی تک تجھے نہیں ملا۔''

سلطان باہو نے حیرت سے پوچھا۔ ''ماں! یہ آپ کیا کہہ رہی ہیں، اگر شاہ حبیب اللہ مرشد نہیں ہیں تو اور کیا ہیں؟''

ماں نے جواب دیا۔ ''میں نے کہہ جو دیا کہ وہ مرشد تو ہیں مگر تیرے مرشد نہیں ہیں۔''

سلطان باہو نے عرض کیا۔ ''اگر وہ میرے مرشد نہیں ہیں تو انہوں نے یہ کیوں کہا کہ میں دنیا کے بکھیڑوں سے نجات حاصل کرلوں؟ اس کے بعد ان سے ملوں تاکہ وہ بیعت لے کر علوم باطنی سکھائیں۔''

ماں نے کہا۔ ''انہوں نے یہ بات ہرگز نہیں کہی کہ پہلے تو دنیا کے بکھیڑوں سے نجات حاصل کرلے، اس کے بعد ان سے بیعت ہوکر علوم باطنی حاصل کرے۔ انہوں نے صرف یہ کہا ہے کہ پہلے تو دنیا کے بکھیڑوں سے نجات حاصل کر اس کے بعد ان سے مل۔''

سلطان باہو کو یاد آیا کہ واقعی شاہ حبیب اللہ نے یہی کہا تھا۔ ماں کے قدموں میں گر کر عرض کیا۔ ''ماں! آپ تو خود ولی ہیں۔ مجھے اور کسی ولی کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔''

ماں نے جواب دیا۔ ''لیکن افسوس! جیسا کہ پہلے میں کہہ چکی ہوں کہ عورتوں سے بیعت ہونے کا حکم نہیں دیا گیا ہے تو پھر میں تجھ کو کس طرح بیعت کرلوں؟''

سلطان باہو نے کہا۔ ''ماں! میں کیا کروں؟ میرے ساتھ جو کچھ ہورہا ہے، آپ اس سے اچھی طرح واقف ہیں لیکن میں آپ سے بیعت نہیں ہوسکتا۔''

ماں نے جواب دیا۔ ''سرِدست تو یہ کر کہ تجھ کو شاہ حبیب اللہ نے جو حکم دیا ہے تو اس پر عمل کر...... اللہ جو کچھ کرے گا اچھا ہی کرے گا۔''

سلطان باہو نے کہا۔ ''شاہ صاحب نے مجھ کو حکم دیا ہے کہ میں دنیا کے بکھیڑوں سے نجات حاصل کرکے ان کے پاس پہنچوں تو وہ میرے لیے کچھ کریں گے۔ اس سلسلے میں آپ کا کیا حکم ہے؟''

ماں نے جواب دیا۔ ''اس سلسلے میں میرا کیا حکم چلے گا۔ شاہ صاحب نے جو حکم دیا ہے، اس پر عمل کرو۔''

سلطان باہو نے عرض کیا۔ ''اگر میں شاہ صاحب کے حکم پر عمل کروں گا تو آپ کا کیا ہوگا؟''

ماں نے کہا۔ ''بیٹے! تو میری فکر نہ کر۔''

سلطان باہو نے اپنا سب کچھ راہِ خدا میں دے کر فراغت حاصل کرلی اور تہی دست و تہی داماں حبیب اللہ کی خدمت میں روانہ ہوگئے۔

کئی دن بعد جب یہ شاہ صاحب کی خدمت میں پہنچے تو انہوں نے ان کا بڑی گرم جوشی سے استقبال کیا۔ سلطان باہو نے عرض کیا۔ ''حضرت! آپ نے جو کچھ فرمایا تھا، اس پر عمل درآمد کرکے آگیا ہوں۔ اب تو آپ مجھے بیعت کرلیں۔''

شاہ صاحب نے فرمایا۔ ''باہو! میں خوش ہوں کہ میں نے جو کچھ کہا تھا تو نے اس پر ہو بہو عمل کرکے مجھے شاد ماں کیا لیکن افسوس کہ میں تجھ کو بیعت نہیں کرسکتا۔''

سلطان باہو نے پوچھا۔ ''وہ کیوں؟ آخر کیوں؟''

شاہ صاحب نے جواب دیا۔ ''کیا تیری ماں نے تجھ کو کچھ بھی نہیں بتایا؟''

باہو نے کہا۔ ''انہوں نے بتایا تو تھا کہ میں کچھ بھی کروں گا مگر آپ مجھ کو بیعت نہیں کریں گے۔''

شاہ صاحب نے کہا۔ ''بے شک! تیری ماں روشن ضمیر ہے۔ تو جس مرتبے کا مالک ہے، میں اس کا اہل نہیں کہ تیری تربیت کروں۔ بہرحال تو دہلی چلا جا۔ وہاں تجھ کو شیخ عبدالرحمٰن قادری ملیں گے تو ان کے پاس چلا جا۔ وہی تیری تربیت کرسکیں گے۔ ورنہ یہ کام میرے بس کا نہیں ہے۔''

باہو نے مایوسی سے عرض کیا۔ ''تو اس کا یہ مطلب ہوا کہ اب میں دہلی جاؤں اور وہاں دربدر کی ٹھوکریں کھا کر میں شیخ عبدالرحمٰن قادری کو تلاش کرتا پھروں۔''

شاہ صاحب نے متانت سے جواب دیا۔ ''بے شک، بے شک، میں جو کہہ رہا ہوں، اس کو بطورِ خاص ذہن نشین کرلے کیونکہ یہ خشتِ اول ہے۔ اگر پہلی اینٹ ہی غلط کردی گئی تو پوری عمارت میں کجی آجائے گی اور پھر کوئی طاقت بھی اس کو سیدھا اور

مضبوط نہیں کر سکے گی۔''
باہو چپ ہو گئے، کچھ دیر بعد پوچھا۔ ''حضرت! آپ نے میری بابت کیا فیصلہ کیا؟''
شاہ صاحب نے جواب دیا۔ ''میں نے کہہ جو دیا کہ یہاں سے تجھ کو دہلی جانا ہے۔ وہاں تو شیخ مرشد کو بتائے گا کہ تجھ کو میں نے ان کی خدمت میں بھیجا ہے اور کچھ نہیں بتائے گا تو تجھے خود ہی مصیبتوں میں گرفتار ہو جانا پڑے گا۔''
سلطان باہو دو دن شاہ صاحب کی خدمت میں رہ کر دہلی چلے گئے۔ ابھی یہ دہلی میں داخل ہی ہوئے تھے کہ ایک شخص ان کے پاس آیا اور بڑی مجسسانہ نظریں ڈال کر پوچھا۔ ''نوجوان! تمہارا نام کیا ہے؟''
''تم میرا نام جان کر کیا کرو گے؟'' باہو نے پوچھا۔
اجنبی شخص نے جواب دیا۔ ''میں شیخ عبدالرحمٰن قادری کا مرید ہوں اور ان ہی کے ایما پر میں یہاں آیا ہوں۔ میں شیخ جی کے پاس کیا منہ لے کر جاؤں گا۔''
باہو نے کہا۔ ''آپ لوگ خود بھی بہت جانتے ہیں۔ کیا میرے لیے کوئی خاص حکم لے کر آئے ہو؟''
اجنبی شخص نے کہا۔ ''ابھی ابھی پیر و مرشد نے مجھے حکم دیا تھا کہ شورکوٹ کا سلطان باہو آ رہا ہے۔ اس کو عزت واحترام سے میرے پاس لایا جائے۔''
سلطان باہو نے سوال وجواب کا سلسلہ بند کر دیا اور شیخ عبدالرحمٰن قادری کی خدمت میں روانہ ہو گئے۔ شیخ عبدالرحمٰن قادری نے ان کے پہنچنے سے پہلے ہی حجرے سے باہر نکل کر ادھر ادھر دیکھا۔ جب کوئی نظر نہ آیا تو بولے۔ ''یہ باہو آخر رہ کہاں گیا۔ اتنی دیر میں تو میرے پاس آجانا چاہیے تھا۔''
ابھی ان کا فقرہ پورا بھی نہ ہوا تھا کہ سلطان باہو ان کے پاس پہنچ گئے اور مؤدبانہ سلام عرض کیا۔ شیخ قادری نے انہیں بڑی دعائیں دیں۔ انہوں نے پوچھا۔ ''باہو! کیا تیری ماں تیرے لیے کافی نہیں تھی؟''
باہو نے جواب دیا۔ ''تھی کیوں نہیں لیکن انہوں نے مجھے بیعت کرنے سے منع کر دیا تھا۔''
شیخ قادری نے مسکرا کر کہا۔ ''بے شک اس کو انکار ہی کر دینا تھا۔ خیر، اب تو مجھ سے کیا چاہتا ہے؟''
باہو نے جواب دیا۔ ''میں اپنے رب کی تلاش میں نکلا ہوں اور جب تک اس کو نہ پالوں یا اس کے خاص اشارے سمجھ نہ لوں، میں یہیں رہوں گا۔ واپس نہیں جاؤں گا۔''
شیخ قادری نے بڑی محبت سے کہا۔ ''اچھا اگر یہ بات ہے تو، تو اسی وقت میرے ساتھ حجرے میں چل۔ تو بھی کیا یاد کرے گا کہ کسی مرشد سے واسطہ پڑا تھا۔''
باہو اسی وقت مرشد کے ساتھ ان کے حجرے میں چلے گئے۔ وہاں شیخ قادری نے ذرا سی دیر میں سلوک کے مدارج طے کرا دیے۔ باہو کو ذرا سی دیر میں یہ محسوس ہونے لگا کہ وہ صاحب کمال ہو چکے ہیں۔
دوسرے دن باہو اپنی حالت اور مقام کا پتا چلانے کے لیے باہر نکلے اور بازاروں میں گھومنے پھرنے لگے۔ ایک جگہ باہو نے ایک نابینا شخص کو اپنے اعصا کے سہارے چلتے دیکھا تو اس کے پاس پہنچ گئے اور اس کے داہنے شانے پر اپنا ہاتھ رکھ کر پوچھا۔ ''اے شخص تو پیدائشی نابینا ہے؟''
نابینا نے ایک سرد آہ بھری اور عرض کیا۔ ''ہاں جناب! میں پیدائشی نابینا ہوں۔''
باہو نے جواب دیا۔ ''یہ تو کوئی ایسی بات نہیں ہے۔ بینائی ابھی آجاتی ہے۔'' اس کے بعد شیخ مرشد سے اجازت لیے بغیر باہو نے کچھ پڑھ کر اس کی آنکھوں پر دم کیا اور کہا۔ ''ذرا پیچھے ہٹ کر کھڑے ہو جاؤ۔''
نابینا چند قدم ہٹ کر کھڑا ہوا تو اس کی بند آنکھوں تلے لاتعداد جگنو نظر آنے لگے۔ اس شخص نے یہ حیرت انگیز منظر دیکھا تو اس کو کسی بات کا یقین ہی نہیں آیا۔ وہ چپ چاپ خاموش کھڑا رہا۔
آخر باہو نے پوچھا۔ ''اے شخص! تیرا کیا حال ہے؟''
اس نے جواب دیا۔ ''پیرو مرشد! اب مجھ کو نظر آ رہا ہے۔ دکھائی دے رہا ہے۔ میری آنکھوں تلے روشنیاں رقص کر رہی ہیں۔''
باہو نے کہا۔ ''اگر تجھ کو تیری بینائی واپس مل گئی ہے تو، تو اپنے رب کا شکر ادا کر۔''
وہ شخص سجدے میں گر گیا۔

☆☆☆

کئی دن بعد باھو نے ایک اور شخص کو گھسٹ گھسٹ کر چلتے دیکھا۔ اس شخص کی ایک ٹانگ فالج زدہ تھی جو سوکھ کر بیکار ہو گئی تھی۔ باھو نے اس سے پوچھا۔ ''یہ تیری ٹانگ کو کیا ہوا؟''

اس شخص نے جھنجلا کر جواب دیا۔ ''جو کچھ ہو گیا ہے کیا تجھ کو نظر نہیں آ رہا؟ میرا آدھا دھڑ فالج نے ناکارہ کر دیا ہے۔''

باھو نے ہنس کر کہا۔ ''وہ تو میں بھی دیکھ رہا ہوں مگر یہ تو بتا کہ تو نے اس کا علاج کیوں نہیں کرایا؟''

اس نے جواب دیا۔ ''میں نے اس کا بہت علاج کرایا مگر تھک ہار کر چپ ہو رہا۔ کسی دوا نے فائدہ ہی نہیں کیا تو میں نے صبر کر لیا اور اس کی رضا کے آگے خاموشی اختیار کر لی۔''

باھو نے کہا۔ ''کیا میں تیری ٹانگ ٹھیک کر دوں؟''

اس شخص نے حیرت سے پوچھا۔ ''تو میری ٹانگ کو ٹھیک کر دے گا؟''

باھو نے جواب دیا۔ ''ہاں! میں تیری ٹانگ ٹھیک کر سکتا ہوں۔''

اس شخص نے چڑ کر کہا۔ ''کیا تو خدا ہے؟''

باھو نے جواب دیا۔ ''میں خدا تو نہیں ہوں لیکن خدا کا بندہ ضرور ہوں اور خدا نے مجھے ایسی خوبی عطا فرمائی ہے کہ میں تیری ٹانگ ٹھیک کر سکتا ہوں۔''

اس شخص نے کہا۔ ''اگر یہ بات ہے تو پھر انتظار کس بات کا۔ میں بھی تو تیری کرامت دیکھوں۔ خالی خولی باتیں ہی کر سکتا ہے یا وہ کام بھی کر سکتا ہے جس کا تو دعوے دار ہے۔''

باھو نے جواب دیا۔ ''میں تیری فالج زدہ سوکھی ٹانگ اسی وقت درست کر سکتا ہوں۔''

وہ شخص عاجز آیا ہوا تھا۔ ''تب پھر کرنا، انتظار کس بات کا؟''

باھو نے چپکے چپکے بارگاہ ایزدی میں مناجات کی اور پھر درخواست کی۔ ''اے میرے رب! اس مجبور شخص کی ٹانگ درست فرما دے۔ اپنے محبوب ﷺ کے صدقے میں۔''

اس کے بعد آپ نے اس شخص سے کہا۔ ''میں تیرے حق میں دعا کر رہا ہوں۔ اثر کے لیے چند دن درکار ہیں۔ اگلے ہفتے ملنا۔''

وہ شخص تو مایوس تھا ہی، بولا۔ ''اگر یہ کہتے ہو تو انتظار کر لوں گا۔ حالانکہ امید تو نہیں۔''

چنانچہ ایک ہفتے بعد جب وہ دوبارہ آپ سے ملا تو اس کے پاؤں کا لنگ دور ہو چکا تھا۔ وہ فرطِ عقیدت سے آپ کے قدموں میں گر گیا۔ فالج زدہ حصے میں دوران خون جاری ہو چکا تھا۔ جب اس واقعے کی اطلاع اطبا کو ہوئی تو انہوں نے اس پر یقین کرنے سے انکار کر دیا لیکن جب اپنی آنکھوں سے دیکھا تو عجز و تحیر کا اظہار کیا۔

☆☆☆

سلطان باھو کی کرامات کا چرچا ہونے لگا۔ لوگوں نے ان کے مرشد عبدالرحمٰن قادری سے عرض کیا کہ باھو کو روکیے۔ اس نے کشف و کرامات کو عام کر دیا ہے۔ جس پر بھی نظر ڈال دیتا ہے، اس کی کایا پلٹ جاتی ہے۔

مرشد نے اسی وقت سلطان باھو کو طلب کیا۔ اس وقت مرید اور مرشد کے پاس وہ لوگ بھی موجود تھے جنہیں سلطان باھو سے حسد تھا۔ وہ دل ہی دل میں خوش ہو رہے تھے کہ آج خبر لی جائے گی اور وہ اس کا نظارہ اپنی آنکھوں سے کر سکیں گے۔

مرشد نے پوچھا۔ ''کیوں باھو! یہ میں کیا سن رہا ہوں؟''

سلطان باھو نے حیرت سے سوال کیا۔ ''آپ کیا سن رہے ہیں؟ ذرا وضاحت بھی فرما دیں تو نوازش ہو گی۔''

مرشد نے کہا۔ ''میں نے سنا ہے تو نے کشف و کرامت کو عام کر دیا ہے...... کیا یہ درست ہے؟''

سلطان باھو نے جواب دیا۔ ''آپ نے جو کچھ سنا ہے، وہ درست سنا ہے۔ آپ نے مجھ پر ایسی نظرِ کرم ڈالی کہ میں خاک تھا پاک ہو گیا۔ مٹی تھا سونا ہو گیا۔ بے کار تھا، کارآمد ہو گیا۔ نالائق تھا لائق ہو گیا۔ میں نے اپنے آپ میں نمایاں انقلاب محسوس کیا، تبدیلیاں پائیں۔ مجھے ایسا لگا کہ میں کچھ ہو گیا ہوں۔ بس یہ دیکھنے کے لیے کہ میں کیا ہو گیا ہوں اور میں کیا کچھ کر سکتا ہوں، چھوٹے چھوٹے تجربے کرنے لگا ہوں۔ ان تجربوں میں کامیاب ہوا۔ میرے حاسد اس کو برداشت نہ کر سکے۔ انہوں نے آپ سے شکایت کر دی۔ اگر میں خطاکار ہوں تو سزا کا حق دار ہوں۔ حاضر ہوں، سزا سنائیں میں بھگتنے کو تیار ہوں۔''

اس جواب نے مرشد کو بے حد خوش کر دیا۔ حاضرین پر نظر ڈالی اور فرمایا۔ ''تم سب نے سلطان باھو کا جواب سن لیا۔ اب کیا کہتے ہو؟ اس کو کیا سزا ملنی چاہیے؟''

لوگوں کے منہ بند ہو چکے تھے پھر بھی جو حسدِ مجسم تھے، انہوں نے عرض کیا۔ ''ہم پیرومرشد کو کیا مشورہ دیں گے۔ آپ نے سلطان باہو کو نعمت خاص مرحمت فرمائی۔ انہوں نے اس نعمت کو عام کردیا ہے۔ ہمارے خیال میں یہ گستاخی ہے۔ اب اس کی کیا سزا ہوسکتی ہے، آپ خود ہی تجویز فرمائیں۔''

مرشد نے جواب دیا۔ ''بے شک سلطان باہو سزا کا مستحق ہے اس نے جو کچھ کیا ہے، اس کی میرے پاس یہ سزا ہے کہ اس نعمتِ خاص میں مزید اضافہ کردیا جائے۔'' پھر سلطان باہو سے کہا۔ ''جا میں نے تجھے زبان کی شیرینی اور عرفان بخش دیا۔ تیرے منہ سے نکلے ہوئے الفاظ لوگوں کے دلوں میں گھر کریں گے اور تیرے کلام کی تاثیر انسانوں کو تیرا والہ وشیدا بنادے گی۔''

حاسدوں کے چہرے اتر گئے۔ سلطان باہو کو اب تک جو کچھ ملا تھا، اس میں مزید اضافہ ہوگیا۔

اس کے بعد مرشد نے حاضرین سے کہا۔ ''جس نے دوسروں کی فکر کی اور اپنے اعمال سے غافل ہوا، وہ کہیں کا بھی نہ رہا۔ لوگو، اپنی فکر کرو، اپنے اعمال پر نظر رکھو۔''

لوگوں کی سرزنش ہوگئی تھی اس لیے وہ کچھ عرصے کے لیے خاموش ہوگئے۔ عبدالرحمٰن قادری نے جب یہ سمجھ لیا کہ حاسد اپنی شرارتوں سے باز نہیں آئیں گے تو انہوں نے سلطان باہو کو بلا کر حکم دیا۔ ''باہو! اگر تم خوشی سے یہاں رہنا چاہو تو شوق سے رہو اور اگر شورکوٹ جانا چاہو تو اس کی بھی میری طرف سے اجازت ہے۔''

سلطان باہو نے عرض کیا۔ ''آپ مجھے کیوں رخصت کرنا چاہتے ہیں؟''

مرشد نے جواب دیا۔ ''مجھے جو کچھ دینا تھا، تمہیں دے دیا۔ اس میں مزید اضافہ تم عبادت و ریاضت سے کرو۔ میرا کام ختم ہوا۔''

سلطان باہو بہ چشمِ نم شورکوٹ کے لیے روانہ ہوگئے۔ آپ کی ماں نے بیٹے کو جس حال میں پایا اس سے بہت خوش ہوئیں۔ جو زمین بچ رہی تھی، اس پر کھیتی باڑی کرنے لگے۔ ہر کام خود کرتے۔ اس کے ساتھ ساتھ رشد وہدایت کا سلسلہ بھی جاری رہا۔ شورکوٹ میں ارادت مندوں کا ہجوم رہنے لگا۔ آپ کی تعلیمات اور عرفان کا شہرہ ہونے لگا۔

سلطان باہو زیادہ پڑھے لکھے نہیں تھے۔ اس لیے علماء ان کو خاطر میں نہیں لاتے تھے۔ انہیں حیرت تھی کہ یہ کم پڑھا لکھا شخص عوام میں اتنا مقبول کیوں ہوگیا۔ بعض عالم آپ کے پاس محض اس لیے آتے کہ آپ کے علم وفضل کا امتحان لیں۔

ایک دن ایک عالم آپ کے پاس آیا۔ بظاہر وہ ارادت مند بن کر آیا تھا لیکن وہ حقیقتاً آپ کا امتحان لینے آیا تھا۔

اس نے آپ سے دورانِ گفتگو پوچھا۔ ''میں آپ کے پاس اس لیے آیا ہوں کہ فقر کی بابت آپ کی رائے معلوم کروں۔ کیونکہ فقر کے بارے میں مختلف صوفیائے کرام نے مختلف معنی بتائے ہیں۔ فقر سے آپ کی کیا مراد ہے؟''

آپ نے جواب دیا۔ ''تم تو عالم ہو۔ مجھ سے فقر کے معنی پوچھ رہے ہو۔ پھر بھی اگر تم اس کے معنی مجھ سے معلوم کرنا چاہتے ہو تو سنو، فقر میں تین حرف ہیں۔ ف ق ر۔ ف سے فنائے نفس، ق سے قہر دُنفس اور ر سے رضا...... یہ رضائے الٰہی اسی طرح سے ف سے فخر، ق سے قرب اور ر سے راز ہے۔ یہ مراتب انہیں حاصل ہوتے ہیں جو فقر محمدی ﷺ حاصل کرلیتے ہیں۔ اگر کسی کو یہ مراتب حاصل نہ ہوئے تو پھر ف سے فضیحت، ق سے قہرِ خدا اور ر سے رُو مراد ہے۔''

عالم آپ کی زبان سے یہ سب سن کر سکتے میں آگیا۔ اس کو یقین نہیں آرہا تھا کہ یہ سب ایک کم پڑھا لکھا شخص کہہ رہا ہے۔

عالم نے ایک سوال اور کیا۔ پوچھا۔ ''حضرت! آپ کی نظر میں فقیر کی کیا تعریف ہے؟''

سلطان باہو نے جواب دیا۔ ''پہلے تمہیں مرشد کی بابت پوچھنا چاہیے تھا۔''

عالم نے کہا۔ ''اگر مرشد کی تعریف جاننا ضروری ہے تو پہلے اس کی تعریف فرمادیجیے۔''

سلطان باہو نے جواب دیا۔ ''مرشد تین قسم کے ہوتے ہیں۔ اول مرشد مرشدِ کامل۔ یہ طالب کے حق میں رحمت ہوتا ہے۔ دوم مرشدِ ناقص جو طالب کے حق میں زحمت ہوتا ہے۔ ان دو کے علاوہ ایک مرشد اور ہے۔ یہ تیسرا مرشد دنیاوی مراعات اور مناصب حاصل کرنے میں اپنا جواب نہیں رکھتا اور یہاں تک ترقی حاصل کرلیتا ہے کہ مرتبہ فرعون بھی اس کے لیے ایک معمولی مقام ہوتا ہے۔ ان تین کے علاوہ ایک چوتھی قسم کا مرشد بھی ہوتا ہے۔ یہ مرشدوں کی ذلیل ترین قسم ہے۔ یہ مرشد نہ تو مراتب دنیا ہی حاصل کرتا ہے اور نہ ہی اسے مقاماتِ معرفت کا علم ہوتا ہے۔ یہ مرشد دونوں جہاں کی ذلت اور رسوائی اپنے سر لیتا ہے۔''

سلطان باہو کی عالمانہ باتوں نے عالم کو زچ کرکے رکھ دیا۔ وہ خود کو سلطان باہو سے اعلیٰ وافضل سمجھ کر آیا تھا۔ اس کا ارادہ تھا کہ وہ سلطان باہو کو اپنی عالمانہ باتوں سے اتنا مرعوب اور متاثر کرلے گا کہ باہو ان سے درخواست کریں گے کہ عالم انہیں اپنا

مرید کرلے لیکن یہاں تو معاملہ ہی الٹ گیا تھا۔

سلطان باھو نے بولنا شروع کیا۔ ''لوگو! خدا کی طرف آؤ۔ اپنے دلوں سے غرور و تکبر کو نکال دو۔'' وہ بولتے بولتے خاموش ہوگئے مگر پھر اچانک بولنے لگے۔ ''مگر افسوس کہ خدا کی طرف آنا کیا معنی۔ وہ اس سے بھاگتے اور گریز کرتے ہیں۔ حالانکہ ان پر معرفتِ الٰہی کی جھلک تک نہیں پڑی۔ مگر وہ اپنے آپ کو عارف اور صاحب حضور جانتے ہیں۔ جبکہ یہ لوگ درحقیقت بے معرفت اور مقامِ حضور سے کوسوں دور ہیں۔ یہ اپنے کشف و کرامت اور بدعت و استدراج میں مغرور رہتے ہیں۔ یہ دنیائے دوں اور سیم وزر میں شب و روز خراب اور پریشان رہتے ہیں۔''

اب عالم سرنگوں و شرمسار ہوچکا تھا۔ بولا۔ ''حضرت! اب برداشت کی طاقت نہیں رہی۔ مجھے اپنے مریدوں اور ارادت مندوں میں شامل فرمالیں۔''

سلطان باھو نے فرمایا۔ ''رسولِ مقبول ﷺ کی متابعت اختیار کر۔ اس کے بعد کسی اور کی ضرورت نہیں رہے گی۔ زندگی بھر اس حقیقت کو ذہن نشین رکھ کہ جو شخص بھی رسول اللہ ﷺ کی متابعت کے بغیر کسی اور شخص یا شے کی راہبری اور پیشوائی پر بھروسا کرے گا وہ خود بھی گمراہ ہوگا اور دوسروں کو بھی گمراہ کرے گا۔''

عالم نے سوال کیا۔ ''میں نے ایسے صوفی بھی دیکھے ہیں جن کے کئی افعال شرعِ محمدی ﷺ کے خلاف ہیں۔ ان کے بارے میں آپ کی کیا رائے ہے؟''

آپ نے جواب دیا۔ ''اگر کسی صوفی کا ایک فعل بھی شرعِ محمدی ﷺ کے خلاف ہے تو وہ صوفی نہیں بلکہ شیطان ہے۔ اس سے کنارہ کشی اختیار کرنا چاہیے۔''

عالم نے دوسرا سوال کیا۔ ''حضرت! آپ کی باتوں نے مجھے مست و مسحور کر رکھا ہے۔ آپ الفاظ و معانی پر سے نقاب اتارتے چلے جارہے ہیں۔ ابھی چند سوال اور باقی ہیں جو میرے دل و دماغ میں کلبلا رہے ہیں۔ براہِ کرم یہ بھی بتاتے چلیے کہ یہ سخاوت کیا چیز ہے اور اس کا مقصد اور مطلب کیا ہوتا ہے؟''

سلطان باھو نے جواب دیا۔ ''سخاوت کرنے سے خلق اللہ کا حق ادا ہوجاتا ہے اور ہمیں یہ بھی معلوم ہوجاتا ہے کہ صاحبِ مال کو اللہ کے مقابلے میں اپنے مال سے کتنی محبت ہے؟''

عالم نے پوچھا۔ ''مزید کچھ یا بس؟''

آپ نے جواب دیا۔ ''فقر اور معرفتِ الٰہی دریائے رحمت کی موجیں ہیں اور سخاوت اور کرم وہ صفات ہیں جو پُل کی طرح خدا سے ملادیتی ہیں۔''

عالم سر دھنتا رہا۔ وہ وجدانی کیفیت میں مبتلا ہوچکا تھا۔ ''حضرت! میں ایک بار پھر مرشد کی طرف آتا ہوں۔ آپ یہ بتائیں کہ مرشد کی باطنی باتوں سے مریدوں کو کیا فائدہ پہنچتا ہے؟''

سلطان باھو نے جواب دیا۔ ''پیر و مرشد میں اتنی باطنی قوت ضرور ہونی چاہیے کہ وہ اس کی مدد سے اپنے مریدوں کی بروقت خبر گیری کرسکے اور ان کو گناہ و معصیت سے روک سکے اور جب کوئی مرید جاں کنی کی حالت میں مبتلا ہو تو اس نازک وقت میں اللہ تعالیٰ اور رسول اللہ ﷺ سے دعا اور عرض کرسکے...... لیکن جو مرشد اس نازک وقت سے صحیح و سالم نہ گزار سکے، وہ پیر و مرشد نہیں ہوسکتا۔''

عالم نے عرض کیا۔ ''اس کے تو یہ معنی ہوئے کہ پیری اور مرشدی بہت مشکل چیزیں ہیں۔''

آپ نے جواب دیا۔ ''بے شک، اس میں کیا شک۔ پیری مریدی کوئی معمولی کام نہیں۔ یہ ایک راز و نیاز سِرّ و اسرار ہے۔''

عالم نے کہا۔ ''حضرت! کوئی نصیحت؟''

آپ نے فرمایا۔ ''اے عالم! یاد رکھو کہ دنیا والے دنیا اور مال و زر کے غلام ہوتے ہیں لیکن فقیر جو عارف باللہ بھی ہو، مال و زر اور دنیا کو غلام بنا کر رکھتا ہے۔ حرص و حسد سے دور رہ کیونکہ ان کا انجام آخر کار ذلت و خواری ہوتا ہے۔ اگر تو چاہتا ہے کہ کامران و بامراد رہے تو چاروں نفسوں کے پرندوں کو ذبح کردے۔''

عالم نے حیرت سے پوچھا۔ ''چاروں نفسوں کے پرند کیا ہوتے ہیں؟''

آپ نے جواب دیا۔ ''شہوت کا مرغ، حرص کا کوا، زینت کا مور اور حسد کا کبوتر۔''

عالم نے عرض کیا۔ ''اب میں اس در کو چھوڑ کر کہاں جاؤں گا۔ خدا کے لیے مجھے اپنی حضوری سے دور نہ کیجیے گا۔''

آپ نے فرمایا۔ ''میری حضوری کوئی معنی نہیں رکھتی۔ اللہ کا قرب اور اس کی حضوری حاصل کرنے کی فکر کر۔''

☆☆☆

آپ کھیتی باڑی خود کرتے تھے۔ آپ کی شہرت دور دور تک پہنچ چکی تھی۔ لوگوں نے ان کے بارے میں عجیب عجیب تصور قائم کر رکھے تھے۔ آپ کے پاس آنے والوں میں ان کی اکثریت تھی جو آپ سے کچھ حاصل کرنا چاہتے تھے۔ ان میں دنیادار بھی تھے اور دین دار بھی۔

آپ تاروں کی چھاؤں میں نکل جاتے اور زمینوں پر ہل خود چلاتے۔ ایک دن کہیں دور دراز سے ایک شخص آپ سے ملنے آیا۔ اس شخص نے سنا تھا کہ سلطان باہو جو چاہتے ہیں، وہ ہو جاتا ہے۔ جس پر نظر ڈال دیتے ہیں، وہ کامل ہو جاتا ہے۔ یہ شخص سونے چاندی کا عاشق تھا۔ اس کی یہی ہوس شورکوٹ کھینچ لے گئی۔ جب یہ گھر پہنچا اور سلطان باہو کی بابت دریافت کیا تو معلوم ہوا وہ کھیت میں ہوں گے۔ یہ پتا پوچھتا ہوا کھیت پہنچ گیا۔ اس نے دور ہی سے کسی کو ہل چلاتے دیکھا تو ایک راہ گیر سے پوچھا۔ ''اے بھائی! کیا تم یہیں کے رہنے والے ہو؟''

راہ گیر نے کہا۔ ''ہاں، میں یہیں رہتا ہوں۔ کیا بات ہے؟''

اس شخص نے پوچھا۔ ''تب پھر تم سلطان باہو سے بھی واقف ہو گے؟''

راہ گیر نے کہا۔ ''ہاں، میں ان سے بھی واقف ہوں اور یہاں کون ایسا ہے جو سلطان باہو سے واقف نہ ہو۔''

اس شخص نے کہا۔ ''مجھے سلطان باہو کی کشش کھینچ لائی ہے۔ ان کے گھر گیا تھا، معلوم ہوا کھیتوں میں گئے ہیں۔ میں انہی کو تلاش کرتا ہوا یہاں تک آ گیا ہوں۔ براہ کرم تم مجھے ان کے پاس پہنچا دو۔''

راہ گیر نے کھیت میں ہل چلاتے ہوئے شخص کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ ''وہ رہے سلطان باہو، جاؤ کھیت میں ان سے مل لو۔''

آنے والے نے حیرت سے سلطان باہو کی طرف دیکھا اور پوچھا۔ ''تو یہ ہیں سلطان باہو......لیکن مجھے یقین نہیں آرہا۔''

راہ گیر نے پوچھا۔ ''یقین کیوں نہیں آرہا؟''

اجنبی نے جواب دیا۔ ''اس لیے کہ اتنا بڑا آدمی یوں ہل نہیں چلا سکتا۔ کیا ان کے مرید اور ارادت مند ان کے لیے یہ کام نہیں کر سکتے؟''

راہ گیر نے کہا۔ ''سلطان باہو کہتے ہیں کہ جب رسول ﷺ بھی خود محنت کیا کرتے تھے تو انہیں بھی اپنا کام خود کرنا چاہیے۔ وہ اپنے مریدوں اور ارادت مندوں کو یہ زحمت نہیں دیتے۔''

اجنبی خاموش ہو گیا۔ راہ گیر نے اپنی راہ لی۔ سلطان باہو تپتی دھوپ میں ہل چلا رہے تھے۔ سارا جسم پسینے میں شرابور تھا۔ اجنبی شخص نے سوچا کہ یہ شخص کسان تو ہو سکتا ہے مگر کچھ اور نہیں ہو سکتا۔ یقیناً لوگوں نے خوش عقیدگی میں بہت کچھ مشہور کر رکھا ہے۔ اگر یہ صاحب کرامت ہیں تو اپنی کرامت کے بل پر ہل چلائے بغیر زمین کو جوت بو کیوں نہیں دیتے۔ انہی خیالوں میں وہ پریشان اور ہلکان ہو گیا اور آخر کار یہ فیصلہ کیا کہ ان سے ملے بغیر ہی واپس جانا چاہیے کیونکہ جو شخص خود اپنے لیے کچھ نہیں کر سکتا، وہ دوسروں کے لیے کیا کرے گا۔

اس شخص نے واپسی کا فیصلہ کیا اور جدھر سے آیا تھا اسی طرف واپس ہو گیا۔ ابھی وہ زیادہ دور نہیں گیا تھا کہ کسی نے اسے آواز دی۔ ''اے شخص! کہاں چلا، ذرا ادھر تو آ۔''

اس نے پلٹ کر دیکھا۔ سلطان باہو اسے بلا رہے تھے۔ اس نے دور ہی سے اشاروں سے پوچھا۔ ''کیا میں......؟ آپ مجھ سے مخاطب ہیں؟''

سلطان باہو نے جواب دیا۔ ''ہاں، میں تجھ ہی سے مخاطب ہوں۔ میرے پاس آ۔ تجھ سے باتیں کرنے کو جی چاہتا ہے۔''

وہ شخص آپ کے پاس پہنچ گیا۔ بولا۔ ''فرمائیے، مجھے کیوں یاد فرمایا؟''

آپ نے فرمایا۔ ''تو کتنی دور سے میری تلاش میں آیا ہے اور افسوس کہ جب میرے پاس پہنچا تو مجھ سے ملے بغیر ہی واپس جا رہا ہے۔''

اس شخص نے بات بنانی چاہی۔ ''یہ بات نہیں ہے۔ میں نے سوچا کہ آپ اپنے کام میں مشغول ہیں۔ شام کو ملاقات کر لوں گا۔''

حضرت سلطان باہوؒ

آپ نے فرمایا۔ ''جھوٹ بولنے کی ضرورت نہیں، میں جانتا ہوں کہ تو کیوں واپس جارہا تھا۔''
اس نے پوچھا۔ ''میں کیوں واپس جارہا تھا؟''
آپ نے جواب دیا۔ ''تو نے سوچا جو شخص خود ہل چلا رہا ہو اور اپنے مریدوں اور ارادت مندوں سے یہ کام نہ لے سکتا ہو، وہ کسی اور کے کیا کام آئے گا۔''
اس شخص نے کہا۔ ''لیکن یہ بات نہیں ہے۔''
آپ نے فرمایا۔ ''مجھے افسوس تو اس بات کا ہے کہ تو اتنی دور دراز سے آیا اور ملے بغیر ہی واپس جانے لگا۔ میں یہ بھی جانتا ہوں کہ تو مال وزر کا شیدا ہے اور میرے پاس سونے چاندی کی ہوس میں آیا ہے۔''
اس شخص نے سونے چاندی کی بات سنی تو انکار نہ کرسکا۔ بولا۔ ''حضرت! میں ایک دنیادار آدمی ہوں۔ میرے لیے سونا چاندی ہی سب کچھ ہے۔ پھر اگر میں نے اس کی ہوس کی ہے تو کیا غلط کیا۔''
آپ نے فرمایا۔ ''ادھر میرے پاس آ اور تھوڑی دیر میرا ہل چلاتا رہ، مجھے پیشاب کی حاجت ہورہی ہے۔''
اس شخص نے آپ کے ہاتھ سے ہل لے لیا اور چلانے لگا۔ آپ کچھ دیر بعد جب واپس آئے، استنجے کے دو ڈھیلے آپ کے ہاتھ میں تھے۔ آپ نے ان ڈھیلوں کو اجنبی کی طرف کردیا۔ پوچھا۔ ''یہ کیا ہے؟ کچھ جانتا ہے؟''
اس شخص نے جواب دیا۔ ''جانتا ہوں، یہ استنجے کے ڈھیلے ہیں اور غالباً اس وقت انہی دونوں سے آپ نے طہارت فرمائی ہے۔''
سلطان باہو نے جواب دیا۔ ''بالکل ٹھیک...... میرے نزدیک سونے چاندی کی یہی حیثیت ہے۔'' اس کے بعد آپ نے انہیں زمین پر دے مارا۔ فرمایا۔ ''ان ڈھیلوں کے ریزے سمیٹ لو۔ تو جس شے کی تلاش میں آیا تھا، حاضر ہے۔''
اس شخص نے زمین پر سونا بکھرا دیکھا۔ ڈھیلوں کے ذرات سونے میں تبدیل ہوچکے تھے۔ اس کو اپنی آنکھوں پر یقین نہیں آرہا تھا۔ اس نے ڈری سہمی نظروں سے سلطان باہو کی طرف دیکھا اور پھر سونے کے ذرّے سمیٹنے لگا۔ جب وہ سمیٹ چکا تو آہستہ سے پوچھا۔ ''اب آپ کا کیا حکم ہے؟''
سلطان باہو نے جواب دیا۔ ''تیرا کام ہوچکا......اور سونا درکار ہو تو وہ بھی فراہم کیا جاسکتا ہے۔''
اس شخص کو اتنا زیادہ سونا مل چکا تھا کہ مزید کی خواہش نہ رہی۔ بولا۔ ''اب میں جاسکتا ہوں؟''
آپ نے فرمایا۔ ''میں نے تجھے روکا تو نہیں ہے۔ میرے پاس جو کچھ لینے آیا تھا، وہ تجھے مل چکا ہے۔ تو واپس جاسکتا ہے۔''
وہ شخص چلا گیا لیکن راستے بھر مبہوت و حیرت زدہ رہا۔

☆☆☆

سلطان باہو نے کئی شادیاں کیں اور آپ کو شاعری سے خاص شغف تھا۔ شاعری کئی زبانوں میں کرتے تھے۔ فارسی، اردو اور پنجابی لیکن پنجابی زبان میں بہت کچھ کہا ہے۔ پوری شاعری عرفان اور تصوف سے مالا مال ہے۔
آپ نے اپنے ایک مرید سے فرمایا۔ ''میری ماں پر اللہ تعالیٰ کی رحمت ہو کہ انہوں نے میرا نام باہو رکھا جو ایک نقطے سے یاہو ہوجاتا ہے۔''
ایک جوگی کو آوارہ و سرگرداں جو دیکھا تو پوچھا۔ ''تو نے یہ جوگ کیوں اختیار کررکھا ہے؟''
جوگی نے جواب دیا۔ ''باہو! میں جس کی تلاش میں سرگرداں ہوں، تم بھی جانتے ہو۔ ہر کسی کو اس کی تلاش ہے۔ میں نے اسی کی خاطر جوگ لیا مگر افسوس کہ ابھی تک اسے نہیں پاسکا۔''
سلطان باہو نے پنجابی کی بیت میں جوگی کو جواب دیا۔

اندر ہُو تے باہر ہُو دَم ہُو دے نال جلیندا ہُو
ہُو دا داغ محبت والا ہر دَم پیا سڑیندا ہُو
جتھے ہُو کرے رُشنائی چھوڑ اندھیرا ویندا ہُو
دوہیں جہاں غُلام اس باہُو جو ہُو سہی کریندا ہُو

(اللہ تعالیٰ ہر جگہ حاضر وناظر ہے باہو تو اسے کہاں کہاں ڈھونڈتا پھر رہا ہے۔ ہو کی محبت کا داغ ہردم جلائے رکھ کیونکہ یہ جہاں جلوہ فروز ہو وہاں سے تاریکی دور ہوجاتی ہے۔ اے باہو جس نے ہو (وحدت) کو سمجھ لیا، دونوں جہاں اس کے غلام ہوگئے)

جوگی نے پوچھا۔ ''باہو! مجھے وہ بات بتاؤ جس سے میں اس کو پالوں جس کی تلاش میں نکلا ہوں۔ تم عرفان حاصل کر چکے ہو اور میں اس کی جستجو میں ہوں۔ تم منزل پر کھڑے ہو، میں مسافر ہوں اور حالت سفر میں پتا نہیں کب منزل پاؤں اور منزل تک پہنچوں گا بھی یا نہیں۔''

باہو نے اپنی دوسری بیت سنائی۔

یار یگانہ ملسی تینوں جے سر دی بازی لائیں ہو
عشق اللہ وچ ہو مستانہ ہو سدا! الاہیں ہو
نال تصور اسم اللہ دے دم نوں قید لگاویں ہو
ذاتے نال جاں ذاتی رلیا تد باہو نام سدائیں ہو

(دیار تجھے اس وقت ملے گا جب تو سر دھڑ کی بازی لگا دے اور اللہ کے عشق میں مست ہو کر ہو، ہو پکارتا پھرے۔ اللہ کے تصور کے ساتھ دم کو قید لگائے۔ تو باہو! اس وقت کہلا سکے گا جب تو ذاتِ کبریا میں مدغم ہو جائے گا)

جوگی نے پوچھا۔ ''باہو! اگر میں نمازیں پڑھنا شروع کر دوں تو میں اپنی منزل پالوں گا؟''

سلطان باہو نے اس سوال کا جواب بھی بیت میں دیا۔ فرمایا۔

عاشق پڑھن نماز پرم دی جیں وچ حرف نہ کوئی ہو
جیہا کیہا نیت نہ سکے اتھے درد مند دل ڈھوئی ہو
اکھاں نیر تے خون جگر دا وضو پاک سزوئی ہو
جیبھ نہ ہلے ہونٹھ نہ پھڑکن خاص نمازی سوئی ہو

(عاشق ایسی نماز پڑھتے ہیں جس میں کوئی حرف نہیں ہوتا۔ یہ ایسی نماز ہے جسے ہر کوئی نہیں پڑھ سکتا۔ صرف دردمند ہی پڑھ سکتے ہیں کیونکہ اس نماز کے لیے آنکھوں کے آنسو اور جگر کے خون سے وضو کیا جاتا ہے اور اس نماز میں نہ تو زبان ہوتی ہے اور نہ ہونٹ پھڑکتے ہیں)

جوگی نے ہو کا نعرہ بلند کیا اور اپنے ہوش و حواس کھو بیٹھا۔

آپ تریسٹھ سال تک زندہ رہے اور رشد و ہدایت کا فریضہ انجام دیتے رہے۔ آخر یکم جمادی الثانی 1102ھ میں آپ نے وصال فرمایا۔ کسی شاعر نے آپ کی تاریخ وفات اپنے اس شعر سے نکالی۔

کاشف اسرار الحق اہلِ دیں

1102ھ

گشت تاریخ وصالش باتیقین

کسی اور نے ''ابدی غلام باہو'' کہہ کر تاریخِ وفات نکالی۔

1102ھ

وصال کے بعد شورکوٹ کے قریب دریائے چناب کے کنارے قہرگان نامی گاؤں کے قلعے میں دفن کیا گیا لیکن تقریباً اٹھتر سال (78) کے بعد 1180ھ میں جب چناب میں طغیانی آئی تو آپ کو پانی سے بچانے کے لیے مزار سے نکالا گیا۔ لوگ یہ دیکھ کر حیران رہ گئے کہ آپ کا جسدِ مبارک اور کفن جوں کا توں تھا۔ اس میں ذرا سی بھی خرابی نہیں آئی تھی۔ آپ کو وہاں سے نکال کر دوسری جگہ دفن کر دیا گیا۔

1336ھ میں ایک بار پھر طغیانی کا خطرہ لاحق ہوا اور ایک بار پھر آپ کے جسدِ مبارک کو ایک تیسری جگہ دفن کر دیا گیا۔

یہ ماہ محرم تھا۔ چنانچہ آپ کا عرس ماہ محرم میں ہوتا ہے۔

خدا رحمت کند ایں عاشقانِ پاک طینت را

ماخذات

تاریخ مبارک شاہی	آثار الصنادید	تاریخ فرشتہ	عہد سلاطین دہلی	تاریخ فیروز شاہی	طبقات اکبری
یحییٰ بن احمد سرہندی	سرسید احمد خان	محمد قاسم فرشتہ	صلاح الدین ناسک	شمس سراج عفیف	نظام الدین احمد

اصلی نقلی

ثمر عباس

دنیا میں بے شمار چہرے ایک دوسرے سے مشابہت رکھتے ہیں لیکن کچھ لوگ اپنی ہی شخصیت کو کئی حصوں میں تقسیم کرکے اسے کھیل بنا لیتے ہیں... اسے بھی اس کھیل میں لطف آنے لگا تھا لیکن اس کے وہم و گمان میں بھی نہ تھا کہ یہ لطف اسے کتنے بڑے دکھ سے دوچار کرنے والا ہے... بہرحال یہ تو دنیا کا دستور ہے کہ کھیل کوئی کھیلتا ہے اور لطف کوئی اور لیتا ہے۔ کچھ ایسا ہی معاملہ یہاں بھی درپیش تھا۔

اصل کو نقل...... اور نقل کو اصل میں گم کرنے والوں کی فنکاریاں

"مجھے بتایا گیا ہے کہ تم لاپتا لوگوں کو ڈھونڈ نکالتے ہو؟"
میں نے اس کی بات سن کر کندھے اچکائے اور بولا۔
"وہ لاپتا نہیں بلکہ گم شدہ لوگ ہوتے ہیں جو عارضی طور پر اپنے والدین یا عزیزوں سے بچھڑ جاتے ہیں۔" اس نے غور سے مجھے دیکھا پھر اپنی نظریں میز پر جما دیں۔ انداز ایسا تھا جیسے کچھ سوچ رہا ہو۔ اس نے چند سیکنڈ توقف کیا پھر بولا۔
"کیا میں تمہاری خدمات حاصل کرسکتا ہوں؟"
"کیوں نہیں! میرا پیشہ ہی یہی ہے بشرطیکہ تم مناسب معاوضہ ادا کرسکو۔"
"کیا میں تمہارے معاوضے کے بارے میں جان سکتا ہوں؟" اس نے خالص کاروباری لہجے میں کہا تو میں نے بلاتکلف اپنے معاوضے کی رقم بتادی جو یقیناً پانچ ہندسوں پر مشتمل تھی۔
اس نے ایک لمحے کی تاخیر کیے بغیر اپنی کرسی پیچھے کی جانب کھسکائی اور دراز سے چیک بک نکالی جس پر چرمی جلد چڑھی ہوئی تھی اور بولا۔

''میں تمہیں یہ رقم اپنے ذاتی اکاؤنٹ سے دے رہا ہوں۔''
''ٹھیک ہے لیکن فی الحال میں آدھا معاوضہ لوں گا۔ باقی رقم کام مکمل ہونے پر۔''
''مجھے تم پر پورا بھروسا ہے۔ اس لیے میں پوری رقم ایڈوانس میں دے رہا ہوں۔''
اس لمحے مجھے تھوڑی سی شرمندگی محسوس ہوئی اور میں نے اپنی جھینپ مٹانے کے لیے کہا۔ ''مسٹر کٹلر! مجھے خود بھی ایڈوانس میں پیسے لینا اچھا نہیں لگتا لیکن کیا کروں، مجبوری ہے۔ گم شدہ لوگوں کو ڈھونڈنا جان جوکھوں کا کام ہے۔ اس میں وقت کے ساتھ ساتھ پیسے بھی خرچ ہوتے ہیں۔ مجھے اس سلسلے میں اچھا خاصا سفر کرنا پڑتا ہے۔ اس دوران ہوٹلوں میں قیام وطعام کے ساتھ ساتھ فیول کی مد میں بھی اچھی خاصی رقم خرچ ہوجاتی ہے۔ جب میں اپنی رپورٹ کے ساتھ یہ رسیدیں منسلک کروں گا تو آپ کو خود ہی اندازہ ہوجائے گا۔''
''اس کی ضرورت نہیں۔'' وہ ہاتھ اٹھاتے ہوئے بولا۔ ''تمہاری سفارش میرے ایک انتہائی قریبی دوست نے کی ہے اور اس کا کہنا ہے کہ اب تک اس کا واسطہ جتنے بھی پرائیویٹ سراغ رسانوں سے پڑا ہے، ان میں سے صرف تم ہی ایسے ہو جو گھاس کے ڈھیر میں سے بھی سوئی تلاش کرلیتے ہو۔''
اس نے جس دوست کا حوالہ دیا، وہ بیورے ہلز کا ایک بااثر وکیل تھا۔ اس لیے مجھے اس کی مبالغہ آرائی پر کوئی حیرت نہیں ہوئی۔ میں نے کچھ زیادہ ہی راست باز بننے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔ ''میرے دوسرے دوست بھی اسی طرح کی رائے دیں گے لیکن ضروری نہیں کہ ان کی کہی ہوئی ہر بات درست ہو۔ سچ ہمیشہ کڑوا ہوتا ہے۔ مثلاً میں آپ کو منی بیک گارنٹی نہیں دے سکتا۔ اس کام میں ہمیشہ ففٹی ففٹی چانس ہوتا ہے۔ بہرحال آپ بتائیں کہ کسے تلاش کرنا ہے؟''
''میں بتاتا ہوں۔'' یہ کہہ کر وہ اپنی جگہ سے اٹھا۔ وہ باوقار قدموں سے چلتا ہوا میز کے سامنے والی دیوار تک گیا جہاں مختلف تصاویر اور سرٹیفکیٹ کے ساتھ ایک چھوٹی سی آئل پینٹنگ بھی آویزاں تھی۔ چھت پر لگی اسپاٹ لائٹ کی روشنی نے اسے مرکزِ نگاہ بنادیا تھا۔
یہ ایک خوب صورت لڑکی کی تصویر تھی جس کی عمر اٹھارہ یا بیس سال ہوگی۔ وہ شاہانہ انداز میں انتہائی نفیس قسم کا گاؤن پہنے کھڑی تھی۔ اس کے سنہری بال شانوں پر لہلہا رہے تھے۔ چہرے کی تازگی، جھیل جیسی گہری آنکھیں اور تراشیدہ لب، اس کے حسن میں نمایاں اضافہ کررہے تھے۔ اس کی معصومیت دیکھ کر اندازہ ہوتا تھا کہ اس نے ابھی تک اپنے دل کی بات کسی پر ظاہر نہیں کی ہے۔ تصویر دیکھ کر میں اپنی پسندیدگی کا اظہار کیے بنا نہ رہ سکا۔
''غالباً یہ تمہاری بیٹی کی تصویر ہے۔''
میرے سوال پر وہ چونک سا گیا پھر سنبھلتے ہوئے بولا۔ ''یہ میری بیٹی تو نہیں لیکن مجھے اسی کی تلاش ہے۔''
یہ کہہ کر میں بھی اس کے پاس چلا گیا۔ قریب سے دیکھنے پر وہ لڑکی اور زیادہ خوب صورت لگ رہی تھی۔ میں نے تعجب سے پوچھا۔
''پھر یہ کون ہے؟''
''میں اس کا نام نہیں جانتا۔ ہم کبھی نہیں ملے۔''
اس کی بات سن کر میرا دماغ گھوم گیا اور میں نے ترش لہجے میں کہا۔ ''یہ تمہاری بیٹی نہیں ہے، تم اس سے کبھی نہیں ملے اور نہ ہی اس کا نام جانتے ہو، اس کے باوجود اسے تلاش کروانے کے لیے ایک بڑی رقم خرچ کرنے پر تیار ہو۔ میں یہ معما سمجھنے سے قاصر ہوں مسٹر کٹلر؟''
''میں اس سے محبت کرتا ہوں۔'' اس نے تصویر پر نظریں جماتے ہوئے کہا۔ ''اور تمہیں اس سے زیادہ جاننے کی ضرورت بھی نہیں ہے۔''
''میں اپنے لیے کسی بڑی عمر کی عورت کا انتخاب کرتا۔'' یہ جملہ لاشعوری طور پر میری زبان سے پھسل گیا۔
وہ تیزی سے میری جانب گھوما اور میرے چہرے پر نظریں گاڑتے ہوئے بولا۔ ''تمہیں میری بے عزتی کرنے کا کوئی حق نہیں۔'' پھر اس نے اپنی انگلی تصویر کے داہنے کنارے پر نچلی جانب رکھ دی جہاں مصور کے دستخط اور تاریخ درج تھی۔ یہ تصویر پچیس سال پہلے بنائی گئی تھی اور اس حساب سے تصویر والی لڑکی اب کٹلر کی عمر کو ہی پہنچ چکی ہوگی۔ اس نے اپنی بات جاری رکھتے ہوئے کہا۔ ''تمہارا کام صرف اسے تلاش کرنا ہے تاکہ میں اس سے شادی کرسکوں۔''
''اگر وہ نہ مل سکی یا تم سے شادی کرنے پر راضی نہ ہوئی تو...؟''
اس کی آنکھوں میں آنسو آگئے۔ شاید یہی میری بات کا جواب تھا۔
''ایسی صورت میں مجھے تمہارا چیک واپس کرنا ہوگا۔'' میں نے خالص کاروباری انداز میں کہا۔ ''یہ میرا اصول ہے۔''

اس نے میری بات پر کوئی توجہ نہیں دی اور عجیب سے لہجے میں بولا۔ ''کیا تم نے کبھی محبت کی ہے؟''

''مجھے اپنی دونوں سابقہ بیویوں سے بہت محبت تھی اور میں ان... کی قدر و قیمت سے خوب واقف ہوں۔''

''پھر تو تمہیں میری بات جلدی سمجھ لینی چاہیے۔ محبت ایک ایسا جذبہ ہے جس کی کوئی تعریف نہیں کی جاسکتی اور نہ ہی اس سے چھٹکارا ممکن ہے۔ کوئی نہیں جانتا کہ محبت کب، کہاں اور کس سے ہوجائے۔ یہ ایک معما ہے۔ سمجھنے کا نہ سمجھانے کا۔ کیا تم اس سے اتفاق نہیں کرتے؟''

''ضروری نہیں کہ میں تمہاری ہر بات سے اتفاق کروں۔'' میں نے اس کے لیکچر سے اکتاتے ہوئے کہا۔ ''یہ بتاؤ کہ تمہیں یہ تصویر کہاں سے ملی؟''

''ایک ماہ پہلے میں کاروبار کے سلسلے میں نیویارک گیا تھا۔ تھوڑی سی فرصت ملی تو میں نے سوچا کہ ایک چکر سوہو کا بھی لگالوں۔ یہ جگہ کسی زمانے میں آرٹ گیلریوں کا مرکز کہلاتی تھی۔ میں ایک سال پہلے بھی وہاں گیا تھا لیکن اب وہاں کافی تبدیلیاں آگئی ہیں۔ میرے قدم ایک نوادرات کی دکان کے سامنے رک گئے اور میں نے وہیں یہ پینٹنگ دیکھی۔ اس تصویر پر نظر پڑتے ہی میرا دل چاہا کہ شیشہ توڑ کر اس لڑکی کے گلے لگ جاؤں۔ میں اس تصویر کے سحر میں گم ہوکر رہ گیا اور جب میری نظر اس تصویر پر لکھی تاریخ پر گئی تو میں نے جانا کہ یہ لڑکی میری ہی عمر کی ہے۔ یوں لگا کہ قسمت کی دیوی مجھ پر مہربان ہوگئی ہے۔ مجھے اس تصویر کو ضرور حاصل کرنا ہے۔ اس طرح میں اس لڑکی کو بھی حاصل کرسکوں گا اور جب وہ مجھے مل جائے گی تو اسے اپنی دلہن بنالوں گا۔''

میں خاموشی سے اس کی باتیں سنتا رہا۔ کہہ بھی کیا سکتا تھا۔ میرا واسطہ ایسے لوگوں سے پڑتا رہتا تھا جو کٹلر سے بھی زیادہ سرپھرے واقع ہوئے تھے۔ مجھے تو پیسوں سے مطلب تھا جس سے میرا کچن چلتا رہے۔

میں نے اپنی معلومات میں اضافہ کرنے کی خاطر پوچھا۔ ''اسٹور والوں نے یہ نہیں بتایا کہ انہوں نے یہ پینٹنگ کہاں سے حاصل کی یا کوئی اور ایسی بات جس سے ہمیں کچھ مدد مل سکے؟''

''نہیں، انہیں صرف مصور کا نام معلوم تھا۔''

''مجھے اپنے کام کا آغاز اسی اسٹور سے کرنا ہوگا۔ شاید میں کچھ مزید معلومات حاصل کرنے میں کامیاب ہوجاؤں۔ اس اسٹور کا نام کیا تھا؟''

''مجھے یاد نہیں رہا۔'' اس نے بے پروائی سے کہا۔ ''وہ کوئی ایسی جگہ نہیں تھی جہاں دوبارہ جانے کی توقع کی جاسکتی۔''

''انہوں نے تمہیں کوئی رسید دی ہوگی ورنہ کریڈٹ کارڈ یا بینک گوشوارے سے بھی یہ نام معلوم ہوسکتا ہے۔''

''انہوں نے کیش لینے پر اصرار کیا تھا۔ اتفاق سے اس وقت میری جیب میں اچھی خاصی رقم نقدی کی شکل میں موجود تھی۔ اس لیے مجھے یہ تصویر خریدنے میں کوئی مشکل پیش نہیں آئی۔''

''اوہ۔'' میں نے ایک گہری سانس لی۔ ''اچھا مسٹر کٹلر! تم مجھے اس مصور کا نام ایک بار پھر بتاؤ۔''

غنیمت ہے کہ اسے مصور کا نام یاد تھا اور تصویر پر بھی اس کے دستخط موجود تھے ورنہ بڑی مشکل پیش آتی۔ گھر واپس آنے کے بعد میں نے فریج کھولا۔ اس میں میرے ڈنر کے لیے وافر مقدار میں سامان موجود تھا۔ کھانے سے فارغ ہونے کے بعد میں انٹرنیٹ کھول کر بیٹھ گیا۔

☆☆☆

کاہوٹیلا سینڈز ایک چھوٹا سا قصبہ تھا جس کی آبادی بمشکل چھ سات سو افراد پر مشتمل ہوگی۔ یہ جگہ کیلی فورنیا اور نویڈا کے بارڈر سے ایک میل کے فاصلے پر واقع تھی۔ وہاں تک پہنچنے کا واحد راستہ کنکریٹ کی دورویہ سڑک تھی جس کا اختتام سان گورگونیو کے پہاڑی سلسلے پر ہوتا تھا۔ قصبے کے باہر لگا ہوا بورڈ میری توجہ کا مرکز بن گیا جس پر لکھا تھا۔

کاہوٹیلا سینڈز میں خوش آمدید...... آئیور گوڈوسکی کا گھر۔

میں اسی شخص کی تلاش میں یہاں تک آیا تھا۔ یہ وہی مصور تھا جس نے کٹلر کی محبوبہ کی تصویر بنائی تھی اور وہی اس لڑکی کو شناخت کرسکتا تھا۔ ممکن ہے کہ اس سے مجھے یہ بھی معلوم ہوجائے کہ وہ لڑکی اس وقت کہاں مل سکتی ہے۔ اگر وہ مجھے اس کا آئی ڈی دے دے تو میں انٹرنیٹ سے ہی اس لڑکی کا پتا معلوم کروں گا۔ یہ کام چند گھنٹوں میں بھی ہوسکتا ہے اور شاید اس میں کئی دن بھی لگ سکتے ہیں۔ کاش مجھے گوڈوسکی کا فون نمبر مل جاتا تو اس ویران جگہ تک آنے کی نوبت ہی نہ آتی۔

میں نے قصبے کی مرکزی شاہراہ کا رخ کیا اور چند ہی منٹوں بعد میری گاڑی دومنزلہ سٹی ہال کے باہر کھڑی تھی۔ میں بے دھڑک اندر چلا گیا۔ استقبالیہ کاؤنٹر خالی پڑا تھا۔ میں نے ادھر ادھر دیکھا پھر بے اختیار کاؤنٹر پر رکھی پرانے وقتوں کی پیتل کی گھنٹی بجانا شروع کردی۔ فوراً ہی بغلی دروازے سے ایک خبطی سا شخص نمودار ہوا جس نے سرخ سوٹ پر نیلے رنگ کا ایپرن پہن رکھا تھا۔ اس نے معذرت

خوابانہ انداز میں کہا۔ ”معاف کرنا۔ میں اپنے لیے ناشتا بنا رہا تھا۔ خیر تم بتاؤ، میں تمہاری کیا خدمت کرسکتا ہوں؟“

جب میں نے اسے اپنے آنے کی وجہ بتائی تو وہ بولا۔ ”اچھا! تم گوڈوسکی سے ملنے کے لیے آئے ہو۔ اس نے میری بھی دو تصویریں بنائی تھیں، بعد میں معلوم ہوا کہ وہ کسی میوزیم میں ٹنگی ہوئی ہیں۔ مجھے اس کا نام یاد نہیں رہا۔ کیا تمہیں بھی تصویریں جمع کرنے کا شوق ہے؟“

”ایسا ہی سمجھ لو۔“ میں نے خوش دلی سے کہا۔ ”کیا تم بتا سکتے ہو کہ اب وہ کہاں ملے گا؟“

”ٹھہرو، میں تمہیں نقشہ بنا کر دیتا ہوں۔ اس طرح تمہیں اس تک پہنچنے میں آسانی رہے گی۔“ یہ کہہ کر اس نے پنسل اور پیڈ اٹھایا اور اپنے کام میں مصروف ہوگیا۔

اس نقشے کے مطابق میں قصبے سے ایک میل باہر چلتا ہوا قبرستان تک پہنچ گیا جس کا رقبہ تقریباً دو باسکٹ بال کورٹس کے برابر تھا۔ تمام قبریں ایک دوسرے کے ساتھ ساتھ تھیں۔ میں نے وہیں کھڑے کھڑے نظر دوڑائی تو ایک قبر پر مجھے گوڈوسکی کا نام لکھا ہوا نظر آیا لیکن اس کتبے پر اس کی پیدائش یا موت کی تاریخیں درج نہ تھیں۔ میں غصے اور جھنجلاہٹ کے عالم میں سٹی ہال پہنچا تو وہ کلرک جیسے میرے ہی انتظار میں بیٹھا ہوا تھا۔ اس سے پہلے کہ میں اس پر اپنا غصہ اتارتا، وہ بڑی معصومیت سے بولا۔

”تم نے صرف یہ پوچھا تھا کہ وہ کہاں مل سکتا ہے اگر یہ پوچھتے کہ وہ کس حال میں ہے تو میں مناسب راہنمائی کرسکتا تھا۔“

اس کی حماقت پر میں سر پیٹنے یا ہنسنے کے سوا کیا کرسکتا تھا۔ اس نے میرا غصہ ٹھنڈا کرنے کے لیے کہا۔ ”اگر تم چاہو تو میں تمہیں ایسی جگہ بھیج سکتا ہوں جہاں سے گوڈوسکی کے بارے میں بہت کچھ معلوم ہوسکے گا۔“

ارملا بیلارڈ کو جب معلوم ہوا کہ میں کون ہوں اور مجھے کس نے اس کے پاس بھیجا ہے تو وہ خوب ہنسی۔ وہ ایک کافی شاپ چلا رہی تھی جس کا نام اس نے ارماز اسنیکس امپوریم رکھا تھا۔ وہ مجھے دیکھ کر کاؤنٹر سے باہر آگئی اور بے تکلفی سے برابر والے اسٹول پر بیٹھ گئی۔

”وہ اسی طرح اجنبی لوگوں کو بے وقوف بنا کر پیسے اینٹھتا ہے۔ اس کا کوئی علاج کرنا ہی پڑے گا۔“

”کیا مطلب؟ اس سے پہلے بھی لوگ گوڈوسکی کی تلاش میں یہاں آتے رہے ہیں؟“

”تم کیا سمجھتے ہو کہ تم ہی پہلے شخص ہو جو اس کا پیچھا کرتے ہوئے یہاں تک پہنچے ہو۔“ وہ طنزیہ انداز میں بولی۔ ”جب اسے پیسوں کی ضرورت تھی تو کسی نے اسے نہیں پوچھا۔ اب وہ ایسی جگہ چلا گیا ہے جہاں پیسا اور شہرت اس کے لیے بے معنی ہیں تو سب اس کی تصویروں کی تلاش میں چلے آرہے ہیں۔“ پھر اس نے ایک لمحے کے لیے توقف کیا اور بولی۔ ”تم کچھ لینا پسند کرو گے...... مثلاً سیب کا مربا اور وینیلا آئس کریم۔“

”یقیناً یہ سب کچھ بہت مزے دار ہوگا لیکن ان دنوں میں ڈائٹ کنٹرول کر رہا ہوں۔“

میری بات سن کر اس کا منہ بن گیا۔ میں اس مرحلے پر اس کی ناراضی مول لینا نہیں چاہتا تھا۔ وہ خود بھی کسی خوش ذائقہ ڈش سے کم نہیں تھی اور ابھی مجھے اس سے گوڈوسکی کے بارے میں بہت کچھ معلوم کرنا تھا۔ وہ ایک جھٹکے سے اٹھی اور لہراتی ہوئی دوبارہ کاؤنٹر کے پیچھے چلی گئی۔ وہ تقریباً میری ہی ہم عمر یعنی پینتیس کے لگ بھگ تھی اور اس کے دلکش جسمانی خطوط کسی بھی مرد کو اپنی جانب متوجہ کرسکتے تھے۔ میں نے اس سے آئس کریم کی فرمائش کی۔ وہ لہراتی ہوئی اٹھی اور میری فرمائش پوری کرنے کے بعد دوبارہ برابر والے اسٹول پر بیٹھ گئی۔

”تم نے بتایا نہیں کہ آئیور سے ملنے کے لیے کیوں آئے تھے؟“

میں نے اپنا موبائل فون نکالا اور اسے وہ فوٹو دکھا دیا جو میں نے کٹلر کے دفتر میں اتارا تھا۔ اس نے فون میرے ہاتھ سے لے لیا اور عکس کو بڑا کرکے دیکھنے لگی۔ ”میں یقین سے کہہ سکتی ہوں کہ یہ آئیور کی پینٹنگ نہیں ہے یہ بھی بالکل اسی طرح کی جعل سازی ہے جیسی کہ لوگ ڈیلی اور پکاسو کی تصویروں کے ساتھ کرتے رہتے ہیں۔“

”تمہیں یہ بات کس طرح معلوم ہوئی؟“

”اگر تم آئیور کے کام کے بارے میں جانتے ہو تو تمہیں یہ بھی معلوم ہوگا کہ وہ کبھی بھی اپنی تصویروں پر تاریخ نہیں ڈالتا تھا۔“

”ممکن ہے کہ یہ محض اتفاق ہو اور اس نے بے دھیانی میں اس تصویر پر تاریخ ڈال دی ہو۔“

”بالکل نہیں۔ اگر اس تاریخ پر یقین کرلیا جائے تو یہ لڑکی اپنی ماں سے بھی زیادہ عمر کی سمجھی جائے گی۔“

”تم اس کی ماں کو جانتی ہو؟“

”میں ہی اس کی ماں ہوں۔“ اس نے بڑے سکون سے جواب دیا۔

اب میرے حیران ہونے کی باری تھی۔ میں نے اس کے ہاتھ سے فون لے لیا اور اس کا موازنہ تصویر سے کرنے لگا۔ دونوں میں حیرت انگیز مشابہت تھی۔ خاص طور پر چہرے کی بناوٹ، آنکھوں کا رنگ اور ہونٹوں کی ساخت بالکل ایک جیسی تھی۔ ارما بغور میرے چہرے کے تاثرات دیکھتی رہی اور پھر ایک دلنواز مسکراہٹ کے ساتھ بولی۔

''اس کا نام مچل ہے لیکن وہ اپنے آپ کو مکی کہلوانا پسند کرتی تھی۔ تم تو جانتے ہی ہو کہ بچوں کے دماغ میں کوئی بات بیٹھ جائے تو اسے نکالنا کتنا مشکل ہو جاتا ہے۔''

''میں مکی سے ملنا اور اس سے باتیں کرنا چاہتا ہوں۔''

میری حالت بالکل ویسی ہی ہو گئی تھی جو کنوئیں کے پاس پہنچ کر پیاسے کی ہوتی ہے۔ میں اس کی تصویر لے جا کر کٹلر کو دکھاتا کہ اس کی محبوبہ وہ نہیں ہے جس کا وہ انتظار کر رہا ہے۔

''میں خود بھی اس سے ملنے کے لیے بے قرار ہوں۔'' اس نے حسرت سے کہا۔ ''آئیور کی تصویر مکمل ہونے کے ایک ہفتے بعد ہی مکی کہیں چلی گئی اور اس کے ساتھ ہی وہ تصویر بھی غائب ہو گئی۔''

''کیا وہ اس تصویر کو ساتھ لے گئی ہو گی؟'' میں نے ڈوبتے دل سے پوچھا۔

''لگتا تو ایسا ہی ہے۔ اس وقت تک اس تصویر کا رنگ بھی خشک نہ ہوا ہو گا۔ وہ تصویر میرے لیے آئیور کی جانب سے ایک تحفہ تھی۔ بالکل اسی طرح جیسے ماضی میں وہ میری تصویریں بنا کر مجھے تحفے میں دیتا رہا تھا۔''

''کیا اس نے تمہاری ایک سے زیادہ تصویریں بنائی تھیں؟''

''ہاں جب اس کے پاس اپنے اخراجات کے لیے پیسے نہ ہوتے تو وہ یہاں آ جاتا اور ایسا اکثر ہوتا تھا۔''

''کیا اس نے مکی کی بھی ایک سے زائد تصویریں بنائی تھیں؟''

''میں صرف ایک تصویر کے بارے میں جانتی ہوں جو اس نے دو برس قبل بنائی تھی۔ تم سوچ سکتے ہو کہ مجھے مچل کو دیکھے یا اس کی آواز سنے ہوئے دو سال ہو چکے ہیں۔ وہ اپنی کوئی تحریر بھی چھوڑ کر نہیں گئی۔''

کافی ہاؤس کے آخری گاہک کو نمٹانے کے بعد اس نے کافی ہاؤس کے باہر کلوزڈ کا بورڈ لٹکا دیا اور دروازہ اندر سے بند کرنے کے بعد مجھے اپنے پیچھے آنے کا اشارہ کرتے ہوئے بولی۔ ''تم خود ہی دیکھ لو۔''

ارما کی رہائش ایک موٹر ہوم میں تھی جو کسی پرانی بس کے مانند نظر آتا تھا۔ اندر کی دیواروں پر جو جگہ دستیاب تھی، وہاں تصویریں لگی ہوئی تھیں جبکہ چھوٹے سائز کی تصویریں کاؤنٹر اور میز کی سطح پر رکھی ہوئی تھیں۔ ان کی تعداد آٹھ تھی اور یہ سب ارما ہی کی تصویریں تھیں جنہیں گوڈسکی نے بنایا تھا۔ یہ سب تصویریں مختلف اوقات میں پینٹ کی گئی تھیں اور ان میں اس کی زندگی کے مختلف ادوار دکھائے گئے تھے۔ کسی تصویر میں وہ مکی کی عمر جتنی دکھائی دے رہی تھی تو کسی تصویر میں سن و سال کے فرق نے اسے موجودہ روپ میں ڈھال دیا تھا۔ البتہ ان میں سے کسی تصویر پر تاریخ درج نہیں تھی۔ اس لیے یہ کہنا مشکل تھا کہ یہ تصویریں کن اوقات میں بنائی گئی تھیں۔ البتہ بیٹی سے اس کی مشابہت غیر فطری اور عجیب لگ رہی تھی۔

''مچل کی ایک تصویر وہاں بھی ہے جو مجھے بے حد پسند ہے۔'' ارما نے اپنے بیڈروم کی کھڑکی کی جانب اشارہ کیا۔ پھر اس نے کمرے کے دروازے کو ہلکے سے دھکا دیا اور آگے بڑھ گئی۔ میں بھی اس کے پیچھے ہو لیا۔ دروازہ غیر محسوس طور سے سرکتا ہوا بند ہو گیا اور میں نے اپنے آپ کو ارما کی ایک قد آدم تصویر کے سامنے پایا۔

''کیا سوچ رہے ہو؟'' اس نے میرے قریب آتے ہوئے کہا۔ ''یہ میری پہلی تصویر ہے جو اس نے بنائی تھی اور اس وقت میری عمر مچل سے بھی کم تھی لیکن ذہنی اور جسمانی طور پر میں اس سے کہیں آگے تھی۔ تم میرا مطلب سمجھ رہے ہو نا۔ میں ہمیشہ سے ہی ایسی ہوں۔ ممتا جیسی فطرت رکھنے والی۔''

''شاندار!'' میرے منہ سے بے اختیار نکلا۔

''تم بھی کسی سے کم نہیں ہو۔'' یہ کہہ کر اس نے میرے گلے میں بانہیں ڈال دیں اور مجھے سنبھلنے کا موقع بھی نہ ملا۔ ''مجھے عرصہ دراز سے تم جیسے ہی کسی شخص کی ضرورت محسوس ہو رہی تھی۔''

ہم دونوں کافی دیر تک باتیں کرتے رہے۔ ارما نے مجھے بتایا کہ مچل ہمیشہ ہی یہاں کی بے کیف زندگی کی شکایت کیا کرتی تھی اور اس کا کہنا تھا کہ یہاں اس کا کوئی مستقبل نہیں ہے۔'' اس نے کبھی بھی اسنیک امپوریم کا انتظام سنبھالنے اور اسے چلانے میں دلچسپی ظاہر نہیں کی جبکہ میں ممی ڈیڈی کے قتل کے بعد اسے آج تک چلا رہی ہوں اور ایک بور زندگی گزارنے پر مجبور ہوں۔''

''تمہارے ماں باپ کو کس نے قتل کیا؟''

''وہ ڈاکوؤں سے مزاحمت کرتے ہوئے مارے گئے جنہوں نے صرف سو ڈالرز کی خاطر انہیں قتل کر دیا۔ پولیس انہیں کبھی نہیں پکڑ سکی۔ اسی لیے میں نے ڈپٹی شیرف

سے گن چلانا سیکھ لی ہے۔ میں چاہتی تھی کہ مچل کو بھی گن چلانی آجائے لیکن اس نے کبھی ایک کیڑا بھی نہیں مارا۔ خدا جانے اب وہ کہاں ہوگی۔ مجھے اس کی کمی بڑی شدت سے محسوس ہوتی ہے۔''

میں نے اس کے زخم کرید دیے تھے اس لیے مرہم رکھنے کا فریضہ بھی مجھے ہی انجام دینا پڑا۔ میں نے اپنی انگلیوں سے اس کے گالوں پر بہتے ہوئے آنسو صاف کیے اور ہمدردی جتاتے ہوئے بولا۔ ''میں تمہاری بیٹی کو تلاش کروں گا۔''

''کیا تم ایسا کر سکتے ہو؟'' وہ جذبات سے مغلوب ہوتے ہوئے بولی۔

''کیوں نہیں۔ اگر جذبہ سچا ہو تو سب کچھ ممکن ہے۔''

''اوہ سویٹ ہارٹ! تم کتنے اچھے ہو۔''

لگتا تھا کہ میری یقین دہانی پر وہ پوری طرح مطمئن ہوگئی تھی اور اس کا ذہن تمام فکروں سے آزاد ہو چکا تھا۔ تبھی تو چند منٹوں بعد وہ نیند کی وادی میں پہنچ چکی تھی۔ میں آہستہ سے اٹھا اور فریج کا رخ کیا۔ مجھے بہت زور کی بھوک لگ رہی تھی۔ وہاں جو کچھ ملا وہ سب سمیٹ کر ڈائننگ ٹیبل پر بیٹھ گیا۔ میری نظریں گوڈوسکی کی تصویروں پر تھیں اور ذہن میں مچل کو تلاش کرنے کا منصوبہ بنانے کی کشمکش ہو رہی تھی۔ یہ کوئی آسان کام نہیں تھا۔ میں ابھی تک کوئی منصوبہ بنانے میں کامیاب نہیں ہو سکا تھا اور اب تک جو کچھ سوچا تھا، وہ سب ارما سے ملنے کے بعد ذہن سے نکل چکا تھا۔

میں نے ایک بار پھر گوڈوسکی کی تصویروں پر توجہ مرکوز کر دی۔ ان میں سے کسی تصویر پر بھی تاریخ درج نہیں تھی۔ سوائے اس تصویر کے جس میں مچل نے..... گاؤن پہن رکھا تھا اور جو نیویارک کے ایک اسٹور میں رکھی گئی تھی۔ جس کسی نے بھی یہ جعلی تصویر بنائی، اسے نقل کے لیے اصل کی ضرورت پیش آئی ہوگی کیونکہ گوڈوسکی نے اس کی وہی ایک تصویر بنائی تھی۔ اس کا مطلب تھا کہ مچل وہ تصویر لے کر نیویارک گئی ہوگی اور کسی طرح اس کی نقل سوہو کے اسٹور میں پہنچ گئی جہاں کٹلر کی نظر اس پر گئی اور اس نے وہ تصویر خرید لی۔

کٹلر کا کہنا تھا کہ وہ اسٹور کا نام بھول گیا ہے۔ یہ کام بھی مجھے ہی کرنا ہوگا۔ میں نیویارک جا کر اس اسٹور کا پتا لگاؤں گا، اس کے ساتھ ہی مجھے اس مصور کو بھی تلاش کرنا ہوگا جس نے گوڈوسکی کی تصویر کی نقل بنائی تھی۔ یہ بھی معلوم کرنا ہوگا کہ اس نے یہ تصویر کیسے اور کس سے حاصل کی۔ ان کڑیوں کو ملاتے ملاتے میرے سامنے مچل کا چہرہ آ گیا اور جب میں نے اسے ارما کے ساتھ ملا کر دیکھا تو میری ہر مشکل آسان ہوتی چلی گئی۔ کم از کم میں کٹلر کو یہ ثبوت فراہم کر سکتا تھا کہ اس کے دیے ہوئے پیسے صحیح جگہ پر خرچ ہوئے ہیں۔

میں نے جب اپنا منصوبہ ارما کو سنایا تو وہ بھی میرے ساتھ چلنے کی ضد کرنے لگی۔ میں نے سوچا کہ اسے ساتھ لے جانے میں کوئی حرج نہیں۔ ویسے بھی ہمارے درمیان مختصر وقت میں اچھی خاصی کیمسٹری قائم ہو چکی تھی۔ بہت ممکن تھا کہ آگے بڑھ کر یہ تعلق کوئی اور شکل اختیار کر لے۔

☆☆☆

سوہو میں بھی لاس اینجلس جیسا رش دیکھنے میں آیا۔ ٹھیلے والوں نے پوری پوری فٹ پاتھ پر قبضہ کر رکھا تھا اور پیدل چلنے والے سڑک کے کنارے چلنے پر مجبور تھے جس کی وجہ سے ٹریفک کی روانی میں خلل پڑ رہا تھا۔ میں اور ارما ایک ایک دکان کو غور سے دیکھتے ہوئے آگے بڑھ رہے تھے۔ کٹلر نے اس اسٹور کی واحد نشانی یہ بتائی تھی کہ وہ کلاتھ اسٹور کے برابر میں واقع تھا۔ ہمیں وہاں گھومتے ہوئے دو گھنٹے ہو چکے تھے لیکن وہ اسٹور نہ ملا۔ اس کے بعد ہم نے جنوب کا رخ کیا جہاں نسبتاً سستی دکانیں تھیں لیکن وہاں بھی کوئی کامیابی نہیں ہوئی۔ سردی بڑھتی جا رہی تھی اور آسمان بادلوں سے ڈھکا ہوا تھا۔ کسی وقت بھی موسلا دھار بارش ہو سکتی تھی۔ ہم نے مایوس ہو کر واپسی کا ارادہ کیا ہی تھا کہ اچانک ارما نے میرا بازو پکڑا اور ایک دکان کی جانب اشارہ کرنے لگی جو کلاتھ اسٹور کے برابر میں واقع تھی اور اس پر ٹریژر آئی لینڈ کا بورڈ لگا ہوا تھا لیکن ارما کی خوشی اور حیرت کا سبب وہ آئل پینٹنگز تھیں جو اس دکان کے بیرونی شیشوں میں رکھی ہوئی تھیں۔ اس نے تیزی سے سڑک پار کی۔ میں بھی اس کے پیچھے لپکا اور ہم دونوں دکان کے باہر ایک تصویر پر نظریں جما کر کھڑے ہو گئے۔ اس تصویر کی لڑکی بھی نفیس گاؤن میں ملبوس تھی لیکن یہاں وہ کھڑے ہونے کے بجائے تخت پر بیٹھی ہوئی تھی اور اس کے سر پر تاج سجا ہوا تھا جس میں ہیرے، موتی اور جواہرات جڑے ہوئے تھے۔ اس تصویر پر بھی گوڈوسکی کے دستخط تھے اور تیس سال پہلے کی تاریخ درج تھی۔ بلاشبہ یہ مچل ہی کی تصویر تھی۔

ہمیں وہاں کھڑا دیکھ کر ایک لڑکی تیزی سے ہماری جانب آئی۔ غالباً وہ وہاں سیلز گرل یا کلرک کے طور پر کام کرتی تھی۔

''تین سال میں یہ گوڈوسکی کی دوسری تصویر ہمارے پاس آئی ہے۔''

''اگر یہ دوسری ہے تو پہلی کہاں ہے؟''

''جیسے ہی وہ تصویر شوکیس میں رکھی گئی اس کا خریدار آ گیا۔ دراصل وہ اس ماڈل پر فدا ہو گیا تھا جس کی شکل تمہاری دوست سے ملتی ہے۔ اگر میں تمہاری جگہ ہوتی تو اس تصویر کو خریدنے کے لیے دوسری بار نہ سوچتی۔''

ارما آگے بڑھی اور جوش میں بولی۔ ''تم اس تصویر کی قیمت بتاؤ؟''

اس لڑکی نے قیمت بتائی اور کہا۔ ''میم! ہم کیش یا ٹریولرز چیک لیتے ہیں۔ میرا باس چیک یا کریڈٹ کارڈز پر بھروسا نہیں کرتا۔''

میری جیب میں اتنی رقم نہیں تھی لہٰذا میں نے اس لڑکی سے پوچھا۔ ''کیا تم اتنی دیر تک اس تصویر کو روک سکتی ہو جب تک ہم کسی اے ٹی ایم سے پیسے نکلوا کر نہ آ جائیں۔''

''یقیناً! میں اس کی رسید بنا دیتی ہوں۔''

''اس کے علاوہ بھی ہمیں کچھ اور چیزوں کی ضرورت ہو گی۔'' میں نے آہستہ سے کہا۔

''مثلاً!'' وہ حیران ہوتے ہوئے بولی۔

''مجھے اس شخص کا نام اور پتا چاہیے جو یہ تصویر لے کر تمہارے پاس آیا تھا۔''

میرا خیال تھا کہ وہ اسٹور پالیسی کا حوالہ دیتے ہوئے کہے گی کہ اس قسم کی معلومات صرف قانون نافذ کرنے والے اداروں کے سوا کسی کو نہیں دی جا سکتیں۔ میں نے اپنی جیب سے ایک نوٹ نکالا اور چپکے سے اس کی طرف بڑھا دیا۔ اس نے ادھر ادھر دیکھا، تھوڑا سا ہچکچائی پھر لپک کر وہ نوٹ پکڑ لیا۔ ''وہ جگہ یہاں سے زیادہ دور نہیں۔ میں سمجھائے دیتی ہوں۔''

☆☆☆

اس چار منزلہ عمارت کے مرکزی دروازے پر کوئی دربان نہیں تھا اس لیے ہم بلا کسی روک ٹوک کے اندر چلے گئے۔ مطلوبہ دروازے کی گھنٹی بجانے پر کوئی جواب نہ ملا تو میں نے زنگ آلود دروازے پر دستک دی۔ اس کا بھی کوئی اثر نہ ہوا تو میں نے گڈون کا نام لے کر آوازیں دینا شروع کر دیں۔ چند سیکنڈ بعد کسی نے سوراخ سے جھانک کر دیکھا اور دروازہ آہستہ سے کھل گیا۔ ہمارے سامنے ایک جوان شخص باکسروں والا نیکر پہنے کھڑا تھا۔ ننگے پاؤں، ننگی چھاتی، تیکھے نقش و نگار، جھکی جھکی سی بادامی آنکھیں، پیلے دانت، بے ترتیب ڈاڑھی، جسم اور بازوؤں پر رنگ کے دھبے۔ مجھے تو اس شخص کو دیکھ کر ہی گھن آنے لگی۔

ہفتہ خوش اخلاقی

ہفتہ خوش اخلاقی کے دوران ایک کلرک کو میز پر سر رکھے سوتے دیکھ کر صاحب نے اسے آرام سے جگایا اور انتہائی نرمی سے کہا۔ ''معاف کرنا بھائی، میں تمہیں ہرگز نہ جگاتا اگر معاملہ اتنا ضروری نہ ہوتا۔ بات دراصل یہ ہے کہ تمہیں نوکری سے نکالا جا چکا ہے۔''

تلاش

ایک دوست دوسرے دوست سے۔ ''ارے تم ابھی تک کھویا ہوا نوٹ ڈھونڈ رہے ہو؟''

''نوٹ تو چھوٹے بھائی کو مل گیا تھا۔ میں تو دراصل چھوٹے بھائی کو تلاش کر رہا ہوں۔''

گدھے کی بات

بعض اوقات بڑی دلچسپ صورت حال پیدا ہو جاتی ہے۔

ایک صاحب گھر میں داخل ہوئے اور آتے ہی اپنی بیوی سے بولے۔ ''بیگم! میں ابھی آ رہا تھا کہ راستے میں ایک گدھا......''

''امی! مجھے گڈو نے مارا ہے۔'' ان کا بیٹا روتا ہوا کمرے میں داخل ہوا۔

''بیٹا تم جاؤ۔ میں ابھی اس کی امی سے شکایت کرتی ہوں۔''

''ہاں تو میں کہہ رہا تھا کہ وہ گدھا......'' شوہر نے دوبارہ کہنا شروع کیا۔

''امی...... امی...... منی نے میری گڑیا توڑ دی ہے۔'' اندر سے ان کی بیٹی دوڑی آئی۔

''اُفوہ...... تم لوگ ذرا چپ کرو۔ مجھے پہلے گدھے کی بات سننے دو۔''

سزا

بیوی شوہر سے۔ ''شادی سے پہلے تو تم مجھے خوش طبع، خوب صورت اور ذہین کہا کرتے تھے۔ اب مجھ سے کھنچے کھنچے رہتے ہو۔ آخر تم کو ہو کیا گیا ہے؟''

شوہر۔ ''دراصل اب میں اس جھوٹ کی سزا بھگت رہا ہوں۔''

مرسلہ۔ ریاض بٹ، حسن ابدال

''تم ایک گھنٹا پہلے آ گئے ہو۔'' اس کے لہجے میں نیند کا خمار جھلک رہا تھا۔ ''اندر آ جاؤ۔''

شاید وہ کسی اور کے دھوکے میں ہمیں اندر لے گیا۔ کمرے کا منظر بھی اس کی شخصیت سے میل کھا رہا تھا۔ سب چیزیں بے ترتیبی سے ادھر ادھر پھیلی ہوئی تھیں۔ اس نے ارما کی جانب اشارہ کرتے ہوئے مجھ سے کہا۔ ''مجھے نہیں معلوم تھا کہ تم کسی اور کو بھی ساتھ لا رہے ہو۔''

میں نے اس کی غلط فہمی دور کرنا مناسب سمجھا اور اسے اپنی آمد کی وجہ بتاتے ہوئے کہا۔ ''ہم نے ٹریژر آئی لینڈ سے گوڈوسکی کی ایک پورٹریٹ خریدی ہے اور اسے لاس اینجلس لے کر جا رہے ہیں۔''

''تم نے وہ پورٹریٹ خریدی ہے، وہ اتنی سستی تو نہیں تھی۔''

''ہم نے اس کی پوری قیمت ادا کی ہے اور وہاں کی کلرک کو جب معلوم ہوا کہ ہم گوڈوسکی کی تصویریں جمع کر رہے ہیں تو اس نے تمہارا پتا دے دیا کہ شاید یہاں سے مزید تصویریں مل سکیں۔''

گڈون نے ایک بار ایزل کی جانب دیکھا اور بولا۔ ''ایسی صورت میں یہ تصویریں اور بھی مہنگی پڑیں گی کیونکہ مجھے اسٹور کو بھی کمیشن دینا ہوگا۔''

''کوئی بات نہیں۔ اگر ہمیں ویسی ہی تصویر مل جائے جو اسٹور میں دیکھی ہے تو ہم مناسب قیمت دینے کے لیے تیار ہیں۔''

''اس کی گارنٹی میں دیتا ہوں۔'' یہ کہہ کر وہ اپنی جگہ سے اٹھا اور کمرے کے دوسری جانب دیوار کے ساتھ رکھی ہوئی تصویروں میں سے ایک نکال کر لے آیا۔ یہ بھی نفیس گاؤن میں ملبوس اسی لڑکی کی پورٹریٹ تھی جس نے کنلر کو دیوانہ بنا دیا تھا اور مجھے بھی اس کی تلاش میں در در کی خاک چھاننا پڑ رہی تھی۔ ارما کے ساتھ میں نے بھی فوراً ہی اندازہ لگا لیا کہ یہ تصویر جعلی ہے کیونکہ اس پر بھی تاریخ لکھی ہوئی تھی۔

''اس کے علاوہ ایک اور تصویر بھی ہے۔'' گڈون ایک بار پھر تصویروں کے ڈھیر کی جانب گیا اور وہاں سے ایک اور تصویر لے کر آ گیا۔ اس پر بھی گوڈوسکی کے دستخط اور تاریخ موجود تھی۔ البتہ یہ دوسری کے مقابلے میں چھوٹی تھی۔ اس تصویر میں مچل کافی کمزور اور پریشان نظر آ رہی تھی اور اس کی روشن چمکتی آنکھوں میں ویرانی چھائی ہوئی تھی۔ ارما اس تصویر کو دیکھ کر اپنے جذبات پر قابو نہ رکھ سکی اور چلاتے ہوئے بولی۔ ''مچل، او میرے خدا! یہ سب کیا ہے...... مچل کو کیا ہو گیا؟''

گڈون اس کا ردِعمل دیکھ کر بوکھلا گیا اور بولا۔

''مچل...... یہ کون ہے؟''

میں نے اسے بتایا۔ ''جس لڑکی کی یہ تصویر ہے۔''

''نہیں، اس کا نام نکی تھا۔'' گڈون نے تصحیح کی۔

''تھا......؟'' ارما کی آنکھوں سے آنسو بہہ نکلے۔

''تھا...... سے کیا مطلب ہے تمہارا؟''

''وہ میری دوست تھی لیکن ایک روز خاموشی سے کچھ کہے بغیر چلی گئی۔ اسے گئے ہوئے ایک سال ہو گیا ہے۔ اس دوران میں میں اپنی یادداشت کے سہارے اس کی تصویریں بنا تا رہا ہوں۔''

''اور ان پر گوڈوسکی کا نام لکھتے رہے۔ کیا یہ جعل سازی نہیں ہے؟'' میں نے جھلاتے ہوئے کہا۔

''وہ میرا چچا تھا۔ میرے باپ کا بھائی۔ ہم سب میں صرف اس کو ہی خاندانی نام استعمال کرنے کا شوق تھا۔ میں نے بھی اسی سے مصوری سیکھی۔ یہاں تک کہ میں بھی اس جیسی تصویریں بنانے کے قابل ہو گیا۔ اس کے باوجود لوگ میرے کام کو نظر انداز کرتے رہے۔ پھر میں نے اسی کے انداز کو نقل کرنا شروع کر دیا اور تصویروں پر اس کا نام لکھنے لگا۔ اس طرح مجھے کچھ آمدنی ہونے لگی۔''

میں نے اسے متوقع انجام سے ڈرانے کی کوشش کی۔ ''یہ جعل سازی ہے اور تم اس کا نام استعمال کرنے کے جرم میں جیل بھی جا سکتے ہو۔''

''ہرگز نہیں۔'' اس نے بڑے اعتماد سے کہا۔ ''کیونکہ میرا خاندانی نام بھی گوڈوسکی ہے۔ میرے چچا نے کبھی تصویروں پر تاریخ نہیں ڈالی جبکہ میں اپنی تصویروں پر اپنی تاریخ پیدائش لکھتا ہوں۔ تصویروں کی نقل بیچنے پر کوئی پابندی نہیں ہے اور نکی کی پورٹریٹ کی زیادہ مانگ ہے۔ اس کے علاوہ میں نے نکی کی اصلی تصویریں بھی بنائی ہیں۔ نکی اپنے ساتھ چچا کی بنائی ہوئی تصویر بھی لائی تھی اور اس نے بتایا تھا کہ وہ ایک بہتر زندگی گزارنے کی خواہاں ہے۔ چچا نے ہی اسے میرے پاس بھیجا تھا کیونکہ ان کا خیال تھا کہ میں اس کی زیادہ بہتر دیکھ بھال کر سکتا ہوں۔''

''مجھے تو لگتا ہے کہ تمہارے ساتھ رہ کر وہ نشے کی عادی ہو گئی تھی۔ تم اسے بہتر زندگی کہتے ہو؟''

''میں ہمیشہ سے ہی ایسی زندگی گزار رہا ہوں اور میرے پاس ایسا کچھ نہیں جس پر فخر کر سکوں لیکن میں نے نکی سے دل کی گہرائیوں سے محبت کی تھی اور وہ بھی مجھے چاہتی تھی۔''

ارما سے ضبط نہ ہو سکا اور وہ غصے سے بولی۔ ''تم بار بار اسے نکی کیوں کہہ رہے ہو؟ اس کا نام مچل ہے اور میں اس

کی ماں ہوں۔''

''میں جانتا ہوں۔'' اس نے کسی حیرت اور تعجب کا اظہار کیے بغیر کہا۔ ''وہ اکثر بتایا کرتی تھی کہ تم دونوں میں کتنی مشابہت ہے اور دیکھنے میں بالکل بہنیں لگتی ہو۔ وہ تمہیں بہت یاد کرتی تھی لیکن اس نے ایک آزاد زندگی گزارنے کی خاطر تم سے جدا ہونا قبول کیا۔''

''کیا اس نے جانے سے پہلے تمہیں بتایا تھا کہ وہ کہاں جارہی ہے؟'' ارما نے گڈون سے جرح کرتے ہوئے کہا۔ ''وہ کوئی تحریر چھوڑ کر گئی ہے یا جانے کے بعد اس نے فون پر تم سے کبھی رابطہ کیا؟''

گڈون کچھ ٹپٹا گیا اور ارما سے نظریں چراتے ہوئے بولا۔ ''میں شاید اپنی بات کی وضاحت نہیں کرسکا۔ میں جب سو کر اٹھا تو وہ جا چکی تھی۔ میرا مطلب ہے کہ رات میں ہی کسی وقت اس نے دنیا سے منہ موڑ لیا تھا۔'' اس کی آواز بھرا گئی اور وہ زاروقطار رونے لگا۔ ''اس شہر نے اسے نگل لیا اور وہ منوں مٹی تلے چلی گئی۔ اس کے بعد مجھے زندگی سے نفرت ہوگئی ہے۔ اوہ خدا...... میں مر کیوں نہیں جاتا۔''

اس سے پہلے کہ میں اسے روکتا، ارما نے اس کے سامان میں سے ایک چاقو اٹھایا اور گڈون پر حملہ کردیا۔ یہ سب کچھ اتنی تیزی سے ہوا کہ اسے اپنے بچاؤ کی بھی مہلت نہیں ملی۔ دل سے چند انچ کے فاصلے پر گردن کے نچلے حصے میں زخم آیا اور خون سے اس کا سینہ سرخ ہونے لگا۔ ارما نے ایک بار پھر چاقو فضا میں بلند کیا اور وحشیانہ انداز میں چلاتے ہوئے بولی۔

''میری بیٹی صرف تمہاری وجہ سے ماری گئی۔''

میں نے اس کی کلائی کو مضبوطی سے پکڑ لیا۔ اس کی گرفت چاقو پر ڈھیلی پڑ گئی اور وہ اس کے ہاتھ سے چھوٹ گیا۔ گڈون تکلیف سے چلا رہا تھا۔ اس نے ایک ہاتھ سے بہتے ہوئے خون کو روکنے کی کوشش کی اور لڑکھڑاتا ہوا پیچھے کی طرف ہٹا۔ اس کا جسم دیوار سے ٹکرایا اور وہ آہستہ آہستہ بیٹھتا چلا گیا۔ اس چھوٹے سے چاقو سے لگنے والا زخم مہلک نہیں تھا اور مجھے اندازہ ہوگیا تھا کہ مرہم پٹی کے بعد گڈون کی جان بچ جائے گی۔

ارما اپنے آپ کو میری گرفت سے آزاد کرانے کی کوشش کررہی تھی اور مسلسل کہے جارہی تھی۔ ''میں اسے زندہ نہیں چھوڑوں گی۔ ایسے لوگوں کو زندہ رہنے کا کوئی حق نہیں ہے۔''

''نہیں۔'' میں نے اسے اپنی طرف کھینچتے ہوئے کہا۔ ''بس اتنا ہی کافی ہے۔''

پھر میں اسے لے کر دروازے کی طرف بڑھا۔ وہ بار بار مڑ کر پیچھے کی طرف دیکھ رہی تھی۔ میں نے ایزل پر پڑا ہوا پردہ ہٹا دیا جہاں مچل اپنی تمام تر رعنائیوں اور زندگی سے بھرپور مسکراہٹ کے ساتھ موجود تھی۔ میں نے ارما کے کندھے پر ہاتھ رکھا اور بولا۔ ''ہم یہاں تمہاری بیٹی کی تلاش میں آئے تھے اور وہ ہمیں مل گئی۔ اب گھر چلو۔''

☆☆☆

کٹلر کے عالی شان دفتر کے خوب صورت ویٹنگ روم میں بیٹھے ہمیں چند منٹ ہی ہوئے ہوں گے کہ کٹلر تیز تیز قدموں سے چلتا ہوا میرے پاس آیا۔ اس کی حالت بالکل اس کھلاڑی جیسی تھی جو سو میٹر کی اولمپک ریس میں سونے کا تمغا جیت کر آیا ہو۔ وہ میرے قریب پہنچ کر تھوڑا سا جھکا اور پُرجوش لہجے میں بولا۔ ''تم یہی کہنا چاہ رہے ہو نا کہ اچھی خبر لے کر آئے ہو اور تم نے اسے تلاش کرلیا ہے۔''

اس سے پہلے کہ میں مناسب لفظوں میں اسے نتیجے سے آگاہ کرتا، اس کی نظر میرے عقب میں کھڑی ہوئی ارما اوپر چلی گئی اور وہ لمحہ بھر کے لیے ساکت ہوکر رہ گیا۔ پھر اس کے جسم میں حرکت ہوئی اور وہ ارما کی جانب اشارہ کرکے کچھ کہنے لگا۔ اس کے ہونٹ حرکت کررہے تھے لیکن اس کے حلق سے آواز نہیں نکل رہی تھی۔

''تم واقعی جادوگر ہو اور جو کچھ مجھے بتایا گیا تھا، تم تو اس سے بھی زیادہ تیز نکلے۔ تم نے نہ صرف اسے تلاش کرلیا بلکہ ساتھ لے کر بھی آگئے۔'' پھر اس نے ارما سے مخاطب ہوتے ہوئے کہا۔ ''جب میں نے پہلی بار تمہاری تصویر دیکھی تو اندازہ لگا لیا تھا کہ اب تمہاری کیا عمر ہوگی۔ میں دیکھ رہا ہوں کہ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ تم مزید خوب صورت ہوگئی ہو۔''

ارما اپنی تعریف سن کر مسکرادی۔ البتہ وہ اس غیر متوقع صورتِ حال کا سامنا کرنے کے لیے ہرگز تیار نہ تھی۔ اس کی سمجھ میں نہیں آیا کہ وہ کٹلر کی بات کا کیا جواب دے۔ اس نے مدد کے لیے میری طرف دیکھا۔ میں جانتا تھا کہ مجھے کیا کرنا ہے لیکن میں نے آنکھوں ہی آنکھوں میں اسے سمجھا دیا کہ یہ اس کی زندگی ہے اور فیصلہ بھی اسی کو کرنا ہے۔

کٹلر نے اس کی جانب اپنے ہاتھ بڑھائے۔ وہ لمحہ بھر کے لیے جھجکی اور مسکراتے ہوئے انہیں تھام لیا۔ میرا کام ختم ہوچکا تھا۔ میرے خیال میں سچ چھپانے سے کسی کو خوشی مل جائے تو اسے بے ایمانی نہیں سمجھا جائے گا۔



کفن بہ دوش

ڈاکٹر عبدالرب بھٹی

کائنات کے کچھ حصوں میں زندگی کچھ اس طرح محبوس ہے کہ قدم قدم پر گویا سانسیں اپنے آنے جانے کا تاوان دے رہی ہوں... جیسے مقبوضہ کشمیر جہاں زندگی اور موت کی آنکھ مچولی اور تماشائیوں کی بھیڑ... کون ہے جو اس الجھی گتھی کو سلجھا سکے۔ بے شک حسن دیکھنے اور چاہے جانے کے لیے ہی بنایا گیا ہے، جسے پانے کے لیے دل مچل جاتا ہے مگر دیکھنے، چاہنے اور پانے کی خواہش میں کون اپنی حدود اور دوسرے کے سکون کی پروا کرتا ہے اور کون اپنی خواہشوں کی قربانی دیتا ہے... اس کا احساس تو بس کوئی ذی شعور ہی کر سکتا ہے... لیکن اس دھکم پیل میں کوئی یہ بھی سوچتا ہے کہ جس حسن کے پیچھے یہ جنگ جاری ہے کیا وہ اس تباہ کاری سے قائم بھی رہ سکے گا اور کیا پانے کے جنون میں مبتلا لوگ جب اسے پائیں گے تو وہ اپنی اصل حالت میں بھی باقی رہے گا۔ چھینا جھپٹی کے اس کھیل میں اس سرزمین پر پیدا ہونے والوں کا بھلا کیا قصور ہے جو اپنے حقوق کی جنگ لڑتے لڑتے بقا کا بھرم ٹوٹ جانے پر قبر میں اترتے جا رہے ہیں۔ اپنی چیز کو اپنا کہنا بھی جہاں کسی بڑے جرم سے کم نہیں۔ دنیا بھر کے لوگ اپنے اپنے گھروں میں سکون کی نیند سوتے ہیں اور یہاں نہ رات کا چین نہ دن کا سکون۔ قدم قدم پر قدرت کی طرف سے دولت کی ریل پیل مگر پھر بھی بھوک و افلاس گھر گھر میں براجمان... یہ عجب امتحان ہے، جانے کب اور کیسے اس خونیں کھیل کا اختتام ہوگا... اور کیا خبر کیا انجام ہو... لیکن مسلمانوں کا ایمان ہے کہ اللہ کے گھر میں دیر ہے اندھیر نہیں... بس اسی یقین و ایمان کے ساتھ یہ جہدِ مسلسل جاری ہے۔

بے پناہ آزمائشوں میں مبتلا دنیا کی بہادر قوم کی المناک داستان



کوہ سلیمان اور کوہ ماران کے درمیان واقع جھیل ''ڈل'' کی منجمد سطح پر بارش کے گرتے ننھے منے قطرے آبگینوں کے مانند چیخ رہے تھے۔ پانی کی سطح کہیں کہیں سے تڑخی ہوئی تھی اور مانجیوں کے شکارے (چھوٹی کشتی) ان میں پھنسے ہوئے تھے۔ یہ غریب کشمیری سبزی فروش تھے اور انہوں نے کرائے کے ان شکاروں پر ڈھیروں سبزیاں لادی ہوئی تھیں تاکہ ''ڈل گیٹ'' پر لے جا کر اپنے ٹھیلوں اور ڈھابوں پر رکھ کر روزی کما سکیں۔ بسا اوقات جھیل کے کنارے ہی یہ لوگ اپنے شکارے لگا کر سبزی فروخت کرنا شروع کر دیتے تھے، اسی لیے اس کنارے کو ''تیرتی ہوئی سبزی منڈی'' بھی کہا جاتا تھا۔

سری نگر (مقبوضہ کشمیر)...... جو مشرق کا وینس بھی کہلاتا ہے اس وقت اپنی سرد ترین صبح کا آغاز کر رہا تھا۔ یہ دریائے جہلم کے دونوں کناروں تک پھیلا ہوا ہے۔ اس پر بنے نو پل شہر کو مختلف حصوں سے ملاتے ہیں۔ اس کے اطراف میں جنگل، جھیلیں اور سرسبز میدان واقع ہیں۔ ان کے پس منظر میں کسی دیدہ زیب لینڈ اسکیپ کا سا منظر پیش کرتی برفیلی پہاڑی چوٹیاں دل فریب نظر آ رہی تھیں۔ دور سے انہیں دیکھ کر یوں لگتا تھا جیسے کشمیر کی عفت مآب شہزادیاں سفید پیراہن اوڑھے ایک شاہانہ وقار کے ساتھ کھڑی ہوں۔

قدرتی حسن سے مالا مال یہ شہر، مغل بادشاہوں کو بہت پسند تھا۔ وہ موسم گرما یہیں گزارتے تھے۔ انہوں نے اس کی قدرتی خوبصورتی کو دیکھتے ہوئے یہاں (خصوصاً ڈل جھیل پر) خوشنما و دیدہ زیب باغات تعمیر کرائے۔ ان میں شاہی چشمہ، شالا مار باغ، نسیم باغ، پری محل اور نشاط باغ نمایاں حیثیت کے حامل ہیں۔

شاید بہت کم لوگوں کے علم میں یہ بات ہو کہ وادی کے تمام علاقوں کی طرح یہاں بھی وسیع پیمانے پر اردو بولی جاتی ہے بلکہ اردو جموں و کشمیر کی سرکاری زبان بھی ہے۔

گزشتہ شب مکانوں کی چھتوں پر گرنے والی شبنم بھی سردی سے جم گئی تھی۔

کشمیر...... جنت نظیر...... اک وادی دل پذیر کا حسن ایک عرصے سے بھارتی غاصب فوجیوں کی ظالمانہ درandازی سے گہنایا ہوا تھا۔ یہاں کے ابتر حالات اور بھارتی درندوں کا کشمیری مظلوم و مقہور عوام پر آئے روز عرصۂ حیات تنگ کرنا معمول بن چکا تھا۔

وہ اٹھارہ، انیس سالہ دبلا پتلا مگر مضبوط کاٹھی کا حامل شیر علی، اس وقت ٹھٹھرتی شام میں اپنے بوڑھے باپ کے ساتھ اس ''تیرتی سبزی منڈی'' میں اپنے، سبزیوں سے لدے ہوئے شکارے کو سنبھالے ہوئے تھا۔

شیر علی بہ ظاہر تو دبلا پتلا نظر آتا تھا لیکن اس کی جسامت سے ایک طرح کی مضبوطی بھی جھلکتی تھی۔ چہرے کے نقوش خوبرو تھے اور قد دراز تھا تاہم اس کے چہرے پر ہر وقت ایک بے نام سی سنجیدگی کھنڈی رہتی تھی، بڑی بڑی روشن آنکھوں میں کسی دیرینہ عزم صمیم کی چمک پھوٹتی محسوس ہوتی تھی جیسے وہ کچھ کرنے بلکہ بہت کچھ کرنے کے لیے بے تاب ہو۔ کسی ایسے راستے کا متلاشی ہو، جو اس کی زندگی کو بامقصد بنا سکے اور جو اس کے اندر بسی ازلی بے چینی و اداسی کو دور کر سکے۔ اس کے بہ ظاہر خاموش چہرے کے پیچھے سوچ بچار کے ہزاروں اضطراب چھپے ہوئے تھے۔

وہ اپنی نوجوانی کی عمر سے گزر رہا تھا، ایسی عمر جس میں ہزار امنگیں اور دل میں ہزاروں آرزوئیں ہوتی ہیں لیکن دیگر کشمیری نوجوانوں کی طرح وہ بھی ذہنی اذیت سے دوچار رہتا تھا۔ وہ بڑے کڑھتے دل سے سوچتا تھا کہ ہماری زندگی کیا تھی؟ جب سے یہ وادی بھارتی غاصب فوجیوں کے پنجۂ استبداد میں جکڑی گئی تھی، تب سے وادی کا سکون غارت ہو چکا تھا۔

آج موسم کی صورت حال کو دیکھتے ہوئے انہوں نے ڈل گیٹ پر جانے کے بجائے کنارے پر ہی سبزی فروخت کرنے کا ارادہ کیا تھا، لہٰذا بڑی مشکل سے دونوں باپ بیٹا اپنے شکارے کو کھیتے ہوئے کنارے تک لائے تھے اور کچھ سکون کا سانس لیا تھا۔

شیر علی کو اپنی فکر تو نہ تھی مگر اپنے باپ محمد علی کو سردی کے مارے بری طرح کانپتے دیکھ کر وہ اپنا دل مسوس کے رہ گیا۔ اسے اس پر بڑا ترس آیا۔ حالانکہ اس نے اسے منع بھی کیا تھا آنے سے مگر وہ نہ مانا۔ وہ بہت سخت کوش اور محنتی تھا۔

شیر علی کنارے پر پہنچتے ہی سب سے پہلے ایک شکارے پر بنے چائے خانے سے اپنے باپ کے لیے کشمیری چائے کا ایک مگ بنوا لایا جو اس نے آدھا پی کر باقی نصف بیٹے کی طرف بڑھا دیا تھا۔

اس روز معمول سے کم آمدنی ہوئی۔ تاہم اس سرد ترین موسم میں کچھ نہ کچھ آمدن تو ہو ہی گئی تھی۔ عموماً یہ باپ بیٹا شام تک بیٹھے رہتے تھے، لیکن آج موسم کے تیور دیکھ کر کسی میں بھی زیادہ دیر ٹھہرنے کی ہمت نہ ہو سکی اور سہ پہر ہوتے ہی تمام مانجیوں نے اپنے اپنے شکارے سمیٹنے

شروع کردیے۔

اگلے دن کی صبح بڑی سحر خیز رہی اور انہوں نے بھی خدا کا شکر ادا کیا۔ خوب تیز اور چمکدار دھوپ نکلی ہوئی تھی ...... مگر محمد علی بری طرح سردی کی لپیٹ میں آ کر سخت بیمار پڑ گیا تھا۔ اسے شاید نمونیا ہو گیا تھا۔ شیر علی باپ کو ڈاکٹر کے پاس لے گیا تھا۔ اس نے ایک انجکشن لگا کر کچھ دوائیاں لکھ کر نسخہ ہاتھ میں تھما دیا تھا۔

آج وہ اکیلا ہی شکارا لیے ڈل گیٹ پر آ گیا تھا۔ مارکیٹ میں سبزی فروشوں کے مختلف ٹھیلے سجے ہوئے تھے، خوب گہما گہمی دیکھنے میں آتی تھی مگر اس گہما گہمی میں جانے کیوں ایک نامعلوم سی گھٹن کا بھی احساس تھا۔ سانس کی روانی آزاد فضا سے مشروط ہوتی ہے، جبکہ ان دنوں نہیں بلکہ برسوں سے اس وادی جنت نظیر و دل پذیر کی آزاد فضا کو مکدر کر دیا گیا تھا۔ جیسے کوئی دبا دبا سا خوف تھا، جو ہر وقت غریب اور نہتے کشمیری عوام کے دل و دماغ میں گردش کرتا رہتا تھا۔ بے شک ان میں اکثریت ایسے ہی لوگوں کی تھی جو اپنی جان کی پروا کیے بغیر، غاصب بھارتی فوجیوں کے سامنے سینہ سپر تھے اور ان کے لیے آج بھی ایک سیسہ پلائی دیوار ثابت ہو رہے تھے۔ یہ کشمیری حریت پسندوں کا وہ کفن بہ دوش ٹولہ تھا، جو ہر روز اپنے لہو سے آزادی کا چراغ روشن کر کے آنے والوں کو درس حریت پڑھا جاتا تھا ...... بے شک عوام کے دل بھی انہی کے ساتھ دھڑکتے تھے، جیسے بچے بچے نے اس بات کا عزم صمیم کر رکھا تھا کہ وہ بھی آنے والوں وقتوں میں اسی طرح اپنے لہو سے چراغ سے چراغ جلاتے رہیں گے۔

شیر علی کا بھی یہی حال تھا، اس کے دل میں جانے کیوں ایک بے نام سی اداسی گھری رہتی تھی۔ اسے یوں محسوس ہوتا تھا کہ وہ اپنے بوڑھے باپ کے ساتھ ڈل گیٹ پر سبزی بیچنے کے لیے نہیں پیدا ہوا ہے، اس کی زندگی کا مقصد تو کچھ اور ہونا چاہیے تھا۔ یہی سوچ کر وہ اداس ہو جایا کرتا۔ کبھی کبھی اس اداسی میں ایک طیش کی کیفیت بھی گھلنے لگتی تھی۔ ایسا کیوں محسوس ہوتا تھا اسے؟ کیا دیگر لوگوں کی طرح وہ بھی یہی محسوس کرتا تھا کہ ان کی آزادی سلب کی جا چکی ہے؟ ہم بظاہر آزاد دکھنے والے کشمیری لوگ درحقیقت پابند سلاسل ہیں ...... کیوں؟ ہمیں اپنی مرضی سے جینے کا حق کب ملے گا؟ اس کے دل و دماغ میں ہر وقت یہی سوچیں گردش کرتی رہتی تھیں۔ شیر علی فطرتاً حساس طبع تھا۔ وہ اپنے باپ سے پانچ جماعتیں زیادہ پڑھا ہوا تھا۔ اس نے میٹرک کر رکھا تھا۔

اس وقت ڈل جھیل کا کنارہ خوشگوار اور تیز دھوپ سے چمک رہا تھا۔ سڑک کنارے وہ اپنا ٹھیلا لگائے ہوئے تھا۔ اس کے قریب میں چاچا قاسم متو کا ٹھیلا تھا، یہ اس کے باپ کی عمر کا تھا، اس نے شیر علی سے پوچھا۔ ”خیریت تو ہے۔ یہ محمد علی آج تیرے ساتھ نہیں آیا، طبیعت تو ٹھیک ہے نا اس کی؟“

چاچا قاسم متو کا اور اس کے باپ محمد علی کی خوب بنتی تھی۔ شیر علی نے اس کی بات کا اثبات میں جواب دیا تو وہ اس کے باپ کے لیے دعائیہ کلمات ادا کر کے ایک گاہک کی طرف مصروف ہو گیا۔

اچانک وہ سڑک بھاری فوجی بوٹوں کی دھمک سے گونجنے لگی۔ مارکیٹ میں لوگوں کی خوش فعل چہ میگوئیوں کو یک دم بریک لگ گئے اور سب اپنے اپنے کاموں میں مصروف ہو گئے۔ بھارتی فوجیوں کا ایک مسلح ٹولا اسی طرف آ رہا تھا۔ یہ تعداد میں گیارہ تھے اور سبھی چست وردیوں میں ملبوس تھے۔

قریب آ کر یہ تین کی ٹولیوں میں بٹ گئے اور سبزی خریدنے لگے۔ انہیں دیکھتے ہی ہر کوئی یہی دعا مانگا کرتا کہ کوئی فوجی ان کے ٹھیلے کی طرف رخ نہ کرے۔ فوجی سبزی خریدتے تو پیسے ہی نہیں دیتے، زیادہ شور مچانے پر چند روپے یوں پھینک دیتے، جیسے بھیک دے رہے ہوں۔

شیر علی کے ٹھیلے کی طرف بھی ایک ٹولا بڑھا۔ وہ تین فوجی تھے۔ تینوں ہی مسٹنڈے تھے۔ وہ تینوں ہندو فوجی پہلے تو اس کی طرف استہزائیہ نظروں سے تکتے رہے پھر ایک نے اس سے بھاؤ تاؤ کیے بنا ہی سبزیاں بندھوانا شروع کر دیں اور چلتے بنے۔

شیر علی نے آواز دے کر انہیں روکا۔ حالانکہ اس کی ماں اور بالخصوص باپ کی یہ نصیحت تھی کہ اگر کوئی بھارتی فوجی اس سے سبزی لینے آئے اور بنا پیسے دیے چل دے تو اسے جانے دیا کرے، الجھنے کی کوشش نہ کرے ...... اور اس کا باپ ایسا کرتا بھی تھا۔

شیر علی کے آواز دینے پر تینوں فوجی یوں رک گئے جیسے چابی بھرے کھلونے کی چابی ختم ہو گئی ہو۔ پھر وہ اس کی جانب مڑے اور بڑی خشمگیں نظروں سے اسے گھورتے رہے پھر ایک نے بڑے غصیلے اور نخوت بھرے لہجے میں شیر علی سے کہا۔

”کیا ہے رے؟ کیوں آواز دیتا ہے؟“

''آپ نے سبزی لی ہے۔ اس کے پیسے تو دیتے جاؤ۔'' شیر علی نے بھی تیز لہجے میں کہا۔

اس پر تیسرا فوجی چند قدم اٹھا تا ہوا اس کی طرف خاصے جارحانہ انداز میں بڑھا اور ایک زوردار تھپڑ اس کے چہرے پر رسید کر دیا۔ وہ سترہ، اٹھارہ سالہ دبلا پتلا نوجوان ہی تھا، دل میں دلیری تھی مگر لڑائی بھڑائی کا کوئی تجربہ نہ تھا۔ تھپڑ کھا کر وہ چند قدم پیچھے لڑکھڑا گیا۔ اس تذلیل پر شیر علی کی آنکھوں میں پانی اتر آیا، چہرہ سرخ ہو گیا۔ اس مردود فوجی نے اس پر بھی بس نہ کیا اور اپنی رائفل جس کی نال کے سرے پر لمبے پھل والا خنجر نصب تھا، وہ اس نے اس کی گردن پر رکھ دی اور درشت لہجے میں بولا۔

''اب بول پیسے چاہئیں؟'' اس کے منہ سے ایک لفظ نہیں نکلا۔ خنجر کی دھار تیز تھی، اس کی گردن کی کھال پر چیرا بھی لگ گیا اور وہاں سے خون بہنے لگا اور وہ کراہنے لگا۔ ایسے میں ایک بوڑھے کشمیری سبزی فروش نے آگے بڑھ کر اسے ان وحشی اور جلاد صفت بھارتی فوجی سے بچا لیا اور بڑی جرأت کا مظاہرہ کرتے ہوئے ان سے بولا۔

''تم لوگوں کو شرم نہیں آتی، ایک معصوم لڑکے کے ساتھ ایسا سلوک کرتے ہوئے؟ ایک تو چوری اوپر سے سینہ زوری۔''

یہ بوڑھا کشمیری چاچا قاسم متو کا ہی تھا۔ چاچا قاسم کی اس جرأت انگیزی نے ان تینوں فوجیوں کے چہرے سیاہ کر ڈالے۔ جس نے شیر علی کو خنجر کی نوک پر رکھا تھا، وہ اور اس کا ساتھی، غصے سے دانت کچکچاتے ہوئے بوڑھے کی طرف بڑھے۔ آفرین تھا اس بوڑھے بہادر کشمیری پر کہ وہ اپنی جگہ سے ٹس سے مس تک نہ ہوا اور تب ہی دوسرے کشمیری سبزی فروشوں کے خون میں بھی ایک ابال اٹھا اور وہ سب ایک دوسرے کا ہاتھ تھامے زنجیر بن کر ایک دم شیر علی اور اس بہادر بوڑھے کے سامنے، دیوار بن کر آن کھڑے ہوئے۔

ان دونوں جوان اور بوڑھے کی طرف جارحانہ انداز میں بڑھتے ہوئے تینوں بھارتی فوجی یک دم رک گئے۔ اسی وقت سبزی منڈی کی فضا گولیوں کی تڑتڑاہٹ سے گونج اٹھی۔ ایسا ان کے بزدل ساتھی فوجیوں نے مجمع کو منتشر کرنے کے لیے کیا تھا۔ لیکن کشمیری سبزی فروشوں کی یہ زنجیر پھر بھی نہیں ٹوٹی، تب پھر نہ جانے کیسے شیر علی کے سینۂ سوزاں میں چھپا غبار ایک پرجوش نعرے کی صورت ابھرا......

''کشمیر بنے گا پاکستان......''

شیر علی کے اس نعرے لگانے کی ایک وجہ تھی۔ وہ اکثر جمعے کی نماز اپنے باپ کے ساتھ جامع مسجد میں پڑھنے جاتا تھا۔ مسجد کے قریب ہی ''نوہاٹا چوک'' تھا۔ یہاں اکثر پولیس اور بھارتی فوجیوں کے خلاف احتجاج ہوا کرتا تھا، پولیس اور بھارتی فوجیوں پر پتھراؤ اور ہنگامے بھی ہوتے رہتے تھے۔ پرجوش کشمیریوں کی شعلہ بیاں تقریریں بھی ہوا کرتی تھیں۔ وہ بھی کبھی کسی کشمیری حریت پسند راہنما کی تقریر سننے کے لیے بھی کھڑا ہو جایا کرتا تھا جسے سن کر اس کے اندر بھی ایک ولولہ انگیز جوش سا ابھرتا تھا۔ وہیں اس نے ایک روز کشمیری مجمع میں یہ نعرہ بلند ہوتے سنا تھا، اس وقت اسے اس نعرے کے مفہوم کا صحیح ادراک نہ تھا۔

مگر جب اس نے ایک دن ایک کشمیری راہنما عبدالرحمان سدھن کی وہ تقریر سنی جس میں اس نے مختصراً... برصغیر کی غیر منصفانہ تقسیم اور پاکستان کے حوالے سے کشمیر کی حق خودارادیت کے سلسلے میں بڑے پرجوش اور ولولہ انگیز لہجے میں بتایا تھا کہ...... ''ہم کشمیریوں کے دل پاکستانیوں کے ساتھ دھڑکتے ہیں اور دھڑکتے رہیں گے انشاء اللہ۔ ہم انگریز سامراج کی اس سازش کو بے نقاب کر چکے ہیں، جس نے یہاں سے جاتے ہوئے بھی اپنی فطرت کے مطابق ''لڑاؤ اور حکومت'' کرو کی پالیسی اپنائی، اس وادی کو چند ٹکوں کے عوض ایک ہندو ڈوگرا مہاراجا گلاب سنگھ کو بیچا گیا لیکن ہماری غیور قوم نے دوتھان اور جلسہ باغ کے مقام پر انہی ڈوگرا فوجیوں کے خلاف کلمۂ حق اور آزادی کا علم بلند کر دیا تھا۔ دوتھان اور جلسہ باغ کے مجاہد غازیوں اور شہداء کا وہ علم آج ہمارے ہاتھوں میں ہے اور ہم کسی صورت بھی اپنی آزادی اور حق خودارادیت سے دستبردار نہ ہوں گے۔ کبھی نہیں، کیونکہ یہ جنگ کفر اور اسلام کی جنگ ہے، ہمارے اسلاف کی جنگ ہے اور فتح ہمارا مقدر ہے، اس لیے کہ حق و باطل کی اس جنگ میں ہمیشہ حق کو ہی فتح حاصل ہوتی ہے۔''

وہ ولولہ انگیز تقریر اس قدر اثر پذیر اور سیدھی دل میں اتر جانے والی تھی کہ شیر علی کا وہاں سے ہٹنے کو جی نہیں چاہ رہا تھا۔ اس کا دل کرتا تھا کہ یہ ولولہ انگیز تقریریں، وہیں کھڑا سنتا رہے لیکن اس کا باپ ذرا اور مزاج کا آدمی تھا۔ وہ اسے بازو سے پکڑ کے کھینچتا ہوا لے جاتا اور جھڑکتا بھی تھا کہ وہ کیوں ہر بار یہاں تقریریں سننے کھڑا ہو جاتا ہے؟

شاید یہی وجہ تھی کہ آج ایسے موقع پر آپوں آپ شیر علی کے لبوں سے یہ نعرہ بلند ہو گیا تھا۔ نہ جانے اس نعرے میں ایسی کیا بات تھی کہ پھر یہ نعرہ شیر علی کا نعرہ نہ رہا، سب کا

بن گیا اور پوری سبزی منڈی میں یہ نعرہ بہ آواز بلند گونجنے لگا۔ بھارتی فوجیوں کے چہرے مسخ ہو گئے۔ انہیں جیسے سانپ سونگھ گیا۔ اس کے بعد وہی ہوا جیسا یہ بزدل غاصب ہندو فوجی کرتے چلے آئے تھے۔ یعنی نہتے اور غریب مظلوموں کے خون سے ہولی کھیلنا۔ گولیوں کی بھیانک تڑتڑاہٹ اور انسانی چیخوں سے پورا علاقہ گونج اٹھا۔ لاشیں گرنے لگیں، شیر علی خود بھی خوف زدہ ہو گیا۔ بھارتی فوجیوں نے درندگی کی انتہا کر دی تھی۔ وہ بڑی مشکلوں سے جان بچا کر وہاں سے بھاگا اور سیدھا نشاط باغ آ کر ہی دم لیا۔ یہ بڑا گنجان علاقہ تھا۔ وہ یہاں سے چھپتا چھپاتا امیراں کدل پل کی طرف آ گیا جو ویران پڑا ہوا تھا۔ یہاں دونوں طرف بھارتی فوجیوں کی چوکیاں قائم تھیں، جہاں مشین گنیں نصب تھیں۔ انہیں دیکھ کر وہ ذرا ڈر گیا مگر اس کا تو یہاں سے گزرنا روز کا معمول تھا، اسی لیے وہ بہ ظاہر سکون کے ساتھ وہاں سے گزرنے لگا۔

اب اس کے دائیں جانب دور گھرک کی برف زار چوٹیاں تھیں اور سامنے چناروں کے درمیان گھری ہوئی سڑک۔ شیر علی اسی پر تیز تیز قدموں سے آگے بڑھتا رہا۔ اب اسے ڈھلانی جگہوں پہ لکڑی کے مکانات دکھائی دینے لگے۔ وہ ایک کشمیری پہاڑی نالا پار کر کے پتھروں سے بنے اس ٹیرس پر آ گیا جدھر اسی کشمیری حریت پسند راہنما عبدالرحمان کا مکان تھا۔ اس سے آگے والی ایک پتھریلی گلی میں شیر علی کا گھر تھا۔ اگرچہ اس علاقے میں بھی آئے دن پولیس اور فوجیوں کے چھاپے پڑتے رہتے تھے اور اچانک بھارتی فوجی کسی بھی وقت یہاں گھر گھر تلاشی لینے کے لیے بغیر اطلاع کیے گھسے چلے آتے تھے۔ مار کٹائی بھی کرتے اور خواتین کے ساتھ بدتہذیبی کرنا تو ان کا شیوہ بن چکا تھا۔

ایسا عبدالرحمان کی وجہ سے ہوتا تھا۔ کئی بار پولیس اسے گرفتار کر کے بھی لے جا چکی تھی اور پھر پوچھ گچھ کے بعد کوئی ٹھوس ثبوت نہ ہونے کی وجہ سے چھوڑ بھی دیتی تھی۔ ایک بار وہ فوجیوں کے ہتھے بھی چڑھا تھا۔ جب کئی روز تک اس بہادر اور دلیر کشمیری حریت پسند راہنما کی بازیابی نہ ہو سکی تو لاکھوں کشمیریوں نے سری نگر میں بھارتی فوجیوں کے خلاف صدائے احتجاج بلند کیا اور ہڑتالیں کیں تب جا کر عبدالرحمان کو بھارتیوں نے چھوڑا۔

یہی وہ راہنما تھا جس کی وجہ سے آج اس کے اندر آزادی کے جذبے کا شعلہ پورے دھڑلے کے ساتھ بھڑکا ہوا تھا۔ یہ انہی کا دیا ہوا درس حریت کا جذبہ تھا۔ وہ اکثر اپنے کشادہ صحن والے مکان میں ان جیسے نوجوانوں کو بلا کر انہیں درس حریت دیا کرتے تھے اور انہیں کشمیر کی تاریخ سے آگاہی دیتے۔ ان کا خیال تھا کہ ماضی کے حقائق جانے بغیر ہمارے اندر جذبۂ آزادی کا بیدار ہونا ناممکن تھا۔

شیر علی بڑے غور سے ان کی باتیں سنا کرتا اور حقیقت یہی تھی کہ اپنی دھرتی سے متعلق حقائق جان لینے کے بعد تو جیسے شیر علی کے اندر بھی جذبۂ آزادی کا ایک شعلہ بھڑکنا شروع ہو گیا تھا۔ انہی سے اسے بہت سی اہم باتوں کا پتا چلا تھا کہ کشمیر کے ساتھ انگریز سامراج اور ابن الوقت ہندو لیڈروں نے کیسی دوغلی اور منافقانہ پالیسی کھیلی تھی۔

وہ 27 اگست 1947ء کا دن تھا، پاکستان کی آزادی کو ابھی بہ مشکل تیرہ دن ہی ہوئے تھے۔ انگریز سامراج دو مملکتوں (پاکستان اور ہندوستان) کے 3 جون 1947ء میں قیام کے اپنے اعلان کو عملی جامہ پہنا چکا تھا لیکن ابھی ان دونوں مملکتوں میں جنگل کے قانون کا سا سماں تھا کیونکہ دنیا کے نقشے پر ابھرنے والی، دولت مشترکہ کی ان دو آزاد و خود مختار مملکتوں میں ابھی اپنی کوئی عملداری رائج نہیں کی جا سکی تھی۔ چالیس کروڑ آبادی پھیلے ہوئے ہندوستان کی 568 ریاستیں، ابھی ان دونوں مملکتوں کے ''الحاق'' کے مرحلے سے گزر رہی تھیں۔ انہی میں ایک ریاست جموں و کشمیر تھی مگر بدقسمتی سے اس کا فیصلہ ڈوگرا شاہی کے ہاتھوں میں دے دیا گیا تھا۔ اس کے بعد مہاراجا ہری سنگھ نے پونچھ اور جموں کے مسلم سدھنوتی سرداروں اور مجاہدین کے جذبۂ حریت اور جہاد سے خوف زدہ ہو کے اور اپنا اقتدار مضبوط کرنے کے لیے، کشمیر کو دھوکے سے بھارت میں شامل کر دیا اور بھارتی فوجیوں سے مدد حاصل کی۔ ریاست جموں و کشمیر جس کی آبادی 40 لاکھ تھی اور اس میں پچھتر فیصد مسلمان آباد تھے۔ پاکستان کے حوالے سے یہ علاقہ اپنی حیثیت کے اعتبار سے بعض اٹل حقیقتوں کا حامل تھا جس میں سے ایک یہ تھی کہ اس میں سے جو دریا پھوٹتے تھے، وہ پاکستان سے گزرتے تھے۔ دریائے جہلم اس کی مثال ہے، جس میں جھیل ڈل (سری نگر) کا پانی بھی شامل ہے اور اسی لیے مذکورہ دریا کے پانی کو شیریں کہا جاتا ہے۔ دوسرے یہ کہ ریاست جموں و کشمیر پاکستان اور ہندوستان، دونوں سے ملحق تھی مگر ایک واضح حقیقت یہ بھی تھی کہ ہندوستان کا اس علاقے سے کوئی دریائی اور زمینی رابطہ نہ تھا اور نہ ہی اقتصادی۔ جبکہ دنیا سے کشمیر کا رابطہ ان دو کچے راستہ نما سڑکوں سے تھا، حتیٰ کہ وہ بھی اصولی طور پر پاکستان

کے حصے میں آتا تھا۔ باوجود اس کے اسے ایک ''نزاعی'' مسئلہ بنا دیا گیا تھا۔ انگریز سامراجی شعبدہ گروں نے جو اس حقیقت سے واقف بھی تھے، ریڈ کلف ایوارڈ سے جب ان کی حدود بندی کا اعلان کیا تو مسلمانان ہندو پاک کو ایک زبردست ذہنی جھٹکا لگا، کیونکہ جموں سے کٹھوعہ جانے والا راستہ ریڈ کلف کی ''مہربانی'' کے تحت ہندوستان کے حصے میں دے دیا گیا۔ یوں ''روانہ ہوتے'' انگریز شعبدہ گروں نے ان دونوں ممالک کے درمیان، اپنی غیر موجودگی میں بھی ہمیشہ کے لیے ایک مسئلہ پیدا کر دیا تاکہ بعد میں بھی یہ انہیں ''یاد'' کرتے رہیں۔

اگرچہ پاکستان کے ساتھ اس ریاست کا الحاق ڈوگرا مہاراجا کے لیے کوئی مشکل بات نہیں تھی، اس لیے کہ اس وقت ریاست کی دونوں بڑی جماعتوں (مسلم کانفرنس اور نیشنل کانفرنس) کے لیڈران جیلوں میں تھے مگر بدطینت، مہاراجا صرف ''معاہدہ استقرار کار'' (standstill agreement) کرتے ہوئے ایک سلگتے ہوئے جوالا مکھی پر دیگ چڑھا کر اس پر بڑے اطمینان سے جما بیٹھا، اپنی راجدھانی کو طول دیتا رہا۔ کیونکہ اس کی نیت میں فتور آچکا تھا مگر یہ بدطینت ڈوگرا مہاراجا اس حقیقت کو نہیں جانتا تھا کہ راولاکوٹ اور نشاط باغ کے سدھن قبیلے کے کشمیریوں کے اسلاف نے آزادی کا نعرہ تو 1832ء میں بہت پہلے ہی بلند کر دیا تھا جس کی گونج آج تک پونچھ میں سنائی دیتی تھی، جبکہ مہاراجا اس حقیقت سے بھی باخبر تھا کہ اس کشمیری سدھن قبیلے کی ہمدردیاں، نوزائدہ اسلامی جمہوریہ پاکستان کے ساتھ تھیں یہ ڈھکی چھپی بات نہ تھی۔ راولاکوٹ اور باغ میں ہونے والے تئیس اور پچیس اگست کے جلسوں میں کشمیری لوگ پاکستان کے ساتھ اپنی دلی ہمدردی کا نعرہ بلند کر چکے تھے۔ یہی نہیں انہوں نے باغ جلسے میں سبز پاکستانی پرچم ہلا کر مہاراجا کو دہلا بھی دیا تھا اور ہمیشہ کی طرح وہ آزادی کے متوالوں کا ہراول دستہ بن چکے تھے اور ان کے حصے میں اس ''جرم وفا'' کی پاداش میں ڈوگرا فوجیوں کی گولیاں بھی آئی تھیں اور انہوں نے جام شہادت نوش کیا۔ ان کی شہادت نے یہ ثابت کر دیا تھا کہ کشمیر پاکستان کی شہ رگ ہے۔

وہ یہی کچھ سوچتا اور اپنے دل و دماغ کو گرماتا ہوا۔۔ خاموشی سے اپنے گھر کی طرف بڑھنے لگا۔ سامنے اپنے گھر کی چھت پر اس نے زینو کو دیکھا، وہ ساگ اور مرچیں سکھانے کے لیے انہیں چھت پر پھیلا رہی تھی۔ یہ اس کی چھوٹی بہن تھی۔ ان دونوں بہن بھائی میں بہت محبت تھی۔ چار افراد کا یہ گھرانا خوشیوں کا گہوارہ تھا۔ زینو نے بھی چھت سے بھائی کو آتا ہوا دیکھ کر فوراً مسکرا کے ہاتھ ہلا دیا اور پلٹی۔

وہ شاید دروازہ کھولنے کے لیے اتر رہی تھی مگر دروازہ کھلا تو سامنے گل نور کو دیکھ کر جیسے شیر علی کا دل دھڑکنا بھول گیا۔ سروقد، نین نقش سے پیاری اور معصوم نظر آنے والی یہ صاعقہ بار صورت لڑکی گل نور ہمیشہ سے ہی اسے اچھی لگتی تھی اور وہ خود بھی اسے پسند تھا۔ یہی سبب تھا کہ شیر علی کو دیکھ کر اس کی دلی کیفیات وہی ہوتی تھیں جو کہ اس کی اسے اچانک دیکھ کر ہو جاتی تھیں۔ وہ اس وقت سرخ رنگ کی کشمیری شال ''پشمینہ'' اوڑھے ہوئے تھی، جس کی کڑھائی اس قدر دیدہ زیب، نفیس اور باریک تھی کہ کپڑا نظر ہی نہیں آتا تھا جبکہ وہ خود اسے اوڑھے ہوئے ایسی ہی لگ رہی تھی جیسے شام کے خاموش افق پر ڈھلتے آفتاب کا سنہرا تھال چمکتا ہے...... گہری سیاہ بھوؤں اور چمکتی گھنیری پلکوں تلے رمزیہ گہرائی لیے اس کی کشادہ دل نشین آنکھیں، اس کے حسن دل آرا کو دوچند کیے دے رہی تھی۔

وہ شیر علی کو خود میں بے خود پا کر ہولے سے معنی خیز انداز میں کھنکھار کے بولی۔ ''اندر آجائیں، کیا پہلے کبھی نہیں دیکھا مجھے؟''

اس کا یوں دلار سے ٹوکنا بھی شیر علی کو بڑا اچھا لگا تو دل بے قرار بھی گویا آمادہ تکلف برطرف ہوا اور جیسے اس نے بھی بے اختیار کہہ ہی ڈالا...... ''تم ہو ہی اتنی پیاری کہ دل بار بار تمہاری جھلک دیکھنے کو بے تاب رہتا ہے اور جتنا دیکھوں، دل ہی نہیں بھرتا۔'' اس کا لہجہ آپوں آپ شاعرانہ ہونے لگا تو اس کے حنا رنگ چہرے میں جیسے حیا کی سرخی گھلنے لگی اور وہ چندے ماہتاب کی طرح دمکنے لگا۔ اس نے فوراً شرما کر شال کا ایک کونا اپنے چہرے پر نصف حد تک سرکا لیا اور ہولے سے بولی۔

''زیادہ باتیں نہ بنائیں اندر آجائیں، گشتابہ لائی تھی بنا کے، کھا لیجیے گا۔'' یہ کہہ کر وہ ایک طرف ہوگئی۔ شیر علی اندر داخل ہوا۔ سامنے کشادہ صحن تھا۔ دیوار کے کونے سے لگی لکڑی کی سیڑھیوں سے زینو جلدی جلدی نیچے اتر رہی تھی۔

''آرام سے بہنا! گر نہ پڑو۔'' اس نے بڑے پیار سے کہا۔

وہ اتر کے بھائی کی طرف آگئی اور بولی۔ ''بھیا! آج آپ جلدی آگئے؟ خیریت... حالات تو ٹھیک تھے نا شہر کے؟'' زینو نے پوچھا۔

''اچھا، زینو! میں چلتی ہوں۔'' اسی دوران گل نور نے ہولے سے کہا تو شیر علی زینو کی طرف دیکھ کر بولا۔

''ارے زینو! تمہاری سہیلی یہاں آئی ہوئی تھی اور تم اسے اکیلا چھوڑ کے اوپر کام میں مصروف تھیں؟''

''اسے ہی جلدی ہو رہی ہے۔ میں نے تو کہا تھا کہ چند منٹوں میں کام نمٹا کے آجاؤں گی۔''

زینو نے کہا تو گل نور بولی۔ ''کوئی بات نہیں، میں پھر آجاؤں گی۔ مجھے بھی گھر کا ایک کام یاد آگیا ہے۔'' اس نے جیسے بہانہ بنایا اور دروازے سے باہر نکل گئی۔

''بھائی جان! آپ منہ ہاتھ دھولیں، گل نور گشتابہ (ایک کشمیری ڈش) لائی تھی، یہ گل نور بہت مزیدار گشتابہ بناتی ہے۔'' گل نور کے جانے کے بعد زینو نے بھائی سے کہا۔

وہ جانتی تھی کہ اس کا بھائی شیر علی ''گشتابہ'' بہت شوق سے کھاتا تھا اور گل نور یہ خصوصی کشمیری ڈش بہت اچھی بناتی تھی۔ دیکھنے میں یہ کوفتے کی طرح کا بہت مزے دار سالن ہوتا ہے مگر اس کے بنانے کی ترکیب بالکل مختلف ہوتی ہے جو ٹماٹر کے مسالے کے علاوہ دہی میں بھی بنتا ہے اور عموماً یہاں شادی بیاہ کی تقاریب میں بنایا جاتا تھا۔

گل نور، زینو کی سہیلی تھی۔ دونوں میں گہری دوستی تھی۔ یہ عبدالرحمان کی یتیم بھتیجی تھی اور اس کی کفالت اسی نے لے رکھی تھی۔ گل نور کا باپ عبدالقیوم بھی ایک جری کشمیری مجاہد اور اپنے بھائی عبدالرحمان کا ایک سچا دستِ راست تھا۔ ان کا تعلق سدھن قبیلے سے تھا۔

سدھن قبیلہ کشمیر کا ایک خاص اور مجاہد قبیلہ جانا جاتا ہے۔ جن کی نس نس میں جاں نثاری اور وطن پرستی رچی ہے۔ اسی قبیلے نے سب سے پہلے انگریز اور ہندو ڈوگرا... مہاراجہ افواج سے ٹکر لی تھی اور مرہٹوں کے سامنے بھی سینہ سپر ہوئے تھے۔

شیر علی کو یہ ساری معلومات اپنے باپ محمد علی سے بھی حاصل ہوئی تھیں۔ اکثر وہ اس کے سوالوں کے جواب دیا کرتا تھا۔ جو بھی شیر علی اپنی آنکھوں سے اپنے اردگرد ہوتا دیکھا کرتا، وہ سب اپنے باپ سے بھی ضرور پوچھا کرتا تھا۔ باپ نے اسے اور بھی بہت سی باتیں بتائی تھیں کہ کشمیر کیوں اور کیسے وادی جنت سے وادی انگار بنا تھا۔ یہی نہیں یہاں کا تو اب بچہ بچہ ماضی کی تاریخ سے خوب اچھی طرح آگاہ ہو چکا تھا، بالکل اسی طرح جیسے کوئی اہم سبق ہو اور جس کا امتحان سر پہ ہو۔

جب گل نور کا باپ بھی زندہ تھا تو یہ دونوں بھائی یعنی گل نور کا باپ عبدالقیوم اور عبدالرحمان بچوں اور بالخصوص نوجوان طبقے کو اپنے بڑے سے مکان کے کشادہ صحن میں جمع کر کے یہ سب باتیں بتایا کرتے تھے۔ کچھ ان سے سوال بھی کر لیا کرتے تھے۔ سب سے زیادہ سوالات کرنے والا شیر علی ہی ہوتا تھا۔ اس کی جانکاری میں دلچسپی اور اشتیاق کو دیکھتے ہوئے دونوں راہنما بھی بغیر بیزاری یا اکتاہٹ کے شیر علی کو بڑی محبت سے وہ سارا کچھ بتاتے رہتے جو وہ ان سے پوچھتا تھا۔

شیر علی کی بچپن سے ہی سوالات پوچھنے کی عادت تھی وہ کہتے ہیں نا کہ جو سوال زیادہ کرتا ہے اس کے علم میں بھی اسی قدر اضافہ ہوتا ہے۔ شیر علی کے علم میں بھی بہت کچھ تھا، اتنا کچھ کہ اس نے وہ آج تک شاید اپنی درسی کتابوں میں بھی نہ پڑھا ہوگا۔ وادی کشمیر کے مقامات اور اس کے... حالات تاریخی حوالوں سے اس کی کلوبل حیثیت سب کچھ اسے ازبر تھا۔

اس کی اس قدر معلومات کو دیکھتے ہوئے اس کے چند قریبی دوست شیر علی کو گائڈ بننے کا مشورہ دیتے تھے جو سیاحوں سے بہت سے پیسے کما لیتے تھے۔

بہرطور...... زینو کی بات کا جواب دیے بغیر اس نے سب سے پہلے باوا جان کی خیریت پوچھی تو وہ کچھ مغموم سی ہوگئی اور اسی لہجے میں بولی۔

''بھیا! بادا جان کی طبیعت ویسی ہی ہے، پر اب انہیں کام پر نہیں جانا چاہیے، تم سمجھاؤ نا انہیں بھیا کہ وہ اب آرام کریں۔''

''میں کتنی ہی بار ان سے یہی کچھ کہہ چکا ہوں مگر میری بات کب مانتے ہیں وہ۔ خیر...... اماں کدھر ہیں؟ سب ٹھیک ہیں نا...؟'' شیر علی کے اس بے ربط سے سوال پر زینو خاصے غور سے اس کا چہرہ تکنے لگی، ذہین تو شروع سے ہی تھی۔ اس کے چہرے اور لہجے کی لڑکھڑاہٹ سے سمجھ گئی کہ آج بھائی کے ساتھ کوئی غیر معمولی واقعہ ہوا ہے۔ بولی۔

''بھیا! بتاتے کیوں نہیں آپ؟ آخر کیا ہوا ہے؟ آپ اتنی جلدی واپس گھر آگئے؟''

''ہاں!'' اس نے ہولے سے کہا اور پھر اسے دھیرے دھیرے ساری بات بتادی، جسے سن کر وہ بھی فکر مند بلکہ متوحش سی نظر آنے لگی اور پھر اسی لہجے میں بولی۔

''بھیا! کہیں ایسا تو نہیں کہ یہ بھارتی فوجی آ...... آپ کو گرفتار کرنے آجائیں؟ مجھے تو بڑا ڈر لگ رہا ہے بھیا!'' وہ بے چاری پریشان اور تشویش زدہ ہوگئی۔

شیر علی نے ازراہِ تشفی اس سے کہا۔
''تو فکر نہ کر بہنا! اللہ ہمارے ساتھ ہے۔''
''لیکن بھیا! آپ اب باہر بالکل مت نکلنا۔'' وہ متفکر ہو کے بولی۔
اس نے کوئی جواب نہ دیا اور سیدھا باوا جان کے کمرے کا رخ کیا۔ وہ جاگ گیا تھا، طبیعت ان کی ویسی ہی تھی یعنی کھانسی بخار تھا۔ بیٹے شیر علی کو دیکھ کر وہ کھانستے ہوئے بولا۔
''ارے۔ تو آج جلدی آ گیا؟ کیا کوئی ہڑتال یا ہنگامہ تو نہیں ہو گیا؟''
یہاں کے حالات ہی کچھ ایسے رہتے تھے کہ وہ کسی سے کوئی بات نہیں چھپا سکتے تھے، لہٰذا شیر علی نے انہیں بھی ساری بات سچ سچ بتا دی۔ محمد علی کے چہرے پر تفکر و تشویش کی ایک گہری لکیر سی ٹھہر گئی۔
اثنائے راہ شیر علی کی ماں بھی وہاں آ گئی، اس کے ہمراہ زینو بھی تھی۔ یہ ساری باتیں سن کر وہ بھی خوف زدہ اور فکر مند ہو گئی۔ زینو تو پہلے سے ہی پریشان تھی۔
''تمہیں کتنی بار سمجھایا ہے کہ ان بھارتیوں کے منہ نہ لگا کرو پیسوں کا تقاضا ان سے تم نے کیوں کیا؟'' باپ نے کہا تو وہ بولا۔
''وہ بدمعاشی کر رہے تھے، چوری اور سینہ زوری بھی مگر یہ تو کوئی بات نہ ہوئی کہ وہ ہم سے سودا خرید رہے ہیں مگر پیسے نہیں دے رہے...... کیا ان کے باپ کا مال ہے۔''
محمد علی بیٹے کی بات سن کر چارپائی سے اٹھنے لگا......
''آپ کہاں چل دیے؟'' بیوی عائشہ خاتون نے پریشان ہو کر ان سے پوچھا تو وہ بولے۔
''مجھے عبدالرحمان سے بات کرنا ہو گی اس سلسلے میں ...... یہ بہت برا ہوا ہے۔'' وہ چارپائی سے اٹھنے کی کوشش میں بیماری اور کمزوری کے باعث لڑکھڑا سے گئے۔ شیر علی نے فوراً آگے بڑھ کر انہیں سہارا دیا اور بولا۔
''آپ کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے، کیسے جائیں گے آپ وہاں؟ اور میرا خیال ہے اس کی ضرورت بھی نہیں ہے، اب تک انہیں بھی حالات کا علم ہو چکا ہو گا۔''
ابھی اس نے اتنا ہی کہا تھا کہ دروازے پر دستک ہوئی۔ ان سب کے دل دھک سے رہ گئے۔ یہاں ہر گھر میں کچھ ایسی ہی ڈر و خوف کی فضا طاری رہتی تھی۔
''میں دیکھتا ہوں۔'' یہ کہہ کر شیر علی دروازے کی طرف بڑھا تو ماں عائشہ خاتون نے اسے روک لیا۔
''تو نہ جا بیٹا! میں جا کر دیکھتی ہوں۔''
''شیرے بیٹا! تو جلدی سے چھت پر چلا جا۔ کہیں وہ تجھے گرفتار کرنے نہ آئے ہوں؟'' باپ بھی پریشانی سے بولا۔ اسی وقت باہر سے کسی نے بہ آوازِ بلند پکارا۔
''محمد علی! دروازہ کھول، خان صاحب آئے ہیں۔''
اس شناسا سا آواز پر ان سب نے نہ صرف سکون کی سانس لی بلکہ خوش بھی ہو گئے کہ عبدالرحمان صاحب خود ہی تشریف لے آئے تھے۔
''جا شیرے! دوڑ کے دروازہ کھول۔'' محمد علی نے فوراً بیٹے سے کہا تو وہ دروازے کی طرف لپکا۔
باہر سے جس شخص نے آواز دے کر عبدالرحمان کی آمد کی اطلاع دی تھی وہ ان کا ملازم راجا تھا۔
کمرے سے نکل کر وہ جلدی سے صحن میں آیا اور لپک کر دروازہ کھول دیا۔ سامنے ہی شیر علی کو ایک باریش شخص دکھائی دیے۔ دراز قد، چوڑے کاندھے، چہرے پہ مشت بھر داڑھی، آنکھوں سے مترشح تیز چمک انہیں ایک پرجوش انسان ظاہر کرتی تھی، عمر پینتالیس، پچاس کے درمیان ہو گی۔ انہوں نے سفید اور ہلکے کریم کلر کا لمبا کرتہ اور شلوار زیب تن کر رکھی تھی۔ وہ کیا، انہیں ایک حریت پسند راہنما عبدالرحمان کے حوالے سے پورا سری نگر جانتا تھا...... گل نور ان کی ہی بھتیجی تھی، جو انہی کے ساتھ رہتی تھی۔ ان کے ہمراہ کچھ اور لوگ بھی موجود تھے۔ کوئی چھ، سات کے قریب ہوں گے۔ شیر علی جانے کیوں تھوڑا گھبرا گیا تھا اور اندر سے ڈر بھی رہا تھا کہ یہ سب لوگ اسے بری طرح لعن طعن کریں گے کہ خوامخواہ ایک معمولی سی بات پر بھارتی درندوں سے الجھ پڑا تھا اور جس کے نتیجے میں جانے کتنے بے گناہ کشمیری ہلاک و زخمی ہوئے تھے۔
شیر علی نے انہیں دیکھتے ہی نہایت احترام و عقیدت سے سلام کیا۔ انہوں نے مسکرا کر اس کی طرف دیکھتے ہوئے سلام کا جواب دیا اور نہایت شفیق لہجے میں پوچھا۔
''محمد علی گھر پر ہے؟''
''جی ہاں جناب! لیکن ان کی طبیعت خراب ہے، نمونیا ہو گیا ہے۔ علاج چل رہا ہے۔ آ...... آپ لوگ اندر تشریف لے آئیں، میں بیٹھک کھولے دیتا ہوں۔'' ان کی مسکراہٹ نے شیر علی کو کچھ حوصلہ دیا تھا۔
''ہوں...... ہمارا ان سے ملنا ضروری ہے اور تم سے بھی برخوردار!''

ان کے لہجے کی معنی خیزی کو محسوس کر کے جانے کیوں وہ خود بھی تھوڑا سا گھبرا گیا تھا۔ تاہم اس نے فوراً اثبات میں اپنا سر ہلایا اور جلدی سے اندر جا کر سب کو ان کی آمد کا بتایا اور ساتھ والی بیٹھک کھول دی جس کا ایک دروازہ باہر بھی کھلتا تھا۔ وہ سب اندر آ گئے۔

وہ اپنے بیمار باپ کو بھی میں بعد میں سہارا دے کر اپنے ساتھ لے آیا تھا، اسے اب بھی کھانسی ہو رہی تھی۔ تاہم وہ بات کرنے کے قابل تھے۔ عبدالرحمان نے پہلے محمد علی کی خیریت دریافت کی پھر ایک نگاہ اس کے چہرے پر ڈالتے ہوئے اس سے بولے۔

''بھائی محمد علی! تمہیں اب تک اپنے بیٹے شیر علی کے ذریعے سری نگر کے آج والے حالات کا تو علم ہو ہی چکا ہوگا۔ میں اسی سلسلے میں... تم سے بات کرنے آیا تھا۔''

وہ ہمیشہ اس کا پورا نام لیتے تھے...... یعنی شیر علی۔

ان کی بات سن کر محمد علی پریشانی سے بولا۔ ''جی...... جی...... مجھے شیرو نے بتایا تھا مگر غلطی اس کی نہیں تھی وہ......'' محمد علی اپنے روایتی خوف کا اظہار کرنے لگا تو عبدالرحمان نے گمبھیر لہجے میں اس کی بات کاٹ کر کہا۔

''نہیں محمد علی! غلطی کی بات چھوڑو، مجھے بھی حالات کا علم ہو چکا ہے۔'' پھر وہ شیر علی کی طرف دیکھ کر عجیب سے انداز میں مسکرا کر بولے۔

''شیر علی نے جو کیا بالکل ٹھیک کیا...... ہم نے اسی وقت پریس کلب کے سامنے جا کر بھارتی فوجیوں کے اس ظلم وستم پر اپنا احتجاج ریکارڈ کرنے کا ارادہ کیا ہے۔ تم سے اجازت لینے آئے تھے، شیر علی کو ہم اپنے ساتھ لے جانا... چاہتے ہیں۔''

ان کی بات سن کر ایکا ایکی شیر علی کو اپنے اندر ایک جوش کی سی کیفیت محسوس ہونے لگی۔ یہ پہلا موقع تھا کہ وہ ان کشمیری حریت پسندوں کے ساتھ ہوتا، جو اس کی ایک ازلی خواہش بھی تھی مگر محمد علی، عبدالرحمان کی بات سن کر یکدم پریشان ہو گیا۔ ان کی شخصیت بھی ایسی تھی وہ انکار بھی نہیں کر سکتا تھا، تاہم خاصے جھجکتے ہوئے ان سے بولا۔

''لل...... لیکن محترم! شہر کے حالات تو خراب ہو رہے ہیں، یہ بھی بڑی مشکلوں سے گھر پہنچا ہے۔'' اس کا اشارہ اپنے بیٹے کی طرف تھا...... ''پھر آپ بھی ساتھ ہوں گے تو...... آپ کے لیے بھی یہ مناسب نہ ہوگا، اس میں آپ کو بھی خطرہ ہوگا۔''

''ہم کیا، اس وقت تو پوری وادی خطرے سے دوچار ہے محمد علی! جب تک ان غاصبوں کے ناپاک قدم ہماری دھرتی پر ہیں، ہم سب ہی خطرے سے دوچار رہیں گے۔ ہماری حق خودمختاری، ہماری آزادی ان غاصب بھارتیوں نے سلب کر لی ہے اگر تم ان حالات میں خود کو پھر بھی محفوظ سمجھتے ہو تو یہ تمہاری ایک خطرناک خوش فہمی ہی ہوگی اور بھول بھی۔''

پھر وہ شیر علی کی طرف متوجہ ہو کر ایک دبدبے سے مستفسر ہوئے۔

''جوان شیر علی! کشمیر بنے گا پاکستان کا نعرہ تم نے ہی لگایا تھا نا؟''

''جی ہاں محترم! مجھے ان بھارتی غاصبوں کی چوری اور سینہ زوری پر ایک جوش سا آ گیا تھا۔'' اس نے بلا تامل ان کے سوال کا جواب دیا اور آگے بولا۔

''محترمی! میں آپ کا پڑھایا ہوا وہ سبق بھلا کیسے بھول سکتا ہوں اور وہ تقریریں بھی جو آپ نے تو ہاٹا چوک پر کیں اور میں نے سنیں۔ میں جب بھی ان بھارتی درندوں کے ناپاک وجود کو اپنی دھرتی کے سینے پر اکڑ کے چلتا ہوا دیکھتا ہوں تو پتا نہیں کیوں میری آنکھوں میں خون اترنے لگتا ہے اور جب انہیں ناانصافی کرتے ہوئے پاتا ہوں تو پھر میں آپے میں نہیں رہتا۔ آج بھی کچھ ایسا ہی ہوا اور میں خود پہ قابو نہ پا سکا۔ میں ان غاصب ہندو بھارتی فوجیوں کو بتا دینا چاہتا تھا کہ ہم سوئے ہوئے نہیں، نہ ہی خواب غفلت میں پڑے ہوئے ہیں، آزادی کی شمع جو شہداء اپنے لہو سے ہمارے دل و دماغ میں روشن کر چکے ہیں وہ ماند نہیں پڑی ہے اور نہ پڑے گی لیکن محترمی! مجھے اس بات کا بھی افسوس ہے کہ محض ایک چھوٹی سی بات پر ان بھارتی درندوں نے کتنے ہی نہتے اور غریب مظلوم کشمیری بھائیوں کو فائرنگ کر کے شہید کر ڈالا۔ بس! جو سچ تھا وہ میں نے آپ سے کہہ دیا۔'' وہ اتنا کہہ کر خاموش ہو گیا۔

بیٹھک میں ایکا ایکی خاموشی چھا گئی۔ شیر علی کا باپ محمد علی اندر سے ڈرا ہوا تھا کہ اس کے بیٹے نے من وعن اپنا ''جرم'' قبول کر لیا تھا، جس کے نتیجے میں نہ جانے کتنے بے گناہ غریب ہانجی کشمیری بھارتی درندوں کے ہاتھوں مارے گئے تھے۔ وہ سمجھ رہا تھا کہ اس کے بیٹے کی کیا حیثیت تھی؟ وہ کوئی لڑاکا یا تربیت یافتہ مجاہد نہ تھا، نہ ہی حریت راہنما عبدالرحمان سدھن کا کوئی ساتھی کمانڈو۔ آخر اس دبلے پتلے کمزور سے نظر آنے والے اس کے بیٹے کو کیونکر معاف کیا جا سکتا تھا، جو ایک غریب سبزی فروش کا بیٹا تھا مگر

دوسرے ہی لمحے محمد علی کا یہ خیال اور خوف باطل ثابت ہوا جب اس نے عبدالرحمان کو ایک جوش اور جذبے کے ساتھ یک دم کھڑے ہوتے اور شیر علی کو دونوں کاندھوں سے تھام کر اپنے سینے سے لگاتے دیکھا۔

''اللہ اکبر۔ شاباش نوجوان ہم یہی جذبہ یہاں ہر نوجوان کے سینے میں دل کی جگہ پر دھڑکتا ہوا دیکھنا چاہتے ہیں، جو ہم آج تمہاری صورت میں دیکھ رہے ہیں۔ ہمیں تم پر فخر ہے۔'' اس کے بعد وہ شیر علی کے باپ کی طرف متوجہ ہوا جو ابھی تک آنکھیں پھاڑے ہوئے کبھی عبدالرحمان کی طرف دیکھتا تو کبھی اپنے بیٹے کو......

''محمد علی! تم ایک خوش قسمت باپ ہو، جس کے گھر میں اس جیسے شیر نے جنم لیا ہے۔ اسے صرف اپنا ہی فرزند نہیں بلکہ آج سے فرزند کشمیر بھی سمجھو۔ کیا تمہاری اجازت ہے کہ اسے ہم پریس کلب لے جائیں؟'' راہنما عبدالرحمان کو بھلا وہ کیا انکار کرتا۔ اس نے اثبات میں اپنا سر ہلا دیا۔

تھوڑی دیر بعد ہی شیر علی، ان کے اس مختصر قافلے کے ساتھ روانہ ہو رہا تھا۔ پیدل چلتے ہوئے اور پریس کلب تک پہنچتے پہنچتے عبدالرحمان کا یہ مختصر کارواں ایک بڑے ہجوم میں تبدیل ہو چکا تھا۔

اس واقعے کے بعد سری نگر ایک دم ویران ہو چکا تھا مگر یہ قافلہ بہ دستور آگے بڑھتا رہا یہاں تک کہ پریس کلب پہنچ کر جیسے پورا سری نگر وہاں اُمڈ آیا۔ مختلف راہنماؤں کی بڑی جوش بھری اور دھواں دھار تقاریر ہوئیں۔ بھارتی فوجیوں کے خلاف نعرہ بازی اور ''کشمیر بنے گا پاکستان'' کا نعرۂ مستانہ بھی بلند کیا گیا۔ یہاں تک کے مجمع میں پاکستانی جھنڈا بھی لہرا دیا گیا۔

نامہ نگاروں اور وقائع نویسوں کو اپنا پرامن احتجاج ریکارڈ کرانے اور بھارتی فوجیوں کی آج والی انسانیت سوز کارروائی میں ان کا بھیانک چہرہ دنیائے صحافت کو دکھانے کے بعد یہ لوگ جس وقت واپس لوٹ رہے تھے تو امیراں کدل پل کے دائیں جانب تقریباً دو کلومیٹر کے فاصلے پر واقع ایک پرانے قلعے ''موتی بھون'' کی کھنڈر نما عمارت میں بھارتی فوجی کرنل ستیا رام ڈوڈیجا کا ایک مخبر جسونت تیواری اسے آج والے واقعے کی مفصل رپورٹ دے رہا تھا۔ وہ فوجی اسی کی رجمنٹ سے تعلق رکھتے تھے جنہوں نے کشمیری سبزی فروشوں پر سیدھی فائرنگ کی تھی اور شیر علی سے اُلجھے تھے۔

بھارتی حکومت نے کرنل ستیا رام ڈوڈیجا کا خاص طور پر انتخاب کیا تھا۔ پینتالیس پچاس کے پیٹے میں نظر آنے والا، خاکستری رنگت کا یہ دراز قامت کرنل ستیا رام کشمیریوں، بالخصوص پاکستان کے لیے بڑے کٹر اور... مخاصمانہ جذبات رکھتا تھا، اسے بھارت کی دو بڑی متعصب تنظیموں کی بڑی حمایت حاصل تھی۔ ماضی میں یہ ''را'' کا ایجنٹ بھی رہ چکا تھا۔ بعد میں اس نے بھارتی فوج میں شمولیت اختیار کر لی تھی۔ اسے خصوصی طور پر سری نگر میں حریت پسندوں کی ایک عرصے سے جاری آزادی کی لہر کو... بہ جبر استبداد، کچلنے کے لیے بھیجا گیا تھا۔ اس نے آتے ہی سب سے پہلے اپنی رجمنٹ کو یہ حکم نامہ جاری کر دیا تھا کہ حریت پسند پارٹیوں کی ہر اس کارروائی کے جواب میں جو ان کے فوجیوں کے جانی و مالی نقصان کا سبب بنے، عام کشمیریوں کو بے دریغ بربریت کا نشانہ بنایا جائے نہ صرف یہ بلکہ ان کی عزت نفس مجروح کرنے کے ساتھ ساتھ انہیں ذہنی اذیتوں سے بھی دوچار کیا جائے۔ اس کے لیے اس نے اپنا چانکیہ پلان ترتیب دے رکھا تھا جس کے تحت اس نے اپنی رجمنٹ لی ایک کمپنی کی کمانڈ کیپٹن بھگوت کھنپال کو سونپ رکھی تھی، جو ایک ٹھگنے قد اور موٹے کالے خنزیر جیسی جسامت کا آدمی تھا۔ شکل بھی اس کی کافی حد تک اسی نجس جانور سے ملتی جلتی تھی۔ آنکھیں بھی چندھی چندھی سی تھیں جن میں ہر وقت ایک ازلی بھوک اور گرسنہ چمک ہلکورے لیتی رہتی تھی۔

کرنل ستیا رام کے ناپاک پلان کے تحت کیپٹن بھگوت کھنپال کو اس کی فطرت کے مطابق یہ ذمے داری سونپی گئی تھی کہ وہ کشمیری خواتین اور نوجوان لڑکیوں کی عصمت دری میں کوئی تامل نہ کرے۔ حتیٰ کہ عام لوگ ان کی اس ننگ بربریت تلے اس قدر تنگ اور مجبور ہو جائیں کہ وہ اپنے ہی حریت پسندوں کے خلاف اٹھ کھڑے ہوں اور اس طرح بعض چھپے ہوئے خطرناک کشمیری مجاہد ٹولوں کی پوری معلومات بھی ان تک بہم پہنچا ئیں۔ کسی حد تک یہ ناپاک چانکیہ پلان کامیاب بھی ہوا تھا مگر اس کے ابھی تک وہ نتائج برآمد نہ ہو سکے تھے جس کی کرنل ستیا رام توقع کیے بیٹھا تھا بلکہ الٹا پوری دنیا میں بھارت خود اپنے ہاتھوں سے اپنے گلے میں بدنامی کا منگل سوتر پہنا رہا تھا۔

آج کل ان کا ٹارگٹ کشمیری راہنما عبدالرحمان اور اس کا گھرانا تھا۔ مخبر جسونت تیواری، کرنل ستیا رام کو جب آج کی رپورٹ دے رہا تھا تو اس کے ہمراہ کیپٹن بھگوت

کھنپال بھی کھڑا بہ غور یہ سب سن رہا تھا۔
"ہوں..... تو یہ ساری بھگدڑ اسی ہاتھ بھر کے لونڈے کی پھیلائی ہوئی ہے۔ کیا نام بتایا اس کا؟"
زبانی کلامی رپورٹ سننے کے بعد کرنل ستیا رام ایک گمبھیر سی ہنکاری حلق سے خارج کرتے ہوئے بولا اور آخر میں سوالیہ نظروں سے مخبر جسونت تیواری کو دیکھنے لگا تو وہ ترنت بولا۔
"مہاشے جی! اس لونڈے کا نام تو شیر علی ہے پرنتو، کہیں سے بھی شیروں والی کھوسیت نہیں دکھائی پڑتی ہے مجھے اس میں، ایک دم تیلا ہے، یوں پھونک ماروں تو یہ جاوہ جا۔"
"ابے تیلا ہے، پر کام تو اس نے جیوٹ بازوں جیسا پھر تیلا کیا ہے۔ دشمن کو کمزور سمجھنا اپنی کمزوری ہے ہم لوگوں کے یہاں۔"
کرنل ستیا رام کے بازو کے پاس کھڑے کیپٹن بھگوت کھنپال نے مخبر جسونت کو گھورتے ہوئے کہا تو اس افسر ستیا رام نے بھی اپنے سر کو تائیدی انداز میں اثبات میں جنبش دی اور مخبر جسونت سے بولا۔
"اس لونڈے (شیر علی) کی اس حرکت کے بعد اس کے اپنے لوگوں کا اس کے خلاف کیا ردعمل تھا؟ تم نے کیا دیکھا؟"
مہاشے جی! ہونا تو یہی چاہیے تھا کہ اس لونڈے کو ہی کشمیری ہانجی سبزی فروشوں کے خون کا قصوروار ٹھہرایا جاتا مگر جانے کیا بات ہے۔ جی کہ اسے تو ان سب نے ہیرو بنا کر اپنے کاندھے پر اٹھا لیا ہے۔ اور تو اور عبدالرحمان سدھن نے تو لمڈے کی پیٹھ بھی ٹھونک بجا دی ہے۔ لگتا یہی ہے کہ وہ اسے کام میں لانے کا ارادہ رکھتے ہیں، انہیں ایسے جوشیلے نوجوانوں کی تلاش رہتی ہے۔"
"ہوں..... لگتا ہے اب عبدالرحمان کا بندوبست بھی کرنا پڑے گا۔" کرنل ستیا رام دانت پیسنے کے انداز میں خود کلامیہ بڑبڑایا پھر مخبر کی طرف سوالیہ نظروں سے دیکھا۔
"اور کچھ؟"
"اب تک تو اتنا ہی ہے مہاشے جی! آگے جو آپ کا حکم ہو سو۔" مخبر جسونت تیواری نے فدویانہ انداز میں اپنے دونوں ہاتھ جوڑ دیے۔ تو کرنل ستیا رام تحکمانہ بولا۔
"شیر علی سمیت اس بڈھے عبدالرحمان سدھن پر بھی کڑی نگاہ رکھو اور ان کی پل پل کی خبر ہمیں پہنچاتے رہو۔ اس کے علاوہ اس کا شجرۂ نسب اور اٹھک بیٹھک، کن لوگوں سے ملتا جلتا ہے وغیرہ، وہ سب..... سمجھ گئے؟"
"سمجھ گیا مہاشے جی! اچھی طرح سمجھ گیا۔" تیس پینتیس سالہ منحنی سے سیاہ رنگت والے مخبر جسونت نے اثبات میں سر ہلا دیا۔ اسے جانے کا اشارہ کرنے کے بعد کرنل ستیا رام، کیپٹن بھگوت کھنپال کی طرف متوجہ ہوا اور بھاری لہجے میں بولا۔
"کھنپال! سمجھ رہے ہو نا تم ......! یہ عبدالرحمان کیا گل کھلاتا پھر رہا ہے؟ یہ سب تمہاری وجہ سے ہے، بہت ڈھیل جو دے رکھی ہے تم نے اس بڈھے کو۔"
کیپٹن بھگوت کھنپال اپنے افسر کی بات سن کر زہریلی مسکراہٹ سے بولا۔ "سر! عبدالرحمان تو خود میری آنکھوں میں ایک عرصے سے کانٹے کی طرح کھٹک رہا ہے۔ اس نے بڑی چالاکی سے اپنے آتنگ وادیوں کا ایک گروہ بنا کر انہیں زیر زمین کر رکھا ہے اور بہ ظاہر خود کو ایک پرامن شہری کی حیثیت سے عام لوگوں میں گھلا ملا رکھتا ہے۔ عنقریب وہ لمڈا شیر علی بھی اسی کے خفیہ گروپ کا ایک رکن بننے والا ہے۔"
کرنل ستیا رام نے بڑی توجہ سے اس کی بات سنی تھی، پھر بولا۔ "تم کیا اس پر ہی جان اور وقت کھپاتے رہو گے، جبکہ میں... وادی میں آزادی کی جولہر اور ان کے پاکستان سے الحاق کی خواہش کا منظر اگست 1947ء سے ابھرتے دیکھ رہا ہوں، وہ ابھی تک ویسے ہی جوبن پر نظر آرہی ہے، بلکہ وقت کے ساتھ ساتھ اس میں اضافہ ہی ہو رہا ہے۔"
کرنل ستیا رام کی اس بات کا کیپٹن بھگوت کھنپال کے پاس کوئی جواب نہ تھا۔ اس کا سر جھکا ہوا تھا۔

☆☆☆

(پس منظر)

برصغیر کی تقسیم کا بنیادی نکتہ یہ تھا کہ مسلم اکثریتی علاقے پاکستان اور غیر مسلم اکثریتی علاقے ہندوستان کے نام سے دو خود مختار ریاستوں کی شکل میں وجود پذیر ہوں گے۔
ریاست جموں و کشمیر کے حوالے سے، ریاست میں مسلم اکثریت کا تناسب 78 فیصد تھا جبکہ وادی (کشمیر) میں مسلم اکثریت کا تناسب 93 فیصد تھا۔ ریاست کا ہندوستان سے سڑک اور ریل کا رابطہ پاکستان کے راستے قائم تھا۔ سڑک راولپنڈی سے اور جبکہ ریل سیالکوٹ کے راستے کشمیر سے منسلک تھی۔ ڈاک اور ٹیلی گراف رابطے بھی پاکستان کے ذریعے منسلک تھے۔ تمام اشیائے ضرورت صرف پاکستان کے راستے کشمیر تک پہنچتی تھیں۔
تاریخی اعتبار سے 14 ویں صدی سے 19 ویں صدی کے آغاز تک کشمیر پر مسلمانوں کی حکومت رہی۔

1819ء میں پنجاب کے حاکم رنجیت سنگھ نے یہ علاقہ افغانوں سے چھین لیا۔ بعد میں اس نے ایک ڈوگرا راجپوت گلاب سنگھ کو جموں کا علاقہ سونپ دیا۔ گلاب سنگھ نے اپنے اقتدار کو کشمیر کے دیگر علاقوں تک وسعت دی، جبکہ وادی اس کے زیر انتظام نہیں تھی۔ 1846ء میں وادی اپنے مکینوں سمیت انگریز حکومت نے ساڑھے سات لاکھ روپے کے عوض گلاب سنگھ کو بیچ دی۔

☆☆☆

جموں شہر میں مسلمانوں کی آبادی کسی ایک جگہ اکٹھی نہیں تھی بلکہ تھوڑے تھوڑے مسلمان شہر کے تقریباً ہر حصے میں آباد تھے۔ ڈوگرا مہاراجاؤں کا خیال تھا کہ ان روح فرسا اور سنگدلانہ واقعات کے بعد پونچھ کا کوئی سرداران سے ٹکر نہیں لے گا، نہ سر اٹھائے گا۔ لیکن نصف صدی کے بعد بھی ''کھڑک'' کے جری و بہادر لیڈر سردار بہادر علی خان نے 1898ء میں تحریک حقوق ملکیت کا آغاز کیا تو دور ونزدیک کے عوام وخواص اور بااثر سرداروں نے ان کی آواز پر لبیک کہتے ہوئے ان کا بھرپور ساتھ دیا مگر ڈوگرا حکمران نے سازش کے ذریعے انہیں زہر دے کر شہید کر دیا لیکن اہل... پونچھ کو لاہور ہائی کورٹ کے فیصلے میں اراضیات کے مالکانہ حقوق مل گئے۔

کشمیر کا مہاراجا ہری سنگھ 23 مارچ 1947ء کو بابائے پونچھ کرنل خان صاحب کی دعوت پر راولاکوٹ کے دورے پر آیا تو تیس ہزار سے زائد سابق فوجیوں (برطانوی فوج سے ریٹائرڈ شدہ) نے اسے سلامی دی تھی۔ مقصد شاید ڈوگرا کو اپنی عسکری طاقت دکھانا تھا تاکہ وہ جموں کے مسلمانوں کو کمزور نہ سمجھے تاہم راولاکوٹ میں تجربہ کار تربیت یافتہ فوجیوں کی اتنی بڑی تعداد دیکھ کر... مہاراجا ہری سنگھ حواس باختہ ہو گیا اور رات کے اندھیرے میں نکل کر وہاں سے واپس چلا گیا۔ اس نے پونچھ میں ڈوگرا فوج کی تعداد دوگنا کر کے انہیں جدید اسلحہ فراہم کیا مختلف علاقوں میں پختہ فوجی مورچے اور پکٹ تعمیر کرائے اور فوجی چھاؤنیوں میں اضافہ کیا۔ اس کے بعد ڈوگرا فوج نے عوام کا جینا محال کر دیا اور ہر طرف لوٹ مار شروع کر دی۔ عوام کو ہراساں اور خوف زدہ کرنے کے حربے آزمائے۔ اس صورت حال نے برطانوی فوج سے ریٹائرڈ کیپٹن حسین کو ڈوگروں کے خلاف جہاد کرنے پر مجبور کیا۔ انہوں نے بابائے پونچھ کو قائل کیا کہ ڈوگروں کے خلاف بندوق اٹھائے بغیر کوئی چارہ نہیں، اس پر مشاورت کے بعد جہاد کونسل قائم کی گئی جس کے چیئرمین بابائے پونچھ مقرر ہوئے.. تاکہ مجاہدین کو باقاعدہ تربیت دے کر جہاد کے لیے منظم کیا جائے۔ اس وقت پونچھ میں سابق اور موجودہ فوجیوں کی تعداد چالیس ہزار کے لگ بھگ تھی۔

انہی دنوں جہاد کونسل کے سپہ سالار کیپٹن حسین خان کو گردیزی سادات کے جرگے نے خط کے ذریعے مطلع کیا کہ ڈوگرا مہاراجا نے باغ میں اپنی فوجیں بھیجنے کا سلسلہ شروع کر دیا ہے لہٰذا انہیں باغ پہنچنے سے روکا جائے۔ بہ صورت دیگر اگر یہ ڈوگرا فوج باغ میں داخل ہو گئی تو...... ایک مرتبہ پھر 1832ء (مہاراجا گلاب سنگھ کا دور) کی تاریخ دہرائی جائے گی۔ قتل عام ہوگا، خواتین کی بے حرمتی کی جائے گی اور ایک مرتبہ پھر ہمارا اکشص برباد ہوگا۔

جہاد کونسل کے سپہ سالار کیپٹن حسین خان نے یہ خط پڑھتے ہی اپنے مجاہدین کو یہ ہدایت کی کہ ڈوگرا فوج کو روکیں۔ 29 اگست 1947ء کو یہ فوجی دستے اپنے سالار مجاہد کی آواز پر لبیک کہتے ہوئے، جذبۂ ایمانی سے سرشار اور اپنے اسلاف کے ناموس اور حفاظت کے لیے دوتھان اور راولاکوٹ کے مقام پر پہاڑیوں کے دامن میں ڈوگرا فوجی دستوں کے آگے سیسہ پلائی دیوار بن کے گھات لگا کر بیٹھ گئے۔ اس مجاہد دستے کی قیادت مسلم نیشنل گارڈ کے کمانڈر کیپٹن محمد اشرف خان کر رہے تھے۔ ان میں سدھن قبیلے کے مجاہدین اپنے کمانڈر عبداللہ کے دونوں بیٹوں، عبدالقیوم اور عبدالرحمان بھی اپنے تین جاں بازوں، شرجیل خان غفار اور محمود سمیت شامل تھے۔ ان کے باقی ساتھیوں کی تعداد تیس کے قریب تھی......

رات اپنے جوبن پر تھی اور دوتھان کا یہ تاریخ ساز معرکہ اپنی پہلی چلنے والی گولی کا منتظر تھا، جو مستقبل میں جہاد کشمیر کی بھی بنیاد بننے والا تھا۔

یہ تاریک اور اندھیری رات کسی وقت بھی لال انگار بننے والی تھی۔ ماحول پر سکتہ طاری تھا اور فضا جامد تھی۔

اسی وقت کیپٹن اشرف خان کو سامنے پہاڑیوں سے اپنے ایک ساتھی ٹولے کا مخصوص اشارہ ملا اور پھر جیسے ہی ڈوگرا فوجی دستہ پہاڑیوں کی سنگلاخ آڑ سے نمودار ہوا، سرفروشوں کا یہ دستہ ان پر قہر خداوندی بن کر ٹوٹ پڑا، بڑا گھمسان کا رن پڑا۔ ڈوگرا فوج کا کمانڈر مہندر جنگ سنگھ، جو مہاراجا ہری سنگھ کا قریبی رشتے دار بھی تھا، مجاہدوں کے اس حملے پر بوکھلا گیا، اگرچہ اسے پہلے ہی پونچھ کے ان مجاہدوں کی عسکری طاقت کا اندازہ تھا لیکن اتنا نہیں تھا کہ وہ

ان کی دُگنی فوجی طاقت سے یوں ٹکرلیں گے۔
لیکن شاید مہندر جنگ سنگھ نہیں جانتا تھا کہ یہ مجاہدین قوتِ تعداد سے زیادہ اپنی ایمانی طاقت اور دلوں میں دھڑکتے کوہ شکن ارادوں اور سر بہ فلک جذبہ جہاد جیسے حوصلوں پر یقینِ کامل رکھتے تھے۔ یہ وہ مسلمان تھے جو تھوڑی تعداد میں بھی ہونے کے باوجود اپنے سے بڑی تعداد اور قوت رکھنے والے دشمنوں کے آگے اللہ کے نام پر سیسہ پلائی دیوار بن جاتے تھے۔
مجاہدین ان پر ٹوٹ پڑے۔ایک طرف سے کیپٹن اشرف خان اور دوسری جانب سے اپنے گروپ کا کمانڈر ......عبدالقیوم سدھن نے بھی ان پر حملہ کردیا۔اس معرکے میں کیپٹن اشرف کے چھ اور عبدالقیوم کے تین ساتھی بھی شہید ہوئے مگر ان شہیدوں کا خون رنگ لایا اور ڈوگرا فوجی دستے کے لیے باغ میں داخلہ ناممکن ہوگیا۔ وہ پیچھے دھکیلے گئے۔حتیٰ کہ اور ریاست بہ زورِ طاقت قبضہ جمانے کا خواب لیے شکست کھا کر اپنے مہاراجا کے حرم کا رخ کیا۔
مجاہدین جموں و پونچھ کی یہ پہلی دو بدو اور باقاعدہ جنگ تھی اور جس میں اللہ رب العزت نے انہیں فتح و کامرانی سے دوچار کیا تھا......لیکن اس فتح کے بعد مجاہدین کو بھی اس بات کا بہ خوبی اندازہ تھا کہ مہاراجا نچلا نہیں بیٹھے گا۔اسی لیے مجاہدین نے ڈوگرا فوج کی آئندہ کی نقل و حرکت اور... ناپاک منصوبوں پر نظر رکھنے کے لیے تربیت یافتہ مخبر ''عیالیوں'' (بھیڑ بکری چلانے والے) کو بھی تیار کیا اور انہیں پھیلا دیا۔
ان عیالیوں نے وقت اور حالات کی نزاکت کو دیکھتے ہوئے بہت جلد یہ اطلاع پہنچادی کہ...... تھورار اور منگ، راولاکوٹ، پلندری، تراڑکھل، ہجیرہ، باغ، دھیر کوٹ، میرپور، کوٹلی، بھمبر اور مظفرآباد میں مہاراجا نے پختہ مورچوں کی تعمیر کا کام تیزی سے شروع کردیا ہے اور پونچھ اور ریاست جموں پر بھرپور چڑھائی کے لیے بھارت سے بھی عسکری مدد حاصل کررہا ہے اور بھارت نے کشمیریوں کے خلاف اس مہاراجا کا ساتھ دینے کا وعدہ بھی کرلیا ہے۔
یہ صورت حال واقعی خطرناک تھی۔ جہاد کونسل اور نیشنل گارڈز کے کمانڈر کو اس پر تشویش ہونے لگی لیکن جب یہ خبر عبداللہ اور اس کے دونوں جری بیٹوں عبدالقیوم اور عبدالرحمان کو ملی تو انہوں نے اس صورت حال کا حل نکالنے کے لیے، ججرہ دوتھان میں پونچھ اور میرپور کے سرداروں کی نشست بلوائی۔

باہمی مشاورت کے بعد پاکستانی سرحدی قبائلی علاقوں کے غیور پٹھانوں سے بھی مدد لینے کا فیصلہ کیا گیا، کیونکہ سدھن قبیلہ سدھ زوئی کہلاتا تھا اور یہ لوگ پاکستانی سرحدی قبائلی علاقوں میں آباد تھے۔ان تک جب یہ پیغام پہنچا تو انہیں اس حقیقت کا پتا چلا کہ غیور قبائلی تو اشارے کے منتظر بیٹھے ہیں۔ وہ ان ہندو ڈوگرا فوجیوں کے خلاف بھرے بیٹھے تھے، لہٰذا کفار سے جہاد کے لیے انہوں نے بھی متحد ہو کر ان کی آواز پر لبیک کہہ دیا۔

☆☆☆

30 اگست 1947ء کی ایک چمکدار صبح میں سدھنوئی (راولاکوٹ) کے مقام پر سدھن قبیلے سمیت تمام کشمیری ڈوگرا مہاراجا ہری سنگھ (موجودہ مہاراجا) اور اس کی مسلح افواج سے ٹکر لینے اور علم بغاوت بلند کرنے کے لیے علاقہ باغ کی ایک اونچی پہاڑی ''نیلا بٹ'' میں اکٹھے ہو چکے تھے۔اس کی کمانڈ عبداللہ سدھن کے ہاتھ میں تھی جو نہ صرف اپنے قبیلے کا سردار بلکہ نیشنل گارڈز کا کمانڈر بھی تھا۔ سن رسیدہ ہونے کے باوجود اس کی مثال بوڑھے شیر جیسی تھی۔اسی نے پاکستان کے قیام کا اعلان سنتے ہی سب سے پہلے پاکستان کے حق میں کشمیر کے الحاق کا اعلان کیا تھا۔
اس وقت مجمعے میں وہ اکیلا نہ تھا، نہ ہی وہ ایسا راہنما تھا کہ دوسروں کو آگے کرتا اور اپنوں کو پیچھے۔اس وقت اس کے دونوں طرف اس کے دونوں بازو یعنی اس کے جواں سال بیٹے عبدالقیوم اور عبدالرحمان اس کے دائیں بائیں تنے کھڑے تھے۔ دونوں ہی گبرو اور خوبرو جوان تھے۔ تحریک آزادی کشمیر کے حق میں اور ڈوگرا ہندو مہاراجا کے خلاف یہ دونوں بھائی اپنے باپ کے شانہ بشانہ تھے۔
ایک اونچے منبر پر عمر رسیدہ مگر بوڑھے شیر کی مثل کشمیری حریت پسند راہنما عبداللہ سدھن ہندو ڈوگرا مہاراجا کے خلاف بڑی پرجوش تقریر میں مصروف تھا۔ یہ کوئی نئی بات نہ تھی، جب سے ان کی دھرتی کا چند ٹکوں کے عوض مہاراجا کے ہاتھوں سودا کیا گیا تھا، تب سے ہی وہ آزادی کے لیے انگریز سامراج، اس کے دست راست اور ہندو ڈوگرا مہاراجا گلاب سنگھ کے خلاف صف آرا ہو چکے تھے اور ان کے خلاف اپنی تحریک اور شمع آزادی کو اپنے لہو کے ایندھن سے روشن کررکھا تھا۔
راہنما عبداللہ کی کمانڈ میں نہ جانے کتنے ہی لوگ ان کے ساتھ آن ملے تھے اور ان کے ساتھ ہم آواز ہوگئے تھے۔
اس وقت بھی سدھنوئی اس اونچے منبر پر اپنے دونوں

شیر جوان بیٹوں عبدالقیوم اور عبدالرحمان کے ساتھ کھڑا بہ آواز بلند مجمعے سے مخاطب تھا۔ اور اپنی شعلہ بیانی سے... پورے مجمعے کو اپنی گرفت میں لیے ہوئے تھا۔

''یہ ہندو ڈوگرا حکمراں خود کو کیا سمجھتے ہیں کہ وہ کلمہ پڑھنے والوں کو اپنے جبر و استبداد تلے کچل دیں گے؟ ہرگز نہیں، مجھے قسم ہے اس نعرہ ''آزادی کے تین نشان...... اللہ محمد ﷺ اور قرآن'' کی۔ ایسا کبھی نہیں ہوگا۔ بھلا جن کا مقدر اسلام سے وابستہ ہو، انہیں کون غلام بنا سکتا ہے؟ اس ڈوگرا شاہی کا اپنا ماضی انتہائی شرمناک ہے جب ان کے پہلے ہندو مہاراجا گلاب سنگھ نے 1806ء میں اپنی لعنتی زندگی کا آغاز بھمبر کے مسلمان راجا سلطان خان کے ہاں 2 روپے پگار (تنخواہ) کی ملازمت سے کیا تھا۔ راجا سلطان نے گلاب سنگھ کو اعزاز و اکرام سے نوازا مگر جب 16 مارچ 1846ء کو یہ محسن کش گلاب سنگھ انگریزوں کے ساتھ ساز باز کر کے ریاست جموں و کشمیر کے سیاہ و سفید کا مالک بنا تو یہ مسلمانوں کے لیے نہایت ہی ظالم اور سفاک شخص ثابت ہوا۔ اس نے ہم مسلمانوں پر طرح طرح کی معاشی پابندیاں اور سختیاں کر رکھی تھیں۔ ندی نالوں پر بہنے والے قدرتی پانی کے علاوہ ہوا سمیت ہر چیز پر ٹیکس لگا رکھا ہے۔ مذہبی پابندیاں تو ناقابلِ برداشت ہیں ہمارے لیے، مسجد میں اذان کی پابندی اور تالا بندی۔ جب مسلمانوں کے صبر کا پیمانہ لبریز ہوا تو ہمارے لیڈر کو میونسپل کمیٹی باغ جموں میں مجمع لگانے پر گرفتار کرلیا گیا۔ دو لاکھ سے زائد بے گناہ مسلمانوں کو گولیاں مار کر شہید کردیا گیا۔

''اب وقت آگیا ہے کہ ان غاصب اور سفاک تعصبی ہندو ڈوگرا شاہی (مہاراجا ہری سنگھ) اور اس کی فوج کے لیے ہم لوہے کا چنا ثابت ہوں۔ کیا تم میرے ساتھ ہم آواز ہو؟ کیا اس جہاد میں تم میرے ساتھ شریک ہو......؟ کیا تم مسلمانانِ جموں کے دھوکے اور بیدردی سے کیے گئے قتلِ عام کا بدلہ لینے کے لیے ڈوگرا شاہی سے بے جگری سے ٹکرانے کو تیار ہو......؟''

تقریر کے اختتام پر مجمعے میں بڑا غضب کا بم بخ ابھرا تھا اور ہر ایک کشمیری پونچھی، جموں اور میرپوری مسلمان کی زبان پر ایک ہی نعرہ تھا جو بعد میں ضرب المثال ثابت ہوا۔

''نعرۂ تکبیر...... اللہ اکبر۔''

''آزادی کے تین نشان...... اللہ، محمد ﷺ اور قرآن''...

پونچھ کی پہاڑیاں جہاد کشمیر کے نعروں سے دیر تک گونجتی رہیں۔ مجاہدین نے حق و باطل کی اس جنگ میں ڈوگرا شاہی کے خلاف لبیک کہتے ہوئے لڑنے کا پختہ عزم کیا اور ایک باوقار موت کا فیصلہ کرلیا تھا...... یعنی آزادی یا موت۔

☆☆☆

ان کشمیری حریت پسند سرفروشوں کی ایک عملی تربیت گاہ تھی، جہاں وہ پچھلے چند ماہ سے جنگی اور گوریلا تربیت... حاصل کر رہے تھے۔

وقت کی ضرورت کو محسوس کرتے ہوئے اور ڈوگرا فوجیوں کے بڑھتے ہوئے مظالم سے تنگ آکر بالآخر عبداللہ نے اپنے سدھن قبیلے سے ہی تعلق رکھنے والے سابق انڈین آرمی کے ملازمین کے ذریعے اپنے نیشنل گارڈز اور دیگر رضا کار مجاہدوں کو یہاں تربیت دینے کا سلسلہ شروع کردیا تھا۔ اس وقت تک نیشنل گارڈز عمل میں لائی جا چکی تھی مگر انہیں باقاعدہ جنگی یا گوریلا تربیت نہیں دی گئی تھی۔

خود عبداللہ سدھن بھی رائل آرمی میں ایک فوجی رہ چکا تھا۔ اس تربیت گاہ کو قائم کرنے میں اس کا بڑا ہاتھ تھا اور اسی نے اس تربیت گاہ کا نام ''حجرۂ دوتھان'' رکھا تھا۔

پہلے اس تربیت گاہ کی کمانڈ اسی کے حوالے تھی، جو بعد میں اس کے بڑے بیٹے عبدالقیوم سدھن کے سپرد کردی گئی تھی، وہی اب ان کا کمانڈر بھی تھا......

اسی تربیت گاہ (حجرۂ دوتھان) کی ایک کوٹھری میں وہ پانچ جری نوجوان موجود تھے، ان میں دو تو کشمیری راہنما عبداللہ کے بیٹے، عبدالقیوم اور عبدالرحمان تھے، جبکہ باقی ان کے مجاہد و سرفروش ساتھی، خان غفار، شرجیل اور محمود تھے۔

کچی دیواروں والی اس مستطیل عمارت کو مختلف جنگلی جھاڑیوں اور مصنوعی ٹیکریوں سے ''کیموفلاج'' کیا گیا تھا۔ یوں بھی بادی النظر میں یہ عمارت دور سے بھینسوں اور مویشیوں کا کوئی باڑا ہی دکھائی دیتی تھی۔ موٹی موٹی ریت کی بوریوں سے مورچے اور خندقیں بھی بنائی گئی تھیں، انہی میں چھپ کر وہ نشانے بازی اور دیگر تربیت حاصل کرتے تھے۔

ان مجاہدین کے پاس بیشتر اسلحہ ڈوگرا فوجیوں سے ہی چھینا ہوا تھا، جن میں ''ٹوپی دار بندوقیں'' بھی شامل تھیں، ورنہ تو ان بے چاروں کے پاس لاٹھیاں، چاقو اور کلہاڑیاں ہی ہوتی تھیں یا پھر درانتیاں لیکن ایک ہتھیار جس پر ان کا سب سے زیادہ انحصار تھا، وہ ان کا آہنی عزم اور قوتِ ایمانی کا جذبہ تھا جس سے وہ سب سرشار تھے۔

اس وقت رات اپنے پہلے پہر میں تھی، حجرۂ دوتھان کے تقریباً سارے ہی مجاہد یہاں موجود تھے اور پہرے پر

تھے جبکہ ایک کوٹھری میں یہ پانچوں مذکورہ مجاہد آپس میں اہم نوعیت کی گفتگو میں مصروف تھے۔

آج کی اس اہم خفیہ نشست کا مقصد ڈوگرا افواج کو کاری ضرب لگانا تھا۔ پچھلے کچھ روز سے ان کی فوجی چھاؤنیاں راولاکوٹ اور پونچھ تک بڑھ آئی تھیں اور انہوں نے تمام آتے جاتے کشمیریوں کا جینا دوبھر کر رکھا تھا...... ذرا ذرا سے شبہے پر معصوم اور بے گناہ کو بے دریغ گولی مار دینا ان ظالم ڈوگرا افواج کا محبوب مشغلہ بن چکا تھا۔ یوں بھی اس سے ان کشمیری مجاہدوں کی تحریک کو بھی نقصان پہنچ رہا تھا۔

''اب ان ڈوگرا فوجیوں کی نقل و حرکت بڑھتی جارہی ہے، اگر جلد ہی انہیں لگام نہیں دی گئی تو ایک وقت آئے گا وہ ہمارے گھروں تک پر قابض ہو جائیں گے۔''

یہ عبداللہ کا چھوٹا بیٹا اور عبدالقیوم کا چھوٹا بھائی تیئس سالہ عبدالرحمان تھا۔ دراز قامت اور چوڑے کاندھے، جسم کسرتی تھا۔ آنکھیں بڑی بڑی اور روشن تھیں، بال قدرے گھنگرالے، رنگ سرخ و سپید تھا۔ اس کی آواز میں ایک گھن گرج کا احساس ہوتا تھا۔

اپنے بڑے بھائی عبدالقیوم کے مقابلے میں یہ زیادہ جوشیلا اور جانباز جانا جاتا تھا۔

''آپ نے بالکل ٹھیک فرمایا محترم! دو تھان پر اگر ان ڈوگروں نے رسائی حاصل کرلی تو سمجھو ہماری اس تحریک کو بھی نقصان پہنچے گا، خدانخواستہ یہ ہمیں بکھیرنے کا سبب نہ بن جائے۔'' بیس اکیس سالہ مناسب قد و قامت کے حامل، جوان شرجیل نے بھی اسی طرح کے خدشے کا اظہار کیا تو اس کے ساتھ بیٹھا اسی کی عمر کا مگر درمیانے جسم اور اچھی صحت کا مالک محمود بھی بولا۔

''ان کی پیش قدمی در حقیقت، دراندازی ہے۔ ان کے ناپاک اور غاصبانہ منصوبوں کو ہر صورت کچلنا ہوگا۔ یہ ہمیں تر نوالہ سمجھنے کی خوش فہمی میں مبتلا ہیں۔ جو ایک طرح سے ہمارے لیے کسی خطرے سے کم نہیں۔''

ان کے پانچویں ساتھی خان غفار نے، جو بہ ظاہر دبلا پتلا نظر آتا تھا لیکن مضبوط کاٹھی اور سخت جان تھا۔ اپنی کسی رائے کا اظہار کیے بغیر اپنے کمانڈر عبدالقیوم کی طرف دیکھ کر از راہ احترام بولا۔

''محترم عبدالقیوم سے ہم سب یہی امید رکھے ہوئے ہیں کہ وہ اس سلسلے میں کوئی لائحہ عمل اختیار کریں گے۔''

اپنے ساتھی مجاہد کے مستفسرانہ تخاطب پر کمانڈر عبدالقیوم نے گمبھیر آواز میں کہا۔

''ساتھیو! آج کی اس اہم نشست کا مقصد ہی یہی ہے کہ میں تمہیں اپنے لائحہ عمل سے آگاہ کروں۔ ہمیں پلوں، چھاؤنیوں اوران کی جنگی گزرگاہوں کو بھی.... وقتاً فوقتاً نشانہ بنانا ہوگا۔''

''ہم تیار بیٹھے ہیں محترم! کشمیر یا موت کا نعرہ ہم نے سر پہ کفن باندھ کر لگایا ہے تو اس کا پاس کرنا بھی اچھی طرح جانتے ہیں۔'' شرجیل نے جوش بھرے لہجے میں کہا۔

تھوڑی دیر بعد یہ لوگ اپنے کاندھوں سے اسلحے کے توڑے لٹکائے، کوہ شکن ارادوں اور سر بہ فلک حوصلوں کے ساتھ، تاریک جنگل اور اندھیری ٹیکریوں کی طرف بڑھ رہے تھے۔ آسمان پر تارے ٹمٹما رہے تھے، طباق چاند کا تھال پوری آب و تاب سے دمک رہا تھا۔ اس کی ضوفشانی سے آسمان روشن تھا۔ یہ پانچوں کفن بہ دوش مجاہد اس چھٹکی ہوئی چاندنی میں ایک قطار کی صورت بل کھاتے، مختصر سے ناپختہ راستے پر بڑھے چلے جارہے تھے۔

جب بھی کوئی اہم مشن سرانجام دینا ہوتا تھا یا کوئی گوریلا کارروائی کرنا ہوتی تو یہ پانچوں ہی یکجا ہو کر نکلتے تھے۔ ہرنہ میرا اور بھیرہ کی طرف کئی ندی نالے بنے ہوئے تھے، ان پر اس سے پہلے کوئی پل نہ تھا لیکن مجاہدین کے مخبر ''عیالی'' (بھیڑ بکری چرانے والے) اس طرف کی خبریں لاتے رہتے تھے۔ وہاں جھولنے والے پل کی تعمیر کا کام ڈوگروں نے جنگی بنیادوں پر شروع کروادیا تھا اور آخری مراحل پر تھا۔ اس طرف کی کڑی نگرانی بھی کی جارہی تھی کہ کہیں ''باغیوں'' کی طرف سے کوئی مجاہدانہ کارروائی ان کا منصوبہ ہی نہ خاک میں ملا دے۔

انہیں اپنی منزل کی طرف بڑھتے ہوئے سیدھے اور مختصر راستوں کے بجائے، متبادل راستہ اختیار کرنا پڑا تھا۔ جو نسبتاً طویل اور پُرپیچ تھا لیکن ان سرفروش مجاہدین کے لیے یہی مناسب اور محفوظ تھا۔

ممنوعہ علاقے کی حدود شروع ہوتے ہی یہ پانچوں مجاہد .... بہت زیادہ محتاط ہو گئے۔ ایک نسبتاً اونچی ٹیکری کے قریب پہنچ کر یہ لوگ ذرا ستانے کے لیے رک گئے۔ پندرہ منٹ بعد انہوں نے اصل اور مطلوبہ راستے کا انتخاب کیا اور پھر روانہ ہو گئے۔

فضا خاموش اور تھمی تھمی سی محسوس ہوتی تھی۔ خنکی کا اثر غالب تھا۔ ہر لمحے دشمن کی بندوقیں گرجنے کا دھڑکا لگا ہوا تھا۔ یہ ڈوگرا فوجی سدھائے ہوئے تھے اور بڑی مربوط

پلاننگ رکھتے تھے۔ انہوں نے اپنے کمانڈوز کی باقاعدہ خفیہ چوکیاں قائم کر رکھی تھیں اور ان چوکیوں کے ارد گرد قریب میں "پکٹے" بھی قائم کیے ہوئے تھے، جہاں دو مسلح فوجی ہمہ وقت فائرنگ پوزیشن میں ریڈ الرٹ رہتے تھے۔

یہ پکٹے ایک طرح سے چوکیوں کے لیے ڈھال کا کام کرتے تھے۔ یہی نہیں بلکہ کہیں کہیں اگی ہوئی خودرو جھاڑیوں میں کسی ہوئی باریک تاروں کا جال بچھایا ہوا تھا، جس سے پاؤں ٹکراتے ہی غیر مرئی لہروں کا ایک سلسلہ پاس کی کسی چوکی کے چوکھٹ میں جھولتے گھنٹے کو "مترنم" کر دیتا اور فوجی محتاط ہو جاتے تھے۔ ڈوگرا فوجیوں کا کشمیری مجاہدین کے خلاف یہی سب سے خطرناک ہتھیار تسلیم کیا جاتا تھا۔ یہ "الارمنگ ہتھیار" درحقیقت افریقا کے قبیلے "بومر" کی طرز کا تھا جو وہ جنگل میں اپنی حدود کی راجدھانی میں اختیار کرتے تھے۔ وہ کسی جانور کی آنتوں کو سکھا کر اس کی باریک تار بناتے اور اس کا سلسلہ گھنے درختوں میں جھولتے پیتل کے بڑے بڑے "بالوں" کے ساتھ اس طرح منسلک کرتے تھے کہ جب بھی کوئی دشمن یا اجنبی ان کی راجدھانی میں چوری چھپے یا ویسے ہی داخل ہونے کی کوشش کرتا تو یہ "بالے" تار چھونے سے ہلنے لگتے اور کسی "گھنٹے" کی طرح بجنے لگتے تھے۔

یہی وہ "بومر" قبیلہ تھا جس نے ایک معروف ہتھیار "بومرنگ" ایجاد کر رکھا تھا جو ایک مخصوص انداز میں پھینکنے سے مد مقابل کو "جاں کش" چرکا لگا کر قوس کی شکل میں فضا میں گردش کرتا ہوا دوبارہ ہاتھ میں آ جاتا تھا۔

بہرطور ڈوگروں کے ان ہتھیاروں کے بارے میں یہ ساری باتیں ان مجاہدین کو "عیاں" مخبروں نے پہلے سے بتا کر خبردار کیا ہوا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ یہ لوگ بہت احتیاط اور گریہ قدمی سے آگے بڑھ رہے تھے۔

ذرا ہی دیر بعد یہ لوگ کامیابی کے ساتھ مدار پور والے پل کے کافی نزدیک پہنچ گئے تھے۔ یہی وہ اہم پل تھا جسے تباہ کرنے کے بعد ڈوگرا فوجیوں کی ممکنہ "پیش بندی" کی جا سکتی تھی۔

یہاں تک تو وہ خیریت سے پہنچ گئے تھے لیکن، آگے مسئلہ یہ تھا کہ گھنی جھاڑیاں پھیلی ہوئی تھیں اور ان جھاڑیوں میں کسی ہوئی تاروں سے ان کا پیر چھو جانے کا ڈر تھا۔ یہ تاریں بال جیسی باریک ہوتی تھیں، چھونے سے بھی پتا نہیں چلتا تھا مگر اس کی لہریں ایک ردھم میں سفر کرتی ہوئی، ان کے لیے موت کا پیغام لا سکتی تھیں۔ ٹارچ جیسی کوئی شے بھی نہیں جلا سکتے تھے۔ مکار ڈوگرا فوجیوں کا یہ ہتھیار بہت کارگر ثابت ہوتا تھا۔ اسی کی مدد سے انہوں نے اب تک کئی کشمیری مجاہدین کی مہمات ناکامی سے دوچار کی تھیں بلکہ بہت سوں کو بے دردی سے شہید بھی کر دیا تھا۔

لیکن مجاہدین نے ڈوگروں کے اس چالباز ہتھیار کا اپنے تئیں مقدور بھر توڑ نکالنے کی کوشش کی تھی مگر وہ کچھ زیادہ کارگر ثابت نہیں ہوتا تھا، بجز اس کے کہ احتیاط کا دامن تھامے رکھتے تھے۔ اس وقت بھی ان پانچوں کو اسی مہلک ہتھیار کا دھڑکا لگا ہوا تھا مگر یہ گریہ قدمی اور قدرے جھک جھک کر آگے بڑھتے رہے۔ ایک مقام پر اچانک خان غفار ٹھٹک کر رکا۔ چٹخی ہوئی چاندنی میں اس کا چہرہ فق سا نظر آنے لگا۔ اس کے یوں ایک دم رک جانے اور نیچے جھک کر دیکھنے کے انداز نے اس کے باقی چاروں ساتھیوں کو بھی دہلا دیا تھا۔

"مم...... میرا...... پاؤں شاید کسی تار سے ٹکرا گیا ہے۔"

"تت...... تمہیں کیسے پتا چلا۔" شرجیل کے منہ سے بے اختیار برآمد ہوا لیکن عبدالقیوم نے وقت ضائع کیے بغیر ان سے سرسراتے لہجے میں کہا۔

"ہوشیار! ادھر ہی رک جاؤ۔ میں اس ہتھیار کا توڑ نکالنے کی کوشش کرتا ہوں۔" یہ کہتے ہوئے اس نے اپنی بغل میں جھولتے توڑے کو کھولا اس کے اندر سے ایک بلی برآمد کی جس کا منہ کپڑے سے اس طرح باندھا ہوا تھا کہ وہ آواز نہیں نکال سکتی تھی۔ اسی وقت انہیں کہیں قریب ہی کھڑبڑ کا احساس ہوا۔ یہ پانچوں یک دم الرٹ ہو گئے۔ کسی بھی وقت گولیوں کی بھیانک تڑتڑاہٹ گونج سکتی تھی لیکن اسی وقت عبدالقیوم نے بلی کے منہ سے کپڑا ہٹا کر اسے سامنے کی طرف اچھال دیا۔ بلی آزاد ہوتے ہی "میاؤں میاؤں" کرتی ہوئی جھاڑیوں میں دوڑتی چلی گئی اور تب ہی ان کی ٹھٹکی ہوئی سماعتوں نے ارد گرد قریب میں بھانڈوں کے بجنے کی ہلکی آوازیں سنی تھیں۔ اب کھڑبڑ بھی ختم ہو گئی تھی۔ دشمن یہی سمجھ کر واپس لوٹ گیا تھا کہ یہ کسی جنگلی جانور کے تاروں سے ٹکرانے کے باعث ہوا تھا۔ تمام مجاہدین نے بے اختیار سکون کی سانس لی لیکن اس پر زیادہ دیر انحصار نہیں کیا جا سکتا تھا۔ دشمن بہت مکار تھا۔ وہ تکنیک میں ضرور جلا ہو گیا ہو گا۔ لہٰذا قیوم نے اپنے ساتھیوں کو راستہ بدل کر آگے بڑھنے کی ہدایت کی اور پھر یہ ڈینجر زون سے ہٹ کر نسبتاً ایک بڑا چکر کاٹتے ہوئے بالآخر جان جوکھم میں ڈال کر اپنی مطلوبہ جگہ (مدار پور) پہنچے تو انہیں خاموش اور ٹھہری

فضا میں پانی کے بہنے کا مخصوص شور سنائی دیا۔ یہاں فضا میں سیلی سیلی مٹی کی باس بھی رچی ہوئی تھی۔

یہ پانچوں فوراً رک گئے۔ سامنے تھوڑے ہی فاصلے پر انہیں روشنی نظر آرہی تھی۔ کمانڈر قیوم جانتا تھا کہ وہ دشمن کی چوکی تھی مگر اس نے ادھر ہی رک جانے کا حکم اس لیے دیا تھا کہ ایک محتاط اندازے کے مطابق چوکی سے تقریباً پندرہ بیس فٹ کے فاصلے پر "پکٹا" قائم تھا، جہاں دانستہ اندھیرا رکھا گیا تھا۔

"ہم منزل پر ہیں۔ ہمیں پکٹا تلاشنا ہوگا۔ لہٰذا اب زیادہ احتیاط کا مظاہرہ کیا جائے۔" کمانڈر قیوم نے سرسراتی سرگوشی میں اپنے ساتھیوں سے کہا اور پھر یہ لوگ اب زمین سے سینے لگائے، کہنیوں اور گھٹنوں کے بل آگے بڑھنے لگے۔ اطراف کا علاقہ صاف تھا، یعنی خودرو جھاڑیاں صاف کردی گئی تھیں لیکن بھربھری مٹی کی ٹیکریوں نے انہیں کسی حد تک آڑ دے رکھی تھی۔

جلد ہی عبدالرحمان کو خنک چاندنی کی روشنی میں ایک چھوٹی ٹیکری کے بالکل قریب سرکنڈوں کی مخروطی چھت سی دکھائی دی۔ کچھ لمحے ٹھہر کر یہ اسی جانب بڑھنے لگے۔ تھوڑی دیر بعد یہ پکٹے کے بالکل نزدیک پہنچ چکے تھے۔ اب انہوں نے لمبے پھل والے چاقو نکال کر اپنے ہاتھوں میں پکڑ لیے تھے۔ یہاں سے قیوم اور شرجیل دائیں جانب اور عبدالرحمان کے ساتھ خان غفار اور محمود بائیں جانب کو سرک گئے۔

قیوم شرجیل کے ہمراہ پکٹے کے قریب پہنچا، اس کی سانسیں سینے میں اٹکی ہوئی تھیں۔ وہ اور اس کے ساتھی اس وقت موت کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالے ہوئے تھے اور جانیں ہتھیلی پہ تھیں۔ اسی وقت قیوم کو ہلکے چراغ کی روشنی میں جھونپڑی کی طرز کے اس پکٹے کے بالکل سرے پر ہی ایک ہندو ڈوگرا فوجی رائفل تھامے پکٹے کی دیوار کے پاس بیٹھا نظر آگیا۔ وہ بیڑی پینے کی تیاری کررہا تھا کہ اچانک قیوم سانپ کی طرح رینگتا ہوا اس کے سر پہ جا پہنچا اور اپنے لمبے پھل والے شکاری چاقو سے اس کی گردن ادھیڑ ڈالی اور ساتھ ہی بڑی پھرتی کے ساتھ اس کے منہ پر ہاتھ بھی رکھ دیا کیونکہ اس کے ذبح ہوتے حلق سے متوقع طور پر برآمد ہونے والی گھٹی گھٹی چیخ بھی اس کے ساتھی دشمن کو اس طرف متوجہ کرسکتی تھی۔

قیوم اسے جہنم واصل کرکے پکٹے میں داخل ہوا ہی تھا کہ اسے ایک اور ڈوگرا فوجی دکھائی دے گیا جو اپنے اندازو اطوار سے خاصا الرٹ دکھائی دے رہا تھا۔ وہ سامنے ہی کے رخ پر تھا اس لیے اس کی قیوم پر نظر پڑ گئی۔ اس نے اپنی رائفل کا رخ اس کی طرف موڑا ہی تھا کہ اچانک اس کے عقب سے عبدالرحمان نے جست لگائی اور اس کی پشت میں چاقو بھونک دیا اور ساتھ ہی اسے نیچے بھی گرالیا۔

اس پکٹے میں دو ہی فوجی تھے۔ انہیں واصل جہنم کرنے کے بعد یہ لوگ چوکی کی طرف بڑھے۔ چوکی میں انہیں دشمن فوجیوں کی تعداد کا کچھ اندازہ تھا کہ وہ تین، چار سے زیادہ نہیں ہوسکتے تھے۔ وہاں بھی انہوں نے اسی منصوبہ بندی کے ساتھ دو ٹولیوں کی شکل میں ہلا بول دیا۔ مشن کا ابتدائیہ رازداری سے انجام دینا تھا، اسی لیے ان کی کوشش یہی تھی کہ اصل ہدف تک پہنچنے سے پہلے تک کوئی شور شرابا یا گولی کا دھماکا نہ ہونے پائے۔

کمانڈر قیوم کا اندازہ درست تھا، چوکی پر چار افراد متعین تھے۔ وہاں بھی ہلکی روشنی تھی۔ پانچوں مجاہد وقت اور ضرورت کی حکمت عملی کو سمجھتے ہوئے گوریلا جنگ میں مصروف تھے۔ چوکی کے قریب پہنچتے ہی پانچوں مجاہدین ان چاروں ہندو ڈوگرا فوجیوں پر شاہینوں کی طرح جھپٹے تھے۔ تین تو موقع پر ہی ہاتھ پیر چھوڑ بیٹھے جبکہ چوتھا، ذرا سخت جان ثابت ہوا تھا یا پھر خان غفار سے کہیں چوک ہوگئی تھی۔ چوتھے ہندو ڈوگرا فوجی نے بروقت جھکائی دے ڈالی تھی اور چاقو کے وار سے خود کو بچایا، بلکہ اسے اپنی رائفل سے گولی چلانے کا بھی موقع مل گیا۔ نشانہ تو وہ کسی مجاہد کا نہیں لے سکا تھا لیکن وہ بھی اس لمحے "شور" کی افادیت سے بہ خوبی واقف تھا...... دوسری بار اس نے رائفل گھمانے کی سعی چاہی تھی مگر عبدالرحمان نے اس کے دائیں پہلو میں چاقو اتار دیا، وہ وہیں ڈھیر ہوگیا۔

رات کے دم بہ خود سناٹے میں گولی چلنے کی آواز دور دور تک پھیلتی چلی گئی تھی اور یہ پانچوں مجاہد تشویش زدہ سے ہوگئے تھے۔ یہ اب پیچھے نہیں ہٹ سکتے تھے مگر ایسے میں پل کے پل کمانڈر عبدالقیوم نے ہولے سے پرجوش آواز میں کہا۔

"جو ہوا سو ہوا۔ آگے بڑھو، ہمیں نالے کے کراڑے (پشتے) سے نیچے اترنا ہے...... آؤ۔" کہتے ہوئے اس نے پیش قدمی کی۔ باقی ساتھیوں کو بھی حوصلہ ہوا اور وہ اپنے کمانڈر کی سرکردگی میں پُرجوش ہوکر اس کے عقب میں ہولیے۔

نالے کا کراڑا بھی سیلا سیلا ہورہا تھا۔ انہوں نے جیسے ہی وہاں اپنے قدم جمانے کی کوشش کی، یہ پھسلتے ہوئے نیچے آرہے۔ اگرچہ انہیں اس کا پہلے ہی ادراک تھا، یہی وجہ تھی

کہ وہ سنبھلنے کی کوشش بھی کرتے رہے۔ اب وہ پل کے ان اہم حصوں کی طرف تیزی سے پھیل گئے، جدھر موٹے موٹے رسے بندھے ہوئے تھے اور اینٹوں کے چوکور ستون ایستادہ تھے۔ انہیں گارے مٹی کا لیپ کر کے ہنگامی بنیادوں پر بنایا گیا تھا۔ تاکہ فوری طور پر ڈوگرا فوجیوں کی پونچھ، دوتھان اور سدھنوئی (راولاکوٹ) تک نقل وحمل ممکن ہو سکے۔

ڈوگرا فوجیوں کو سب سے زیادہ اس طرف کے مجاہدین سے خوف رہتا تھا۔ پانچوں مجاہدین نے ان ستونوں کو دستی بموں سے اڑا دیا اور رسوں کو آگ لگا دی۔ جب تک ہندو ڈوگرا فوجی یہاں پہنچتے وہ اپنا کام کر چکے تھے اور اب دوبدو جنگ کے لیے جان ہتھیلی پہ رکھے دشمنوں سے نمٹنے کے لیے تیار تھے۔ نتیجتاً، دونوں طرف سے گولیوں کی خوفناک آوازیں ابھریں اور سارا علاقہ فائرنگ سے گونج اٹھا۔

فائرنگ کے دوران عبدالقیوم نے اپنے ساتھیوں کو کراڑے ہی کی آڑ میں رہنے کی ہدایت دیتے ہوئے ساتھ ساتھ پیچھے ہٹ کر نکل جانے کا بھی اشارہ دیا تھا اور وہ ایسا ہی کر رہے تھے۔ ایک دوسرے کو کور کیے یہ لوگ، اپنے دفاع میں پیچھے بھی ہٹ رہے تھے اور ساتھ ہی ڈوگرا فوجیوں کو بھی اپنی گولیوں سے نشانہ بنا رہے تھے۔

نالے کا چوڑا پاٹ اور اونچے کراڑے کی وجہ سے یہاں چاند کی روشنی کم ہی پھیلی ہوئی تھی اور یہ ان کے لیے اچھا ہی تھا۔

ایک مقام پر جب یہ پانچوں جری جانباز ڈوگرا فوجیوں کا مقابلہ کرتے ہوئے نالے سے باہر نکلنے کی سرتوڑ کوشش میں مصروف تھے تو اچانک کراڑے کی بلندی سے ایک دستی بم ان پر پھینکا گیا۔ جو تاریکی کے باعث کسی کو نظر نہ آسکا اگرچہ ان پانچوں کو بھی اس کا خدشہ تھا، ایک سماعت شکن دھماکا ہوا اور۔ دو مجاہدوں کی کرب ناک چیخوں نے باقی تینوں کو دہلا دیا۔ دونوں بھائیوں عبدالقیوم اور عبدالرحمان نے اپنے ان دو ساتھیوں خان غفار اور محمود کی چیخوں کی آوازیں پہچان لی تھیں۔ بڑا بھائی کمانڈر قیوم تو انہیں سنبھالنے کو لپکا تھا مگر چھوٹا بھائی رحمان، اپنے ساتھیوں کی چیخیں سن کر بپھر گیا تھا۔ اس کے سر پہ ایک سرفروشانہ جنون سوار ہو گیا۔ وہ ایک محتاط اندازے سے، جدھر دستی بم پھٹا تھا، درانہ وار پیش قدمی کرتے ہوئے۔ اوپر کی جانب چلا اور جلد ہی اسے مدھم چاندنی میں اوپر کراڑے پر ڈوگرا فوجیوں کا ایک پورا دستہ، ہیولے کی صورت میں دکھائی دے گیا۔

انہی میں سے دو کو اس نے فضاء میں ہاتھ بلند کرتے ہوئے بھی دیکھا۔ ان پر یکے بعد دیگرے دستی بم پھینکے جانے والے تھے مگر اس سے پہلے ہی عبدالرحمان نے اپنی رائفل سے ان پر یکے بعد دیگرے فائر جھونک مارے۔ دونوں کی کربیہ انگیز چیخیں نالے پر گونج کر رہ گئیں۔ ادھر ایک جنگی حکمت عملی کے تحت عبدالرحمان نے بجلی کی سی پھرتی کے ساتھ اپنی جگہ بدلی تھی اور یہی وہ وقت تھا جب اوپر سے ڈوگرا فوجیوں نے اس پر فائر کھول دیا تھا، جس کا اندازہ عبدالرحمان کو بھی تھا...... اسی سبب وہ نہ صرف خود کو بچا گیا بلکہ اسے دوبارہ پوزیشن بنانے کا موقع بھی مل گیا اور اس نے شست باندھتے ہی ایک بار پھر اپنی رائفل چھتیا دی۔ مزید ایک سے زائد ڈوگرے فوجیوں کے جسد ناپاک لڑھکتے... ہوئے نیچے آرہے۔ وہ آج اپنی ''مجرۂ دوتھان'' کی تربیت کا بھرپور اور کامیابی کے ساتھ مظاہرہ کر رہا تھا۔

ادھر اس سے ذرا نیچے موجود عبدالقیوم اور شرجیل نے اپنے ساتھی کو تن تنہا۔ اس مقابلے میں جتا ہوا دیکھا تو وہ بھی اس کی مدد کو لپکے اور فائرنگ میں اس کے ساتھ شامل ہو گئے۔

اس دستے کو جہنم واصل کرنے کے بعد انہیں نکلنے کا موقع ملا تو پھر وہ نہیں ٹھہرے۔ تھوڑی ہی دیر بعد یہ نالے کا کراڑا پار کر کے جنگل میں داخل ہو گئے۔ ان کے عقب میں نیچے مدارپور کا پل شعلوں کی لپیٹ میں آچکا تھا۔

اپنے دو ساتھیوں خان غفار اور محمود کی بے مثال قربانی دینے کے بعد یہ تینوں جری جانباز بہ خیریت اپنا مشن کامیابی سے ہمکنار کرنے کے بعد ٹھکانے پر پہنچ چکے تھے۔

☆☆☆

وادی میں مسلم اکثریت کا تناسب 93 فیصد تھا۔ ریاست کا ہندوستان سے سڑک اور ریل کا رابطہ پاکستان کے راستے قائم تھا۔ سڑک راولپنڈی سے جبکہ ریل سیالکوٹ کے راستے کشمیر سے منسلک تھی۔ ڈاک اور ٹیلی گراف کے رابطے بھی پاکستان کے ذریعے منسلک تھے۔ تمام اشیائے ضرورت صرف پاکستان کے راستے کشمیر تک پہنچتی تھیں۔

تاریخی اعتبار سے 14 ویں صدی سے 19 ویں صدی کے آغاز تک کشمیر پر مسلمانوں کی حکومت رہی۔ 1819ء میں پنجاب کے حاکم رنجیت سنگھ نے یہ علاقہ افغانوں سے چھین لیا۔ بعد میں اس نے ایک ڈوگرا راجپوت گلاب سنگھ کو جموں کا علاقہ سونپ دیا۔ گلاب سنگھ نے اپنے اقتدار کو کشمیر کے دیگر علاقوں تک وسعت دی، جبکہ وادی اس کے زیر انتظام نہیں تھی۔ 1846ء میں وادی اپنے مکینوں سمیت انگریز حکومت نے ساڑھے سات لاکھ

روپے کے عوض گلاب سنگھ کو بیچ دی۔
ٹائمز آف لندن کے مطابق دولاکھ 37 ہزار مسلمانوں کو منصوبہ بندی کے تحت موت کے گھاٹ اتار دیا گیا، جو بچ گئے وہ پاکستان آ گئے۔ اخبار اسٹیٹس مین کے ایڈیٹر آئن اسٹیفن کے مطابق، 1947ء کے موسم خزاں میں پانچ لاکھ سے زائد کشمیری مسلمانوں کو بری طرح سے کھدیڑا گیا تھا۔
اس صورت حال کا ردعمل لازم تھا۔ کشمیری جنگجوؤں نے اکیس، بائیس اکتوبر کو مہاراجا کی فوج پر حملوں سے اس ظلم کا جواب دیا۔ 24 اکتوبر کو مہاراجا نے بھارت سے فوجی مدد مانگ لی۔
25 اکتوبر کو مہاراجا اپنے خاندان اور قیمتی اثاثوں سمیت سری نگر جموں فرار ہو گیا۔ فوج اور پولیس میں بغاوت ہو چکی تھی۔ مسلمان جوان اور افسر فوج چھوڑ کر حریت پسندوں سے جا ملے تھے۔ وی پی مینن پہلے ہی کشمیر آ چکا تھا۔ جموں پہنچ کر مہاراجا نے بھارت کے گورنر جنرل کو فوج بھیجنے کی درخواست لکھ کر مینن کے حوالے کی اور ساتھ ہی کشمیر کے بھارت کے ساتھ الحاق کی دستاویز پر دستخط کر کے مینن کے سپرد کر دی۔
27 اکتوبر کو لارڈ ماؤنٹ بیٹن نے اس درخواست کو قبول کرتے ہوئے جو جواب مہاراجا کو لکھا، وہ بہت اہم اور دلچسپ ہے...... ماؤنٹ بیٹن نے لکھا۔
''عزت مآب مہاراجا آف کشمیر نے جن غیر معمولی حالات کا تذکرہ کیا ہے۔ اس کے پیش نظر میری حکومت نے الحاق کی درخواست قبول کرنے کا فیصلہ کیا ہے۔''
27 اکتوبر کو صبح نو بجے بھارتی فوج سری نگر میں اتر گئی۔ پونچھ اور پاکستان سے تعلق رکھنے والے بہت سے فوجی مزاحمت کے لیے سرحد پار کر گئے۔
ایلسٹر لیمب نے اپنی کتاب ''نامکمل بٹوارا'' میں لکھا ہے، اگر برطانوی حکام نے دانشمندی کا ثبوت دیا ہوتا تو پنجاب اور بنگال کی تقسیم کی منطق کو استعمال کرتے ہوئے کشمیر کے معاملے کو حل کیا جا سکتا تھا جس کے تحت مسلم اکثریت والے ریاست کے مغربی حصے، پاکستان جبکہ ہندو اور بدھ اکثریتی مشرقی حصے بھارت میں شامل ہوتے...
برصغیر کی تقسیم اور برطانوی راج کے خاتمے کے موقع پر جو مذہبی بنیادوں پر قتل و غارت گری کا بازار گرم ہوا، ریاست جموں بھی اس سے محفوظ نہیں رہی تھی۔
پورے برصغیر میں جاری مار اماری سے ہٹ کر کشمیر میں ہونے والی سرگرمیاں اس حوالے سے مختلف تھیں کہ یہاں کشمیر کی مسلح افواج کو حکم دیا گیا تھا کہ وہ بزور طاقت جتنے مسلمانوں کو ریاست سے بے دخل کر سکتے ہیں، انہیں نکال باہر کریں۔ لہٰذا جلد ہی یہ بات واضح ہو گئی کہ ریاست میں مسلمان فیصلہ کن اکثریت میں موجود ہیں، اس لیے ان کا صفایا کرنا ناممکن ہے اور یہ علاقہ ہمیشہ مسلم اکثریتی علاقہ رہے گا۔
ان تلخ حقائق سے کشمیر کا ہر مرد، عورت بوڑھے اور بچے تک واقف تھے۔ یہ ایک خنک شام کا ذکر تھا۔ اپنی مدار پور والی کامیاب مہم سے واپسی کے دوسرے دن مجاہدین کے اس خفیہ تربیتی کیمپ ''حجرۂ دوتھان'' میں موجود عبدالقیوم اور عبدالرحمان اپنے دس بارہ ساتھیوں کے ساتھ بیٹھے تھے۔ انہیں مدار پور والے مشن میں اپنے دو ساتھیوں کی شہادت کا دکھ تھا مگر خوشی بھی تھی کہ ان کی قربانی رنگ لائی تھی۔
اس وقت ان کے ہمراہ عبداللہ خود بھی موجود تھا۔ کیپٹن حسین خان اور اشرف خان کی قیادت میں انہوں نے گزشتہ دنوں جنگ میں بھی حصہ لیا تھا اور آئندہ بھی لیتے رہنے کا عہد کیا تھا۔ نیز تازہ ترین صورت حال کے مطابق، جو خاصی مخدوش تھی، اسی پر یہ مجاہدین سوچ بچار اور آئندہ کا لائحہ عمل تیار کرنے کے لیے یہاں جمع ہوئے تھے۔ ان کے خیال کے مطابق بے شک سرحد پار سے پاکستانی قبائلی بھی ان کی مدد کو جوق در جوق پہنچنے والے تھے۔ ان سب باتوں کے باوجود ان مجاہدین کا اپنا ایک لائن آف ایکشن تھا اور طریقہ کار تھا۔
''خدا ہمیں کفار کے ساتھ اس جنگ میں کامیاب و کامران فرمائے لیکن ہمیں جنگ سے پہلے اس کے مابعد اثرات پر بھی نگاہ رکھنا ہو گی۔''
عبداللہ سدھن نے اپنی باریش پر ہاتھ پھیرتے ہوئے متحمل لہجے میں دعائیہ کلمات سے ابتدا کی۔ اس کے دونوں بیٹے دائیں بائیں بازو بن کے قریب ہی بیٹھے تھے اور باقی مجاہد سامنے، فرشی نشست جمائے ہوئے خاموشی سے اپنے سینئر کمانڈر کی بات سن رہے تھے۔
''جنگ کے لیے ہمارے پاس بھی عسکری طاقت موجود ہے لیکن دشمن کو بھی کمزور سمجھنے کی غلطی نہیں کرنی چاہیے۔ جیسا کہ ہمارے علم میں آ ہی چکا ہے کہ ڈوگرا فوجیوں نے اپنی تعداد دوگنی کر رکھی ہے اور بھارتی فوج بھی اس کے ساتھ ہونے کی ہامی بھر چکی ہے لیکن جنگ سے پہلے ہمیں اپنی کمانڈو کارروائیاں کرتے ہوئے، ڈوگرا فوجیوں کے اہم ٹھکانوں کو تباہ کرنا ہو گا اور ان میں ابتری پھیلانی ہو

گی ۔مطلب یہ کہ ہم جنگ کے انتظار میں ہاتھ پہ ہاتھ دھرے نہ بیٹھے رہیں۔'' وہ اتنا کہہ کر خاموش ہوئے تو ایک مجاہد نے مؤدبانہ عرض کی۔

''محترم! ہم آپ کے خیال سے پوری طرح متفق ہیں اور بے چین ہیں کہ ہمیں آپ کی طرف سے کوئی حکم صادر ہو۔'' اس مجاہد سے وہاں موجود باقی مجاہدین نے بھی اپنے سروں کو تائیدی انداز میں جنبش دی تھی۔

''ہمیں سب سے پہلے ڈوگرا فوجیوں کے اہم ٹھکانے تباہ کرنے ہوں گے لیکن تین مجاہدوں کی ایک الگ ٹولی کو ڈوگرا سالار مہندر جنگ سنگھ کو موت کے گھاٹ اتارنا ہوگا۔ یہ دو الگ مشن ہیں۔'' عبداللہ نے گہری متانت بھری آواز میں کہا۔

''اس تین مجاہدین کی ٹولی میں میرا بڑا بیٹا عبدالقیوم خود بھی شامل ہوگا اور اس کے ہمراہ شرجیل اور بابر ہوں گے جبکہ باقی مجاہدین دشمنوں کی اہم چھاؤنیوں اور اسلحے کے ڈپو تباہ کرنے کی کوشش کریں گے۔''

سب نے ان کی بات پر صاد کرتے ہوئے اپنے سر اثبات میں ہلائے تھے۔

☆☆☆

دریائے پونچھ کے دوسرے کنارے پر کوٹلی میں دھیر کوٹ کے مقام پر ایک ڈوگرا فوجی کیمپ میں اس وقت لحیم شحیم جسامت کا مہندر جنگ سنگھ افسر اعلیٰ کی وردی پہنے، پشت پر اپنے ہاتھ باندھے ٹہل رہا تھا۔ اس کی عمر پینتالیس پچاس کے لگ بھگ تھی۔ اس کا چہرہ پُرغیظ ہو رہا تھا۔ ریاست میں چکراتے ہوئے جاسوسوں نے بتا دیا تھا کہ مسلمانانِ جموں اس وقت اپنی بھرپور عسکری طاقت میں ہیں اور نہ صرف یہ بلکہ ان کی مدد کے لیے سرحد پار سے ہزاروں جنگجو قبائلیوں کے قافلے بھی جوق در جوق پہنچ رہے ہیں۔

یہ ایسی خبر تھی جس نے اسے پریشان کر دیا تھا۔ اگرچہ اسے بھارتی عسکری امداد کی طرف سے تسلی بھی تھی، جس کی ہندو اور گورکھا کمپنیوں پر مشتمل دو بٹالینیں پہنچ چکی تھیں اور ان کی کمانڈ بھارتی فوج کا افسر میجر کالی کھرانہ کر رہا تھا۔ اس نے اپنا فوجی کیمپ نالا پناکھ کے قریب قائم کر رکھا تھا اور مہندر جنگ سنگھ اس وقت اسی کی آمد کا انتظار کر رہا تھا۔ اسی وقت ایک شخص اندر داخل ہوا اور مہندر سنگھ سے مؤدبانہ بولا۔

''سر! وہ پٹھانیہ آیا ہے، آپ سے ملنا چاہتا ہے۔''

اپنے ماتحت کی بات پر وہ چونکا۔ کیونکہ اسے اس وقت اس کے بجائے میجر کالی کھرانہ کی آمد کی توقع تھی۔ اگرچہ یہ اس کا خاص آدمی تھا تاہم اس وقت وہ اس کی آمد پر الجھ سا گیا۔ جیسے اسے اس کی آمد بے محل محسوس ہوئی ہو مگر وہ جانتا تھا کہ وہ کیوں آیا تھا۔ اس شخص کا یوں بھی مہاراجا کے قریبی حواریوں میں شمار ہوتا تھا۔

''بھیج دو اسے اندر۔'' مہندر سنگھ نے اس سے تحکمانہ کہا اور پھر ایک کونے میں رکھی ہوئی میز کی طرف بڑھا۔ اس کی دراز کھولی، ایک چھوٹی سی پوٹلی نکال کر جیسے ہی اپنے ہاتھ میں پکڑی، اس کے عقب سے ایک کھردری سی مگر خوشامدانہ سی آواز ابھری۔

''حکم شرکار (سرکار)! آپ کا شیوک کار (سیوک کار) حاجر (حاضر) ہے۔'' وہ اپنے مخصوص گورکھا انداز میں بولا۔

مہندر سنگھ اس کی طرف مڑا تو اس کے سامنے، ایک خاکستری رنگت والا ایک بھاری بھرکم شخص کھڑا تھا۔ اس نے چولا ٹائپ قمیص اور نیچے کھلے گھیر والی شلوار پہنی ہوئی تھی۔ اس کی آنکھوں سے ہی نہیں بلکہ چہرے سے بھی وحشت ٹپک رہی تھی جس پر سفاکی کا رنگ غالب تھا۔ اپنی وضع قطع سے وہ بد قماش ہی دکھائی دیتا تھا۔ اس نے مؤدبانہ انداز میں اپنے دونوں ہاتھ جوڑ رکھے تھے۔ اس کا پورا نام بلدیو سنگھ پٹھانیہ تھا اور یہ ایک ہندو گورکھا تھا۔

مہندر سنگھ نے اپنے ہاتھ میں پکڑی ہوئی پوٹلی اس کی طرف اچھال دی، جسے بلدیو سنگھ نے فوراً جھپٹ کر دبوچ لی۔ پوٹلی کو دیکھ کر اس کی آنکھوں کی حریصانہ چمک تیز ہوگئی تھی۔ بدہیت ہونٹوں کی مکروہ مسکراہٹ بھی سوا ہو چکی تھی۔

''یہ تمہارا انعام ہے۔ اپنا کام جلدی نمٹا دو۔''

مہندر جنگ سنگھ نے اس کی طرف دیکھ کر کہا تو گورکھا بلدیو مکروہ مسکراہٹ سے بولا۔ ''اش (اس) کی کیا ضرورت تھی شرکار...... مال تو ویسے بھی ہمیں مل ہی جائے گا۔'' اس نے اپنے خالص گورکھا لہجے میں کہا اور ساتھ ہی مکارانہ انداز میں اپنی ایک آنکھ بھی میچی ہوئی تھی۔ پھر آگے بولا۔

''شرکار! یہ شالا (سالا) بلدیو بھی کچھ کام کرتا ہے بھلا۔ آج کی رات کوٹلی کے مشلوں (مسلمانوں) کی آکھری رات ہے۔''

''کسی کو شبہ تو نہیں ہوا تم پر؟'' مہندر سنگھ نے کسی خیال کے تحت پوچھا۔

''نہیں شرکار! کشی کو بھی شبہ نہیں ہوا۔ شارے مشلے (مسلمان) تیار بیٹھے ہیں، میں نے تو کل ہی منادی کرا دی تھی۔ شارے مشلے مجھ پر بہوت (بہت) بھروشا (بھروسا) کرتے ہیں شرکار! آپ بے پھکر (بے فکر) رہو۔''

گورکھے بلدیو نے مکروہ لہجے میں کہا۔ اس مردود کی آنکھوں سے بے رحمی جھلکنے لگی تھی۔
''خیال کرنا۔ یہ سب کوٹلی کی حدود میں نہ ہونے پائے۔'' مہندر سنگھ بولا۔
''نہیں ہوگا شرکار! مجھے آپ کی ہدایت معلوم ہے۔ ان شب مشلوں (سب مسلمانوں) کو پریڈ گراؤنڈ میں جمع ہونے کے لیے کہہ دیا ہے۔ لاریاں اور ٹرک بھی پہنچ گئے ہیں۔ ان شب (سب) کو کوٹلی سے شوچیت گڑھ (سوچیت گڑھ) کے راشتے (راستے) شیالکوٹ (سیالکوٹ) سے پاکشتان (پاکستان) پہنچانے کا جھانسا دے کر شیدھا (سیدھا) کھٹوعہ روڈ کے ویران اور بنجر میدان لے جائیں گے اور پھر......'' یہ کہتے ہوئے اس خبیث مکروہ انسان نے جواب دیتے ہوئے، دانستہ معنی خیز انداز میں اپنا جملہ ادھورا چھوڑ دیا۔ اس کے بدہیت کالے ہونٹوں پہ شیطانیت اور سفاکانہ مسکراہٹ مترشح تھی۔ اس کی بات کا ہولناک اشارہ بھانپ کر مہندر جنگ سنگھ نے ہولے سے اپنے سر کو تفہیمی جنبش دی۔ اس پر بلدیو سنگھ نے آخر میں ہاتھ جوڑتے ہوئے اپنے مخصوص لہجے میں مزید کہا۔
''بش! (بس)۔ اب آپ کے حکم کا انتجار (انتظار) تھا۔ کام بالکل ٹھیک طریقے شے (سے) ہو جائے گا شرکار (سرکار)۔'' مہندر جنگ سنگھ نے اسے جانے کا کہہ دیا اور وہ اسے ہاتھ بھر کا سلام جھاڑ کے واپس ہولیا۔
یہ گورکھا وہاں سے سیدھا مسلمانوں کی بستی تراڑ پہنچا۔ جہاں پریڈ گراؤنڈ میں بسیں اور لاریاں پہنچ چکی تھیں اور جموں کی مختلف مسلم بستیوں سے ایسے مسلمان جو بے چارے یہاں کے حالات اور آئے روز کی جنگی کارروائیوں اور سکھوں اور گورکھا لٹیروں کے ظلم وستم سے تنگ آئے ہوئے تھے، اس کے جھانسے میں آگئے تھے اور اسے ہی اپنا نجات دہندہ سمجھے ہوئے تھے۔ ان مسلم بستیوں میں ہندو اور سکھ بھی رہتے تھے۔ حالانکہ جموں کے سرداروں نے انہیں کسی ہندو یا مہاراجا کے آدمیوں کے جھانسے میں نہ آنے کی تاکید کر رکھی تھی لیکن بلدیو اور اس کے حواریوں نے مہاراجا ہری سنگھ کی ایک خاص ظالمانہ ہدایت کے مطابق پہلے گھر گھر جا کر مسلمانوں کو اپنی چکنی چپڑی باتوں سے یہ باور کرایا تھا کہ بہت جلد جموں میدان جنگ بننے والا ہے بلکہ مہاراجا اور بھارتی افواج نے جموں کو مسلمانوں کا قبرستان بنانے کا عہد کر رکھا ہے۔ اس لیے بہتر یہی ہے کہ راتوں رات جموں کے جتنے مسلمان نکل سکتے ہیں نکل جائیں اور اس سلسلے میں بالکل بے فکر رہیں، کیونکہ مہاراجا نے خود ان کی (مسلمانوں کی) بحفاظت ان کے آرزوؤں کے مسکن پاکستان پہنچانے کی ذمے داری کو فوج اور پولیس کے سپرد کیا ہے۔
گورکھا بلدیو سنگھ خود ایک لٹیروں کے ٹولے کا سردار تھا۔ اس نے اور اس کے حواریوں نے جو پہلے ہی مسلمانوں کے ساتھ گھلے ملے ہوئے تھے اور بہ ظاہر ان کے نجات دہندہ بنے ہوئے تھے، راتوں کو ان کے گھروں میں نقاب ڈال کر ڈاکے مارا کرتے تھے۔ ان میں وہاں رہنے والے ہندو بھی شامل تھے۔
مسلمانوں کو یہ کہہ کر جھانسا دیا گیا تھا کہ انہیں سوچیت گڑھ کے راستے سیالکوٹ پہنچایا جائے گا اور پھر یہ لوگ اپنے نوزائدہ بننے والے ملک پاکستان پہنچ کر بالکل اور ہمیشہ کے لیے محفوظ ہو جائیں گے۔ اپنا تاثر انہوں نے یہی دیا تھا کہ وہ اس طرح خود بھی کرائے بھاڑوں کے نام پر پیسا کمانا چاہتے ہیں اور یہی ان کا پیشہ بھی ہے۔
بے چارے مصیبت کے مارے کچھ مسلمان تو ان کے جھانسے میں آگئے اور کچھ خوف زدہ تھے اور انہوں نے جانے سے انکار کر دیا تھا، جبکہ چند مسلمان ایسے بھی تھے جسے وہ مہاراجا کی ایک سوچی سمجھی کوئی خطرناک چال کا نام دے رہے تھے اور ان کو سمجھانے کی کوشش کر رہے تھے کہ وہ ایسا قدم نہ اٹھائیں۔ اس بات پر مسلمانوں میں آپس میں بحث و مباحثے کی حد تک تنازعہ بھی کھڑا ہوا تھا۔ ان میں رحیم خان اور نذیر علی کا بھی خاندان تھا۔
ان کی بستی تراڑ میں پریڈ گراؤنڈ کے قریب ہی واقع تھی۔ رحیم خان اور نذیر علی آپس میں پڑوسی تھے۔ رحیم خان اپنے خاندان کے ساتھ، جو ایک جوان بیٹی اور ایک بیٹے پر مشتمل تھا، اس قافلے کے ساتھ پاکستان جانے کے لیے تیار تھا۔ اس کی بیوی مر چکی تھی۔ اس کا بیٹا شادی شدہ تھا، بیوی تھی اور دو چھوٹے معصوم بچے تھے، جن کی عمریں بہ مشکل آٹھ اور نو سال تھیں۔
جبکہ دوسرا خاندان جو اس ''ہجرت'' کی آڑ میں گورکھوں اور ہندوؤں کی سازش پر شبہ کیے ہوئے تھا وہ نذیر علی کا خاندان تھا۔ اس کا خاندان ایک بیوی اور ایک جوان بیٹے پر مشتمل تھا۔ بیٹا شفیق علی بیس سالہ نوجوان تھا۔
بستی کے ہندوؤں نے بھی، جو درپردہ بلدیو سنگھ کے ساتھ ملے ہوئے تھے، ان مسلمانوں کے ''ہمدرد'' بن کر انہیں یہی مشورہ دیا تھا کہ وہ لوگ نکل جائیں۔
اب حالت یہ تھی کہ جو مسلمان خاندان بلدیو سنگھ اور

ہندوؤں کی باتوں میں آکر سوچیت گڑھ کے راستے سیالکوٹ (پاکستان) جانے کے لیے تیار بیٹھے تھے، انہوں نے اپنے ہی مسلم بھائیوں کی نصیحتوں سے تنگ آکر بظاہر ان سے کہہ رکھا تھا کہ وہ نہیں جائیں گے مگر اندر سے جانے کی تیاری رکھے ہوئے تھے۔

دریائے پونچھ پر جھلملاتی شام اب رات کے اندھیروں میں بدلنے لگی تھی۔ ذرا پرے ایک بستی میں بہ ظاہر ہو کا عالم تھا۔ لیکن کچھ گھروں میں لوگ کوچ کی تیاریوں میں مصروف تھے اور وہ ایک ''ہدایت'' کے مطابق اپنا مختصر اسباب سمیٹے مع اہل وعیال کے، گھروں سے ایک ایک خاندان کر کے خاموشی سے نکل رہے تھے۔ ایسے ہی میں ایک مختصر سے مکان میں خاموشی طاری تھی۔ یہ نذیر علی کا گھر تھا، جو اس کوچ کو ایک سازش سمجھے ہوئے تھا اور انہوں نے ہجرت کرنے سے انکار کر دیا تھا۔ اسی لیے یہاں ایک تو خاموشی چھائی ہوئی تھی۔ دوسرے یہ کہ مکین سوئے ہوئے تھے، سوائے شفیق علی کے جو اپنے کمرے میں چارپائی پر لیٹا چھت کو گھور رہا تھا۔ اس کے اندر ایک تلاطم سا بپا تھا۔ وہ ایک گورا چٹا اور درمیانے قد کا صحت مند نوجوان تھا۔

تھوڑی دیر بعد وہ چارپائی سے اٹھا اور بے آواز قدموں سے اس نے اپنے کمرے سے دروازے تک کا راستہ طے کیا۔ رک کر ایک پلٹتی نگاہ اس کوٹھری کے دروازے پر ڈالی جہاں اس کے ماں باپ سوئے ہوئے تھے، دروازہ بند تھا۔ ایک تسلی کرنے کے بعد اس نے دروازے کی کنڈی کھولی اور باہر تاریک گلی میں آ گیا اور پھر تین گھر چھوڑ کے وہ جیسے ہی ایک گھر کے قریب بڑھا تو اچانک رک گیا اور فوراً ایک دیوار کی آڑ میں ہونے کی کوشش کرنے لگا۔ اپنے مطلوبہ گھر کے بالکل سامنے والے مکان سے کچھ لوگ باہر نکل رہے تھے۔ یہ پانچ افراد تھے اور ان میں دو بوڑھے مرد عورت ایک جوان لڑکی اور ایک نوجوان تھا۔ یہ سلیمان متو کا گھرانا تھا اور ان مسلم گھرانوں میں شامل تھا جنہوں نے بلدیو کی باتوں میں آکر اسے اپنا نجات دہندہ سمجھ کے کوچ کرنے کا فیصلہ کر لیا تھا۔

شفیق نے ایک دکھ بھری نظر ان پر ڈالی۔ جانے کیوں یہ منظر دیکھ کر اس کا دل بھر آیا تھا۔ جب یہ خاندان اپنے اہل وعیال کے ساتھ، مختصر اسباب سمیٹے گلی میں چلتا ہوا نظروں سے اوجھل ہو گیا تو اس نے جیسے اپنے سینے کے پنجرے میں قید ایک بھنچی بھنچی سانس کسی زخمی پرندے کی طرح آزاد کی اور مذکورہ مکان سے ایک مخصوص فاصلے پر کھڑے ہو کر اس نے اپنے دونوں ہاتھوں کا بھونپو بنا کر الو کی آواز نکالی اور اس کے چند ہی لمحوں بعد اس نے کسی کو اپنے مطلوبہ گھر کے دروازے سے نمودار ہوتے دیکھا جس نے ایک بڑی چادر سی اوڑھی ہوئی تھی۔ اسے دیکھ کر شفیق کا دل ایک لمحے کو یکبارگی زور سے دھڑکا۔ وہ فوراً اس کی طرف لپکا، قریب پہنچنے پر جب دونوں ایک دوسرے کے روبرو ہوئے تو بے اختیار لڑکی نے اپنے چہرے سے چادر ہٹا دی۔ شفیق کی اس پر نظر پڑی تو لڑکی کے نازک چہرے کو اشکبار دیکھ کر اس کا اپنا دل اندر سے گھٹ کے رہ گیا۔ وہ رحیم خان کی بیٹی زلیخاں تھی جس کے گھر والوں نے آج رات پریڈ گراؤنڈ پہنچ کر پاکستان ہجرت کرنا تھی۔ زلیخاں ایک نرم و نازک اور دلکش نقوش والی خوبصورت لڑکی تھی۔ صورت معصوم اور آنکھیں کشادہ تھیں۔ بالوں کی ایک لٹ اس کی سپید پیشانی پر اٹکھیلی کر رہی تھی۔ آنسو اس کی آنکھوں سے بہہ کر پورا چہرہ تر کیے ہوئے تھے۔ گداز ہونٹوں پہ ایک کرب بھرا ارتعاش تھا۔ یوں جیسے اس نے اپنے اندر دکھوں کی ایک دنیا آباد کر رکھی ہو۔ ایسی ہی ایک دنیا کا شفیق خود بھی تو باسی تھا اور اس کربناک حقیقت سے بھی واقف تھا کہ اب یہ دنیا اپنے دکھوں اور آہوں سمیت اس سے جدا ہونے والی تھی۔ وہ منہ سے کچھ نہیں بولی، بس، یک ٹک آنسوؤں بھرے چہرے سے اپنے سامنے ایک لاش کی شکل کھڑے شفیق کو تکے جا رہی تھی۔ اس کے دیکھنے کا انداز بھی ایک سراپا کرب تھا۔ گھٹی گھٹی سی ایک حسرت تھی اور اس حسرت میں غم ہجر کا ایک اذیت ناک الاؤ سا بھڑک کے ہوئے تھا۔

''اس طرح تو تم مجھے مار ہی ڈالو گی زلیخاں!'' اسے یوں سراپا غم میں ڈوبا، بہ دستور اپنی جانب تکتے پا کر شفیق تڑپ اٹھا تھا۔

''زندہ تو میں بھی نہیں شفیق!'' اس کے لب لرزاں نے جیسے سسکی لی۔ ''یہ جو تمہارے سامنے کھڑی ہے، ایک لاش ہی تو ہے۔''

''مت کرو ایسی دل دکھانے کی باتیں۔ حوصلہ رکھو۔ یہ سب بس اچانک ہی ہو گیا، ورنہ۔''

''تم دل دکھنے کی بات کرتے ہو شفیق!'' زلیخاں نے درمیان میں کہا۔

''یہاں تو ساری جاں دکھ رہی ہے۔ تم کچھ دیر کے لیے بھی نگاہوں سے اوجھل ہوتے ہو تو مجھے یوں لگتا ہے جیسے بہت دور چلے گئے ہو۔ یہ تو پھر سرحد پار چلے جانا ہے۔ ایسا لگتا ہے جیسے میں ایک ملک کی نہیں، اپنی زندگی کی سرحد پار

کرنے والی ہوں۔'' وہ گھٹے گھٹے لہجے میں بولی اور شفیق نے اس کے جگر سوز الفاظ پر بے اختیار تڑپ کر اپنا ہاتھ اس کے نرم و گداز لبوں پر رکھ دیا...... محبوب کے ہاتھ کا لمس اپنے پیاسے لبوں پر محسوس کر کے جیسے زلیخاں کے تن مردہ میں تھوڑی جان سی پڑ گئی، اس نے بھی اپنا ایک ہاتھ اس کے ہاتھ پر رکھ دیا اور اپنے ہونٹ رگڑتی ہوئی جب ایک وارفتا نہ مگر ہجر زدہ چاہت سے اپنا مرمریں گال بھی ٹکا دیا تو اس کی اس حسرت ناتمام ادا نے شفیق کا دل بھی جھیروں جھیر کر ڈالا۔ اس کی روح جیسے کانٹوں پر لوٹنے لگی۔ زلیخاں کے گال کی نرماہٹ نے اسے تڑپا دیا۔ آنسو اس کی آنکھوں میں بھی چمک رہے تھے مگر وہ نہ جانے کیسے حوصلہ کیے ہوئے تھا۔ جانتا تھا شاید کہ اسے ہی حوصلہ پکڑنا ہے، ورنہ اسے بے حوصلہ دیکھ کر زلیخاں کا کیا حال ہوگا؟ اس نے اپنے گلے کی گھٹی گھٹی رقت کا ایک گھونٹ زہر کی طرح بھرا اور زلیخاں کے آنسوؤں سے لبریز چہرے کو اپنے دونوں ہاتھوں کے پیالے پر لیتے ہوئے اس کی آنکھوں میں ڈوب کر بولا۔

''زلیخاں! میں نے تم سے وعدہ کیا ہے، بھروسا کرو مجھ پر۔ تم لوگوں کے خیریت سے پاکستان پہنچتے ہی میں بھی......''

وہ اپنا جملہ ہی نہ پورا کر پایا۔ شاید اس کی کھوکھلی تسلی، اس کے لفظوں کی بیساکھی کو بھی نہ سہار پائی۔ یہاں تک کہ زلیخاں نے خود ہی کہہ دیا۔

''میں زیادہ دیر نہیں رک سکتی۔ ہم روانہ ہونے والے ہیں۔ میں تمہارا انتظار کروں گی، اب شاید یہی میرا مقدر ہے لیکن کاش! میرا یہ انتظار، محض انتظار ہی نہ رہے۔''

یہ کہہ کر وہ سسک پڑی۔ پلٹنے لگی تو شفیق کی ہمت سوا ہوئی اور اسے روکا۔

''ٹھہرو۔'' وہ پلٹتے پلٹتے رکی، اس کی طرف مڑی۔ وہ اس کی طرف بڑھا، اس بار پورے یقین سے بولا۔

''زلیخاں! میرا یقین کرو۔ میں نے بھی اماں اور اباجی کو بہت کہا چلنے کو لیکن تمہیں معلوم ہی ہے کہ کچھ لوگ ڈرے ہوئے ہیں۔ اس لیے انہوں نے یہی سوچا کہ پہلے ایک کھیپ خیریت سے پاکستان پہنچ جائے تو دوسرے بھی کوچ کریں۔ لوگوں نے ڈرایا ہوا تھا۔ اسی لیے کچھ لوگوں نے اس ہجرت سے انکار ہی کر دیا۔ میں نے یہ بھی سوچا کہ میں خود ہی تم لوگوں کے ساتھ چلا چلوں لیکن تم جانتی ہو کہ میں اپنے ماں باپ کو پیچھے کس کے سہارے چھوڑتا۔ بلکہ ہم تو چاہ رہے تھے کہ تم بھی ابھی نہیں جاتے۔''

''کسی تمہید کی ضرورت نہیں ہے شفیق!'' وہ بولی۔

''میں نے کہا نا کہ میں تمہارا انتظار کروں گی۔''

''تو پھر میں بھی اپنا وعدہ تمہارے سامنے دوبارہ دہرائے دیتا ہوں۔ میں ضرور آؤں گا۔''

''خداحافظ۔'' زلیخاں نے جاتے جاتے اپنا ہاتھ ہلا دیا اور پھر اپنے گھر کے دروازے کی طرف بڑھ گئی۔ وہ اسے جاتا ہوا دیکھتا رہا، جب تک وہ دروازے کے اندر داخل ہو کے اس کی آنکھوں سے اوجھل نہ ہو گئی۔

اس کے بعد بھی وہ وہیں کھڑا رہا، اپنی جگہ سے ہلا تک نہیں۔ تھوڑی دیر گزری، اگلی بار اس نے منظر دیکھا تو اسے یوں لگا جیسے کسی نے اس کا دل نکال کر اپنی دونوں ہتھیلیوں میں لے کر مسل دیا ہو۔ زلیخاں کے گھر کا دروازہ کھلا اور اندر سے پہلے اس کا باپ رحیم خان برآمد ہوا، پھر اس کا بھائی اپنی بیوی اور دو بچوں کے ساتھ، سب سے آخر میں زلیخاں اپنی ماں کے ہمراہ نکلی تھی۔ ان لوگوں نے ہاتھوں میں مختصر اسباب کی بقچیاں تھامے ہوئے تھیں۔ یہ لوگ آگے چل دیے۔ زلیخاں نے ایک ذرا مڑ کر اس کی طرف دیکھا تھا، پورا یقین تھا اسے کہ اس کا محبوب ابھی تک اسی دیوار سے چپکا کھڑا ہوگا، جس دیوار کی بھیدوں بھری تاریکیوں میں تھوڑی دیر پہلے ان کی سسکیاں کروٹیں لے رہی تھیں۔ دونوں نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا اور پھر وہ اپنی ماں کے ساتھ آگے بڑھ گئی تو شفیق کے قدم بھی بے اختیار اس کی جانب اٹھنے لگے۔ اس نے دھیان رکھا تھا کہ اہل خانہ میں سے کسی کی نظر اس پر نہ پڑے۔ اسی طرح ان کے پیچھے چلتا ہوا وہ بھی پریڈ گراؤنڈ تک پہنچ گیا اور وہاں کا منظر دیکھ کر چونکا۔ مختلف بستیوں سے آئے ہوئے مسلمان خاندان وہاں جمع تھے اور ٹرک اور لاریوں میں سوار ہو رہے تھے۔ شفیق نے دیکھا۔ وہاں پولیس اور ڈوگرا فوجی ان کی نگرانی میں مصروف تھے۔ ان میں اس نے گورکھے بھی دیکھے تھے جو مسلمانوں کو لاریوں وغیرہ میں جلدی جلدی سوار ہونے کا کہہ رہے تھے۔ انہی میں اس نے گورکھا بلدیو سنگھ پٹھانیہ کو بھی دیکھا تھا۔ شفیق کا ذہن الجھا ہوا تھا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ اس ہجرت سے متعلق جو باتیں مسلم بستیوں میں گردش کر رہی تھیں، وہ جھوٹی تھیں یا سچی، یا پھر محض وسوسوں پر مبنی تھیں؟ کیونکہ کچھ لوگوں کا خیال تھا کہ یہ سب ڈھکوسلے بازی ہے اور مسلمانانِ جموں کے خلاف مہاراجا کی ایک گھناؤنی سازش ہے۔ جو سکھوں اور گورکھا لٹیروں کے ذریعے ان کے قتل عام پر منتج ہوگی لیکن زیادہ تر مسلمانوں کا خیال تھا کہ مہاراجا اتنا ظالم نہیں ہو سکتا

اور نہ ہی اس کے اندر اتنی جرأت ہو سکتی ہے کہ وہ ہزاروں مسلمانوں کے خونِ ناحق سے ہولی کھیل سکتا ہے۔ بلکہ وہ تو خود چاہتا ہے کہ جتنا ہو سکے، مسلمان جموں سے ہجرت کر کے اپنے آرزوؤں کے مرکز پاکستان جا پہنچیں اور علاقے میں کشیدگی کم سے کم ہو...... یہ وہ باتیں تھیں، جو مہاراجا کے حواریوں (مہندر جنگ سنگھ اور بلدیو سنگھ پٹھانیہ وغیرہ) نے ایک سوچی سمجھی سازش کے تحت مسلم بستیوں میں پھیلا کر انہیں جھانسا دینے کی کوشش کی تھی۔

شفیق نے بڑے دکھ اور کرب کے ساتھ زلیخاں کو ایک لاری میں اپنے گھر والوں کے ساتھ سوار ہوتے دیکھا اور اس کا دل ایک بار پھر بھر آیا۔ ان غیر یقینی حالات میں زلیخاں کا اس طرح ہجرت کرنا شفیق کی اب تشویش بھی بڑھانے لگا تھا اس کے دل کو ایک نامعلوم سے اضطراب اور بے چینی نے جکڑ لیا تھا۔ جس وقت زلیخاں نے لاری میں سوار ہوتے وقت شفیق پر ایک آخری نگاہ ڈالی تھی، اسی وقت شفیق نے بے اختیار اپنا ہاتھ بلند کر کے ہلایا تھا۔ وہ شاید زلیخاں کو خدا حافظ کہہ رہا تھا۔

خاصی دیر بعد جب یہ قافلہ سوچیت گڑھ کی طرف روانہ ہونے لگا تو زلیخاں نے کھڑکی سے ایک بھوری سی غمزدہ نگاہ باہر ڈالی تھی لیکن اسے شفیق کہیں کھڑا دکھائی نہ دیا تھا۔ اسے حیرت ہوئی۔ کیا شفیق کے اندر آخری بار اسے دیکھنے کی تاب نہیں رہی تھی؟ وہ کیا واپس اپنے گھر کی طرف لوٹ چکا تھا؟

☆☆☆

(پیش منظر)

محمد علی کی طبیعت کچھ سنبھلنے تو لگی تھی لیکن اسے اب ایک نئی فکر لاحق ہوگئی تھی۔ ایک نامعلوم سا خوف ہر وقت اس کا حالِ بےچین کیے رکھتا تھا۔ درحقیقت جتنی اس کی عمر تھی، اتنا ہی اس کی بوڑھی آنکھوں نے بھارتی فوجیوں کی درندگی کے جگر خراش مناظر دیکھے تھے۔ ایک خوف سا اس کے دل ودماغ میں جاگزیں رہتا تھا۔ اسے اپنے خاندان، اپنے بیوی بچوں سے بہت محبت تھی اور انہی کے لیے اس نے جان توڑ محنت مشقت کی تھی اور اب تک کر رہا تھا۔ بس وہ چاہتا تھا کہ وقت ایسے ہی گزرتا رہے۔ یہی سبب تھا کہ وہ خود بھی ایسے حالات سے کتراتا تھا جس سے اس کے خاندان پر کوئی آنچ آئے لیکن اب اپنے ہی جوان بیٹے شیر علی کو اس تازہ واقعے میں ملوث پا کر وہ بہت زیادہ فکرمند اور تشویش زدہ ہوگیا تھا۔ جاننے لگا تھا کہ اس طرح صرف اس کا بیٹا شیر علی ہی نہیں بلکہ اس کا پورا خاندان بھی بھارتی سفاک درندوں کی نظروں میں آگیا ہوگا اور اس پر مستزاد یہ کہ عبدالرحمان جیسے ایک بڑے کشمیری راہنما اور کمانڈر کا اس کے بیٹے کی پیٹھ ٹھونکنا اور یہی نہیں بلکہ پریس کلب لے جا کر اسے اس طرح ایک نوجوان کشمیری مجاہد کی حیثیت سے نمایاں کرنا، اس کے لیے فکر وتشویش کا سبب بنا تھا۔

اگلے دن صبح جب وہ ڈل جھیل کی طرف جانے کے لیے نکلنے لگا تو اس کی بیوی عائشہ نے کہا۔

”آپ ابھی تو بیماری سے اٹھے ہیں۔ دو تین دن مزید آرام کر لیتے۔ شیر علی چلا جائے گا۔“

بیوی کی بات پر وہ یک دم بولا۔ ”اسے اب بھول کر بھی گھر سے باہر مت نکالنا، سمجھیں تم؟“

”اللہ خیر کرے! ایسا کیا کر دیا ہے میرے لعل نے۔“

عائشہ یک دم پریشان سی ہوگئی۔ محمد علی نے دل ہی دل میں اپنی سیدھی سادی بیوی کی کج فہمی پر افسوس کیا اور بولا۔

”بے وقوف! کیا تجھے نہیں معلوم...... اس نے کیا گل کھلایا ہے؟“

”لل...... لیکن سب نے میرے شیر علی کی بہادری کو دل سے تسلیم بھی کیا ہے اور یہ بھی کہ اس کا کوئی قصور نہ تھا۔ خان صاحب (کمانڈر عبدالرحمان) نے بھی میرے لعل کی اس روز تعریف کی تھی جبکہ وہ ناخوشگوار واقعہ تو بھارتی فوجیوں کی وجہ سے...“

”میں بھی انہی کی بات کر رہا ہوں۔“ محمد علی نے اس کی بات کاٹی۔ ”کشمیری تو سب تعریف کریں گے ہی تیرے لعل کی مگر...... اب میں تجھے کیسے سمجھاؤں۔“ اس نے اپنا سر پکڑ لیا۔ وہ خود جس پریشانی اور تشویش میں مبتلا تھا نہیں چاہتا تھا کہ خاندان کا اور کوئی فرد بھی اسی سے دوچار ہو۔

شوہر کو پریشان دیکھ کر عائشہ نے بحث کرنا مناسب نہیں سمجھا اور بولی۔

”اچھا...... اچھا ٹھیک ہے۔ جیسے آپ کی مرضی لیکن اپنا خیال بھی رکھنا۔ آج کل سردی بہت پڑ رہی ہے۔ چائے اور قہوہ پیتے رہنا۔“

محمد علی نے ایک گہری سانس خارج کی اور گھر سے نکل گیا۔ سری نگر کی گل پوش پہاڑیوں سے سورج اپنی پوری تب وتاب کے ساتھ ابھرنے لگا تھا۔ وادی کو گھیرے میں لیے ہوئے برف سے ڈھکی ہوئی چوٹیاں اس کی نودمیدہ کرنوں سے چمکنے لگی تھیں۔ ابھرتے سورج کو اپنی بھرپور تمازت سے نمودار ہوتے دیکھ کر ڈل جھیل کے مانجھیوں نے

اندازہ لگایا تھا کہ آج وادی میں سردی کا تناسب نسبتاً کم ہی رہے گا اور یہ ان کے لیے ایک خوش گوار بات تھی۔ کاروباری لحاظ سے بھی کہ اب وہ ''ڈل گیٹ'' کے ساتھ ساتھ جھیل کے کنارے بھی اپنے سبزیوں سے لدے شکارے لگا کر سبزی فروخت کرسکتے ہیں۔ اس طرح انہیں دگنی آمدنی ہوجایا کرتی تھی۔

محمد علی نے بھی جھیل کے قریب پہنچ کر اپنا شکارا سنبھالا اور اسے کھیتا ہوا دوسرے کنارے جا پہنچا۔ وہاں اس نے ماحول میں کچھ سوگواری اور ایک نامعلوم سی خاموشی کا عنصر غالب پایا۔ ایک دبے دبے خوف کی فضا بھی محسوس کی تھی۔ وہ اس کی وجہ جانتا تھا اسی لیے خاموش رہا۔ البتہ وہاں اس کا خیال تھا کہ لوگ اسے اس کے بیٹے شیر علی کی وجہ سے سخت تنقید کا نشانہ بنائیں گے مگر ایسا نہیں ہوا بلکہ اس کے برعکس وہ بڑے احترام اور خوش دلی سے اس کی طبیعت کے بارے میں خیر خیریت پوچھنے لگے اور کئی ایک تو اس کے بیٹے شیر علی کی بہادری کی تعریفیں بھی کرتے نظر آئے۔

مگر محمد علی خاموشی سے اپنے دھندے میں مگن رہا۔ ابھی اسے وہاں بیٹھے تھوڑی ہی دیر گزری ہوگی کہ وہ بری طرح چونک پڑا۔ اس کا بیٹا شیر علی وہاں آن پہنچا۔

''تت......تو......کیوں آگیا ادھر؟ میں نے تو تیری ماں کو منع کیا تھا کہ وہ تجھے یہاں نہ بھیجے۔''

اس نے بیٹے سے ذرا سخت لہجے میں کہا تو وہ حیرت سے باپ کی طرف دیکھ کر بولا۔ ''کیوں ابا جی؟ میں تو بالکل ٹھیک ہوں بلکہ آپ کو نہیں آنا چاہیے تھا۔ آپ کی طبیعت......''

''پھر وہی بحث۔ میں جو کہہ رہا ہوں، بس وہی کرو...... جاؤ گھر واپس۔'' محمد علی نے اس کی بات کاٹی تو شیر علی خاموش ہو رہا۔ سمجھ تو گیا تھا کہ معاملہ کیا تھا۔ اسے باپ کے ایسے رویے پر دکھ ہوا تھا مگر وہ اس کے حکم سے سرتابی نہیں کرسکتا تھا۔ لہٰذا خاموشی سے واپس پلٹا مگر گھر جانے کے لیے نہیں، وہ کسی اور طرف چل دیا تھا۔ جانے کیوں اس کا واپس اپنے گھر جانے کو جی نہیں چاہ رہا تھا۔ بلکہ حقیقت تو یہ تھی کہ اس کا اپنے باپ کے اس سبزی فروشی والے کام میں بھی دل نہیں لگتا تھا۔ وہ فطرتاً متنوع مزاج تھا۔ ایک ہی جگہ بیٹھے بیٹھے گاہکوں کا انتظار کرنا اور ایک ایک چیز ناپ تول کر دینا، ترازو سنبھالنا، یہ سب اسے اکتا دینے والا کام لگتا تھا مگر مجبور تھا کہ ان کا گزارہ ہی اسی کام میں تھا۔ ہاں! اسے ایک کام پسند تھا اور وہ تھا گائیڈ بننا۔ ایک دن اس نے دبے دبے لفظوں میں باپ سے کہا بھی تھا کہ وہ اس کی جگہ کوئی نوکر رکھ لے اور وہ خود گائیڈ بن کر پیسے کمانا چاہتا ہے۔ اس میں بہت آمدنی ہوتی ہے، کرنا کچھ نہیں ہوتا۔ وادی میں سیاحت کے لیے آئے ہوئے لوگوں کو تانگے میں یا بھی ان کی اپنی گاڑی میں مختلف علاقوں کی سیر کرانا پڑتی تھی اور ساتھ ساتھ قابل ذکر تاریخی مقامات کے بارے میں انہیں آگاہ کرنا ہوتا تھا۔ شیر علی تو وادی کے چپّے چپّے سے واقف تھا۔

وہ آج اداس بھی تھا۔ اس روز والے واقعے کا اس کے دل و دماغ پر خاصا اثر پڑا تھا، اگرچہ اس سے پہلے بھی وہ بھارتی فوجیوں کی نہتے کشمیریوں کے ساتھ سفاکانہ کارروائیاں اپنی آنکھوں سے دیکھتا اور کانوں سے سنتا بھی رہا تھا لیکن اس بار جو کچھ ہوا تھا اس کا تعلق خود اس کی اپنی ذات سے تھا۔ اس دن بھارتی فوجیوں کو للکارنے کے بعد جو جھگڑا کھڑا ہوا تھا، وہ دیکھتے ہی دیکھتے اس قدر سنگین صورت اختیار کرگیا تھا کہ اس میں کئی بے گناہ کشمیری بھارتی فوجیوں کے ہاتھوں لقمۂ اجل بن گئے تھے۔ کئی روز وادی میں ہڑتال رہی تھی۔ بھارتی فوجیوں کی اس ظالمانہ کارروائی کے خلاف احتجاج بھی ہوا تھا، کشیدگی بھی بڑھی تھی۔ پھر ہمیشہ کی طرح حالات معمول پر آتے چلے گئے لیکن شیر علی جانے کیوں مرجھا سا گیا تھا۔ اسے بہت افسوس ہوا تھا کہ اس کی وجہ سے اتنے غریب کشمیری جان سے ہاتھ دھو بیٹھے تھے۔ اگرچہ اس واقعے کے بعد سے وہ اپنے کشمیری بھائیوں میں ایک ''ہیرو'' کی حیثیت اختیار کرگیا تھا مگر اسے اس کی کوئی خوشی نہیں ہوئی تھی۔ حتیٰ کہ جب کشمیری راہنما اور مجاہد کمانڈر عبدالرحمان نے بھی خود بہ نفسِ نفیس اس کے گھر آکر اس کی پیٹھ تھپتھپائی تھی، پھر بھی اس کے اندر کی بے چینی فرو نہیں ہوسکی تھی۔ اس واقعے کے رونما ہونے کے بعد اسے یہ بھی ڈر ہوا تھا کہ سارے کشمیری اسے لعن طعن کریں گے اور وہ بھی جن کے عزیز و اقارب اس میں شہید ہوئے لیکن صد آفرین ہے ان پر کہ انہوں نے اس سے نفرت کے بجائے اس کی حوصلہ افزائی کی تھی ......مگر باوصف ان سب باتوں کے اسے ایک چپ سی لگ گئی تھی۔ اس کی آنکھوں کے گرد بار بار وہی دہلا دینے والا منظر گردش کرنے لگتا تھا۔ وہ کیا چاہتا تھا؟ اس نے اپنے آپ سے پوچھا...... ''بدلہ!'' اسے ایک ہی جواب ملا۔

اس روز کے بعد جیسے اس کا اندر بدل کے رہ گیا۔ اس کا خیال تھا کہ مجاہد کمانڈر عبدالرحمان اسے اب اپنے گروپ میں شامل کرلیں گے اور وہ اپنی ازلی خواہش کو عملی جامہ پہنانے کی کوشش کرے گا مگر اس سلسلے میں انہوں نے بھی

اس سے کوئی ایسی بات نہ کی تھی۔
وہ یہی سوچتا ہوا ہوٹل براڈوے کی طرف نکل آیا۔ آج واقعی موسم خوشگوار ہو گیا تھا، دھوپ خوب چمکنے لگی تھی۔ وہ یوں ہی ہوٹل براڈوے کے قریب سے گزرنے لگا۔ یہ سری نگر کا بہت قدیم اور مشہور ہوٹل تھا۔ اپنی مخصوص لوکیشن کی وجہ سے یہ غیر ملکی سیاحوں کی توجہ کا مرکز تھا اور زیادہ تر سیاح اور غیر ملکی صحافی اسی ہوٹل میں ٹھہرا کرتے تھے۔
وہ پاس سے گزرنے لگا تو اچانک ایک آواز سن کر وہ رک گیا۔ کسی نے اس کا نام لے کر پکارا تھا۔
''شیر علی!'' وہ رکا اور گردن موڑ کر دیکھا۔ اس کے بائیں جانب حبیب خاں عرف حبیبی کھڑا تھا۔ یہ ایک چالیس پینتالیس سالہ بھاری بھرکم کشمیری شخص تھا اور کئی بار وہ اس سے ملاقات کر چکا تھا۔ شیر علی اسے پہچان کر بے دلی سے مسکرایا۔ وہ اس کی طرف بڑھا۔ اس نے ہاتھ ملایا اور بولا۔
''خیریت تو ہے، آج سبزی منڈی کے بجائے ادھر نظر آرہے ہو...... کہیں میری تلاش تو نہیں تھی تمہیں؟'' یہ کہتے ہوئے اس کی آنکھوں میں ایک عجیب سی چمک عود کر آئی تھی۔
جواباً شیر علی بولا۔ ''نہیں، میں ویسے ہی ادھر نکل آیا تھا۔ آج کام پر دل نہیں لگا تھا۔''
''سمجھ گیا، لگے گا بھی کیسے۔ میں اچھی طرح جانتا ہوں تجھے۔ اسی لیے تو کہہ چکا ہوں کہ میرے ساتھ کام میں بڑا مزہ آئے گا تجھے...... میرے سارے لڑکوں سے بہتر ہے تو۔ وہ تو بس گزارہ کررہے ہیں۔ جتنا تو جانتا ہے، وہ نہیں جانتے۔ بس! کام چلاؤ ہیں۔''
''سیکھ جائیں گے وہ۔ بد دل نہ ہوا کر ان بے چاروں سے۔'' شیر علی بولا پھر آگے بڑھنے لگا تو حبیبی نے اسے اشارے سے روکا۔
''رک نا ذرا...... اب اس طرف نکل آیا ہے تو میری بات بھی سنتا جا۔'' شیر علی نہ چاہتے ہوئے بھی رک گیا مگر وہ جانتا تھا کہ یہ اس سے کیا کہنے والا تھا۔
حبیب کے پاس شیر علی کی عمر کے آٹھ دس لڑکے تھے، وہ سارے ہی اس کے تقریباً رشتے دار تھے۔ کوئی بھائی کا لڑکا تھا تو کوئی بہن کا یا کسی عزیز کا۔ وہ گائڈ کا پیشہ اختیار کیے ہوئے تھے۔ حبیب خاں نے ہی انہیں سکھایا تھا کہ یہاں آنے والے سیاحوں کی کس طرح راہنمائی کرنی ہے۔ بالخصوص صحافیوں اور وقائع نگاروں کو ایسے گائڈز کی زیادہ ضرورت پڑتی تھی۔ ہوٹل کے کچھ ویٹرز اس سلسلے میں حبیب کے اس کاروبار کی زبانی کلامی اشتہاری مہم چلاتے تھے اور وہی حبیب کو ایسے کسٹمرز کا بندوبست کرکے دیا کرتے تھے، جنہوں نے اس وادی کی سیر کرنا ہوتی تھی۔ اس کے بدلے وہ حبیب سے کمیشن وصول کرتے تھے اور حبیب ان سیاحوں سے۔ وہ شیر علی کو بھی کئی بار اپنے اس کام میں شمولیت کے بارے میں کہہ چکا تھا کیونکہ وہ تاڑ گیا تھا کہ اس کا اپنے باپ کے کام میں دل نہیں لگتا تھا مگر شیر علی اپنے باپ کو بھی اکیلا کیسے چھوڑ سکتا تھا اور پھر شیر علی کی ایک خصوصیت یہ بھی تھی کہ اسے انگریزی بھی آتی تھی۔ یہاں جنہیں آگے چل کر گائڈ بننا ہوتا تھا، ان کی اولین کوشش یہی ہوتی تھی کہ وہ کم از کم انگریزی ضرور جانتے ہوں۔ چاہے ٹوٹی پھوٹی سہی۔ حبیب یہ بھی اچھی طرح جانتا تھا کہ...... اس کے اپنے لڑکے جھوٹی سچی معلومات جھاڑتے ہیں جبکہ شیر علی میں یہ بات نہیں تھی۔
''آج کل سیزن چل رہا ہے۔ ہوٹل سیاحوں سے بھرا ہوا ہے۔ ایک تگڑی پارٹی ہے۔ انہیں تیرے جیسا ہی ایک اچھا گائڈ درکار ہے۔ خوب پیسا ملے گا۔ کیا کہتا ہے؟''
اس بار شیر علی کا بھی انکار کرنے کو جی نہیں چاہ رہا تھا۔ تاہم نیم دلی سے بولا۔
''نہیں چاچا! میرا باپ اکیلا ہو جائے گا۔ وہ اب بوڑھا ہو گیا ہے، بیمار بھی رہنے لگا ہے۔ اکیلا شکارا نہیں سنبھال سکتا۔''
''اسی لیے تو کہہ رہا ہوں۔ اسے آرام کرنے دے گھر پر اب۔ اس کام میں تجھے اتنی آمدنی ہو جائے گی کہ تیرے پورے گھرانے کی آرام سے گزر بسر ہو جائے گی۔'' حبیبی اس کی نیم رضامندی سے پرامید ہو کر ترنت بولا جس نے شیر علی کو بھی کچھ سوچنے پر مجبور کر دیا تھا۔ اسے سوچتا پا کر حبیبی آگے بولا۔
''سبزی فروشی میں رکھا ہی کیا ہے۔ سخت سردی میں جھیل پہ سیلن زدہ اور ٹھٹھرتا ہوا شکارا سنبھالنا اور سبزی سے لدے ہوئے شکارے کو کھینا۔ ایک ہی جگہ شام تک اکڑوں گاہک کے انتظار میں بیٹھے رہنا، کتنے ہی بے چارے سردی سے مر کھپ گئے۔''
شیر علی جانتا تھا کہ وہ غلط نہیں کہہ رہا تھا۔ خود اس کے بیمار باپ کی حالت اس کی نظروں کے سامنے تھی۔
''چل! اگر آج تو کام پہ نہیں گیا ہے تو ایک تجربہ ہی کرلے آج کے دن۔ آج میرے پاس کوئی لڑکا بھی نہیں

ہے۔ سب کام پر ہیں جبکہ اندر ایک بہت تگڑی پارٹی کسی اچھے گائڈ کی منتظر ہے۔ اور میں جانتا ہوں، تیرے سے زیادہ کون اچھا گائڈ ہوگا۔ کیا یاد کرے گا، جیبی چاچا کو بھی۔ آج کا دن تیرا۔ مجھے ایک پائی نہ دینا، سارے تو رکھ لینا پیسے۔'' ابھی اس نے اتنا ہی کہا تھا کہ ہوٹل کے گیٹ سے ایک باوردی ویٹر نکلا اور سیدھا جیبی کی طرف بڑھا۔

''کیا ہوا جیبی؟ بندوبست ہوا کسی گائڈ کا؟ اندر پارٹی تیار بیٹھی ہے۔''

''ہاں، ہاں...... ہو گیا ہے۔ بھیج دے پارٹی کو۔'' جیبی نے اس سے کہہ دیا اور ساتھ ہی اپنی قمیص کی جیب سے کچھ نوٹ نکال کر اسے پکڑا دیے۔ ویٹر نے ایک نگاہ اس کے ساتھ کھڑے شیر علی پر ڈالی اور پھر دوبارہ گیٹ کی طرف مڑ گیا۔

''اب تو میں نے ویٹر کو کمیشن بھی دے دیا۔ یار! انکار مت کرنا۔ وعدہ۔ بس آج کے دن۔'' جیبی نے اس سے ملتجی لہجے میں کہا تو شیر علی نے اثبات میں اپنے سر کو جنبش دے ڈالی۔

تھوڑی دیر گزری، اس نے دیکھا ہوٹل کے گیٹ سے کچھ غیر ملکی سیاح برآمد ہوئے۔ انہیں دیکھ کر شیر علی کو اندازہ ہوا تھا کہ وہ ایک پوری فیملی تھی اور اینگلو انڈین ''کالے صاحب'' قسم کے ہندوستانی انگریز تھے۔ ایک تو کالا انڈین ہی نظر آتا تھا لیکن اسے دیکھ کر لگتا یہی تھا کہ اس کا ذہن ابھی تک برطانوی راج کے محکوم دور کے زیر اثر رہا ہے۔ اب تو انگریز جا چکے تھے مگر اپنی اس طرح کی باقیات ایک نفسیاتی ہتھیار کے طور پر ضرور چھوڑ گئے تھے اور یوں انہیں آدھا تیتر آدھا بٹیر بنا گئے تھے۔ البتہ اس کے ہمراہ جو خاتون تھی، وہ ضرور انگریز لگتی تھی اور ان کے ہمراہ دو نوجوان لڑکا لڑکی بھی تھے، تقریباً شیر علی کے ہی ہم عمر۔ اور ان سب کی ''ٹور'' کالے صاحب، گورے صاحب جیسی ہی نظر آتی تھی۔ لیکن وہ شاید یہ نہیں جانتا تھا کہ ''پکا صاحب'' بننے کے چکر میں وہ ''کچا صاحب'' بن چکا تھا اور اپنی اقدار کو ہیچ اور دوسرے کو اعلیٰ سمجھتا تھا۔ اس چکر میں وہ خود آدھا تیتر اور آدھا بٹیر بن کر رہ گیا تھا۔

درحقیقت اینگلو انڈین یا اینگلو ورنیکلر...... برطانوی راج کے ہندوستانی معاشرے میں مخلوط النسل افراد کی معاشرتی حیثیت کا تعین کرتی تھیں۔ معاشرتی اقدار کا دامن تھامے رہنا بہت مشکل تھا جبکہ ان اقدار کو چھوڑ دینا بہت آسان...... مگر اس آسان راستے کی قیمت بہت گراں تھی۔ انگلستان سے ہر طبقے کے لوگ کشاں کشاں ہندوستان چلے آئے تھے، اعلیٰ سرکاری یا فوجی عہدوں پر تعینات ہو کر ہندوستان آنے والے ''پکے صاحب'' لوگوں نے، جو اپنے اہل وعیال کے ساتھ آئے تھے، اپنی روایات برقرار رکھی تھیں۔ انہوں نے اپنے اور مقامی لوگوں میں فاصلہ رکھا تھا...... خود کو مقامی لوگوں سے برتر اور افضل جانتا تھا جبکہ ریلوے، تار برقی، آب رسانی اور بجلی کے محکموں، ملوں اور فیکٹریوں میں مختلف النوع خدمات کی انجام دہی کے لیے، آنے والے نچلے درجے کے انگریزوں نے مقامی لوگوں سے مجبوراً یا ضرورتاً میل جول رکھنے سے گریز نہ کیا تھا۔ اس میل ملاپ نے مقامی لوگوں اور بدیسیوں کے مابین، رشتے ناتوں کی داغ بیل ڈالی تھی۔ اب یہ اور بات تھی کہ اس نوعیت کے اختلاط کے نتائج خاصے مہیب نکلے تھے۔ کلکتہ اور ہندوستان میں ایسے ایک دو نہیں ان گنت گھرانے تھے، جنہوں نے عرصہ پہلے اپنی گوری رنگت والی لڑکیوں کو مقامی کالے نوجوانوں سے شادی کرنے کی اجازت دے دی تھی اور اب ہندوستان ہی کو اپنا وطن سمجھتے تھے مگر ایسی شادیوں کے نتیجے میں، جنم لینے والے بچے اور ان بچوں کے بچے اب اپنی ماؤں یا نانی دادی کی رنگت اور طور طریقے بھول بھال کر بالکل مقامی لوگوں کے رنگ میں زندگی بسر کر رہے تھے مگر المیہ یہ تھا کہ نہ انہیں مقامی لوگ اپنا سمجھتے تھے نہ انگلستان سے آئے ہوئے انگریز انہیں اپنا گردانتے تھے۔ گوری میموں کی، مقامی کالے ہندوستانیوں سے شادی سے قطع نظر چند برسوں کے لیے ہندوستان آنے والے نچلے طبقے کے انگریزوں نے بھی مقامی عورتوں سے وابستگیاں تیار کرنے میں کوئی تردد نہ کیا تھا۔

شیر علی تو خیر الگ طبیعت کا لڑکا تھا مگر دوسرے گائڈ لڑکے اس سلسلے میں بہت چالاک تھے، وہ ایسے ''دوغلی نسل'' کے لوگوں کی نفسیاتی پیچ سے واقف تھے۔ جو احساس کمتری کے مارے ہوتے اور اپنی امارت جھاڑنے کے لیے اپنا غربت بھرا ماضی چھپانے کی بھونڈی حرکتیں تو کرتے ہی تھے، ان کی ایک حرکت ان گائڈ لڑکوں کے لیے بڑی سودمند ثابت ہوتی تھی۔ وہ اجرتِ خالص کے نام پر پیسا بہت دیتے تھے۔

شیر علی لالچی نہیں تھا۔ وہ ان کی طرف دیکھنے لگا۔ اس نے جیبی سے ہامی بھر لی تھی۔

کالے صاحب کی میم گوری تھی اور خاصی موٹی بھی۔ اس نے ہلکے نیلے رنگ کا لانگ پلین اسکرٹ پہن رکھا تھا۔ بال سرخی مائل تھے جنہیں نفاست سے مشرقی

اسٹائل میں گوندھ کر لپیٹا ہوا تھا، آنکھوں پر بڑا سیاہ چشمہ تھا۔ انڈین کالے صاحب کو اپنی گوری میم بیوی پر فخر تھا اور اس کے منتھی ہونے سے وہ خود کو بھی ذرا ''اونچا'' ہی سمجھ رہا تھا۔ دونوں جواں سال لڑکا لڑکی بہن بھائی ہی تھے۔ نسل تو دیسی تھی مگر اپنے باپ کی طرح وہ بھی ''صاحب جی'' بننے کی کوشش میں مغربی اسٹائل اپنائے ہوئے تھے۔ لڑکے نے ٹائٹ جینز کی پینٹ اور ہاف آستین کی بنیان ٹائپ شرٹ پہن رکھی تھی۔ پیروں میں جاگرز تھے اور پیٹھ پہ بڑا سا کیمرا جھول رہا تھا۔ کانوں میں واک مین تھا جبکہ لڑکی نے شارٹ نیکر پہن رکھی تھی اور چہرے پر پلاسٹک فریم کے سن گلاسز تھے۔ شارٹ نیکر کے نیچے سے اس کی سبک اور سپید رانیں مع پنڈلیوں تک نظر آرہی تھیں۔ گلے میں اس کے بھی کیمرا جھول رہا تھا۔ لڑکی کا رنگ گورا اور لڑکے کا سانولا تھا۔ دونوں چیونگم چبا رہے تھے۔

حبیب ان کو دیکھتے ہی فوراً ان کی طرف لپکا اور شیر علی نے دیکھا کہ وہ ان سے باتیں کرنے کے دوران بار بار اس کی طرف اشارے بھی کر رہا تھا۔ کالا صاحب زور زور سے اپنا سر اثبات میں ہلاتا جا رہا تھا۔ اس نے گیلس والی لفافہ قسم کی خاکی کلر کی پتلون پہن رکھی تھی۔ عمر اس کی پچاس ہی کے لگ بھگ تھی۔ منہ میں پائپ دبا ہوا تھا جبکہ اس کی میم چالیس کے پیٹے میں تھی۔ ابھی یہ لوگ ہوٹل براڈوے کے گیٹ کی سیڑھیوں سے نیچے اتر ہی رہے تھے کہ عقب سے شیشے کا مرکزی دروازہ کھلا اور وہی ویٹر ایک اور فیملی کے ساتھ نمودار ہوا۔ اس نے حبیب کو اشارہ کیا اور اس سے کچھ بولا تو حبیب دوڑتا ہوا شیر علی کے پاس آگیا۔ بولا۔

''لے یارا! ایک اور کسٹمر ہاتھ لگ گئے، دونوں کو ہی بھگتا لے یار۔ یہ مسلم ہیں، پاکستان سے آئے ہیں۔ سیالکوٹ کے رہنے والے ہیں۔''

شیر علی کا بیک وقت دو خاندانوں کے لیے گائڈ کے فرائض انجام دینا مشکل تھا مگر جب اسے معلوم ہوا کہ دوسری فیملی کا تعلق پاکستان سے ہے تو وہ انہیں انکار نہ کر سکا۔ کیونکہ وہ جانتا تھا کہ مسلم، بالخصوص پاکستانیوں کے لیے یہ وادی کس قدر اہمیت کی حامل تھی۔ وہ اسے اپنے وجود کا حصہ سمجھتے تھے اور اپنے ملک (پاکستان) کی شہ رگ سمجھتے تھے۔

اسے افسوس ہوا کہ اگر وہ پہلے نظر آجاتے تو زیادہ بہتر تھا۔ وہ اس انڈین فیملی کو انکار کر دیتا مگر اب کچھ نہیں ہو سکتا تھا۔ اس نے ہامی بھرتے ہوئے حبیب سے کہہ دیا کہ وہ اس فیملی کو بھی وزٹ کروا دے گا۔

مسلم پاکستانی فیملی میں صرف ایک مرد اور عورت تھے۔ دونوں ہی جوان تھے۔ لڑکی کی عمر تیس کے اندر ہی تھی جبکہ مرد چالیس کے لگ بھگ نظر آتا تھا۔ دونوں خاصے خوبرو تھے اور مناسب لباس میں تھے۔ حبیب نے نہ جانے ان کے سامنے شیر علی کی کیا تعریف کی تھی۔ وہ اس کی طرف تیزی سے بڑھے۔ تب تک وہ کالا صاحب قسم کا آدمی اپنی آدھا تیتر آدھا بٹیر ٹائپ کی فیملی کو لے کر نیچے اتر چکا تھا اور انگلی کے اشارے سے اس نے شیر علی کو اپنی طرف بلایا تھا۔ شیر علی کو اس کا یہ انداز پسند نہیں آیا۔ البتہ طوعاً و کرہاً جب وہ اس کی طرف بڑھنے لگا تو تب تک وہ دونوں جوان مرد اور عورت اس کے بالکل قریب پہنچ چکے تھے۔

''السلام وعلیکم! کیا نام ہے تمہارا؟'' جوان مرد نے بڑی خوش دلی سے سلام کرتے ہوئے اس کی جانب اپنا ایک ہاتھ مصافحے کے لیے بڑھایا۔ شیر علی کو اس کا یہ انداز تخاطب پسند آیا تھا، لہٰذا وہ بھی اس مغرور کالے صاحب کو نظر انداز کرتے ہوئے اس کی طرف متوجہ ہو کر شائستہ لہجے میں سلام کا جواب دیتے ہوئے بولا۔

''وعلیکم السلام۔ میرا نام شیر علی ہے۔''

''بہت اچھا نام ہے۔'' مرد بولا۔ پھر اپنا اور اپنی ساتھی لڑکی کا تعارف کرواتے ہوئے بولا۔ ''میرا نام تنویر احمد ہے، یہ میری بہن ہیں، غزالہ۔ ہم دونوں پاکستان سے آئے ہیں۔ وہاں ہم اپنا ایک اخبار نکالتے ہیں اور ایک ہفت روزہ میگزین بھی۔ یہاں ہم سیر کرنے بھی آئے ہیں اور یہاں کے بعض مشہور مقامات کے بارے میں کچھ تحریری اور تصویری معلومات بھی اکٹھی کرنا چاہتے ہیں۔ تمہارا ساتھی بتا رہا تھا کہ تم اپنے کام میں دیانت دار اور ماہر ہو۔''

شیر علی سمجھ گیا کہ ''تمہارا ساتھی'' سے اس کی مراد حبیب خاں حبیبی ہی تھا، نیز وہ اس کے ایک اور جملے کا مطلب بھی اچھی طرح جان گیا تھا جب تنویر نامی اس پاکستانی آدمی نے اس کے لیے دیانت داری کا لفظ استعمال کیا تھا۔ وہ دونوں ہی پڑھے لکھے اور سلجھے ہوئے دکھائی دے رہے تھے اور انہیں بھی اس حقیقت کا ادراک تھا کہ بہت سے گائڈ محض روپیا بٹورنے کی خاطر اور اپنی کم علمی کی وجہ سے جھوٹ کا سہارا لیتے ہیں اور بہت سی غلط باتیں بتا ڈالتے ہیں۔ یہ سنجیدہ مزاج شیر علی ان دونوں بہن بھائیوں کو اچھا اور شریف لگا تھا۔

"اے مسٹر! اسے پہلے ہم نے ہائر کیا ہے۔ تم اپنا راستہ لو۔" اچانک اس کالے صاحب نے قریب آکر تنویر کے بائیں کاندھے کو اپنی انگلی سے چھوتے ہوئے کہا تو تنویر نے مڑ کر اسے سر سے پاؤں تک دیکھا اور پھر اپنے شولڈر پر گرد جھاڑنے کے انداز میں چٹکی دی اور اس کے کچھ کہے بغیر دوبارہ شیر علی سے مخاطب ہو کر مسکراتے ہوئے بولا۔

"تو پھر چلیں؟ یہ بتاؤ سب سے پہلے تم ہمیں کہاں لے کر جاؤ گے؟"

کالے صاحب کا انگریزوں والی نخوت اور غرور خاک میں مل گیا مگر وہ صرف ناک بھوں چڑھانے کے سوا کچھ نہیں کرسکتا تھا۔ تاہم شیر علی نے تنویر کو جواب دینے سے پہلے ازراہِ اخلاق اس کالے صاحب کو مخاطب کر کے کہا۔

"آپ فکر نہ کریں، میں آپ دونوں کو بھی سیر کروادوں گا۔" شیر علی کے اس طرح کہنے پر کالے صاحب کا کم ظرفوں جیسا غرور پھر جاگ پڑا۔ وہ بڑی نخوت سے ہاتھ ہلا کر بولا۔

"نائیں ضرورت ہے ہمیں تمہاری اور بہوت مل جائیں گے تمہارے جیسے لپاڑے لونڈے......" یہ کہہ کر وہ قریب گھبرائے ہوئے کھڑے حبیب سے مخاطب ہو کر بولا۔

"تم ہمارے لیے کسی انڈین چھوکرے کا بندوبست نہیں کرسکتے؟"

"اے مسٹر! دیسی انگریز کی اولاد! زبان سنبھال کر بات کرو۔ لپاڑے لونڈے ہوں گے تیرے یہ دونوں......" شیر علی نے غصے سے اس کی طرف دیکھتے ہوئے، اس کے دونوں لڑکی لڑکے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

پھر وہ انہی دونوں پاکستانی بھائی بہنوں کی طرف متوجہ ہو گیا اور قریب کھڑی ٹیکسی کی طرف بڑھ گیا۔ کالا صاحب ہکا بکا رہ گیا۔ دیسی انگریز کا لفظ اسے گالی کی طرح لگا تھا مگر جانتا تھا کہ یہ نوجوان سالار کا شیر علی اس کی "اوقات" پہچان چکا تھا۔ اسی لیے اس نے بھی معاملہ رفع دفع ہونے دیا۔ البتہ اب حبیب ان لوگوں کو سنبھالنے کی... کوشش میں لگ گیا تھا۔

تنویر اور غزالہ کو اس کشمیری لڑکے کا یہ دلیرانہ اور مدبرانہ انداز بہت بھا گیا۔ وہ دونوں ہی مسکرا کر رہ گئے۔

"آپ دونوں پہلے کہاں اور کس مقام کو دیکھنا پسند کریں گے......؟"

تھوڑا آگے تک پیدل چلنے کے بعد شیر علی نے ان سے پوچھا۔ غزالہ جو کچھ زیادہ ہی غور سے شیر علی کو دیکھ رہی تھی۔ اس سے بولی۔

"ہمیں پہلے کسی پر فضا مقام پر لے چلو مگر شرط یہ ہے کہ تمہیں اس کے بارے میں تھوڑی بہت معلومات بھی ہو۔" اسے یہ خوبرو اور معصوم سا کشمیری نوجوان اچھا لگ رہا تھا، اس کا کھراپن اسے بہت بھایا تھا۔

"تھوڑی بہت کیوں جی؟ مجھے تو اچھی خاصی معلومات ہے۔" وہ غزالہ کی طرف دیکھ کر جھٹ سے مسکرا کر بولا تو وہ دونوں بہن بھائی بھی مسکرادیے۔

"میں آپ کو سب سے پہلے "گلمرگ" لے چلتا ہوں جسے ایشیا کا سوئٹزرلینڈ بھی کہا جاتا ہے۔" شیر علی نے کہا اور پھر یہ سب ایک ٹیکسی میں سوار ہو گئے۔

وہاں پہنچ کر گلمرگ کا فطری حسن تنویر اور غزالہ کو بہت خوبصورت لگا۔ پہاڑوں پر جمی برف حسین منظر پیش کررہی تھی۔ صبح سویرے کا ہی وقت تھا اور دونوں کا ارادہ... زیادہ دن سری نگر میں رکنے کا نہیں تھا۔ اسی لیے وہ کم سے کم وقت میں زیادہ سے زیادہ گھوم لینا چاہتے تھے۔

بلندی پر جانے کے لیے خچر بھی کرائے پر مل جاتے تھے۔ تاہم کیبل کار کے ذریعے شیر علی انہیں گھماتا رہا، وہ اس سے مختلف مقامات کے بارے میں معلومات بھی لیتے رہے۔ ضلع بارہ مولا میں واقع ہل اسٹیشن سے پیرپنجال کی سربہ فلک پہاڑیوں کا نظارہ کیا۔ شیر علی نے انہیں بتایا کہ پیر پنجال کے سلسلہ ہائے کوہ پر برف جمی رہتی ہے، نیز پاک بھارت کی عارضی سرحد (لائن آف کنٹرول) گلمرگ کے نزدیک ہی ہے۔

ریاست جموں و کشمیر تین خطوں پر مشتمل ہے جموں، وادی کشمیر اور لداخ...... جب دوپہر ہوئی تو انہوں نے نیچے ترائیوں میں بنے ایک مشہور ہوٹل "خیبر" میں کھانا کھایا اور پھر وہاں سے یہ لوگ ایک دوسرے صحت افزا مقام "پہلگام" کی طرف روانہ ہونے کے لیے ہوٹل سے نکلے تو اچانک ان کی نظر ایک فوجی جیپ پر پڑی۔ شیر علی تھوڑا سا پریشان ہوا لیکن اس نے اپنی پریشانی ان دونوں پاکستانی ٹورسٹ بہن بھائیوں پر ظاہر نہیں ہونے دی۔ اس کے ذہن میں باپ کی نصیحت ابھری تھی، جس نے اسے گھر سے باہر نہ نکلنے کی سخت تاکید کی تھی اور اسے ٹھیلے پر بھی نہیں بیٹھنے دیا تھا اور فوراً اسے گھر جانے کا کہا تھا۔

اس نے دیکھا جیپ تھوڑی دیر رکی تھی۔ اس کے اندر

اسے پانچ چھ وردی پوش بھارتی فوجی بیٹھے دکھائی دیے تھے، اس کے بعد جیپ آگے بڑھ گئی۔ اس نے قدرے سکون کا سانس لیا۔

پہلگام، سری نگر سے تین گھنٹے کی مسافت پر تھا۔ وہاں جانے کا انہوں نے اگلے دن صبح کا پروگرام رکھ لیا تھا۔ وہاں سے یہ واپس اپنے ہوٹل کی طرف لوٹے اور شیر علی انہیں نشاط باغ کے ڈاچی گام نیشنل پارک لے آیا۔ اس کے بعد ڈل جھیل کا پورا چکر لگاتے ہوئے شیر علی انہیں درگاہ حضرت بل کی طرف لے چلا تو ایک بار پھر اسے بھارتی فوجی جیپ نظر آئی۔ وہ یہ سوچ کر تشویش زدہ بھی ہونے لگا کہ کہیں یہ بھارتی فوجی ان پر نگاہ تو نہیں رکھے ہوئے ہیں، یا پھر یہ معمول کے گشت میں مصروف ہیں۔ بوڑھے باپ کی ایک بار پھر تاکید اسے یاد آنے لگی۔ تاہم اس نے اب فیصلہ کیا کہ ان دونوں بہن بھائیوں کو درگاہ حضرت بل کی زیارت کروانے کے بعد سیدھا اپنے گھر کی راہ لے گا۔

سب سے پہلے انہوں نے درگاہ میں موجود مزارات پر فاتحہ پڑھی، انہیں درگاہ کے باہر کبوتروں کا جھنڈ غٹرغوں غٹرغوں کرتا نظر آیا۔ تنویر اور غزالہ نے کبوتروں کو دانہ ڈالا۔ غزالہ کی آنکھوں میں بڑا اشتیاق اور عقیدت سمایا ہوا تھا، یہاں اسے ایک روح پرور سکون محسوس ہو رہا تھا۔ شیر علی نے انہیں بتایا کہ "بل" کشمیری زبان میں "جگہ" کو کہتے ہیں، لہٰذا حضرت بل کے لغوی معنی ہیں محترم ومقدس جگہ اور سری نگر کے مرکز سے دس کلومیٹر دور حضرت بل کا یہ تاریخی علاقہ پھیلا ہوا تھا۔ شیر علی نے انہیں بتایا کہ یہاں آنحضرت ﷺ کے موئے مبارک کی زیارت بھی کرائی جاتی ہے، جو پورے سال میں دس بار کی جا سکتی ہے۔ ان ایام کے علاوہ اس مبارک تبرک کو کھولا نہیں جاتا۔ تنویر اور غزالہ کو یہ بات معلوم تھی، ان دونوں بہن بھائیوں کے دل میں اس موئے مبارک کی زیارت کرنے کی خواہش بڑی شدت سے جاگی مگر متولی نے انہیں بتایا کہ اس موئے مبارک کی زیارت، عید میلادالنبی، شب معراج اور اکیس رمضان میں عوام الناس کو ہو چکی تھی۔ البتہ اس موئے مبارک سے متعلق انہوں نے وہاں کے متولی سے کچھ بنیادی معلومات بھی لے لی تھیں۔ موئے مبارک سے متعلق یہ روایت تھی کہ 1435ء میں نبی کریم ﷺ کی اولاد میں سے سید عبداللہ ہندوستان آئے۔ ان کے پاس آپ ﷺ کا ایک موئے مبارک بھی تھا۔ جسے بعد ازاں مرحوم کے فرزند سید حامد نے ایک امیر کشمیری تاجر، خواجہ نورالدین ایشائی کو فروخت کر دیا تھا۔

1700ء میں خواجہ صاحب کی دختر، عنایت بیگم نے ایک عمارت تعمیر کروائی اور وہاں موئے مبارک محفوظ کر دیا۔ رفتہ رفتہ ان کے اہل خانہ وہاں دفن بھی... ہونے لگے۔ چنانچہ عمارت کو درگاہ حضرت بل کہا جانے لگا۔ یہ وادی کشمیر میں سب سے مقدس اسلامی عمارت سمجھی جاتی ہے۔

اگرچہ شیر علی نے بھی انہیں بتایا تھا مگر تنویر اور غزالہ نے درگاہ کے متولی سے بھی پوچھ لینا ضروری سمجھا تھا، بعد میں شیر علی کی بات بھی صحیح ثابت ہوئی تھی۔

غزالہ نے نوٹ بک کھول رکھی تھی۔ وہ شیر علی سے... حاصل کردہ معلومات نوٹ کرتی جارہی تھی۔ اگلے دن انہوں نے اننت ناگ اور پہلگام جانا تھا شیر علی نے کوئی وعدہ تو نہیں کیا تھا تاہم اتنا ضرور کہا تھا کہ وہ آنے کی پوری کوشش کرے گا۔

درگاہ سے نکلنے کے بعد یہ لوگ ہوٹل پہنچے تو شیر علی کا دل جانے کیوں بے چین سا ہونے لگا۔ اس نے دونوں بہن بھائیوں سے جانے کی اجازت چاہی تو انہوں نے اسے بصد اصرار تھوڑی دیر کے لیے اپنے ساتھ اندر ہوٹل کے کمرے میں بلالیا۔ تنویر نے اسے بہت سے پیسے دیے، تو شیر علی ان کا شکریہ ادا کرتے ہوئے بولا کہ وہ اسے پاکستان کی کوئی نشانی بھی دیں۔ تنویر اور غزالہ اس کشمیری نوجوان کی بات سے ازحد متاثر ہوئے، تب پھر غزالہ نے اسے کچھ ایسی نشانیاں دیں جسے لے کر شیر علی بہت خوش ہوا۔ یہ نشانیاں... کی چین میں بنی مینار پاکستان کی تھی اور مزار قائد کا ایک چھوٹا سا شوپیس بھی دیا۔ نیز پاکستان کے مشہور علاقوں کی تصاویر بھی ان میں شامل تھیں۔

شیر علی ان سے رخصت ہونے لگا تو اچانک دروازے پر دستک ہوئی۔ تنویر نے آگے بڑھ کر دروازہ کھولا تو اچانک اسے کسی نے زوردار دھکا دیا۔ وہ الٹے پاؤں لڑکھڑاتا ہوا کمرے کے وسط میں کھڑی اپنی بہن غزالہ پر آن گرا۔ وہ اس اچانک افتاد پر بری طرح متوحش سی ہو گئی۔ شیر علی بھی بری طرح چونکا تھا۔ اس نے دیکھا، تین چار مسلح بھارتی فوجی اندر گھسے چلے آئے تھے۔ تنویر کو انہوں نے ہی دھکا دیا تھا۔ ان میں کرنل ستیارام کا دست راست کیپٹن بھگوت کھٹپال بھی تھا جو بڑی کینہ توز نظروں سے شیر علی کو گھور رہا تھا۔

(جاری ہے)